کلیاتِ میر

جلد اول

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات میر

جلد اول

(مکمل چھ دیوان غزلیات)

مرتب

ظل عباس عباسی

بتصحیح و اضافہ

احمد محفوظ

زیر نگرانی

شمس الرحمن فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 1983
تیسری طباعت : 2013
تعداد : 200
قیمت : -/440روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1130

K ulliyat-e-Meer Vol- I
Compiled By : Zille Abbas Abbasi
Revision & Editing : Ahmad Mahfooz
Supervision : Shamsur Rahman Faruqi

ISBN :978-81-7587-879-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا ایسا ادارہ ہے جو قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اس کے دائرۂ کار میں بنیادی طور پر اردو زبان کو اس طرح فروغ دینا شامل ہے کہ اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت سے تعلق رکھنے والے بیش بہا سرمائے سے نئی نسل کا رشتہ قائم ہو سکے اور ساتھ ہی اردو زبان کے پھلنے پھولنے کی راہ مزید ہموار ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قومی اردو کونسل کئی منصوبوں پر بیک وقت عمل پیرا ہے۔ انھیں میں ایک اہم منصوبہ اردو کی ان قدیم علمی اور ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی ہے، جو اردو زبان بالخصوص اردو شعر وادب کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اب رفتہ رفتہ نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ان ادبی کتابوں کی نئی اشاعت اس لیے بھی وقت کی اہم ضرورت ہے کہ یہ ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں بلکہ یہ ایسا سرمایہ ہے جس سے رشتہ قائم کیے بغیر ہم اپنی زبان اور ادبی تہذیب کی حقیقی قدر و قیمت کا سچا احساس نہیں پیدا کر سکتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت دیگر کتابوں کے علاوہ اردو کے قدیم شاعروں کی تصانیف بھی شائع کرتی رہی ہے۔ کلیات میر جلد اول کی اشاعت نو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میر تقی میر کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ اب تک ان کے کلیات کی بہت سی اشاعتیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ظل عباس عباسی مرحوم کا مرتب کردہ کلیات جلد اول جو میر کی غزلوں پر مشتمل تھا اور پہلی بار 1968 میں علمی مجلس دہلی سے شائع ہوا تھا، اس کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے 1983 میں شائع کیا۔ کلیات میر جلد اول کا یہ عکسی ایڈیشن اس ادارے کی پہلی اشاعت تھی۔ لہٰذا اس کی بہت پذیرائی ہوئی اور یہ ایڈیشن بہت جلد نایاب ہو گیا۔ چونکہ اس ایڈیشن میں متن کی ترتیب اور صحت سے متعلق خامیاں پہلے سے موجود تھیں جو عکسی اشاعت کے سبب دور نہیں کی جا سکی تھیں، اس لیے دوسری اشاعت سے پہلے قومی کونسل کے ادبی پینل نے اس کی تصحیح کا کام ڈاکٹر احمد محفوظ کے سپرد کیا اور اس کام کی نگرانی محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کو سونپی گئی۔ اس طرح کلیات میر جلد اول (مکمل 6 دیوان غزلیات) کا دوسرا ایڈیشن

تصحیح و اضافے کے ساتھ 2003 میں منظر عام پر آیا اور اس قدر مقبول ہوا کہ یہ ایڈیشن بھی حسب توقع جلد ختم ہو گیا۔

کلیات میر جلد اول کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے جو قومی کونسل اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں جو خامیاں رہ گئی تھیں انھیں حتی الامکان دور کر دیا گیا ہے۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں پھر بھی اگر کوئی خامی نظر آئے تو اس کی طرف ہمیں متوجہ فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جا سکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست

• دیباچۂ اشاعت اول	احمد محفوظ	7
• دیباچۂ اشاعت دوم	احمد محفوظ	11
• تمہید	شمس الرحمٰن فاروقی	15
• تعارف (طبع اول)	رشید احمد صدیقی	25
• مختصر حالات زندگی	قاضی عبدالودود	27
• میر کی آپ بیتی	مترجمہ نثار احمد فاروقی	39
• میر کا ذکر تذکروں میں	ظل عباس عباسی	59
• میر کے مطالعے کی اہمیت	آل احمد سرور	71
• میر کی عالمگیر مقبولیت	فراق گورکھپوری	87
• میر جی	محمد حسن عسکری	91
• اسلوبیات میر	گوپی چند نارنگ	101
• چوں خمیر آمد بدست نانبا	شمس الرحمٰن فاروقی	125
• فہرست غزلیات ردیف وار		143
• دیوان اول		181
• دیوان دوم		415
• دیوان سوم		573
• دیوان چہارم		665
• دیوان پنجم		735
• دیوان ششم		817

احمد محفوظ

دیباچۂ اشاعت اول

ظل عباس عباسی مرحوم نے میر تقی میر کا کلیات دو جلدوں میں مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کلیات کی پہلی جلد، جو چھ مکمل دیوان غزلیات پر مشتمل تھی، ۱۹۶۸ میں علمی مجلس دلی سے شائع ہوئی۔ مگر دوسری جلد کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ بہرحال یہ جلد اول اپنی جگہ پر انتہائی مقبول ثابت ہوئی اور بہت جلد اس کے نسخے بازار میں نایاب ہو گئے۔ اس جلد کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے ۱۹۸۳ میں شائع کیا۔ اس وقت ظل عباس عباسی کی فرمائش پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ۱۹۶۸ والے ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی متعدد غلطیوں کی نشان دہی کر دی تھی، جنھیں حاشیے پر درج کر دیا گیا یا جہاں ممکن ہو سکا وہاں متن میں درست صورت بنا دی گئی۔ تاہم اس ایڈیشن میں بہت سی غلطیاں پھر بھی موجود رہیں۔ اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ عباسی مرحوم کی مرتب کردہ جلد کلیات میر کے دوسرے ایڈیشنوں سے بہتر تھی۔

یہ عکسی ایڈیشن بھی ایک عرصے سے نایاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اسے دوبارہ چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں قومی کونسل کے ادبی پینل نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ۱۹۸۳ کے ایڈیشن کی دوبارہ اشاعت سے پہلے غلطیوں کو اس حد تک درست کر دیا جائے کہ نئی اشاعت کو گذشتہ ایڈیشن سے بھی بہتر قرار دیا جا سکے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ غزلوں کے علاوہ میر کے دیگر تمام کلام کو کلیات جلد دوم کی صورت میں شائع کیا جائے۔ جلد اول کے متن کی تصحیح اور جلد دوم کے متن کی تدوین و ترتیب کا کام مجھے سونپا گیا اور اس کام کی نگرانی کی ذمہ داری جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو دی گئی۔ مکمل چھ دیوان غزلیات پر مشتمل کلیات جلد اول اب آپ کے سامنے ہے۔ دوسری جلد کا کام بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ یہ جلد انشاء اللہ عنقریب آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شور انگیز'' کے لیے ظل عباس عباسی کے مرتب کردہ کلیات جلد اول کو ہی بنیادی متن قرار دیا تھا اور اپنے ذاتی نسخے میں متن کی بہت سی غلطیوں کو درست بھی کر لیا تھا۔ میں نے اپنے کام کی منزل اول میں فاروقی صاحب کی نشان کردہ تمام تصحیحات کو اپنے مسودے میں شامل کیا۔ پھر از سر نو پورے کلیات کو از اول تا آخر لفظ بہ لفظ پڑھا گیا، جس کے نتیجے میں مزید اغلاط روشنی میں آئیں۔ ان میں کچھ غلطیاں تو سامنے کی تھیں مثلاً نقطوں کا چھوٹ جانا یا کتابت کے اغلاط وغیرہ، لیکن بہت سی جگہوں پر متن کی ایسی صورت تھی جس سے شعر سمجھ میں نہ آتے تھے یا بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ ان مشکلات کے حل کے لیے قدم قدم پر مختلف فرہنگوں کا سہارا لیا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے اشعار ایسے بھی تھے جو سمجھ میں تو آتے تھے لیکن ان کے متن پر پوری طرح اطمینان نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسے تمام شعروں کو کلام میر کے دیگر مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے اسی متن کو اختیار کیا گیا جو مرجح معلوم ہوا۔ صرف انھیں جگہوں پر قیاسی قرأت کو اختیار کیا

گیا جہاں کسی مطبوعہ نسخے سے کوئی مدد نہ مل سکی۔

عباسی مرحوم نے کلیات کی اشاعت اول (۱۹۶۸) میں اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''یہ کلیات میر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ ۱۸۱۱) کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہے''۔ ملحوظ رہے کہ یہ کلام میر کی اولین اشاعت ہے اور اسے عام طور پر سب سے زیادہ معتبر کہا جاتا ہے۔ لیکن اب یہ تقریباً نایاب ہے۔ چونکہ عباسی مرحوم نے اسی ایڈیشن کو پیش نظر رکھا تھا اور شمس الرحمن فاروقی نے بھی اپنے کام کے دوران اس سے استفادہ کیا تھا، اس لیے اب اس کی طرف مراجعت کرنا ضروری نہ معلوم ہوا۔ مزید برآں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ وقت کی تنگی کے پیش نظر اس کلیات کے متن کو قطعی شکل دینے کے لیے مخطوطات کے بجائے مطبوعہ نسخوں کو ہی ممکن حد تک سامنے رکھا جائے۔ اس صورت میں جو دیگر نسخے ہمارے پیش نظر رہے اور جن سے بہت سے شعروں کے ممکنہ صحیح ترین متن تک ہماری رسائی ہوئی وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) دیوان میر (نسخۂ محمود آباد، مکتوبہ ۱۷۸۸) مرتبہ اکبر حیدری، اشاعت اول ۱۹۷۳ سری نگر

(۲) کلیات میر (نسخۂ نول کشور) اشاعت اول ۱۸۶۸ لکھنؤ

(۳) کلیات میر (نسخۂ آسی) اشاعت اول ۱۹۴۱ لکھنؤ

(۴) کلیات میر جلد اول مرتبہ احتشام حسین، اشاعت اول ۱۹۷۲ الٰہ آباد

(۵) کلیات میر مرتبہ کلب علی خاں فائق، چار جلدوں میں (جلد اول ۱۹۷۶، جلد دوم ۱۹۷۷، جلد سوم ۱۹۷۷، جلد چہارم تاریخ ندارد، غالباً ۱۹۷۷) مجلس ترقی ادب لاہور۔

زیرنظر کلیات میں متن کو درست کرنے کے علاوہ میر کا وہ غیر متداول کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے جو دیوان اول نسخۂ محمود آباد اور کلیات میر نسخۂ نول کشور (اشاعت اول ۱۸۶۸) میں شامل ہے۔ ظل عباس عباسی مرحوم نے میر کے غیر مطبوعہ کلام کو کلیات میر کی دوسری جلد میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر انھوں نے کلیات کی جلد اول کی ''خصوصیات'' کے زیر عنوان کر دیا تھا۔ لیکن موت نے انھیں فرصت نہ دی اور وہ دوسری جلد کی ترتیب کا کام نہیں کر سکے۔ اب یہ غیر متداول غزلیں اور اشعار زیرنظر کلیات کے دیوان اول کی متعلقہ ردیفوں کے آخر میں یا متعلقہ موجودہ غزلوں میں مناسب مقام پر درج کر دیے گئے ہیں۔ جہاں جہاں یہ غزلیں اور اشعار درج ہیں وہاں حاشیے پر ''نسخۂ محمود آباد'' یا ''نسخۂ نول کشور'' لکھ کر نشان دہی کر دی گئی ہے۔ نسخۂ محمود آباد اور نسخۂ نول کشور کے آخر میں بہت سے اشعار فردیات کے تحت بھی شامل ہیں۔ انھیں بھی کلیات کے دیوان اول کی متعلقہ ردیف کے آخر میں حاشیے پر نوٹ کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیرنظر کلیات میں پہلے ہی ایک یا دو شعر کئی جگہوں پر بطور غزل شامل ہیں۔ عباسی ایڈیشن میں کئی غزلیں ایسی تھیں جو بیک وقت دو دواوین میں شامل تھیں، یہی صورت بہت سے اشعار کی بھی تھی۔ ان سب مکررات کو ایک جگہ باقی رکھا گیا ہے اور دوسری جگہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

ظل عباس عباسی مرحوم نے اپنے مرتب کردہ ''میر کا ذکر تذکروں میں'' کے ساتھ رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، فراق گورکھپوری اور آل احمد سرور کی تحریریں بھی اپنے ایڈیشن میں شامل کی تھیں۔ ادھر چند برسوں میں میر کے بارے میں کئی

اور قابل ذکر تحریریں منظر عام پر آئی ہیں۔ لہٰذا میں نے یہ مناسب جانا کہ ان میں سے بھی کچھ منتخبات اس ایڈیشن میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، ظل عباس عباسی، فراق گورکھپوری اور آل احمد سرور کی تحریروں کے ساتھ نثار احمد فاروقی، محمد حسن عسکری، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے بھی کچھ اقتباسات اس ایڈیشن میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان تحریروں میں جابجا میر کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کا متن اس کلیات میں شامل متن سے مختلف ہے۔ میں نے اسے اپنے منصب کے منافی جانا کہ نقل کردہ ایسے اشعار کی تصحیح کی جائے۔ چنانچہ ان شعروں کو علیٰ حالہ رہنے دیا گیا ہے۔

پرانے متون کی تدوین کے وقت املا کا مسئلہ ہمیشہ پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ یہ کلیات اردو شاعری کے عام شائقین، طالب علموں اور علما سب کے زیر مطالعہ آئے گا، میں نے پورے کلیات میں جدید املا کو حتی الامکان اختیار کیا ہے اور ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کی شائع کردہ کتاب املا نامہ (اشاعت دوم ۱۹۹۰) میں بیان کیے ہوئے رہنما اصولوں کی پابندی ممکن حد تک کی گئی ہے۔

میں اپنے کرم فرما محترم شمس الرحمٰن فاروقی کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کام میں نہایت انہماک اور دلچسپی کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی۔ اپنی ناسازی صحت اور عدیم الفرصتی کے باوجود انھوں نے اپنا قیمتی وقت جس طرح صرف کیا اور جس قدر شوق اور دلچسپی کے ساتھ میری معاونت کی، اس کے لیے میں اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت اور طول عمر کی دعا کرتا ہوں۔ میں یوں بھی ان کا، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کا شکرگذار ہوں کہ انھوں نے اپنی قیمتی تحریروں کے اقتباسات اس ایڈیشن میں شائع کرنے کی اجازت دی۔ محترم شمس الرحمٰن فاروقی کا اس لیے بھی شکریہ واجب ہے کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس ایڈیشن کے لیے نیا مضمون سپرد قلم کیا جو تمہید کے طور پر شامل اشاعت ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب محمد حمیداللہ بھٹ اور ادبی پینل کے تمام اراکین کا میں مشکور ہوں کہ انھوں نے ایسے بڑے کام کی ذمہ داری مجھے تفویض کی۔ قومی کونسل کے دیگر اراکین اور کارکنان بالخصوص ڈاکٹر انوار رضوی، ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، ڈاکٹر محمد احسن اور ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہر طرح سے میری مدد کی۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اسی کے فضل سے یہ بھاری بھرکم اور بڑا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

●●●

دیباچۂ اشاعت دوم

گذشتہ برس یعنی ۲۰۱۱ میں میر تقی میر کے کلام کی اولین اشاعت (۱۸۱۱) پر پورے دو سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ ان دو صدیوں میں کلام میر کی متعدد اشاعتیں عمل میں آئیں، جن میں سے چند کو یقیناً قابل ذکر حیثیت حاصل رہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قومی کونسل براے فروغ اردو زبان، نئی دہلی قابل مبارکباد ہے کہ میر کے مکمل کلام کی اب تک کی تازہ ترین اور سب سے قابل ذکر اشاعت کا سہرا اس ادارے کے سر ہے۔

ملحوظ رہے کہ یہ اشاعت ظل عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ کلیات میر، جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) کی صورت میں راقم الحروف کے تصحیح و اضافہ کے ساتھ قومی کونسل سے ۲۰۰۳ میں منظر عام پر آئی، اور تصحیح و اضافہ کا کام جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں انجام پایا۔ حسب توقع اس ایڈیشن کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور اسے میر کے مطبوعہ کلیات کا عام طور پر سب سے بہتر ایڈیشن قرار دیا گیا۔ اس ایڈیشن کے بہت جلد ختم ہو جانے کے بعد اہل ذوق کی طرف سے اس کی نئی اشاعت کا شدت سے انتظار تھا۔ چنانچہ اب یہ نیا ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ غزلوں کے علاوہ میر کے دیگر تمام کلام پر مشتمل کلیات میر کی جلد دوم مرتبہ راقم الحروف زیر نگرانی شمس الرحمٰن فاروقی قومی کونسل سے ہی پہلی بار ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ اشاعت بھی جلد ہی ختم ہو گئی۔

زیر نظر کلیات کی اشاعتِ اول سے پہلے غزلیاتِ میر کے متن کی تصحیح کے دوران ہمیں جن مراحل سے گذرنا پڑا، ان کی طرف طبع اول کے دیباچے میں ہم کچھ اشارے کر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے کوشش کی تھی کہ عباسی ایڈیشن کا متن حتی الامکان اغلاط سے پاک ہو جائے اور ترتیب کلام کی دیگر خامیاں بھی دور ہو جائیں۔ علاوہ ازیں دیوان میر (نسخۂ محمود آباد) مرتبہ اکبر حیدری اور کلیات میر (نسخۂ نولکشور) میں شامل غیر متداول غزلوں اور اشعار کو کلیات میں داخل کیا گیا۔ اس طرح میر کے متداول کلام میں کچھ اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھیں اسباب کی بنا پر یہ اشاعت میر کے اب تک کے تمام مطبوعہ کلیات کے مقابلے میں عام طور پر سب سے زیادہ جامع اور قابل اعتماد سمجھی گئی ہے۔ میر کے کلام کی غیر معمولی اہمیت کے سبب اس نئی اشاعت کے پہلے ہم نے پورے کلیات پر نظر ثانی کا فیصلہ کیا اور طریقۂ کار بھی کم و بیش وہی اختیار کیا جو پہلی اشاعت کے دوران ہمارے پیش نظر تھا۔

عام خیال کے برخلاف کلام میر کا متن غیر معمولی غور و فکر، باریک بینی اور دقت نظر کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بیشتر حضرات میر کے متن کو حد درجہ سادہ اور سلیس سمجھتے ہیں۔ میر کے متن کی اصل حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب ہم اس سے سرسری نہیں گذرتے بلکہ ایک ایک لفظ (خواہ وہ سامنے کا ہی لفظ کیوں نہ ہو) کے صرف اور اس کے معنی و مفہوم کے مختلف جہات اور امکانات پر بغور نظر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ کلیات کی اس نظر ثانی کے دوران تمام کلام کو دوبارہ حد درجہ دقت نظر کے

ساتھ پڑھا گیا۔ یہ بات میرے لیے باعث اطمینان و مسرت ہے کہ کلیات کی نظر ثانی کے دوران بھی جناب شمس الرحمن فاروقی کی نگرانی اور رہنمائی میرے ساتھ رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں کی ایما پر ہم دونوں نے پورے کلیات کو از اول تا آخر پہلے الگ الگ نہایت غور سے پڑھا اور پھر متعدد اشعار کے تعلق سے کئی کئی نشستوں میں تفصیلی تبادلۂ خیال کر کے متن کی صحت کو مزید یقینی بنانے کی کوشش کی۔ اس کام کے دوران فاروقی صاحب نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ میر کا متن ایک غیر معمولی کیفیت کا حامل ہے جس کے ساتھ معاملہ کرنا بہت آسان نہیں۔ اس کلام کی نوعیت اور فطرت ہی ایسی ہے کہ یہ بآسانی قابو میں نہیں آتا۔ آپ غور کریں کہ یہ ایسے شخص کا اعتراف ہے جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ میر کے کلام پر غیر معمولی غور و فکر اور نہایت گہرے مطالعے میں صرف کیا ہے۔

جیسا کہ ہم گذشتہ ایڈیشن کے دیباچے میں عرض کر چکے ہیں، کلام میر کے متن کی اس کیفیت کا عملی تجربہ پہلے ایڈیشن کے کام کے دوران ہمیں ہو چکا تھا اور ہم نے پورے کلام کو شروع سے آخر تک اچھی طرح سے دیکھ ڈالا تھا۔ تاہم اس نئی اشاعت سے پہلے نظر ثانی کے دوران کمپوزنگ، طباعت اور کچھ دیگر تسامحات پر مبنی اغلاط کو درست کرنے کے باوجود ہم نے پورے کلیات کو دوبارہ بغور لفظ بہ لفظ پڑھنے کا اس لیے بھی فیصلہ کیا کہ اس بیچ کلام میر کی فرہنگ بنانے کا کام ہم شروع کر چکے تھے۔ چنانچہ فرہنگ نویسی کے اس کام کی بدولت میر کے متعدد اشعار کے معنی و مفہوم پر مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ چونکہ فرہنگ میں بطور لغت درج کرنے کی غرض سے خاصی تعداد میں ایسے الفاظ زیر غور آئے جن کے معنی اور صحت کی تحقیق کئی قدیم و جدید اردو اور فارسی فرہنگوں کو دیکھ کر کی گئی، لہٰذا اس طرح بھی اشعار کے متن کے تعلق سے مزید اطمینان بخش صورت سامنے آئی۔

کلام پر نظر ثانی کے دوران کلیات میر کی اولین اشاعت نسخۂ کلکتہ سے بھی کہیں کہیں مدد لی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، نسخۂ کلکتہ کی تاریخی اہمیت اس کے اولین اشاعت ہونے کی وجہ سے مسلم رہی ہے۔ لیکن جہاں تک ترتیب کلام، صحت متن اور طباعت کا تعلق ہے، اس نسخے کو اہل نظر نے پوری طرح قابل اعتبار نہیں سمجھا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں اگرچہ گیارہ صفحات پر مشتمل ''غلط نامہ'' بھی شامل ہے، اس کے باوجود دیگر بہت سے اغلاط اس کے متن میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے، ایسی صورت میں اس نسخے کے متن پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی جہاں کہیں ہمیں محسوس ہوا کہ کسی شعر کا متداول متن مخدوش معلوم ہوتا ہے یا اس سے پوری طرح شرح صدر نہیں ہوتا اور نسخۂ کلکتہ کا متن زیادہ اطمینان بخش ہے وہاں اس متن کو قبول کر لیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ پورے کلیات کے پیش نظر یہ صورت بہت کم ہی جگہوں پر عمل میں آئی ہے۔ اوپر بیان کردہ اسباب کی بنا پر ہم نے ہر جگہ نسخۂ کلکتہ کے متن کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا۔

زیر نظر کلیات کی اشاعتِ اول کے بعد جہاں ایک طرف اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، وہیں کچھ صاحبان ذوق نے اس کے بارے میں زبانی اور تحریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ ہم ان تمام حضرات گرامی کے ممنون ہیں جنھوں نے اس کام کی تحسین کر کے نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کی بلکہ کچھ ایسی فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کی طرف توجہ بھی دلائی جس سے نظر ثانی کے دوران ہمارے لیے مزید آسانی پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلی اشاعت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے جن لوگوں نے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی کی اور جن کی وجہ سے کلیات

میں موجود کچھ اغلاط کو درست کرنے کا ہمیں موقع ملا، ان میں زیادہ تر وہ اصحاب نظر ہیں جن کا رویہ ہمارے لیے ہمدردانہ اور مخلصانہ تھا۔ البتہ ان میں گنتی کے کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے چند اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ پورا کلیات اسی طرح کی غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان لوگوں کا عام انداز غیر ضروری عیب بینی اور خردہ گیری کا تھا۔ بہر حال ان لوگوں کی توجہات سے جو غلطیاں سامنے آئیں، انھیں بھی درست کر دیا گیا۔ اس کے لیے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں۔ ہم پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر محمد ذاکر اور ڈاکٹر عبدالرشید کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کا اظہار خیال عالمانہ اور ہمدردانہ تھا اور ان کی تحریروں کی روشنی میں کچھ ایسے مسامحے ہم نے درست کیے جن پر عام طور سے نگاہ نہ ٹھہرتی۔

میں اپنے استاد معنوی جناب شمس الرحمن فاروقی کا صد درجہ شکر گذار ہوں اور ان کے احسان سے خود کو ہمیشہ گراں بار محسوس کرتا رہوں گا۔ کلیات کی پہلی اشاعت کے دوران انھوں نے جس انہماک اور شوق کے ساتھ میری رہنمائی کی تھی، اشاعت ثانی کے دوران اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ ہر چند کہ اس مدت میں ان کی ناسازیِ طبع اور عدیم الفرصتی پہلے سے مستزاد تھیں، ان کی کرم فرمائیوں میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، بلکہ ان کا ہی مجھ پر اصرار رہا کہ اس کام کو جلد ختم کروں۔ میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ وہ فاروقی صاحب کو صحت مند رکھے تاکہ وہ اسی دلجمعی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا مشکور ہوں کہ ان کی توجہ سے یہ ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ قومی کونسل کے دیگر اراکین اور کارکنان بالخصوص پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر جناب نسیم احمد، مسرت جہاں صاحبہ اور جناب محمد عصیم کا شکریہ لازم ہے کہ مجھے ان تمام حضرات کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

احمد محفوظ

●●●

شمس الرحمٰن فاروقی

تمہید

محمد حسن عسکری نے ایک تقریر میں بڑی عمدہ بات کہی تھی کہ "لوگوں نے اردو کے ہر بڑے شاعر کی عظمت سے انکار کیا ہے، مگر میر کا منکر ڈھونڈے سے ہی ملے تو ملے"۔ انھوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا، ورنہ وہ اس سوال تک ضرور پہنچتے کہ ایسا کیوں ہے؟ میر میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ناسخ کی طرح سب ہی کہتے ہیں کہ ؎

شبہ ناسخ ہے کسے میر کی استادی میں آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

(خیال رہے کہ یہ مضمون، کہ سبھی میری استادی کے قائل ہیں، میر کا ہے ؎

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

یعنی میر کی عظمت کے معاملے میں سبھی لوگ میر کے ہم خیال ہیں)۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کی عظمت سے کسی نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے، تو یہ استدلال سراسر دوری (Circular) ہے، کیونکہ اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ میر کو خدائے سخن کہتے ہیں اس لیے کسی نے ان کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیانات محتاج ثبوت ہیں اور ان میں دعوے کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کا کلام ہر زمانے میں مقبول رہا ہے، تو بھی کوئی دلیل نہیں بنتی۔ مقبول تو ان شعرا کا بھی کلام رہا ہے، اور ہے، جن کی عظمت کے منکرین بھی موجود رہے ہیں۔ مثلاً اقبال کے کلام کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کے منکرین ہر زمانے میں رہے ہیں، کبھی اکادکا اور کبھی کثیر تعداد میں۔

جس تقریر کا میں نے ابھی ذکر کیا، اس میں محمد حسن عسکری نے اردو غزل اور فارسی غزل کے حوالے سے کچھ بہت بنیادی باتیں کہی تھیں۔ ان پر غور کیا جائے تو شاید اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مدد ملے کہ میر کی عظمت کا اقرار سبھی نے کیا تو کیوں کیا۔

یہاں سب سے پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ اردو غزل نے فارسی غزل کی مکمل تقلید نہیں کی، یعنی اردو کی غزل کو فارسی کی غزل کا محض تتمہ یا ضمیمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اس غلط رجحان کی ابتدا اٹھارویں صدی کی دلی میں فارسی پرستی کے جوش کے باعث پڑی بلکہ ایک مدت تک تو دلی والوں نے "ریختہ" اور "غزل" میں فرق کیا، یعنی "غزل" سے وہ مراد لیتے تھے فارسی غزل، اور ہندی (یعنی آج کے معنی میں اردو) غزل کو وہ "ریختہ" سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ قائم چاند پوری کے مشہور، بلکہ صحیح معنوں میں بدنام شعر میں "غزل" اور "ریختہ" کا وہی مطلب ہے جو میں نے اوپر بیان کیا ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

قائم کے اس شعر کی تاریخ متعین کرنا مشکل ہے، اغلب ہے کہ یہ شعر ۱۷۵۰ تا ۱۷۶۰ کی دہائی میں کہا گیا ہو۔ مصحفی کا

مندرجہ ذیل شعر ان کے آٹھویں دیوان میں ہے جس کی تاریخ ۱۸۲۰ کے کچھ بعد کی متعین کی گئی ہے۔ (مصحفی کا انتقال ۱۸۲۴ میں ہوا)۔

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل معتقد اب کوئی کیوں سعدی و خسرو کا ہو

مصحفی کے اس مقطعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک بھی دلی والے فارسی کی ہی غزل کو ''غزل'' کے نام سے سرفراز کرتے تھے۔ لیکن مصحفی کے شعر میں خودستائی اور در مدح خود کے علاوہ ایک طرح کی شکایت بھی ہے کہ یار لوگ اب بھی اردو کو نقلی اور فارسی کو اصلی مال قرار دے رہے ہیں، جبکہ میں نے ''ریختہ'' کو فارسی سے بڑھا دیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی خاطرنشیں رہے کہ یہاں وہ دو نام لاتے ہیں (سعدی و خسرو)، یہ دونوں فارسی کے مسلم الثبوت بڑے شاعر ہیں، لیکن ان میں سے ایک ہندوستانی ہے، یعنی وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ ''غزل'' (یعنی فارسی غزل) بھی ساری کی ساری ایرانیوں کی جاگیر نہیں ہے۔

بہرحال، مصحفی کا آٹھواں دیوان مدت مدید تک عرصۂ خفا میں رہا، اور لوگوں کو یہ بات نہ معلوم ہوسکی کہ مصحفی نے خود کو سعدی و خسرو سے بڑھ کر بتانے میں صرف ڈینگ نہیں ہانکی تھی، بلکہ میر کی پچھتر برس پرانی بات کا جواب بھی دیا تھا کہ ریختہ کی شاعری وہ شاعری ہے جو زبان اردوے معلاے شاہجہاں آباد میں ہو، اور بطرز فارسی ہو۔ یعنی مصحفی یہ کہہ رہے تھے کہ ہم (ریختہ والوں) نے اپنی راہ الگ نکالی ہے، یا کم سے کم اپنا تشخص الگ قائم کیا ہے، ہم فارسی کا دم چھلا نہیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مصحفی کا یہ دیوان اور ان کا یہ شعر اگر متداول بھی ہوجاتا تو ہم لوگوں کو کچھ فرق نہ پڑتا۔ یہ بات ہماری تنقید میں کسی نہ کسی مفہوم میں بہرحال عام رہی ہے کہ اردو کی غزل محض ''ریختہ'' (پڑی گری) ہے جب تک وہ ''غزل طور'' (فارسی کے طرز و انداز کی) نہ ہو۔ محمد حسن عسکری اسی غلط رائے کے خلاف ہمیں متنبہ کر رہے تھے جب انھوں نے متذکرہ بالا تقریر میں کہا کہ اردو شاعری نے فارسی کی آواز سے آواز نہیں ملائی، اور ''ممکن ہے یہ مجبوری یا ناکامی بھی ہو، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے شاعروں نے آواز سے آواز ملانے کی پوری کوشش ہی نہ کی ہو''۔ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ عسکری جب ''آواز سے آواز ملانے'' کی بات کرتے ہیں تو وہ فارسی کے مضامین، استعاروں اور تلمیحات کی بات نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اوپری چیزیں ہیں۔ یونانی المیہ کی ظاہری رسومیات کی سخت پابندی کے باوجود ملٹن نے ''شمسون مبارز'' (Samson Agonistes) کے روپ میں انگریزی ہی ڈراما تخلیق کیا۔ یونانی تو شاید اسے ڈراما ہی نہ تسلیم کرتے۔ اور یونانی مضامین اور استعاروں کو استعمال کرکے ٹامس گرے (Thomas Gray) کی ''بطرز پنڈار'' نظمیں (Pindaric Odes) یونانی نہیں ہوگئیں۔ لہٰذا وہ اردو اور فارسی شاعری کی بنیادی روح میں اختلاف کی بات کرتے ہیں۔ عسکری کہتے ہیں کہ اردو کے ادیب ''کی روحانی کاوش کا مرکز دوسرا تھا''۔

اس نکتے کی تفصیل عسکری نے ان الفاظ میں لکھی ہے: ''اردو شاعری اور اردو نثر دونوں میں روزمرہ کی معمولی زندگی کا احساس بہت قوی ہے۔ اس کی شہادت میر، مصحفی، درد کے کلام میں مل سکتی ہے اور ''باغ و بہار'' اور ''طلسم ہوش ربا'' میں بھی... روزمرہ کی زندگی کے احساس سے پیچھا چھڑانا ان کے بس کی بات نہ تھی... خالص جذبے کو اپنانا ان سے ممکن نہیں تھا۔ وہ جذبے کو اس کے دور دراز مناسبات، متعلقات اور پس منظر سے الگ نہیں کرسکتے''۔ دوسرے الفاظ میں، اردو کا شاعر رسومیات کا کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو اور لگے بندھے مضامین میں نئے نئے پیوند اور پہلو لگانے کا کتنا ہی شائق ہو، لیکن وہ دنیا

کو، اس کی بظاہر معمولی چیزوں کو بھی وہی اہمیت دیتا ہے جو بالعموم مابعدالطبیعیاتی، ماورائی یا ''آفاقی'' چیزوں کے لیے مختص رکھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب تیسرے درجے کی اضافیت (Relativism) نہیں، کہ تمام چیزیں برابر ہیں، صحت اور اہمیت کے اعتبار سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر خوب ہے۔ آپ بھی ٹھیک ہم بھی ٹھیک، چلیے جھگڑا ختم ہوا۔ یہ رویہ تو دیوالیہ پن یا بددیانتی کا آئینہ دار ہے۔ ''معمولی'' باتوں سے بھی بڑے بڑے نتائج نکالے جاسکتے ہیں، اور بعض اوقات ''بڑی'' باتوں کے معنی اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب انھیں معمولی، روزمرہ زندگی میں اٹھنے والی، چھوٹی موٹی اشیا وکوائف کے تناظر میں رکھا جائے۔

میر کے دیوان اول سے حسب ذیل شعر محمد حسن عسکری نے اپنے ایک اور مضمون (مطبوعہ ۱۹۴۷) میں نقل کیا ہے۔

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے　　رومال دو دو دن تک جوں ابرتر رہے ہے

عسکری صاحب نے اس شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ ایسا شعر تخیل اور شعریت کی انتہائی بلندیوں ہی پر پہنچ کر کہا جاسکتا ہے اور اس شعر میں جو المیہ ہے وہ رونے کے ذکر سے نہیں، بلکہ رومال کے ذکر سے ہے۔ بات بالکل صحیح ہے، لیکن عسکری صاحب اس بات کو شاید نظرانداز کر گئے تھے کہ رومال کا مضمون میر سے بہت پہلے ولی باندھ چکے تھے۔ ولی کا شعر ہے۔

نہ پوچھو عشق میں جوش وخروش دل کی ماہیت　　برنگ ابر دریابار ہے رومال عاشق کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کا شعر ولی کے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ ولی نے مضمون نیا نکالا، پھر بہت سجا کر شعر کہا۔ مناسبت الفاظ غضب کی ہے: جوش، خروش، ماہیت، رنگ، ابر، دریا، دریابار، تمام لفظ آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور معنی و انسلاکات کی نئی دنیائیں ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ لیکن ولی کو اولیت کا شرف ہونے کے باوجود ان کے شعر میں وہ انسانی پہلو نہیں ہے جس نے میر کے شعر کو اس قدر بلند رتبہ کردیا ہے۔ بجا کہ رومال کا مضمون ولی نے دریافت کیا، لیکن رومال کا ابر دریابار کے رنگوں تر دکھانا رسومیاتی معاملے کو مبالغے یعنی استعارے کے عالم میں ڈال دینا ہے۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے، لیکن میر اس سے بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں کہ استعارے کے عالم کو روزمرہ کے عالم میں ڈال دیتے ہیں۔ رومال کا ''دو دو دن تک'' تر رہنا کس قدر گھریلو اور مانوس بیان ہے۔ مبالغہ ہے لیکن مبالغہ معلوم نہیں ہوتا، خاص کر جب ''رونے بیٹھتا ہوں'' کہا جارہا ہے۔ یعنی جہاں بہت سے کام ہیں وہاں رونا بھی ایک کام ہے۔ کبھی ہم کوئی کام انجام دیتے ہیں، کبھی کوئی کام کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ انسانی المیے کی وہ منزل ہے جہاں عاشق کی ناکامیاں اور مایوسیاں دنیا کے روزمرہ، عام، بلکہ عامیانہ کاموں میں گھل مل جاتی ہیں، حل ہوجاتی ہیں۔ یہ کوئی چھپ چھپ کے رونا نہیں ہے جو حسرت موہانی نے ہمیں سکھایا تھا۔ میر جس دنیا سے ہمیں روشناس کراتے ہیں وہاں عشق زندگی کی ظاہر و باہر حقیقت ہے۔ یہاں عشق ایسا کام نہیں جو شرمندہ ہونے یا احساس گناہ میں مبتلا ہوکر گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور کرے۔

مندرجہ بالا تجزیے کی روشنی میں دیکھیں تو میر کے رونے میں مقامی اور آفاقی حقیقتیں ایک ہونے لگتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار پر غور کریں۔

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب　　اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا حضرت بکا کیا ۔ کرو رات کے تئیں

بکائے شب و روز اب چھوڑ میر نواح آنکھوں کا تو ورم کر گیا

آخری شعر کے ساتھ اسی غزل کا یہ شعر بھی دھیان میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ میر نے عشق کی حقیقت کو عام انسان کی دسترس سے کس قدر نزدیک کر دیا ہے۔

مرے مزرع زرد پر شکر ہے کل اک ابر آیا کرم کر گیا

عشق ایسا تجربہ ہے، بلکہ ایسی زندگی ہے جو معمولی معمولی سینکڑوں زندگیوں پر بھاری ہے۔ اس کے نشیب و فراز، اس کے بلند و پست، اس کا قبض و انبساط، یہ سب کئی کئی تجربات و حوادث کا آئینہ ہیں۔ لیکن انسان ہی یہ عشق جھیلتے اور بھوگتے ہیں، فرشتوں کا یہ کام نہیں۔ عشق انسانی حقیقت ہے، اور میر اسے انسان کی طرح برتتے اور اسی میں جیتے اور مرتے ہیں۔ اوپر جو شعر میں نے نقل کیا ہے، اس کے ٹھیک اوپر مندرجہ ذیل شعر ہے۔

شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند تن زار میرا بھسم کر گیا

قافیے کی شوکت دیدنی ہے، لیکن یہ بھی دیکھیے کہ بظاہر اختلاف کے باوجود دونوں اشعار میں اتحاد کتنا ہے۔ دل سے وہ شعلہ اٹھا جس نے تن ضعیف و زار کو بھسم کر دیا اور آسمان سے کہیں گھومتا پھرتا ایک ابر آیا جس نے اس زرد و خشک کھیتی کو نہال کر دیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابر کا آنا اور نہال نہال کرنا ''کرم'' تھا، اور دل سے اٹھنے والا شعلہ گھر کا بھیدی تھا، اسے تو دل کو بھسم کرنا ہی تھا۔ تو یہ سب معاملات ایک ساتھ ہوتے رہتے ہیں اور ہم انسانوں کا وجود، بلکہ ہمارا انسان پن، انھیں کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ۔

میر خلاف مزاج محبت موجب تلخی کشیدن ہے یار موافق مل جاوے تو لطف ہے چاہ مزا ہے عشق

کے باوجود، یا شاید اس کے سبب، عشق کو میر نے عام کاروبار زندگی کے درجے پر متمکن کر دیا۔ یار اگر موافق نہ ہو تو زندگی زیادہ مشکل گذرتی ہے، لیکن جگر چاکی اور ناکامی خود برابر ہیں انسان کی عام زندگی کے۔ چاہ کے لطف اور عشق کے مزے کے باوجود۔

جگر چاکی ناکامی دنیا ہے آخر نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

اب شاید یہ بات کچھ صاف ہونے لگی ہوگی کہ زندگی کی عام باتوں میں الیاتی قوت اور ماورائی معنی دیکھ لینے کا عمل میر کے یہاں کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے اور اب یہ نکتہ بھی روشن ہونے لگا ہوگا کہ اردو کا شاعر، خاص کر میر کے درجے کا شاعر صبح و شام کی معمولہ زندگی کو کس طرح اور کن معنی میں اپنے شعر میں ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ہم لوگ اپنے گرداگرد پھیلی ہوئی سچائیوں سے زیادہ گرد و پیش کے مناظر کے دلدادہ رہے ہیں۔ ہماری نظر میں نظیر اکبر آبادی ایسے شاعر ہیں جو ''عام زندگی'' کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہم لوگ ''میلے ٹھیلے'' کے ذکر کو عام زندگی کا ذکر سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ میلہ ٹھیلہ عام زندگی کا حصہ نہیں، تماشا ہے، جو کبھی ہوتا ہے تو کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اس کے موسم ہیں، وقت ہیں، ٹھکانے ہیں۔ یہ سب چیزیں بھی حقیقی ہیں، لیکن یہ عام زندگی کا چھوٹا سا حصہ ہیں، روز کے معاملے نہیں۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے اسی لیے کہا گیا تھا۔

میر نے جس طرح روزمرہ، بول چال کی زبان کو شعر کی زبان کا رتبہ بخش دیا تھا، اسی طرح انھوں نے روزمرہ کی بے رنگ زندگی کو مابعدالطبیعیاتی اور ماورائی دنیاؤں کے عالم میں بدل دیا۔

لے جایئے میر اس کے دروازے کی مٹی بھی — اس درد محبت کی جو کوئی دوا جانے
ناصح نہ روئیں کیونکہ محبت کے جی کو ہم — اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے
جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھے ہو سہل — ہمیں بھی یہ جینا ہے دشوار سا
دکھاؤں متاع وفا کب اسے — لگا واں تو رہتا ہے بازار سا
کس کی خوبی کے طلبگار ہیں عزت طلباں — خرتے بکنے کو چلے آتے ہیں بازار کے بیچ
پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا — یاں کبھو اس کا یوں گذارا تھا
مل اہل بصیرت سے کچھ دے ہی دکھادیں گے — لے خاک کی کوئی چٹکی اکسیر بنادیں گے

یہ معمولی شعر نہیں ہیں، لیکن کلیات میر میں یہ معمولی ہیں۔ اور انھیں کی مدد سے اندازہ لگانا چاہیے کہ جہاں مناسبت اور رعایت، رمز و کنایہ، معنی پروری، طنز و اشارہ کا یہ وفور معمولی اشعار میں ہو، وہاں عالی رتبہ شعروں کا کیا رنگ ہوگا۔ لیکن یہ شعر یہاں میں نے کسی اور مطلب سے نقل کیے ہیں۔ آپ ملاحظہ کریں کہ ان شعروں میں عام زندگی کے معاملات، رہن سہن، بات چیت، بحث مباحثہ، خرید و فروخت، تنگی و فراخی، ان چیزوں کو مضمون بنایا گیا ہے، یا مضمون کو ان کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اشعار میں نے کچھ تو حافظے سے اور کچھ کلیات کے ورق الٹ پلٹ کر حاصل کیے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے بعض شعرا کے کلیات میں اس رنگ و کیفیت کے اشعار ملیں گے، مگر میر سے کم۔ اور بعد کے شعرا کے یہاں تو میدان خالی ہی ملے گا۔ مصحفی اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان پل کی طرح ہیں، ان کے یہاں بھی یہ رنگ مل جائے گا، لیکن اتنے تنوع کے ساتھ نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ میر کو جتنی اور جیسی دلچسپی اس بظاہر سادہ اور سرسری، غیر دانشورانہ، غیر تعقلانہ زندگی اور اس کے مظاہر سے ہے، وہ کسی اور شاعر کو نہیں۔ اور اس زندگی اور اس کے مظاہر سے جتنے معنی میر نے نکالے ہیں وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھے۔

میر کے نام نہاد ''بہتر'' نشتروں کا ذکر بہت کیا گیا ہے، اور افسوس کہ یہ ذکر اب بھی کہیں کہیں سننے میں آجاتا ہے۔ بھلا ستر برس کی مشق سخن، علم و فضل و تجربہ، غور و تفحص، اور آخری عمر تک شعر گوئی کی صلاحیت ویسی ہی برقرار رہنا جیسی کہ اوائل ریعان میں تھی، ان سب کو بہتر نشتروں میں کون سمیٹ سکتا ہے؟ اپنے سرمائے کی جو ناقدری ہم نے روا رکھی ہے اور تاریخ کو ہم جس طرح جھٹلاتے رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ہم نے اپنے سب سے بڑے شاعر کی کائنات کو ہفتا دو دو ابیات میں محصور سمجھ لیا۔ بہتر نشتروں کے ایک دو مجموعے بھی میری نظر سے گذرے ہیں۔ یہی محسوس ہوا کہ ان بزرگوں نے بہتر نشتر ڈھونڈنے کا کام کسی فرض کی طرح نبھایا ہے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس قدر مارے باندھے انداز میں تو وہی فرض نبھایا جاتا ہے جس میں ہمارا دل نہ ہو، بس عقیدہ ہو، جیسے ہم میں سے اکثر کے لیے ٹھنڈے ٹھار موسم میں فجر کی نماز کے لیے اٹھنا اور سرد پانی سے وضو کرنا۔ معلوم ہوا بہتر نشتروں کا تصور عقیدہ بن کر ہمارے شعور میں جاگزیں ہوگیا ہے۔

مثال کے طور پر، فاضل مشہدی صاحب نے میر کے بہتر نشتروں کا ایک مجموعہ ۱۹۳۰ یا ۱۹۳۸ میں شائع کیا۔ جو نسخہ میرے سامنے ہے اس پر طباعت کی تاریخ نہیں پڑی ہے، لیکن مصنف کے دیباچے کی تاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ درج ہے۔ اس کتاب میں تین شعر ایسے ہیں جو مجھے میر کے کلام میں کہیں نہیں ملے۔ لہٰذا انتخاب میں بہتر کی جگہ انہتر ہی شعر رہ گئے۔ یہ سب شعر نشتر ہیں کہ نہیں، اور اگر نشتر ہیں تو نشتر آبدار ہیں کہ نہیں، ان سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اشعار کی شرحیں دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اشعار، یا مضمون کے "نیچرل" ہونے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اس انتخاب میں میر کے ساتھ کتنا انصاف کیا گیا ہوگا۔

یہ بات یہاں میں نے کئی وجہوں سے اٹھائی ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے انتخاب میں بہتر شعر ہوں یا سات ہزار دو سو شعر ہوں، کوئی انتخاب میر کی وسعت اور ان کے کیف و کم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ کہ انتخاب کنندہ چاہے کتنا ہی دیانت دار کیوں نہ ہو، اپنے تعصبات سے بہ تمام و کمال دامن کش نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ گذشتہ سو سوا سو برس سے ہمارے عام اساتذہ اور اصحاب رائے کا تعصب "نیچرل شاعری" کی پوری موافقت میں، اور کلاسیکی شاعری کی محض مشروط موافقت میں کام کرتا رہا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ میر انتخاب کے شاعر ہیں۔ انتخاب کے شاعر نظیر اکبرآبادی اور مصحفی اور آتش و ذوق ہیں۔ غالب بھی انتخاب کے شاعر ہیں۔ ان سب شعرا کو انتخاب سے فائدہ پہنچے گا یا پہنچ چکا ہے۔ غالب کی مثال سامنے کی ہے۔ میر انیس اور اقبال کی طرح میر کلیات کے شاعر ہیں۔

یہاں میر انیس کے ذکر سے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ افسوس کہ انیس کے تمام کلام کا متن پوری طرح متعین اور مدون نہیں ہوا ہے، لیکن جو بھی مرثیہ میر انیس کا آپ پڑھیں، آپ کو محسوس ہوگا کہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ مرثیہ انیس کے ان تمام مرثیوں سے مختلف ہے جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور مختلف ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں گذشتہ مرثیوں سے مختلف کردار یا روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ میر کا بھی یہی معاملہ ہے کہ ان کے کسی شعر کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بیکار ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوگا کہ اکیلا شعر واہیات معلوم ہوگا لیکن جب اسے غزل میں رکھ کر دیکھیں گے تو گرد و پیش کے اشعار کی وجہ سے اس میں کوئی لطف، یا معنویت نظر آ جائے گی۔ کبھی کبھی (بلکہ شاید اکثر) ایسا ہوگا کہ اکیلا شعر انتہائی زبردست معلوم ہوگا، لیکن آپ جب اسے غزل یا دیوان میں رکھ کر دیکھیں گے تو گرد و پیش ایسے بہت سے شعر ملیں گے جو اس سے ذرا انیس یا ذرا بیس ہوں گے اور وہی شعر جو تنہا آپ کو بے حد غیر معمولی لگ رہا تھا اب تاروں کے جھرمٹ میں ایک تارا دکھائی دے گا اور پھر آپ کو اس بات پر تعجب نہ ہوگا کہ دیوان یا کلیات کا مطالعہ کرتے وقت وہ شعر آپ سے نظر انداز ہو گیا تھا۔

ایک مدت ہوئی میں نے لکھا تھا کہ میر کے خراب شعر بھی اہمیت رکھتے ہیں، کہ وہ میر ہی کی طرح کے خراب شعر ہیں، ہما شما کی طرح کے خراب شعر نہیں ہیں۔ محمد حسن عسکری نے ایک اور بات کہی تھی کہ میر کے خراب شعر کے بارے میں بھی غور کر لینا چاہیے کہ شاعر نے اس میں دنیا کا کون سا تجربہ، زندگی کے بارے میں کون سی بات رکھ دی ہے۔ عسکری صاحب کا نکتہ درست تو ہے، لیکن وہ ہمیں بہت دور تک نہیں لے جاتا، کیونکہ اٹھارویں صدی کے کم و بیش ہر اردو شاعر نے زندگی کے براہ راست تجربے پر مبنی باتیں کثرت سے کہی ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ میر کے کون سے شعر آج کے مذاق پر گراں گذرتے ہیں۔ (یہ بات دیگر ہے کہ آج کے لوگوں کا مذاق انگریزی سے متاثر ہے، اس معنی میں کہ لفظ سے زیادہ خیال پر

زور دینا ہم نے بزعم خود مغرب سے سیکھا ہے۔) خیر، تو جب ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈیں کہ میر کے کون سے شعر آج کے مذاق کو ناگوار ہیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سب شعر وہ ہیں جن کا مضمون نئے مذاق پر بار ہوتا ہے، یعنی آج کے لوگ میر کے ان شعروں کو ناپسند کرتے ہیں جو ان کے خیال میں سفیہانہ، یا عامیانہ، یا پیش یا افتادہ مضامین پر مبنی ہیں، یا ان میں رعایت لفظی یا تصنع ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو رعایت لفظی اور تصنع والی بات بھی مضمون کی ہی متابعت میں ہے، کیونکہ جن اشعار کا مضمون لوگوں کو پسند آتا ہے ان میں اگر رعایت (یا بقول بعض تصنع) وغیرہ بھی ہو تو آج کے لوگ اسے نظر انداز کردیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مندرجۂ ذیل شعر کے دونوں مصرعوں میں ''دیکھنا'' کو بطریق ایہام برتا گیا ہے، لیکن اس شعر کو سب پسند کریں گے، اور شاید ہی کوئی اعتراض کرے گا کہ اس شعر میں ایہام جیسی ''قبیح'' صنعت استعمال ہوئی ہے۔

سنتے تھے کہ جاتی ہے ترے دیکھنے سے جاں — اب جان چلی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں ہائے

اب ایک اور شعر دیکھیے، آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اسے دیکھ یا سن کر لاحول نہ پڑھے۔

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر — اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے

سبھی کہیں گے، صاحب کیا پست مضمون ہے، اور کیسی بھونڈی رعایت لفظی ہے، ''پلیتھن'' اور ''ٹکی'' کتنا برا معلوم ہوتا ہے، وغیرہ۔ لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ رعایت اس لیے بری لگ رہی ہے کہ مضمون ہمارے من پسند نہیں۔ اب ذرا رک کر مزید غور کریں۔ کیا ضرور ہے کہ اسے عاشق صادق کی ناکامی اور نارسائی اور رقیب بوالہوس کی کامیابی اور رسائی پر مبنی ''درد ناک'' شعر قرار دیا جائے؟ یہ شعر مزاحیہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ اور اگر اسے مزاحیہ قرار دیں تو اس حیثیت میں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو معنی آفرینی کا پہلو ہے، کہ ''پلیتھن نکل جانا'' بمعنی ''برا حال ہونا'' اور ''پلیتھن پکانا'' بمعنی ''تباہی کا سامان کرنا، یا تباہ کر ڈالنا'' ہیں، اور ''ٹکی لگانا'' بمعنی ''تعلق قائم کرنا، مطلب حاصل کرنا'' ہے۔ لہٰذا دونوں محاوروں کو مزاحیہ رنگ میں برتا گیا ہے۔ اور دوسرا پہلو خود پر ہنسنے کا ہے، کہ اپنی زبوں حالی، بیچارگی اور نارسائی کے مقابلے میں رقیب کی کامگاری ہے، لیکن اسے اس طرح بیان کیا ہے گویا یہ بات موجب ظرافت ہو۔

اب وہی بات سامنے آتی ہے کہ میر کے خراب شعر بھی ہیں تو وہ میر ہی کی طرح کے ہیں۔ مثلاً میر کے یہاں ڈھیلی، سست بندش والا شعر ایک نہ ملے گا۔ نہ ہی میر کے پورے کلیات میں آپ کو دولخت شعر ملے گا، نہ ایسا شعر ملے گا جس میں ایک مصرع بہت عمدہ ہو اور دوسرا پھسپھسا ہو۔ اسی طرح، بھرتی کے الفاظ میر کے اکادکا شعر (خاص کر غزل کے شعر) میں ملیں تو ملیں۔ اس کے لیے آپ کو بہت کاوش کرنی ہوگی۔ میر کے یہاں آپ کو کمزور یا نامناسب استعارے اور تشبیہیں نہیں ملیں گی۔ اور حُسن یا روانی سے عاری، بلکہ کم روانی والا شعر تو میر کے یہاں آپ کو ساری عمر کی تلاش کے بعد بھی نہ ملے گا۔ کہنے کو تو یہ بات آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ میر کے یہاں پست و بلند بہت ہے، لیکن اس بات پر توجہ نہیں ہوتی کہ خالص فن شعر کے اعتبار سے دیکھیں تو میر کا شعر خال خال ہی ایسا ہوگا جسے عیب دار کہا جاسکے۔ اور ان عیب دار شعروں میں بھی بعض ایسے ہوں گے جن میں سقوط عین یا سقوط ہائے ہوز ہے، جو اس زمانے میں اگر عام نہیں تو جائز ضرور تھا۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ میر کے زمانے میں جو خوبی کے معیار تھے ان میں سے کچھ کو ہم نے جدید فیشن کے زیر اثر ترک کردیا۔ یا یوں کہیں کہ اپنے احساس شعر سے خارج کردیا۔ اپنے کچھ نئے معیار بھی ہم نے میر، اور میر ہی کیوں تمام کلاسیکی شعرا پر جاری کردیے۔ فاضل مشہدی ہزار سادہ رہے ہوں لیکن وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھے۔ انھوں نے لکھا ہے میر

کے زمانے میں تو ''اشعار عموماً محاورہ بندی، ایہام گوئی، درستی زبان' پر مبنی کہے جاتے تھے،''مگر آج جس بات پر لوگ جان دیتے ہیں وہ نیچرل شاعری ہے''۔ لہٰذا ہم لوگوں نے میر کو اپنے معیاروں پر جانچا، اور اس کارگذاری سے میر کا کچھ نقصان تو ہوا، لیکن زیادہ نقصان ہم ہی لوگوں کا ہوا۔ میر کا تو نقصان صرف اتنا ہوا کہ کوئی سو برس سے ان کے بارے میں یہ جھوٹ مشہور ہوگیا کہ ان کا بہت سارا کلام ''پست'' (یعنی نیچرل شاعری اور ''حقیقت نگاری'' کے معیاروں سے ساقط) ہے۔ اس افواہ کو تقویت ایک اور افواہ سے ملی کہ شیفتہ جیسے جید آدمی نے میر کا محاکمہ یوں کیا ہے کہ ''پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند''۔ شیفتہ نے لکھا تو یہ تھا (اور وہ بھی آزردہ کے حوالے سے) کہ ''پستش اگر چہ اندک پست اما بلندش بسیار بلند'' (ملاحظہ ہو ''گلشن بیخار''، مطبوعہ دہلی، ۱۹۴۳، صفحہ ۱۴۹)، لیکن افواہ جتنی جھوٹی ہو اتنی ہی توانا اور دیرپا ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ آج اگر چہ آزردہ/شیفتہ کا صحیح قول بار بار نقل کیا جاچکا ہے، پھر بھی عام خیال یہی ہے کہ شیفتہ نے میر کے بارے میں ''پستش بغایت پست'' لکھا تھا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، میر کے بارے میں غلط تنقیدی رائے کی شہرت نے میر کو ذرا ہی سا نقصان پہنچایا۔ ''پستش بغایت پست'' کی شہرت کے باوجود میر بہرحال خدائے سخن کی مسند پر متمکن رہے۔ اور عینی طور پر دیکھیے تو ان کے کلام کا رتبہ اس رائے کی وجہ سے پست تو ہوا نہیں، وہ تو وہیں کا وہیں کلیات میں محفوظ، اور کسی اچھے شعر فہم کا منتظر رہا۔ لیکن ہم لوگوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ ہم نے میر کے بہت سے اشعار کو سمجھا ہی نہیں، اور بہت سے اشعار کو غلط سمجھا۔ ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ رطب و یابس کی کثرت اور کلیات کی طوالت کے (بے بنیاد، لیکن حقیقی) خوف کے سبب ہم لوگوں نے میر کا کلیات پڑھا ہی نہیں، اور اس طرح ان کے بہت سے نہایت عمدہ شعر (یعنی ایسے شعر جن کا جادو ہمارے تعصب کے باوجود سر پر چڑھ کر بولتا) ہماری نظر سے اوجھل رہے۔ ناصر کاظمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب وہ میر کے اشعار اپنے احباب کو سناتے تو لوگ متعجب ہوکر پوچھتے کہ یہ شعر کون سے انتخاب میر میں ہیں؟ اثر لکھنوی، محمد حسن عسکری، سردار جعفری اور خود ناصر کاظمی کے انتخابات نے میر کے بارے میں صحیح تر تنقیدی رویوں کو پروان چڑھانے میں مدد کی، لیکن انتخاب پھر انتخاب ہے، اور میر بہرحال کلیات کے شاعر ہیں۔ یہاں یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ میر کا کوئی اچھا کلیات بھی بازار میں نہ تھا جس سے شائقین مستفید ہوسکتے۔ ہمیں ظل عباس عباسی مرحوم کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے غزلوں کا بڑی حد تک معتبر کلیات ۱۹۶۸ میں علمی مجلس دہلی سے شائع کیا۔ اسی کو مزید اصلاح و درستی کے بعد ترقی اردو بورڈ، حکومت ہند (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، نئی دہلی نے چھاپا، اور اب اس کا نیا ایڈیشن مزید تصحیح و اضافہ کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اب اس سوال پر کچھ مزید غور ہوسکتا ہے کہ میر نے ہر کس و ناکس سے اپنی عظمت کا لوہا کیونکر منوایا۔ ایک بات تو یہی ہے کہ ''خدائے سخن'' کا خطاب جو انھیں جمہور اردو نے نئے زمانے کے پہلے عطا کیا تھا، وہ بہرحال قائم رہا۔ کسی نے اس بات میں شک کیا ہو تو کیا ہو کہ میر خدائے سخن واقعی ہیں کہ نہیں، لیکن میر ہمارے عظیم شاعر ہیں، اتنا تو انھوں نے بھی تسلیم کیا جو میر کو خدائے سخن ماننے میں تردد رکھتے۔ لیکن یہ بات تو ادبی تہذیب اور ادبی معاشرے کی نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور خدائے سخن والی دلیل میں دور لازم آتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا کیا کوئی معروضی باتیں بھی میر کی عالم گیر مقبولیت کے سلسلے میں کہی جاسکتی ہیں؟

تو یہاں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ میر کے کلام کا انتخاب بنانے والوں کی ناانصافیوں یا تعصب کے باوجود یہ بات ظاہر اور ثابت رہی کہ روزمرہ کے معاملات حیات کو برتنے کے ساتھ ساتھ عشق کی زندگی جینے سے جو سروکار میر نے رکھا، اور چھوٹی

چھوٹی باتوں سے بڑے مطالب میر نے جس طرح نکالے، وہ بات اوروں کے یہاں نہیں ہے، اور اگر کسی کے یہاں ہے بھی (مثلاً میر اثر اور میر حسن کی غزلوں میں) تو اس تنوع اور رنگارنگی سے نہیں ہے۔ میر کا کلام پڑھیے تو لگتا ہے یہ باتیں اسی لیے خلق ہوئی تھیں کہ میر کے شعر میں انھیں جگہ ملے۔ مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتخاب بہت اچھا نہیں ہے، اگر چہ یہ اولین اشاعت (۱۹۳۷) سے لے کر آج تک بہت مقبول رہا ہے۔ بابائے اردو کے انتخاب میر کی ورق گردانی کریں تو شروع کے دس صفحوں میں ہی اس طرح کے شعر بے تکلف دکھائی دیتے ہیں۔

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

تھے برے مغبچوں کے تیور لیک شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

ان میں سے پانچویں کے علاوہ کوئی شعر ایسا نہیں جسے بڑا شعر کہہ سکیں۔ لیکن ان سب شعروں میں یہ غیر معمولی بات ہے کہ وہ ایسی باتوں پر مبنی ہیں جو عام گفتگو، تبادلۂ خیال، آپس کی رائے زنی کے دوران سنائی دیتی ہیں۔ کوئی مضمون دور کا نہیں ہے، لہجہ عام بول چال کے بہت قریب ہے، اور ایک لمحے کے لیے یہ بھول جائیں کہ یہ بیانات وزن میں ہیں (یعنی بحر و وزن کے اعتبار سے ''موزوں'' ہیں) تو یہ ایسے جملے معلوم ہوں گے جو ہم اپنے معاشرے میں روزانہ بولتے اور سنتے ہیں۔ اور پھر بھی یہ شعر ہیں، بلکہ بابائے اردو (اور لاتعداد پڑھنے والوں) کی رائے مانی جائے تو بہت اچھے شعر ہیں۔ میر کے کلیات غزل میں کوئی پندرہ ہزار شعر ہیں۔ بابائے اردو کے انتخاب غزلیات میں کوئی اٹھارہ سو شعر ہیں۔ لہٰذا یہ انتخاب خاصا سخت ہے، اور اس انتخاب کی رو سے مندرجہ بالا اشعار میر کے بہترین شعروں میں ہیں۔ چلیے اتنا نہ سہی، یہ تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اچھے، اوسط درجے کے شعر ہیں۔ تو ذرا کسی اور کا کلیات دیکھ ڈالیے، کس کے کلام میں اتنی کثرت سے ایسے شعر ملیں گے جو نک سک سے درست ہوں اور جن میں ایسی باتیں ہوں جنھیں ہم پہچان سکیں کہ ہمارے گرد و پیش اٹھنے والی باتیں ہیں؟ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کچھ بھی لکھا ہو، کہ میر کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کی کھڑکی کے پیچھے باغ ہے، لیکن یہ شعر اس شخص کے کہے ہوئے ہیں جسے عام انسانی زندگی اور عام لوگوں کی معاشرتی اقدار سے اتنی دلچسپی ہے کہ یہ چیزیں اس کے کلام میں جابجا چمک اٹھتی ہیں۔ ان شعروں کے خالق سے مجلسیں اور محفلیں بھی اتنی ہی آباد رہی ہیں جتنے کہ خلوت خانے اور حبس دم کے حجرے اس کے وجود سے گرم رہے ہیں۔

آج کل لوگ اکثر پوچھ دیتے ہیں، صاحب، اس شاعر نے ہمارے لیے کیا پیغام دیا ہے؟ میر کے زمانے میں میر سے یہ سوال پوچھا جاتا تو وہ تیوری پر بل لاتے اور چپ رہتے۔ لیکن اگر وہ آج ہوتے اور اس کلیات کی رسم اجرا کے موقعے پر کوئی جیالا ان سے پوچھ ہی بیٹھتا تو ان کا جواب شاید یہ ہوتا کہ ہم نے مجلس آفاق بھی گرم کی، جل بھی بجھے، اور اسی جل بجھنے میں اپنی شام کو سحر کر دیا۔ ہو سکے تو تم بھی یہی کر دیکھو۔

●●●

رشید احمد صدیقی

تعارف

میں خدا کی تسبیح و تمجید کے بغیر خدا کی عظمت کا قائل ہوں اور شاید ان لوگوں سے زیادہ جو ایسا کرتے رہتے ہیں! ناسخ کی شاعری کا نہیں بلکہ ناسخ کا جو تھوڑا بہت لحاظ کرتا ہوں تو اسی وجہ سے کہ انھوں نے میر کے بارے میں یہ آخری بات کہہ دی یعنی ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں''۔ ناسخ نہ کہتے تو اب تک معلوم نہیں کتنے اور لوگ کہہ چکے ہوتے جن میں ایک یقیناً میں بھی ہوتا۔ میر کے حضور میں ہمارے اچھے سے اچھے لکھنے والوں نے نذرِ عقیدت پیش کی ہے اور کرتے رہیں گے۔ میرؔ، غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ ہمارے وہ شعرا ہیں جن پر لکھنے والے لکھنے سے کبھی نہیں تھکیں گے چاہے (بفرضِ محال) اردو شاعری کا چرچا باقی نہ رہے۔ آپ تو جانتے ہیں، غزل گو شعرا میں میر اور غالبؔ سے بڑا درجہ کسی اور کا نہیں مانا جاتا۔ اعتراض یا مذاق کرنے والوں نے غالبؔ یا غالبؔ کے کلام کو اپنا نشانہ بنایا لیکن آج تک میر سے بے تکلف ہونے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ آج اس پرانی زبان کی بھی نقل کی جاتی ہے جس کے نمونے جہاں تہاں میر کے کلام میں ملتے ہیں لیکن اب متروک ہیں۔ بربنائے عقیدت کسی کے نقص کی بھی پیروی کی جائے تو بتائیے وہ شخص کتنا بڑا ہوگا۔ اردو کے مشہور شعرا کی پیروڈی Parody کی گئی، میر کی کسی نے نہیں کی۔ میر جس زمانے میں تھے وہ زمانہ جاگیرداری کا رہا ہو یا زبوں حالی اور زیاں کاری کا، ان کی شاعری ہر زمانے کے ذوق وظرف کی آبرو رہے گی، اگر اس زمانے کو آبرو سے رہنے کی توفیق یا حوصلہ ہوگا! جہاں میر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ''عشق بن یہ ادب نہیں آتا'' وہاں یہ بھی غلط نہیں ہے کہ میر بن یہ ادب نہیں آتا! میرے لیے میر پر تھوڑا کہنا اور جلد کہہ ڈالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا دوسروں کے لیے بہت کہنا اور کہتے رہنا آسان! اس کے لیے کوشش کرنا پڑے گی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں خود میر بن جاؤں۔ ممکن ہے کوئی اور ایسا کر سکے، میرے لیے یہ بہت مشکل ہے اس لیے کہ میں خود اپنا میر بن چکا ہوں۔ اپنے بنائے ہوئے خول سے نکلنا مشکل ہے، چہ جائیکہ میر کے خلوت کدے میں باریاب ہونے کا حوصلہ کروں، میر کی فضا میں سانس لینا اور ان کی بارگاہ میں دم مارنا آسان نہیں۔

ان کے کلام کی تاثیر عالمگیر ہے۔ بظاہر یہ بڑا فرسودہ اور بندھا ٹکا فقرہ معلوم ہوتا ہے، شاید ہو بھی۔ بے احتیاطی اور بے دردی سے استعمال میں آنے سے اپنی معنویت بھی کھو بیٹھا ہے لیکن اگر اسے صحیح مان لیا جائے کہ میر کی شاعری کی تاثیر مسلم ہے تو پھر یہ تسلیم کر لینا آسان ہو جاتا ہے کہ یہی اور اسی طرح کی تاثیر شاعر اور اس کی شاعری کو ابدمدت بنا دیتی ہے۔

میر جیسا بڑا اور اچھا شاعر ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانے اور ہر زبان کا محبوب اور قابلِ فخر شاعر ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میر ہمارے ہی لیے نہیں ہیں، تمام دوسرے اقوام اور ممالک کے یکساں محبوب شاعر ہیں۔ میر ہماری تہذیب کے ترجمان اور حسن کار ہیں۔ ''تہذیب رسمِ عاشقی'' کا فقرہ اور دعویٰ تو حسرتؔ کا ہے لیکن میرے نزدیک اس کی روایت میر سے شروع ہوتی ہے۔ میر اور حسرتؔ کی ''تہذیب رسمِ عاشقی'' میں نمایاں فرق بھی ہے۔ میر کی زبان منفرد و ممتاز ہے۔

اردو بڑی عشوہ طراز ہے اور آسانی سے ہر کس و ناکس کی گرفت میں نہیں آتی۔ اس کے ''دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں ازمن'' کی اداؤں سے سب واقف نہیں ہیں۔ یہ بات اور زبانوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے لیکن اردو کی تخلیقی توانائی تازگی و طرفگی کے عوامل دوسری زبانوں کو کم نصیب رہے ہیں۔ جتنی زبانوں، تہذیبوں، قوموں اور تحریکوں سے اس نے ترکیب پائی ہے اور ان کے حسن کو اپنے میں جس طرح اس نے نکھارا، سنوارا، مقبول و مستحکم کیا ہے اس کو نظر میں رکھیں تو اردو کا صحیح تصور اور مقام سامنے آتا ہے۔ میر کی اردو دوسرے شعرا کی اردو سے اس اعتبار سے علیحدہ اور اہم ہے کہ دوسرے شعرا اکثر و بیشتر عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ، تراکیب، بندش، محاورہ، روزمرہ یا انواع و اقسام کے علوم وفنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں۔ میر صرف اردو اور اپنے مخصوص لب ولہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعرا کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے اس میں اتنی ''اردویت'' یا ''اردوپن'' نہیں ہوتا جتنا میر کے یہاں ہے۔ میر نے ہر طرح کی بات اور ہر شاعر کی بات اپنی خاص زبان اور مخصوص لہجے میں ادا کردی ہے۔

ہر شاعر کی زبان اور لب ولہجہ مختلف و مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن میر اور دوسرے شعرا میں یہ فرق ہے کہ میر کی زبان ولہجہ کی تقلید کرنے والوں کا ہم احترام کرتے ہیں۔ دوسروں کی زبان کی نقالی پر ہم برہم اور بدحظ ہوتے ہیں اور ایسے شاعر اور اس کی شاعری دونوں کو مضحکہ خیز و ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ میر کی زبان میں ''منافقت'' نہیں کی جاسکتی۔ اردو پر کتنا ہی زمانہ کیوں نہ گزر جائے اور یہ زبان زمانے کے ساتھ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے، میر کی اردو ہمیشہ مقبول رہے گی۔ اس لیے کہ میر کی زبان حسن و عشق کے ہر تصور کو واضح اور دلنشیں بنا دیتی ہے، خواہ وہ تصور ارضی ہو یا ماورائی، ہمارا ہو یا آپ کا، روس کا یا امریکہ کا! جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے میر نے ہمعصر نہیں بلکہ ہمہ عصر روح کو گرفت میں لے لیا ہے۔ یہ امتیاز دنیا کے چند ہی شاعروں کے نصیب میں آیا ہے۔ کیا تعجب، میر جیسا شاعر پیدا کرنے میں 'فلک' کو 'برسوں' سے زیادہ 'پھرنا' پڑا ہو!

●●●

قاضی عبدالودود

مختصر حالات زندگی[1]

مقالۂ ہٰذا پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) آگرہ (۲) دہلی (۳) کمہیر وغیرہ (۴) دہلی میں دوبارہ قیام اور (۵) لکھنؤ

(۱) آگرہ: کچھ لوگ (''بزرگانِ من'' ذکر میر، ص۳) جن کی فاطمیت[2] کا دعویٰ کیا گیا ہے اپنے ''دار و دستہ''[3] کے ساتھ حجاز سے وارد ہند ہوئے اور ان میں ایک شخص، جن کا نام معلوم نہ ہوسکا آگرہ میں توطن گزیں ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بیٹے جو باپ کی طرح مجہول الاسم ہیں فوجداری نواح آگرہ[4] پر فائز ہوگئے تھے، ان کے دو بیٹے تھے، بڑے جو ''خلل دماغ'' سے خالی نہ تھے جوان مرے، چھوٹے جن کا نام محمد علی تھا ۱۰۸۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے علومِ ظاہر کی تحصیل شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی (متوفی ۱۱۰۹ھ) سے کی، اور ظاہرا انھیں کے مرید بھی ہوئے۔ ان کی پہلی بی بی خانِ آرزو کی بہن تھیں، دوسری کس خاندان کی تھیں اس کا پتا نہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس عہد کے معیارِ شرافت پر پوری نہ اترتی ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی کو علی متقی[5] کا لقب ملا تھا۔

محمد تقی دوسری بی بی سے اواخر ۱۱۳۵ھ میں متولد ہوئے۔ اسے چند سال گزرے تھے کہ علی متقی ایک دن بہت بھوکے گھر پہنچے، کھانا پکنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے اضطراب ظاہر کیا، ماما نے کہا کہ یہ فقیروں کی روش نہیں۔ علی متقی بولے کہ تم اطمینان سے کھانا پکاؤ، میں ایک درویش سے ملنے لاہور جاتا ہوں، ماما نے بہت روکا مگر نہ رکے۔ لاہور میں خفشاں نمود سے ملاقات ہوئی جس نے ان سے کہا کہ میں دینِ محمدی کی تائید کرتا ہوں مگر ''بے حقیقت'' لوگ مجھے ''مغوی'' جانتے ہیں۔

---

(۱) اس مقالہ میں حوالے بہت کم ہیں اور اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ سند اور تفصیل درکار ہو تو میؔر سے متعلق میرے دوسرے مضامین دیکھے جائیں— میؔر نے اپنی ذات اور اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی نسبت جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ لازماً قابل قبول نہیں۔

(۲) میؔر نے کلیات میں ایک اور شخص کی زبان سے اپنے کو ''بنی فاطمہ'' کہوایا ہے۔ میری رائے میں ان کی فاطمیت مشتبہ ہے۔ اس رائے کی تائید میں کہ میؔر صدیقی ہیں بعض اصحاب نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ میرے نزدیک قابل قبول نہیں۔

(۳) داروودستہ = قوم وقبیلہ، غالباً مراد یہ ہے کہ ایک خاندان کے کچھ لوگ آئے۔

(۴) میرے نزدیک صحیح نہیں۔

(۵) قرینہ یہ ہے کہ یہ لقب خود میر کا دیا ہوا ہے۔ ذکر میر میں یہ ایک درویش کامل کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں جو ''شہرۂ آفاق'' بھی تھے۔ ان کی ولایت کا حال ولی جانیں، ''شہرۂ آفاق'' ہونا غلط محض ہے۔ ذکرِ میر نہ ہوتی تو آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔ آباواجداد سے متعلق فسانہ طرازی پہلے بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔

انھوں نے جواب میں کہا کہ سمجھ بوجھ کر باتیں کرو، ورنہ میرے ہاتھوں سے قتل [(۱)] ہوجاؤ گے۔ دینِ محمدی تمھاری تائید کا محتاج نہیں۔ لاہور سے دہلی آئے اور شیخ عبدالعزیز عزت، دیوان صوبہ کے بیٹے قمرالدین خاں [(۲)] کے یہاں، جن سے ''قرابت قریبہ'' تھی، ٹھہرے۔ امراء نے ملنا چاہا مگر انکار کردیا۔ امیرالامرا صمصام الدولہ نے جو اس زمانے میں میر بخشی تھے، ''حقوقِ سابق'' [(۳)] کی بنا پر اصرار کیا، مگر یہ نہ مانے، کہلوا بھیجا کہ ملاقات کے لیے ''مناسبت شرط'' [(۴)] ہے۔ دہلی میں معتقدین کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ یہ تنگ آکر ایک دن آدھی رات کے وقت چل کھڑے ہوئے۔ بیانہ آگرہ کی راہ میں تھا، وہاں ایک خوبصورت سیدزادہ، امان اللہ جس کی شادی اسی دن ہونے والی تھی، ملا۔ اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس پر رحم کیجیے۔ انھوں نے اسے کچھ پڑھ کر پانی پلایا اور وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اس کی استدعا پر یہ اس کے یہاں گئے اور اسے مخاطب کر کے ازدواج کے خلاف تقریر کی جس میں یہ بتایا کہ ''کدخدائی مانعِ خداپرستی'' ہے [(۵)] اور اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ انھیں اس سے نجات مل چکی ہے۔

امان اللہ کی برات روانہ ہونے کے بعد یہ عازم آگرہ ہوئے۔ دولھا دولھن کو لے کر گھر واپس آیا تو انھیں نہ پا کر بہت پریشان ہوا اور اسی وقت ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، لیکن نہ تو شاید اسے ان کا نام معلوم تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ وہ کہاں کے ہیں اور کہاں گئے ہیں۔ ایک صحرا میں پہنچ کر خضرؑ سے مدد چاہی اور ایک بڈھے نے ''پسِ پشت'' سے نمودار ہوکر کہا: ''اے جوان گرامی جوئی؟ وانہا چیست کہ می گوئی؟ علی متقی دراکبرآباد است، دست پاچہ مشو'' (ذکر میر ص۱۶) امان اللہ آگرہ پہنچے، تو علی متقی نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور بجائے اس کے کہ سمجھا بجھا کر رخصت کر دیتے، ان کی تربیت میں مصروف ہوگئے۔ یہاں تک کہ تھوڑی سی مدت میں یہ ''فقیرِ کامل'' ہوگئے۔

''کارش بجائے کشید کہ اگر چشم زدے عجائبات نمودے واگر آستین افشاندے کرامت ظاہر شدے'' (ذکر میر ص ۱۷) علی متقی انھیں ''برادرِ عزیز'' کہا کرتے تھے۔ ادھر یہ حضرت تو درویشی کے مرحلے طے کر رہے تھے ادھر ان کی دلھن دق میں مبتلا ہوکر راہی عدم ہوئی۔ قیام آگرہ کو ایک سال گزرا تھا کہ علی متقی نے انھیں کہلوا بھیجا کہ ''اکنون درِفیض بروے عالمیان باید کشاد'' (ذکر میر ص ۱۹) محمد تقی اس زمانے میں (۱۱۴۲ھ یا ۱۱۴۳ھ ہوگا) ہفت سالہ تھے، امان اللہ نے جو ابھی خود نوجوان تھے، انھیں اپنی فرزندی [(۶)] میں لیا۔ یہ ان کے ساتھ رہنے لگے اور ان سے قرآن پڑھنے لگے۔ امان اللہ آگرہ

---

(۱) میر اثناعشری تھے، لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ علی متقی سنی تھے۔ میر کے تبدیل مذہب کے کیا اسباب تھے، ان کا علم نہیں۔ میر کی وسعت مشرب جس پر ڈاکٹر فاروقی نے زور دیا ہے، فرضی ہے۔

(۲) قمرالدین خاں مطابق ذکر میر مطبوعہ، بعض اصحاب نے ذکر میر نسخہ رامپور کے متعلق بتایا ہے کہ اس میں فخرالدین ہے۔

(۳) تفصیل نامعلوم (۴) مشتبہ

(۵) میر کا اختراع معلوم ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ عقیدت مندوں سے گھبرانے والا، ایسی حرکت کرے۔

(۶) ''بامادر و پدرم نگذاشت'' ذکر میر ص ۲۰، یہ اس پر مشعر ہے کہ ماں زندہ تھیں، لیکن محمد علی جس وقت لاہور چلے ہیں صرف ماما روتی ہے، بی بی کا اس موقع پر ذکر نہیں، اور ازدواج کی مذمت کے وقت اس کی قید سے اپنی رہائی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ امور خبر دیتے ہیں کہ بی بی پہلے ہی مرچکی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ پہلے حافظ محمد حسن کی ماں فوت ہوئیں اور امان اللہ کے ورود آگرہ سے قبل ہی میر کی ماں مرچکی تھیں۔

میں ایک ''جوان چرب'' (پسر ''روغن فروش'' ذکر میر ص ۳۰) پر مائل ہوئے۔ میر کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے حکم دیا کہ آٹھ شبانہ روز اپنے حجرے سے باہر نہ نکلو شاید خدا[1] اسے بھیج دے۔ ایک ہفتہ گزرا تھا کہ وہ خود چلا آیا اور علی متقی نے اسے ''جوان عزیز'' کا لقب دیا۔ اکابرِ شہر اس کی عزت کرنے لگے اور مریدانِ خاص کو اس پر رشک ہونے لگا۔

محمد تقی، امان اللہ کے ساتھ فقیروں[2] کی ملاقات کو جایا کرتے اور ان کی باتیں سنا کرتے۔ ان میں سے ایک احسان اللہ تھا۔ اس نے محمد تقی کو دیکھ کر کہا تھا: ''ایں بچہ ہنوز سوزہ بال است، اما چنیں معلوم شود کہ اگر بخوبی پر برآورد، بیک پرواز آں طرف آسمان خواہد بود''۔ اس نے انھیں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں تر کرکے دیا تھا، جس سے لذیذ تر چیز انھوں نے کبھی نہ کھائی تھی اور جس کا ذائقہ انھوں نے فراموش نہیں کیا۔ محمد تقی اور امان اللہ بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ ''صوبہ دار'' نصرت یار خاں، احسان اللہ کے یہاں آیا اور پانچ اشرفیاں نذر دے کر چلا گیا۔ یہ اشرفیاں اس کی موت کا باعث ہوئیں۔ ایک گویے کے لڑکے نے جسے اس نے اپنا مہمان کیا تھا، اسے زہر دے کر مار ڈالا، اور اشرفیاں لے کر چمپت ہوا۔ دوسرا فقیر جس سے یہ لوگ ملے، بایزید تھا جو علی متقی کے بڑے مداحوں میں تھا۔ ایک دن علی متقی اور امان اللہ ساتھ بیٹھے تھے کہ اسداللہ نامی ایک ''سیرابہ چڑ'' کبود جامہ سے آیا۔ میر کی زندگی میں علی متقی نے ان سے کہا تھا کہ اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے کہ موت سے قبل مجھے معلوم ہوجائے کہ جلد مرنے والا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا تھا کہ اسداللہ کو دیکھو تو یقین جانو کہ سال بھر سے زیادہ زندہ نہ رہوگے۔ علی متقی نے امان اللہ کو اس سے آگاہ کیا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور بولے کہ اس دن کے دیکھنے کے لیے میں نہیں رہوں گا۔ امان اللہ نے جو کہا تھا وہی ہوا اور اوائل شوال (۱۱۴۵ھ ہونا چاہیے) میں ان کی وفات ہوگئی۔

علی متقی کو بہت رنج ہوا اور انھوں نے اپنا لقب ''عزیز مردہ'' رکھا۔ محمد تقی اس وقت دہ سالہ تھے۔ ان کا بھی امان اللہ کے غم میں برا حال ہوا۔ علی متقی ایک دن باہر گئے تھے (جمادی الاخریٰ کا آخری عشرہ ہوگا) کہ ''حرارتِ آفتاب'' کے اثر سے بیمار ہوگئے اور تپ آنے لگی۔ ایک مہینہ گزرا تھا کہ یہ مشخص ہوا کہ ''تپ متشبث بقلب'' ہے اور ''استخوانی'' ہوگئی ہے۔ انھوں نے دوا و غذا ترک کردی اور جب موت قریب نظر آئی (۲۱ رجب تھی ۱۱۴۶ھ ہونا چاہیے) تو اپنے بڑے بیٹے حافظ محمد حسن (میر کے سوتیلے بھائی) کو بلوایا اور کہا کہ میں فقیر ہوں اور میرے پاس (۳۰۰) کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کتابیں میرے پاس لے آؤ اور آپس میں تقسیم کرلو۔ (حصہ برادرانہ[3] کردہ بگیرید'' ذکر میر ص ۵۹) حافظ محمد حسن نے جواب دیا کہ میں ''طالب علم'' ہوں اور بھائی چھوٹے ہیں یہ کتابوں کو ضائع کردیں گے۔ ان کا حصہ میرے پاس امانت رہے تو اچھا ہے۔ علی متقی جو اس کے ''مزاجِ ناساز'' سے آگاہ تھے کہنے لگے:

''چہ شد[4] کہ ترک لباس کردم، لیکن کج پلاسی تو ہنوز نرفتہ است، می خواہی کہ طفلانِ بے چارہ را بازی دہی و پس از

(۱) علی متقی میر کو بھی مشورہ دیا کرتے تھے کہ ''عشق بورز'' اور کھیل کود سے مانع آتے تھے۔

(۲) فیض میر ص 7 میں ایک فقیر احسن اللہ نامی سے سفر میں ملنے کا ذکر ہے مگر امان اللہ کا ساتھ ہونا مرقوم نہیں۔

(۳) یہاں پر بیٹی کا ذکر نہیں۔ محمد حسین کلیم میر کے بہنوئی تھے، مگر یہ پتہ نہیں کہ ان سے حقیقی بہن بیاہی گئی تھیں یا سوتیلی، محض رشتے کی بہن۔

(۴) مجھے بہت شبہ ہے کہ میر نے اس موقع پر راست گفتاری سے کام لیا۔

مرگ، دل بخرابی ایشاں نمی، دانستہ باش کہ حق تعالیٰ غیور است و غیور رادوست می دارد، غالب کہ میر محمد تقی دست نگر تو نشود۔ اگر بنوعِ دیگر پیش خواہی آمد، کاسہ بر سرت خواہد شکست و نقشِ عزتِ تو پیش ایں بابا نخواہد نشست۔ خواہی دیدا گر بمراد خواہی رسید برائے یک جلد کتاب پوستِ تو خواہد کشید۔ خوب است کتاب را بیرون نگاہدار'' (ذکر میر ص ۵۹)

اس کے بعد محمد تقی سے کہا کہ میں تین سو روپوں کا قرض دار ہوں، جب تک یہ رقم ادا نہ ہو میرا ''مردہ'' نہ اٹھانا۔ محمد تقی نے جواب دیا کہ کتابیں آپ نے بڑے بھائی کے حوالے کردیں، گھر میں کوئی دوسری چیز جس سے ادائے قرض ہو سکے، ہے نہیں۔ علی متقی نے کہا کہ ہنڈی راہ میں ہے، چاہتا تھا کہ اس کے پہنچنے تک زندہ رہوں لیکن اس کی کوئی صورت نہیں۔ یہ کہہ کر میر کے حق میں دعا کی اور انھیں خدا کے حوالے کیا اور جان بحق تسلیم ہوئے۔

علی متقی کی وفات کے بعد حافظ محمد حسن نے بڑی بے مروتی کی۔ کہنے لگے کہ ''کسانیکہ ہمگیر ناز و نعم بودند، آنہا دانند و کارِ آنہا، من در حیاتِ پدر دخیل کارے نگشتم، از وقف اولادی [(۱)] ہم گزشتم، سجادہ نشینانِ او سلامت باشند، سرِ رامی کنند، وجہ را می خراشند، آنچہ مصلحتِ وقت خواہد بود، خواہند نمود''۔ (ذکر میر ص ۶۰)

''بذالانِ بازار'' دو سو روپے لائے، مگر محمد تقی کو علی متقی کی وصیت کا پاس تھا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ یہی حال تھا کہ سید مکمل خاں (مرید امان اللہ) کا آدمی پانچ سو کی ہنڈی لایا اور محمد تقی نے قرض ادا کر کے علی متقی کو ان کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔ باپ کی موت کے بعد محمد تقی نے کسی کو اپنے سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ پایا، تو اپنے معاملات چھوٹے بھائی کے سپرد کر کے ''اطرافِ شہر'' میں نوکری تلاش کرنے لگے۔ اس میں کامیابی نہ ملی تو دہلی کی راہ لی۔ وہاں پہلے یہ حال ہوا کہ ''بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم'' (ذکر میر ص ۶۲) مگر بالآخر قسمت نے یاوری کی اور خواجہ محمد باسط، برادرزادۂ صمصام الدولہ کو ان پر مہربان کردیا۔ وہ انھیں لے کر اپنے چچا کے پاس گئے اور انھوں نے ایک روپیہ روز ان کا مقرر کردیا۔ میر عرضی ساتھ لے گئے تھے، متدعی ہوئے کہ اس پر دستخط کردیے جائیں کہ متصدیوں کو کچھ کہنے کا موقع نہ رہے۔ خواجہ محمد باسط کی زبان سے نکل گیا کہ ''یہ قلم دان کا وقت نہیں'' محمد تقی قہقہہ مار کر ہنسے [(۲)]۔ صمصام الدولہ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے کہا: ''ایں عبارت را فہمیدم اگر ایشاں می گفتند، قلم دان بردار حاضر نیست ایں حرف گنجائش داشت، با آنکہ وقت دستخط نواب نیست باتی وارد'' وقتِ قلمدان نیست'' انشائے تازہ [(۳)] است قلم دان چوبے بیش نمی باشد، وقت و غیر وقت نمی داند، بہر نفرے کہ اشارت رود برداشتہ بیارد''۔ (ذکر میر ص ۶۲) صمصام الدولہ ہنس کر بولے کہ معقول بات ہے اور قلمدان منگوا کر دستخط کردیے۔ یہ روزینہ صمصام الدولہ کی وفات (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) تک انھیں ملتا رہا۔ بند ہوا تو بڑی پریشانی کا سامنا ہوا۔ ان لوگوں نے بھی جو علی متقی کی زندگی میں ان کی خاکِ پا کو ''کحل الجواہر'' سمجھتے تھے، بے توجہی کی اور یہ سترہ برس کے تھے (۱۱۵۲ھ؟) کہ دوبارہ عازمِ دہلی ہوئے۔

(۲) دہلی میں قیام: دہلی پہنچے تو خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ محمد تقی نے خان آرزو

(۱) جائداد ۳۰۰ کتابوں سے قطع نظر بھی ہی نہیں، تو وقف اولاد کہاں سے آگیا؟

(۲) بلند پایہ اور معمر اشخاص کے سامنے ایک بچہ کا قہقہہ مار کر ہنسنا اور لفظی گرفت کرنا حد درجہ مستبعد ہے۔

(۳) لفظ ''انشا'' کا محل نہیں۔

سے استفادہ کیا تھا۔ نکات الشعرا میں محمد تقی انھیں ''استاد و پیر و مرشدِ بندہ'' بھی کہتے ہیں اور محسن پسر حافظ محمد حسن و شاگرد میر انھیں تلامذۂ آرزو میں شمار کرتا ہے۔ لیکن ''ذکرِ میر'' میں مطلقاً کسی نوع کے علمی و ادبی استفادے کا ذکر نہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ ''چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' (ذکر میر ص ۶۲) کچھ دنوں میں یہ اس قابل ہوئے کہ کسی کے ''مخاطب صحیح'' ہو سکیں تو حافظ محمد حسن نے اپنے ماموں کو لکھا کہ محمد تقی ''فتنۂ روزگار'' ہے، دوستی کے پردے میں اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔[1] اس کے بعد خان آرزو ان سے بدسلوکی کرنے لگے جس کا اثر یہ ہوا کہ:

> ...جنتے پیدا کردم... [2] در حجرۂ کہ می بودم درش می بستم و بایں کثرتِ غم تنہائی نشستم، چوں ماہ بر می آمد قیامت برسرم می آمد... در شب ماہ پیکرے خوش صورت... از جرمِ قمر انداز طرفِ من می کرد و موجب بے خودی من می شد بہر طرف کہ چشم می افتاد برآں رشکِ پری می افتاد۔ بہر جا کہ نگاہ می کردم تماشاے آں غیرتِ حوری کردم، در و بامِ صحن خانۂ من ورق تصویر شدہ بود یعنی آں حور حیرت افزا از شش جہت روی نمود، گاہے چوں ماہِ چہاردہ مقابل۔ گاہے سیر گاہِ او منزلِ دل۔ اگر نظر بر گلِ مہتاب می افتاد، آتشے در جانِ بے تاب می افتاد۔ ہر شب باد صحبت، ہر صبح بے او وحشت... تمام روز جنون می کردم، دل دریا وار خوں می کردم۔ کف بر لب چوں دیوانہ و مست، پارہ ہاے سنگ در دست۔ من افتاں خیزاں، مردم از من گریزاں۔ تا چار ماہ آں گلِ شب افروز رنگ تازہ می ریخت... ناگاہ موسمِ گل رسید، داغِ سودا سیاہ گردید... شایستۂ کنارہ گیری شدم زندانی و زنجیری شدم۔ (ذکر میر ص ۶۴)

فخر الدین کی بی بی نے، کہ علی متقی کی مرید اور ان سے قرابت قریبہ رکھتی تھیں، محمد تقی کے علاج میں بہت روپے صرف کیے۔ موسم خزاں آیا تو انھیں صحت حاصل ہوئی اور انھوں نے ''ترسّل'' پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دن میر جعفر عظیم آبادی سے، جو ایک مجہول الاحوال شخص ہیں، درس لیا اور سعادت امروہوی سے ملاقات ہوئی تو ان کی ترغیب سے ریختہ گوئی شروع کی۔ انھوں نے میر تخلص اختیار کیا اور جہدِ بلیغ سے ''مستند شعرا میں محبوب ہونے لگے اور ان کی شاعری کا شہر میں چرچا ہونے لگا۔

ایک دن خان آرزو نے میر کو کھانے پر بلایا اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ وہ کھانے کو یونہیں چھوڑ، گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حوض قاضی میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، جو انھیں رعایت خاں پسر ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں و خواہرزادۂ قمر الدین خاں وزیر کے یہاں لے گیا۔ رعایت خاں نے میر کو اپنا رفیق بنا لیا اور انھوں نے ''قیدِ تنگ دستی'' سے رہائی پائی۔

درانی کے حملۂ اول کی خبر آئی (۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) تو قمر الدین خاں اور احمد شاہ اس کے مقابلے کے لیے دہلی سے نکلے۔ رعایت خاں بھی ساتھ تھے۔ میر ان کے ہم سفر تھے اور خدمتیں بجالاتے تھے۔ سرہند میں میر کی ملاقات یقین کے دادا سے ہوئی تھی جس کا ذکر نکات الشعرا میں ہے۔ افغانوں کی شکست اور قمر الدین خاں کی موت (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے بعد رعایت خاں معین الملک پسر قمر الدین خاں کی رفاقت ترک کر کے، صفدر جنگ کے ہمراہ جو آگے چل کر قمر الدین خاں کی جگہ وزیر ہوئے، روانۂ دہلی ہوئے۔ میر دہلی پہنچے تو اس کے کچھ بعد راجہ بخت سنگھ، رعایت خاں کو اپنے ساتھ

---

(۱) یہ میر کا بیان ہے، دوسرے فریق کا بیان ہمارے سامنے نہیں کہ میر کے قول کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔ یہ امر کہ دشمنی اس حد تک تھی کہ جان لینے کے در پے تھے، قرینِ قیاس نہیں۔

(۲) مثنوی خواب و خیال (مشمولۂ کلیات) میں میر نے اس بیماری کا حال لکھا ہے، لیکن اس میں آرزو کی بدسلوکی کا ذکر نہیں۔

راجپوتانہ لے گیا۔ میر بھی ساتھ تھے۔ اس کے بعد سادات خاں ذوالفقار جنگ، میربخشی عازم اجمیر ہوئے۔ مگر معاملات نے وہ رخ اختیار نہ کیا جو یہ چاہتے تھے اور بعض مصالح کی بنا پر یہ ناکام دہلی لوٹے۔ اس سفر میں میر کو خواجۂ اجمیرؒ کی درگاہ کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ راجہ اور رعایت خاں میں نزاعِ لفظی ہوئی اور دونوں کے تعلقات خراب ہوگئے۔ میر نے رعایت خاں کی طرف سے راجہ کے پاس جا کر قسم کھائی کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ لیکن اس نے معذرت قبول نہ کی اور ''مردانِ رسالہ'' کی زرِتنخواہ رعایت خاں کو بھیج دی۔ رعایت خاں (اور ان کے ساتھ میر بھی) دہلی واپس آگئے۔ ایک دن رعایت خاں نے میر سے فرمائش کی کہ اپنے کچھ اشعار ایک قوال بچے کو سکھا دیجیے کہ یہ گائے، میر اس پر راضی نہ ہوتے تھے، لیکن خان نے اپنے سر کی قسم دی، تو مجبور ہوگئے اور پانچ شعر اسے یاد کرائے (''آموختم'' ذکرِ میر ص ۷۰) اس کا اثر ان پر ایسا ہوا کہ چند دنوں کے بعد ''خانہ نشین'' ہوگئے اور نوکری چھوڑ دی۔ خان نے ان کی ''رفاقت'' کا خیال کر کے ان کے بھائی محمد رضی کو نوکر رکھ لیا اور انھیں ایک گھوڑا عنایت کیا۔ مدتِ مدید کے بعد ملاقات ہوئی تو خان نے بہت عذر کیا۔ اس پر کچھ دن گزرے تھے کہ میر، جاوید خاں خواجہ سرا کے یہاں نوکر ہوئے۔ اسد یار خاں بخشی فوج نے میر کا حال بتا کر گھوڑا اور ''تکلیفِ نوکری'' معاف کرا دی مطلب یہ کہ برائے نام سپاہی تھے، کام کچھ نہ تھا۔

صفدر جنگ، قائم خاں کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گھر ضبط کرنے چلے تو نجم الدولہ (شجاع الدولہ کی بیگم کے بڑے بھائی) ہمراہ تھے۔ میر بھی ساتھ ہو لیے۔ صفدر جنگ اور احمد خاں، برادرِ خرد قائم خاں میں جنگ ہوئی، جس میں صفدر جنگ کو شکست ہوئی اور نجم الدولہ مقتول ہوئے۔ میر شکست خوردہ لشکر کے ساتھ دہلی واپس آئے۔ ذوالفقار جنگ کی معزولی اور میربخشی کے عہدے پر غازی الدین خاں کا تقرر جس زمانے میں ہوا ہے میر نے دوستوں سے ملنا جلنا (''ملاقاتِ عزیزاں'' ذکرِ میر ص۷۲) ترک کر دیا تھا اور مطول پڑھنے میں مشغول تھے۔ جاوید خاں کو صفدر جنگ نے قتل کرایا تو میر بے کار ہوگئے۔ مہانرائن دیوان صفدر جنگ نے اپنے داروغہ دیوان خانہ نجم الدین علی سلام پسر شرف الدین علی پیام کی معرفت میر کو کچھ بھیجا اور طلب کیا، میر کے چند مہینے فراغت کے ساتھ گزرے۔ ۱۱۶۵ھ میں میر کا تذکرۂ شعرائے اردو، جس کا آغاز اس سے کچھ قبل ہوا تھا اور جس کی نسبت ان کا دعویٰ ہے کہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے، منظرِ عام پر آیا۔ قائم کا بیان ہے کہ میر نے ولی کے بارے میں لکھا تھا کہ ''شاعریست از شیطان مشہورتر'' اور اس پر خفا ہو کر پیر خاں کمترین نے ان کی ہجو کہی تھی— خود میر کا قول ہے کہ خاکسار نے ''علی الرغم ایں تذکرہ، تذکرۂ نوشتہ... آتشِ کینہ کہ بے سبب افروختہ چوں کبابم بوی دہد۔'' فتح علی گردیزی مولف تذکرۂ شعرائے صراحتہً نکات الشعرا کا ذکر نہیں کیا مگر وہ میر سے خفا معلوم ہوتا ہے۔ میر نے نکات میں جابجا دوسروں کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ سوؔدا کے ایک قطعے میں غالباً اس کی طرف اشارہ ہے۔ کچھ باتوں کا جو اس تذکرے میں ہیں ذکر ہو چکا ہے، کچھ امور کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(۱) سعادت علی سعادت امروہوی سے ''ربطِ بسیار'' تھا۔ (۲) سودا کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ملک الشعرائی ریختہ او را شاید... اکثر اتفاق طرحِ غزل باہم ی افتد (۳) دردؔ کے متعلق مرقوم ہے: ''خلف الصدق... خواجہ ناصر... ایامیکہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار[1] شرف اندوزی شد از زبانِ مبارکش ی فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد... حرف آں سرسلسلۂ خداپرستان موثر افتاد... مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است... بذاتِ ہمیں بزرگ[2] است و زیرا

(۱) مراد از پدرِ درد (۲) بزرگ سے میر درد مراد

کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر، از گردش روزگار... برہم خورد، از بسکہ باایں احقر اخلاص دلی داشت، گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین بکنید بہتر است... عمل کردہ آمد"۔ (۴) فغاں کی نسبت لکھا ہے: "بندہ بخدمتِ او بسیار مربوطم" (۵) حاتم کی مذمت کی ہے اور انھیں اپنا "آشنائے بیگانہ" بتایا ہے۔ (۶) یقین کی فرعونیت کی شکایت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ "ذائقۂ شعر فہمی" مطلق نہیں رکھتے۔ لوگوں کے اس گمان کا ذکر بھی کیا ہے کہ خود شعر نہیں کہتے۔ (۷) محمد علی حشمت کی نسبت تحریر کیا ہے کہ "اکثر بہ شعر با مرداں اعتراض می کرد و جواب باصواب می یافت... ریختہ... بسیار پا جیانہ می گفت"۔ (۸) تاباں کے متعلق مرقوم ہے: بافقیر یک صفائی داشت از چندے بسبب کم اختلاطی ایں ہیچمدان کدورتے بمیاں آمد، اجلش مہلت نداد کہ تلافیش کردہ آید"۔ (۹) میر عبدالرسول از یاران... مولف است چنانچہ شعر بمشورت من میگوید۔ (۱۰) محسن، برادرزادہ و شاگرد میر (۱۱) بندرا بن راقم، مشق شعر از مرزا رفیع می کند، قبل ازیں بافقیر نیز مشورت شعری کرد۔ (۱۲) محمد میر، میر... از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش است۔ (۱۳) میاں جگن... دعوی شاگردی فقیری می کند۔

(۳) کمبھیر وغیرہ: اسی زمانے میں یا اس سے کچھ قبل میر نے آرزو کی "ہمسائگی" چھوڑ دی اور امیر خاں انجام کی حویلی میں رہنے لگے۔ صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ اس کا جانشین ہوا۔ خانِ آرزو اس امید میں کہ نجم الدولہ کے بھائی وہاں ہیں اور "حقوق سابق" پر نظر کر کے ان کے ساتھ رعایت کریں گے، اودھ گئے۔ لیکن وہیں وفات پا گئے۔ (۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶) اس کے چند ماہ بعد راجہ جگل کشور میر کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے اشعار اصلاح کے لیے پیش کیے۔ میر کہتے ہیں کہ "قابلیت اصلاح ندیدم بر اکثر تصنیفات او خط کشیدم" (ذکر میر ص ۷۵) انھیں کی وساطت سے میر مہاراجہ ناگرمل کے نوکر ہوئے اور دوسرے حملۂ درانی کے بعد لواحق کو ہمراہ لے کر نکل کھڑے ہوئے، کوئی خاص جگہ مدنظر نہ تھی، راجہ جگل کشور کی بی بی لی، اس کے ساتھ برسانہ گئے اور وہاں سے "فردائے عاشورہ" روانہ ہوئے اور کمبھیر پہنچے جو راجہ سورج مل کے قلعوں میں سے ایک تھا۔ اس عہد میں راجہ ناگرمل نے اسے اپنا مستقر بنا لیا تھا اور میر بھی وہاں اس کے زیر سایہ رہے — یہاں بہادر سنگھ پسر رادھا کشن خزانچی (صفدر جنگ) جو اس زمانے میں راجہ کے ساتھ تھا، بحسنِ سلوک پیش آیا۔ میر کا بیٹا فیض علی بھی ان کے ہمراہ تھا، مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس وقت اس کی عمر کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ میر کی شادی اس سے قبل ہو چکی تھی۔ میر نے اس کا مطلقاً ذکر نہیں کیا اور بالکل خبر نہیں کہ ان کی بی بی کون تھیں؟ میر کمبھیر میں تھے کہ راجہ آ گئے، میر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت چاہی کہ وہاں سے کہیں چلے جائیں۔ راجہ نے کہا کہ آپ تو "بیاباں مرگ" ہونا چاہتے ہیں، مگر میں کب اس کا موقع دوں گا۔

پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کے بعد راجہ ناگرمل، میر کو ساتھ لے کر دہلی گئے۔ وہاں درانی کے وزیر نے راجہ سے کہا کہ شجاع الدولہ کی روش ٹھیک نہیں، آپ اور نجیب الدولہ اسے سمجھائیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ درانی سے اسے کچھ نقصان پہنچے۔ یہ لوگ گئے اور اسے درانی کے پاس لائے اور کدورت صفائی میں مبدل ہوئی۔ میر اس سفر میں راجہ کے ساتھ تھے۔ میر نے حملۂ درانی سے جو دہلی کی تباہی کا حال لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکان بھی لٹا تھا۔ ذکر میر میں جو مشاہدات لکھے ہیں وہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں اس سے میر کے طرزِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے:

ناگاہ درمحلۂ رسیدم کہ آں جا می ماندم، صحبت می داشتم، شعری خواندم، عاشقانہ می زیستم، شبہا می گریستم، عشق

> باخوش قداں می باختم، ایشاں را بلندی انداختم، با سلسلہ مویاں می بودم، پرستش گویاں می نمودم، اگر دے بے ایشاں نشستم، تمنا بر تمنا می شکستم، بزمے می آراستم، خوباں را می خواستم، مہمانی می کردم، زندگانی می کردم، دوست روی نیامد کہ با وفنس خوش آمدم، مخاطب صحیح نیافتم کہ صحبت دارم۔

سورج مل نے آگرہ پر قبضہ کرلیا تھا، خبر تھی کہ شاہ عالم ''لشکر بے شمار'' کے ساتھ عازم آگرہ ہیں۔ سورج مل نے ناگرمل کو وہاں بلایا۔ وہ چلے تو میر بھی ساتھ ہو لیے۔ آگرہ میں علی متقی اور امان اللہ کے مزاروں کی ''زیارت'' کی، وہاں کے شعرا سے ملاقات رہی— ایک سنی عالم کے یہاں گئے، جس نے انھیں شیعہ سمجھ کر گفتگو کی اور کہا کہ ''اگر فی الواقع چنیں است، مرا بحال من واگذارید'' میر نے جواب دیا ''مرا نیز ہمیں تردد بود، الحمدللہ کہ صاحب سنی برآمدند'' میر لکھتے ہیں کہ ''مغز خرخوردہ کنایہ فہمید و بسیار خوش گردید'' (ذکر میر ص ۱۰۳) میر آگرہ سے، کمھیر واپس گئے۔ عماد الملک بھی بعض اوقات قلعہ جات سورج مل میں آ کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہیں میر ان سے ملتے رہے، ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

> یگانۂ عصر است، اوصاف پسندیدہ دارد، چناں چہ ہفت خط بخوبی می نویسد، شعر ریختہ و فارسی ہر دو بامزہ می گوید، بحال فقیر عنایتے بیش از بیش می کند ہرگاہ بخدمت شریف او حاضر بودہ ام، حظے بردا شتہ۔ (ذکر میر ص ۱۱۳)

راجہ ناگرمل دوسری بار آگرہ گئے تو میر پھر ان کے ساتھ تھے اور وہاں پندرہ دن قیام کے بعد کمھیر واپس گئے۔ سورج مل اور جواہر سنگھ کے مقتول ہونے کے بعد اہل دہلی سے جاٹوں کا سلوک اچھا نہیں رہا۔ یہ دیکھ کر راجہ نے ان لوگوں سے کہیں اور جانے کی اجازت چاہی، جاٹ لیت و لعل کرتے رہے، راجہ کو یقین ہوگیا کہ بخوشی نہ جانے دیں گے تو مردانہ وار اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ قلعہ سے باہر نکلے اور کل اہل دہلی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں سے یہ قافلہ کاماں پہنچا۔

وہاں یہ خبر معلوم ہوئی کہ شاہ عالم فرخ آباد میں ہیں۔ راجہ ناگرمل نے میر کو حسام الدین خاں کے پاس جو شاہ عالم کے مزاج میں تصرف رکھتے تھے، ''عہد و پیمان درست'' کرنے کے لیے بھیجا اور میر نے وہاں جا کر ان سے سب باتیں طے کرلیں، لیکن راجہ کے چھوٹے بیٹے نے اس بنا پر کہ اس کے برادران کلاں سے ''ربط'' تھا، باپ کو سمجھایا کہ مرہٹوں کے پاس جانا بہتر ہے۔ میر اس سے بہت آزردہ ہوئے لیکن چارۂ کار نہ تھا۔ اپنے لواحق کے ساتھ، راجہ کی معیت میں روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچے تو ''زن و فرزند'' کو عرب سرائے میں چھوڑ کر راجہ سے علاحدہ ہوگئے۔

(۴) دہلی میں دوبارہ قیام: چند دنوں کے بعد میر، رائے بہادر سنگھ (پسر راجہ ناگرمل) سے ملے اور حقیقتِ حال بیان کی۔ وہ اپنے مقدور کے موافق ان کے ساتھ سلوک کرتا رہا، مگر بعض وجوہ سے کچھ دن کے بعد اسے اس کا موقع نہ رہا۔ دہلی میں میر پر جو کچھ گزری اس کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> من بگدائی برخاستہ بر در ہر سرکردۂ لشکر شاہی رفتم، چوں بسبب شعر شہرت من بسیار بود، مردمان رعایت گونہ بحال من مبذول داشتند، بارے بحال سگ دگر بہ زندہ ماندم و با وجیہ الدین خاں برادر خرد حسام الدولہ (حسام الدین خاں) ملاقات نمودم۔ آں مرد نظر بر شہرت من و اہلیت خود، قدرے قلیل معین نمود و بسیار دل دہی نمود۔
> (ذکر میر ص ۱۲۲)

یہ ابتدا کا حال ہے، کچھ دن کے بعد لکھتے ہیں:

> فقیر دراں ایام خانہ نشین بود، بادشاہ اکثر تکلیف کرد، نرفتم۔ ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں کہ صوبہ دار کشمیر بود و بنی عم عبدالاحد خاں مختار است مراعات گونہ بکاری برد، گاہ گاہ با و ملاقات می شد۔ گاہے بادشاہ ہم چیزے بچیزے می فرستاد۔ (ذکر میر، ص ۱۲۵)

اس بار جو میر دہلی آئے تو سودا، قائم و سوز وہاں نہ تھے۔ درد و مظہر و حاتم تھے۔ مگر ان میں سے درد و مظہر پیشہ ور شاعر نہ تھے، میر کا اگر کوئی حریف تھا تو حاتم۔ ان کے ایک شاگرد بقا سے جھگڑا ہوا اور طرفین نے ہجویں کہیں۔ میر نے جو ہجو کہی تھی وہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔ اس میں بقا کا نام یا تخلص نہیں آیا لیکن اس کے باوجود یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کس کی ہجو ہے۔ میر نے اس زمانے میں ایک مثنوی ''اژدرنامہ'' لکھی جس میں معاصرین کی خبر لی تھی، قاسم کا بیان ہے کہ اسی مشاعرے میں حاتم کے شاگرد نثار نے یہ شعر پڑھا۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

آئینہ دار کی مذمت میں جو مثنوی کلیات میں ہے وہ بھی اسی دور کی ہے اور آئینہ دار سے یقین ہے کہ عنایت اللہ حجام شاگرد سودا کی طرف اشارہ ہے، اس مثنوی میں سودا سے متعلق اشعار ذیل ہیں (۱)

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت یاں تأنی واں خجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں ہوتے اس جا کہ جو مرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں میر کے دیوان اول کا ایک نسخہ ہے جس میں ایک ہجویہ مثنوی ''دم الفضول'' شامل ہے جس کی نسبت بعض اصحاب کا خیال ہے کہ حاتم کے حق میں ہے، لیکن قرائن اس کے موید نہیں۔ نسخۂ مذکور ۱۱۹۲ھ میں تمام ہوا ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہے کہ مثنوی لکھنؤ جانے سے قبل کی ہے، مگر کب لکھی گئی اس کا ٹھیک پتہ نہیں ملتا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ بھی اسی دور کی ہے۔ مثنوی معاملاتِ عشق بھی جس میں اپنی ناجائز محبت کا ذکر کیا ہے اسی زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ تسنگ نامہ کا بھی اسی سے تعلق ہے، اگر معاملات عشق اس عہد کی ہے تو یہ بھی اسی زمانے کی ہے۔

(۵) **لکھنؤ**: سودا کی وفات رجب ۱۱۹۵ھ میں ہوئی تو آصف الدولہ کو خیال آیا کہ میر کو بلوانا چاہیے۔ انھوں نے اپنے ماموں سالار جنگ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سالار جنگ اس ''ربط قدیم'' کی بنا پر جو انھیں آرزو سے تھا بولے کہ زادراہ جائے تو ضرور آئیں گے۔ انھوں نے اخراجات سفر آصف الدولہ سے لے کر ایک خط کے ساتھ بھجوائے۔ یہ اوائل ۱۱۹۶ھ کی بات ہے۔ میر بیکار تھے اور ''بے اسبابی'' کی وجہ سے کہیں باہر جانا بھی ممکن نہ تھا، فوراً چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں فرخ آباد پڑتا تھا۔ مظفر جنگ رئیس فرخ آباد نے چاہا کہ کچھ دن وہاں ٹھہریں لیکن میر اس پر راضی نہ ہوئے، ایک دو روز کے بعد روانہ لکھنؤ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی سالار جنگ کے یہاں گئے جو ان سے بہت اچھی طرح ملے اور آصف الدولہ کو اطلاع کرائی کہ میر آگئے ہیں۔ چار پانچ دن کے بعد ''اتفاقاً'' آصف الدولہ مرغ بازی کے لیے آئے تو میر نے ''ملازمت''

---

(۱) ''ہجو عاقل نام کسیکہ بسگاں انسے تمام داشت'' کلیات میں ہے، عجب نہیں سودا کی ہجو بہ تبدیل اسم ہو (عیارستاں ص ۱۳۵)

حاصل کی۔ وہ میر سے بغل گیر ہوئے اور اپنے اشعار سنائے۔ میر نے کہا ''سبحان اللہ کلام الملوک، ملوک الکلام'' انھوں نے میر کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی تو میر نے بھی غزل کے چند شعر سنائے۔ آصف الدولہ کی رخصت کا وقت آیا تو سالار جنگ نے کہا کہ یہ آگئے ہیں، ان کے لیے کوئی جگہ مقرر ہو جائے اور جب جی چاہے بلایا کیجیے۔ چند دنوں کے بعد آصف الدولہ نے انھیں بلوایا، انھوں نے قصیدہ مدحیہ سنایا اور نواب کے ملازمین میں داخل ہو گئے۔ صاحب سفینۂ ہندی کا بیان ہے کہ ماہانہ تن خواہ دو سو روپے تھی۔

آصف الدولہ شکار کے لیے بہرائچ گئے تو میر بھی ہم رکاب تھے۔ شکار نامہ موزوں کیا جو کلیات مطبوعہ میں شامل ہے۔ دوسری بار شکار کے لیے ''دامن کوہ شمالی'' تک گئے اور تین مہینے کے بعد واپس آئے۔ ذکر میر میں صراحتہً میر کے ساتھ جانے کا ذکر نہیں، لیکن دوسرے شکار نامے کے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ اس بار بھی میر ساتھ گئے تھے۔ آصف الدولہ نے دوسرے شکار نامے کی دو غزلوں کو مخمس کیا۔ دوسرے شکار نامے کے آخری دو شعر توجہ طلب ہیں۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا   خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر کر لے چلو   بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

یہ اشعار اگر واقعی میر نے آصف الدولہ کے سامنے پڑھے تھے یا انھیں دکھائے تھے تو تعجب کی جگہ ہے۔ یہ اشعار جس طرح ذکر میر میں ان کی قدر دانی کا ذکر ہے اس سے میل نہیں کھاتے۔ ناصر و آزاد نے جو حکایتیں میر و آصف الدولہ سے متعلق بیان کی ہیں وہ ایسے لوگوں کے بیانات ہیں جنھوں نے آصف الدولہ کا زمانہ نہیں پایا۔

یکتا، صاحب دستور الفصاحت کا معاملہ مختلف ہے، یہ آصف الدولہ کے ہم عصر ہیں۔ ان کا بیان ہے:

> آصف الدولہ... از خاطرداری و پاس مشارٌ الیہ ہیچ دقیقہ فروہی گذاشت حالانکہ جناب میر بغرور کمال و استغنائے تصوف کہ مضمر بخاطرش بودہ، اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحال مردم می نمود، بلکہ گاہ گاہ با امرا ہم چناں چہ باید، راہ التفات و مبالغت نمی پیمود۔ چناں چہ نقل است کہ روزے میر صاحب قصیدہ تازہ گفتہ بدربار آوردند، نواب وزیر کہ از چاشت فراغت کردہ، متوجہ شنیدن شد۔ میر صاحب شروع بخواندن کردند و طول دادند، اتفاقاً آں روز ملا محمد مغلے را کہ تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ برائے ملازمت آوردہ می خواست کہ آں ہم چیزے در مدح حضور بخواند وتطویل قصیدۂ میر وقت نگذاشت۔ ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ ''میر صاحب قصیدہ خوب است اما طولانی۔ اگر دماغ نواب وفائی کرد کہ می شنید''؟ میر... بیاض از دست انداختہ و منغض شدہ گفت کہ: ''اگر دماغ نواب وفائی کرد، دماغ من کجا وفا می نماید؟'' مطلق پاس حضور نہ نمود۔ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ استمالۂ مزاج میر بکمال مہربانی ومعتجا نمودہ، بقیہ قصیدہ ہم تمام شنید و خاطر ملا ہیچ نکرد، باوصف ایں کہ او با نواب صیغۂ اخوت داشت۔ (دستور الفصاحت، ص ۲۵۔۲۶)

ناصر کا بیان ہے کہ میر نے لکھنؤ میں شادی کی، یہ صحیح ہوگا۔ میر کے دوسرے بیٹے حسن عسکری (عرش) اور بڑے بیٹے فیض علی فیض کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، دونوں کے ایک ماں کے بطن سے ہونا خلاف قیاس ہے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں مشاہرہ برابر ملتا رہا، سعادت علی خاں کے عہد میں جیسا کہ تذکرۂ کمال میں ہے بند ہو گیا۔

صاحب نودار الکملا نے میر کے آخری ایام کا حال اس طرح لکھا ہے:

در سالے مایۂ ناز، پروردۂ آغوشِ ناز دخترے، و سالے دیگر... خلف کامگار و در سالے دیگر اہلیۂ عفت شعار... بکنج عافیت مزار آسودند۔ درحواس و مزاج اختلالِ کلی راہ یافت، برداشتگی خاطر از دنیاے ناپایدار از حد افزوں وشوق جاں سپردگی از اندازہ بیروں رفت۔ دامانِ عزلت مستحکم گرفتند، مجالس و محافل را وداع نمودند مدتے ہمیں نوع گزشت آں چہ گزشت۔ آخر در شہر ربیع الثانی عوارض مزمنہ رو بترقی آوردند، دردِ قولنج کہ جلیس قدیم و ہمراز و ندیم بود، سائحے نگذاشت، وجع مفاصل قواے جسمانی را معطل ساختہ، پزشکان شاہی کہ شناساے قدیم بودند، ہجوم آوردند، راے ہمگناں برآں قرار یافت کہ چارۂ کار واقعی باید نمود و داروے باید استعمال آورد کہ قبض طبیعت برطرف شود۔ تیپے دادند، اسہال بود کہ پیام مرگ، جثۂ نحیف مضغۂ ضعیف و اسہال یک روزہ یک صد و پنجاہ۔ واویلا آہ آہ۔ دو سہ روز ہمیں نوبت بود، آزار بمرگ انجامید، فرشتۂ موت جام ہلاہل "کل من علیہا فان" پیش نمود، بیاشامید۔

دیوان چہارم مذکور کے ساتھ عبارتِ ذیل محمد محسن مخاطب بہ زین الدین احمد خاں کی ہے:

بروز جمعہ بیستم شعبان... وقتِ شام ۱۲۲۵ھ ... بود کہ میر... صاحب... در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھی... بجوار رحمتِ ایزدی پیوستند و بروز شنبہ... وقت دوپہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستان مشہور است، نزد قبور اقرباے خویش مدفون شدند۔

●●●

ترجمہ: نثار احمد فاروقی

میر کی آپ بیتی

[میرے دادا] کے دو لڑکے تھے۔ بڑے تو خلل دماغ سے خالی نہ تھے، جوانی میں مرے اور بسر گئے۔ ان سے چھوٹے میرے والد تھے، انھوں نے ترک لباس کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ علم ظاہری کی تحصیل، جس کے بغیر عالم معنی تک پہنچنا دشوار ہے، شاہ کلیم اللہ (1) اکبر آبادی سے کی جو وہاں (آگرے) کے اولیائے کاملین میں سے تھے اور کڑی ریاضت کر کے دولتِ باطنی حاصل کرلی۔ انھوں نے ترک و تجرید کی کوشش میں مجاہدے کیے اور ان بزرگ کی رہنمائی سے درویشی کی منزل تک پہنچ گئے۔

پس از خرابی بسیار دل بدست افتاد

والد کا عقیدہ: وہ جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے، دل میں عشق کی گرمی رکھتے تھے۔ علی متقی کے خطاب (۲) سے ممتاز ہوئے۔ نقل ہے کہ ایک دن انھوں نے شیخ کی خدمت میں سوال کیا کہ میں نے اپنے عقائد جیسا کچھ درست کرلیے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے لیکن حاکم شام (۳) کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ''شاہ صاحب نے فرمایا ''بتادیں گے''۔

---

(۱) شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی کے وقائع حالات اور ملفوظات نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے یہ اتنے بڑے آدمی نہ تھے کہ ان پر کوئی مستقل کتاب لکھی جاتی۔ البتہ تاریخ محمدی مصنفہ مرزا حارثی بدخشی میں ۱۱۰۹ھ کے مرنے والوں میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے: ''شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی، جامع المعقول والمنقول در اکبر آباد فوت شد''۔ (ص۱۰۱۳)

''مصنف تاریخ محمدی نے، کوئی کتاب ہے افق المبین، اس کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اسی کتاب میں متعدد اہل ظاہر و باطن بزرگوں کی تاریخ وفات لکھتے ہوئے افق المبین کا نام لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کا مصنف کون ہے؟'' (اقتباس از مکتوب مولانا امتیاز علی خاں عرشی، موسومہ مترجم)

(۲) میر کی ایک تحریر سے، جو اسی کتاب میں آگے آئے گی، یہ ثابت ہوچکا ہے کہ ان کے والد کا نام میر محمد علی تھا اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے وہ ''علی متقی'' مشہور ہوگئے تھے، لیکن یہ ''خطاب'' دیا کس نے تھا؟ میر نے نہیں بتایا۔ عجب نہیں پیر و مرشد کے دربار سے ملا ہو۔

(۳) مولوی عبدالحق، مرتب ذکر میر نے اس موقع پر سرخی قائم کی ہے۔ ''باپ کی اپنے پیر سے گفتگو در بارۂ یزید'' لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں ''حاکم شام'' سے مراد حضرت امیر معاویہؓ ہیں وہ حضرت فاروقؓ کے دور خلافت (۱۳ھ/۶۳۴ تا ۲۳ھ/۶۴۴) میں چار سال اور حضرت عثمانؓ کے عہد (۲۳ھ/۶۴۴ تا ۳۵ھ/۶۵۵) تک شام کے حاکم رہے تھے۔ ۴۱ھ/۶۶۱ میں خود خلیفہ ہوئے اور ۶۰ھ/۶۸۰ میں انتقال فرمایا۔

یہاں ''عقائد کو درست کرنے'' کی بات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ پہلے میر کے والد سنی تھے اور شیخ کلیم اللہ کی صحبت میں رہ کر تشیع یا تفضیلیت کی طرف مائل ہوئے۔ امیر معاویہؓ کے سیاسی کردار سے متعلق بہت سے اہل سنت والجماعت حضرات کو بھی شبہ رہتا ہے، یزید بن معاویہ کی سیاسی غلطیوں پر اکثر اتفاق رائے رہا ہے، اس لیے علی متقی کا یزید بن معاویہ کے بارے میں استفسار کرنا اتنا قرین قیاس نہیں جتنا کہ انھوں نے حضرت معاویہؓ کے متعلق اپنا عقیدہ درست کرنے کے لیے سوال کیا ہو۔

مدت کے بعد ایک دن منھ اندھیرے، محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم شیخ کے وضو کے لیے پانی فراہم کرنے کو دوڑے، مگر والد خود اٹھے اور لوٹا ہاتھ میں لے لیا، (شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے) اس وقت شاہ صاحب نے ہاتھ منھ پر پانی ڈال کر فرمایا: ''میاں علی متقی! تمام عمر اس کا نام میری زبان پر نہیں آیا، میرا منھ نہیں کہ اس کے لیے خدا کا شکر ادا کروں! میرے والد کہتے تھے ''خدا کا شکر ہے پھر میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا''۔ (۱)

تعلیم عشق: وہ روز و شب خدا کی یاد میں رہتے تھے۔ خدا نے کبھی انھیں شرمندہ نہیں کیا۔ کبھی موج میں آتے تو فرماتے: ''بیٹا (۲) عشق کرو، عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ (۳) بے عشق زندگی وبال ہے، عشق میں جی کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ عشق کی سوزش ہے، پانی عشق کی رفتار ہے، خاک عشق کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی، زندگی عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب اور دن عشق کی بیداری ہے۔ مسلمان عشق کا جمال ہے، کافر عشق کا جلال ہے، نیکی عشق کا قرب ہے، گناہ عشق کی دوری ہے، جنت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت سے بہت بلند ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ آسمانوں کی گردش بھی ''حرکتِ عشقی'' ہے، یعنی وہ اپنے مطلوب تک نہیں پہنچتے اور سرگرداں ہیں۔

---

(۱) علی متقی کے پوتے محسن نے محاکمات الشعرا کے مقدمے میں (کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور میں صرف مقدمہ ہے) اپنے متعلق لکھا ہے کہ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے پاس جا کر کتب تفسیر و حدیث مثل کشاف و بیضاوی و جلالین و مدارک و تفسیر کبیر و صحیح بخاری و صحیح مسلم و صحیح ترمذی و مسند امام حنبل و مسند امام مالک وغیرہ سے متعلق تحقیق کرتا تھا۔ اس نے کسی شیعہ عالم کے پاس جانے یا شیعوں کی مذہبی کتابوں کے بارے میں تحقیق کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اس کے سنی ہونے پر مشعر ہے اور اس خیال کو کہ علی متقی سنی تھے اس سے تقویت پہنچتی ہے۔

محسن، حبیب اللہ پسر شاہ کلیم اللہ کا مرید تھا، وہ لکھتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے وقت کے قطب تھے اور ان کے خلیفہ و جانشین، عمادالدین مشہور بہ درویش محمد تھے۔ (معاصر ۱۲/۳۴۔۳۵)

(۲) عشق کا بڑا وصف یہ ہے کہ تمام رذیل اخلاق شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں۔ بغض، کینہ، حسد، خود پرستی، فخر، غرور فنا ہو جاتے ہیں۔ طبیعت میں رقت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے اور انسان ایک عام محبت اور کشش سے لبریز ہو جاتا ہے۔ حضرات صوفیہ جب طالب کو تزکیۂ نفس کی تعلیم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے عشق و محبت کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صیقل تمام زنگ کو پاک کر دے گا۔ اس مضمون کو نظیری اس طرح ادا کرتا ہے۔

کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم   ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نرسد

(شبلی شعرالعجم ۳/۵۔۴۔۷ طبع ۱۹۲۴)

یہ اور بات ہے کہ میر کے سیرت نگار کو یہ سارے اوصاف ان کی سیرت میں نہ مل سکیں۔

(۳) یہ نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے   سچے ہیں عاشقاں، خدا ہے عشق   (دیوان اول)

بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست　　پیغمبرِ کنعانی، عشق پسرے دارد(۱)

وہ دن بھر عالمِ حیرت میں رہتے اور راتوں کو جاگتے۔ اکثر جبینِ نیاز جھکی رہتی۔ ہمیشہ شرابِ شوق سے سرشار اور دامن پاک۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کا رونق افزا تھا۔ وہ اک آفتاب تھے، مگر اپنے سائے سے بھی گریزاں۔ کبھی آپ میں آتے تو کہتے: ''بیٹے دنیا اک ہنگامے سے زیادہ نہیں، تمھیں چاہیے کہ اس سے ترکِ تعلق کرلو اور اپنے دامن پر علائق کی گرد نہ جمنے دو، عشق الٰہی کو اپنا پیشہ کرو، عاقبت کا دن درپیش ہے، اپنا اندیشہ کرو، جو اہل ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا سہل (حقیر) ہے، زندگی ایک وہم ہے، وہم کی بنیاد پر (امیدوں کے محل) بنانا پانی کو رسی سے باندھنا ہے، اور طول امل میں پھنس جانا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہے۔ آہ بے خبر نہ رہنا کہ چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ زادِ راہ کی فکر کرتے رہیو تا کہ راہ میں کام نہ آجاؤ، ارے اس کی طرف دیکھو عالم کو جس کا آئینہ کہتے ہیں، اپنی ذات کو اسے سونپ دو جسے دل میں تلاش کرتے ہیں، مقصود کا ملنا یقینی ہے بہ شرطیکہ ذوقِ طلب سچا ہو، اگرچہ ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے مگر ہمیں اس کے اظہار میں شرطِ ادب ضروری ہے۔

(نکتہ) خدا کا اپنے بندوں سے وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے ہے، یعنی تمھارا وجود بغیر اس کے اور اس کی نمود بغیر تمھارے نہیں۔ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عینِ ذات تھی، اور نمودِ صوری کے بعد وہی ذات عینِ کائنات ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست　　اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند(۲)

وہ درویش اور درویش پرست تھے، شکستہ دل اور شکستگی کے مشتاق، عجب نیازمند، مسافر در وطن، وسیع المشرب، فقیرِ کامل اور پانی کی طرح ہر رنگ میں شامل، جب کبھی مجھے گود میں اٹھا لیتے اور پیار کی نظروں سے میرا کاہی رنگ دیکھتے تو کہتے: ''اے سرمایۂ جان! یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھپی ہے، یہ کیسی جلن ہے جو تیری جان کو لگی ہے''۔ میں ہنستا جاتا اور وہ روتے رہتے۔ افسوس میں نے ان کی زندگی میں ان کی قدر نہ جانی، وہ اک انسان تھے اپنے مقامات میں گم، کبھی کسی کے لیے بارِ دوش نہ بنتے تھے۔

ایک دن اشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیل کود میں محو پایا بولے: بیٹے زمانہ بہتا ہوا وقت ہے یعنی بہت کم فرصت، اپنی تربیت سے غافل نہ رہو، اس راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں دیکھ بھال کر چلو۔

---

(۱) (مطلب) عشق کے بغیر (قائم) نہیں رہا جاسکتا، نہ بغیر عشق زندہ رہ سکتے ہیں۔ دیکھو پیغمبر کنعانی (حضرت یعقوب علیہ السلام) بھی اپنے بیٹے سے عشق کرتے تھے۔

(۲) مشکل بات تو یہ ہے کہ ہر ذرہ عین ذاتِ خداوندی ہے، پھر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس (ذات خداوندی) کی نشاندہی کرسکیں۔ (یعنی کسی چیز کو لے کر کہہ سکیں کہ یہ خدا ہے، حالانکہ ہر شے کا ظہور خدا کی ذات سے قائم ہے) یہ شعر فغانی کا ہے اور اس نے عطار کے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے۔

پر شد از دوست ہر دو کون ولیک　　سوئے او زہرۂ اشارت نیست　　(شعر العجم ۲/۱۳)

میر کہتا ہے: پایا نہ یوں کہ کریے اس کی طرف اشارت　　یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا　　(دیوان اول)

فغانی کا وطن شیراز ہے، یہ سلطان یعقوب، فرماں روائے تبریز کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۹۲۵ھ میں مشہد میں وفات پائی۔ ایک طرزِ نو کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ (شعر العجم ۳/۳۴)

نشانِ پائے تو فردِ حسابِ زندگی است قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار[1]

یہ کیا کھیل رہے ہو، کس واہیات میں پھنسے ہو، ارے اس سے لو لگاؤ آسمان جس کی رنگین خرامی کی بلائیں لیتا ہے، اس کو دل دو جس کی ہر آن پر دل اور جانیں داری ہوں، اس گل کی بلبل بنو جو ہمیشہ بہار ہے۔ اس سادہ پر مٹو جو سدا سہاگ ہے، آسمان دورنگ کی چال کسی کے لیے بدلتی نہیں، جلدی کرو، فرصت کو غنیمت جانو اور اپنے تئیں پہچان لو۔

ان کی متبرک صورت اس تمام عالمِ اجسام میں معنی مجسم تھی، وہ ایسے متین آدمی تھے کہ انھوں نے عنانِ اختیار کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں جانے دی۔ ایسے پرہیزگار کہ کسی نامحرم کی آنکھ کبھی ان کے ہاتھ پاؤں پر نہیں پڑی۔ اگر تم دیکھتے تو کہتے کہ شاید فرشتہ اور یہ عزیز ایک ہی صورت کے دو روپ ہیں۔ اگلوں نے بھی ایسی خوبی سے استقامت کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ اخلاق حمیدہ، اوصاف ستودہ، طبع مشکل پسند، جان دردمند، آنکھیں نم اور حال درہم۔

سید زادے کو تلقین: (فائدہ) سن رکھو یہ مناسب وقت ہے اور یہ پتے کی باتیں ہیں۔ یہ لباسِ وجود جسے جسم کہتے ہیں مستعار ہے، مستعار لباس کو پاک و صاف رکھنا چاہیے اور روح جو تمھاری ذات پر دلالت کرتی ہے اسے این و آں کے علائق میں نہ الجھانا چاہیے۔ (المصنف)

پاسِ جاں کن تن ندارد اعتبار قالبِ خاکی مزارے بیش نیست[2]

خودی سے گذرو اور اپنے اندر دیکھو، خدا پر نظر رکھو اور توکل کرو۔ نیاز پیدا کرو کہ نماز ہی ہمیشہ کام نہیں آتی، گداز پیدا کرو، کیونکہ بے گداز دل کسی مصرف کا نہیں ہوتا۔ غرور کرنا عیب ہے، اپنے کام خدا کو سونپ دو، جو تم سے زبوں حال ہے اسے بھی ہلکی نظر سے نہ دیکھو، غرور بڑا عیب ہے۔ خبردار اس سے منھ پھیر لو۔ نیازمندی کی عادت ڈالو تا کہ دل سے ربط پیدا کر سکو۔ جہاں تک بن پڑے بکھیڑوں سے بچو، بے کار اپنے اوپر یہ بوجھ مت رکھو۔ دل کو نقشِ غیر سے پاک کرو، جب تک گھر صاف ستھرا نہ کرو گے مہمان کے قابل نہیں ہوگا۔ ہر موافق و ناموافق سے نبھاؤ جب تک آدمی اخلاق پیدا نہ کرے انسان نہیں بنتا۔ ہر شخص سے سلوک کرو۔ یہی فقیر کا مذہب ہے۔ پردیسی کی طرح رہو کیونکہ سفر درپیش ہے۔ یہ عالم عزاخانہ ہے۔ یہاں دیر تک ٹھہرنے کی رسم نہیں۔ دنیا والے ماتمی ہیں، ان کی تسلی کے لیے کوئی دم ٹھہر جاؤ۔ یہ ایک خوفناک جنگل ہے، جہاں سانپ اور چیونٹی بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ زادِ راہ کی فکر کرو کیونکہ قافلہ اچانک چل دیتا ہے، اگر چاہتے ہو کہ اس بیمار خانے سے صحیح سالم نکل جاؤ تو حکیمانہ پانی پیو، پرہیزی کھانا کھاؤ"۔

(نکتہ) فقیر وہ ہے کہ جن چیزوں کا محتاج ہو وہ بھی نہ رکھتا ہو اور غنی وہ کہ اس نے مملکتِ عدم اپنے غیر کے لیے چھوڑ دی ہو۔ ہمیں فقیری ملی ہے: اَللّٰهُ غَنِیٌّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اللہ غنی ہے اور تم سب فقیر ہو) جان لو اس چمن میں ایک ہی گلِ تر ہے جو ہزار رنگ میں جلوہ گر ہے۔ یعنی معشوق ایک ہی ہے لیکن اس کے جلوے بے شمار ہیں۔

---

(۱) تمھارے نقشِ پا بھی زندگی کے حساب کی کھتونی ہیں، اس دنیا میں قدم بھی گن گن کر رکھنے چاہئیں۔ (یعنی زندگی کو بے مصرف و بے مقصد نہیں گنوانا چاہیے۔)

(۲) (مطلب) جان (روح) کی احتیاط کرو، جسم کا تو کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ مٹی کا قالب ایک مزار سے زیادہ نہیں۔

جاؤ کچھ کھا پی کر سو رہو، سفر سے تھکے ماندے آرہے ہو ذرا دیر کو پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ تم نے بہت زحمت اٹھائی ہے۔ ایک نوکر کو اشارہ کیا کہ ان کے آرام کا بہت خیال رکھے اور کسی وقت ان کی خدمت سے دریغ نہ کرے۔

میں ان دنوں سات[1] سال کا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے سے مانوس کر کے گود لے لیا تھا یعنی مجھے میرے ماں باپ کے ساتھ نہ چھوڑتے تھے، اپنا فرزند بنا لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے پاس سے جدا نہ کرتے اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے، چنانچہ میں دن رات انھیں کے ساتھ رہتا تھا اور ان کی خدمت میں قرآن شریف پڑھتا تھا۔

عشق: (نقل) ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے تھے، وہاں ان کی نظر ایک تیلی کے لڑکے پر پڑی وہ ایک دولت مند جوان تھا، یہ (اس کی محبت میں) دل کھو بیٹھے اور ساری استقامت جو رکھتے تھے بھول گئے یعنی تاب نہ لا سکے اور بے قابو ہو گئے۔ جب اس کی جانب سے التفات نہ دیکھا تو دل پکڑے واپس آ گئے۔ ہر چند ضبط کی کوشش کرتے تھے مگر دل بے تاب پر بس نہ چلتا تھا۔ نوکر کا کندھا پکڑ کر زمین پر قدم رکھتے تھے تب کہیں راستہ چلتے تھے، اپنے دل سے کہتے: ''اے عزیز! ایسا واہیات کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تو نے کھیل کر اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رسوا کرایا۔ یا تو ضبط و استقامت کا وہ عالم تھا، یا یہ بے اختیاری ہے، جو حرکت تو نے کی ہے، ایک بچہ بھی نہیں کرے گا، جس راستے پر تو چلا ہے اس پر اندھا بھی قدم نہیں دھرے گا۔ دل ایسی چیز تو نہ تھی کہ ایک بازاری لونڈے پر نچھاور کر دی جائے۔ تیرا دل ایسے کی محبت میں جلا ہے جو کبھی دھوپ چڑھے گھر سے باہر بھی نہیں نکلا اور تو ایسے کا دیوانہ ہوا ہے جو کبھی دل کی راہ میں قدم بھر بھی نہیں چلا۔ یہ آنکھیں اور بھی رونے لگی ہیں گویا منتظر تھیں، جیسے ہی دیکھا ٹوٹ پڑیں، دل اور بھی زیادہ تڑپ رہا ہے جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ آنکھ لڑی اور تڑپنے لگا۔ آنکھوں پر کہاں تک نظر رکھوں، دل کی کب تک خبر رکھوں، کبھی جوانی میں آنکھ نہ لگائی تھی۔ اب بوڑھے منھ مہاسے نکل رہے ہیں۔ اگر خود کو سنبھالتا ہوں تو دل تڑپ تڑپ کر قیامت ڈھاتا ہے اور ضبط کی کوشش کرتا ہوں تو آنسوؤں کا سیلاب امڈا آتا ہے، حیران ہوں کہ کیا کروں کون سی تدبیر سے یہ گتھی سلجھے۔ اب پیر و مرشد کی توجہ کے سوا چارہ نہیں پاتا ہوں جو کچھ بھی ہو ان کی خدمت میں جاتا ہوں۔

اسی حال تباہ سے آنکھوں میں اشک اور لبوں پر آہیں لیے ہوئے، مغرب کی نماز کے قریب نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر درویش کی خدمت میں آئے۔ حاضرین نے تعظیم کی (درویش نے) اشارہ کیا، انھیں صدر میں جگہ دی گئی۔ (والد نے) کہا: ''ارے بھائی کہاں تھے؟ آج بڑی دیر میں صورت دکھائی''۔ انھوں نے عرض کیا: ''جمعہ بازار کی سیر کرنے گیا تھا، فرمایا: ''تم نے شاید یہ نہیں سنا؟ (المصنف)

مستمندِ عشق ی داند کہ سودا می کند　　　دیدنِ طفلانِ تہ بازار رسوا می کند[2]

---

(۱) زمانہ ۱۱۳۲ھ/ ۳۰-۱۷۲۹ء

(۲) (ترجمہ) عشق کا گرفتار ہی جانتا ہے کہ بازاری لڑکوں کا دیکھنا رسوائی کا سبب ہوتا ہے اور جنون پیدا کرتا ہے۔

''جاؤ، اپنی کوٹھری سے آٹھ دن رات تک باہر نہ نکلنا، اور اس واقعے کو ہرگز یاد نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کریم ہے شاید اسے پہنچا دے اور تمھاری لاج رکھ لے!''

اتفاق دیکھیے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ شام کے وقت وہ چودھویں کا چاند اپنے گھر سے نکلا اور بیتاب سا (اپنی) دکان پر بیٹھ گیا۔ ایک دلال وہاں کھڑا تھا اس نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ آج رات تمھارا رنگ ہی بدلا ہوا ہے، بہت بے چین نظر آتے ہو''۔ لڑکے نے کہا: ''کیا بتاؤں جو مجھ پر گذر رہی ہے، زبان تک نہیں لا سکتا۔ مگر تجھے دوست جانتا ہوں تجھے بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آج چھٹا دن ہے ایک درویش اس راستے گذر رہے تھے ان کی نگاہ میری رعنائی پر پڑی، کچھ دیر کھوئے ہوئے سے کھڑے رہے، میں نے اپنی اکڑفوں میں ان کی جانب التفات نہ کیا ناچار انھوں نے جلے ہوئے دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چلے گئے۔ اب نہ ان کی صورت میری نظروں سے جدا ہوتی ہے نہ دل سے ان کا خیال جاتا ہے، سوتے جاگتے انھیں کا تصور اور انھیں کی یاد ہے۔ کیا کروں؟ دل کو کیسے بہلاؤں؟ ان کا نام کس سے پوچھوں؟ اتا پتا کہاں دریافت کروں، کدھر جاؤں، اپنا غم کسے سناؤں؟'' (دلال نے) کہا: ''ارے وہ تو مشہور درویش ہیں، بڑے بے خویش ہیں، خلق ان کے آستانے پر جھکتی ہے، عالم ان کا مرید ہے۔ وہ علی متقی کے چھوٹے بھائی ہیں جو مشہور آفاق ہیں اور اس نیلی چھتری کے نیچے طاق ہیں، ان کا آستانہ جس کی خاک بطور تبرک لے جاتے ہیں، شہر پناہ سے باہر عیدگاہ کے قریب ہے، میرے ساتھ آؤ اور بندِ غم سے چھٹکارا پاؤ''۔ غرض وہ مرد فرومایہ جوان کو میرے والد کی خدمت میں لایا۔ انھوں نے حقیقت حال سن کر فرمایا: ''آخر عشق بے پروا نے تغافل کا انتقام لے ہی لیا''۔ ایک نوکر کو اشارہ کیا کہ جا کر برادرِ عزیز سے کہہ دے کہ آؤ تمھارا مطلوب تمھیں ڈھونڈتا ہے''۔ جب یہ حکم، اس خوش خبری کے ساتھ اس جگر خستہ گوشہ نشین نے پایا تو کلبۂ احزاں سے دست افشاں و پاکوباں باہر آیا۔ پہلے پابوسی کے لیے پیر و مرشد کے قدموں میں سر نیاز جھکایا پھر دستِ شوق لڑکے کی طرف بغل گیر ہونے کے لیے بڑھایا، یعنی دل کی خواہش کے مطابق اسے سینے سے لگایا اور اپنی تمنا کے موافق اس نخلِ مراد کو پایا۔ پیر نے دونوں کو اجازت دی کہ علاحدہ بیٹھ کر بات چیت کرلیں۔ جب باتیں چھڑیں اور قصہ نکلا تو درویش (میر امان اللہ) نے کہا: ''اے جوانِ رعنا' میں فقیر ہوں اور دل بے مدعا رکھتا ہوں مجھے اپنی زلف کا اسیر نہ جانیو، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دل کہاں اٹکا ہوا ہے اور یہ سراپا خواہش جان کا ہے کی آرزومند ہے، خبردار اس گھمنڈ میں نہ رہنا اور نازنخرے نہ دکھانا ایسا نہ ہو کہ افسوس کرنا پڑے، درویش لوگ اگرچہ اس اوندھے آسمان کے دائرے سے باہر ہیں (یعنی عام لوگوں سے مختلف ہیں) لیکن انھیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا یعنی ہم لوگوں کا حال مختلف ہے۔ اچھا جاؤ تم نے بہت رنج اٹھایا ہوگا!''

(لڑکے نے) کہا: ''میں نے رنج تو اٹھایا، مگر گنج بھی پایا۔ میں اس آستانے کی جاروب کشی کو سعادت جانتا ہوں، امید ہے کہ آپ مجھے محروم نہ فرمائیں گے اور میرے حال سے عنایت کی نظر نہ اٹھائیں گے''۔ وہ ہر روز صبح آ کر بیٹھتا تھا اور دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔

ایک دن درویش (میر امان اللہ) کسی خاص کیفیت میں بیٹھے تھے، ایسے میں وہ جوان آ گیا "جوانِ عزیز[1]" کہہ کر بلایا اور اپنے پاس بٹھایا۔ اس کے حال پر ایسی نظر فرمائی کہ اس نے اپنا مقصودِ دلی پایا اور اسی لقب سے عالم میں مشہور ہوا۔ شہر کے بڑے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ دوسرے خاص مرید اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آخر اس کا یہ حال ہوا کہ میدانِ طریقت میں بے مثال ہوا۔ سچ ہے جب درویشوں کی نگاہ اثر کرتی ہے تو خاکِ ناچیز کو زر کرتی ہے۔

احسان اللہ: (حکایت) درویشِ جگر ریش، یعنی عم بزرگوار (میر امان اللہ) ہفتے میں ایک بار، احسان اللہ نامی ایک فقیر سے، جو ایک مردِ آزاد تھے، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے، ان کا بڑی ستھری لپی پتی چار دیواری کا مکان جس کا دروازہ بند، دیواریں بلند، فقیر کا تکیہ، کر کے مشہور تھا، اس دل جلے کے دروازے پر یہ شعر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

خاطرِ آسودہ خواہی راہِ آمد شد بہ بند چاک در پیراہنِ دیوار از دستِ دراست[2]

اگر کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا تو وہ خود آتے اور جواب دیتے کہ "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے، بھاگ جاؤ، یہ گھر خالی ہے"۔ ایک بار میرے چچا نے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔[3] جب دروازے پر پہنچے تو وہی جواب ملا کہ "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے"۔ چچا نے کہا: "اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے!" ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں گٹھے ہوئے ہاڑ کا جوان ہے خورشید سوار! جس کی پیشانی سے ہیبتِ حق نمودار۔ اکہری بڑی چادر سر پر، ایک لنگی کمر پر، رعب دار سرخ آنکھیں! جیسے شیرِ عشقِ الٰہی سے سو گیا ہے اس در پر۔ مصافحہ ہوا، پہلو کے سائے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی۔ فرمانے لگے: "میاں میر امان اللہ میں نے گوشہ نشینی اس لیے اختیار کی ہے کہ ملنے کی گوں کا آدمی نہیں ملتا۔ تمھیں دل بہت چاہتا ہے جب تک نہیں آتے کھلتا رہتا ہے۔ اور ہاں، یہ بچہ کس کا ہے؟" چچا نے کہا: "علی متقی کا بالا اور میرا گود پالا ہے۔" فرمایا، اس بچہ کے ابھی کلیاں نکل رہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اچھی طرح پر نکل آئے (تربیت ڈھنگ سے ہوگئی) تو ایک ہی اڑی میں آسمان کے پار پہنچے گا۔ اس بابا سے کہو درویشوں کی ملاقات کو معمول بنائے کہ فقیروں کی صحبت میں بڑی برکت ہوتی ہے۔" پھر سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھانے کے لیے مجھے دیا۔ میں نے ایسی لذت کا کھانا کبھی نہیں کھایا تھا، ابھی تک میرا ذائقہ اس کی یاد میں چٹخارے لے رہا ہے، وہ مزہ آج تک لطف دے رہا ہے۔

درویش کے ارشادات: (نکتہ) فرمانے لگے کہ اے یارِ عزیز اللہ کی معرفت اس صحرائے پرغبار (دنیا) میں ایک وحشی ہرن ہے، روح شہ سوار اور گھوڑا انسان کا بدن ہے۔ اگر یہ شکار مل جائے تو بلا سے گھوڑا (مٹی میں) رل جائے، لیکن اگر

---

(۱) سب فقیروں سے بازی لے گیا اور عالم میں مشہور ہوا، مگر افسوس کہ میر نے اس کا اصلی نام تک ظاہر نہیں کیا اور نہ کسی کتاب میں خیر اس کے پیر و مرشد بلکہ مرشد کے مرشد کا بھی ذکر نہیں ملتا۔

(۲) (ترجمہ) اگر تجھے اطمینانِ قلب درکار ہے تو آمد و رفت کے راستے بند کر دے۔ (یعنی لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے) دیوار کے پیراہن میں چاک دروازے ہی کی وجہ سے ہے (یعنی زیادہ میل جول یادِ الٰہی میں قلب کو یکسو نہیں ہونے دیتا۔)

(۳) زمانہ تقریباً ۱۱۴۳ھ/۳۱-۱۷۳۰ء

گھوڑا مر گیا اور شکار بھی چھڑ گیا تو انجام وہ حسرت ہے جس میں ہر عذاب سے زیادہ شدت ہے، عذابِ قبر بھی اسی حال سے عبارت ہے۔

(موعظت) آؤ، غرور و ہوس سے نکل جاؤ۔ نفسِ امارہ تو حریص کتا ہے، اگر اس کے کہے پر قطعِ راہ کرو گے تو اپنے تئیں تباہ کرو گے، ہاں اگر مجاہدہ کر کے خودی سے گذر گئے تو سمجھو انسانیت کی منزل سر کر گئے! بے سمجھ طولِ امل کی برائیوں کو نہیں سمجھ پاتا مگر عقلمند اپنے لیے پھانسی کا پھندا خود نہیں بناتا۔

(نکتہ) یہ آسمان ایک طلسماتی پردہ ہے جس پر عجیب و غریب شکلیں اور صورتیں نمودار ہوتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ یہ آنا اور جانا شکل و صورت کے اختیار میں نہیں اس کی ڈور کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھو دنیا کو دل نہ دیجیو کہ یہ بے شرم قحبہ ہے جب باپ اٹھ جاتا ہے تو بیٹے سے ہم بستر ہو جاتی ہے جو اہلِ میرت اور صاحبِ غیرت ہیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔

(فقیرانہ باتیں) ریاکار لوگ از راہ خود پسندی، اس بے حقیقت زندگی پر جو پلک جھپکاتے تمام ہوتی ہے، کیسے پھولے ہوئے ہیں اور عناصر کی اس چار دیواری میں جسے دنیا کہتے ہیں اور جس سے جلد ہی گذر جانا چاہیے، اقامت کو جاودانی سمجھ کر کیسی فراغت سے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ وہ ظاہر میں (کتنے ہی) ہشیار (نظر آئیں) لیکن واقع میں بے خبر ہیں یعنی حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں، ان کی خلوتِ باصفا سراسر کدورت ہے، ایسوں کی صحبت میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بابِ صحبت تو وہ بے نوا درویش ہیں جو درخت کے سائے کا بوجھ بھی اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہیں، یا وہ برہنہ تن فقیر جو ہمہ اوست کا دم بھرتے ہیں۔ یا وہ گدڑی پوش پہلوان جو نفسِ امارہ سے جہاد کرتے ہیں، یا وہ درویشانِ جگر ریش ہیں جو بے گانۂ یار و خویش ہیں، جن کی پیشانیاں آلودۂ خاک ہیں اور دل بہتے ہوئے پانی کی طرح پاک ہیں۔ یہ بیشۂ فقیری کے شیر خونِ دل پینے والے، بحرِ بے جوش اور طوفانِ بے خروش ہیں۔ کوچۂ محبت کی خاک اڑانے والے، بیابانِ وحشت میں دھونی رمانے والے، وہ بندے جو خدا سے واصل ہیں۔ سب سے دور رہتے ہیں مگر نزدیک دل ہیں، جلوۂ یار کے دلدادہ، معشوق کے سایۂ دیوار کے خاک افتادہ، بحرِ حقیقت کے شناور اور بیشۂ طریقت کے رہبر ہیں۔ وہ آوارگانِ منزل رسیدہ جن کے سائے سے آفتاب ابھرتا ہے۔ وہ خاک نشین جو آسمان پر کمند ڈالے ہوئے ہیں، وہ گوشہ نشین جو نام نکالے ہوئے ہیں، وہ دشتِ مہر و وفا کے دیوانے اور گلشنِ حیا کی خوابیدہ کلی سخت پتھر جن کی بالش ہے اور علامتِ دیوانگی ان کی پوشش۔ پیٹ سے پتھر باندھتے ہیں، مگر شکایت نہیں کرتے، حریص نہیں، لذیذ کھانا اگر مل بھی جائے تو اس کی طرف رغبت نہیں کرتے، روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں۔

وہ عجب زرد رخسار ہیں (عشق کے) پرانے بیمار ہیں، مزاج کے ایسے غیور کہ جسے دیکھنے کے لیے مرتے ہیں اسی سے صرف نظر کرتے ہیں۔ سر میں وہ پندار رکھتے ہیں کہ جب تک معشوق کی تیغ ناز ہی نہ بٹھا دے خود نہیں بیٹھتے۔ محبوبِ حقیقی کو جس سے وہ اتحاد رکھتے ہیں، کمالِ ذوق و شوق سے دن رات تلاش کرتے ہیں! وہ ایسے جنگ آور ہیں کہ انھوں نے بہتر فرقوں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دیا ہے اور ایسے کیمیاگر، کہ ناچیز خاک کو ہزار بار سونا بنا دیا ہے۔ درویش اس کارخانۂ ہستی میں متصرف ہیں، یعنی جو کچھ ہیں وہی وہ ہیں جو چاہو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر دے سکتے ہیں، یعنی حاصلِ ہر دو جہاں ہاتھ

بڑھا کر دے سکتے ہیں۔ ایسے درویشوں کا ذکر کرو، ان سے طلب ہمت کی فکر کرو، بن سکو تو ان جیسے بن جاؤ، یعنی درویش کہلاؤ۔ حقیقت کا دریائے عظیم جس کا راستہ بند ہے، اس کی کنجی درویشوں کی زبان ہے۔ پانی پر جانماز پھینکنا اور بے تکلف چلنا درویشوں کی شان ہے۔

جب جھٹپٹا ہوا، تو فرمایا: ''اے یارِ عزیز مغرب کی نماز کا وقت آیا، اگرچہ تمھیں رخصت کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن طلوع و غروب آفتاب سے قبل خشوع و خضوع کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بیٹھنا نہیں چاہیے۔ جاؤ علی متقی سے میرا سلام کہہ دینا''۔

ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کرلیا۔ چچا نے وہاں سے آکر فقیر کا سلام میرے والد کو پہنچایا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام لیا اور فرمایا کہ ''احسان اللہ کی ملاقات کو اللہ کا احسان سمجھنا چاہیے۔ جاتے رہو اور میرا بھی سلام پہنچاتے رہو۔ چوتھے دن چچا پھر ان کے گھر گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے کر گئے، دستک دی وہی جواب ملا ''گھر میں نہیں ہوں۔'' چچا نے فرمایا: اگر تم نہیں ہو تو کون ہے جس نے میرے دوست کے گھر میں دھرنا دیا ہے''۔ (احسان اللہ) ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ ہم عجب سعادت سے مالا مال ہوئے یعنی ان کی پر مغز باتیں سنیں اور عنایات بے حد سے نہال ہوئے۔

فرمایا: ''اے عزیز عشق نے جب سے مجھے ٹھکانے لگایا ہے اور محبت کا نقش اچھی طرح میرے دل پر بٹھایا ہے یہاں کی کوئی چیز میری نظروں میں نہیں سماتی اور یہ دنیا دل کو قطعاً نہیں بھاتی۔ تجرد پیشہ ہوں، بے اندیشہ ہوں، اگر سارا عالم درہم برہم ہو جائے تو بھی میری جمعیت خاطر میں فرق نہ آئے، اگر آسمان زمین پر آپڑے تو بھی ممکن نہیں میرا دل کہیں جا پڑے، جب آنکھ بند کرتا ہوں تو اس کے مکھڑے پر کھولتا ہوں جو سورج مکھی سے زیادہ نازک ہے۔ یعنی نگاہِ گرم کی تاب نہیں لاتا۔ جب سر بگریباں ہوتا ہوں تو اس دلبر کا تماشائی بن جاتا ہوں جس کا جلوہ برق سے ہزار درجہ شوخ تر ہے، یعنی پل بھر کو میرے دل سے نہیں نبھاتا۔ میرا یار محشر خرام اگر رفتار میں آوے، عالم تہ و بالا ہو جاوے، میرا بلند بالا اٹھ کھڑا ہو، تو فتنۂ قیامت اٹھاوے، اس کے کوچے کی خاک ہو جاؤ تاکہ تم سروں کے تاج ہو جاؤ۔ اس کے پائمال ہوتا کہ اہلِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ کہلاؤ۔ ایسا دل لاؤ جسے وہ پسند کرے ایسی جان پیدا کرو جو اس سے پیوند کرے۔ کسی اپنے سے بہتر کے ہاتھوں میں ہاتھ دو کہ اسی سے یہ منزلِ دشوار ہاتھ آتی ہے، خبردار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیو کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے سے راہ پست ہو جاتی ہے۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، موت ایک عجیب تبدیلی ہے جو پیش آتی ہے، اپنے احتساب سے غافل نہ رہو، یعنی اپنے تئیں دشمن کی نگاہ سے دیکھو کہ یہی دوستی جانی ہے، حال جان ہوشیار بدن سے مفارقت کے بعد ایسا ہے جیسے کوئی مست ہو معشوق درکنار۔ چونکہ اس عالم میں تجدد امثال نہیں ہے، ایک طویل مدت کے بعد جب وہ مستی جسے دنیا کی لگاوٹ کہیے زائل ہو جاتی ہے تو دفعتہً لذتِ وصل حاصل ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے اس ناآگاہ کی جان پر جو اس دنیا سے دور ہو جائے اور اس عالم سے کوئی نسبت قائم نہ کر پائے۔ پھر وہ متاسف رہتا ہے اور (ملال و مسرت کی) انھیں دو کیفیتوں کو عارف بہشت دوزخ کہتا ہے''۔

(موعظہ) ''اے یارِ عزیز! دل اگر درد آشنا ہے تو بہتر ہے، غم اگر دل گداز ہے تو شائستہ تر ہے۔ (درویش) دل محزوں تلاش کرتے ہیں شائستۂ طرب نہیں جان دردمند چاہتے ہیں درمان طلب نہیں، روئے نیاز اس کی طرف لاؤ جو بے نیاز ہے، سب کام اسے سونپ دو جو کارساز ہے، گوشہ نشین ہو جاؤ اور توکل کرو، اپنے اندر کھو جاؤ اور غور و تامل کرو، اگر جان میں نیازمندی پیدا ہو جائے تو عنقا ہے۔ دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے۔ (لمصنفہ)

مدعا نایاب و راہِ جستجو دور و دراز   پا بدامن ہم نشیں ناچاری باید کشید[۱]

(نکتہ) اے یارِ عزیز، وہ یکتا پیرہن معشوق، جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہو جاتا ہے، کبھی پھول ہے، کبھی رنگ، کہیں لعل ہے، کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کرتے ہیں، بعض رنگ پر مرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے، دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار! یہاں لغزش کا اندیشہ ہے، ایسی آنکھ چاہیے جو اس کے غیر پر نہ کھلے، وہ دل ہو کہ کسی اور پر نہ ڈھلے۔ دشمن اور دوست سب اسی سے ہیں، کیونکہ دل تصرف میں اسی کے ہیں۔ ہدایت اور گمراہی دونوں اسی کے مظہر ہیں، مست اور ہوشیار سب اسی کے رہ سپر ہیں، محراب اس کی ابرو سے پیدا ہوئی ہے اور مے خانہ اس کی آنکھ سے ہویدا۔ زاہدانِ مناجاتی عبادت و طاعت کا ثواب کماتے ہیں۔ زاہدان خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر پھوڑا کر جاؤ، خرابات میں رندانہ وضع سے آؤ یعنی ہر موقع کی رعایت لازم رکھو اور ہر مرتبے کا پاس دکھاؤ۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، ہستی واجب (خدا) دلیل و برہان کی محتاج نہیں ؎

ہر کہ برحق دلیل می گوید   بچراغ آفتاب می جوید[۲]

بس سورج نکلا اور دن پھیل گیا۔ اگر کوئی مالک نہ ہو تو آسمان گر پڑے اور پہاڑ کھڑا نہ رہ سکے، نہ سورج تابش کرے، نہ چاند گردش، نہ آگ جلائے، نہ ہوا بجھائے، نہ بادل برسے، نہ بجلی تڑپے، نہ پانی بہے، نہ گھاس اگے، نہ پھول کھلے، نہ چمن ہنسے، نہ پھل پھلے، نہ پیڑ جمے۔

حق سبحانہ تعالیٰ جسے کریم کہتے ہیں، اس صفت کے غلبے پر نظر کر کے سررشتۂ زندگی ہاتھ سے نہ دینا چاہیے کہ وہاں تو صاحبی ہے، جب وہ نوازتا ہے تو خاک کو آدمی بنا دیتا ہے، اور جب بے نیازی پر آتا ہے تو آدمی کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی شان میں ہے۔[۳] ''لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ'' (اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) تمام تمام رات نماز پڑھتے اور اتنا قیام فرماتے تھے کہ پائے مبارک سوج جاتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے ''یا رسول اللہ آپ اتنی ریاضت کیوں فرماتے ہیں، آپ نے تو سارے عالم کو بندِ غم سے نجات دلا دی ہے۔'' (حضور اکرمؐ) تبسم فرماتے اور ارشاد ہوتا ''کیا کریں ہم تو بندے ہیں'' تو میرے عزیز! بندگی اور صاحبی کا رشتہ بڑا نازک

---

(۱) (ترجمہ) ہمارا مدعا نایاب اور راہِ جستجو بہت دراز ہے اس لیے اے ہم نشیں گوشہ گیر ہو جانا ناگزیر ہے۔

(۲) (ترجمہ) جو خدا کے وجود پر دلیلیں بیان کرتا ہے وہ گویا سورج کو چراغ لے کر تلاش کرتا ہے۔

(۳) میر نے ''در شانِ اوست'' لکھا ہے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیت قرآنی ہے، اسے حدیث قدسی کہا جاتا ہے لیکن اکثر علمائے حدیث نے اسے موضوع بتایا ہے۔

ہے۔ بندگی لاؤ تا کہ اپنے آقا کے سامنے شرمندگی نہ اٹھاؤ''۔

یہاں تک بات پہنچی تھی کہ شہر کے صوبہ دار کا چوبدار آیا اور اس کا سلام پیش کر کے کہا کہ نصرت یار خاں[۱] قدم بوس کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا: ''خیر اچھا، ہر چند وہ فقیروں سے ملاقات کا منھ نہیں رکھتا، لیکن مجھے اس سے شرم آتی ہے کئی بار لوٹ کر جا چکا ہے۔ اگر اس بار بھی واپس جائے تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو پائے''۔ جب (صوبہ دار) دروازے پر آیا تو ہاتھی سے اتر کر دوڑا، شرفِ پابوسی سے سرفراز ہو کر پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ (احسان اللہ نے) فرمایا: ''خوب آئے، خوش رہو''۔ (صوبہ دار نے) عرض کیا: ''زہے قسمت کہ میں نے آپ کی خدمت میں بار پایا اور خواہشِ دل کے مطابق دیدار پایا'' درویش کا التفات دیکھا تو التجا کی کہ ''کبھی کبھی اس روسیاہ کو نوازتے رہا کیجیے''۔ فرمایا: ''دل قوی رکھو، تمھیں اعتبار ملا ہے، یعنی خدائے عز و جل کی طرف سے اقتدار ملا ہے۔ اغلب کہ وہاں سرخرو پہنچو۔ اس نعمت کے شکر میں بے کسوں کو نوازیو، یعنی بے مروت نہ بنیو، اور انھیں ذلیل نہ کریو، خدا سے شرم کرتے رہیو، اینڈیومت، غریبوں کے کام میں کسی کا منھ مت دیکھیو، خبردار بے کسوں سے منھ نہ موڑیو، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن منھ نہ دکھا سکو۔ اچھا اب جاؤ کیونکہ یہ یارِ عزیز (میر امان اللہ کی طرف اشارہ) شیشہ جان اور نازک مزاج ہیں اور میں ان کی پاس داری کرنے میں لاعلاج''۔ صوبہ دار نے غریبانِ خاکسار کی طرح اپنا چہرہ زمین پر ملا اور فقیر کی چوکھٹ کو بڑے اعتقاد سے چوم کر چلا۔

احسان اللہ کی وفات: اتنے میں ایک گویے کا لڑکا، گھونگھریالے بال، کتابی چہرہ، عودی رنگ، خوش گلو، کندھے پر طنبورہ، کانوں میں سونے کے بالے، اس راہ سے گذرا، فقیر کی نظر اس پر پڑی، بے اختیار دل دے بیٹھے۔ میرے چچا سے فرمایا: ''اسے بلاؤ اور بٹھاؤ''۔ جب وہ لڑکا آ کر بیٹھا تو خود بخود آمدی قبلان کا یہ شعر بھیرویں میں، جو ایک راگنی ہے اور بے وقت الاپی جاتی ہے، گانے لگا:

بیا کہ عمرِ عزیزم بہ جستجوے تو رفت　　ز دل نہ رفتی و جانم در آرزوے تو رفت[۲]

درویش کو وجد آگیا اور بہت محظوظ ہوئے۔ اس سے کہا: ''اے عزیز آج رات فقیر کے ہاں رہ جاؤ اور جو چیزیں تمھیں آتی ہوں بطورِ خود سناؤ''۔ لڑکے نے عرض کیا: ''یہ تو میرے لیے سعادت اور مجھ پر منت ہے''۔

چونکہ شام ہو چلی تھی، ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا اور یادِ الٰہی میں بیٹھ گئے۔ پھر سنا گیا کہ جب فقیر نے عشا کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو اشرفیوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس سیاہ دل گویے نے تاڑ لیا، تھوڑی دیر کے بعد بازار گیا،

---

(۱) سید نصرت یار خاں ساداتِ بارہہ میں سے تھا۔ عہد محمد شاہی کا ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ ہدایت اللہ نام اور رکن الدولہ خطاب تھا۔ یہ سید قاسم بارہہ (شہامت خاں) کا برادرزادہ تھا (مآثر الامراء) تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۲۲ رمضان ۱۱۴۴ھ کی شب کو دہلی میں انتقال کیا (تاریخ محمدی، قلمی نسخہ رام پور) کا مورخاں کی تاریخ (نسخہ پٹنہ) میں بھی یہی تاریخ ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس کی نعش پٹنہ بھیجی گئی تھی۔ اس میں عظیم آباد کی صوبہ داری کا بھی ذکر ہے۔ (بحوالہ معاصر ۲۰۹/۸)

نصرت یار خاں میر کی ولادت سے ایک سال پہلے مر چکا تھا اور اس کے صوبہ دار آگرہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ میر یہ واقعہ تقریباً ۱۱۴۴ھ کا لکھ رہے ہیں۔ یا تو انھیں صوبے دار کا نام یاد رکھنے میں تسامح ہوا، ورنہ ''حافظہ نباشد'' والا معاملہ ہے۔

(۲) (ترجمہ) اے محبوب آ جا کہ میری عمرِ عزیز تیری جستجو میں گذر گئی، میری جان بھی تیری تمنا میں نکل گئی مگر تیری یاد دل سے نہ نکلی۔

وہاں سے ایک پیالہ دودھ میں زہر ملاکر لایا اور سر ہوکر درویش کو پینے کے لیے دیا، دودھ کا پینا تھا کہ درویش کی حالت دگرگوں ہوگئی، انھوں نے ہاتھ پاؤں پھینکنے شروع کیے، یعنی زہر اپنا کام کر گیا۔ وہ سنگ دل ناہنجار اشرفیاں اٹھا کر چلتا بنا۔ آدھی رات کو درویش کی دل خراش آہ آہ نے ہمسایوں کی نیندیں اڑا دیں۔ گھبرا کر دوڑے تو (درویش کو) جاں بلب پایا۔ کچھ لوگوں نے اس عیار کو بہت ڈھونڈھا مگر وہ رات کی تاریکی میں ایسا چھپ گیا کہ کسی کو نظر نہ آیا۔ جب رات آخر ہونے آئی تو درویش نے دنیا سے آنکھ چرائی اور جانِ شیریں بڑی تلخی سے سپرد کی۔ شہر کے سرکردہ لوگ انتہائی رنج و ملال کے ساتھ ان کے جنازے میں شریک ہوئے اور ان کی وصیت کے مطابق فقیر کے تکیے میں دفن کردیا۔ اب تک وہ جگہ زیارتِ گاہ عزیزاں ہے"۔[۱] (المصنفہ)۔

فلک زیں گونہ خوں بسیار کروست   عزیزاں را بسے آزار کروست[۲]

اس اوچھے آسمان کے غمزے نئے نئے ہیں اور نخرے نرالے! آئے دن خاک نشینوں کو ستاتا ہے، ہر شب نیا فتنہ اٹھاتا ہے، کسی کی زہر ہلاہل سے جان گنواتا ہے، تو کسی کو تیغ ستم سے گھائل کرکے خاک میں لٹاتا ہے۔ محبت کے متوالوں کو چاہیے کہ اس کی گردش سے نچنت نہ رہیں تاکہ سختی نہ اٹھائیں اور اپنی راہ سے بھٹک نہ جائیں۔

بایزیدؒ: (حکایت) میرے چچا کو درویشوں کی صحبت میں جانے کا ذوق اور ان جگر ریشوں سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دن کسی سے سنا کہ بایزید نامی ایک فقیر سرائے گیلانی کے قریب، جس کی عمارت سیلاب نے بہا دی تھی، ایک حجرے میں جو عاشقوں کے دل کی طرح ہزار رخنے رکھتا تھا، پڑے رہتے ہیں اور وہ قابلِ زیارت ہیں۔ جب اس فقیر کا پتا مل گیا تو دل کا اشتیاق بڑھا اور ہر چیز سے جی اچاٹ ہوگیا۔ مجھے چھوڑ کر، بھاگم بھاگ گئے۔ دیکھا ایک جوان ہے، بلند بالا، نہایت بے پروا، گویا فرشتہ اس دنیا میں اترا ہے، نہیں نہیں بلکہ جانِ آدم اس کے آگے کیا ہے، پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا، ہر وقت ہلاک ہونا، شکستہ دل، کشادہ رو، سوختہ جاں، فتیلہ مو، دلدادہ، خاک افتادہ، توکل پسند اور مقصود دلی سے بہرہ مند۔ اگر کوئی خوش چشم ان کے سامنے سے نکلتا تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، کسی سے نہ ملتے، بے کسانہ جیتے تھے۔ اکثر اوقات آنکھیں موندے رکھتے، دل کو خدا کے دھیان بن نہ چھوڑتے، روٹی سے منھ موڑتے اور حلق پر پانی کی بندش رکھتے تھے، سخت کوش اور باریک بیں تھے۔ قلندرانہ پوشش رکھتے تھے۔ (چچا سے) پوچھا "کیا نام ہے؟ اور کہاں کے ہو؟ دردمند اور عاشق پیشہ دکھائی دیتے ہو"۔ (چچا نے) کہا: "اسی شہر میں رہتا ہوں، مجھے میر امان اللہ کہتے ہیں"۔ فرمایا: "بیٹھ جاؤ، کچھ دیر خوش وقتی کرلیں"۔ چچا کہتے تھے جب بات چلی تو (بایزید) بولے کہ "اے عزیز، میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں، بہت رنج جھیلے ہیں، اپنے تئیں رمایا ہے، بہت کوچوں میں گھمایا ہے، ابر کی طرح گھرا ہوں، برق کے مانند گرا ہوں، ایک عمر سرگرداں رہا، ایک مدت دل پریشاں رہا، کچھ دن باچشم تر پھرا، آوارۂ دشت و در پھرا، کتنی راتوں کو نہ سویا، کتنے دنوں کسی سے بات نہ کی، کبھی ہاتھ امیروں کے دامن پر مارا کبھی سر فقیروں کے مسکن پر، تب کہیں اس شوخ چشم کا مجھ پر گذار ہوا اور وہ میرے حال تباہ سے خبردار ہوا۔

---

(۱) لیکن اب اس جگہ کا کچھ نشان نہیں ملتا نہ کسی اور کتاب میں حوالہ دیکھا گیا۔

(۲) (ترجمہ) آسمان نے ایسے کتنے ہی خون کیے ہیں اور (خدا کے) پیاروں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں۔

دیر بر سر آں غزالِ دورگرد آمد مرا از طپیدن ہاے دل پہلو بدرد آمد مرا[1]

اگر تم چاہتے ہو کہ اس کی راہ میں سختی جھیلنے والے شمار کیے جاؤ تو چاہیے کہ فولاد کا دل اور پتھر کا کلیجہ لاؤ۔

(سخنانِ غریب) اے عزیز اگر وہ بانکا چھب والا آنکھوں کے سامنے ہے، تو یہی بہشت جاوید کا عالم ہے، اگر وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو یہی عاشقِ ناامید کا جہنم ہے۔ جان رکھو حقیقت کا اور چھور نہیں ملتا۔ یعنی ہمیں کچھ پتا نہیں۔ کیا جانے زاہدانِ ریاضت پیشہ کیا ٹھانے ہوئے ہیں اور اس مست سرانداز کے متوالے کیا جانے ہوئے ہیں۔ ایک جماعت کو خواہش کی خلش ہے تو دوسری کو کاہش کی کاوش۔ مگر جو حق شناس ہیں، وارستۂ امید و یاس ہیں۔ وہ عزیز جو خدا کے ہو گئے، اس کی رضا میں کھو گئے۔ عاشقوں کی جان کو تلخیوں سے ضرور پالا پڑا ہے، مگر ان کا خون میٹھا بڑا ہے (یعنی وہی لذت اندوز بھی ہیں) رنج کو گوارا کرو کہ اپنے تئیں شایانِ راحت بنا سکو۔ کڑیاں جھیلو کہ بفراغت یہاں سے جا سکو۔ اس دنیا سے دل اٹھانا اچھا ہے، اگر معرفتِ حق میسر نہ ہو، تب بھی یہ کیا برا ہے؟ دنیا کی عمارت ڈھے جانے والی ہے۔ اس کی بنیاد وہم پر مطلق ہے۔ یہ نیلے گنبد والا آسمان گر جانے والا ہے کیونکہ ہوا میں معلق ہے۔ اگر مقصود تک پہنچنا چاہو تو کسی دل میں راہ کرو اور جو کچھ خدمت تمھارے دست کوتہ سے بن پڑے، للہ کرو۔ اگر تم دریا کے شناور ہو، تہ تک نہیں پہنچ سکتے، تو خیر کنارے پر رہو، یعنی اگر اک دم اپنے ہلاک پر قادر نہیں ہو تو جان دینے کو آمادہ اشارے پر رہو! خود کو دیر و مسجد کی قید سے بچاؤ یعنی خدا کے بنو اور سب جگہ جاؤ!

(فائدہ) عارفوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک جماعت کے لوگ نقشِ دیوار ہیں، گویا بے زبان ہیں، یعنی اس پرکار کی صنعت گری و تازہ کاری کے حیران ہیں، جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے، دیکھا ہے، جو سمجھا ہے، سمجھا ہے! دوسری جماعت کے لوگ بادام کی طرح زبانِ مغزدار رکھتے ہیں یعنی معشوق کی چشمِ سخن گو کے اشارے پر کھتے ہیں جب وہ اس کے انکھڑیاں لڑانے کے طور دکھاتے ہیں، ہزار رنگ سخن زبان پر لاتے ہیں اور یار کے پلک جھپکانے کی ادا سو سو طرح بتاتے ہیں۔ چنانچہ اس مستِ ناز کے کمالات حدِ شمار سے بڑھ کر ہیں تو اس بے خود کے کلمات بھی دائرۂ بیان سے باہر ہیں!"

پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ختم ہوگئی۔ فقیر کو اس سے زیادہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا! (چچا نے) میرے والد کی خدمت میں آ کر، ان کا سارا احوال بیان کیا۔

---

(۱) (ترجمہ) بڑی دیر کے بعد وہ غزالِ رمیدہ (محبوب) میرے پاس آیا کہ دل کے تڑپنے سے میرا پہلو بھی درد کرنے لگا تھا۔ (میرزا رضی دانش) میر رضی بن میر ابوتراب رضوی مشہدی شاہ جہاں کے عہد میں ہندستان آیا اور دربار میں باریاب ہوا۔ دارا شکوہ نے ایک بار صرف اس شعر پر ایک لاکھ روپیہ دیا تھا:

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیساں در بہار قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

پھر بنگالہ میں شہزادہ محمد شجاع کے ساتھ رہا وہاں سے دکن کو ہجرت کی اور عبداللہ قطب شاہ کا مقرب رہا۔ رضی کے والد میر ابوتراب بھی شاعر تھے۔ فطرت تخلص تھا۔ ۱۰۶۰ھ میں حیدرآباد جا کر انتقال کیا اور دائرہ میر محمد مومن میں مدفون ہوئے۔ ۱۰۷۲ھ میں عبداللہ قطب شاہ نے میر رضی کو اپنی طرف سے زیارتِ عتبات کے لیے مشہد کو رخصت کیا۔ میر رضی نے ۱۰۷۶ھ میں انتقال کیا۔ (سروِ آزاد ۸۷-۸۸ و خزانۂ عامرہ ۲۱۷)

انھوں نے کہا ''ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است''۔ ہم مشرب درویش کہاں میسر آتے ہیں، انھیں دیکھنے کے لیے اکثر جایا کرو۔

بایزیدؒ کی وفات: (تیسری ملاقات) ہم ان کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ بیمار ہیں اور ایک پہلو سے پڑے ہوئے کراہ رہے ہیں، جب میرے چچا پر نظر کی تو ایک ٹھنڈی آہ سرکی، اپنے سامنے بلایا اور شفائی[(۱)] کا یہ شعر سنایا۔

پرستارے نہ دارم بر سرِ بالینِ بیمارے　　مگر آہے،ازیں پہلو، بآں پہلو بگرداند[(۲)]

(چچا نے) دریافت کیا: ''کیا حال ہے؟ جو اتنا ملال ہے؟'' کہنے لگے: ''اے عزیز میرا سینہ ایسے پھنکا جا رہا ہے جیسے اندر کوئی آگ بھڑکا رہا ہے جو نالہ کر رہا ہوں، اسی آگ کی لپٹ ہے جو آہ بھر رہا ہوں اسی شعلے کی لپک ہے۔

من نمی دانم کہ دل می سوزد از غم یا جگر　　آتش افتادہ است در جاے و دودے می کند[(۳)]

اگر موت میری فریاد سن لے تو اسے جنت سمجھو، ورنہ یہ دوزخ ہے جسے بداعمالیوں کی عقوبت سمجھو، اب تو جان کا نکل جانا ہی فتوح ہے کیونکہ سانس کی آمد و شد بھی سوہانِ روح ہے۔ رات کو بے خواب رہتا ہوں، دن کو بے تاب، کیا کروں کس میں دل دھروں، کہ مرجاؤں اور چین حاصل کرجاؤں۔

روزے بشب کنم بصد اندوہِ سینہ سوز　　شب را سحر کنم، بامید کدام روز[(۴)]

ہوا چلتی ہے تو اس آگ کو بھڑکاتی ہے، پانی پیتا ہوں تو تیل کا کام کرتا ہے، کوئی دوا موافق نہیں آتی، کوئی تدبیر پیش نہیں جاتی، اگر مجھے چمن میں لے جاؤ گے تب بھی اس کڑھن سے ہاتھ ملتا رہوں گا، عمان میں پھینک دو گے تو بھی یوں ہی جلتا رہوں گا۔ کاش میرا سینہ چیر کر دل و جگر جلدی سے نکال دیں، یا مجھے یہاں سے لے جائیں اور زندہ ہی قبر میں ڈال دیں۔''

القصہ، اس دل سوختہ و جگر کباب کا احوال زوالِ آفتاب تک اسی طور رہا، کبھی دیوار کے سہارے کھڑا ہوجاتا، کبھی بیٹھتا اور گر جاتا، کبھی آنکھیں کھول کر مایوسی سے دیکھتا، کبھی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا۔

ناگاہ میں نے کہا: ''ظہر کا وقت ہوگیا''۔ (درویش نے) بڑے خشوع و خضوع سے نماز ادا کی، سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کہا اور قضا کی۔

---

(۱) شرف الدین حسین شفائی حکیم ملا کے فرزند اور مشہور طبیب تھے۔ شاہ عباس صفوی کے دربار میں مراتبِ قرب پر فائز تھے۔ ان سے ایک قرابادین بھی یادگار ہے۔ رمضان ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں شعری تصانیف میں ہیں۔ (سرو آزاد ص ۴۷)

(۲) (ترجمہ) بیماری میں میرا کوئی خدمت گار بھی نہیں ہے، بس اک آہ ہے جو اس پہلو سے اس پہلو کو لٹا دیتی ہے! (حکیم شرف الدین شفائی)

(۳) (ترجمہ) میں نہیں جانتا کہ دل غم سے پھنک رہا ہے یا جگر، بس ایسا ہے جیسے کسی جگہ آگ جا پڑی ہے اور وہ دھواں دے رہی ہے۔ (سائر مشہدی)

(۴) (ترجمہ) دن کو تو ایسی جاں سوز مصیبت کے ساتھ رات کرتا ہوں، اب رات کو کس دن کی امید پر صبح کروں؟

آتشِ عشقش بسے را سوختست لیک زیں ساں کم کسے را سوختست (۱)

والد کے کلماتِ معرفت : (سخنانِ نغز) اے برادرِ عزیز، جب تم جانتے ہو کہ وہ سدا گلاب، ہزار رنگ میں جلوہ گری کرتا ہے اور یہ چمن اسی کا سنوارا ہوا اور یہ رنگ اسی کے بھرے ہوئے ہیں تو اگر دیکھتے ہو، غور سے دیکھو قدم اٹھاتے ہو تو دیکھ بھال کر اٹھاؤ، کائنات کے تمام ذروں میں اسی آفتاب کا عکس ہے، اگر تم اس کی ادا پہچان گئے تو تمھارا دل کامیاب ہے۔ جس کا دل زندہ اور آنکھیں روشن ہیں، جانتا ہے کہ حباب اور موج دریا ہی سے ہیں۔ غافل بھی سچا ہے، اگر وہ غفلت میں ہے، ساحل پر پڑا ہوا دریا کی کیا جانے آؤ چلو کہ ہم بیچ سے نکل جائیں۔ شاید جان کی تمنا کے مطابق ہمہ او بن جائیں۔

موسمِ جوانی گیا، لطفِ زندگانی گیا، عمر ساٹھ سال کی ہوگئی، بڑھاپا آن پہنچا، قامت خم ہوئی طاقت کم ہوئی، دماغ ضعیف، طبیعت سے روانی گئی اور مزاج سے جولانی، آنکھوں سے بصارت گئی، کانوں سے سماعت، ذوق بے ذوق، دانت کمزور، پاؤں ناتواں، سر بے شور، بال سفید، دل ناامید، یہ زنگ و زنجیر کمر سے نکال دو۔ آرائش فقیری کے زماں کھو گئے اور سر کی زنجیر پیر میں ڈال دو، زینتِ قلندری کے دن ہوا ہوگئے''۔

(نکتہ) ''زندگی میں شہرت کا لحاظ کرو (یعنی جیسے کہلاؤ ویسے بنو) اور آخرت کے لیے عقل کی روشنی میں کام کرو۔ یعنی ظاہر کو باطن جیسا بناؤ اور باطن کو عقل کے مطابق دکھاؤ۔ اگر یار حرم میں جلوہ گر ہے تو مسلمان ہونا ہنر ہے، مقصود دل کا وہی ہے چاہے جس در سے آئے۔ اور اگر اس کا جلوہ یقیناً بت خانے میں ہے، تو کیا حرج کافر بن جانے میں ہے؟ آنکھوں کا منظور تو وہی ہے جہاں کہیں بھی نظر آئے۔

بدیر و کعبہ، می گردیم، گاہ این جا و گاہ آن جا
کہ مطلب جستجوے اوست، خواہ این جا و خواہ آن جا (۲)

(نصیحتِ درویشانہ) چاہیے کہ گوشہ نشیں رہو اور کچھ دن تنہا نشین رہو، آنکھوں میں الوپ انجن لگاؤ اور سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤ، کسی چیز سے التفات نہ کرو، خدا پر نظر رکھو اور ہرگز کسی سے ملاقات نہ کرو، بوالہوسوں کی صحبت بہت اٹھائی اب وہ وقت ہے کہ ذرا پلک جھپکی اور موت آئی، کب تک اونگھو گے؟ غفلت سے باز آؤ، اگر نکتہ رس ہو تو اس شعر کا مفہوم سمجھ جاؤ۔

دیدہ ام در علمِ صحبت ہاے رنگیں صد کتاب
کردہ ام یک مصرعۂ تنہا نشینی انتخاب (۳)

نہ جانے کیا سوچ رہے ہو جو اپنا مداوا نہیں کرتے، بس اب ہوا و ہوس کی سرگرانی دور کرو، سر کو یادِ حق کے نشے میں چور کرو، اپنی سفید داڑھی کا پاس کر کے فریب اور چاپلوسی چھوڑ دیجیو، خرقِ عادت کا قصد نہ کیجیو، خدا کے کھلیان میں اپنی گائے نہ

---

(۱) (ترجمہ) اس کے عشق کی آگ نے بہتوں کو جلایا ہے، لیکن ایسا کسی کو کم جلایا ہوگا۔

(۲) (ترجمہ) ہم دیر و کعبے میں بھٹک رہے ہیں، کبھی یہاں ہیں کبھی وہاں ہیں کیونکہ اس (محبوبِ حقیقی) کی جستجو سے مطلب ہے خواہ وہ یہاں ملے یا وہاں۔

(۳) (ترجمہ) میں نے رنگین صحبتوں کے علم میں سیکڑوں کتابیں دیکھی ہیں اور ان میں سے ایک مصرعہ انتخاب کیا ہے وہ ہے تنہا نشینی۔

باندھیو، خدائی کا دم بھرنا اپنے گدھے پن کا شہر میں شہرہ کرنا ہے، اگر بے ارادہ کوئی کرامت ظاہر ہو بھی جائے تو اترائیو مت کہ غرور کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ اکڑفوں کو درویش عیب جانتے ہیں اور گھمنڈی کو آدمی نہیں مانتے"۔

جب (چچا) رخصت ہوئے تو دل میں عہد کیا کہ آئندہ کہیں نہ جاؤں گا اور دن میں دو بار (پیر و مرشد کی خدمت میں) آؤں گا۔

ایک دن میرے والد نے کہا: "اے برادرِ عزیز، دماغ سٹ رہا ہے، یعنی ہر روز گھٹ رہا ہے، اگر یہ قرآن کے حفظ کرنے میں لگایا جائے تو کیسا ہے؟ عرض کیا "اچھی بات آپ کے خیال میں آئی!" چنانچہ ڈیڑھ سال کی مدت میں (دونوں نے) مصحفِ مجید کو یاد کرلیا۔

چچا کی وفات: (حکایتِ جاں سوز) عید کی صبح، میرے چچا، نئے کپڑے پہن کر نماز کو گئے، جب واپس آئے تو ان کے سینے میں درد ظاہر ہوا اور ایسی شدت سے کہ چہرے کا رنگ اڑ گیا، اور دل کا سکون جاتا رہا، میرے والد کو بلایا اور کہنے لگے: "میرے (سینے میں) نہایت شدید درد ہے، ایسا دھیان پڑتا ہے کہ اب خیریت نہیں اور ایسی کڑھن ہے کہ دم گھٹا جارہا ہے، غالبًا جانِ ناتواں میں طاقت نہیں۔ میری عبا بدن سے نوچ لو کہ اب یہ نہیں بھاتی ہے اور میری ٹوپی اتار پھینکو کہ یہ سر پر بوجھ بنی جاتی ہے، جان میری ناتواں ہے اور یہ بیماری گراں ہے۔ جب وقتِ شام ہوا، وہ درد اور عام ہوا، ان کی آہ آہ کا شور بلند ہوا اور وہ سراپا اک دلِ دردمند۔ جب ضبط کرتے تو غنچے کی طرح سٹ جاتے اور درد سے آہ و فریاد کرتے تو پھول کے مانند بکھر جاتے جب دل بہت گرفتہ ہوتا تو ایسی آتش ناک آہ بھرتے کہ جگرِ سوختہ کا دھواں آسمان پر پہنچتا، اگر بات کرتے تو یہ رباعی پڑھتے۔ (المصنف)

وقت است کہ رو بہ مرگ یک بارہ کنیم
آن درد نداریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریِ صعب عشق دارد دلِ ما
گر جامہ گذاریم کفن پارہ کنیم(1)

جب گھڑی بھر رات گذری تو ناطاقتی حد سے بڑھ گئی، پیر و مرشد سے کہنے لگے کہ "آخر میرے دل نے سختی اٹھائی اور آنکھیں (شدتِ غم سے) پتھرا گئیں، آپ تو اس میخانے کے دانائے راز ہیں، اگر میری عمر کے پیانے میں ابھی کچھ تلچھٹ رہ گئی ہے، تو وہ کسی اور کو دے دیجیے کیونکہ اس شدید درد میں دُرد (تلچھٹ) پینے کو جگر چاہیے، میں موت کی تلخی کو اس جان شیریں کے مقابلے میں سو درجے گوارا تر سمجھتا ہوں، توجہ فرمائیے کہ چین سے مرجاؤں، رحم کیجیے تاکہ مجھے کل پڑ جائے۔ رات گئے اپنی کلاہِ شب پوش مجھے عنایت فرمائی اور غلبۂ ناتوانی سے آنکھیں موند لیں، جب رات کٹی یعنی صبح کی پو پھٹی تو ان کی الم ناک روح لبوں پر آگئی۔ ادھر موذن نے "اللہ اکبر" کی بانگ سنائی، ادھر اس بیمارِ شب زندہ دار کو نیند آئی۔ یعنی دل

(1) (ترجمہ) (اب وہ) وقت ہے کہ بس یک لخت جان نکل جائے (کیونکہ) ہم وہ درد نہیں رکھتے جس کا علاج ہو سکے ہمارے دل کو عشق کی جان لیوا بیماری ہے اور اس میں ہمارا جان سے گذر جانا ہی شفایاب ہو جانا ہے۔

پر ہاتھ رکھا اور جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

ان کے پیر و مرشد (میرے والد) نے پگڑی زمین پر دے ماری، گریباں چاک کرلیا اور اس جاں کاہ صدمے سے چھاتی پیٹنے لگے، ان کے مریدوں نے سروں میں خاک اور جگر پر داغ لیے، اسی رنجوری کے عالم میں میت کی رسوم ادا کیں اور اس دردمند کا جنازہ تیار کیا۔

عشق دردِ بے دوائے بودہ است   بہر جان و دل بلائے بودہ است (۱)

جب لوگ نماز (جنازہ) کے لیے کھڑے ہوئے تو اکثر فرش پر گر پڑے۔ میرے والد نے کہا: "اے ناواقفِ پاسِ آشنائی، دیر میں کھلا کہ تو بے وفا ہے، ایسا شتاب رخصت ہوا کہ میری چھاتی پھونک گیا ہے، دوست یوں رخصت نہیں ہوا کرتے، غم خوار ایسے بے مروت نہیں ہوا کرتے"۔

چہ شد آن وفا و عہدے کہ تو وعدہ ہا نمودی   بتو من چہ گفتہ بودم، تو بمن چہ گفتہ بودی (۲)

بزرگوں نے جنازے کو کندھا لگایا، یعنی اسے پوری عزت سے اٹھایا، پیر و مرشد (والد) کی آہ مردے کے علم کی طرح جنازے کے آگے چل رہی تھی، ان (چچا) کے معتقد آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے میت کو شہر سے باہر لے گئے اور ایک باغ کے گوشے میں سپردِ خاک کرکے پھول برسائے اور فاتحہ پڑھی۔ نہایت صدمہ اٹھایا اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ پایا!

تیجے کے دن جب شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آئے تو میرے والد نے کہا کہ "جس کا ایسا عزیز مرگیا ہو، اگر اس کو "عزیز مردہ" کہیں تو کیا بے جا ہو۔ آج سے مجھے "عزیز مردہ" کہا جائے۔" چنانچہ وہ شہر میں اسی لقب سے مشہور ہوگئے، دن میں سو بار گریہ سر کرتے تھے اور مردوں کے حال سے بسر کرتے تھے، میں جو ان کا گودوں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو ان سے کہتا تھا، انھیں کے ساتھ سوتا اور کھاتا تھا، اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر فریاد کرتا۔ درویش "عزیز مردہ" (والد) میری دل جوئی کرتے اور کبھی مجھے آزردہ نہ ہونے دیتے۔ کبھی کہتے کہ "بیٹے" میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، مگر اس غم میں گھلا جاتا ہوں کہ میں خود چلنے ہار ہوں"۔ کبھی فرماتے: "میرے چاند! اب تم گود کے بچے نہیں ہو، خدا کا شکر ہے، دس سال کے ہوگئے، کیوں جی کڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو، دل کو قوی رکھو، اپنے تئیں خدا کو سونپ دو، ہشاش بشاش رہو اور مجھے اپنا ناز بردار سمجھو۔ میری جان، کیا تم دودھ پیتے بچے ہو جو ہر وقت روتے ہو، اپنا غم کیوں کرتے ہو، خدا جیسا وارث رکھتے ہو۔ جانے والے کبھی نہیں آتے، گذرنے والے منھ نہیں دکھاتے، بیٹے دنیا میں چل چلاؤ لگ رہا ہے ہر کوئی آمادۂ سفر ہے۔ مت جانیو کہ دنیا تمھارے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ تو مجلسِ رواں نے گمان کر رکھا ہے، جو حاضر تھے چلے گئے، جو بیٹھے تھے اٹھ گئے، دل مت کڑھاؤ، پھول کے مانند مسکراؤ، اس چمن کی بہار اجڑنے والی ہے، اپنے دل پر میل نہ لاؤ، دنیا کا یہ قمارخانہ ایسا بنایا ہے کہ یہاں تم جیسے بہتیروں نے اپنا دل گنوایا ہے۔ جب تک یہاں کی راہ و رسم نہ جان جاؤ، ہرگز اس راستے پر نہ آؤ، پاکھٹ کھلاڑیوں کی ایک کہاوت ہے "قمار و راہ قمار"

(۱) (ترجمہ) عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں، یہ (ہمیشہ) جان و دل کے لیے ایک مصیبت رہا ہے۔

(۲) (ترجمہ) وہ وفا، اور عہد کیا ہوا جب تو نے مجھ سے کچھ وعدے کیے تھے، میں نے تجھ سے کیا کہا تھا اور تو نے مجھ سے کیا کہا تھا؟

یعنی اناڑی ہوتو نہ کھیلو۔ وہ ہر روز ایسی ہی باتیں کرتے اور بڑے لاڈ سے میری پرورش کرتے تھے۔

[یہ تو میر کی آپ بیتی کے وہ حصے ہیں جہاں میر نے بہت اختصار و اجمال سے کچھ اپنے خاندان کا بیان کیا ہے، رمز و کنائے کے انداز میں اپنے والد کے حالات اور کلمات لکھے ہیں، ان کے ہم عصر درویشوں کی باتیں بیان کی ہیں، ان میں سے بیشتر میر کے اپنے ذہن کی ایجاد ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب وہ دہلی آتے ہیں اور یہاں کے سیاسی اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہیں تو ان کے قلم کا رخ سیاسی اور تاریخی ہوجاتا ہے اور وہ اپنے مشاہدات اس طرح لکھتے ہیں۔ مترجم]

چار روز کے بعد شاہ (ابدالی) اور نجیب الدولہ کی فوجیں ایک ساتھ کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا تک پہنچ گئیں، جیالے سردار اور جنگ جو سوار (مرہٹوں کی) گوش مالی کرنے پر آمادہ ہوئے۔ روہیلوں کے پیادوں نے پیش قدمی کر کے جنگ شروع کردی، نہایت جاں فشانی سے کٹ کٹ کر لڑے۔ ادھر سے دتا جو دکن کی فوج کا سردار تھا اپنے کارگذاروں کی مدد کو آ پہنچا اور بڑی ثابت قدمی سے اس فوجِ سنگین کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ پہلی ہی تفنگ جو ادھر سے سر ہوئی اس کا ایک تیر دتا کے لگا اور پہلو میں ترازو ہوگیا۔ مرہٹوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس کے مردے کو اٹھا کر دریا کے کنارے رکھا، تو انھوں نے دریا کے اس طرف آکر مار دھاڑ شروع کی۔ یہ (مرہٹے) ہار کر بھاگ گئے وزیر اپنے سرداروں کو ملیچاروں پر چھوڑ کر دکن کی فوج سے مل گیا۔ زمانۂ غدار نے بڑی تباہی مچائی درانیوں نے (مرہٹوں کی) بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور ان میں سے اکثر کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا وہاں سے واپس آکر شہر لوٹنے میں لگ گئے۔

دلی میں لوٹ: شام کو راجا شہر سے نکلا اور سورج مل کے قلعوں میں جانے کا قصد کیا اور صحیح سلامت پہنچ گیا۔ بندہ (میر) اپنے ناموس (حرم) کی حفاظت کے لیے شہر ہی میں رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ ''شاہ (ابدالی) نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہیے کہ پریشان دل نہ ہو''۔ مگر جب گھڑی بھر رات گذری تو غارت گروں نے مظالم شروع کیے، شہر کو آگ لگا دی، گھروں کو جلا دیا اور (ساز و سامان) لے گئے۔ صبح کو جو (گویا) صبحِ قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے۔ (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کرلیا بہتوں کو جلا دیا اور سر کاٹ لیے۔ ایک عالم کو خاک و خون میں لٹایا اور تین دن رات تک ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پہننے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھا دیں، سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کر دیے۔ وہ بدطینت ہر در و بام پر (چڑھے ہوئے تھے) اور شرفا کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔ شہر کے عمائد خستہ حال تھے، بڑے بڑے لوگ ایک گھونٹ پانی کے محتاج تھے، گوشہ نشین بے گھر اور نواب گداگر بن گئے۔ وضیع و شریف ننگے پھرتے تھے، گھر والے نکھرے ہوگئے تھے اکثر بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ و بازار تھے۔ کتنے ہی مصیبت میں مبتلا تھے اور ان کے زن و فرزند اسیر، شہر پر (غارت گروں کا) ہجوم تھا اور قتل و غارت علی العموم ہو رہی تھی۔ لوگوں کا حال ابتر ہوگیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آگئی (یہ غارت گر) زخم بھی لگاتے اور گالیاں بھی بکتے،

روپیہ بھی چھین لیتے اور سیدھیاں بھی سناتے۔ جو سامنے پڑتا اس کا پاجامہ تک چھین لیتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مر گیا۔ ایک جہان کی ناموس برباد ہوگئی۔ نیا شہر ڈھے کر خاک سے برابر ہوگیا۔ تیسرے دن نسق مقرر ہوا۔ انزلا خاں نامی نسقچی باشی آیا تو لوگوں کی ٹوپیاں اور نیمہ تن اس نے اتروا لیے۔ بارے قدغنچیوں نے ان غارت گردوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں۔ (اب) وہ بے رحم لوگ پرانے شہر پر ٹوٹ پڑے اور ایک جہاں کو ہلاک کردیا۔ سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ گرم رہا۔ ایک وقت کا کھانا اور پہننے کا سامان بھی کسی کے گھر میں نہ رہا،مردوں کے سر ننگے تھے،عورتوں کے پاس اوڑھنی تک نہ تھی، چونکہ راستے بند تھے بہت سے لوگ زخم کھا کھا کر گزر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اینٹھ کر مر گئے۔ (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے حملہ کیا اور (شہریوں کو) بے آبرو کیا، غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے، ان غارت زدوں (کی فریاد) کا شور و ہنگامہ ساتویں آسمان تک پہنچ رہا تھا، مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سنتا نہیں تھا۔ ہزاروں خانہ خراب عین اس بھڑکتی آگ میں دل پر داغ لیے ترکِ وطن کر کے جنگل کی طرف چل دیے۔ مگر راستے ہی میں چراغِ صبح گاہی کی طرح مر گئے۔ بہت سے مجبوروں کو وہ ظالم اپنے رکاب میں ڈال کے دائرۂ لشکر میں قیدیوں کی طرح لے گئے۔ ان جفاکاروں کا دور دورہ تھا، دست درازی کرتے، لوٹتے کھسوٹتے، خوب دولت بٹورتے، عورتوں پر ہاتھ صاف کرتے، اپنی تلواریں لیے مال پر قبضہ کرتے پھرتے۔ شہریوں سے کچھ نہ بن پڑتا تھا کیونکہ ان کے جی چھوٹ گئے تھے۔ کوئی مضطرب ہوتا تھا، کوئی حیران تھا، ہر گھر میں ایک بدباطن، ہر کوچے میں قتل گاہ، آزار دگیر و دار عام تھی، ہر طرف خوں ریزی، ہر سمت سزا دہی۔ چٹکیاں لیتے تھے، طمانچے مارتے تھے۔ غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے تھے اور یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھرتے تھے۔ گھر جل گئے، محلے ویران ہوگئے۔ سیکڑوں چوب کاری (ایک طرح کی سزا) کی تاب نہ لاکر چل بسے۔ کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک عالم ان کے ستم سے ہلاک ہوگیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر کا علاقہ جسے (رونق و شادابی کے باعث) ''جہانِ تازہ'' کہتے تھے۔ کسی گرمی ہوئی منقش دیوار کے مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں اور سینے ہی نظر آتے تھے۔ ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہورہی یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، سیاہی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مر گیا (وہ گویا) آرام پا گیا، (اور) جو ان کی زد میں آگیا وہ بچ کے نہ جاسکا۔ میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہوگیا۔ افلاس اور تہی دستی سے میرا حال بہت ابتر ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو میرا تکیہ (مکان) تھا وہ بھی ڈھے کر برابر ہوگیا۔ غرض کہ وہ بے مروت سارے شہر کو لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ ذلت (و رسوائی) اٹھا کر جان سے گذر گئے۔

میرا آگرے جانا (جولائی ۱۷۶۲): میں اس تقریب سے تیس سال کے بعد[1] اکبرآباد گیا اور اپنے والد اور چچا کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہاں کے اکثر شعرا مجھے اس فن کا امام سمجھ کر ملنے کو آئے۔

---

(۱) میر نے تیس سال کے بعد اپنا دوبارہ آگرے جانا لکھا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ غلط ہے۔ عباراتِ ماسبق سے اتنا واضح ہوہی چکا ہے کہ میر نادر شاہی حملے (۱۷۳۹) کے بعد (دوبارہ) دلی آئے تھے اور وہ زمانہ اگر ۱۷۴۰ بھی مانا جائے تو سورج مل کی بغاوت جولائی ۱۷۶۲ کا واقعہ ہے جس کی رو سے میر ۲۲-۲۳ برس کے بعد تیسری بار آگرہ گئے ہیں نہ کہ تیس برس میں۔

آہ اے وطن! (جولائی تا اکتوبر ۱۷۶۲): (حکایت) میں صبح وشام دریا کے کنارے سیر وتماشا کرنے جاتا تھا۔ اس کا محل وقوع بہت اچھا ہے یعنی اس طرف باغات ہیں ادھر قلعہ اور امرا کی حویلیاں، گویا بہشت کی نہر ہے۔ میری معنی آفرینی کا شہرہ تو عالمگیر تھا، الغرض حسین، سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب، پاکیزہ طینت اور شعراء مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور میری بہت عزت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا، مگر کوئی ایسا بات کرنے کی کوں کا نہ ملا جس سے دل بیتاب تسلی ہوتا۔ میں نے سوچا کہ سبحان اللہ یہ وہی شہر ہے جس کی گلی گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانشمند، فقیہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدث، مدرس، درویش، متوکل، شیخ، ملا، حافظ، قاری، امام، موذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہمان سرا، مکان اور باغ تھے اور آج کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر دل خوش کرلوں۔ ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے کچھ دیر گپ کرسکوں۔ بس ایک وحشت ناک خرابہ تھا (جسے دیکھ کر بہت) رنج اٹھایا اور واپس آگیا۔ اس طرح چار مہینے وطن مالوف میں گذارے، رخصت ہوتے وقت حسرت سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور میں سورج مل کے قلعوں میں آگیا۔

[میر کی آپ بیتی کا آخری حصہ ایک ڈائری کی شکل میں ہے جس میں واقعات اشاراتی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر ذرا سی محنت کی جائے تو ان عبارتوں کو تاریخ کے اعتبار سے بھی مدون کیا جاسکتا ہے۔ مترجم]

●●●

ظل عباس عباسی

میر کا ذکر تذکروں میں

نکات الشعرا: از میر تقی میر مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵)

''فقیر حقیر میر محمد تقی میر مولف ایں نسخہ متوطن اکبرآباد است بسبب گردشِ لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است'' (ص ۱۵۴)

مخزنِ نکات: از شیخ محمد قیام الدین قائم مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۲۹)

''شمع انجمنِ عشق بازاں، فروغِ محفلِ سخن پردازاں، جامع آیات سخندانی، مجمع کمالات انسانی، معجز طراز کرامت تحریر، محمد تقی المتخلص بہ میر اصل و منشاء وے دارالخلافت اکبرآباد است۔ در خدمت خان آرزو کہ خالوے او بود، لختے دانش اندوختہ در اوائل حال پیش ظہیرالدولہ بہادر می گذراند۔ چوں بادشکر آبی رسید رفیق راجہ ناگرمل گردید۔ چنانچہ تا حال باعز و امتیاز در رفاقت اوست''۔ (ص ۴۰ و ۴۱)

تذکرۂ ریختہ گویاں: از شیخ فتح علی حسینی گردیزی، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳)

''سخن سنج بے نظیر، میر محمد تقی میر متخلص زادگاہش اکبرآباد است و طبعش معنی ایجاد شمع استعدادش برکردۂ شعلۂ ادراک سراج الدین علی خاں آرزو است۔ فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ۔ حقا کہ دراں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بوے کار آوردہ''۔ (ص ۱۳۷-۱۳۸)

چمنستان الشعرا: از رائے لچھمی نرائن اورنگ آبادی المتخلص بہ شفیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸)

سیر محمد تقی میر اکبرآبادی، میر میدانِ سخنوری و شہنشاہ اقلیم معنی پروری است۔ اشعۂ آفتاب کمالش در منبع الفاظ بہ نہایت درخشانی پیدا، ولمعۂ ماہتاب معنیش بشب عبارت بکمال تابانی ہویدا، شہپر کلکش بہ تسخیری پردازد و شہباز طبعش بجنگ فکر رسا بہ تسخیر مضامین رنگین می سازد، ہزاراں معنی بیگانہ غلام جنابش... پر فرحت می دہد کمیابش نقطۂ طبع زادش چوں در رخ عزیزم و محترم و حرف رقم زد قلمش مثالِ زر سفید رائج عالم حقا کہ... و نازک خیالی سرتاج شاعران ایں عصر و گلِ سرسبد... حرف گیراں می نہد و بریں کمال غریب او تذکرۂ نکات الشعرا من تصنیف میر گواہی می دہد۔ (ص ۲۶۱، ۲۶۲)

تذکرۂ شعرائے اردو: از میر حسن بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۴۰)

میر شعرائے ہندستان، واضح فصحائے زماں، شاعرِ دل پذیر و سخن سنج بے نظیر، میاں محمد تقی المتخلص بہ میر، رفعت رواق کاخ بیانش از طاقِ سپہر برتر و گوہر کانِ ضمیرش از جوہر مہر عالی گوہر، فکر عالیش در عینِ خوش آبی بہ طبع روانش بہ نہایت شادابی، چراغ

نثرش روشن و ساحتِ نظمش گلشن، شعرش چوں مدخوش آب و اندازِ سخنش بے حساب، صیقل ذکاے اورنگ زادِ آیینۂ خورشید، پیش ضیاے اوردے رخشانِ ماہ سفید، از استادانِ صاحب قدرت است۔ طرزش مانا بطرز شفائی۔ برادرزادۂ سراج الدین علی خاں آرزو وہم از شاگردان اواست۔ متوطن اکبرآباد جوان محمد شاہی الحال در شاہجہاں آباد است، سن او قریب شست رسیدہ۔ تذکرۂ حقدمین و معاصرین از تالیفِ او بیادگار ماندہ است۔ رباعی و غزل وقصیدہ وہجو و مدح ہمہ می گوید، لیکن آنچہ گوید از غزلیات کہ بسیار بہ انداز وطرز اوی تراود بلکہ گرم بازاری اوست از ہمیں است۔ بسیار صاحب دماغ است۔ ودماغ اورا می زیبد۔ خدایش سلامت باکرامت دارد۔ (ص۱۵۲-۱۵۳)

تذکرۂ مسرت افزا: از ابوالحسن امیرالدین احمد المشتہر بہ امراللہ اکبرآبادی مرتبہ قاضی عبدالودود (شمولہ معاصر پٹنہ، ۱۹۵۴)

محمد تقی، میر تخلص میر میدان سخن و شیر بیشۂ ایں فن است۔ گوہرِ وجودش از معدن اکبرآباد برآمدہ، اما قدر و قیمتش در بازارِ دہلی افزود و مشق سخن بخدمتِ سراج الدین علی خاں آرزو کردہ، شاید باوے قرابتِ خواہر زادگی دارد۔ بسبب رعونت و گردن کشی کہ خلقی اوست، زبانزد زبان آوراں شدہ و باعث عیب جوئی سخنوراں در زبانِ شاں افتادہ، بقول شخصے

عیب مردم فاش کردن بدترین عیبہاست   عیب جو اول کند بے پردہ عیب خویش را

ہر یکے را حوصلۂ عیب جوئی او بہم رسید، میرزا رفیع گوید:

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح   لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے

تذکرۂ نکات الشعرا تالیفِ اوست۔ دراں عجب نکتہ چینی درکلام شعراے ریختہ نمودہ۔ ہرکرا یاد نمودہ، بہ تحقیر و بے ادائی آوردہ و اشعارِ ایشاں را بے رتبہ و ناپسندیدہ چیدہ ذکر کردہ۔ اگر راست گویم، سبب تالیف ایں تذکرہ مسرت افزا ہم ہمیں بود کہ من بزعمِ حاسدان عیب بیں و خردہ گیرانِ نکتہ چیں حالات ہر یکے کماہی در مسطر تحریر کشیدم، لیکن چوں دریں غربت دیوانِ احدے باخود نبود کہ اتفاق انتخاب شعرا ہم می شدہ از اشعار ایشاں آنچہ یاد بود، نوشتم۔ طرفہ تر کہ میر چوں ہمت خود بہ انتخاب اشعارِ ناپسندیدۂ شعرا گماشتہ بودہ، طبعش بہ ہمیں مرغوب گشتہ ازایں جہت از اشعار خود ہم ہرچہ دراں تذکرہ نوشتہ، اکثرے ازآں بے رتبہ و ناپسندیدہ است۔ در دیوانش بہتر ازیں اشعار بہ نظرِ فقیر درآمدہ۔ شنیدم کہ محمد تقی میر سید نیست، میر ناصر مرحوم، والدِ میر درد بمشاہدۂ جودتِ طبعش در عنفوان جوانی و آغاز حالش می گفت کہ محمد تقی میر میدانِ سخنوری خواہد شدہ۔ ازآں روز خود را ملقب بمیر ساختہ۔ درایں جالطیفۂ بخاطر رسیدہ کہ حضرت مصیب قدس سرہ می فرمود کہ شخصے در ہمسایۂ من بود کہ خود را شیخ می گفت۔ بعد چندے جہتِ سعی معاش سفر کردہ۔ چوں از آنجا بخانہ رسید، خود را میر مشہور ساخت۔ روزے بطریق استہزا ازو پرسیدم کہ در شیخی چہ خلل بود کہ میر شدی۔ گفت، پیرمن مرا میر خطاب دادہ۔ (ص ۱۹۹-۲۰۰)

تذکرۂ ہندی: از شیخ غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ عبدالحق مرحوم (انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳)

''میر محمد تقی میر تخلص کہ مفصل احوالِ ایشاں نیز در تذکرۂ فارسی سمتِ تحریر یافتہ، شخصِ صاحب کمال است۔ اکثرے در فن ریختہ او را در پلۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو وقصیدہ براد

فضیلت می دہند۔ غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ برو مسلم است۔ اگر چہ دیوان فارسی ہم دارد اما در فارسی گویاں شمردہ نمی شود۔ ہمہ ریختہ گویانِ ہند سند از کلامش می آرند۔ اورا دریں فن مشقّی می دانند والحق کہ چنیں است۔ از چند سال کہ از شاہجہاں آباد بہ پورب رسیدہ در سرکار نواب آصف الدولہ بہادر اعتبار و امتیازِ تمام دارد۔ چہار دیوانِ ریختہ از خامۂ فکرش ریختہ و مثنویہاے متعددہ و شکارنامہ ہاے بے نظیر نگاشتہ۔ کلکِ ندرت طراز او برصفحۂ زمانہ یادگار است، برفقیر بسیار مہربانی می فرماید۔ عمرش تخمیناً قریب ہشتاد است"۔ (ص ۲۰۳-۲۰۴)

عیار الشعرا: از خوب چند ذکاؔ (قلمی) عکس مملوکہ مالک رام

میر محمد تقی سلمہ اللہ تعالیٰ المتخلص بہ میرؔ۔ شاعریست غرا، زاد بوش خطۂ اکبرآباد۔ وے سرآمدِ شعراے ہند است۔ غلغلۂ سخن در چار دانگِ ہندستان جنت نشان انداختہ وکلامش مدارجے بہم رسانده۔ چند دیوان و مثنویات و یک نسخۂ تذکرۂ مختصر و قصائد و رباعیات و مخمس و مسدس و ہجو و مدح و دیگر تصانیف بے شمار از و بروے کار آمدہ۔ در لکھنؤ بصیغۂ استادی در سرکار فیض آثار نواب وزیرالممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ بمواجب دوصد روپیہ شرف اختصاص دارد۔ الیوم در نواحِ لکھنؤ بعقلِ ناقص ایں بندہ ہم چو او عدیل شاعرِ زبردست و سیر مشق و بسیار گو و خوش و شیریں بیان و خوش زبان برنخاستہ غرض کہ در تالیف فارسی و علی الخصوص در ریختہ گوئی بالفعل لاثانی است۔ بندہ چشم آشنا نیست، الاسخن آشنا۔

از تصنیفات تلاش او قریب او یک ہزار بیت انتخابی قابلِ نوشتن تذکرہ برآمدہ بود از آنجا کہ مختصر نویسی شعارِ تذکرہ سازی است لہٰذا عمداً بطوالتِ کلام نہ پرداخت و ہمیں اختصار نمودہ ایں گوہرِ اشعارِ آبدار ازاں اوستادِ زماں، دریا دل، کامل فن، آشناے بحرِ مواجِ معانی و سخن سلکِ تسطیر دررشتۂ تحریر کشید۔ (ورق ۳۷۸ (ب) ۳۷۹ (الف))

گلشنِ ہند: از میرزا علی لطف مرتبہ شبلی نعمانی و ڈاکٹر عبدالحق (لاہور: ۱۹۰۶)

"میر تخلص، نام نامی اس نگینِ خاتمِ سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے، متوطن اکبرآباد کے۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتداے سنِ شعور سے پرورش انھوں نے دارالخلافہ شاہجہاں آباد دہلی میں پائی ہے اور خانِ مذکور کے فیضِ صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیازِ ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس کے رمز کو پہچانتا ہے کہ میرؔ شیریں مقال میں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبتِ خورشید و ماہ ہے اور فرقِ سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین و آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبانِ قلم کی اور اس خراش سے عارضِ رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کا سد ہے اور ہواے شہرستانِ ماضی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحرکاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادوطرازی بیان میں معنی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے۔ جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ کو گئی، تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن

علتِ پیری سے یہ بے چارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔
زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہلِ تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور کے مویز ہیں اب بھی جو بوجھ تمکنتِ معنی کا جزثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھلاتا ہے، جوان اگر کو بوتیس ہے تو تحمل سے اس کے کر جاتا ہے۔ بہر تقدیر جب مرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہجہاں آباد میں تھے، سن ۱۱۹۷ھ میں رایاتِ عزم اس صاحبِ لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہیں، وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخندانی ہر قسم چکیدہ خامہ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جوان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قومِ سخن سرمایہ گاں کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحبِ چہار دیوان ہے خوش بندش وخوش بیان ہے۔ مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبت جریدۂ روزگار ہیں''۔ (ص۱۵۲-۱۵۳)

عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) : تالیف ۱۸۴۹، از نواب اعظم الدولہ میر محمد خان بہادر سرورؔ (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔۱۹۶۱)

میر تخلص، میر محمد تقی ہمشیر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو، اصلش از اکبرآباد، مدتے در دارالخلافہ استقامت ورزیدہ آخر ہا کساد بازاری ایں جادیدہ رختِ اقامت بہ لکھنؤ برد و در سرکار نواب وزیر الممالک مرحوم بہ علاقۂ دو صد روپیہ ماہواری ملازم شد۔ تعریفِ اشعارش محتاج بشرح و بسط نیست، مہارتے تمام در فصیح گوئی و فنونِ شاعری دارد و بلند تلاشان ایں فن شاعر مسلم الثبوت می شمارند، و بہ استادی او قائل اند۔ وضع و رویۂ شعر گوئی بہ نہجے کہ دارد کسے را میسر نہ شدہ است۔ بسیار عزیزاں تلاش تتبع زبان او کردند لیکن بآں نہ رسیدند۔ فی الواقع مرتبۂ شاعری او دریں زمانہ بسا بلند است و پایۂ او دریں فن کم از رفیع السودا نیست۔ بلکہ در غزل گوئی رجحان دارد۔ تصانیفش بسیار چنانچہ پنج دیوان ریختہ و یک دیوانِ فارسی و تالیف تذکرۂ ریختہ گویاں و اکثر مثنویات و مدحیات و ہجویات و مخمسات و واسوخت و مسدسات و ترجیع بند و مناقب و مرثیہ وغیرہ تصنیف نمودہ۔ (ص۵۵۳-۵۵۴)

تذکرۂ شعرائے اردو : از خیراتی لال بے جگر (قلمی) عکس مملوکہ مالک رام صاحب

در فنِ سخن امیر، میر محمد تقی المتخلص بہ میر شاعرے است کہ در رنگین خیالی طبیعتے دارد سر مشق بہار کشمیر و در شعر فارسی و ہندی دست قدرتے کثیر۔ آئینۂ آب اگر معیوب بحباب نہ بودے در آئینہ شفافی مشابہت کلامش رو بہ یک روئی نمودے و چشمۂ آفتاب اگر در چشمۂ شمسگو، تاثر، او، ہر سحر چہرۂ خود نشوئیدے، موج صفائیش کے سر بلفک کشیدے۔ شعرے کہ در

اضطرابی عاشق مہجور از جوشان طبع ذخار دے برآمدے، ہر حرف ازاں چوں ماہی بے آب جدا جدا ہم آغوش طپیدن برفزودے کہ بذکر وصال معشوق از خیال مواج برآوردے۔ مصرعہ اش بامصرعۂ دیگر چوں جفت سرخاب درانداز بہم گردیدن اگر ہم سرآں روے محبوبان دلربا را برشان توصیف گذاشتے عاشقاں را دل دوپارہ ساختے واگر تیر مژگانِ ترکانِ خطا بر کمانِ تعریف داشتے، رخنہ در جگر دل دادگانِ بیچارہ انداختے۔ خلاصۂ کلام کہ آں میر یگانہ بقول غلام محی الدین عشق وطن آبائے خود را اکبرآباد گزاشتہ طرح سکنت بدہلی انداخت و بعداز مدتے چوں در آں جا ہنگامۂ بادشاہ گردی ہا قیامت برپا کرد از تابِ خورشید حوادث پناہے بجز گریختن ندید... بہ لکھنؤ کشید و در نظر دوربین وزیر بے بہا در دریاے قدردانی نواب آصف الدولہ بہادر، حاتم زمانی (و) وجود کرامت آمودش بہ صفات لاثانی برآمد چنانچہ اکثر بہ عطاے صلہ و انعام گوہر عالی دماغی و نادر الافکاری او را پیش دیگر سخنوراں حضور آب می دادند و مصحفی در تذکرۂ خود بعد نظرِ مجمل در احوال و اقوال بعضے قدم ریختہ گوئیش را برجاے مرزا رفیع سوؔدا نہادہ بیک گفتار برخی سواے قصائد و ہجو در غزل و مثنوی آں شہنشاہے وقت را از مرزاے مذکور فوق دادہ و ہم نوشتہ کہ باوصف دیوانِ مردف فارسی در فارسی گویاں شمردہ نمی شود الاشعراے ریختہ گو سند از کلامش می آرند و نام اوستادی براو می گذارند انتہیٰ، خامۂ ندرت نگار فکرش سواے چہار دیوان ریختہ مثنویات متعددہ از بس دل پذیر و شکارنامہ ہاے بسیار یک قلم بے نظیر بر صفائح روزگار ریختہ۔ عاقبت بعد بقطع مراحلِ نود و شش از سنین عمر در سالِ یک ہزار و دوصد و بست و پنج ہجری بہ وصل جانانِ حقیقی پیوست غفراللہ لہ۔ مصحفی قطعۂ تاریخش طولانی بہ تعمیہ چہار عدد از سر درد انشا کردہ کہ این است۔

وہ محمد تقی میر کہ تھا   ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہند جنت نشاں میں رکھتی تھی   غزل عاشقانہ اس سے رواج
خرمنِ عمر اس کا برقِ اجل   کر گئی جس دم آن کر تاراج
از سر درد مصحفی نے کہا   حق میں اس کے موا نظیری آج
۴+۱۲۲۱=۱۲۲۵ ہجری

و لالہ ہرگوپال تفتؔہ تاریخ وفاتش نوشتہ۔

چہ بلاہا کہ نیامد بسر اہل سخن   چوں موے ملکِ عدم گشت رواں میر تقی
تفتہ بنوشت سنہ او ز حروف منقوط   چوں نہ نالیم برفتہ ز جہاں میر تقی
۱۲۲۵ ہجری

دستور الفصاحت: از احد علی خاں یکتاؔ، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی (رامپور، ۱۹۴۳)

متکلم سحرکار، شاعر جادوکردار، سلطان اقلیم فصاحت، فرمان فرماے کشور بلاغت، مونس و غمخوار جماعۂ عشاق نام برآوردہ باوستادی در تمام آفاق، سلطان الظرفا، سیدالشعرا، مملکتِ سخن را امیر، سید محمد تقی المتخلص بہ میر نوراللہ مضجعہ، شاعرے بود پرقوت بر جمیع اقسام سخن قادر، بہمہ دقائق سخنوری عالم و ماہر، غزل را بطرزے گفتہ کہ ہیچ کس نمی تواند۔ بلکہ دریں باب بملک الشعرا ہم حرف است۔ چوں کلامش بسبب وسعت، جامع اکثر کلماتِ محاورہ افتادہ، افادۂ سند ازاں نسبت بکلامِ میرزا زیادہ تر است، اما تقلید و پیروی او نہایت دشوار۔ اگرچہ کلامِ فصاحت نظامش مثل سعدی بظاہر آسان نظر می آید، ولے ممتنع است۔ بیشتر شعرا مقلد او ہستند و مطلق طرزش نمی یابند بخلاف مرزا محمد رفیع کہ باوجود کمال پختگی کہ دارد،

تقلیدش ہر صاحب فہمے را ممکن۔ و برشتگی کلام و نزاکت معانی میر را چہ گویم؟ باستادی و معلومات ایں مسلم الثبوت را چہ نویسم؟ سلمائے اعتبار میر دریں فن بالیلائے شہرت مرزا در یک محمل سوار، و آفتاب شہرۂ ایں ہر دو بے عدیل، بچرخ علو دریک درجہ گرمِ اشتہار۔ لہٰذا نواب آصف الدولہ مرحوم و مغفور ہم بعد رحلتِ مرزا، میر را از شاہجہاں آباد فخر یہ طلب داشتہ، بمنصب عالی ملازم ساخت داز خاطر داری و پاس مشارٌ الیہ، ہیچ دقیقہ فرونمی گزاشت۔ حالانکہ جناب میر بغرور کمال و استغنائے تصوف کہ مضمر بخاطرش بودہ، اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحال مردم می نمود، بلکہ گاہ گاہ بہ امراہم، چنانچہ باید، راہِ التفات و مبالغت نمی پیمود، چنانچہ نقل است کہ روزے میر صاحب قصیدۂ تازہ گفتہ بدربار آوردند۔ نواب وزیر کہ از چاشت فراغت کردہ متوجہ شنیدن شد۔ میر صاحب شروع بخواندن کردند و طول دادند۔ اتفاقاً آن روز ملا محمد مغلے را کہ تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ برائے ملازمت آمدہ می خواست کہ آں ہم چیزے در مدحِ حضور بخواند و تطویل قصیدۂ میر وقت نگزاشت۔ ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ ''میر صاحب قصیدہ خوب است، اما طولانی۔ اگر دماغ نواب صاحب وفا نمی کرد کہ می شنید؟'' میر بمجرد استماع بیاض از دست انداختہ و منغض شدہ گفت کہ اگر دماغ نواب وفا نمی کرد دماغ من کجا وفا می نماید؟' مطلق پاسِ حضور نہ نمود۔ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ، استمالہ مزاج میر بکمال مہربانی و ملتجبا نمودہ، بقیہ قصیدہ ہم تمام شنید و خاطر ملا ہیچ نہ کرد۔ باوصف ایں کہ او با نواب صیغۂ اخوت داشت۔ غرض کہ شرح صفات و بیانِ کمالاتِ آں سید الشعرا از قدرتِ قلم و زبان زاید است۔ بعد نواب ہم زندگانی بسیار کرد۔ سہ چہار سال شدہ کہ در لکھنؤ وفات یافت۔ شش ''دیوان'' و یک ''دیوانچہ'' و چند مثنوی ''شکار نامہ'' و طیاری ہولی وغیرہ کہ باشارۂ وزیر مرحوم نوشتہ بود، ہمہ در زبانِ ریختہ و چند جزو نثر و نظم فارسی در دہر یادگار گذاشتہ است۔ چنانچہ تاریخ آں یگانہ زمانہ مرزا مغل فرزانہ کہ ... ہضماًلنفسہ، غافل تخلص در کلام می گذارد دریں قطعہ نظم فرمودہ تاریخ۔

جب دلِ احباب پر موجب رنج و الم   واقعۂ جاں گداز میر تقی کا ہوا

مادہ تاریخ کا پیرِ خرد نے وہیں   درد کے رو سے کہا ''آج نظیری موا''

۴ + ۱۲۲۱ = ۱۲۲۵ ہجری (ص ۲۲-۲۶)

گلشنِ بے خار: از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۰)

میر تخلص افصح فصحا، اشعر شعرا سخنور عالی مقام محمد تقی نام از اہل اکبرآباد خواہرزادۂ سراج الدین علی خاں آرزو ست، لطافت بہ طبعش ہمزاد است و با کلامش حرف غیر زمزمہ بلبل و فغاں خا و طوطی ناطقۂ شکر بارش رونق بازار عنادل شکستہ و صفرخامۂ گلستاں نگارش نالہ برلب مرغ بستانی بستہ صفحۂ خیالش بجلوہ ریزی لالہ عذاران افکار دلاویز چوں اندیشۂ عاشق قطعۂ گلزار است و رشحۂ قلمش در شگفانیدن گلہائے مضامین تازہ ہم رنگ ابر نو بہار۔ صد آہِ دردناک بتاثیر یک مصراع اونیست و ہزار عزائم تسخیر ہم فسونِ نیم بیتش کور حلاوتِ سخنش بکام مشتاقاں گوارا تر از شہد لعل شکر باراست و نمک گفتارش بمذاقِ شوریدہ طبعاں بامزہ تر از پستۂ تبسم دلدار۔ نظمش اگر سحر است سحر حلال است و فکرش اگر از قوت مکتبی است از چہ اعجاز مثال بافنون نظمیہ ربط تمام دارد۔ لاسیما در غزل سرائی و مثنوی گوئی گوے سبقت می رباید... پست و بلند کہ در کلامش بنی

ورطب و یابس کہ درابیاتش بنگری نظر نہ کنی واز نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند۔ فرد۔

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست　　　در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

دلنشتہ سخن دریں باب تحت ترجمۂ مرزا رفیع سودا گذشت و بغایت چیدہ و سرہ است فلیتذکر۔ شش دیوان ریختہ باصناف سخن نظم کردہ۔ مسدس کہ بہ مضامین واسوخت گفتہ غازۂ شہرت بررودارد۔ از اقسام شاعری در قصیدہ فکر خوشے نداشتہ، چنداں کہ غزلش بلند مرتبہ تراست۔ ہمچناں قصیدہ اش پست پایہ تر درزیدہ و حال بہ شاہجہاں آباد آمد وتمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ می گزرانید و مایحتاج از سرکار نواب وزیرالممالک بہادری یافت ہم درآں جابسیر ملک عدم شتافت و دیوانہایش ملاحظہ شد۔ (ص ۲۱۰-۲۱۱)

(صدرالدین آزردہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے میر تقی المتخلص بہ میر... پستش اگر چہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند است۔ ص ۱۰۰ گلشن بیخار)

تذکرۂ بہار بے خزاں : از احمد حسین سحر لکھنوی (تالیف ۱۲۶۱ھ) نسخۂ قلمی مملوکہ مالک رام صاحب

میر تخلص محمد تقی نام از اہل اکبرآباد، خواہرزادۂ سراج الدین علی خاں آرزو، ہمدوش مہوشانِ پری جلوہ کنہ دانی و ہم آغوشِ دوشیزگانِ شوخ ادائے معانی است۔ دیوانۂ طرز دلکش و دل آویز آشفتۂ مضمونِ عاشقانہ و درد انگیز مجنونِ بہار حسن لیلائے دلفریبی، فرہادِ تلخ کامِ شیریں ادایانِ محبوبی، برشتہ جگر شمع رویان، ہم بستر ناکامی و ہم یاس وحرماں بودہ کلام شور انگیزش لختِ دل پارہ دارد و زبانِ معنی آشنا درآتش انداختہ و روزمرہ گفتگوے بے ساختہ اولطفِ حسن بندش دیگراں از دلہا برداشتہ۔ مشہور است کہ بشہر خویش باپری تمثالے کہ از عزیز انش بود، در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشتہ آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بیچار بیچار سوے رسوائی بشکند وحسن بے پردہ بجلوہ گری درآید۔ از ننگ افشائے راز وطعن اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت وحرماں و باخاطر ناشاد دست وگریباں، قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ برانداز یہا بشہر لکھنؤ رسید وسنگِ شکیبائی بر شیشہ زدہ از آوارہ گردیہا آرمید وہمیں جا بصد حسرتِ جانکاہ جلاوطنی وحرماں نصیبی از دیدارِ یار دیارِ جاں بجان آفریں داد تا قید رشتۂ حیات بود، طوق محبت بگردن وسلسلہ دیوانگی بپاداشت۔ از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پنداشت کہ صد آرزو بخاک برد۔ چند مثنوی ہا وشش دیوان ریختہ دارد و بفارسی ہم سلیقہ داشتہ، القصہ تاثیر کلام قیامت زاش تاثیرے دارد کہ ہمچو خدنگ خاراشگاف از سینہ بروں می جہد (ص ۱۵۴-۱۵۶)

گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب : از حکیم میر قطب الدین باطن اکبرآبادی (نول کشور، ۱۲۹۱ھ)

میر تخلص مرشد شعرا درۃ التاج اساتذہ فلک احتشام درغرر بحر اوستادان رفیع احترام لولوے شاہوار فصیحانِ ارفع التزام، جناب میر محمد تقی نام والا دودمان عالی خاندان، ملک مالوفہ ابرنیساں بار، فخرِ دہلی درمکنون ہمشیرہ زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو اوستاد اساتذۂ جدید وقدیم جن کے سب شاعر معتقد ہیں جو جاہل ان کی نسبت الفاظ اہانت لکھے اس سے گفتگو فصاحت خادمۂ کلکِ جادو نگار بلاغت کنیز خامہ طوبیٰ اطوار، محاوراتِ روزمرہ غاشیہ بردار، طبع شوخ گوہر بار، مضمون

عاشقانہ سحابِ فکر سے ترشح کرتے ہیں۔ نباتاتِ کیمیا خصلت مرزبومِ شعر میں نشوونما اترتے ہیں۔ اہتزازِ نسیمِ طبع نے وہ گلہائے بوقلموں کھلائے جن کی نکہت سے مشامِ یاراں عنبر سر ہو جائے۔ عنادلِ طبع تخن سنجانِ عصر شاخِ مضارعِ رنگین پر پروانہ وار نثار، طوطی نواسنج زبان خوش گویانِ کلام کے روبرو صورت آئینہ بصد شکل حیران و پر اضطرار۔ زبان گویا کا کام نہیں کہ ان کے لب ولہجہ کے روبرو گفتگو کرے۔ ناطقہ کو تاب کہاں کہ یارا بات کہنے کا ہو، روبرو اف یا تو کرے۔ صفیرِ خامہ چمنستان دیوان میں رشکِ صدائے بلبل ہزار داستاں، نوائے کلکِ دو زبان بوستانِ نظم میں روکش نغمۂ طوطی خوش زباں۔ جس مرتبہ صفت لکھیے مناسب اور بجا لاریب فیہ۔ جس قدر تعریف کیجیے زیبا۔ صاحب گلشن بیخار آنحضرت استاد کی خدمت میں بھی بے ادبی کے الفاظ لاتے ہیں۔ صفت کی عبارت لکھتے لکھتے پھر وہی ژاژ خائی کی طرف لے جاتے ہیں اور ایسے ایسے فقرات تحریر فرماتے ہیں، پست و بلند کہ درکلامش ہنی و رطب و یابس کہ در ابیاتش بنگری نظر نہ کنی و از نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند، شعر۔

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

اس فقرے کا فقرۂ دیگر دوسرے چہرہ تصویر کا اور ہی رنگ ہے ان کے اس بیان کا نئے طرز کا ڈھنگ ہے: در قصیدہ فکرِ خوش نداشتہ۔ چنداں کہ غزلش بلند رتبہ تر است ہمچناں قصیدہ اش پست پایہ تر در بدر حال شاہجہاں آباد آمدہ وتمتع نیافتہ ناکام برگشتہ الخ جب ایسے صاحب کی نسبت یہ عبارت ہو تو اوروں کی کیا حالت ہو۔ میر گلشن بیخار و گلستان بے خزاں سے جھوٹ سچ دونوں کا معلوم ہوگا، فریقین کا نیک و بد سیاروں کو مفہوم ہوگا۔ مرشد شعرا نے چھ دیوان فکر شائستہ سے آمادہ کے کہ شش جہت میں جواب نہیں۔ ان کے برابر نظمِ اردو میں کسی شاعر کی کتاب نہیں۔ قیام اپنا لکھنؤ میں اختیار کیا۔ سرکار نواب وزیر الممالک میں روزگار کیا۔ یہ اشعار نتائج افکار شریفہ سے زیب جریدہ کیے۔ فی الحقیقت شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ کیے۔ گرمی کلام سے عدو کباب ہے، آتش حسرت میں خاک وہ خانہ خراب ہے۔ کلام میر ہی افسر برخورد و کبیر ہے۔ استاد کا ارشاد ہے، جس کے فیض سے ہر شاگرد استاد ہے۔ صفحۂ کاغذ دبستانِ تخن ہے، سطح قرطاس گلستانِ تخن ہے، جب پڑھتے اور گنتے ہیں تو نظارہ کے دامن دامن پھول چنتے ہیں۔ اس گلشن کے سیاروں کا دل باغ باغ ہے بہار دیکھیے تو غیر خزاں نصیب ذلیل خوار کے دل پر داغ ہے۔ رہروانِ منزلِ نظم کے خضر کا کلام ہے۔ اس طریق سے جادہ کاغذ پر انتظام ہے۔ (ص ۲۲۶-۲۲۷)

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی): از سعادت خاں ناصر لکھنوی (۱۲۶۱ھ) (نسخۂ آزاد لائبریری، علی گڑھ)

استادِ استاداں، امامِ شرعِ سخنوراں، عدیم المثال، بے نظیر، محمد تقی متخلص بہ میر۔ پسر رشید عبداللہ ساکن اکبرآباد ہمشیرزادۂ سراج الدین علی خاں آرزو، غالب ہے کہ تربیت یافتہ بھی ای کے ہوں۔ یہ نقل خود فرماتے تھے کہ عنوان (؟عنفوان) جوانی میں جوشِ وحشت اور استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور زبان و کام ہرزہ گوئی پر راغب۔ ترکِ نیک (؟ننگ) و نام بلکہ رسوائی خاص و عام، پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کاروبار تھا۔ خان آرزو نے کہا: اے عزیز دشنامِ موزوں دعاے ناموزوں سے بہتر اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیع شعر خوشتر ہے۔ چونکہ موزونی طبیعت جوہر

ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی، مصرع یا بیت ہوگئی۔ بعد اصلاح دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا۔ کبھی کبھی دو چار شعر جو خان آرزو کی خدمت میں پڑھے، پسند فرمائے اور تاکید شعر و سخن کی زیادہ سے زیادہ کی۔ ایک دن خان آرزو نے ان سے کہا کہ آج مرزا رفیع آئے اور یہ مطلع نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے۔

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا　　صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میر صاحب نے اس کو سن کر بدیہہ یہ مطلع پڑھا۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

خان آرزو فرطِ خوشی سے اچھل پڑے اور کہا: خدا چشمِ بد سے محفوظ رکھے۔

اب سنیے، جب اکبرآباد سے میر صاحب پورب کی طرف چلے، حسب اتفاق ایک بنیے کے ساتھ سوار ہوئے، مگر وقت سوار ہونے کے کچھ رات باقی تھی۔ جب روز روشن ہوا اور اس کی صورت دیکھی، منھ اپنا ادھر سے پھیر لیا اور لکھنؤ تک اس کی طرف منھ کرکے نہ بیٹھے۔ سبحان اللہ، کیا عالی دماغ لوگ تھے کہ ضرورت میں بھی ناگوار کو گوارا نہ کرتے تھے۔ مرزا مغل سبقت نقل کرتے تھے کہ جب میر صاحب لکھنؤ تشریف لائے، میں نے دولت دست بوسی حاصل کی۔ بعد قیل و قال کے ملتمس ہوا۔ کچھ اپنے کلام سے مستفید فرمائیے۔ بے تامل فرمایا کہ تمھارے بشرہ سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی۔ سخن کے ضائع کرنے سے حاصل! انسان کو اتنی خود پسندی بھی زیبا نہیں کہ 'مثلِ من دیگرے نیست: **فضلنا بعضکم علی بعض**۔ مرزا مغل اچھے شاعر تھے، بلکہ اوروں پر سبقت رکھتے تھے۔ ایک دن شاہ قدرت اللہ تخلص قدرت اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت نے چند غزل اپنے دیوان کی پڑھیں۔ میر صاحب نے کچھ نہ کہا۔ آخر وہ ملتمس ہوا کہ آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ میر صاحب نے کہا: صوابدید یہ ہے کہ تم دیوان کو اپنے دریا میں ڈال دو۔ اور ایک نقل ہے کہ عمادالملک نواب غازی الدین خاں لب دریا بیٹھے ہوئے تھے اور مرغانِ آبی بطور سرخاب دریا میں واسطے سیر و تماشا کے چھوٹے ہوئے تھے۔ اتفاقاً میر صاحب ادھر سے آنکلے۔ نواب نے چند قصیدے اپنے میر صاحب کے روبرو پڑھے اور داد طلب ہوئے۔ میر صاحب نے فرمایا: میری مدح کی کیا احتیاج ہے، ہر ربط کو صاحب کے اشعار پر حالت وجد اور سماع ہے۔ نواب کو یہ سخن نہایت ناگوار گذرا۔ دوسرے روز میر صاحب کو پھر طلب فرمایا اور آپ ایک کرسی پر بیٹھے۔ زمین پر سوائے خاک کچھ فرش نہ بچھوایا۔ میر صاحب نے لمحہ کے لمحہ انتظار چوکی اور مونڈھے کا کیا بعدازاں دوپٹہ اپنا اتار کر کے بچھایا اور بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے کہا: کچھ عنایت فرمائیے یعنی اپنے کلام سے مستفید کیجیے۔ میر صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر　　سمجھے نہ ہم، تو فہم کا اپنی قصور تھا

جب سرکار نواب آصف الدولہ بہادر میں میر صاحب صیغۂ شاعری میں نوکر ہوئے، ایک دن وہ آصف جاہ کتاب خانہ میں جلوہ گر تھا اور روائیں زیر و بالا رکھے ہوئے تھے۔ ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے بہت دور تھی اور میر صاحب

سے نزدیک۔ فرمایا: مجھے اٹھا دیجیے۔ میر صاحب نے ایک خادم سے کہا: سنو تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں۔ نواب نے راست ہوکر اس کو اٹھالیا، مگر یہ (بات) مرزا (کو) نہایت ناگوار خاطر ہوئی۔ بعد یک لمحہ کے فرمایا: کیوں میر صاحب! مرزا رفیع السودا کیسا شاعر مسلم الثبوت تھا! میر صاحب نے کہا: بجا، ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد، ہنر است۔ حضور پرنور نے کہا: ہم عیب پسند ہیں! یک نشد، دو شد۔ اس میں میر محمد سوؔز صاحب کہ استاد جناب عالی کے تھے، واسطے مجرے کے حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا: کچھ شعر پڑھو۔ حسب الحکم میر سوؔز نے دو تین غزلیں اپنے دیوان کی پڑھیں۔ نواب فلک جناب نے تعریف میں ان کی مبالغہ فرمایا۔ میر صاحب کو دلیری میر سوؔز کی اور تعریف نواب کی بہت ناگوار گذری۔ میر سوز صاحب سے کہا: تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی؟ میر سوؔز نے کہا: صاحب بندہ، کیا میں شاہجہاں آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا؟ کہا بزرگی اور شرافت میں تمھاری کیا تامل! مگر شعر میں میر سے کسی کو ہمسری نہیں۔ موقع اور محل تمھاری شعرخوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈکاحیا پکتی ہو، نہ کہ میر تقی کے سامنے۔ میر سوؔز سے تو یہ کہا اور وہ شقہ کہ جو میر کو حضور پرنور نے لکھا تھا، جیب سے نکال کر حضور کے آگے رکھ دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے: خانہ آباد و دولت زیادہ۔ نواب نامدار نے فرمایا: خدا حافظ۔ دو تین مہینے کے بعد تحسین علی خاں نے ذکر اس کی عسرت اور غریب الوطنی کا تقریباً حضور میں گذارش کیا۔ اس حاتم زمان نے اول شکایت ان کی بے اعتنائی کی بہت سی کی، بعدۂ شفاعت خواجہ سرا کی قبول فرمائی۔ خواجہ سرا خوش خوش میر صاحب کے پاس آیا اور وہ ذکر سنایا۔ میر صاحب نے حاضر ہونا دربار میں اس کی معرفت سبک سری سمجھ کر انکار کیا۔ ایک دن وہ جوہر شناسِ ہنرمندان عتیق اللہ کے امام باڑہ کی طرف آیا اور تحسین کو اشارہ کیا کہ میر صاحب کو لے آ۔ خواجہ سرا نے میر صاحب سے کہا: چلو، تمھارے لینے کو حضور آئے ہیں۔ سبحان اللہ کیا قدرشناسی تھی کہ اپنے نوکر کی رئیسوں کو یہ خاطر تھی۔ آخر آخر میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا اور صورت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائنہ ہوئی۔ پر جوان ہمت ایسوں کو کہتے ہیں، کسی نے پوچھا کہ اس پیرانہ سالی میں کدخدا ہونے کا کیا باعث ہوا؟ فرمایا: فقط اس واسطے کہ سسرال والے کہیں: لڑکا آیا۔

جب مرض الموت سے بیمار ہوئے، وصیت کی۔ میرے جنازے کے اٹھانے میں تعمل (؟تعجیل) نہ کرنا جو سنے گا کہ میر نے رحلت کی ہے، خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول بھیجے گا۔ بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی، کسی نے کچھ نہ بھیجا۔ آخر شیخ امام بخش ناسخ کی اعانت زادِ آخرت ہوئی۔ میاں مصحفی نے تاریخ ان کے مرنے کی ۔

موا نظیری آج

کہی ہے اور ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ یہ ہے۔

شد ز جہاں میر محمد تقی　　داغ ز بے مہری اہلِ جہاں
ناسخ تاریخ وفاتش نوشت　　واویلا مرد شہ شاعراں

۱۲۲۵ ہجری

کھلا نشہ میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میرؔ　　سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

استاد نا حضرت مذنب مغفور فرماتے تھے کہ میں نے یہ مقطع میر سے سن کر یہ شعر فارسی کا پڑھا۔

ز فرطِ نشۂ خود گشت طرہ بر دستار   سمندِ ناز ترا تازیانہ دیگر شد

میر صاحب نے کہا: یہ دل و دماغ اور فرصتِ فراغ کسے ہے کہ اور کا کلام دیکھیے (ص ۲۶ (ب) ۲۹ (الف)

طبقات الشعراے ہند: از ایف فیلن و مولوی کریم الدین: ۱۸۴۷ (مطبع العلوم دلی، ۱۸۴۸)

میر، افصح فصحاے محمد تقی نام، اکبرآبادی ہے وہ سراج الدین علی خاں آرزو کا بھانجا تھا۔ یہ ہی وہ شاعر ہے جو کہ بنام میر مشہور ہے۔ شعر اس کا تمام شعرا سابقین اور متاخرین سے بیشک بہت اچھا ہے تمام فنون نظمیہ وہ جانتا تھا، خصوصاً غزل اور مثنوی اس کی سب سے بہتر ہے۔ آج کے زمانہ تک تمام شعرا اس کے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے۔ وہ شاعر واقع میں ایسا ہی ہے کہ اگر اس کو بادشاہ شعرا کا کہیں تو بجا ہے۔

چھ دیوان ریختہ مع مسدس و مخمس و غزل و رباعی و قطعہ وغیرہ کے اس کے موجود ہیں۔ میرؔ کا قصیدہ اچھا نہ ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی میں سودا کو میر پر فوقیت ہے اور غزل میں میر کو سودا پر۔ ابتدا حال میں درمیان شاہجہاں آباد کے آیا، ناکام پھر لکھنؤ کو چلا گیا۔ سرکار نواب وزیرالمما لک میں ملازم ہوا۔ ۱۷۹۳ میں اس جا فوت ہوا۔ اس کی تصنیف سے نو مثنویاں، چھ دیوان، ایک تذکرہ نکات الشعرا ہے۔ اول میں جب دلی میں تھا، خواجہ میر درد کے گھر میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ پھر بموجب خواہش درد کے، میر مجلس مشاعرہ اپنے مکان پر منعقد کرنے لگا۔ میں نے تمام دیوان اور مثنویات اس کے خوب دیکھے ہیں۔ (ص ۱۱۵-۱۱۶)

سخن شعرا: از مولوی عبدالغفور بہادر نساخ: ۱۲۹۱ھ (نول کشور)

میر تخلص میر محمد تقی اکبرآبادی ولد میر عبداللہ ہمشیرزادہ و شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو، عنفوانِ شباب میں دہلی میں گئے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی۔ نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے ان کا وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ سنہ بارہ سو پچیس ہجری میں فوت کیا۔ سواے قصیدہ کے جمیع اصناف سخن پر قادر تھے۔ اشعار ان کے بغایت مرتبہ رتبہ بلند رکھتے ہیں۔ فرطِ اشتہار سے حاجتِ بیان نہیں۔ مثنوی و غزل گوئی میں استاد مسلم الثبوت گذرے۔ ان کی استادی سے کسی کو انکار نہیں۔ جو درد کہ ان کے کلام میں ہے کسی شاعر ریختہ گو کے کلام میں نہیں۔ ان کے چھ دیوانِ ریختہ معہ قصائد و مثنوی نظر سے گذرے۔ ایک دیوانِ فارسی اور ایک تذکرۂ شعرا اور ایک رسالہ فیض میر بھی ان سے یادگار ہیں۔ (ص ۴۷۹)

●●●

آل احمد سرور

میر کے مطالعہ کی اہمیت

اردو شعر و ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ابھی تک ہمارے بہت سے اماماں فن کے کلیات و دواوین یا تو دستیاب ہی نہیں ہوتے یا ملتے ہیں تو بہت غلط ہیں اور ان کی کتابت و طباعت بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام اساتذہ کے کلام کے مستند ایڈیشن صاف ستھری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوں تا کہ ایک طرف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی ذہنی غذا کا سامان ہو سکے اور دوسری طرف تحقیق و تنقید زیادہ صحیح بنیادوں پر ہو سکے۔

میر کی کلیات کا وہ ایڈیشن جو نول کشور پریس نے آخری بار شائع کیا تھا اور جس کی صحت عبدالباری آسی نے کی تھی اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا، عبادت بریلوی نے پاکستان سے کلیات میر کا ایک نیا ایڈیشن ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے متن میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئی تھیں مگر یہ بھی اب ہندوستان میں نہیں مل سکتا۔ اس لیے کلیات میر کے ایک ایسے مستند ایڈیشن کی ضرورت سختی سے محسوس کی جا رہی تھی جو دیدہ زیب بھی ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ زیر نظر ایڈیشن اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے، ویسے ادبی دنیا میں حرف آخر تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔

میر کے متعلق کچھ کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ میر کی عظمت ان کے زمانہ سے آج تک مسلم رہی ہے اور مشکل اس لیے کہ اس عظمت کا تجزیہ یا اس کا سائنٹفک مطالعہ ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکا ہے۔ کسی شاعر پر تنقید کے لیے سب سے اہم تو اس کا کلام ہے لیکن اس کے علاوہ شاعر کے حالات زندگی، اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، اس کے ماحول، اس سے پہلے کے شاعری کے اسالیب سب کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا یہ خیال اگرچہ غلط نہیں ہے کہ زمانہ کسی شاعر کو یوں ہی اہم قرار نہیں دیتا مگر اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے سے فکر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور تنقید میں ایک تقلیدی رنگ آ جاتا ہے جو ادب کی ترقی کے لیے مضر ہے۔ اس لیے میر کی مسلمہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی ہمارا فرض یہ ہے کہ تنقید کے ان جامع اصولوں کی روشنی میں جو دور حاضر کا عطیہ ہیں، ہم میر کو پرکھنے کی اور اس طریقہ سے اپنے تنقیدی معیاروں کو پرکھنے کی برابر کوشش کرتے رہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اگرچہ میر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر سوائے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر حیات اور شاعری" اور ڈاکٹر عبداللہ کی "نقد میر" کے ابھی تک کوئی تفصیلی جائزہ موجود نہیں ہے۔ میر پر مضامین کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان میں سے بعض ایک سنجیدہ اور قابل قدر مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر کے متعلق بہت کچھ بے سوچے سمجھے تسلیم کر لیا گیا ہے اور اسی لیے ہماری کوشش یہ ہے کہ میر کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ ان کے فکر و فن کی اہمیت واضح کی جائے اور اردو شاعری میں ان کے کارنامے کی نوعیت متعین کی جائے۔

میر کے حالات بہت کچھ ''ذکرمیر'' سے معلوم ہو سکتے ہیں جو ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ لیکن میر کے سارے بیانات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا جیسا کہ خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ میر نے اپنے والد کی بزرگی کا جو تذکرہ کیا ہے اس پر اکتفا کر کے میر کے بچپن کی تصویر کھینچنا ہمارے عام نظامِ اخلاق کے مطابق ہو تو ہو لیکن ادبی تحقیق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ میر نے جو کچھ کہا ہے وہ سرتاسر جھوٹ ہے لیکن میر کے سچ کا ثبوت اس دور کے تذکروں یا تاریخوں سے ملنا چاہیے۔ آزاد نے بعض قدیم تذکروں کی مدد سے آبِ حیات کے نگارخانہ میں میر کی ایک جیتی جاگتی تصویر ضرور بنائی ہے مگر آزاد کے تاثرات و تعصبات بھی مسلم ہیں۔ میر کے حالات کے سلسلہ میں ''گلِ رعنا''، جواہرِ سخن، مقدمۂ نکات الشعرا، مقدمۂ مثنویاتِ میر، مقدماتِ کلیاتِ میر، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، تذکرۂ مجموعۂ نغز، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ از مسعود حسن رضوی اور قاضی عبدالودود کے متعدد مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری تحقیق اب تک محدود دائروں میں گھومتی رہی ہے اور بنیادی اور ضمنی باتوں میں فرق نہیں کرتی، اس لیے ان سے ہمیں میر کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ معمولی واقعات اور نتیجہ خیز واقعات میں فرق ہے۔ میر کے والد کا نام دراصل اتنا اہم نہیں جتنا میر اور خان آرزو کے بگاڑ کے وجوہ کو سمجھنا۔ ذکرِ میر اور نکات الشعرا میں خان آرزو کے متعلق متضاد باتیں کیوں ملتی ہیں؟ میر باوجود اس کے کہ مختلف امرا سے کسی نہ کسی طرح متوسل رہے ہیں کیوں اپنی درویشی اور بے نیازی پر اس قدر زور دیتے ہیں؟ اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے۔ میر کا گھریلو ماحول، ان کی اکبرآباد کی زندگی، دہلی میں ان کے عنفوانِ شباب کے تجربات، ان کی دیوانگی، بعض امرا سے ان کے مراسم، لکھنؤ میں بیتی ہوئی زندگی، آصف الدولہ اور ان کے معاملات، معاصرین سے ان کے تعلقات یہ ایسے مسائل ہیں جن پر ابھی تک بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ میر کا کلام ان کی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا، ان کے جو دیوان ملتے ہیں ان میں ایک تاریخی ترتیب ہے لیکن ان کے دہلی اور لکھنؤ کے کلام کو علیحدہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کے ارتقا پر رائے زنی ہو سکے۔ میر کے معاصرین کے اقوال ہم آنکھیں بند کر کے نہیں مان سکتے۔ ہمیں ان سارے جذبات و تعصبات کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو ایک ہم عصر اور میر جیسے نازک مزاج ہم عصر کے متعلق قرینِ قیاس ہیں۔ ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس زمانہ میں تحقیق اور تنقید کا معیار کیا تھا اور ذاتی اور شخصی تعلقات شاعری پر رائے میں کس حد تک اثرانداز ہوتے تھے۔ پھر لکھنؤ اور دہلی کے تہذیبی ماحول میں جو فرق رونما ہو رہا تھا اس کا احساس بھی ضروری ہے۔ میر کے حالات اور شخصیت کے متعلق تحقیق ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ میر کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہے لیکن اگر ہم موجودہ معلومات کو تقلید کی روش یا اجتہاد کے جذبہ سے بلند ہو کر پرکھیں تو میر کی زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں ضرور کہہ سکتے ہیں۔

میر کو بچپن ہی میں مہربان ''چچا'' اور شفیق باپ کی موت کی وجہ سے ایک محرومی کا احساس ہوا۔ بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ چنانچہ محرومی کے احساس میں ظلم کا احساس بھی شامل ہو گیا۔ دہلی میں انھیں خان آرزو جیسے سنجیدہ اور ثقہ آدمی کی صحبت ملی۔ مگر خان آرزو کی شفقت انھیں نصیب نہ ہوئی۔ قصور خان آرزو کا زیادہ ہے یا میر کا، اس کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خان آرزو میر کے اطوار سے خوش نہ تھے۔ یہ اطوار اخلاقی اعتبار سے کتنے ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہوں ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ ایک عالم اور ایک ''رند'' کے مزاج میں جو فرق ہوسکتا ہے وہ یہاں بھی موجود تھا۔ اس فرق نے اپنا رنگ دکھایا۔ میر خان آرزو سے رخصت ہوئے، ایک گھنے سایہ دار درخت کا سایہ ان کے لیے عذاب ہوگیا۔ انھوں نے کڑی دھوپ کی آزادی پسند کی اور اس سایہ میں جو چوٹیں ان کے دماغ کو لگی تھیں انھیں ساتھ لیے ہوئے اپنی انانیت کے سہارے زندگی کے خارزار میں مردانہ وار نکل کھڑے ہوئے۔ میر دیوانے تو نہیں تھے مگر دیوانگی کا دورہ ان پر پڑ چکا تھا۔ ایک گہرے اور طوفانی عشق نے ان کے دل و دماغ پر شدید اثر کیا تھا۔ باپ اور چچا سے انھیں چند اخلاقی اور متصوفانہ تصورات ملے تھے۔ وہ اعصاب زدہ Neurotic ضرور تھے، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے وہ یکسر بے نیاز تو نہیں ہوسکتے تھے لیکن اپنے تخیل کی طلسم کاری سے اس پر پردہ تو ڈال سکتے تھے۔ دہلی کی معاشرت نے انھیں جو کچھ دیا تھا اس کو سینہ سے لگائے جب وہ لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ کی جنت سے ان کی نگاہیں خیرہ تو کیا ہوتیں، ہاں ان پر ایک حقارت کی نظر تو ڈال سکتے تھے۔ ضرورت امرا کی طرف جانے پر مجبور کرتی تھی۔ مگر اپنے کو لیے دیے تو رکھ سکتے تھے۔ دہلی کی تباہی و بربادی میں انسانیت اور تہذیب کی جو بربادی ہوئی اس کا احساس تو رکھ سکتے تھے۔ صدیوں کے ریاض سے تہذیب کی جو جنت بنی تھی اس کے مٹنے سے اخلاق اور اقتدار کا جو نقصان ہوا، اسے تو محسوس کر سکتے تھے۔ جو خزانہ زمانے کے ہاتھوں لٹ گیا تھا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ تو لگا سکتے تھے۔ میر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان نکتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

رہی میر کی شاعری تو اگرچہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے متعلق اختلاف نہیں ہے مگر خصوصیات کے تعین اور ان کے مدارج کے متعلق بے شمار جزوی اختلافات ہیں۔ تذکروں کی تنقید بیشتر تعارف، تحسین یا تنقیص سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس غبار میں حقائق کی کرنیں ضرور ہیں مگر اس زمانہ کے تہذیبی اور اخلاقی معیاروں نے تنقید کو تقریظ اور تجزیہ کو تاثرات کی ایک دلدل بنا دیا ہے۔ میر کی سادگی، ان کی قنوطیت، پست و بلند، ان کی آہ اور مرزا کی واہ کو اب لوگ بے سمجھے بوجھے دہرا دیتے ہیں۔ میر پر لکھنے والوں میں پہلی معنی خیز تنقید مولوی عبدالحق کی ہے۔ انھوں نے ان کے غم کو ان کے ماحول کے انتشار سے مربوط کیا ہے۔ اس کے بعد وحیدالدین سلیم نے میر کے کلام کی اصلیت اور ان کے بیان کے جادو پر زور دیا۔ مگر میر کی سادگی قنوطیت اور جذباتیت کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا چکا تھا کہ یہ خیالات ادبی تاریخ کا جزو بن گئے۔ اس یک رخی تصویر نے بیسویں صدی کی اس نسل کو جو جذبات سے آگے بڑھ کر فکر کی کارفرمائی دیکھی تھی اور جو غالب کی ذہنی رو سے خاصی مانوس ہو چلی تھی، میر سے بیگانہ رہنا سکھایا۔ پھر سماجی تنقید نے اپنے جوش میں کبھی اس عشق کی مذمت کی جو ایک آزار ہے کبھی جذبات کی مستی کو ایک خطرہ قرار دیا اور کبھی حسن و عشق کے رنگ محل کو حقائق سے فرار بتایا۔ میر کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہوئے، اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نسل نے میر کو اپنے دل سے قریب نہ ہونے دیا۔ میر کے دیوان کی جگہ تو الماری کے سب سے اونچے خانہ میں محفوظ تھی مگر اس کا مطالعہ چنداں ضروری نہ رہا تھا۔ صرف اس کا احترام کافی تھا لیکن سماجی تنقید کی ابتدائی طفلانہ کوششیں جب کم ہوئیں اور اس میں توازن آیا تو کلاسکس کو دوبارہ دریافت کیا گیا۔ عبدالحق اور وحیدالدین سلیم کے بعد میر کی عظمت کا احساس دلانے میں جعفر علی خاں اثر اور مجنوں کا بھی ہاتھ ہے۔ اثر نے میر پر متعدد قابل قدر مضامین لکھے اور جو لوگ غالب پرستی کے جوش میں میر کو محض جذبات کا شاعر سمجھتے تھے ان پر یہ حقیقت واضح کی کہ بڑی شاعری میں فکر اور جذبہ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بعض اوقات یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کون سی چیز

کہاں شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ جعفر علی خاں اثر نے ان بکھرے ہوئے موتیوں سے کوئی مالا نہیں بنائی۔ پھر بھی مرزا میر کے نام سے انھوں نے میر کا جو انتخاب شائع کیا اس کے مقدمہ میں میر کی حسن کاری کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر کی سادگی کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر خلط مبحث بھی کیا۔ سادگی یا رنگینی بذات خود کوئی بڑی چیز نہیں۔ سادگی خیال کی ترسیل میں مدد دیتی ہے۔ رنگینی اسے کیفیات کے ایک لطیف غبار میں پیش کرتی ہے۔ سادگی یا رنگینی سے پہلے خیال کی ندرت اور اظہار کی کیفیت ضروری ہے۔ یہ کیفیت جب سادگی لیے ہوتی ہے تو زیادہ عام فہم ہوتی ہے، لیکن غالب کے یہاں ان کے بہترین اشعار وہی نہیں ہیں جو سادہ ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے میر کی جو پرستش شروع ہوئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نئی نسل جس کے پاس حقائق نے صرف کھلے ہوئے خواب چھوڑے ہیں اور جس کے صنم کدے کئی بار ویران ہو چکے ہیں، میر کی آواز میں ایک جانی پہچانی کیفیت محسوس کرتی ہے۔ اس نسل کے پاس زخموں کی جو کائنات ہے، وہ میر کی ''چشم خوں بستہ'' سے اور ان کے عشق کے آزار سے اسے کچھ قریب کر دیتی ہے مگر اس مقبولیت میں بھی میر کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہے بلکہ میر کے ایک من مانے بت کی پرستش ہو رہی ہے۔ ہر دور اپنی ذہنی پرواز اور حدودِ فکر کے مطابق اپنے ماضی کی تشریح اور تفسیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ الگ الگ تصویریں میر کی تمام خصوصیات کی آئینہ دار نہیں ہیں۔ میر کی شاعری بھی ایک بت ہزار شیوہ کی طرح ہے۔ وہ ہمیں جو بصیرت عطا کرتے ہیں اس کی کئی جہیں ہیں۔ سطحی ذہن رکھنے والے میر کے دردناک اشعار سے اس دور کے درد و داغ کا جو اندازہ لگاتے ہیں اس میں اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ میر کا مقصد صرف ماحول کی عکاسی نہیں ہے۔ گو اس کے کلام میں اس ماحول کی روح جلوہ گر ہے۔ میر اس لیے بڑے شاعر نہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں۔ وہ اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ جو واقعات اور حالات کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی دنیا ہے اس کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیتا ہے۔ میر کے مطالعہ میں ہمیں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ہے کہ انھیں کے ذریعہ سے ہم اس دور کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں اور محشر جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو ہماری تہذیبی بساط پر رونما ہوا تھا۔ میر اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کی کرن نہ صرف ماضی کے دھندلکے کو چیر کر ہمیں ایک جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی ہے بلکہ ان کی یہ تصویر ہمارے حال اور مستقبل دونوں میں رہبری اور رہنمائی کر سکتی ہے۔ میر کی رفاقت سے ہم اسی لیے کسی دور میں منھ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔

میر کی شاعری کی اہمیت کے اسباب ظاہر ہیں۔ ان کے خیالات میں گہرائی، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے۔ یوں تو ان کی نظر انتخابی ہے یعنی زندگی کے مخصوص پہلوؤں کی زیادہ کامیاب مصوری کرتے ہیں مگر اس انتخاب میں بھی قوسِ قزح کی سی دلآویزی اور رنگارنگی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے ماحول دونوں میں کئی بڑے بڑے طوفانوں سے گزرے ہیں۔ ابتدائی تربیت نے انھیں ایک نظامِ اخلاق، ایک شیوۂ زندگی اور ایک آئینِ مجلسی عطا کیا۔ جوانی نے انھیں ہر قسم کے تجربات سے آشنا کیا مگر یہ تجربات ان کے مزاج کو بدل نہ سکے، ان کے مخصوص میلان کو اور استوار کر گئے۔ میر کی زندگی میں ان کے عشق اور دورِ جنون دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے اثر سے وہ عمر بھر اعصاب

زوہ رہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کی سمت کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت کے پیچ وخم کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ میر کے یہاں عشق کا تصور ایک دھندلا سا دیا نہیں ہے بلکہ ایک شعلۂ بے باک ہے جس کی آنچ ان کی ہڈیوں تک کو جلائے دیتی ہے۔ اس مادی عشق کا سلسلہ ''اسرار و معارف'' سے بھی مل جاتا ہے کیونکہ یہی اس زمانہ کا ذہنی سرمایہ تھے۔ مگر اس میں ہماری گوشت پوست کی دنیا اور اس کے تند و تیز جذبات کی ساری گرمی موجود ہے۔ یہ عشق ایک وضع داری بن کر زندگی کی ایک خاص قدر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور وہ بصیرت عطا کرتا ہے جس کے فیض سے واعظ اور ناصح کی منافقت، دیر و حرم کی حد بندی، دولت کی رعونت، تعیش کی سطحیت واضح ہوجاتی ہے۔ یہی دردمند انسانیت کی وہ آواز بن جاتا ہے جو ہر جبر و قہر کے خلاف ہے اور صداقت، حسن، انصاف اور صحتِ ذہنی کی امین ہے۔ میر کے فن پر توجہ اور ان کی فکر کی طرف سے بے نیازی نے ان کے جوہر کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ حالانکہ فن کی بہار فکر کی حنابندی کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ میر کا فن اس لیے برگزیدہ اور بلند پایہ ہے کہ ان کے آئینۂ فکر میں پرخلوص تجربات کا جوہر ہے اور یہ تجربات بھی ذاتی ہوتے ہوئے ایک عمومی رنگ رکھتے ہیں۔ میر کا عشق گو جنسی ہیجان کا نتیجہ ہے مگر یہ جنسی ہیجان نہ ہوتا تو میر کی شاعری میں جنسی جذبہ ایک ترفع حاصل نہ کر پاتا۔ شاعری جنسی ہیجان کا نام نہیں ہے، جنسی ہیجان کے ترفع کا نام ہے۔ جب اس ترفع میں اخلاقی اقدار شامل ہوجاتے ہیں تو یہ ایک تہذیبی صفت بن جاتا ہے۔ شخصی اور ذاتی ناکامیاں اور محرومیاں ایک دور کی ناکامیاں اور محرومیاں ہوجاتی ہیں۔ ذات کائنات کی مظہر ہوجاتی ہے۔ شاعری زندگی کا آئینہ ہی نہیں اس کی شمع بن جاتی ہے اور اس شمع کی روشنی دیر تک اور دور تک ہماری رفاقت کرسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کچھ تو میر کی شخصیت کے پیچ وخم کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے، کچھ ان کی الم پسندی کو قنوطیت کہہ کر اور کچھ غزل کے رمز و ایما کے آداب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے میر کی شاعری کے کئی اہم پہلو واضح نہیں ہونے پائے۔ نشتریت، سادگی، قنوطیت، سوز و گداز جیسے الفاظ سے میر کے رنگ کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی۔ ان الفاظ کی اہمیت ضرور ہے مگر میر کی عظمت میں ان کا بنیادی حصہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس عظمت کو اور واضح کرتے ہیں۔ ادب کے طالب علم کا فرض ہے کہ میر کی نفسیات، اس دور کی تاریخ اور اس تہذیبی بساط سے آشنا ہوجائے جس میں میر نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کے سرد و گرم سے گزرے۔ اس تہذیبی بساط کی یہ خصوصیت نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ یہ اشراف کی پرستار ہوتے ہوئے بھی عوام اور عوام کی زبان سے اپنا رشتہ مضبوط رکھتی تھی اور دربار سے تعلق کے باوجود خانقاہ یا بازار سے منھ موڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میر کی شاعری اس لیے بھی ہماری بہت بڑی دولت ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے، بازار، خانقاہ اور دربار اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگار خانے میں جلوہ گر ہوجاتی ہیں۔

میر کے یہاں پست و بلند پر ہمارے نقادوں نے بڑا زور دیا ہے اور اسی وجہ سے ان کے بہتر نشتر مشہور ہیں۔ پست و بلند کی یہ اصطلاح بھی بڑی گمراہ کن ہے۔ اس سے کون بڑا شاعر بچا ہے۔ شیکسپیئر، گوئٹے، کالی داس، امرالقیس— پھر ہمارے یہاں سودا، نظیر، غالب، حالی، انیس، اقبال سب ہی کے یہاں کم و بیش یہ دھوپ چھاؤں مل جائے گی۔ پست و بلند سے کسی نے بہت برے اشعار اور بہت اچھے اشعار مراد لیے ہیں۔ کسی نے پستی کو ابتذال کے مضمون میں استعمال کیا ہے۔

لیکن یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ پہلی بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر کا کلام ناہموار ہے۔ دوسری سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے انھوں نے پست خیالات ظاہر کیے ہیں۔ دراصل پست و بلند کے اخلاقی اور جمالیاتی تصور میں فرق کرنا چاہیے۔ اخلاقی اعتبار سے میر کے یہاں جو خیالات قابل اعتراض ہیں وہ اس دور کی عام کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں اور صرف میر کو اس وجہ سے ہدف ملامت بنانا صحیح نہیں۔ شاہ حاتم سے لے کر نظیر، مصحفی، انشا اور جرأت تک یہ نشیب و فراز ملتا ہے۔ شرفا کی زندگی عام بدمذاقیوں سے مبرا نہیں تھی اور پچھلے اخلاقی قوانین کے پیچھے عقیدہ تو تھا مگر استقامت نہیں تھی۔ سماج میں جب کوئی بڑی ہلچل رونما ہوتی ہے تو یہ کیفیت اکثر نظر آتی ہے۔ رہی وہ پستی جو پھیکے پن یا سپاٹ پن کے مترادف ہے تو اسے پستی کے بجائے کسی اور نام سے یاد کرنا چاہیے۔ میر نے ساری عمر شعر کہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو دہراتے بھی ہیں اور کہیں کہیں ان کے اشعار صرف کلامِ موزوں بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں شروع سے آخر تک ایک لہجہ اور آواز ہے۔ آوازوں کا تصادم یا کشمکش نہیں ہے۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ جس طرح غالب نے اپنے کلام کا انتخاب کیا تھا اسی طرح میر کے بھی کلام کا انتخاب ہوتا تو ان کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوتا۔

نشتریت، تغزل، سہل ممتنع، یاسیت یا قنوطیت ان میں سے کسی اصطلاح میں میر کے مجموعی رنگ کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ نشتریت یا تغزل یا سہل ممتنع میر کی کچھ خصوصیات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ قنوطیت کی اصطلاح یقیناً غلط ہے۔ اس پر بحث آگے آئے گی۔ الم پسندی اور الم پرستی میں فرق کرنا چاہیے۔ دراصل میر اور غالب جیسے بڑے شاعروں کے رنگ کو ایک اصطلاح میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کبھی کبھی دریا کوزے میں نہیں سماتا۔ میرے نزدیک میر کے یہاں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور ایک حساس اور خوددار شخص کا خاموش گریہ ملتا ہے۔ میر کے رنگ کو ہم اگر چاہیں تو شبنمی رنگ کہہ سکتے ہیں۔ میر کے یہاں وہ مسائل یا سوالات ڈھونڈنا بیکار ہے جو غالب کے یہاں ملتے ہیں۔ غالب کے دور پر آنے والے زمانے کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں۔ میر کا چمن خزاں دیدہ تھا۔ نئے نظام کی آمد نے غالب کے دور کے سامنے جو مخصوص الجھنیں پیدا کی تھیں میر کے زمانے میں ان کا احساس نہیں ہوا تھا۔ زندگی کے متعلق جو سوالات غالب کے ذہن میں آئے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے یہاں جو فکر و فلسفہ ملتا ہے وہ میر کے یہاں تلاش کرنا بیکار ہے۔ میر کے سامنے تو ایک لٹتی ہوئی جنت ایک اٹھتی ہوئی بساط اور ایک جاتے ہوئے کارواں کا ماتم ہے اور اس ماتم کے پیچھے انسانیت کی چند ایسی قدریں ہیں جو نہ صرف اس دور کو بصیرت عطا کر سکتی تھیں بلکہ آج بھی ہمارے ذہن کا اجالا ہو سکتی ہیں۔

ہماری مشرقی تنقید ہمارے تہذیبی تصور کا عطیہ ہے جس میں جاگیردارانہ دور کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ اس کا تہذیبی تصور شہروں اور ان کی ایک مخصوص ہما ہمی تک محدود تھا۔ اس کے فن کا تصور زبان کے ایک ادھورے شعور کا غماز ہے۔ تنقیدی شعور تو تخلیقی شعور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مگر تنقیدی کارنامے ہر دور میں تخلیقی کارناموں کے پیچھے چلے ہیں۔ چنانچہ ہمارے تذکرے اور تنقید زبان اور فن کے خواص پسند تصور سے عرصہ تک آزاد نہ ہو سکے۔ میر کم اور نظیر زیادہ اس تصور کا شکار ہوئے۔ مگر میر اور نظیر میں جو تعلق ہے اسے بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ میر کی غزلوں میں ہماری مشترک تہذیب و تمدن کا وہی جلوۂ صد رنگ ملتا ہے جو نظیر کی نظموں میں پہنچ کر ایک مخصوص آہنگ اور لے اختیار کر لیتا ہے اور نظم

کے فارم کی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ آزاد نے غلط نہیں کہا تھا کہ نظیر کے کچھ اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں۔

نظم غزل کے مقابلہ میں راست گفتاری سے زیادہ کام لیتی ہے۔ اگر ہم ٹلیرڈ (Tillyard) کی اصطلاحوں کو تسلیم کرلیں تو ہم کو نظم میں بلاواسطہ شاعری اور غزل میں بالواسطہ[1] شاعری ملتی ہے۔ غزل کا ابہام اس کے رمز و ایما، اس کی ماورائے سخن باتیں اور نہ کہنے کے انداز میں بہت کچھ کہہ دینا ہر حقیقت پر نقاب ڈال دینا اور ہر نقاب میں حقیقت کی کرن رکھنا، نقاد کی مشکلات میں اضافہ کردیتا ہے۔ غزل گو شاعر کے یہاں فلسفہ ڈھونڈنا بیکار ہے۔ اس کے یہاں فلسفیانہ میلان مل سکتے ہیں۔ وہ تنظیم اور تعمیر کے پھیر میں نہیں پڑتا۔ اس کی ہر تصویر اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے لیکن تصویر میں ایک نگارخانے کی شان پیدا کرنا اور اشاروں میں داستان کی بلاغت سمودینا اسے آتا ہے۔ چونکہ غزل بڑے ریاض کا ثمرہ ہے اس لیے اس پر تنقید بھی خاصا ریاض چاہتی ہے۔ یہاں حکم لگانے سے پہلے ذہنی ہمدردی درکار ہے۔ فیصلہ سے پہلے ترجمانی کی ضرورت ہے۔ تنقید میں غزل کی روایات کے حسن و قبح کا سوال اتنا اہم نہیں۔ ان روایات سے واقفیت زیادہ ضروری ہے۔ اسی ناواقفیت نے ہمیں اپنی کلاسیکل شاعری سے پوری طرح مستفید نہ ہونے دیا۔ اگر ہم اس کا کچھ عرفان رکھتے ہوتے تو شاید اس طرح اسے ماننے سے انکار نہ کیا کرتے۔ ہماری فکر میں ہم آہنگی اور ہمارے فن میں ہمواری کی جو کمی ہے اس کا یہی راز ہے۔ شاعری کو ترنم، معنی اور کنایہ کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ اچھی شاعری میں یہ تینوں اجزا اس طرح وصل ہوجاتے ہیں کہ کوئی چیز نہ علاحدہ سے ذہن میں کھٹکتی ہے نہ کانوں کو ناگوار گزرتی ہے نہ کوئی متضاد ذہنی رو پیدا کرتی ہے۔ متضاد ذہنی رو کی ایک مثال ذم کا پہلو ہے۔ شاعرانہ ترنم اور خالص ترنم میں فرق یہ ہے کہ یہاں ترنم کے ساتھ معنی کا رابطہ بھی ہے۔ اگر معنی میں ترنم نہیں تو اشعار ذہن میں ہلچل پیدا نہیں کرتے نہ جذبات کو متاثر کرسکتے ہیں۔ میر نے قیامت کے ہنگامے، شورانگیزی یا جادو کی پڑی پر جو فخر کیا ہے وہ اسی مترنم معنی آفرینی کی وجہ سے ہے۔ میر کے دور میں شاعر موسیقی سے یکسر نابلد نہیں ہوتے تھے۔ وہ فنونِ لطیفہ کے مشترک جوہر کا ضرور احساس رکھتے تھے۔ ان کی طویل اور چھوٹی بحریں[2] دونوں بڑی مترنم ہیں۔ میر کو الفاظ کے ترنم کا بھی پورا پورا احساس ہے یہاں تک کہ وہ اس کی خاطر قواعد تک کی پروا نہیں کرتے۔ میر کے معنی آفریں ترنم میں جو تحت الشعوری زیر و بم جو تصویروں میں لپٹی ہوئی تصویریں ہیں اور جو نگارخانہ آباد ہے وہ ایک تفصیلی اور سائنٹفک جائزہ چاہتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں جدید نفسیات سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہاں بہت مفید ہوسکتی ہیں۔

علم نفسیات شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں دے سکتا لیکن شاعر کی شخصیت، اس کے تخیل، اس کے لاشعور، اس کی محرومیوں اور سرشاریوں، اس کے جذباتی مراکز اور ذہنی الجھنوں کو سمجھنے میں ضرور مدد دے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میر کی شخصیت اور شاعری کے مطالعہ سے بہت دلچسپ نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

میر کے کسی شعر پر نظر ڈالیے تو یہ بات آئینہ ہوجاتی ہے کہ الفاظ معلوماتی اظہار نہیں بلکہ تاثراتی اظہار ہیں۔ بشریات کے ماہروں نے الفاظ کو جذباتی علامات کہا ہے۔ مالینوس (Malinowsky) اس بنیاد پر شعر کو ''آوازوں میں

---

(۱) Oblique (۲) خصوصاً وہ بحریں جہاں حروف علت کی آوازوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

چلن"[1] کہتا ہے۔ جب الفاظ نظروں یا کانوں سے گذرتے ہیں تو ان کے معلوماتی پہلو سے زیادہ تیز اور صریح ان کا جذباتی پہلو اور اس کے روابط ہوتے ہیں۔ یہ جذبات آفرینی ہی شاعر کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتی ہے۔ بڑی شاعری جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اور ان کا تنقیہ بھی کرتی جاتی ہے۔ اس لیے میں میر کو تنقیہ [2] کا بادشاہ سمجھتا ہوں۔ اس اصطلاح کو تنگ نظری کی وجہ سے المیہ سے مخصوص کیا گیا ہے۔ حالانکہ خود ارسطو کی نظر المیہ کے ادبی پہلو پر زیادہ ہے اس کے فنی پہلو پر کم ہے۔ میر کے یہاں یہ تنقیہ اتنا عام ہے کہ ان کی مایوسی اور ناکامی، یاس وحرماں اور رنج وغم بھی ان کو قنوطی نہیں بنا پاتے۔ ان کے ان تین اشعار پر غور کیجیے۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا میر کا طور یاد ہے ہم کو
مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا کھا گیا نشتر سرتیز جگر دل دونوں

ان اشعار میں زیست کرنا، محبت میں سلیقہ سے نباہ اور رات کی سینہ خراشی میں ہنر قابل غور ہیں۔ میر کا سب سے محبوب موضوع عشق ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں جسم کی مستی بھی ہے اور روح کی آنچ بھی۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ تو صرف جسم کے پیچ وخم میں اسیر ہوکر رہ جاتے ہیں اور نہ محض حسن سے ایک روحانی رشتہ کافی سمجھتے ہیں۔ اگر میر کے یہاں صرف شباب کے ہیجان کی داستان ہوتی تو اس کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ میر کے یہاں یہ ایک وضع جنوں بن گئی ہے اور اس وضع جنوں میں عاشقی ہی نہیں زندگی کی کچھ بڑی قدریں بھی شامل ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی عشقیہ شاعری محض عشقیہ نہیں ہوتی کچھ اور بھی ہوتی ہے۔ "دل پرخوں کی اک گلابی" سے جو شخص عمر بھر شرابی رہے اس کی مستی زندگی میں بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ یہ ایک تہذیبی قدر بن جاتی ہے۔

ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں شاعری کی تین آوازیں بتائی ہیں۔ ایک اپنی آواز، دوسری خطابی آواز اور تیسری کسی کردار، موقع یا واقعہ کی ترجمانی۔ ہمارے یہاں آپ بیتی اور جگ بیتی کے دو رنگ تسلیم کیے گئے ہیں۔ یہ تقسیم سمجھانے کے لیے ہے اور اس کا ریاضیاتی تصور غلط ہوگا۔ میر کے یہاں شاعری کی پہلی آواز ہے مگر اس پہلی آواز میں دوسری آواز کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ میر کی داخلیت تمام تر داخلی نہیں ہے۔ گرد و پیش کی کرنیں میر کے ذہنی آئینے میں آکر کچھ نئے خطوط اور رنگوں کی حامل ہو جاتی ہیں۔ رنگوں کے اس دلآویز کرشمہ کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کی کرنوں کا احساس بھی ضروری ہے۔

فکر کے معنی چونکہ ہم نے کسی نہ کسی فلسفہ طرازی کے سمجھ لیے ہیں اور کسی شاعر کے کلام میں ذہنی گہرائی ڈھونڈنا ایک محبوب مشغلہ ہوگیا ہے۔ اس لیے بعض اوقات میر کے یہاں جو افکار ایک لطیف سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ آئے ہیں ان کی اہمیت کو ہم نظرانداز کر دیتے ہیں۔ میر یا غالب یا اقبال ان معنوں میں مفکر نہیں ہیں جن معنوں میں افلاطون، کانٹ اور ہیگل وغیرہ ہیں اور نہ ان کی فکر کی گہرائی ہمارے لیے بذات خود اہمیت رکھتی ہے جب تک کہ یہ افکار شاعرانہ اظہار کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں۔ میر کے یہاں چونکہ افکار کے ساتھ شاعرانہ اظہار بھی ملتا ہے اس لیے اظہار کا حسن بعض

(1) Vocal Custom (2) Catharsis

اوقات فکر کی لطیف تابانی کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ غالب اور اقبال نے افکار کو اظہار بنانے میں جو پاپڑ بیلے وہ میر کو نہیں بیلنے پڑے۔ غالب اور اقبال کو پتھر نچوڑنے پڑے۔ میر کے جذبہ کی آنچ سے پتھر خود پگھل گئے۔ اس لیے حسن بیان کے لحاظ سے میر اب بھی سب سے اچھے ماڈل ہیں۔ اچھا معمار وہ ہے جو اپنے مسالہ کو ماہرانہ طور پر استعمال کرے۔ مسالہ کی فراوانی لازمی طور پر تعمیر کی خوبی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ رنگوں کی کثرت کی بجائے رنگوں کا چابک دستی سے استعمال زیادہ قابل قدر ہے۔

جس طرح فکر کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے ہم میر کے میلان فکری پر پوری توجہ نہیں کر سکے اسی طرح فن کے محدود تصور نے میر کے فن کی عظمت بھی واضح نہ ہونے دی۔ میر کے یہاں ہندی بول چال کی بنیاد پر فارسی تراکیب کا خوشنما محل ہے۔ مگر پوری تعمیر میں اجزا کی موزونیت اور ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

میر نے دراصل انشا کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ لفظ خواہ کسی زبان کا ہو جس طرح ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی کی اضافت کو جائز رکھا۔ انھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کا محاورہ برتا، جہاں تیغ و سناں اور طاؤس ورباب گلے ملتے تھے اور قواعد سے زیادہ چلن کی حکومت تھی۔ ناسخ نے میر کے آداب فن کو نظر انداز کر کے اردو زبان و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے دیہات اور قصبات سے شہروں تک پھیلے ہوئے لسانی مواد سے کام لینے کے بجائے شاعری کو ایک مخصوص مصنوعی اور بے مصرف شہریت کا آئینہ دار بنا دیا جس کے پاس نہ چلن کی فضا تھی نہ محنت کا آب و رنگ اور نہ کسی گہرے عقیدے کی گرمی۔ فن کے اچھے تصور میں صرف زبان کی قدرت ہی نہیں اس کا مناسب و موزوں استعمال بھی شامل ہے۔ میر کے فنی شعور کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے غزل اور مثنوی دونوں کے آداب کا لحاظ رکھا۔ ان کی غزل کہیں قصیدہ نہیں ہو پاتی اور مثنویاں مختلف موضوعات کا بے جوڑ سلسلہ نہیں معلوم ہوتیں۔ میر کے زمانہ میں اردو زبان وسیع بھی ہو گئی تھی اور مالا مال بھی۔ زبان کو وسعت دینے کا خیال عام تھا۔ حفاظت کا تصور اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ وسعت کا یہ تصور صوفیوں، درویشوں اور عوام کا لایا ہوا اور تہذیبی قدروں کے بڑھنے اور پھیلنے کا ثبوت ہے۔ حفاظت دربار اور امرا کے خواص پسند تصور سے وابستہ ہے۔ میر کے سامنے اگرچہ زیادہ تر فارسی ادب کی روایات تھیں۔ مگر ان کا رشتہ اپنی سرزمین اور اپنی عام زندگی سے بھی تھا۔ اس عام زبان میں ادبی عظمت میر کے اثر سے آئی ہے۔ یوں تو ادبی کارنامے میر سے بہت پہلے ملنے لگتے ہیں اور جنوبی ہند میں ولی تو ایک سلسلہ کے خاتم اور دوسرے کے بانی ہیں۔ مگر شمالی ہند میں عام زبان کے ادبی حسن کو سب سے زیادہ میر نے آشکارا کیا اور ان کے بعد نظیر نے۔ میر ٹھیٹھ بول چال کے الفاظ جس بے تکلفی اور روانی سے استعمال کرتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ پھر وہ ہندی اور فارسی کے الفاظ کو اس خوبی سے لاتے ہیں کہ وہ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے۔ فارسی تراکیب کے استعمال کے باوجود میر کبھی ثقیل نہیں ہوتے۔ ان کے لہجہ کی خوش آہنگی اور شیرینی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ ان کے یہاں اضافتوں کے پہاڑ بھی روئی کے گالے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میر کی سادگی کا موازنہ میر سوز سے کیا جائے تو میر کی چابکدستی اور صناعی کا پتہ چلتا ہے۔ میر سوز اپنی سادگی میں سپاٹ ہو جاتے ہیں۔ میر کی سادگی میں پرکاری ہے۔ میر سوز کے یہاں سرد راکھ ہے، میر کے یہاں وہ لاوا جو تن تک کو جلا دیتا ہے۔

ہر شاعر کی طرح میر کے یہاں بھی بعض الفاظ اصطلاحات اور ترکیبیں بار بار آتی ہیں۔ دوانہ، لہو، جنوں، دل پرخوں، آزار

جیسے الفاظ کی تکرار بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ امپسن کا یہ خیال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ کلیدی الفاظ (Key Words) بھی ہوتے ہیں، جن سے ہر شاعر کی روح کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ کلیدی الفاظ کچھ تو روایتی بھی ہونے ہیں یا اپنے دور کی آئینہ داری کرتے ہیں مگر کچھ اس شاعر کی انفرادیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ میر اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے کچھ اپنے بھی کلیدی الفاظ ہیں جو بعد کی روایت بن گئے ہیں۔

اول و دوسرے درجہ کے شاعروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اول درجہ کا شاعر کچھ اپنے کلیدی الفاظ رکھتا ہے۔ ان کی وجہ سے اس کی شاعری میں ایک جدت، تازگی اور طرفگی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے درجہ کے شاعر روایتی کلیدی الفاظ کو کامیابی سے برت لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اوپر کہا گیا ہے کہ میر کے یہاں فارسی تراکیب کے استعمال میں بڑا سلیقہ ملتا ہے۔ وہ صرف فارسی تراکیب پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ فارسی کے محاوروں اور فقروں کا نہایت آزادی اور بے تکلفی سے اردو میں ترجمہ بھی کر لیتے ہیں۔ ان ترجموں میں فارسی مفہوم سے زیادہ وسعت پیدا کر کے وہ ہماری زبان کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ وہ عجمی لے کی خاطر ہندی لے کو نہیں چھوڑتے اور نہ بعض شعرا کی طرح فارسی تراکیب سے خواہ مخواہ پرہیز کرتے ہیں۔ وہ اس گر سے واقف ہیں کہ دوسری زبانوں سے نہ صرف تلمیحات اور رمز و ایما کے سانچے لیے جا سکتے ہیں بلکہ الفاظ اور فقروں کو بھی سلیقہ سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے زبان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ میر کی زبان اپنی حزنیہ لے کے باوجود بڑی جان دار زبان ہے۔ اس میں اپنے پورے سرمایہ سے کام لیا گیا ہے۔

شاعروں کے لیے وہ بہت اچھے رہنما ہیں۔ الفاظ پر قدرت رکھتے ہوئے بھی وہ الفاظ کی بازیگری یا شعبدہ بازی کے قائل نہیں۔ وہ ایک اسٹائل یا اسلوب کے مالک ہیں مگر اسٹائل کے شہید نہیں ہیں۔ انھوں نے تغزل کے لب و لہجہ کو اس طرح متعین کر دیا ہے کہ اس سے انحراف آسان نہیں ہے۔ وہ ہر لفظ کے صحیح استعمال اس کی آواز اس کی گونج اور تھرتھراہٹ، اس کے ذہنی اثرات اور ضمنی ارتعاشات کو مانتے ہیں۔ پھر وہ الفاظ کی چمک دمک کو قابو میں رکھنے اور جذبات کی تھرتھراہٹ کو نمایاں کرنے کے راز سے واقف ہیں۔ ان کے الفاظ میں گرج اور کڑک کہیں نہیں ملتی۔ دلکشی، دل آسائی اور دلآویزی جابجا نظر آئے گی۔ وہ نرم اور کرخت آوازوں کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ ان کا جادو اپنا کام کر جاتا ہے مگر اس جادو کے پیچھے جو صناعی ہے وہ جلد نظر نہیں آتی۔ یہی فن کا اعجاز ہے۔ اپنے جذبات کی تہذیب کرنے کے بعد ہی انھوں نے جرأت کو ان کی ''چوماچاٹی'' پر متنبہ کیا تھا۔ حالانکہ چوماچاٹی کے اشعار ان کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔

اردو شاعری پر میر کے جو احسانات ہیں ان کا احساس عام ہے۔ مگر ان کا عرفان کم ملتا ہے۔ میر کے دور میں جو اخلاقی سماجی اور تہذیبی قدریں مسلم تھیں وہ بہرحال ہندستان کے جاگیردارانہ دور کا عطیہ تھیں۔ میر کی شاعری کی خصوصیات کو ہم اٹھارہویں صدی کے ہندستان کی تاریخ اور اس کے پس منظر کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں اس مشترک تہذیب کا جادو اور جمال ہے جو مغلوں کے دور کا عطیہ ہے۔ اس میں وہ تصوف ہے جو ایران اور وسط ایشیا کے تمدنی اثرات کے بیج ہندستان میں بو کر ایک پوری فصل تیار کر چکا تھا۔ اس تصوف کے پیچھے ایک فلسفۂ زندگی تھا جسے سہولت کے لیے ہم عینیت یا Idealism کہہ سکتے ہیں۔ میر بہرحال اپنے دور کی پیداوار ہیں لیکن ان کی شاعری کی اپیل آفاقی ہے۔ وہ اپنے اظہار میں اپنے دور سے بلند بھی ہو جاتے ہیں اور ذہنِ انسانی کے ایسے سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں جو ہر دور کے لیے

کشش رکھتے ہیں۔ کارگہ شیشہ گری کا کام صرف میر کے زمانہ میں ہی نازک نہیں تھا۔ آج بھی نازک ہے اور اگرچہ آج سانس آہستہ لینے کا زمانہ نہیں ہے پھر بھی اس شعر کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے ہم سانس روک لیتے ہیں اور ہمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ موجودہ دور کے سارے کمالات کے باوجود جسم و جان کا رشتہ ایک ڈورے سے زیادہ نازک ہے اور زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔

میر کے یہاں زندگی کے جبر و قہر اور انسان کی معذوری و مجبوری کا جو تذکرہ ہے اس کی وجہ سے بعض لوگ میر کو قنوطی کہنے لگتے ہیں۔ میر نے زندگی کے جبر و قہر کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان کی عظمت کا ترانہ گایا ہے۔ یہ صاحب نظر جو مقدور سے زیادہ مقدور رکھتا ہے، جس کے لیے برسوں مہر و مہ کی آنکھیں لگی رہی ہیں، جو خاک کے پردے سے اس وقت نکلتا ہے جب فلک برسوں گردش کر لیتا ہے، جو گرم سخن ہوتا ہے تو اس کے گرد ایک خلق ہے اور جس کی خاموشی میں بھی ایک عالم نکلتا ہے، وہی میر کا ہیرو ہے۔ میر اس سستی رومانیت سے بلند ہیں جو اپنے خواب و خیال کی مستی کی وجہ سے سنگین حقائق کا احساس نہیں رکھتی۔ انھیں زندگی کی سنگین اور دلدوز حقیقتوں کا پورا پورا احساس ہے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک گمبھیر اور عظیم شے ہے اور انسان زندگی کے صحرا میں اس قطرۂ شبنم کی طرح ہے جو خار بیاباں پر رکا ہوا ہے۔ میر کی شاعری میں قطرۂ شبنم اور خار بیابان دونوں کا احساس ملتا ہے۔

مشرقی فلسفے میں جو ترک دنیا اور فنا کی تعلیم ملتی ہے وہ اس قنوطیت سے مختلف ہے جس کا اظہار شوپنہار، ہابس، ہارڈی یا وجودیت (Existentialism) کے بعض علم برداروں میں ملتا ہے۔ مشرقی فلسفے میں روحانیت اور مغربی فلسفے میں مادیت کی جلوہ گری ہے۔ روحانیت کے خیال کے مطابق مادے کی کثافتوں کو دور کر کے روح کے جلوے کو جلا دینا عین مقصد زندگی ہے مگر اس کی وجہ سے کائنات ایک بے مقصد وجود اور زندگی ایک بے سود مظاہرہ نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ پردۂ ظلمات ہے جس سے گزر کر آب حیات ملتا ہے۔ مغرب میں قنوطیت فطرت انسانی کو ایک اندھی مشیت کا کھلونا سمجھتی ہے۔ مشرق میں جبریت اور بے ثباتی دنیا کی تعلیم دنیا کو مقصود بالذات سمجھنے سے روکتی ہے اور اس کی نیرنگیوں سے نگاہوں کو خیرہ نہیں ہونے دیتی۔ بعض اوقات تصوف نے قنوطیت کو بھی شہ دی ہے مگر تصوف کے وہ افکار جن سے میر نے بھی غذا لی، اپنے اخلاقی نصب العین کی وجہ سے قنوطیت کے اسرار نہیں بن پاتے۔ اردو میں قنوطیت کے سچے پرستار صرف فانی ہیں۔ ہاں قنوطی رنگ کے اشعار میر اور غالب کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ پھر فانی کی قنوطیت بھی اس دور کے بہت سے سستے رجائیوں سے زیادہ وقیع اور تہ دار ہے۔

میر نے شاعری کو جو لب و لہجہ دیا ہے اور صلابت کے بجائے لطافت پر توجہ، آواز میں گونج اور گرج کے بجائے نرمی پر اصرار، جذبات کے تند و تیز بہاؤ کے بجائے ضبط فغاں اور ساز زیر لبی پر جو زور دیا ہے وہ بڑی بھرپور اور مستقل کیفیت رکھنے والی شاعری کا ہے۔ یہ ظاہر ہے انھیں چیزوں کو فن کی، شاعری کی مستقل قدریں نہیں کہا جاسکتا۔ میر کے زمانہ میں سیاسی انتشار، بدامنی اور تاراج نے صراحت کے بجائے کنائے اور وضاحت کے بجائے اشارے میں پناہ لی۔ تہذیبی معیاروں نے آہستہ روی اور نازک خرامی سکھائی۔ شرافت کے آداب نے نرمی اور ملائمت پر اصرار کیا۔ اس طرح فن میں جو لطیف چاندنی اور پراسرار دھندلکے کی کیفیت آئی اسے فن کی ابدی معنویت سمجھنا غلطی ہوگا۔ فکر میں تبدیلی کے ساتھ فن بھی

بدلتا ہے مگر بدلتے ہوئے بھی یہ اپنا ایک تسلسل قائم رکھتا ہے اور نیا فن پرانے فن سے بالکل بے نیاز بھی نہیں ہوتا۔ تجربے میں دراصل روایت نئے نئے روپ اختیار کرتی ہے اور نئی بجلیوں میں کتنے برسے ہوئے بادلوں کی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ اس لیے ادب میں روایات یکسر بیکار نہیں ہوتیں۔ دراصل روایات کا اصل مفہوم ہی یہ ہے کہ چاہے ان کی صحت باطل ہوجائے مگر ان پراعتماد باقی رہے، چاہے ان کا وزن ختم ہوجائے مگر وقار نہ جائے۔ اس لیے میر نے غزل کو جو لب و لہجہ دیا ہے اور تغزل کو جو آداب سکھائے ہیں انھیں کسی زمانے میں ترک نہیں کیا جاسکتا اور کسی نہ کسی وقت میر سے آداب فن سیکھنے کے لیے ہر ایک کو ان کے در پر آنا پڑتا ہے۔ غالب بھی ساری دنیا کی سیر کر کے میر تک پہنچے۔ انیسویں صدی کے آخر کے لکھنؤ میں اگر چہ غالب کے خیال اور میر کی زبان کی ایک میکانکی تقسیم ہوگئی مگر وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد ''دل کی جراحتوں کے جو چمن کھلائے گئے'' ان میں میر کا رنگ فطری طور پر آیا اور جب تک غم جاناں اور غم دوراں کا ''نشتر سرتیز'' موجود ہے ''میر کا ہنر'' بھی زندہ ہے۔ جدید شاعری میں سرگوشی کی جو کیفیت ہے وہ بھی میر کے ساز زیرلبی کی ایک آواز بازگشت ہے۔

اس لیے عاشقی اور زندگی کے تصورات میں انقلابی تبدیلیوں کے باوجود میر کے فکر و فن سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ برنارڈ شا نے ایک جگہ کلاسیکی ادب کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد کلاسیکل شعرا اور ادیبوں کی تصانیف کا رنگ محل افکار پارینہ کا ایک کھنڈر رہ جاتا ہے مگر ان کا طرز تعمیر اور تعمیر کی فضا کبھی برباد نہیں ہوتی۔ ہر دور کی فضا اور طرز تعمیر کا یہ احساس نہ ہو تو نئی تعمیر میں کجی اور ناہمواری آجاتی ہے۔ ہر زمانے کے شاعر اور ادیب وہ تہذیبی اقلیت ہوتے ہیں جو اپنے دور کی تمدنی اکثریت کے پیشوا کہے جاسکتے ہیں۔ ہر آنے والا تمدن پچھلے تہذیبی کارناموں کی بصیرت کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے انیسویں صدی کے تہذیبی معیار بیسویں صدی کے تمدن کے لیے بالکل فرسودہ نہیں ہوئے۔ ہاں بیسویں صدی کی تہذیب کے لیے فرسودہ ہوسکتے ہیں۔ شعر و ادب تصور کو تاثر بناتا ہے۔ اس تاثر میں زندگی کی توانا قدروں کا جتنا احساس ہوتا ہے اتنا ہی بڑا ادب وجود میں آتا ہے۔ میر کی شاعری میں غزل کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ غزل میں انداز نظر، حجاب سخن، اشارے کی بلاغت اور کنائے کی تاثراتی جنت سب کچھ ہے۔ غزل نہ شاعری کی آبرو ہے، نہ پوری شاعری ہے۔ جس طرح شاعری میں رمز و ایما کی اہمیت ہمیشہ رہے گی اور رمز و ایما بدلتے بھی رہیں گے۔ اسی طرح رمزیت اور ایمائیت کی جس صنف میں سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ صنف بھی باقی رہے گی۔ غزل کے ذریعے سے ذہنی قیادت کا وہ کام نہیں لیا جاسکتا جو نظم کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ ہاں اس کے ذریعہ سے دلوں میں وہ خاموش طوفان برپا ہوسکتے ہیں جو بعض اوقات کسی آتش فشاں سے زیادہ ہلچل پیدا کرسکتے ہیں۔ یہ طوفان شاعری کی تمام اصناف میں ہمارے لیے نمونہ اور مثال نہیں بن سکتے، جس طرح میر کی عاشقی زندگی کی آبرو ہوتے ہوئے ساری زندگی نہیں بن سکتی۔ جس طرح زندگی ایک بت ہزار شیوہ ہے اسی طرح شاعری بھی بلبل ہزار داستان ہے۔ بات کہنے کے بہت سے انداز ہوتے ہیں مگر شیوہ کار آگہی ہر انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وحدت اور کثرت کا تصور ادب میں بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

میر کی شاعری میں ہمیں آفاقی عناصر ملتے ہیں۔ آفاقی عناصر مثبت اور منفی دونوں قدروں کے احساس سے بنتے ہیں۔

ان قدروں پر ہر دور میں ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی اہمیت کا احساس کافی ہے۔ میر انسانیت کے لیے ایک نظام اخلاق ضروری سمجھتے ہیں۔ فرد کے جنون کو آزار مانتے ہوئے بھی وہ اس آزار کی عظمت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ میر کے دور میں عشق کے آداب ہی زندگی کو ایک بے معنی چکر سے بلند کرتے تھے۔ یہ عشق فرد کو جذبات کی تہذیب اور سماج کو خیالات کی تہذیب سکھاتا رہا۔ فرد کو نفسانیت تعیش اور زر پرستی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا اور سماج کو تنگ نظری، منافقت اور ظاہر پرستی سے روکتا رہا۔ میر کے یہاں عاشقی قدر اعلیٰ ہے۔ غالب کے یہاں زندگی۔ کیونکہ غالب نے قدیم نظام کے رخنوں کو دیکھ لیا تھا اور ایک صحت مند تشکیک کے ذریعہ سے قدیم نظام اخلاق سے بلند ہوکر زندگی کی عظمت کو واضح کیا تھا۔ اقبال کے یہاں آ کر صرف زندگی ہی نہیں بلکہ باعمل زندگی قدر اعلیٰ بن جاتی ہے مگر غالب و اقبال کو بھی میر ہی کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ادب اپنے دور کی پیداوار ضرور ہوتا ہے مگر کوئی بڑا ادیب سماج کے دھارے پر تنکے کی طرح نہیں بہتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس دھارے کی سمت اور رفتار پر اثر ڈالتا ہے۔ اس کے لیے اپنے ماحول کا فرد ہوتے ہوئے اسے ماحول کو ذرا دور سے یا بلندی سے یا پیچھے ہٹ کر دیکھنا بھی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی نیا ماحول پیدا کرنے کے لیے ہو یا کسی جاتی ہوئی قدر کو باقی رکھنے کے لیے۔ میر، سودا، درد اور سوز کے مطالعہ سے ان سب کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ سودا اپنے دور کے نالہ ونغمہ دونوں کے آئینہ دار ہیں۔ مگر ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد ہمارے دل میں وہ ٹیس نہیں اٹھتی جس کے درد میں کیفیت ہوتی ہے اور جس کی کیفیت زندگی کے لیے ایک مسلسل مستی کا باعث ہوتی ہے۔ درد کا کلام میر سے پہلو مارتا ہے مگر درد کا ذہنی اور تجرباتی سرمایہ محدود اور ان کا لب و لہجہ میر کے مقابلہ میں اس لیے کم پرسوز ہے کہ انھوں نے انسانی فطرت کو اس کے ہر رنگ میں نہیں دیکھا۔ درد ہمارے محترم ہیں مگر محبوب نہیں ہوسکتے۔ سوز کو جذبات کی تہذیب کا گر نہیں آیا۔ درد، سودا اور سوز تینوں اپنے دور سے بہت بلند یا دور نہیں ہو پاتے۔ میر گرد و پیش کی دنیا میں اپنے خونِ جگر کا ایک باغ لگا کر اس میں محو ہوجاتے ہیں۔ آب حیات کے لطیفے سے یہ نتیجہ نکلنا صحیح نہ ہوگا کہ میر کو مطالعۂ حیات کی حاجت نہ تھی۔ میر کو فوٹوگرافی کی ضرورت نہ تھی۔ انھیں تجربوں کو تخئیلی لباس دینا تھا۔ انھیں تخئیلی پیکروں میں قدروں کا احساس پیدا کرنا تھا۔ ان کی نگاہ میں کون و مکاں کے جلوے تھے مگر وہ خود خلوت پسند تھے۔ یہ خلوت پسندی بھی فنکار کے لیے ضروری ہے بلکہ فنکار انجمن میں رہتے ہوئے بھی خلوت میں رہتا ہے لیکن اس کے معنی مردم بیزاری کے نہیں لینا چاہیے۔ اس خلوت پسندی کی وجہ سے میر کی زندگی میں بہت سی محرومیاں آئیں مگر ہر دور میں زندگی کی یہ محرومیاں شاعری کی کامرانیاں ثابت ہوئی ہیں۔ خوابوں کے نگار خانوں سے حقائق کی توسیع کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ میر کا کمال یہ ہے کہ ان کے خواب معنی خیز حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اشارے اس نرمی اور دل آسائی کے لہجہ میں کیے گئے ہیں کہ ان کی اپیل آج بھی باقی ہے۔ اردو شاعری اور اس کے اسالیب سے جذباتی وابستگی آج کافی نہیں ہے کیونکہ جذباتیت کے پاؤں نہیں ہوتے اور وہ سختی اور سستی کی تاب مشکل سے لاسکتی ہے۔ ہمارے لیے قدروں کے اس رنگ محل کا علم ضروری ہے جو صدیوں کے فکر وفن اور تہذیبی جدوجہد کا مرہونِ منت ہے۔ میر اس لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے زیادہ ہمیں بصیرت عطا کرسکتے ہیں کہ ان کے یہاں نہ فن پر بہت سے پردے ہیں اور نہ فکر میں زیادہ پیچ وخم۔ اس قدر خلوت پسند اور لیے دیے رہنے کے باوجود وہ زندگی اور اس کے عام مظاہرے سے ایک ایسا رشتہ رکھتے ہیں کہ ان کے مرد معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

حرف و حکایت شکر و شکایت ہے اک وضع و وطیرہ پر
میر کو جاکر ہم نے دیکھا ہے مردِ معقول کوئی

پھر میر کا فن بھی اپنے اعجاز کے باوجود ترسیل اور ابلاغ کے لحاظ سے عام فہم ہے اور سہل ممتنع کی پرانی اصطلاح کا سب سے اچھا نمونہ۔ میر کے یہاں ابلاغ کا یہ احساس نہایت واضح ہے۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

بڑی شاعری کے متعلق ایلیٹ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ادب کیا ہے، اس کا فیصلہ تو صرف ادبی معیاروں سے ہی کیا جاسکتا ہے مگر ادب میں بڑائی کے تعین کے لیے صرف ادبی معیار کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ معیار کون سے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار وہ ہوں گے جو زندگی میں بڑائی کا باعث ہوتے ہیں۔ بڑائی صرف گہرائی یا بلندی کا نام نہیں ہے اور زندگی میں بلندی صرف خیال کی بلندی یا خلوص کی گہرائی سے نہیں ناپی جاتی، اس کے لیے میرے نزدیک وہ معیار ضروری ہیں جو انسانیت کے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب انسانیت صرف وظیفۂ لب بن جائے تو آدمیت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ انسان آدمی سے بڑا ہے، آدمیت بھی ایک معیار ہے مگر بڑا معیار نہیں۔ انسانیت کے اندر ایک اخلاقی تصور ہے۔ انسان کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کا پجاری نہیں ہے بلکہ اسے دوسروں کے دکھ درد کا بھی احساس ہے، وہ جنت میں بیٹھے ہوئے سموم نجد کی لپٹ محسوس کرسکتا ہے۔ وہ اپنی خاطر نہیں، دوسروں کی خاطر جی سکتا ہے، اس کے نزدیک زندگی سود و زیاں سے بلند ہے اور کبھی جاں ہے اور کبھی تسلیم جاں، یہ انسانیت ملکوتیت نہیں ہے، یہ آدمی کا نقطۂ عروج ہے، یہ خدا کی ساری مخلوق سے محبت کرتی ہے اور اس کے نزدیک جو لوگ مذہب، مقام، رنگ و نسل کی بنا پر بعض لوگوں سے امتیازی سلوک کرتے ہیں یا بعض کے ساتھ زیادتی روا رکھتے ہیں وہ انسانیت کے مقام بلند تک نہیں پہنچ پاتے، اس انسانیت کے لیے میر نے اپنے زمانے کی مروجہ اصطلاح عشق سے کام لیا ہے جو آدمی کو خودغرضی اور ذاتی مفاد کے دائرے سے نکال کر ایک بڑے مقصد، مشن یا مسلک سے آشنا کر دیتا ہے اور جس کی گرمی سے بے مقصد زندگی میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے جو آخر زندگی کے لیے ایک روشنی بن جاتی ہے، اس عشق پر میر نے جابجا زور دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد — کھاؤ کسی کی تیغ کسی کے شکار ہو
شراب عشق میسر ہوئی جسے یک شب — پھر اس کو روز قیامت تلک خمار رہا
دور بیٹھا غبار میرؔ ان سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ — مذہب عشق اختیار کیا

اسی عشق کی وجہ سے آدمی کو فوقیت حاصل ہے۔

آدم خاکی سے آدم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا
ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا
سر کسی سے فرو نہیں ہوتا — حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ماہیت دوعالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون دل یہ طوفان ہے ہمارا

میر کی یہ انسان دوستی کسی خاص مذہبی یا سیاسی مسلک کی پابند نہیں ہے، یہ ایک وضع ایک اسلوب ہے، ایک مزاج ایک طرزِ فکر ہے، یہ نہ خوابوں میں پناہ لیتی ہے نہ حقائق کی سنگینی سے چور چور ہوتی ہے، یہ حقائق کو بھگتنے، برتنے اور ان میں کچھ بڑی قدروں کی کرن پیدا کرنے کا نام ہے، یہ شخصیت کو گرمی دیتی ہے اور اس کے ساتھ دل آویزی بھی، یہ ایک مستی عطا کرتی ہے جس کا نشہ کبھی زائل نہیں ہوتا، اسے کسی مخصوص مذہبی یا اخلاقی یا سیاسی طرزِ فکر کا نام دینا بھی درست نہ ہوگا کیونکہ اس طرح اس کی آفاقی اپیل محدود ہوجائے گی۔ بقول اصغر۔

جو کچھ کہا تو ترا حسن ہوگیا محدود

بڑائی کا ایک پہلو اور بھی ہے، یہ زندگی کی بصیرت ہے، زندگی بڑی پیچیدہ ہے، تہذیب کے آغاز سے اسے نظریوں اور فارمولوں کے ذریعے سے ناپنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مادیت، روحانیت، عینیت، تاریخی مادیت، اثباتیت، وجودیت وغیرہ اسی کوشش کا ثبوت ہیں لیکن نفسیات کی جدید معلومات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان کی عقلیت جو بڑی قابل قدر ہے اس کی جبلتوں پر ابھی مکمل فتح نہیں پاسکی ہے، اس کے جذبات اب بھی تہذیب کے بنائے ہوئے قوانین سے متصادم ہوتے رہتے ہیں، اس کا دل اب بھی اس کے دماغ کی حکومت سے باغی ہوجاتا ہے، وہ اب بھی نامعلوم اتھاہ اور بے پناہ پراسرار اور گمبھیر طوفانی طاقتوں میں گھرا ہوا ہے اور اس لیے جہاں اس کی فتح قابل قدر ہے وہاں اس کی شکست بھی ناقابلِ اعتبار نہیں بلکہ اس معرکہ میں فتح وشکست کے معنی بدل جاتے ہیں اور صرف جدوجہد یا کشمکش کی اہمیت رہتی ہے، فطرت انسانی کی اس بوقلمونی کا احساس میر کے کلام میں بھی گہرا ہے۔ اسی لیے میر کے کلام سے ہمیں زندگی کی خاصی بھرپور بصیرت ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بصیرت آج کی زبان میں نہیں ہے، میر کی زبان اور اصطلاحات میں ہے مگر ان میں اتنی تہ داری اور آبداری ہے کہ میر کی بات کو ہم نہ صرف سمجھ لیتے ہیں بلکہ اس کے جادو کو محسوس بھی کرلیتے ہیں، یہ اشعار دیکھیے۔

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے   خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت   انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو   دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

وجہ بیگانگی نہیں معلوم   تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

ہر یک سے ڈھب جدا ہے سارے زمانہ کا بھی   بنتی ہے جس کسو کی یک طور پر بنے ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن   سینے میں کوئی جیسے دل کو ملا کرے ہے

کنارا یوں کیا جاتا نہیں پھر   اگر پاے محبت درمیاں ہو

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث   برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالہ

میر نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے   خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر   مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

بڑی شاعری اس خونابہ کشی کی داستان ہے، اس مرمر کے عمر تمام کرنے کے نام ہے۔ ہاں اس خونابہ کشی، اس مرمر کے عمر تمام کرنے کے بہت سے نام ہیں، زندگی کے اس بستار کو عشق کے دو انچھر میں سمولینا قطرہ میں دجلہ دیکھنا اور دکھانا، میر کا کمال ہے۔ ان کی عظمت کا راز اسی کمال میں ہے، اس سے ان کا مطالعہ سدا بہار ہے بلکہ جب جب زندگی کسی نازک موڑ پر آئے گی تو مرمر کے زندگی کرنا ایک نئی معنویت حاصل کرے گا اور میر کی عظمت کو نئے سرے سے دریافت کیا جائے گا۔

●●●

فراق گورکھپوری

میر کی عالمگیر مقبولیت

میر کی جادو نگاری اور کلام میر کی سحرکاری میں جو بات سب سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے، جو حقیقت سب سے زیادہ نظر آتی ہے اور جس میں اس کی عالمگیر مقبولیت کا راز پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے داخل ترین محسوسات کی اتنی فطری مصوری اور وہ بھی کم سے کم الفاظ میں، سادہ سے سادہ الفاظ میں، معمولی سے معمولی الفاظ میں اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا۔ ان کے ایسے اشعار ہمارے دلوں کی آخری تہوں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں، ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔ فروعات، ضمنیات اور تمام مصنوعات سے معرا اور آزاد ہو کر یہی بات میر کی آواز کو زندگی بنا دیتی ہے۔ ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ فن شاعری حقیقی شاعری کی راہ میں حائل تھا۔ الفاظ و بیانات زندگی کی آواز چھپا اور دبا دیتے تھے یا بدل دیتے تھے یا انھیں ناقص و نامکمل اور خارجی طور پر پیش کرتے ہیں۔ میر کی شاعری فن کو صلیب پر چڑھا کر اسے پھر سے زندہ کر دیتی ہے۔ الفاظ کو گھٹا کر ان کے اثرات کو لامتناہی بنا دیتی ہے اور شاعری کو شاعر کی آواز نہیں بلکہ زندگی کی آواز بنا دیتی ہے۔ کلام میر میں ہم اپنے کو چھوتے ہوئے، ہم اپنے آپ سے قریب تر ہوتے ہوئے، ہم اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک اس شاعری کا اہم ترین پیام ٹھہراؤ ہے۔ ہر شعر پڑھ کر رک رک کر سوچنے لگیے اور اس حقیقت پر غور کیجیے کہ کیا اردو کے بڑے سے بڑے شاعر اس خلوص، اس صداقت، اس معصومی، اس انسانی لہجہ اور اس تہ رسی کے ساتھ کوئی شعر کہہ سکتے ہیں۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
بڑے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
دل پرخوں کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے
نامرادانہ زیست کرتا تھا — میر کا طور یاد ہے ہم کو
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو ٹپکا ہے — ہم نے جانا تھا کہ اے میر یہ آزار گیا
کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
ہم فقیروں سے کج ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

غزل کی شاعری ان اشعار سے یہی نہیں کہ اونچی ہوگئی بلکہ ان سے اونچی جا نہیں سکتی۔ رو لینے کے بعد زندگی جو

سنبھالا لیتی ہے اور جونئی توانائیاں حاصل کر لیتی ہے وہی اثر میر کے پُردرد اشعار سے پیدا ہوتا ہے۔

میر کے اشعار کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان کی تمام شاعری میں اس زمانے کے سماج کی تنقید بہت کم ملتی ہے۔ افراتفری اور انتشار سے مجبور ہو کر میر کے زمانہ میں کوئی بھی دوسرا بڑا حقیقی شاعر ہوتا تو اسے میر کی طرح اپنی شخصیت کے اندر جا کر ہی پناہ لینی پڑتی اور میر نے بھی یہی کیا۔ میر نے سماجی زندگی کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ لگا سکتے تھے، لیکن اس شخصیت کے اندر کی دنیا کتنی بڑی ہے کتنی عظیم ہے اور کتنی دائمی قدروں کی حامل ہے اور کتنی عالمگیر انفرادیت رکھتی ہے، اس کا اندازہ ہمیں میر کی شاعری کے لب ولہجہ سے ہوتا ہے۔ میر کے اشعار پکار پکار کر کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں ایک بڑی شخصیت نے جنم دیا ہے۔

میر کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحرِ حیات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے، میر کی آہ و فغاں میں شش جہت کی ہواؤں کی سنسناہٹ ہے۔ میر جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ میر عالمگیر میر بن جاتا ہے۔

میر کے یہاں ہر معمولی بات جتنی ہی معمولی ہوتی ہے اتنی ہی غیر معمولی بن جاتی ہے— اس کی ہر بات ایک مقام سے ہے۔ بہت سے چھوٹے بڑے لوگ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ عظیم شخصیت بہت سے مختلف علوم، بہت سی مختلف صلاحیتوں، بہت سی عملی قوتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تعداد اور وزن لمبائی چوڑائی اور خارجی حساب کتاب سے عظمت کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔

عظیم شخصیت ڈگری یافتہ شخصیت کا نام نہیں ہے۔ عظیم شخصیت کی مشابہت دریا اور سمندر سے ہوتی ہے، زمین اور آسمان سے ہوتی ہے۔ نباتات اور وحش وطیور سے ہوتی ہے—

لیکن ان کی حقیقی عظمت کو ہم ایک ایسا پُرعظمت ''جہل'' کہہ سکتے ہیں جسے میں نے ہمّیت اور جبلت کے نام سے موسوم کیا ہے اور جس کے بارے میں اصغر گونڈوی نے کہا ہے ع

مقامِ جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے

میر نے کہیں کہیں تم کی ضمیر استعمال کی ہے۔ تم کے لفظ میں جو چمکار اور تھرتھراہٹ یا جو اپنائیت میر نے کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی بلکہ شاید دنیا کی شاعری میں بھی بہت کم ملے گی۔

میر مجسم پیار تھے، صرف محبوب کے لیے نہیں بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کے لیے— میر زندگی اور کائنات سے بیزار نہیں ہیں۔ جب وہ اس بیزاری کا رونا روتے ہیں اس وقت بھی ناقدانہ شعور یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میر حیات و کائنات کو اپنے سینے میں بھینچے ہوئے تھے۔ یہی پیار اور چمکار اس سوز و گداز کا راز ہے جس میں کوئی بھی اردو شاعر میر کو نہیں پا سکا۔

یہ سوز و گداز ذاتی غم یا محرومی کی دین نہیں ہے بلکہ یگانگی اور ہم آہنگی کی دین ہے۔ میر کی گالی اس درویش کی وہ گالی ہے جس کی محرک انتہائی شفقت ہوتی ہے، یہ گالی نہیں دعا ہے۔

میر کے یہاں قدرِ اول کے اشعار کی تعداد غالباً ڈھائی تین سو یا اس سے کچھ کم یا زیادہ تک پہنچتی ہے— لیکن میر کے نہایت اچھے اشعار کی تعداد تین ہزار اشعار سے کم نہیں ہے—

میر کی شاعری میں لہجہ کا دھیما پن ہے جس سے حیات و کائنات کی عظمت، رعب و جلال کا اندازہ ہمیں میر کراتے ہیں—

میر کے لہجہ کی نرمی دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی— میر کے کلام کی سب سے بڑی اور سب سے اہم حقیقت یا محرک میر کا خلوصِ تخیل ہے۔ غنائی شاعری میں یہ خلوصِ تخیل دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے اور یہی وہ مرکزِ سوز و ساز ہے جہاں خود الفاظ کے پر جلنے لگتے ہیں— میر کی شاعری میں ہم سکوت سرمدی کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔

●●●

محمد حسن عسکری

میرا جی

میرے خیال میں ہر تنقیدی مضمون کا آغاز معافی کی درخواست سے ہونا چاہیے۔ معافی کی درخواست نہ سہی ''یاد دہانی سہی''۔ اس ضرورت کی عمومیت کو دیکھتے ہوئے اگر پڑھنے والے ہر مضمون سے پہلے یہ تشبیب فرض کرلیا کریں، تو غالباً بہت سے صدموں سے بچ جائیں۔ جائے پیدائش اور سنہ ولادت تک تو خیریت رہتی ہے لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہی تنقید لکھنے والے، جس شخص کے متعلق تنقید لکھی جارہی ہے اس کی اور پھر تنقید پڑھنے والے تینوں کی شخصیتیں اس بری طرح آپس میں گڈمڈ ہونے لگتی ہیں کہ یہ پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے، کون کہاں شروع ہوتا ہے اور کون کہاں ختم ہوتا ہے۔ یوں تو میں نے میر کے متعلق بری بھلی رائے قائم کرنے کی جرأت ضرور کی ہے، لیکن مجھے قطعاً دعویٰ نہیں ہے کہ میں میر کی اصلیت کو پہنچ گیا ہوں۔ یا سختی سے معروضی اور خارجی نقطۂ نظر قائم رکھ سکا ہوں۔ بہرنوع میں نے کوشش کی ہے کہ بغیر کسی اندرونی شہادت کے محض قیاس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہ کروں، لیکن اس تھوڑی بہت احتیاط کے باوجود میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے میر کو صحیح طور سے سمجھا ہے یا بالکل غلط۔ میر کی اس تعبیر وتفسیر میں کسی ذاتی ضرورت کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ بالکل یہی رائے میں اس تفسیر کی تائید یا تردید کے بارے میں دوں گا۔ بہرکیف میر کے متعلق میرے ان تاثرات کا ایک استعمال ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تاثرات آپ کے تاثرات سے مختلف ہوں اور ان دونوں کے مقابلے اور موازنے سے کوئی تیسرا وسیع اور جامع نتیجہ مرتب کیا جاسکے۔

فی الحال مجھے اس بحث سے کوئی مطلب نہیں کہ اردو ادب میں میر کا کیا درجہ ہے؟ اپنے لیے تو خیر میں نے اس سوال کا فیصلہ کرلیا ہے اور اتنا کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھوں گا کہ زندگی کے متعلق جس قسم اور جس کیفیت کا شعور مجھے میر کے یہاں ملا ہے ویسا شعور میں نے انگریزی شاعری کے اپنے مختصر سے مطالعے میں کہیں اور نہیں پایا۔ چنانچہ اس مضمون میں میری کوشش یہی ہوگی کہ اس مخصوص شعور اور کیفیت کی طرف اپنی کندفہم نثر کی مدد سے اشارہ کرسکوں۔

دنیا کے ہر معقول فن کار کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ رہا ہے، خواہ شعوری طور پر اس نے اس کے متعلق کچھ سوچا ہو یا نہ سوچا ہو، بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے اس سارے جھگڑے کا فیصلہ بالکل غیرشعوری طور پر کرلیا ہو۔ جب تک آدمی صرف عارضی غم یا عارضی نشاط، ہنگامی تاثرات اور وقتی جذبات میں محو رہتا ہے اس وقت تک تو کوئی خلش نہیں ہوتی لیکن اس غم ونشاط کی ہنگامیت پر تھوڑا سا قابو پاکر انھیں ذرا وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو فوراً یہ سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کی، ہمارے آدرشوں کی، ہمارے طرز زندگی کی اور خود ہماری، نظام کائنات میں کیا حیثیت اور کیا درجہ ہے، ایسے وقت اور ایسے وقت پر ہی کیا منحصر ہے، روزمرہ کی زندگی میں بھی، ہمارے لیے حقیقت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک تو وہ حقیقت جسے ہم اپنے اندر یا اپنے تخیل کے ذریعہ محسوس کرتے ہیں جو ہمارا آدرش ہے،

جس سے ہمیں محبت ہے۔ دوسری حقیقت وہ ہے جو ہم سے باہر دنیا میں موجود ہے۔ مرئی اور غیر مرئی دونوں طرح ان دو متضاد حقیقتوں کے آپ جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ خیر وشر، تخیل اور اصلیت، عشق اور عقل، خیال اور عمل۔ اسی طرح ان دو حقیقتوں کے اجزائے ترکیبی ہر آدمی کی نفسیاتی ساخت کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔ آدمی کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کے اندر ان دو حقیقتوں، ان دو دنیاؤں کے امتزاج کا تناسب کیا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی پرستش میں غلو بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر، عقلی اور عملی حقیقت پر زور دینے سے آدمی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا اس سے اور آگے بڑھ کر اپنے ملک کے دشمنوں کے ہاتھ اسلحہ بیچنے والا سرمایہ دار ہوسکتا ہے۔ تخیلی عنصر کی شدت ہو تو قیس عامری کا درجہ حاصل کرنے کا بھی امکان ہے۔ ان دونوں حقیقتوں میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہونا یا نہ ہونا، یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی طبیعت کی بات ہے۔ لیکن پسند کر چکنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بالکل مطمئن ہو جانا اور نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کرنا کسی بہت ہی بے ایمان اور مطلب پرست آدمی کا کام ہوسکتا ہے یا احمق اور دیوانے کا۔ خیر، ہمیں تو فی الحال فن کار سے مطلب ہے اور فن کار کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ ان سوالوں کا مقابلہ کرتا ہے جن سے بڑے بڑے عارفین کے پتے پانی ہوتے ہیں اور جہاں تک فن کار کا تعلق ہے اس میں کہنے سننے کی گنجائش نہیں کہ وہ عقل کی بہ نسبت عشق، اصلیت کی بہ نسبت تخیل اور عمل کی بہ نسبت آدرش کو پسند کرتا ہے اور سب سے زیادہ اپنے عشق اپنے تخیل اور اپنے آدرش کو۔ مختصراً اپنی خودی کو۔ لیکن پسند کر چکنے کے بعد وہ اپنے احساس کے دروازے بند نہیں کر دیتا۔ اوروں کی بہ نسبت اسے ان دونوں حقیقتوں کے تقابل کا احساس کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی خودی ہوتی ہے دوسری طرف خارجی دنیا اور اس کے باشندے۔ ایک طرف فرد، دوسری طرف کائنات، ایک طرف تو آدمی کو خودی اور اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے جو کسی حد اور کسی پابندی کا احترام نہیں کرنا چاہتا بلکہ عالم موجودات سے بھی آگے اگر کوئی چیز ہے تو اس پر بھی چھا جانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی بے مقدار حقیر چیزیں ہیں جو برابر یاد دلاتی رہتی ہیں کہ یہ احساس رفعت وعظمت محض ایک خودفریبی ہے۔ ہر ہر قدم پر ہمیں اپنی بے حقیقتی اور بیچارگی کا تماشا دیکھنا پڑتا ہے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری نہیں ہونے پاتیں۔ موت ہماری محبتوں کا احترام نہیں کرتی، سر اوپر اٹھائیں تو فضا کی قہار لاانتہائیاں ہمارے اوپر چھائی ہوتی ہیں۔ اور تو اور ذرا سا کانٹا لگ جائے تو ساری بلند نظری رفو چکر ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ کائنات کے سامنے فرد کی ہیچ مقداری کے احساس سے کسی طرح مفر ممکن نہیں۔ میر کے یہاں اس احساس کی ایک آدھ شہادتیں دیکھیے:

ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج میر بہتوں کے کام ہوگئے ہیں کل تمام یاں
کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا ہے

اپنی بے چارگی تسلیم کرنے کے بعد فرد کا رویہ دو طرح کا ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ سے بالکل مایوس اور ہر قسم کے آدرشوں اور ہر قسم کی علوخیالی سے بیزار ہو جائے، اس صورت میں اگر وہ عمل کی طرف راغب ہے تو کسی نہ کسی شکل میں مردم آزاری اختیار کرے گا، ورنہ پھر ٹرین کے نیچے جا لیٹے گا۔ اگر وہ تخلیقی کام کرتا ہے تو اس کے کلام یا اس کی تصویروں

میں سخت کلبیت اور زندگی سے بیزاری ہوگی۔ فرد کا دوسرا ردعمل ہوسکتا ہے لامحدود اور غیر مشروط اثبات خودی لیکن غیر محدود اثبات خودی۔ غیر مشروط سرکشی اور بغاوت انسان کے تخیل سے ممکن نہیں۔ اور باتوں کو چھوڑیے صرف موت کا تصور ہی ایسی چیز ہے جو بڑے سے بڑے سرکش اور باغی کا سر جھکا دیتا ہے۔ تھوڑی بہت دیر اثبات خودی کی ہوا میں آدمی جتنا چاہے فرانٹے بھر لے، لیکن آخر وہ لمحہ آجاتا ہے جب اسے ماننا پڑتا ہے کہ اتنی تگ و دو کے بعد بھی اس کی حیثیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اس شکست کے احساس سے جو جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے وہ بہت خطرناک چیز ہے۔ اس بات پر غور کرنے کے لیے بہت کم لوگ رکتے ہیں کہ ملکی فتوحات یا انسانیت کی خدمت، یا عمل یا فلسفۂ سخت کوشی کی تہ میں بڑی بے پناہ مایوسی اور احساس شکست خوردگی ہوسکتا ہے۔ اثبات خودی یقیناً کسی نہ کسی مادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر ہونے کے لیے ضرور کسی نہ کسی شہوت کا سہارا لیتا ہے، خواہ وہ ملک گیری اور سیاسی اقتدار کی خواہش ہو، یا جنسی تعیش یا تحصیل علم کی آرزو، اس قسم کی ہر جدوجہد کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، ناکامی۔ یہی ٹریجڈی ہے جو گیٹے نے ''فاؤسٹ'' میں پیش کی ہے۔ بہر حال یہ دونوں ردعمل حیاتیاتی اعتبار سے غیر صحت مندانہ اور ضرر رساں ہیں۔

جب یوں چین نہ دوں چین تو پھر آخر انسان کرے کیا؟ انسانیت کے اکثر رہنما اور غالباً بزرگ تر رہنما یہی نصیحت کرتے ہیں کہ انسان کو ہار مان لینی چاہیے اور اپنی خودی کو قربان کر دینا چاہیے۔ مذہب صرف انسان کی خودی کے گلے میں پٹہ ڈالنے کی ایک کوشش ہی تو ہے۔ یہ نصیحت صرف مذہبی پیشواؤں ہی کی نہیں بلکہ بڑے بڑے فنکار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یسوع مسیح نے کہا ہے کہ جو آدمی اپنی روح کھوئے گا وہی اسے پائے گا۔ اسی سے ملتا جلتا نظریہ گیٹے کا ہے ''مرجا اور ہوجا''۔ یہی تاکید بلیک کرتا ہے کہ تمھارے اندر خودی بار بار پیدا ہوگی، اسے بار بار ہلاک کرتے رہو۔ اسی سے ملتی جلتی تشریح کیٹس کے نظریہ ''منفی صلاحیت'' کی ہوسکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میر کو بھی ہتھیار ڈال دینے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ مثالیں میں ابھی دوں گا۔ پہلے ایک اور ضمنی سوال پر غور کر لیجیے۔ یہ تو تسلیم ہے کہ ہمیں اپنی خودی قربان کر دینی چاہیے لیکن کس قربان گاہ پر؟ ہم اسے کس کے سامنے پیش کریں؟ خدا کے سامنے؟ نظام کائنات کے سامنے؟ یا انسانیت کے سامنے؟ حسن فطرت کے سامنے؟ یہ ساری قربانیاں بہت آسان ہیں کیونکہ یہ ساری چیزیں غیر مرئی، تصوراتی اور غیر شخصی ہیں۔ جو مرئی ہیں وہ بھی کم سے کم خوش آئند ضرور ہیں۔ بہت کم آدمی ہیں جو ان کے سامنے سر جھکانا، اپنی ذلت اور توہین سمجھیں، لیکن اگر عام انسانوں کے سامنے جن میں ہزار قسم کے عیب، بے رنگیاں، عامیانہ پن، ابتذال، گندگیاں، حماقتیں اور ذلالتیں ہوتی ہیں، اپنی خودی پیش کرنے کا سوال ہو تو کتنے آدمی تیار ہوں گے؟ یہ ہے اصلی روحانی ریاضت۔ اس کے لیے شیکسپیئر، چوسر، ڈکنز یا جوئس کے قد و قامت کا آدمی چاہیے۔

اور اگر میں نے میر کو ذرا بھی صحیح پڑھا ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنی خودی کو عام انسانوں کے سامنے پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ اگر وہ دوسرے انسانوں کی اقدار اور عملی دنیا کی اہمیت کو کلیتاً قبول کر لیتے تو شاعر نہیں رہ سکتے تھے، اودھ کے جاگیردار البتہ ہوتے۔ انھیں اپنی قدروں، اپنے آدرشوں اور اپنی انفرادیت پر پورا یقین ہے، حد درجہ محبت ہے، لیکن وہ

ان کے مقابل کی دوسری حقیقت کو رد نہیں کرتے۔ یہی میر کی عظمت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور اپنی خودی سے محبت کرے، لیکن آخر اس انفرادیت کا کوئی پس منظر، اس کے مادی لوازمات اور سناسبات بھی تو ہوں گے؟ میر اس پس منظر کو کبھی نہیں بھولتے اور نہ وہ اسے ناقابلِ اعتنا یا حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر اور اپنی حقیقت سے مایوس یا بیزار ہوئے بغیر دوسرے انسانوں کے نقطۂ نظر کی اہمیت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ انھیں اس خیال سے ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ انھیں اور ان کی اقدار کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے بھی جانچا جاسکتا ہے۔

اس کے برخلاف اردو کے دو اور بڑے شاعروں کو دیکھیے۔ اقبال کے نزدیک آدمی کی عظمت کے لیے یہی چیز کافی ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہو۔ انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ فوق الانسان ہو۔

گر از دست تو کار نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

ان کے آدرش کے مقابلے میں روزمرہ کی دنیا اتنی پست ہے کہ انھیں انسانوں کی صحبت سے زیادہ عزلت گزینی پسند ہے۔ ان کا فوق الانسان اپنا قانون خود اپنے آپ ہے۔ اگر وہ کبھی انسانوں کی دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے تو صرف ان پر رعب جمانے کے لیے۔ ایک جگہ اقبال نے خودی کو قانونِ الٰہی یا دینِ فطرت کا پابند ضرور بتایا ہے، لیکن دینِ فطرت کی تعبیر وتفسیر میں فوق الانسان بالکل آزاد معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب بھی اپنا مکان عرش سے پرے بنانا چاہتے ہیں۔ انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ منظور نہیں کہ انھیں دوسروں کے معیار سے جانچا جائے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

غالب کو پستی منظور ہے، لیکن کسی اور کی مدد سے بلندی پر پہنچنا منظور نہیں۔ ان کے خیال میں انسان کو خود اپنے لیے کافی ہونا چاہیے، خواہ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی غالب کو بھی اپنی صلاحیتوں کے محدود ہونے، اور اپنے اثباتِ خودی کی لازمی شکست کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اپنی فتح یا شکست کا اندازہ کرنے کے لیے بھی وہ دوسروں کی ترازو استعمال نہیں کرتے۔ غالب کی خودی اور انفرادیت کی کمزوری اور شکست کا اگر کوئی آدمی نظارہ کرسکتا ہے تو صرف غالب۔ انھیں اس کی ذرا بھی فکر نہیں کہ دوسرے انھیں کیا سمجھتے ہیں۔ انھیں تو صرف یہ غم ہے کہ غالب وہ نہ ہو سکا جو وہ ہونا چاہتا تھا۔

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس کے برخلاف میر قدم قدم پر اپنا دوسرے انسانوں سے مقابلہ کرتے ہیں، ان کے معیار سے اپنے آپ کو جانچتے ہیں، اور اس معیار کے مطابق ان کی انفرادیت میں جو خامیاں نکلتی ہیں انھیں بڑی جرأت سے تسلیم کر لیتے ہیں اور تمام چیزوں کے باوجود اپنی اصلیت اور جس حقیقت کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کی اہمیت اور برتری سے ذرا بھی بدظن یا غافل نہیں ہوتے۔ غالب اور اقبال کی طرح وہ اپنا جلوہ صرف اپنی نظروں سے نہیں دیکھتے، بلکہ بار بار اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنی خودی کو دور سے اور دوسروں کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ وہ دنیا میں اکیلے نہیں رہتے اور

نہ کوئی ایسی دنیا بنا سکتے ہیں جو دوسرے انسانوں سے بالکل غیر متعلق اور ان کے حملوں سے بالکل محفوظ ہو۔ جب انسانوں کے درمیان رہنا ہے تو ان کی رائے اور ان کے نقطۂ نظر سے بھی تجاہل نہیں برتا جاسکتا۔ چنانچہ وہ بار بار اپنے طرز زندگی اور طرز احساس کو سماج کے طرز احساس کے مقابل رکھتے ہیں اور دونوں کا موازنہ کرتے ہیں اور فیصلہ بھی وہ ہمیشہ اپنے حق میں نہیں کرتے، حالانکہ اپنے آپ سے اور اپنے طرز زندگی سے ان کی محبت اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ وہ برابر دونوں حقیقتوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ان کے احساسات و جذبات اور اعمال و افعال کا اثر دوسرے لوگوں پر کیا ہوگا اور ان کا ردعمل کس قسم کا ہوگا۔ وہ دوسروں کو بھی اپنی اپنی انفرادیت اور خودی کے اظہار کا اتنا ہی حق اور موقع دیتے ہیں جتنا اپنے آپ کو، اور اپنی برتری منوانے پر ذرا بھی اصرار نہیں کرتے۔ اکثر وہ خود اپنے اوپر ہنستے ہیں، خود اپنے اوپر طنز کرتے ہیں۔ ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور بیزاری شامل ہو بلکہ یہ طنز میر کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔ یہاں لاکر وہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ ملا دیتے ہیں۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں، اپنے اوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی، بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت۔ اب آپ میر کے کچھ شعر ایسے سن لیجیے جن کی بنیاد پر میں نے اپنا یہ نظریہ قائم کیا ہے۔

کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا
کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منھ

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر

اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں
میر صاحب کو دیکھیے جو بنے

بہت میر نے آپ کو گم کیا
کسو وقت پاتے نہیں اس کو گھر

تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
جو اس شور سے میر روتا رہے گا

ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو
شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمھارے کیا رودیں

کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے
میر صاحب رلا گئے سب کو

جب میر یہ دو لفظ ''میر صاحب'' یا ''میر جی'' استعمال کرتا ہے تو نہ معلوم ان میں کیا کیا بجلیاں بھر دیتا ہے۔ خیر کچھ اور مزے سنیے۔

تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں

خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اس کے آئی ہو
کہیں تو ہیں کہ عبث میر نے دیا جی کو

میر کا طور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا

جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تونے

تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا
قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار

وحشت ہے بہت میر کو مل آیئے چل کر کیا جانیے پھریاں سے گئے کب ہو ملاقات

چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

سودا ہو تپ ہو میر کو تو کریئے کچھ علاج اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

صرف یہی نہیں کہ میر میں دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت ہو، بلکہ بڑے خلوص کے ساتھ اسے خود بڑی حیرت ہے کہ وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے جو دوسروں کے لیے غیر متوقع اور عجیب ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو ان شعروں سے ہو ہی گیا ہوگا۔ اب میر کا ایک ایسا شعر پیش کروں گا جو صرف تخیل اور شعریت کی انتہائی بلندی پر پہنچ کر کہا جاسکتا ہے۔ ہما شما کے بس کا نہیں۔

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

اس شعر میں ان دونوں حقیقتوں کے تقابل کو میر نے صرف دردناک نہیں، بلکہ بلند ترین معنی میں ٹریجڈی بنا دیا ہے۔ اس شعر میں لاچاری اور افتادگی یا شکستگی نہیں ہے بلکہ غم کو ہضم کرنے کی کوشش۔ اس شعر میں جو حقیقی ٹریجڈی پیدا ہوتی ہے وہ رونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رومال کے ذکر سے۔ یہ ایک لفظ بجلی کی سی تیزی سے سارا منظر ہمارے سامنے لے آتا ہے کہ یہ دنیا کیا جگہ ہے، یہاں کے آدمی کون لوگ ہیں، ان سے کس بات کی توقع کی جاتی ہے اور ان سب کے سامنے میر کا غم کیا چیز ہے؟ اس شعر میں میر اپنی خودی کا اثبات نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنی انسانیت کا۔

اسی طرح میر پنچایتی خیالات اور عوام کے محاوروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو وہ ان دو متضاد حقیقتوں کے تقابل کا ذریعہ بناتا ہے لیکن اپنی حقیقت کی اصلیت کو کہیں بھی فراموش نہیں کرتا۔

میں اس چیز پر زیادہ زور تو نہیں دے سکتا لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر عشق کو (اس سے بہت کچھ مراد ہے) صرف اپنا طرز زندگی نہیں سمجھتا بلکہ ایک طرز زندگی جسے اس نے اختیار کرلیا ہے اور دوسرے انسان بھی اختیار کرسکتے ہیں۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا

بہرحال اس میں تو شک کی گنجائش نہیں کہ میر عاشق سے زیادہ انسان ہے۔ کم سے کم عاشق ہونے کے بعد وہ اپنی انسانیت کو نہیں بھولا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی مخصوص رعایت نہیں چاہتا جو دوسرے انسانوں سے نہ کی جاسکتی ہو۔ وہ محبوب کے سامنے بھی اپنے آپ کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کرتا ہے۔ محبوب سے شکایت کرتا ہے تو وہ بھی اس طرح جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے شکایت کرتا ہے۔

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں میر کو تم عبث اداس کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

دور پھرنے کا ہم سے وقت ہے کیا پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

یہ بے قراریاں نہ کبھو اس نے دیکھیاں جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

محبوب سے التجا یا اپنی سفارش کرتے ہیں تو وہ بھی بحیثیت انسان کے۔

رنگ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے اک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم

محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں ایسے ناکام بھی بیکار پھرا کرتے ہیں

اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میر ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

اپنے اوپر افسوس کرتے ہیں یا اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں بلکہ اپنی تعریف کرتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو انسان سمجھ کر، فوق الانسان سمجھ کر نہیں۔

خوش رہا جب تلک رہا جیتا میر معلوم ہے قلندر تھا
یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو یہی آتا ہے بار بار افسوس
مردہ کہیں بھی میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا ظالم کسو کا سن کہا کوئی گھڑی آرام کر
نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار رہیں بے لطفیاں ہی یاں تو باہم
صبر بھی کریے بلا پر میر صاحب جی کبھو جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہان ہے پیارے
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
وجہ کیا ہے کہ میر منھ پہ ترے نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

میر کو یوں تو حسرت و یاس کا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن پھر بھی یہ کہیں محسوس نہیں ہوتا، کم سے کم ان کے اچھے شعروں میں کہ اگر انھیں غم ہے تو وہ ساری دنیا کو غم میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زندگی کو لازمی طور پر اپنا دشمن سمجھتے ہیں جس نے چھانٹ کر انھیں اپنا شکار بنایا ہو۔ انھیں اپنی ناکامیوں پر رنج سہی، لیکن وہ اس رنج کو کائنات پر مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ وہ صرف اتنی ہمدردی کے طالب ہیں جتنی ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے۔

خواہ مارا انھیں نے میر کو خواہ آپ موا جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے یہی میر اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

اسی ضمن میں ایک اور شعر دیکھیے جہاں پھر میر نے ایک عامیانہ چیز کی مدد سے ٹریجڈی پیدا کی ہے۔

کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

محبوب کی بے اعتنائی کو بھی میر ہمیشہ سخت دلی اور ظلم یا فطری بدکرداری نہیں سمجھتے۔ ان کے بہترین شعروں میں محبوب بھی انسان ہوتا ہے اور اس کی وہی خصوصیات ہوتی ہیں جو اور انسانوں کی۔ میر کو فرد کی لازمی تنہائی کا پورا احساس ہے۔ وہ

انسانوں کے جذبات و احساسات میں پوری مطابقت بالکل ناممکن ہے، نہ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں پوری طرح شریک ہوسکتا ہے۔ اگر محبوب بے اعتنائی کرتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ کج خلقی یا اذیت پسندی ہو، بلکہ فطری اور انسانی مجبوری بھی ہوسکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ محبوب چاہے بھی اور عاشق پر مہربانی بھی نہ کرسکے۔ ایسی صورت میں عاشق اپنی بدنصیبی پر افسوس تو کرسکتا ہے لیکن محبوب کی شکایت بالکل بے جا ہے۔ تنہائی زندگی کا قانون ہے اور اس کے سامنے عاشق اور محبوب دونوں مجبور و معذور ہیں۔ اگر قصور ہے تو عاشق کی لامحدود آرزوؤں کا، آرزوؤں کی شدت کا۔ چنانچہ عاشق کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ جس طرح ہوسکے اپنا غم برداشت کرے۔ اب میر کے کلام سے اس احساس کی دو ایک شہادتیں سنیے۔

جگر چاکی ناکامی دنیا ہے آخر | نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا
آتا ہے دل میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں | پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج | تم بھی تو میر صاحب و قبلہ عجول ہو
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ | سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

میر کو ایک طرف تو تنہائی کا احساس ہے اور دوسری طرف کائنات اور موت کے سامنے فرد کی بے حقیقتی کا بھی یقین ہے۔ فرد کی انفرادیت اور خودی کتنی ہی حسین و جمیل اور شاندار چیز سہی، لیکن اس پر حد سے زیادہ فخر کرنے کا کوئی موقع نہیں، کم سے کم یہ موقع زیادہ دیر تک نہیں ملتا۔ غیر مشروط اثبات خودی بے معنی چیز ہے۔ زندگی کا ایک قانون ہے اور ہزار ہاتھ پیر مارنے کے باوجود فرد اس جال سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ افسوس کی چیز تو ضرور ہے لیکن مجبوری ہے، فرد کیا کرسکتا ہے۔

لاعلاجی ہے جو رہتی ہے مجھے آوارگی | کیجیے کیا میر صاحب بندگی بیچارگی
زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر | کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا ہے
ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج میر | بہتوں کے کام ہوگئے ہیں کل تمام یاں
تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم | کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں
جور دلبر سے کیا ہوں آزردہ | میر اس چار دن کے جینے پر
چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب | سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار

فرد کی تنہائی اور بے چارگی یہ دو احساس ایسے ہیں جن کے بعد زندہ رہنے کی کوئی منطقی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن انسان کے اندر زندگی کی خواہش بہت قوی ہوتی ہے۔ اس لیے مرجانا بھی آسان نہیں، تو پھر انسان کس طرح زندگی بسر کرے؟ پہلے غالب کا جواب سن لیجیے۔ انھیں اس کے سوا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا کہ آدمی کڑھ کڑھ کر اپنی زندگی ختم کردے۔ دوسرے انسانوں سے وہ کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ''ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں''۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل | دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

غالب زیادہ سے زیادہ تسلی یہ دیتے ہیں کہ ؏

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس کے برخلاف میر زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قرار کی تلقین کرتے ہیں۔ فرد کائنات کے قانون کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بدل سکتا۔ اس لیے محض سرکشی اور بغاوت بے نتیجہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آدمی کو بہت سے رنج اور غم سہنا پڑیں گے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو کسی بلند تر اصول کے قابو میں دے دینے کو تیار ہو تو وہ ایک ایسا سکون حاصل کر سکتا ہے جو غم و نشاط سے ماورا ہے۔ فرد کو قانون حیات دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی خودی اور انفرادیت کو اس قانون سے ہم آہنگ بنانا چاہیے۔ اس سلسلے میں میر کو جو کچھ کہنا تھا وہ انھوں نے ایک شعر میں کہہ دیا ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — کہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

غیر مشروط اثبات خودی کے معتقد میر کو بزدلی کا الزام دے سکتے ہیں لیکن جس طرح ہر جگہ اور ہر صورت میں تسلیم و رضا اور مصالحت بے ایمانی نہیں ہوتی، اسی طرح ہر جگہ اور ہر صورت میں بغاوت اور سرکشی مفید نہیں ہوتی۔ یہاں مفید کا لفظ میں ایک بہت خاص معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ اگر میر دوسروں کا نقطۂ نظر قبول کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مصلحت اندیشی اور مادی منفعت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا معاملہ درپیش ہے۔

دنیا میں صرف ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ وہ یہ کہ آدمی کو کیوں زندہ رہنا چاہیے؟ تو چونکہ انسان زندہ رہنے اور زندگی کی خواہش کرنے پر مجبور ہے، اس لیے اس کی قدر آخر یہ بن گئی ہے کہ اچھی چیز وہ ہے جو نسل انسانی کی بقا میں مدد دے۔ آپ چاہیں تو اسے بزدلی یا بے ایمانی کہہ سکتے ہیں، انسان سے پہلے جو نسلیں وجود میں آئیں، ان کی بقا کا دارومدار تھا، طبعی ماحول سے ان کی مطابقت پر لیکن نسل انسانی نے طبعی ماحول کو حیاتیاتی اعتبار سے معطل کر دیا ہے، انسان اپنا ماحول خود بن گیا ہے۔ اسے اپنے اعضا میں تغیر و تبدل نہیں کرنا پڑتا، بلکہ اپنے خیالات و احساسات کی دنیا میں ہم آہنگی اور نظم برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اسی پر نسل انسانی کی بقا منحصر ہے۔ اس لیے خیالات و احساسات کی افادیت جانچنے کے لیے کوئی مجرد اور مطلب معیار کام نہیں دے گا بلکہ ان کا صرف ایک پیمانہ ہے۔ یہ خیالات نسل انسانی کی بقا میں کس حد تک معاون ہو سکتے ہیں؟ جہاں تک میر کے آخری فیصلے کا تعلق ہے ہم اس فیصلے کو انسانیت کے لیے بہترین رویہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ فیصلہ صرف میر کا نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے بڑے بڑے مفکروں اور فنکاروں کا بھی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ میر ایک بہت بڑا فنکار ہے اور ہمیں صرف ایک راستہ دکھا کر نہیں رہ جاتا، بلکہ ہمیں اس پر چلا کر دکھا دیتا ہے۔ اب یہ ہماری صلاحیت پر منحصر ہے کہ ہم اس کی مدد کے بغیر اس راستے پر کتنی دیر چل سکتے ہیں۔

مختصراً میر نے زندگی کے متعلق جو کچھ سمجھا اور سوچا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ بھرپور زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنی خودی کو کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دے لیکن ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بیزار بھی نہ ہو اور یہ رائے کوئی قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا۔ (۱۹۴۷)

●●●

گوپی چند نارنگ

اسلوبیاتِ میر

(۱)

دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا از سعادت خاں ناصر لکھنوی (۱۲۶۱ھ) سے روایت ہے۔ ''ایک دن سراج الدین علی خان آرزو نے جو کہ میر تقی میر کے سوتیلے ماموں تھے کہا کہ آج میرزا رفیع سودا آئے اور یہ مطلع نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے:

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میر نے اوس کو سن کر بدیہہ یہ مطلع پڑھا:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

خانِ آرزو فرطِ خوشی سے اچھل پڑے اور کہا ''خدا چشم بد سے محفوظ رکھے''۔ یہ غزل دیوانِ اول میں سات شعر کی موجود ہے۔ البتہ دوسرا مصرع یوں ہے/ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا/ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں میر کے جس شعر سے سب سے پہلے بحث کی ہے وہ یہی مطلع ہے اور لکھا ہے ''ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا پورا اندازہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو صاحبِ ذوق ہیں''۔

ذکرِ میر میں میر نے صراحت کی ہے ''جو لوگ درویش (والد) کی زندگی میں میری خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، اب انھوں نے یکبارگی مجھ سے آنکھیں چرالیں ناچار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خانِ آرزو کا منت پذیر ہوا''۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اس وقت میر کی عمر کوئی پندرہ برس ہوگی۔ میر نے لکھا ہے کہ ''جب میں کسی قابل ہوا تو سوتیلے بڑے بھائی کا خط پہنچا۔ ''میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے وہ عزیز (سراج الدین علی خانِ آرزو) واقعی دنیادار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہوگیا...... میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے اگر ان کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر ہوجائے''۔ گویا میر کچھ ہی مدت کے بعد خانِ آرزو سے الگ ہوگئے۔

ذکرِ میر اور نکات الشعرا کے بیانات سے ظاہر ہے کہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کی سودا کے مطلع پر مطلع کہنے کی روایت شروعِ جوانی کی ہے جب میر کی عمر پندرہ سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہی زمانہ میر کے جوشِ وحشت کا بھی ہے جب انھیں

اس قدر رنج اور تکلیف پہنچی کہ ان کی حالت جنون کی سی ہوگئی۔ میر اور سودا کی عمروں میں جو فرق ہے اس کے پیش نظر اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر جب شعر کہنا شروع کر رہے تھے اس وقت سودا شہرت کے درجے پر فائز ہوچکے تھے۔ (سودا ۱۷۰۶-۱۷۸۱ میر تقی میر ۱۷۲۲-۱۸۱۰) میر نے طویل عمر پائی، ان کی استادی کا لوہا سب نے مانا اور ان کے شاعرِ دل پذیر اور سخن سنج بے نظیر ہونے کا اعتراف بھی سب نے کیا لیکن میر کی تمام زندگی پر سودا کی شہرت کا سایہ برابر لہراتا رہا ہے اور اکثر تذکرہ نگاروں نے بشمول تذکرۂ ہندی (مصحفی) گلشنِ ہند (مرزا علی لطف) اور گلشنِ بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ) سودا سے میر کا موازنہ کرتے ہوئے میر کے بارے میں اعتذار کا لہجہ اختیار کیا:

> اکثرے درفنِ ریختہ اورا در پلۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند واکثر درغزل ومثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند ومرزا را درہجو وقصیدہ برا وفضیلت می دہند۔ غرض ہرچہ ہست استادی ریختہ برو مسلم است (تذکرۂ ہندی)۔ ''سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی خوب ہے''۔ (گلشن ہند) ''پست و بلند کہ درکلامش بینی درطب و یابس کہ درابیاتش بنگری نظر نہ کنی واز نظرش نیفگنی (گلشن بیخار)۔

منفرد لہجے کی شناخت: اس تناظر میں میر کے مندرجہ بالا مطلع کو دیکھیے تو ایک دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شروع ہی سے میر کا مزاج اپنے پیشرووں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کا جوہرِ ذاتی اس نوع کا تھا اور تخلیقی اپج ایسی زبردست تھی کہ شروع جوانی ہی سے میر اپنے عہد کے مزاج سے ہٹ کر شعر کہہ سکتے تھے اور اپنی طرزِ گفتار اور انفرادی لہجے کا انھیں شدید احساس بھی تھا ورنہ سودا جیسے مسلم الثبوت شاعر کے مطلع پر بدیہہ مطلع کہنے کی ہمت کیونکر کرتے۔ نوجوانی کی اس ایک بیت سے کئی ایسے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو بعد میں میر کے شعری اسلوب اور طرزِ گفتار کی شناخت بن گئے۔ سودا کا مطلع معمولی نہیں۔ چمن، صبا، صبح، تیغ، آبِ رواں میں معنوی اور صوتی نسبتیں ہیں نیز جنگجو کی رعایت سے صبا کا آبِ رواں سے تیغ کا کام لینا بھی خالی از لطف نہیں۔ لیکن میر کے مطلع میں دل کو چھو لینے والی جو کیفیت ہے، سودا کا مطلع اس سے خالی ہے۔ کیوں؟ شعر میں معنویت، تصویریت، کیفیت سب لفظوں ہی کے ذریعے پیدا ہوتی ہے اور زبان کا تخلیقی استعمال ہی شاعر کی اپج، فطری جوہر، جوشِ جذبات اور زورِ تخیل کی بنیادی کلید فراہم کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس مطلع میں میر کی فطری افتاد نے ان کے لہجے کو کس طرح یکلخت سودا سے الگ کردیا ہے۔ اسلوبیات کی معمولی مدد سے جس کا نام آتے ہی کرمیں تکیے لگاکر انشاپردازی کرنے والے نام نہاد نقادوں کی نیندیں اچاٹ ہوجاتی ہیں، اس بارے میں کیسی مدد مل سکتی ہے۔ سودا کے شعر میں چمن، صبح، جنگجو، صبا، تیغ، آب، کام، کیا ہیں؟ یہ سب اسم ہیں۔ پورا مصرع سات اسما کا مجموعہ ہے۔ اب میر کا مطلع دیکھیے۔ علاوہ لفظ نام کے جو دونوں شعروں میں مشترک ہے، سارے شعر میں صرف ایک اسم ہے، دلِ ستم زدہ، اور شعر کا پورا معنیاتی نظام اس ایک اسم کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے معنی کی ترسیل اور کیفیت پیدا کرنے میں جو مدد ملتی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ بادی النظر میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ میر نے بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور اس کا اعادہ ہماری میریات کی پوری تنقیدی روایت میں ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ غلط بات میر کے اسلوبِ شعر کے بارے میں کہی ہی نہیں جاسکتی اور اس سے بحث آگے آئے گی کہ میر کی زبان محض بول چال کی زبان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر کا صرفی اور نحوی ڈھانچہ عام اردو کا ہے۔ لیکن لفظوں کے سُر الگ ہیں۔ متعدد اسلوبیاتی

امتیازات کے باعث میر کا لہجہ ایسی شدید انفرادیت رکھتا ہے کہ میر کا شعر پڑھتے یا سنتے ہی فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لہجہ دوسروں سے الگ ہے۔

رفتہ رفتہ میر کی آواز پورے عہد پر چھا جاتی ہے۔ میر کا یہ دعویٰ غلط نہیں۔

اگرچہ گوشہ‌نشیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

دیکھتے ہی دیکھتے شعر میر نے زمانے کا مذاق بدل کر رکھ دیا۔ سودا کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہی لیکن مقبولیت میں میر کہاں سے کہاں نکل گئے۔ سید عبداللہ نے اشارہ کیا ہے کہ سودا کے ایک شاگرد نے اپنے ایک قصیدے میں شکایت کی ہے کہ جو شاعر ظہوری اور نظیری کے انداز میں شعر لکھتا ہے، لوگ اس پر ایسے شاعر کو ترجیح دے رہے ہیں جو لہجۂ عام میں شعر کہتا ہے۔

جو ایسی زباں میں ہو غزل اس کو کہیں بد
اور لہجے میں ہو عام کے سو پائے وہ توقیر

یعنی نظیری اور ظہوری کے لہجے میں غزل کو (اس انداز کو جسے سودا نے اپنایا ہے) اب برا سمجھا جانے لگا اور لہجۂ عام کی شاعری (یعنی میر کے انداز) کی قدر بڑھ گئی ہے۔ میر کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ فوری احساس یہی ہوتا ہے کہ وہ لہجۂ عام کے شاعر ہیں حالانکہ یہ نظر کا دھوکا ہے اور یہ سلسلہ دو صدیوں سے چل رہا ہے۔ اصلاً میر کا آرٹ فریب نظر کی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ اس آرٹ پر آرٹ کا شائبہ نہیں ہوتا یعنی سادگی کے ساتھ میر کی پُرکاری اس درجہ تہ نشیں ہے کہ بظاہر سادہ ہی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ میر نے بار بار تنبیہ کی ہے۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میر بار بار دعویٰ کرتے ہیں اگرچہ ان کو گفتگو عوام سے ہے لیکن ان کے شعر خواص پسند ہیں۔ عوام سے گفتگو ایک نوزائیدہ زبان کے اپنے آپ میں آنے کا ثبوت تھا لیکن اشعار کا خواص پسند ہونا ادائے خیال، لطفِ بیان اور حسن کاری کے ان تمام تقاضوں کو پورا کیے بغیر ممکن نہیں تھا جو غزل کی صدیوں کی شعری روایت کا حصہ بن چکے تھے۔ یعنی بغیر شدید نوعیت کی پُرکاری کے خواص کی پسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

نکات الشعرا کی بحث اور ''انداز'': میر نے بھی قائم کی طرح کئی جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا۔ اردو اس وقت ایک کچی پکی ان گھڑ زبان تھی جس کے بنانے اور نکھارنے میں میر اور ان کے معاصرین نے زبردست کردار ادا کیا۔ اس وقت زبان کئی سمتوں میں سفر کرسکتی تھی۔ تذکرۂ نکات الشعرا کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کو اردو کی ان وسعتوں اور بعض ابتدائی معذوریوں کا پورا اندازہ تھا۔ انھوں نے نکات الشعرا میں ریختے کی چھ قسمیں بیان کی ہیں۔ اول ایک مصرع فارسی اور ایک مصرع ہندی جس کی مثال امیر خسرو کے قطعے سے دی ہے۔ دوم آدھا مصرع ہندی اور آدھا فارسی اس کی مثال میر معز کے شعر سے دی ہے۔ سوم حرف و فعل فارسی میں لائے جائیں اسے میر نے قبیح

قرار دیا ہے۔ پنجم ایہام کہ شاعرانِ سلف میں ان کا رواج تھا اب اس صنعت کی طرف توجہ کم ہے جب تک نہایت شستگی کے ساتھ نظم نہ ہو۔ چوتھی اور چھٹی شق کی ذیل میں میر نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے لہجے کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چوتھی قسم ترکیبوں کے استعمال کے بارے میں ہے۔ میر کا کہنا ہے کہ ''جو ترکیبیں زبانِ ریختہ کے موافق ہیں، ان کا صرف جائز ہے۔ اس کی تمیز غیر شاعر نہیں کرسکتا۔ جو تراکیب نامانوس ہیں ریختے کے لیے معیوب ہیں۔ اس کی شناخت سلیقۂ شاعر پر موقوف ہے۔ فقیر کا مسلک یہی ہے''۔ (اردو ترجمہ) چھٹی شق کی ذیل میں میر تقی میر نے ''انداز'' کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے ''اسے ہم لوگوں نے اختیار کیا ہے جو تمام صنائع پر محیط ہے، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، گفتگو کی صفائی، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ یہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ فقیر بھی اسی وتیرے سے خوش ہے''۔ (اردو ترجمہ) میر نے مزید وضاحت کی ہے ''جو شخص اس فن میں طرزِ خاص کا مالک ہے میرا مطلب سمجھتا ہے۔ عوام سے مجھ کو سروکار نہیں۔ احباب کے لیے میرا قول سند ہے ہر شخص کے لیے نہیں کیونکہ میدانِ سخن وسیع ہے اور چمنستانِ ظہور کا تلون آشکار ہے''۔ (اردو ترجمہ) چنانچہ چوتھی اور چھٹی شق سے ظاہر ہے کہ میر صرف ان فارسی ترکیبوں کا صرف جائز سمجھتے تھے جو زبانِ ریختہ کے موافق ہوں اور اس کی شناخت کے لیے انھوں نے سلیقۂ شاعر کو ضروری قرار دیا۔ نیز اس ''انداز'' کو جو تمام صنائع پر محیط ہے میر نے اپنا طرزِ خاص کہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میریات کی تنقیدی بحث میں اس پہلو کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا۔ میر کو خدائے سخن تو سب نے تسلیم کیا، ان کی بارگاہِ عظمت میں سر بھی سب نے جھکایا، اور ان کی شہرت کا ڈنکا بھی بجتا رہا، لیکن میر کی تنقیدی بازیافت کی راہ میں حالی، مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی نے جو بنیادی اقدام کیے، اگر چہ مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی دونوں کے پیشِ نظر نکات الشعرا کا یہ بیان تھا، تاہم اردو کی ابتدائی تنقید محمد حسین آزاد کی اس مغالطہ آمیز رائے سے دھوکا کھاتی رہی۔ ''انھوں نے جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی اتنا ہی بلاغت کو کم کیا''۔ یوں میر کی سادگی نظروں میں رہی اور میر کے کمال کی دوسری جہات پوری طرح زیرِ بحث نہیں آئیں بالخصوص وہ چیز جسے میر نے ''انداز'' سے تعبیر کیا تھا جو صرف لفظوں کی سادگی، سلاست، صفائی، گھلاوٹ سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ کسی حد تک اس کی ضد تھی۔ سید عبداللہ نے میر کے ''انداز'' سے بحث کی لیکن انھوں نے بھی اصرار سادگی ہی پر کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اثر لکھنوی نے میر کے بعض اشعار کا بہت اچھا معنوی تجزیہ کیا۔ انھیں میر سے سچی عقیدت تھی لیکن ان کی معنوی وضاحتیں تجزیے سے زیادہ کیفیات کا اظہار ہیں۔ بہت زور مارتے ہیں تو ان کی تان ایسے بیانات پر ٹوٹتی ہے: ''میر کے یہاں عجیب وغریب سلاست و روانی ہے، درد و خستگی ہے اور بس''۔ اس میں شبہ نہیں یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ میر کے یہاں سادگی، سلاست، درد و خستگی بھی ہے، ان کے اکثر اشعار سہلِ ممتنع بھی ہیں، لیکن بات صرف اتنی نہیں۔ اسلوبِ میر کی اور جہتیں بھی ہیں اور جب تک ان سب کو نظر میں نہ رکھا جائے میر کے ''انداز'' کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میر اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اردو کی جتنی شانیں، جتنے ذیلی اسالیب اور جتنی لسانی جہات ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ غالب اور اقبال کی عظمت مسلم، لیکن غالب یا اقبال کے شعری اسالیب میں اتنا لسانی تنوع نہیں ہے۔ تاریخ کے مختلف لمحات میں رائج ہونے والے مختلف اسالیب کے مختلف دھاروں کے

باہم موجزن ہونے سے جو کیفیت میر کے یہاں پیدا ہوتی ہے، بعد میں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اقبال کے شعری اور معنیاتی اسلوب کا جو رشتہ غالب سے ہے وہی رشتہ غالب کے شعری اسلوب کا میر سے ہے۔ غالب کی بہار ایجادیِ بیدل اپنی جگہ پر لیکن مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح وضاحت کی ہے کہ غالب کے شعری اسلوب کے اکثر حوالے میر سے نکلتے ہیں۔ میر کے یہاں شعری زبان کی وہ کیفیت بھی موجود ہے جو گنجینۂ معنی کی طلسم کاری سے عبارت ہے جسے غالب نے منتہاے کمال کو پہنچا دیا اور علاوہ اس کے میر کے یہاں دوسری شانیں بھی ہیں۔ میر کی پہچان بالعموم سادگی اور سلاست والی شان سے ہوتی رہی ہے جو تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ میر کی زبان کا سب سے بھرپور تجزیہ وحیدالدین سلیم نے کیا تھا۔ یہ تجزیہ گرامر کی حد تک جامع ہی نہیں مانع بھی ہے۔ ان کا یہ مضمون اس حد تک Seminal ثابت ہوا کہ بعد میں میر کی زبان کی ساری بحثیں اسی سے متاثر رہیں۔ لیکن یہ تجزیہ صرف لفظی اور صرفی نوعیت کا ہے۔ لفظیات اور صرفیات کے امتیازات کس طرح شعر کا حصہ بنتے ہیں اور میر کے یہاں ان سے کیا جادو پیدا ہوتا ہے، یا میر کے یہاں اندازِ شعر کی تشکیل میں ان عوامل کی کارفرمائی کیوں کر ہوتی ہے، اس کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا اور شاید اس لیے بھی نہیں کیا کہ ان کے زمانے میں زبان کے تجزیے کے جو محدود تصورات تھے، وہ ان سے آگے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔

بنیادی اسلوبیاتی امتیازات: اندازِ میر کی بحث میں یہ بات خاطرنشان رہنی چاہیے کہ کسی ایک مثال یا ایک طرح کی مثالوں سے میر کے انداز کو سمجھنا سطحیت کو راہ دینا ہے۔ ایسی کوئی کوشش یک طرفہ، ادھوری اور یک رخی ہوگی۔ چنانچہ اس کے لیے ایک طرف نہیں بلکہ بیک وقت کئی اطراف میں دیکھنا ضروری ہے۔ کچھ باتیں تجزیے اور وضاحت کی زد میں آتی ہیں اور کچھ نہیں بھی آتیں۔ تاہم منطقی زبان کی یہ کمزوری ہے کہ جب بحث کی جائے گی تو Serial ہوگی۔ لیکن یاد رہے کہ اسلوبیاتی امتیازات ہرگز Serial نہیں ہوتے۔ یہ پرت در پرت بیک وقت وارد ہوتے ہیں اور اس حد تک باہم دگر مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور یہ تخلیقی عمل کے منافی بھی ہے، تاہم بحثِ شعر میں یہ عمل ناگزیر ہے۔ یہاں پہلے میر اور غالب کی ایک ایک ہم طرح غزل کو لیا جاتا ہے۔ مزید گفتگو اس کے بعد ہوگی۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام

کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
ایسے آہوے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا
ساقی نے از بہرِ گریباں چاکیِ موجِ بادۂ ناب
تارِ نگاہِ سوزنِ مینا رشتۂ خطِ جام کیا
مہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتل تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسد
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

میر کی غزل ان کی ابتدائی غزلوں میں ہے اور دیوانِ اول میں شامل ہے۔ اس میں کل پندرہ شعر ہیں جن میں سے صرف گیارہ کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔ غالب کی غزل بھی ابتدائی دور سے متعلق ہے اور نسخۂ حمیدیہ میں ملتی ہے۔ ان غزلوں کا موازنہ کرتے ہوئے سید عبداللہ نے لکھا ہے "ان مماثل غزلوں میں ایک آدھ شعر کے سوا مضمون اور اسلوب کی کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب اس غزل کی رواں دواں اور پرجوش و پرترنم بحر سے محظوظ ہوئے مگر اس دل

بستگی کے باوجود میر کے سب قوافی غالب سے نبھ نہیں سکے۔ غزل کو پانچ اشعار تک پہنچا کر ختم کر دیا ہے۔ میر کی پرتاثیر غزل کے مقابلے میں غالب کی یہ غزل محض چند رنگین الفاظ کا مجموعہ ہے مگر اس سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی فطرت اپنے لیے کسی مقامِ بلند کی تلاش میں پیچ و تاب کھا رہی ہے اور کسی روشن مستقبل کے لیے آمادہ ہو رہی ہے"۔ (نقدِ میر ۲۸۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں غزلیں اپنے اپنے اسلوب کی نمائندہ ہیں۔ غالب کے مطلع میں اسما اور اسماے صفات نو ہیں: وحشی، صیاد، رم خوردوں، رشتہ، چاک، جیب، دریدہ، قماش، دام۔ میر کے یہاں کیا ہے؟ پہلے مصرع میں تدبیریں اور دوا اور دوسرے میں بیماری دل اور ان کی ساخت یوں ہے، تدبیروں کا الٹا ہو جانا، دوا کا کام نہ کرنا اور بالآخر بیماری دل کا کام تمام کرنا۔ آپ نے دیکھا شعر میں صرف تین اسما ہیں اور تین نحوی اکائیاں ہیں اور ہر ایک کی تکمیل فعل سے ہوتی ہے۔ ان تینوں افعال کو "دیکھا" کے صرف سے جو بجائے خود ایک فعلیہ اکائی ہے شاعر نے بیماری دل کے آخر کام تمام کرنے کی معنویت کو پوری طرح راسخ کردیا۔ غالب کے یہاں دوسرے شعر میں بھی دس اسما ہیں، جبکہ میر کے یہاں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بالعموم شعر کے دو مصرعوں میں دو نحوی واحدے ہوتے ہیں یا اگر ایک مصرع دوسرے سے نحوی اعتبار سے جڑا ہوا ہو تو ایک ہی نحوی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میر کے یہاں ایسا نہیں، طویل بحر کی اس غزل میں تین تین چار چار نحوی ٹکڑے ملیں گے: الٹی ہوگئیں سب تدبیریں / کچھ نہ دوا نے کام کیا / دیکھا / اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا / اسی طرح / عہد جوانی رو رو کاٹا / پیری میں لیں آنکھیں موند / یعنی رات بہت تھے جاگے / صبح ہوئی آرام کیا۔ یہ پہلا خطِ امتیاز ہے جو میر اور غالب کے اسالیب کے بیچ کھینچا جاسکتا ہے۔ یعنی میر کی زبان میں اسما یا اسماے صفت کی بھرمار نہیں۔

دوسرے یہ کہ میر کے یہاں طویل بحروں میں بھی چھوٹے چھوٹے نحوی واحدے ہیں جو معنیاتی Nodes کی طرح کام کرتے ہیں اور فوری ترسیل جذبات یا تاثیر میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

تیسرے اسما کی قلت و کثرت سے مضاف اور مضاف الیہ کا رشتہ اور اضافت کا کردار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سامنے کی بات ہے لیکن غیر اہم نہیں ہے۔ غالب کا ہر ہر شعر اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اسلوب میر میں الٹی ہوگئیں، رو رو کاٹا، آنکھیں موند، ہاتھ میں لاکے چھوڑ دیے، بھولے اس کے قول و قسم پر، وحشت کھوئی، قشقہ کھینچا، سے صاف ظاہر ہے کہ میر کی زبان اپنی طاقت دھرتی کی گہرائیوں میں پیوست پراکرتوں کی جڑوں سے بھی حاصل کر رہی ہے۔ غالب کی زیرِ نظر غزل میں ایک بھی معکوسی یا ہکار آواز نہیں آئی۔ کیوں؟ کیا اس سے اردو زبان کے صرف ایک رخ کی تصویر سامنے نہیں آتی؟ یہ بات نہیں ہے کہ غالب کی ساری شاعری میں ایسی امتیازی آوازیں نہیں آتیں، آتی ہیں لیکن کم کم۔ میر کے یہاں ان کا عمل دخل فطری ہے جسے اردو کے اردوپن یا ٹھیٹھ پن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسلوب میر کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ میر جس طرح فطری زبان کو شعری زبان کے درجے تک لے آتے ہیں اور اسے شعر میں کھپاتے ہیں وہ الگ بات ہے۔

پانچویں یہ کہ میر کے یہاں مصوتوں کا استعمال اور بالخصوص طویل مصوتوں کا استعمال دوسرے صاحب اسلوب شعرا کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ میر کے یہاں قوتِ پرواز بھی ہے اور گم شدگی، سپردگی اور حیرت و استعجاب کی کیفیتیں بھی لیکن زبان

کے معاملے میں دھرتی سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ موسیقی کے نظام کی طرح ہمارے عروضی نظام میں بھی یہ گنجائش ہے کہ زمانی وقفے تو مقرر ہیں لیکن آوازیں مقرر نہیں۔ چنانچہ مصوتوں کی تعداد فنکار کی تخلیقی قوت کے زیر اثر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے بحروں کے صرف میں شاعر کی انفرادی شان اور انفرادی ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے عروضی نظام کی بنیاد حرف پر ہے۔ یہ مصمتوں اور طویل مصوتوں میں فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر بڑے شاعر کے یہاں ان کے صَرف کی شان الگ ہی ملے گی۔ اس کا ثبوت میر کی مندرجہ بالا غزل کے ہر ہر شعر سے مل جاتا ہے۔ یوں دیکھیے تو یہ خصوصیت پہلی بنیادی خصوصیت سے بڑی حد تک جڑی ہوئی ہے کیونکہ جہاں نحوی واحدے زیادہ ہوں گے طویل مصوتے بھی افعال کے درآنے سے لامحالہ زیادہ ہوں گے۔ اس بحث کے بعد اب میر کے اشعار کو کہیں سے بھی لیجیے اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کی نحو پر بھی نظر رکھیے اور دیکھیے کہ ان میں نحوی واحدے کس کثرت سے ہیں اور انھیں کتنی آسانی سے الگ کیا جاسکتا ہے۔

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی/ نازک ہے اسرار بہت
انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی/ لیکن ہے بستار بہت

گرچہ کب دیکھتے ہو/ پر دیکھو
آرزو ہے/ کہ تم ادھر دیکھو

گلی میں اس کی گیا/ سو گیا/ نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

اب کے بہت ہے شور بہاراں/ ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں/ دھومیں ہم کو مچانے دو

کہتا تھا کسو سے کچھ/ تکتا تھا کسو کا منھ
کل میر کھڑا تھا یاں/ سچ ہے/ کہ دِوانا تھا

Oral روایت کا آخری شاعر/ سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی: میر کا زمانہ آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے کا زمانہ تھا۔ میر کے اواخر عمر میں چھاپے خانے کی ابتدا ہوگئی تھی لیکن خود میر کا کلیات فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ میں چھپ کر تیار ہوا۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ میں ہوا تو گویا خود انھوں نے اپنا کلیات چھپا ہوا نہ دیکھا ہوگا۔ چھاپے خانے کے اثر سے اردو شعر و ادب کے اسالیب پر جو زبردست اثر پڑا اس کو ابھی پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس وقت تک ہمارے ادب کی بہت سی روایتیں نثر میں بھی اور شعر میں بھی کہنے اور سننے کی روایتیں تھیں۔ بعد میں یہ روایتیں رفتہ رفتہ چھپی ہوئی

تحریری کی روایتوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ داستان سے ناول کی طرف گریز میں سب سے بڑی عمل کاری شاید اسی عنصر کی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو شاید میر اردو غزل میں کہنے اور سننے کی Oral روایت کے آخری امین ہیں۔ وہ بار بار اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ میر کے اشعار میں باتوں کا انداز پایا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں ''بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں''۔ سید عبداللہ نے لکھا ہے ''میر لکھنے سے زیادہ کہنے کے قائل ہیں۔ اس لیے وہ بات اور گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں''۔ مثلاً

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

میر جا بجا میاں، پیارے، ارے، صاحب، رے کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے بجائے تم اور بعض جگہ بول چال کی بے تکلفی میں تم کے بجائے تو بھی لاتے ہیں۔ میر، میر صاحب، میر جی بھی گفتگو میں تخاطب کے لیے خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری کا عام انداز یہ ہے گویا باتیں کر رہے ہیں (میر کے یہاں بات یا باتیں سے مراد شعری نکتہ، یا شعر بھی ہے)۔

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مشہور ہیں عالم میں تو کیا، ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں، بہت نہ پیار آئے

میر شاعری کے تحریری پہلو کے نہیں سننے یا سنانے کے انداز کے نمائندہ ہیں۔ جگہ جگہ انھوں نے اپنی باتوں کو کہانی یا رام کہانی سے بھی تعبیر کیا ہے۔

فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی سنا کرتے ہیں

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

سہلِ ممتنع اور طبیعت کی روانی / میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی/: میر کے سلسلے میں سہل ممتنع کا تذکرہ سب نے کیا ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں سہلِ ممتنع کی داد یوں دی ہے کہ جس کو دیکھ کر خیال ہو کہ ایسا کہنا بہت آسان ہے، لیکن جب کہنے کی کوشش کی جائے تو ناممکن ہو۔ اس سہلِ ممتنع کا اسلوبیاتی پہلو یہ ہے کہ میر کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ بحر اور وزن کی ضرورتوں کے تحت نحوی ترتیب میں تقدیم وتاخیر ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس کی بھی اپنی حد بندیاں ہیں اور جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں بعض نحوی حدود کے اندر ہوتی ہیں۔ لیکن میر کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں اگرچہ کہیں کہیں ضرورتِ شعری کے تحت ایک آدھ لفظ آگے پیچھے آتا ہے لیکن جس بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے ان کی قدرتِ کلام کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذیل کے اشعار میں یہ بھی دیکھیے کہ دو مصرعوں میں دو Nodes کا وقوع فطری ہے (اگر مصرعے نحوی طور پر مربوط ہوں یعنی ایک میں خبر ہو اور دوسرے میں مبتدا تو Node ایک ہی ہوگا) لیکن میر کے یہاں اکثر و بیشتر تین تین یا اس سے زیادہ Nodes ملتے ہیں۔ یہ بالذات نحوی واحدے اور ان کی فطری ساخت سہلِ ممتنع کی وہ اسلوبیاتی بنیاد ہے جس کی وضاحت شعریات کی قدیم روایت میں ناممکن تھی جیسا کہ مولوی عبدالحق نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ''میر کا کلام بہ لحاظِ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کا تجزیہ کرکے الگ الگ اس کی خوبیوں کا گنوانا ناممکن ہے''۔

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کی یہ روایت خاصی دلچسپ ہے کہ عنفوانِ جوانی میں جب میر جوشِ وحشت میں مبتلا ہوئے تو

ہرزہ گوئی پر راغب ہوئے بلکہ رسوائی خاص و عام پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کاروبار تھا۔ خانِ آرزو نے کہا ''اے عزیز دشنامِ موزوں دعائے ناموزوں سے بہتر ہے۔ اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیع شعر خوشتر ہے۔ چونکہ موزونی طبیعت جوہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہوگئی۔ بعد اصلاحِ دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا''۔ دشنام طرازی والی بات صحیح ہو یا نہ ہو لیکن ایک احتجاجی کیفیت اور لہجے کی گھلاوٹ اور دردمندی کے باوجود ایک دبی دبی تلخی میر کی شاعری میں ہے۔ اس کا گہرا رشتہ ان کے جوشِ طبیعت اور تخلیقی اپج سے ہے۔ اس روایت میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ''موزونی طبیعت جوہر ذاتی تھی''۔ بول چال کی جس نحوی ترتیب کا ذکر اوپر کیا گیا اس کا گہرا تخلیقی رشتہ میر کی حد درجہ موزونی طبیعت اور شدید نوعیت کی روانی کلام سے مل جاتا ہے۔ جب تک طبیعت میں شدید ابال نہ ہو اور تخلیقی موجیں اندر ہی اندر پیچ و تاب نہ کھاتی ہوں اور ان میں اظہار کے لیے تلاطم برپا نہ ہو لفظ شدت سے شعر کا قالب اختیار نہیں کرتے۔ میر کے یہاں بعض بعض مضامین مثلاً لہو میں نہانا، خون میں ہاتھ رنگنا، آنسوؤں کا سیلاب بن کے بستیوں اور آبادیوں کو بہا لے جانا یا جنگل کو میراب کرنا، عاشق کا بگولہ، دھواں یا غبار بننا، سایۂ دیوار میں بیٹھنا، دل کے اجڑے نگر میں اکیلے چراغ کا جلنا، ہڈی ہڈی کا گلنا، استخواں کانپ کانپ جلنا، دل کے مکاں کا اجڑنا، ہڈیوں کا مٹی میں مل جانا، نقشِ پا یا استخوانوں کا بولنا، خاک سے پھول بن کر نمودار ہونا، یہ اور ایسے بعض دوسرے مرکزی مضامین بار بار بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بعض جگہ پیکروں کی بھی تکرار ہے۔ لیکن کسی بھی بحر کا تقاضا یا قافیے کی ضرورتیں میر کی طبیعت کو بند نہیں کر پائیں۔ بحر کوئی ہو، قافیہ کچھ ہو میر کا جوشِ طبیعت ایسی تمام پابندیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ اور ایک کیفیت سے کیا کیا کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ میر کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ روایت نے انھیں بہتر نشتروں کا شاعر مشہور کر دیا۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ سے منسوب قول بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست اتنا مشہور ہوگیا کہ اکثر یہ سمجھا جانے لگا کہ چند مشہور اشعار کو چھوڑ کر باقی کلام رطب و یابس سے بھرا پڑا ہے۔ حالانکہ صدرالدین آزردہ سے جو اصل روایت تھی وہ یوں تھی: ''پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلنداست''۔ حق بات یہ ہے کہ میر کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے/قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں۔ میر کے پہلے دو دیوانوں میں تمام و کمال، تیسرے اور چوتھے دیوان میں بڑی حد تک اور پانچویں اور چھٹے دیوان میں کسی حد تک میر کے جوشِ طبیعت اور شدید نوعیت کی روانی کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ میر نے بار بار اپنی ''طبعِ رواں'' کا ذکر کیا ہے۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ ''میر شاعر بھی زور کوئی تھا''۔ اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اصل صناعی یہی ہے کہ اگر بات نہ بنتی ہو تو بھی موزوں طبعاں اس کو بنا دیتے ہیں۔

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ تو بھی بنا دیتے ہیں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر

صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
در سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

نحوی ساختیں جملوں سے قریب/ بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے : میر کی شاعری کی نحوی ساختیں غیر معمولی موزونی طبیعت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ زبان کی عام ساختوں سے بے حد قریب ہیں۔ جملوں اور لفظوں کی ترتیب گفتگو کی ترتیب سے دور نہیں۔ اگر کہیں کچھ ردوبدل ہوا بھی ہے تو معمولی لیکن ہر جگہ شعریت کا حق ادا ہوگیا ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ
ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج
ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز
کہیں دیکھا تھا تجھ کو دریا پر

گوش کو ہوش سے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

میر کی سادگی نظر کا دھوکا: میر کی نحوی سادگی جس سے حصۂ اول میں بحث کی گئی، دراصل نظر کا دھوکا ہے۔ بالعموم اس نحوی سادگی کو معنوی سادگی بھی سمجھ لیا گیا جو غلط ہے۔ میر کے یہاں جو بول چال کا پیرایہ یا گفتگو کی نحوی ترتیب کا انداز ہے، اس سے شاعری کی زبان کے بارے میں ایک بنیادی سوال کو راہ ملتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہوتی۔ شاعری کی زبان جتنی بول چال کی زبان سے ہٹی ہوئی ہوگی یا اس سے گریز کرے گی اتنی ہی زیادہ وہ شاعری کا حق ادا کرے گی۔ غالب اور اقبال کے اسالیب اس حقیقت کی روشن ترین مثالیں ہیں۔ میر نے لہجۂ عام پر اصرار کیا اور سودا کے طرز اور اپنے عہد کے مقبولِ عام رواج ایہام گوئی کو رد کیا اور عمداً ''باتوں'' کا انداز اختیار کیا۔ پھر ان کی زبان شاعری کی زبان کیونکر ہوئی؟ اور یہ شاعری ساحری کے درجہ پر کیسے پہنچی۔

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

میر کی زبان بار بار یہ سوال پوچھتی ہے کہ لہجۂ عام یعنی معمولی ریختے کو جو بقول معیار سازوں کے اس وقت عیب ہی عیب تھا، میر نے اس عیب کو ہنر کیسے کیا:

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

اور دُر سے ہزار چند آب میر نے اپنے اشعار میں کیسے پیدا کی۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں: میر کے یہاں اگر ''بول چال کی زبان'' ہے اور کوئی خاص ''طرز'' بھی نہیں تو پھر موتی پرونے کا راز کیا ہے؟ یہ سوال شعری زبان کے جن امکانات پر توجہ کی دعوت دیتا ہے ان میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ بول چال کی زبان شاعری کی زبان نہیں ہوتی لیکن شاعری کی زبان میں بول چال ہو سکتی ہے اور اس کا حق ادا کرنا سلیقۂ شاعر پر موقوف ہے۔ میر کا اصل کارنامہ جو بالعموم فریبِ نظر کی کیفیت پیدا کرتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے لہجۂ عام کو اپنایا لیکن اسے لہجۂ عام کی سطح پر برتا نہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ بول چال کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت کام کرتی ہے۔ اس میں لفظ محض لفظوں کی طرح کام کرتے ہیں اور صرف وہی معنی ادا کرتے : جو ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان کا یہ بنیادی فرق کہ بول

چال کی زبان صرف اپنی اوپری ساخت کے ذریعے کام کرتی ہے، دوررس نتائج کا حامل ہے کیونکہ شاعری کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت نہیں بلکہ اس کے علاوہ داخلی ساخت اور بعض اوقات کئی کئی داخلی ساختیں کام کرتی ہیں۔ میر نے نکات الشعراء میں اپنے ''انداز'' کی وضاحت کرتے ہوئے صرف صنائع کا ذکر کیا تھا یعنی تجنیس و ترصیع وتشبیہ و ادابندی وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعری زبان کی داخلی ساختوں میں نہ صرف یہ بلکہ بدیع و بیان کے جملہ منضبط اور غیر منضبط وسائل کام میں آتے ہیں۔ صنعتوں کے محدود تصور سے ہٹ کر داخلی ساختیں ایسے ایسے جہانِ معنی آباد کرتی ہیں اور ایسے ایسے احساسات و جذبات وتصورات وخیالات کے دروازے کھول دیتی ہیں جن تک پہنچتے ہوئے زبان کی اوپری ساخت کے پر جلتے ہیں اور جنھیں صرف ملفوظی مجازی واسطوں ہی کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے۔ زبان کا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے اور جہانِ معنی لامحدود۔ فرائڈ کے ایک نئے ترجمان اور فرانس کے نئے فلسفی Jacques Lacan نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ زبان کی ساخت انسانی لاشعور کی ساخت کا ثنیٰ ہے۔ Language is structured like the unconscious چنانچہ زبان کے دھندلے خطے اس کے روشن خطوں سے کہیں زیادہ کارگر ہیں۔ ان کی وسعتیں اور پہنائیاں لامحدود ہیں اور انسانی ذرائع سے ہم انھیں ناپ نہیں سکتے۔ غور فرمایئے کہ یہ بات عام زبان کے لیے کہی گئی ہے جس کا کل ذخیرۂ الفاظ چند سو صفحوں کے ایک لغت میں سماجاتا ہے۔ کسی بھی فنکار کا کمال زبان کے اس معمولی ذخیرے سے غیر معمولی محسوسات اور خیالات کا چراغاں کرنے میں ہے۔ فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی اور نئی نسل کے شعرا کی میر تقی میر سے عقیدت بے وجہ نہیں۔ فراق کا یہ کہنا کہ ''میر کے یہاں ہر معمولی بات جتنی معمولی ہوتی ہے اتنی ہی غیر معمولی بن جاتی ہے'' اس بات کا اعتراف ہے کہ میر کے یہاں عام زبان عام زبان نہیں رہتی۔

داخلی ساختوں کا شعری تفاعل/کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ/ر: میر کے یہاں عام زبان کی شعری تقلیب ہوتی ہے تب کہیں جا کر وہ موتی کی لڑی بنتی ہے یا جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ تقلیب کا عمل اصلاً ربط و تضاد، رشتوں یا مناسبتوں کا عمل ہے جس میں ذہن ایک چیز سے دوسری کی طرف یا دوسری سے تیسری کی طرف یا اس کی خوبیوں یا خصائص کی طرف یا ان کے رشتوں یا ضد کی طرف راجع ہوتا ہے۔ ان رشتوں کے کئی نام ہیں، تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ، رمز، مجاز، علامت، پیکر، تجنیس، تضاد وغیرہ۔ میر کا اعجاز یہ ہے کہ عام بول چال کی زبان کی اوپری ساخت میں وہ ایسی خاموشی سے داخلی ساختوں کو لے آتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے کو گمان تک نہیں ہوتا اور وہ عام زبان کو اعلیٰ ترین شعری زبان کا درجہ دے دیتے ہیں۔ میر کا کوئی شعر کہیں سے لیجیے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

بظاہر یہ بول چال کی زبان ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ بول چال کی زبان ہے؟ بظاہر گفتگو کا پیرایہ ہے لیکن کیا اس کے پیچھے ایک جہانِ معنی پوشیدہ نہیں؟ یوں روایتی طور پر دیکھیں تو گل، کلی، کلی کا تبسم کرنا یعنی کھلنا میں ایسی رعایتیں ہیں جو عام

زبان کو شعری زبان کا درجہ دیتی ہیں، لیکن روایتی صنعتوں کا تصور اپنے تحدد کی وجہ سے زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتا، اس نوع کی صنعتیں تو بالکل بے روح شعر میں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ جبکہ درحقیقت جو چیز عام زبان کو شعری زبان بناتی ہے وہ داخلی ساختوں کا وہ تفاعل ہے، جس کے ذریعے ایک محدود تجربہ کسی لامحدود صداقت کا خزینہ دار بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مکالمہ جاندار اور بے جان میں ہے۔ اس طرح کا مکالمہ روزمرہ کی زبان میں جہاں بالعموم زبان کی خارجی ساختیں کام کرتی ہیں، ممکن ہی نہیں۔ ایک جاندار کا بے جان سے خطاب کرنا اور بے جان کا بجائے لفظوں کے محض اپنے عمل سے جواب دینا بجائے خود شعری پیرایہ ہے جو تمثیل کے رشتوں سے جڑا ہوا ہے اور تمثیل، تجسیم یا تشکیل کے رشتے داخلی ساختوں کے معنیاتی عمل در عمل سے وجود میں آتے ہیں۔ شعر میں لطف و اثر تبھی پیدا ہوتا ہے جب خارجی ساختیں داخلی ساختوں کے ساتھ مل کر بیک وقت کام کرتی ہیں۔ گل شاخ پر کھلنے والا پھول بھی ہے اور حسن و رنگ و بو کا استعارہ بھی۔ اس طرح کلی کا تبسم کرنا اس کا محض کھلنا بھی ہے یعنی کلی کا پھول بننا بھی ہے اور حسن کا اپنے کمال یعنی شباب کو پہنچنا بھی۔ نیز پھول کی کیفیت سے اس کا لمحاتی ہونا بھی مراد ہے اور حسن کا بے ثبات اور ناپائدار ہونا بھی۔ ان میں کوئی معنی خارجی یا داخلی بالذات طور پر یعنی منفرد طریقے سے قائم نہیں ہوتا۔ ہر ہر معنی دوسرے معنی سے اپنا وجود پاتا ہے اور دوسرے کے رشتے میں بندھا ہوا ہے اور ایک رشتہ دوسرے رشتہ کو راہ دیتا ہے اور یوں معنی در معنی کا نظام روشن ہو اٹھتا ہے۔ سوال ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔ کلی اس کا جواب نہیں دیتی، بس سن کر تبسم کرتی ہے۔ تبسم کرنا کی داخلی ساخت ہے کھل کر پھول بننا اور کھل کر پھول بننا کی داخلی ساخت ہے اوج کمال پر پہنچنا اور اوج کمال پر پہنچنے کی داخلی ساخت ہے زوال کی طرف راجع ہونا اور زوال کی طرف راجع ہونا کی داخلی ساخت ہے موت کی طرف قدم بڑھانا۔ کلی کے مسکرانے کے عمل میں کئی دوسری معنیاتی داخلی ساختیں بھی ہیں۔ یعنی جو بات پوچھنے کی نہ ہو، اس پر بھی مسکرا دیتے ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے۔ کلی جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کرتی۔ بس مسکرا دیتی ہے۔ یہ مسکراہٹ تحقیر آمیز بھی ہوسکتی ہے کہ بھئی سامنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات بس اتنا ہے جتنی دیر میں کلی کھل کر پھول بنتی ہے۔ نیز ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پھول سے پژمردگی، یا جوانی سے بڑھاپے، یا زندگی سے موت، یا خوشی سے دکھ کا فاصلہ بس اتنا ہی ہے جتنی دیر میں کلی کھلتی ہے۔ تبسم میں مسرت و نشاط کی اور کلی کے پھول بننے اور پھر مرجھانے میں زوال اور الم ناکی کی جو کیفیت ہے اور ان کیفیتوں کے معنوی ساختیوں میں جو تضاد اور تناؤ ہے وہ بھی معنیاتی نظام کو لطف و حسن عطا کرتا ہے۔ اگرچہ شعر کا مضمون انتہائی پیش پا افتادہ ہے یعنی زندگی بے ثبات ہے یا ناپائدار ہے، لیکن میر نے اسے تمثیلی پیرایہ دے کر انوکھی کیفیت سے سرشار کر دیا ہے۔ پہلے مصرع میں استفہام کا لہجہ ہے، دوسرے میں بصری پیکر ہے۔ لیکن تمثیل کا نظام اصلاً قائم ہوتا ہے گل، کلی اور تبسم کی داخلی ساختوں کے عمل سے جن سے معنی در معنی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور مضمون کے پیش پا افتادہ ہونے کے باوجود شعر حسن و لطف کا شاہکار بن گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں شعر میں نشتریت پیدا ہوگئی ہے۔ بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ شعر بول چال کی زبان میں ہے، لیکن یہاں زبان محض بول چال کی سطح پر کام نہیں کرتی بلکہ شعری وسائل کو بروئے کار لا کر داخلی ساختوں کو انگیز کرتی ہے۔ یہ بول چال کی زبان

کا نہیں شعری زبان کا تفاعل ہے۔ غرض بول چال کی زبان صرف معنی قائم کرتی ہے جبکہ شعری زبان معنی در معنی کا ایسا پہلودار نظام قائم کرتی ہے جو شعری لطف یا جمالیاتی حسن پیدا کرتا ہے۔ یہ حسن کاری بول چال کی زبان سے کوسوں آگے کی بات ہے۔ پس معلوم ہوا کہ میر کے یہاں بول چال کی زبان میں شاعری نہیں بلکہ شاعری کی زبان میں بول چال ہے۔ یعنی میر کے یہاں بول چال کی زبان کی شعری تقلیب ہوتی ہے۔ صاحب طبقات الشعرا نے صحیح داد دی تھی ''ہر چند سادہ گواست اما در سادہ گوئی پرکاری ہا دارد'' اردو تنقید نے پہلے حصے کو یاد رکھا دوسرے کو فراموش کردیا۔ اگرچہ خود میر نے اس رویہ کے خلاف صاف لفظوں میں خبردار کیا تھا۔ میر کے اس شعر کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

میر کے یہاں عام زبان عام زبان نہیں رہتی۔ وہ گویا ان کے چھو دینے سے حسن شعر سے برتیا جاتی ہے۔ یہ چند اشعار مزید دیکھیے۔ بظاہر یہ بول چال کی زبان میں ہیں لیکن ملاحظہ ہو کہ عام زبان کی کیسی تقلیب ہوئی ہے اور معنیاتی نظام کس طرح داخلی ساختوں کے شعری تفاعل سے روشن ہو اٹھتا ہے۔

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ڈوبے اچھلے ہے رات بھر خورشید
اس نے دیکھا ہے تجھ کو دریا پر

رنگِ گل و بوے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن کا ساغر بھرا لہو کا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ملاحظہ ہو خود میر کو اپنے "دلِ پرشور" اور اپنی "صناعی" کا کتنا گہرا احساس تھا:

خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

صوتِ جرس کی طرز بیاباں میں ہائے میر
تنہا چلا ہوں میں دلِ پرشور کو لیے

تھا بلا ہنگامہ آرا میر بھی
اب تلک گلیوں میں اس کا شور ہے

(۳)

میر کی سادگی پر اس قدر زور دیا گیا کہ میر کے شعری اسلوب کے دوسرے بہت سے پہلو نظر انداز ہو گئے۔ میر کی شاعری بحرِ ذخار ہے۔ مولوی عبدالحق اور اثر لکھنوی نے جب میر کی تنقیدی بازیافت شروع کی تو شاید سادگی و سلاست پر اصرار کی ضرورت بھی تھی کیونکہ یہ سامنے کی چیز تھی لیکن تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لے سید عبداللہ تک چلی گئی ہے۔ "اس میں شک نہیں کہ میر جہاں اپنی غزل میں فارسیت کا رنگ پیدا کرنے پر اتر آتے ہیں، اس میں بھی ایک بات پیدا ہو جاتی ہے، مگر جو اثر ان کے اصلی رنگ میں ہے، وہ اس میں نہیں۔ ذیل کی غزل

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

صنائعی لحاظ سے مکمل اور بے عیب ہے۔ غزل کو پڑھ کر کلیم یا سلیم کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر ان اشعار میں وہ اثر موجود نہیں جو عام طور پر میر کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ (نقدِ میر ۲۲) تعجب ہے کہ سید عبداللہ جیسے سخن فہم نے جنھوں نے میریات کی کئی منزلیں سر کی ہیں، اس غزل کے ایسے اشعار کو کس طرح نظر انداز کر دیا۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

اکثر و بیشتر میر فارسی تراکیب کو نہایت خوبی سے کھپاتے ہیں۔ اثر لکھنوی نے صحیح اشارہ کیا ہے کہ بہت سی ترکیبیں مثلاً کاوکاو/ یک قطرۂ خوں/ سادہ و پرکار/ شیشہ باز/ یک بیاباں/ ہنگامہ گرم کن/ حریفِ نبرد/ حریفِ بے جگر وغیرہ جن کے وضع کرنے کا سہرا غالب کے سر باندھا جاتا ہے، میر کی دست نگر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ طرز جو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی داغ بیل میر ڈال گئے تھے۔

حریفِ بے جگر ہے صبر، ورنہ کل کی صحبت میں
نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

فارسی آمیز لہجہ کی خوش امتزاجی اور نشتریت / میر صناع ہے ملو اس سے / : ایسے اشعار کا سیدھا اسلوبیاتی رشتہ غالب کی مخصوص شعری ساختوں تک چلا گیا ہے لیکن میر کے دواوین میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں فارسیت اور بول چال کے انداز میں خوش امتزاجی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی ان میں میر کی خوش ترکیبی ریختے کی صرفی و نحوی ساختوں سے ایسی گھل مل گئی ہے کہ شعر کی حسن کاری اور تہہ داری کا بڑا انحصار اسی لسانی خوش امتزاجی پر ہے۔ اگرچہ استثنائی صورتیں مل جائیں گی تاہم میر کو جہاں جہاں ٹھیس لگی اور وہ آبلے کی طرح پھوٹ بہے ہیں انھوں نے سادہ ایمائی لہجہ اختیار کیا لیکن جہاں انکشافِ ذات کی صورت پیدا ہوئی ہے یا ماہیت عالم پر غور کیا ہے یا ذات و کائنات کا فشار محسوس ہوا ہے یا حیرت و استعجاب کے عالم میں ڈوب ڈوب گئے ہیں وہاں اکثر و بیشتر فارسی آمیز پراکرتی امتزاجی پیرائے سے اظہار کا حق ادا ہوا ہے۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اس نوع کے اشعار بھی میر کے بہترین اشعار ہیں اور سادہ ایمائی اشعار کے مقابلے میں ان میں بھی ''نشتریت'' کی کمی نہیں۔

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

موسم آیا تو نخلِ دار میں میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

کچھ گُل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قدکش
اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

مجھ کو دماغِ وصفِ گُل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں

میر کے ہم عصر شعرا نے اور سب سے بڑھ کر خود میر نے فارسی اثرات کو کیسی خوش اسلوبی سے اردو میں کھپایا۔

سینکڑوں ترکیبیں اور محاورے اردو میں کھپ کر اردو کے ہو گئے اور زبان کی تاثراتی جہات روشن تر ہو گئیں۔ خوش آمدن سے خوش آنا، بوکردن سے باس کرنا، سرفرو آوردن سے سرفرو لانا، بروئے کار آوردن سے بروئے کار لانا، تماشا کردن سے تماشا کرنا، ساز کردن سے ساز کرنا، خوکردن سے خوکرنا، نیاز کردن سے نیاز کرنا، تکلیف کردن سے تکلیف کرنا، اسی طرح طرح کردن (طرح کرنا)، بہم رسیدن (بہم پہنچنا)، واشدن (وا ہونا) داغ شدن (داغ ہونا) سرکشیدن (سر کھینچنا) قدم رنجہ کردن (قدم رنجہ کرنا) ترآمدن (ترآنا) راہ غلط کردن (راہ غلط کرنا) وغیرہ سینکڑوں الفاظ اور ترکیبیں اردو میں آگئیں۔ وحیدالدین سلیم نے اپنے تجزیے میں ایسے پورے کے پورے مصرعے فارسی کے نقل کیے ہیں جو میر کے یہاں ملتے ہیں۔ جن کے لیے بعد میں غالب کی شاعری بدنام ہوئی۔ صحرا صحرا وحشت، دنیا دنیا تہمت، عالم عالم عشق و جنوں، شائستۂ پریدن، جوشِ اشک ندامت، صد سخن آغشتۂ خوں، غبار دیدۂ پروانہ، سرنشین راہ سے خانہ، ہنگامہ گرم کن، دلِ غفراں پناہ، حرف زیر لبی، تہہ بال، ستم کشتہ، غنچہ پیشانی جیسی ترکیبیں تو میر کی اردو میں ایسے گھل مل گئی ہیں گویا فارسی کی نہ ہوں اردو ہی کی ہوں۔ آل احمد سرور نے صحیح کہا ہے "میر کے لہجے کی خوش آہنگی اور شیرینی کبھی ماند نہیں پڑتی، ان کے یہاں اضافتوں کے پہاڑ بھی روئی کے گالے معلوم ہوتے ہیں"۔ اضافتیں تو کم کم ہیں البتہ ترکیبیں خوب خوب آئی ہیں۔ وحیدالدین سلیم کہتے ہیں کہ "ان میں سے بعض ترکیبیں یقیناً ایسی ہیں کہ اردو زبان ان کا تحمل نہیں کر سکتی لیکن میر صاحب پر کون حرف رکھ سکتا ہے"۔ یہاں وحیدالدین سلیم سے نکات الشعرا کے شق چار والے بیان کی روشنی میں کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ میر نے کہا تھا "فارسی ترکیبیں ایسی ہونی چاہئیں جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں اور اس بات کو شاعر کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا اور اس کا جاننا سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے"۔ چنانچہ میر کے یہاں اکثر و بیشتر یہ تمام عناصر مانوس و نامانوس، رائج اور غیر رائج، غریب و غیر غریب، یہ سب میر کے تخلیقی آتش کدے میں تپ کر اردو میں ایسے کھپ گئے ہیں کہ اردو کے وجود کا حصہ بن گئے ہیں۔ فارسی عنصر کا جذب و قبول میر کی شاعری کا روشن پہلو ہے۔

ہندی الفاظ کا رس: پوری اردو کا پورا شاعر: میر کی زبان کو دراصل سادگی و سلاست یا فارسیت و مشکل پسندی کی اصطلاحوں کے ذریعے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ درجہ بندی بعد کی شعری روایتوں کی وجہ سے راسخ ہو گئی اور تنقیدی زبان میں میکانکی طور پر برتی جانے لگی۔ میر کا تخلیقی ذہن شاید ان حد بندیوں سے بے نیاز تھا۔ اس لیے ان درجہ بندیوں کی مدد سے میر کی زبان کو سمجھنا میر سے بے انصافی کرنا ہے۔ میر نے اردو کے ایک روپ ایک رخ ایک سطح یا ایک پرت کو نہیں برتا پوری اردو کو برتا ہے۔ مستقبل کی اردو کے تمام شعری امکانات کی سیر میر کے یہاں ہو جاتی ہے۔ میر سے محمد حسین آزاد نے جو روایت منسوب کی ہے کہ انوری و خاقانی کا کلام سمجھنے کے لیے "ان کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میر کے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہلِ اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس سے آپ محروم"۔ اس روایت کا یہ پہلو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جامع مسجد کی زبان کو سند میں لانے کی ضرورت لسانی برتری جتانے کے لیے لکھنؤ میں پیش آئی تھی، ورنہ میر کا لڑکپن آگرے میں گزرا تھا۔ اکبر آباد کی لسانی روایت پر دہلی کی کھڑی بولی کی نہیں بلکہ آگرے کی برج کی

چھاپ تھی۔ میر کے یہاں کبھو، کسو، کچو، لیجو، جد، تد، ان، کن، تک، ٹک، نپٹ، پون، بچن، مکھ، نگر، برہ، سانجھ، تجن، باس، ماٹی، سیکڑوں الفاظ برج کے غیر شعوری لسانی اثرات کی یاد دلاتے ہیں۔ طویل مصوتوں یا خفیف مصوتوں کو کھینچ کر طویل بنانے کا رجحان بھی برج بھاشا کی بھگتی کال کی شاعری کے اثرات کی عام کیفیت ہے۔ البتہ میر کی زبان کی شیرازہ بندی ہوئی دہلی میں اور یہ کھڑ کھڑا کر اور بن سنور کر، جوان ہوئی دہلی کی کھڑی بولی کے سائے میں۔ میر کے یہاں کھڑی کے قدیمی اثرات مثلاً آوے ہے، جاوے ہے، بووے گا، کھاوے گا، ڈھائے کر، آئے کر، جائے کر، بلبل کنے، دوش اوپر، مجھ پاس، ہم پاس، میرے تیئں، اپنے تیئں، دیکھیا ہوں، لکھیا ہوں، جو جوتم نے ظلم کیے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں وغیرہ بہت سی لسانی خصوصیات سترہویں اٹھارہویں صدی کی کھڑی بولی سے لے کر آج تک کی عوامی زبان میں چلی آتی ہیں۔ لکھنؤ میں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں کی اردو کا وہ لوچ جو بعد میں انیس کے مرثیوں اور مرزا شوق کی مثنویوں میں سامنے آیا، اودھی کے اثرات کی دین تھا۔ میر لکھنؤ میں ساٹھ برس کی عمر میں پہنچے تھے، اس لیے کسی نئے لسانی اثر کو قبولنا جہاں شعوری طور پر احساسِ برتری کے باعث ناممکن تھا، وہاں تحت شعوری طور پر نئے لسانی اثرات کے بروئے کار آنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اردو زبان بولیوں کے سنگم پر وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان سے مراد وہ زبان لینی چاہیے جو ان تمام بولیوں کے لسانی منتھن سے میر کے عہد تک وجود میں آچکی تھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی وضاحت میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے میر نے مسجد کو میت، پلید کو پلیت، دستخط کو دسخط یا خیال کو خیال بروزن حال باندھنے کا جواز پیدا کیا ہے تو یہ اس اہتم بالشان لسانی روایت کی نہایت ہی محدود اور سطحی تعبیر ہے۔ یہ تعبیر اس انتہائی کشادہ اور مختلف عناصر کو جذب کرنے والی زبان کی توہین ہے جو میر کی شاعری میں ایک مواج سمندر کی طرح تلاطم خیز نظر آتی ہے۔ میر دراصل پوری اردو زبان کے پورے شاعر تھے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ میر کی لفظیات سب سے بڑی ہے۔ قطعی لفظ شماری کی غیر موجودگی میں یہ بات قیاساً ہی کہی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نظیر یا انیس کی لفظیات میر سے زیادہ ہو، لیکن لفظیات زبان کی صرف ایک سطح ہے۔ پوری اردو سے مراد صرف ایک سطح نہیں ہے بلکہ اس کے تمام لسانی روپ اور پرتیں یعنی صرفی اور نحوی، صوتیاتی، اسلوبیاتی نیز عروضی ان تمام رخوں کو جیسا میر نے کھنگالا ہے اور زبان کے آئندہ کے امکانات کی جو بشارت دی ہے اس اعتبار سے پوری اردو زبان کے پورے شاعر کہلانے کا شرف میر تقی میر ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے صحیح کہا ہے: ''میر کی اردو دوسرے شعرا کی اردو سے اس اعتبار سے علاحدہ اور اہم ہے کہ دوسرے شعرا اکثر و بیشتر عربی فارسی اور اور دوسری زبان کے الفاظ، تراکیب، بندش، محاورہ، روزمرہ، یا انواع و اقسام کے علوم وفنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں، میر صرف اردو اور اپنے مخصوص لب ولہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعرا کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے، اس میں اتنی ''اردوئیت'' یا ''اردوپن'' نہیں ہوتا جتنا میر کے یہاں ہے''۔ ذیل کے اشعار میں دیکھیے ایک معمولی سے دیسی لفظ نے شعر میں کیا معنویت پیدا کی ہے۔

جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جاے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے

کہہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک
جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے: اوپر کی بحث میں اگرچہ میر کے شعری اسلوب کی بنیادی جہات کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم بہت سے ذیلی نکات اور تفاصیل ایسی ہیں جن پر مزید گفتگو ہوسکتی تھی، لیکن طوالت کے خوف سے ان سے صرف نظر کرنا پڑا۔ میر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری اردو کے ادبی حسن کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آشکار کیا۔ ٹھیٹھ بول چال کی زبان سے انھوں نے شاعری کی زبان وضع کی اور فارسی اثرات کی خوش آہنگ آمیزش سے ایمائی اظہار کی ایسی ایسی رفعتوں تک ایک نوزائیدہ زبان کو پہنچا دیا کہ باید و شاید۔ میر کے یہاں حسن کاری اور تہ داری کی بنیادیں دراصل زبان کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ ان کی سلاست، صفائی، لطافت، اگرچہ بے ارادہ اور بے کاوش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پیچھے جو زبردست تخلیقی جوہر ہے، وہ ایسا بھید بھرا معنیاتی زیروبم پیدا کرتا ہے کہ وجود کے بہت سے سُر اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ فراق نے کیا خوب کہا ہے ''معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے''۔ میر کی آواز کا جادو ہر عہد میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے لہجے کی خوش آہنگی اور تاثیر اور دردمندی کبھی ماند نہیں پڑسکتی۔ ان کے یہاں بحروں اور آوازوں کے ترنم، گونج اور تھرتھراہٹوں سے پورا پورا کام لیا گیا ہے۔ وہ ایسے صناع ہیں جن کی صناعی آسانی سے نظر نہیں آتی۔ ان کے یہاں خاموشی اور سناٹے بولتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں سے وہ ایسی تصویریں بناتے ہیں اور داخلی محسوسات کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں کہ دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی دل آویزی اور دل آسائی ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ میر کی زبان آج بھی زندہ ہے اور یہ زبان آج بھی دل کی تہوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میر کی عظمت کے کئی گوشے ہیں لیکن شاید سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے پوری زبان کے پورے امکانات کو روشن کیا اور پوری زبان کی ظاہری اور زیریں ساختوں کو جس طرح برتا اور جس طرح شعری اظہار کی اعلیٰ ترین سطحوں پر فائز کیا، یہ اعزاز اور اعجاز کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

میر کی شاعری 'دردمند انسانیت کی آواز' ہے۔ میر کی 'چشم خوں بستہ' انھیں ہر دل سے ضرور قریب کردیتی ہے، لیکن میر کا سمجھنا سہل نہیں۔ میر کی بصیرت تہ در تہ ہے۔ انھوں نے اپنی موجِ سخن کو بلاوجہ صد رنگ نہیں کہا تھا۔

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریاے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

لیکن اردو تنقید نے ابھی اس موجِ صد رنگ کے تمام رنگوں سے انصاف نہیں کیا۔ پورے میر کو سمجھنا اور پہچاننا ابھی باقی ہے۔

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

(۱۹۸۰)

●●●

شمس الرحمٰن فاروقی

چوں خمیر آمد بدست نانبا

میں نے عرض کیا ہے کہ انسانی رشتوں کے تعلق سے میر ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انسانی رشتوں کا یہ اظہار ان کی جنسیت میں بھی ہوا ہے اور ان کی حس مزاح میں بھی۔ حس مزاح کا عنصر غالب اور میر دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن غالب اپنے مزاح کا ہدف زیادہ تر خود اپنے کو ہی بناتے ہیں، جبکہ میر کی حس مزاح معشوق کو بھی نہیں بخشتی۔ میر کو جب موقع ملتا ہے وہ معشوق سے پھکڑ پن بھی کر گزرتے ہیں۔ وہ زور زور سے قہقہہ لگانے سے گریز نہیں کرتے، جبکہ غالب کے یہاں عام طور پر تبسم زیر لب کی کیفیت ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنی پوزیشن اور اپنے وقار کا احساس میر سے بڑھ کر ہے، لیکن بنیادی بات وہی ہے کہ غالب کا مزاج تصوراتی زیادہ ہے۔ اسی بنا پر ان کے یہاں انسانی رشتوں کا تذکرہ بھی تصوراتی اور رسومیاتی سطح پر ہے۔ بہت بھونڈے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ میر تو ہر ایک سے بات کر لیتے ہیں لیکن غالب کی گفتگو زیادہ تر اپنے ہی سے ہوتی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں ۔

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کے یہاں جنسی تعلقات کا بیان بہت کم ہے۔ کم نقادوں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ غالب کے یہاں جنسیت اس وجہ سے کم نہیں ہے کہ وہ میر کی بہ نسبت زیادہ ''مہذب'' یا ''نفیس طبع'' تھے یا Sophisticated تھے۔ جنس بہرحال انسانی تعلقات کی سب سے زیادہ Intimate صورت اور منزل ہے۔ غالب کو انسانی تعلقات سے چنداں دلچسپی نہ تھی، اس لیے انھیں جنس کے معاملات سے بھی وہ لگاؤ نہ تھا۔ ورنہ نام نہاد نفاست تو مومن کے یہاں بھی بہت ہے، لیکن ان کے یہاں جنس کی کارفرمائی بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بصری تخیل سے محروم ہونے کی وجہ سے مومن کا جنسی اظہار بہت پھیکا ہے۔ ان کے برخلاف میر کے یہاں بصری تخیل کی فراوانی ہے۔ ہماری شاعری میں جنسی مضامین کا بیان چونکہ کھل کھیلنے کی حد تک بہت کم پہنچتا ہے، اس لیے اس طرح کے مضامین کے لیے بصری تخیل بہت موثر کردار ادا کرتا ہے۔ علاوہ بریں، معاملہ بند شاعر کو بصری تخیل بہت زیادہ درکار بھی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، جرأت کے یہاں جنسی مضامین خاصی تعداد میں ہیں، لیکن وہ زیادہ تر معاملہ بندی پر مبنی ہیں (جیسا کہ آگے مثالوں سے واضح ہوگا۔) لہٰذا جرأت کا کام بصری تخیل کے بغیر چل جاتا ہے۔ عسکری صاحب نے غلط نہیں کہا ہے کہ جرأت دراصل بیانیہ انداز کے شاعر

ہیں۔ بیانیہ انداز میں جنسی مضامین کا برتنا آسان ہوتا ہے، کیونکہ اس میں اپنی اور معشوق کی باتیں اور حرکتیں بیان ہوتی ہیں، خود معشوق کا بیان نہیں ہوتا۔ نواب مرزا شوق اور میر حسن دونوں کے یہاں جنسی مضامین اسی وقت چمکتے ہیں جب معاملہ بندی ہو۔ مومن کی مثنویاں اور غزلیں اس اصول کی عمدہ مثال ہیں۔ غزل میں جنسی بیان کے وقت بھی مومن مضمون آفرینی میں اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ جنس کا جذباتی اور لذت آفریں پہلو پس پشت جا پڑتا ہے۔ اور یہی مومن مثنوی میں بہت واضح اور پراثر طور پر جنسی مضامین کو استعمال کرتے ہیں۔ میر نے جرأت کے بارے میں بقول محمد حسین آزاد اور قدرت اللہ قاسم، ''چوماچاٹی'' کا فقرہ کہا تھا۔ اس فقرے سے دو نتیجے نکالے گئے ہیں اور دونوں ہی ہماری تنقید میں بہت مقبول و موثر رہے ہیں۔ پہلا نتیجہ تو یہ کہ جرأت کے یہاں جنسی مضامین کی غیر معمولی کثرت ہے، اور دوسرا نتیجہ یہ کہ میر کے یہاں ایسے مضامین بہت کم ہیں۔ میر کا کلام تو لوگوں نے پڑھا نہیں، اس مبینہ قول کی روشنی میں یہ نتیجہ ضرور نکالا کہ اگر میر نے جرأت کی شاعری میں جنسی مضامین کی کثرت دیکھ کر اس کو ''چوماچاٹی''[1] قرار دیا تو لازم ہے کہ میر نے خود اپنے یہاں اس طرح کے مضامین نہ برتے ہوں گے جن پر ''چوماچاٹی'' کا الزام لگ سکے۔

اردو تنقید میں مروج تاثراتی فیصلوں کی طرح یہ دونوں فیصلے بھی غلط ہیں۔ نہ تو جرأت کے یہاں جنسی مضامین کی بہتات ہے اور نہ میر کے یہاں ان کا فقدان۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ میر کے بارے میں اس درجہ ''خوش فہمی'' میں مبتلا ہیں کہ ان کو مبتلاے ہر رنج والم کے ساتھ بالکل ''معصوم'' اور ''بھولا بھالا'' اور دل خستہ لیکن عشق کی ''گندی'' باتوں سے بے خبر کوئی نوعمر صاحبزادہ سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تقریباً تمام چیزوں کی طرح عشقیہ جنسیہ اور Erotic مضامین کو بھی میر نے کثرت سے اور بڑی خوبی سے برتا ہے۔ میر نے جرأت کو چوماچاٹی کا شاعر اس لیے نہیں کہا تھا کہ جرأت کے کلام میں جنسی مضامین کی کثرت ہے۔ میر کا اعتراض دراصل یہ تھا کہ جرأت کے یہاں عشق کی گہرائی اور کشمکش نہیں ہے، صرف معاملہ بندی والے جنسی مضامین ہیں۔ عسکری صاحب نے اس نکتے کو پوری وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں: ''جرأت شاعر سے زیادہ واقعہ نگار ہیں... جرأت کے یہاں کتنے ہی شعر ایسے ملیں گے جو حقیقت نگاری کی وجہ سے پھس پھسے بن کے رہ گئے ہیں''۔ عسکری صاحب کے مطابق جرأت ''اپنے عشق کو عام طور پر معاشقے کی سطح سے اونچا نہیں اٹھنے دیتے... میر کے یہاں وہ زبان ملے گی جو وسیع ترین انسانی تعلقات کے داخلی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ جرأت کے یہاں وہ زبان ہے جو خارجی حرکات کے بیان میں کام آتی ہے... نہ تو ان کے اندر کشمکش پیدا ہوتی ہے جو حالی کے یہاں ہے، نہ وہ تضاد اور کھینچا تانی جو میر میں ہے۔ میر کے درد کا سبب یہ الجھن ہے کہ آخر عشق بہ یک وقت رحمت اور عذاب کیوں ہے؟'' عسکری صاحب کا آخری نکتہ یہ ہے کہ چونکہ جرأت کا عشق روح کی پکار سے زیادہ جسم کی پکار ہے اور یہ شخصیت کے باقی حصوں کو متاثر نہیں کرتا، اس لیے ان کے یہاں ''لگاؤ کے ایک ہی معنی ہیں: یعنی لگاؤ کا خارجی اظہار''۔ لہٰذا میر دراصل اس بات سے ناخوش تھے کہ جرأت کے یہاں معاشقہ نگاری اور سطحی جذباتی تلاطم کیوں ہے، وہ ''تضاد اور کھینچا تانی'' کیوں نہیں کہ انسانی تعلقات کی آویزش بھی ہو، اپنے دکھ کی کہانی سنانے کا ولولہ ہو، لیکن اس کا مطالعہ کرنے، اپنی معنویت دوسروں پر واضح کرنے اور دوسرے کی معنویت اپنے اوپر واضح کرنے کا شوق ہو۔

(1) اصل فقرہ ''چوماچاٹا'' ہے۔

عسکری صاحب کی بنیادی بات بالکل صحیح ہے، لیکن انھوں نے جرأت کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی یہ کر دی ہے کہ ان کے یہاں جو مخزونی ہے اس کو نظر انداز کر کے انھوں نے صرف معاملہ بندی کو لے لیا ہے اور تاثر یہ دیا ہے کہ جرأت کا کلیات جنسی مضامین سے لبالب ہے۔ پھر انھوں نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ معاملہ بندی ہماری غزل میں بہت بڑا Humanizing عنصر ہے، یعنی وہ معشوق کو انسان کی سطح پر لے آتا ہے اور اس لیے جنسی مضامین کے لیے یہ بہت اہم اور بنیادی اسلوب کا حکم رکھتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ جرأت کے یہاں میر کی طرح کا بصری تخیل نہ تھا، لہٰذا وہ مومن (اور خود مثنوی ''معاملات عشق'' کے میر) کی طرح محض معاملہ بندی تک رہ گئے۔ میر کی بڑائی اس بات میں ہے کہ وہ دیکھتے اور دکھاتے بہت ہیں، بیان کم کرتے ہیں (جنسی مضامین کی حد تک۔) ان کی دوسری بڑائی یہ ہے کہ وہ جنسی مضامین کو مضمون آفرینی کے لیے نہیں استعمال کرتے، بلکہ ان کا جنسی پہلو مقدم رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں وہ بے لطفی (یعنی جنسی مضمون کی حد تک بے لطفی) نہیں آنے پاتی جو ناسخ اور مومن اور لکھنؤ کے اکثر شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ میر کے یہاں جنسی مضامین میں بھی خوش طبعی اور طباعی یعنی Wit اور اپنے اوپر ہنسنے کا انداز مل جاتا ہے۔ پہلی صفت میر اور مصحفی میں مشترک ہے، باقی میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

اس سے پہلے کہ میں بات کو آگے بڑھاؤں اور مثالوں کی مدد سے اسے مزید واضح کروں، ''جنسی مضامین'' کی اصطلاح کی وضاحت ضروری ہے۔ میں ''عریانی'' کا لفظ دو وجہوں سے نہیں استعمال کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جنسی مضامین کے لیے عریانی شرط لازم نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ''عریانی'' میں خواہ مخواہ اخلاقی فیصلے کا رنگ نمایاں ہے اور میں جنسی مضامین کے خلاف اخلاقی فیصلے کا قائل نہیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ جو شاعری بہو بیٹیوں کے سامنے نہ پڑھی جاسکے اسے عریاں، مخرب اخلاق اور مذموم کہا ہی جائے گا، چاہے آپ اسے ''عریاں'' کہیں یا ''جنسی مضامین'' پر مبنی کہیں۔ ایسے لوگوں سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ اپنی اپنی بہو بیٹیوں کو میر کی شاعری سے محفوظ رکھیں، بڑی خوشی سے۔ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ادبی حسن کا جویا ہوں، اخلاقی تعلیم کا نہیں اور نہ میں ٹیری ایگلٹن Terry Eagleton کی طرح اس جھگڑے میں پڑنا چاہتا ہوں کہ فن پارے کی تشریح کے بجائے اس کی وجہ بیان کی جائے کہ فلاں فلاں پیداواری رشتوں کے باعث اور سماج کے Superstructure میں فلاں فلاں استحصالی رویوں کے باعث شاعر مجبور تھا کہ اس اس طرح کی شاعری لکھے۔ یعنی شاعر وہی لکھتا ہے جو سماج کے حاکم پیداواری وسائل پر اپنا تسلط جمائے رکھنے کی خاطر اس سے لکھواتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ساری غزل کی اساس جنسی احساس پر ہے، لہٰذا یہ فطری ہے کہ اس میں جنسی مضامین بھی نظم ہوں۔ میں ایسے مضامین کو عریاں، مبتذل، ہوسناکی پر مبنی وغیرہ کچھ نہیں کہتا، بلکہ انھیں غزل کے مزاج کا خاصہ سمجھتا ہوں۔ اور ان کا مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے کرتا ہوں۔ اگر وہ حسن کے ساتھ بیان ہوئے ہیں تو یہ شاعر کی کامیابی ہے۔ اگر نہیں تو یہ شاعر کی ناکامی ہے۔

غزل میں جنسی مضامین کا مطالعہ الگ سے کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ہماری غزل کا معشوق بوجوہ اکثر بہت مبہم اور Idolized اور ناانسانی Dehumanized معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس کے صفات عام طور پر بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے جاتے ہیں، اس لیے اس میں انسان پن بہت کم نظر آتا ہے اور اس باعث حالی کی طرح کے اخلاقی

نقادوں اور ممتاز حسین یا کلیم الدین کی طرح غزل کی رسومیات سے بے خبر نقادوں کو شکایت کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ جنسی مضامین کے ذریعہ غزل کا معشوق انسانی سطح پر اتارا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بطور صنف سخن، غزل کو مکمل اور وسیع بنانے میں ان مضامین کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

جنسی مضامین سے میری مراد دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک تو وہ جن میں معشوق کے بدن، یا بدن کے کسی حصے، یا لباس وغیرہ کا تذکرہ انسانی سطح پر اور لطف اندوزی کے انداز میں ہو، یعنی اس طرح ہو کہ یہ بات صاف معلوم ہو کہ کسی انسان کی بات ہو رہی ہے، کسی مثالی، تصوراتی اور تجریدی ہستی کی نہیں۔ دوسری طرح کے مضامین وہ ہیں جن میں جنسی وصل کے معاملات کا ذکر ہو۔ اس صورت میں یہ مضامین معاملہ بندی کی ضمن میں آتے ہیں۔ ممکن ہے میر نے انھیں ہی ''ادابندی'' کہا ہو۔ ظاہر ہے کہ بعض اوقات دونوں طرح کے مضامین ایک ہی شعر میں آجاتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جنسی مضامین اور معنی آفرینی، کیفیت اور مضمون آفرینی میں کوئی تضاد نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر معنی آفرینی یا مضمون آفرینی پر اس قدر زور دیا جائے کہ مضمون کی جنسیت پس پشت رہ جائے تو اس حد تک وہ شعر ناکام یا نامکمل کہلائے گا۔ یعنی اگر ہم معشوق کے حسن سے زیادہ شاعر کی تیز طبعی سے لطف اندوز ہونے پر مجبور ہوں، تو ایسا شعر اچھا تو کہلائے گا، لیکن اسے جنسی مضمون کے اعتبار سے ناکام کہا جائے گا۔

میر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ جنسی مضامین میں بھی معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کو برتتے ہیں، لیکن اس طریق کار کے باوجود میر کے یہاں جنسی مضمون دبتا نہیں، بلکہ اور چمک اٹھتا ہے۔ مومن اور ناسخ ان مضامین کو برتنے میں معاملہ بندی سے گریز کرتے ہیں (ممکن ہے وہ بھی اسے چوماچاٹی سمجھتے ہوں۔ مومن کے یہاں معاملہ بندی کثرت سے ہے، لیکن جنسی مضامین پر مبنی نہیں ہے۔ ناسخ کے یہاں معاملہ بندی بالکل نہیں ہے۔) لیکن مومن اور ناسخ مضمون آفرینی کو مقدم کرنے کے چکر میں مضمون کی جنسیت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مثلاً مومن کو ہم بستری کا مضمون بہت پسند ہے۔

مجمع بستر مخمل شب غم یاد آیا
طالع خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی
ان کو بے تابی ہے کیوں اس خواب بے تعبیر سے

ساتھ سونا غیر کے چھوڑ اب تو اے سیمیں بدن
خاک میری ہوگئی نایاب تر اکسیر سے
بوے گل کا اے نسیم صبح اب کس کو دماغ
ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

ظاہر ہے کہ ان شعروں میں کوئی جنسی لطف نہیں، کیونکہ سارا زور مضمون بنانے میں صرف ہوا ہے۔ پہلے شعر میں کہا ہے کہ شب غم میں بستر مخمل پر معشوق کے ساتھ سونا یاد آ گیا۔ ظاہر ہے کہ اب نیند کہاں؟ پھر طالع خفتہ کی نیند تو پریشاں ہوگی نہیں۔ یعنی تقدیر جاگے تو ہم سوئیں۔ دوسرے شعر میں معشوق کی پریشانی کا ذکر ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ میں مومن کے ساتھ سو رہا ہوں۔ مومن اسے تسلی دیتے ہیں کہ اس خواب کی تعبیر تو کوئی ہے نہیں۔ نہ تم ہمارے ساتھ کبھی سوؤگے اور نہ کوئی کبھی دیکھے گا۔ اس لیے بدنامی سے ڈرتے کیوں ہو؟ تیسرے شعر میں معشوق کو سیمیں بدن کہہ کر اور اپنی خاک کو اکسیر سے زیادہ نایاب کہا اور یہ مضمون پیدا کیا کہ اب تو تم، جو چاندی سے بدن والے ہو، غیروں کے ساتھ سونا چھوڑ دو۔ تمھارے غم میں میری خاک گھس گھس کر اکسیر سے بھی زیادہ قیمتی ہوگئی ہے، گویا اب تو میں قدر کے لائق ہوا۔ آخری شعر میں معشوق کی سمن بری سے فائدہ اٹھا کر کہا ہے کہ اب ہمیں گلاب کی خوشبو سے کیا لینا دینا، ہمارا بدن اس سمن بر سے ہم بستری کے باعث خود ہی معطر ہے۔ پہلے اور دوسرے شعر میں خیال اس قدر باریک ہے اور اس قدر کم لفظوں میں بیان ہوا ہے کہ خیال کی باریکی اور نزاکت نے بیان کے حسن کو مجروح کر دیا ہے اور چاروں شعروں میں مضمون آفرینی کی کثرت کے باعث جنسی مضمون (جو بنیادی مضمون ہے) پس منظر میں چلا گیا ہے۔

ناسخ اور ان کے بعض شعرائے مابعد نے بھی مضمون آفرینی اور طباعی اختیار کی، بلکہ بعض اوقات تو یہ خیال ہوتا ہے کہ جنسی مضامین ان لوگوں کے مقصود ہی نہیں۔ ناسخ کی خوبی یہ ہے کہ وہ استعاراتی یا اصطلاحی لفظ کو لغوی معنوں میں استعمال کر کے نئی طرح کا استعارہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اصل جنسی مضمون بالکل غیر اہم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ان کا یہ لاجواب شعر ہے (مجھے خوشی ہے کہ رشید حسن خاں نے اسے اپنے انتخاب میں شامل رکھا ہے)۔

دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو بنت کی چھتیاں
پلتی ہے بالے کی مچھلی موتیوں کی آب میں

طباطبائی نے (غالباً) ناسخ کے کسی شاگرد کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

انگیا کے ستارے ٹوٹتے ہیں
پستاں کے انار چھوٹتے ہیں

اس طرح کے اشعار میں طباعی ہے۔ ان کی مضمون آفرینی بھی ان کی طباعی کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ لیکن ان میں جنسی مضمون بہت پھیکا رہ گیا ہے۔ ناسخ کا عام انداز یہی ہے۔

میں ہوں عاشق انار پستاں کا
نہ ہوں مرقد پہ جز انار درخت

تو نے مگدر ہلائے کیوں نہ کریں
باغ عالم میں افتخار درخت

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

ناسخ جب مضمون آفرینی ترک کر کے بیانیہ انداز میں آتے ہیں تو ان کے شعر کا لطف بالکل غائب ہو جاتا ہے۔

جی میں ہے سر میں رکھ کے سو جاؤں
تکیہ مخمل کا ہے تمھارا پیٹ

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دل زار نے سونے نہ دیا

یاد آتا ہے ہجر میں وہ مزا
بر میں لے لے کے تنگ سونے کا

اب مصحفی کا شعر دیکھیے تو بات صاف ہو جائے گی۔

بخت ان کے ہیں جو سو کے ترے ساتھ لے گئے
گہ پیرہن کا لطف تو گاہے بدن کا حظ

واقعہ یہ ہے کہ مصحفی کا کلام جنسی مضامین کے تنوع اور حسن کے اعتبار سے میر کی یاد دلاتا ہے۔ میر اور مصحفی ہمارے یہاں سب سے تیز آنکھ والے شاعر ہیں۔ میر کی صفت میں استعارہ، مضمون، معنی سب شامل ہیں۔ مصحفی وہاں تک نہیں پہنچتے جہاں میر اکثر نظر آتے ہیں، لیکن دونوں کا انداز ایک ہی طرح کا ہے۔

مصحفی: یوں ہے اس گورے بدن سے جلوہ گر لوہو کا رنگ
دست قدرت نے ملایا جیسے میدے میں شہاب (دیوان دوم)

میر: بیڑے کھاتا ہے تو آتا ہے نظر پان کا رنگ
کس قدر ہائے رے وہ جلد گلو نازک ہے (دیوان دوم)

مصحفی: یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں
سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں

میر: کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے (دیوان دوم)

میر کے یہاں معنی اور مضمون دونوں کی کثرت ہے۔ (تفصیل کے لیے شرح ملاحظہ ہو۔) مصحفی کے یہاں مضمون دوسرے مصرعے تک آتے آتے ہلکا ہو گیا، لیکن شعر کا مقصود حاصل ہو گیا۔ حسرت موہانی نے اس مضمون کو بار بار کہا، لیکن ہر

بار غیر ضروری یا کمزور الفاظ نے شعر بگاڑ دیے۔

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکس مے سے شیشہ گلابی

مصحفی کو ایک بار اور سن لیجیے تو کھرے کھوٹے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

مصحفی نے حسن ٹپکنے کا ثبوت ''لبریز آب و رنگ'' کہہ کر فراہم کر دیا اور انداز بھی انشائیہ رکھ کر مضمون میں ایک نئی جہت پیدا کر دی۔ یہ زمین دراصل میر کی ہے۔

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام (دیوان دوم)

اس مضمون کو بدل بدل کر میر نے کئی بار استعمال کیا ہے۔

اس کے سونے سے بدن سے کس قدر چسپاں ہے ہائے
جامہ کبریتی کسو کا جی جلاتا ہے بہت (دیوان ششم)

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ (دیوان ششم)

میر کے یہاں تکرار کا شکوہ بعض نقادوں نے کیا ہے۔ اس وقت تکرار کے اصول پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن مندرجہ بالا تین شعروں سے یہ بات واضح ہوئی ہوگی کہ میر کی تکرار ہر جگہ ناروا نہیں ہوتی۔ اکثر وہ ایک ہی مضمون میں نئے پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ''بدن تمام'' والے شعر میں دوسرے مصرعے کا زبردست پیکر اور پہلے مصرعے میں انشائیہ انداز کی وجہ سے ابہام اسے ''بدن کے ساتھ'' والے شعر سے الگ کرتا ہے۔ یہاں دوسرے مصرعے کے پیکر میں ''لپٹا ہے'' کے باعث جنسی اشارہ اور طرح کا ہے۔ انشائیہ انداز یہاں مصرع ثانی میں ہے، لیکن ''تنگ جامہ'' کی رعایت سے ''جی پھٹ گیا'' کے استعمال نے اسے مصرع اولیٰ کے ساتھ ایک اور طرح کا ربط مہیا کر دیا ہے۔ ''جلاتا ہے بہت'' والے شعر میں مصرع اولیٰ کا

انداز انشائیہ ہے، لیکن ''سونے سے بدن'' کی دوہری معنویت اور ''کبریتی'' اور ''جی جلاتا'' کی رعایتوں نے اسے بالکل مختلف طرح کا زور بخش دیا ہے۔

معشوق کے ندی میں نہانے کا مضمون میر اور مصحفی کے یہاں مشترک ہے۔ میر نے اسے کئی بار باندھا ہے، لیکن اس کا بہترین اظہار غالباً مندرجہ ذیل اشعار میں ہوا ہے۔

دیوان دوم: شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی میں
گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں
ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہر تر پانی میں

مصحفی اس مضمون کو بہت دور لے گئے ہیں اور میر سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ لہروں کے آغوش بن جانے کا مضمون میر نے غالباً مصحفی سے پہلے باندھ لیا تھا۔ میر نے اس مضمون کو کئی جگہ باندھا ہے۔

دیوان دوم: اٹھتی ہے موج ہر یک آغوش ہی کی صورت
دریا کو ہے یہ کس کا بوس و کنار خواہش

دیوان اول: اسی دریائے خوبی کا ہے یہ شوق
کہ موجیں سب کناریں ہوگئی ہیں

بہرحال مصحفی کا شعر ہے۔

کون آیا تھا نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کردیا ہے

معشوق کی برہنگی کا ذکر میر نے شاید تمام شاعروں سے زیادہ کیا ہے۔ معشوق کی برہنگی آتش کا بھی محبوب مضمون ہے۔ لیکن ان سے بات پوری طرح نبھتی نہیں، کیونکہ وہ بیانیہ انداز سے کام زیادہ لیتے ہیں اور مناسبت الفاظ کا دھیان نہیں رکھتے۔

تا سحر میں نے شب وصل اسے عریاں رکھا
آسماں کو بھی نہ جس مہ نے بدن دکھلایا
(آتش)

حفظ مراتب کا لحاظ نہ رکھنے کے باعث شعر کمزور ہوگیا۔ میر یا تو پوری ہوسناکی سے کام لیتے ہیں اور پھر بھی حفظ مراتب رکھتے ہیں، یا پھر معشوق کی عریانی کو تہذیبی حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

دیوان دوم: وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پہ اس کے
سوجی گئے تھے صدقے یہ جان و مال کیا ہے

دیوان دوم: مر مر گئے نظر کر اس کے برہنہ تن میں
کپڑے اتارے ان نے سیر کھینچے ہم کفن میں

دیوان پنجم: راتوں پاس گلے لگ سوئے ننگے ہوکر ہے یہ غضب
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز

آخری شعر کو مندرجہ ذیل شعر کے ساتھ پڑھیے تو معنی واضح تر ہوں گے۔

دیوان پنجم: آنکھ لگے اک مدت گذری پائے عشق جو بیچ میں ہے
ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمائے ہنوز

اور یہ کمال بھی میر ہی کو حاصل ہوا کہ اپنی برہنگی اور دیوانگی کا تذکرہ کیا اور معشوق کو پورے لباس میں رکھا، لیکن اس کے باوجود جنسی تحرک سے بھرپور ہستی کے طور پر معشوق کی مکمل تصویر کھینچ دی۔

دیوان چہارم: ترک لباس سے میرے اسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا
جامے کا دامن پاؤں میں الجھا ہاتھ آنچل اکلائی کا

یہاں جسمانی اعضا کا ذکر جنسی مضمون پیدا کرنے کا آسان نسخہ ہے لیکن لباس کا پورا پردہ قائم رہے اور پھر بھی لڑکی شاعر کی آنکھ کو عریاں دکھائی دے۔ یہ صرف بڑے شاعر کے بس کی بات ہے۔

دیوان پنجم: کیا صورت ہے کیا قامت دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منھ دیکھو جو کوئی کلال بناوے گا

دیوان پنجم: مونڈھے چلے ہیں چولی چسی ہے مہری پھنسی ہے بند کسے
اس اوباش نے پہناوے کی اپنے تازہ نکالی طرح

میر کے یہاں معشوق کے بدن سے لطف اندوز ہوکر وجد میں آنے سے لے کر معشوق پر طنز، طماعی کا اظہار، صاف صاف لالچ کا اظہار، ہر طرح کا انداز موجود ہے۔ لالچ پر ایک شعر دیکھیے۔

دیوان پنجم: پانی بھر آیا منھ میں دیکھے جنھوں کے یارب
وے کس مزے کے ہوں گے لب ہائے ناگزیدہ

اللہ میاں سے تخاطب کی شوخی اور ''معصومیت'' بھی خوب ہے۔ اسی غزل کا مطلع ہے، جو کام یاب ہوس کی گرمی سے پسینہ پسینہ ہے۔

اب کچھ مزے پر آیا شاید ہو شوخ دیدہ
آب اس کے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ

پھر جب معشوق کی نازک بدنی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ایک نیا انداز برہنگی کا سامنے آتا ہے۔

دیوان پنجم: وے کپڑے تو بدلے ہوئے میر اس کو کئی دن
تن پر ہے شکن تنگی پوشاک سے اب تک

اس مضمون میں شوخی ہے، لیکن ہوس بھری اور بظاہر محض مدح پر مبنی ہے، کہ معشوق کس قدر نازک ہے۔ شوخی اس وقت کھلتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ بدن پر تنگی پوشاک کے باعث جو شکن پڑی ہے، اسے دیکھنے کے لیے بدن کو ننگا دیکھا ہوگا۔ مندرجۂ ذیل شعر میں معشوق کو بے لباس کرنے کا بہانہ اس کی تنگ پوشی اور نزاکت کو بنایا ہے۔

دیوان ششم: تنگی جامہ ظلم ہے اے باعث حیات
پاتے ہیں لطف جان کا ہم تیرے تن کے بیچ

اسی غزل میں خسرو سے مستعار لے کر اپنا مضمون بنایا ہے۔

کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانی یار کا
اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیچ

معشوق پر طنز کرنے یا اس بہانے خود پر طنز کرنے کا انداز جنسی مضمون میں کم نبھتا ہے۔ میر نے اس کو بھی نبھا کر دکھا دیا ہے۔

دیوان ششم: آشنا ڈوبے بہت اس دور میں
گرچہ جامہ یار کا کم گھیر ہے

دیوان پنجم: ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو
یہ کبھو انگ دان دیتے ہیں

دیوان پنجم: طالع نہ ذائقے کے اپنے کھلے کہ ہم بھی
ان شکریں لبوں کے ہونٹوں کا کچھ مزا لیں

دیوان پنجم: ننگے سامنے آتے تھے تو کیا کیا زجر اٹھاتے تھے
ننگ لگا ہے لگنے انھیں اب بات ہماری ماننے سے

دیوان سوم: نکل آتا ہے گھر سے ہر گھڑی ننگے بدن باہر
برا یہ آپڑا ہے عیب اس آسائش جاں میں

دیوان ششم: خمیازہ کش ہوں اس کی مدت سے اس ادا کا
لگ کر گلے سے میرے انگڑائی لے جماہا

معشوق کی انگڑائی اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ وہ عاشق کے ساتھ ساری رات جاگا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ عاشق سے اکتا گیا ہے۔ ساتھ رات گذارنے یا معشوق کو برہنہ دیکھنے کا کنایہ میر کے یہاں اکثر ملتا ہے۔ کچھ شعر اوپر گذر چکے، کچھ اور ملاحظہ ہوں۔

دیوان اول: لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

دیوان سوم: جس جاے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

دیوان اول: دیہی کو نہ کچھ پوچھو اک بھرت کا ہے گڑوا
ترکیب سے کیا کہیے سانچے میں کی ڈھالی ہے

دیوان ششم: ایسی سڈول دیہی دیکھی نہ ہم سنی ہے
ترکیب اس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی

آخری دو شعروں کے مضمون کو مصحفی سے لے کر علی اوسط رشک تک کئی لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ میر نے "بھرت کا گڑوا"، "دیہی"، "سڈول" اور "ترکیب" جیسے الفاظ رکھ کر مضمون کی رنگینی اور واقعیت اور تفصیل کو پوری طرح برت دیا ہے۔ اس پر مفصل بیان کے لیے شرح ملاحظہ ہو۔ میر کو چونکہ روزمرہ کی زندگی سے مضمون بنانے میں خاص مہارت تھی، اس لیے ان کے سامنے آتش، بلکہ مصحفی بھی غیر واقعی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً معشوق کے بھیگنے کا مضمون مصحفی اور میر دونوں کو پسند تھا۔

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہہ کی بوندیں
جوں لالۂ تر رنگ ترا اور بھی چمکا

جھلک بدن کی ترے ہے یہ رخت آبی میں
کہ جیسے جلوہ کرے آفتاب در تہ آب

پہلا شعر روزمرہ زندگی پر مبنی ہے۔ باقی مضامین خیالی تو نہیں ہیں، لیکن میر کے مندرجہ ذیل شعر کے سامنے مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

دیوان چہارم: گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

میر کے شعر پر نظیر اکبرآبادی کے ایک شعر کا ہلکا سا پرتو ہے، لیکن نظیر کے یہاں اشاروں کی اور بصری پیکر کی وہ فراوانی نہیں جو میر کے یہاں ہے۔

سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ وہ کچھ خشک موتی کچھ پسینے کے وہ تر موتی

نظیر اکبرآبادی کے شعر میں بندش بھی بہت سست ہے۔ میر کے شعر میں پہلے اور دوسرے مصرعے میں برابر کے پیر ہیں۔ لیکن چولی کے پسینے میں بھیگنے میں اشارات و انسلاکات اس قدر ہیں اور اتنے بے پناہ ہیں اور پھر بھی اتنے نزدیک کے ہیں کہ شعر معجزہ بن گیا ہے۔ تجربے کے جس منطقے کا یہ شعر ہے، اس کے بالکل متضاد منطقے سے اس طرح کے شعر برآمد ہوتے ہیں۔

دیوان دوم: بو کئے کمھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے

دیوان چہارم: ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تن نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

میر کے جنسی مضامین کا تذکرہ ان کے امرد پرستانہ اشعار کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ عندلیب شادانی نے اپنا مضمون ''میر صاحب کا ایک خاص رنگ'' یوں لکھا تھا گویا میر نے اپنے یہ اشعار کہیں داب چھپا کر رکھ دیے تھے، یا اگرچہ یہ شعر کلیات میں تھے، لیکن لوگوں نے انھیں پڑھا نہ تھا۔ پھر یاروں نے طرح طرح سے اس ''خاص رنگ'' کی توجیہیں بھی کرنے کی کوشش کی۔ احتشام صاحب نے مسعود حسن رضوی ادیب کے نام شادانی کے مضمون پر بعض ''بزرگوں'' کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''سنا کہ مرزا محمد عسکری صاحب بہت متغض ہوئے کیونکہ شادانی صاحب، میر وغیرہ کے وہی اشعار پڑھ کر نتائج نکالتے رہے جن کا ذکر وہ اپنے مضامین میں کر چکے ہیں''۔ (خطوط مشاہیر مرتبہ نیر مسعود) حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص نے بھی کلیات میر کا سرسری ہی سا مطالعہ کیا ہوگا، وہ اس شوق اور شغف و انہماک سے بے خبر نہ رہا ہوگا جو امرد پرستی کے مضمون پر میر نے صرف کیا ہے۔ میں اس رجحان یا میلان کا دفاع نہیں کرتا۔ نہ اس کو مطعون کرتا ہوں۔ میں یہ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ میر یقیناً امرد پرست تھے، اور نہ فراق صاحب کی طرح یہ کہتا ہوں کہ دنیا کے اکثر بڑے لوگ امرد پرست ہوئے ہیں۔ شاعرانہ اظہار کی حد تک امرد پرستی کے اشعار میں میر کے یہاں خود پر طنز کرنے، خود امردوں پر طنز کرنے، اور امردوں سے دلچسپی پر مبنی، ہر طرح کے اچھے برے شعر مل جاتے ہیں۔ فی الحال میری غرض جنسی مضمون کے حامل اور امرد پرستی پر مبنی اچھے اشعار سے ہے۔ چند کو بلا کسی مزید تفصیل کے پیش کرتا ہوں۔

دیوان اول: باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو خوابا

دیوان پنجم: ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہوئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

دیوان پنجم: وہ نو بادۂ گلشن خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح
شاخ گل سا جائے ہے لچکا ان نے نئی یہ ڈالی طرح

ان اشعار پر مفصل گفتگو شرح میں ملاحظہ کیجیے۔ میں ہر اس شعر کو جس میں امرد پرستی کا شائبہ ہو، لازماً جنسی مضمون پر مبنی شعر نہیں مانتا، لیکن یہ بھی ہے کہ امرد پرستانہ شعر میں معشوق آسانی سے Idealize نہیں ہو پاتا، لہٰذا اس حد تک اسے جنسی مضمون کا حامل قرار دینا ہی پڑتا ہے۔ بعض بعض جگہ فیصلہ الفاظ کے اصطلاحی معنوں پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً ٹیک چند بہار نے ''دنداں مزد'' کے معنی درج کیے ہیں کہ اصطلاح میں بوسے کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ واضح نہیں کیا ہے کہ یہ کس طبقے کی اصطلاح ہے۔ قرینے سے لگتا ہے کہ امرد پرستوں کی اصطلاح ہوگی۔ ایسی صورت میں دیوان ششم کا یہ غیر معمولی شعر اور بھی غیر معمولی ہو جاتا ہے۔

آج اس خوش پرکار جواں مطلوب حسین نے لطف کیا
پیر فقیر اس بے دنداں کو ان نے دنداں مزد دیا

میر کے یہاں جنسی مضامین کا مطالعہ ہمیں یہ سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ میر کے یہاں عشق کا تجربہ کس نوعیت کا یا یوں کہیے کہ کن نوعیتوں کا ہے۔ محمد حسن عسکری اسے انسانی تعلقات کی پیچیدگیوں کے مرادف قرار دیتے ہیں۔ لیکن بات شاید اتنی سادہ نہیں، کیونکہ میر کے یہاں عشق کی پیچیدگیوں کے علاوہ اس کی وسعت اور تنوع بھی اس درجے کا ہے کہ اس پر کوئی ایک حکم نہیں لگ سکتا۔ اور میر کو صرف دروں بیں یا عشق کے ''اعلیٰ'' اور ''گھریلو'' اور ''ہوس آمیز'' پہلوؤں کی کشاکش کا شاعر کہنے سے بات پوری نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس معاملے کو ذرا اور وسعت اور توجہ سے دیکھنا چاہیے۔ لیکن توجہ کو اس طرف منعطف کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی چھان بین کی جائے کہ جب میر جنسی مضمون کو ہر پہلو سے بیان کرنے پر قادر تھے، تو انھوں نے جرأت کی سی معاملہ بندی بھی کیوں نہ اختیار کی؟ اس سوال کا جواب اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے ہمیں میر کے یہاں عشق کے تجربے کی حدوں کا پتہ لگ سکتا ہے۔ ممکن ہے اسی ضمن میں اس بات پر بھی روشنی پڑ سکے کہ آیا میر کے عشق کی کوئی مرکزی نوعیت یا اس کا کوئی مرکز ہے کہ نہیں؟

ایسا نہیں ہے کہ میر جنسی مضامین کو معاملہ بندی کے اسلوب میں پیش کرنے پر قادر نہیں تھے۔ گذشتہ صفحات میں دیوان اول کے ایک قطعے کا ذکر ہو چکا ہے اس کا پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

کل تھی شب وصل اک ادا پر
اس کی گئے ہوتے ہم تو مر رات

ایسا بھی نہیں ہے کہ جنسی مضامین کے باہر معاملہ بندی میں میر کو کوئی مشکل پیش آتی ہو۔ لہٰذا جنسی مضامین میں معاملہ بندی سے کم و بیش اجتناب کی وجوہ دریافت کرنا بہت اہم ہو جاتا ہے۔

جنسی مضامین پر مبنی اشعار کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر ان میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کی کثرت رکھی جائے تو اصل مضمون کے پھیکے پڑ جانے کا امکان رہتا ہے۔ میر اس معاملے میں غیر معمولی ہیں کہ وہ یہاں بھی اکثر وبیشتر مضمون آفرینی یا کثرت معنی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ استعارے کا ہر اسلوب جانتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو رعایت لفظی میں کمال حاصل ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ حتی الامکان شعر کو بیانیہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن جن اشعار میں معشوق سے وصل کے مضمون کو جنسی لذت اندوزی کے رنگ میں کہا گیا ہو، ان میں بیانیہ رنگ در آنا لازمی ہے۔ میر نے وصل کے مضمون میں جنسی مضامین سے عام طور پر احتراز کیا ہے اور اگر ایسا مضمون لائے بھی ہیں تو اس میں ابہام کا پہلو ایسا رکھ دیا ہے کہ خود بہ خود کثرت معنی پیدا ہو گئی ہے۔

دیوان دوم: وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

دیوان پنجم: وصل میں رنگ اڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا

دیوان پنجم: اس کا بحر حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

دیوان چہارم: پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا
یاں کبھو اس کا یوں گزارا تھا

دیوان سوم: کیا تم کو پیار سے وہ اے میر منھ لگاوے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹے ہو گال اس کا

دیوان دوم: منھ اس کے منھ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
اب ہاتھ سے دیا ہے سر رشتہ میں ادب کا

دیوان سوم: گو شوق سے ہو دل خوں مجھ کو ادب وہی ہے
میں رو کبھی نہ رکھا گستاخ اس کے رو پر

دیوان ششم: بدن میں اس کے تھی ہر جاے دلکش
بجا بے جا ہوا ہے جابجا دل

دیوان سوم: گات اس اوباش کی لیں کیوں کہ بر میں میر ہم
ایک جھرمٹ شال کا اک شال کی گاتی ہے میاں

اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے کہ میر وصل کی لذت اندوزی کے وقت بھی رعایت لفظی، ابہام اور استعارے سے کام لیتے ہیں اور بیانیہ انداز کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ اکثر یہ بات بھی نہیں کھلتی کہ وصل ہوا ہے بھی کہ نہیں۔ ان اشعار میں معاملہ بندی سے گریز اور کبھی کبھی خود اپنے پر ہنسنے کی ادا اس بات کی غماز ہے کہ کچھ باتیں شاید ایسی بھی ہیں جن کو میر اپنے آپ پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے یہاں گستاخ دستی کی کمی نہیں ہے، لیکن وہ اختلاط باطنی کے واضح بیان سے اکثر گریز کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کا مبہم اور استعاراتی مزاج اسے پسند نہیں کرتا۔ مضامین وصل میں اگر واضح معاملہ بندی کی جائے تو استعارے کی گنجائش کم ہوجاتی ہے۔ جرأت کا یہی معاملہ تھا۔ وہ استعارے کو وقوعے پر قربان کردیتے ہیں۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ملائے لب سے لب لیٹے تھے جب تک وہ بھی لیٹا تھا
پھریری لے کے میں جو کرکے اف یک بار اٹھ بیٹھا

تو کچھ اٹھنے کے اس نے ساتھ ہی چتون جو پہچانی
تو کیا گھبرا کے بس جلدی سے وہ عیار اٹھ بیٹھا

لپٹ کر سونے سے شب کے چنبی پھولوں کی جو بدھی
تو کیا ہوکر وہ جھگڑالو گلے کا ہار اٹھ بیٹھا

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی
بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلہن کی سی

یاد آتا ہے یہ کہنا جب تو اڑ جاتی ہے نیند
اپنی ہٹ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کے سویئے

تم جو کہتے ہو نہ جرأت سوئیں گے ہم تیرے ساتھ
سو زباں بہر خدا اب یہ پلٹ کے سویئے

اپنے سینے پہ رکھا ہاتھ میں ان کا تو کہا
چھوڑ کم بخت ہتھیلی مری گلخن سے لگی

دل ہی دل جانے ہے کچھ اس کا مزا اور لذت
مل کے جب ایک شب وصل میں ہوں سینے دو

شعر نمبر چار اور ایک حد تک نمبر سات کے علاوہ باقی تمام شعروں میں مضمون کا فقدان ہے۔ شعر نمبر چار میں پیکر، اور انشائیہ انداز بیان اس طرح یک جا ہوئے ہیں کہ میر تو نہیں، لیکن مصحفی کا سا رتبہ حاصل ہوگیا ہے۔ باقی تمام شعروں کا اسلوب خبریہ ہے۔ معاملہ بندی کی ایک کمزوری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں انشائیہ اسلوب، جو خبر یہ سے بہتر اور بلند تر ہوتا ہے، استعمال نہیں ہوسکتا۔ اب یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ میر اگر چہ جنسی مضامین سے خود بالکل گریز نہیں کرتے، لیکن انھوں نے جرأت پر چوماچاٹی کا الزام اس لیے لگایا تھا کہ جرأت کے یہاں نری معاملہ بندی ہے، مضمون آفرینی بہت کم ہے اور ابہام و استعارہ تقریباً مفقود ہے۔ میر اگر واضح بیان اختیار بھی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کسی قسم کا حوالہ، طنزیہ، یا تہذیبی یا نفسیاتی ضرور رکھ دیتے ہیں۔ لہٰذا معاملہ صرف یہ نہیں ہے کہ میر کا عشقیہ تجربہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ معاملہ یہ بھی ہے کہ میر اس تجربے کے اظہار کے لیے فنی چابک دستیوں اور باریکیوں کا اظہار بیش از بیش کرتے ہیں۔ ان چابک دستیوں کی بنا پر ان کے یہاں کثرت معنی ہے۔ مضمون کی ان کے یہاں فراوانی ہے اور وہ مضمون آفرینی کے ساتھ جنسی مضمون کا صحیح تناسب قائم رکھتے ہیں۔

مضمون کی فراوانی کے ساتھ میر کے یہاں عام طور پر اور جنسی لذت کے مضامین میں خاص طور پر حواس خمسہ کی کارفرمائی بہت ہے۔ ان کے یہاں تن بدن اور ذہنی کیفیت کا زبردست انضمام و انہماک ہے۔ اس کے برخلاف غالب کے یہاں جنس اور بدن کے بھی اسرار کو تجرید کے ہوائی پردوں میں لپیٹنے کا عمل نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر دیکھیے۔

غالب: کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

میر (دیوان دوم) اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ
آب اس کے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ

غالب کے یہاں بھی جنسی تجربے کا براہ راست حوالہ ہے، لیکن مصرع ثانی میں وہ فوراً تجرید اختیار کر لیتے ہیں۔ میر کے یہاں جنسی تجربے کا حوالہ مصرع ثانی میں اور بھی مستحکم اور بدن کی سطح پر تمام ہوتا ہے۔ لالچ کے موقعے پر بھی میر حواس خمسہ میں سے وہ حس منتخب کرتے ہیں جو لطیف ترین تجربے کو بھی تیزی سے حاصل کر لیتی ہے، یعنی قوت ذائقہ۔

(دیوان پنجم) پانی بھر آیا منھ میں دیکھے جنھوں کے یارب
وے کس مزے کے ہوں گے لب ہائے نا مکیدہ

جنسی لذت اور جنسی تجربے کی تمام حسیاتی جہتوں میں میر کا انہماک و اشتغال تمام تر وہ کیفیت رکھتا ہے جسے مولانا روم نے "نانبائی کے ہاتھ میں خمیری آٹے" کے نادر اور پانچوں حواس پر مبنی استعارے کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ جس طرح نانبائی خمیری آٹے کو کبھی سخت گوندھتا ہے، کبھی نرم کرتا ہے، کبھی اس پر زور سے مٹھیاں لگاتا ہے۔ کبھی اس کو تختے پر پھیلا دیتا ہے، کبھی اچانک اٹھا کر ہاتھ میں لے لیتا ہے، کبھی اس میں پانی ڈالتا ہے، کبھی نمک، کبھی اس کو تندور میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ ٹھیک پکا کہ نہیں، وہی حال عاشق کے ہاتھ میں معشوق کا ہوتا ہے۔ مولانا روم اس کو یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ قدیم اور حادث، عین اور عرض میں بھی اس طرح کی باہم دست و گریبانی روز اول سے ویسی ہی فرض ہے جیسی ویس اور رامیں کے

درمیان بہم بستگی اور بہم آویزش فرض تھی۔ یعنی یہ بھی اصول کائنات ہے اور دونوں حقائق ایک ہی اصول، کائنات کے پرتو ہیں۔ مثنوی (دفتر ششم) میں مولانا کہتے ہیں۔

زن بہ دست مرد در وقت لقا
چوں خمیر آمد بدست نانبا

بسر شد گاہیش نرم و گہ درشت
زو برآرد چاق چاقے زیر مشت

گاہ پہنش وا کشد بر تختۂ
درہمش آرد گہے یک لختۂ

گاہ در وے ریزد آب و گہ نمک
از تنور و آتشش سازد محک

ایں چنیں پیچد مطلوب و طلوب
اندریں لعب اند مغلوب و غلوب

ایں لعب تنہا نہ شورا بازن است
ہر عشیق و عاشقے را ایں فن است

از قدیم و حادث و عین و عرض
پیچشے چوں ویس و رامیں مفترض

ان اشعار کی خوبیاں بیان کرنے میں بہت وقت صرف ہوگا۔ فلسفیانہ نکات میں نے اوپر بیان ہی کردیے ہیں۔ اب صرف یہ دیکھ لیجیے کہ پانچوں حواس (دیکھنا، چھونا، چکھنا، سونگھنا، سننا) یہاں پوری طرح صرف بروئے کار ہی نہیں آئے ہیں بلکہ بیان بھی ہوئے ہیں اور شروع کے چار شعروں میں حرکی پیکر کی اس قدر شدت ہے کہ بڑے بڑے شاعروں کو جھرجھری آجائے۔ جب میر کے سامنے ایسے بڑے بڑے نمونے موجود تھے اور خود ان کی صلاحیتیں بھی ان نمونوں کے برابر کلام کی قوت رکھتی تھیں تو وہ جرأت یا مصحفی یا شاہ حاتم کی طرف کیوں متوجہ ہوتے اور اس میدان میں بھی میر کا کلام ان لوگوں سے ممتاز کیوں نہ ہوتا؟

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میر میں زندگی کے تمام تجربات کو حاصل کرنے اور انھیں شعر کی سطح پر قبول کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ مولانا روم کی طرح وہ بھی ہر بات کو شعر میں کہہ سکتے تھے۔ مثنوی معنوی کے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ جن کو آج کل کے ''مہذب'' لوگ پڑھ یا سن نہیں سکتے۔ مولانا نے ان سے عارفانہ نتائج نکالے ہیں، یہ اور بات ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ مولانا روم کو "فحش" مضامین بیان کرنے سے عار نہ آتی تھی۔ محمد حسن عسکری نے ایک خط میں لکھا ہے کہ جو قصہ بیان کر رہا ہوں وہ فحش تو ہے لیکن مولانا تھانوی نے بیان کیا ہے اور اس سے سبق آموزی کی ہے، اس لیے درج کرتا ہوں۔ پرانی تہذیب میں اس طرح کا احرام وتحریم نہ تھا جیسا آج کل ہم لوگوں نے اختیار کرلیا ہے۔ میر کے ظریفانہ اور پھکو پن کے اشعار پر مولوی عبدالحق باباے اردو ناک بھوں چڑھاتے ہیں (یا شرمندہ ہوتے ہیں۔) باقی لوگ تو ان کا ذکر بھی کرتے شرماتے ہیں۔ حالانکہ وہ اشعار بھی تہذیب وکائنات کے ایک تصور کی عملی صورت ہیں۔ جنسی اشعار میں میر بہت زیادہ کھل تو نہیں کھیلے ہیں لیکن ان کا اصول وہی ہے کہ تہذیب طرح طرح سے اپنا اظہار کرتی ہے اور تہذیب کا ہر مظہر شعر کی سطح پر برتا جاسکتا ہے، اگر شاعر جرأت اظہار کے ساتھ ساتھ سخن طرازی کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

●●●

فہرست غزلیات ردیف وار

غزل نمبر

دیوان اول- ردیف الف

۱ تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
۲ کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا
۳ نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا
۴ جامۂ مستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
۵ اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
۶ شب ہجر میں کم تظلم کیا
۷ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
۸ چمن میں گل نے جو کل دعویِ جمال کیا
۹ دیکھے گا جو تجھ رو کو سو حیران رہے گا
۱۰ تا گور کے اوپر وہ گل اندام نہ آیا
۱۱ جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
۱۲ منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
۱۳ وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا
۱۴ بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
۱۵ دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
۱۶ حال دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سنا
۱۷ جب جنوں سے ہمیں توسل تھا
۱۸ آگے جمال یار کے معذور ہو گیا
۱۹ فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا
۲۰ گل شرم سے بہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
۲۱ مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
۲۲ سنیو جب وہ کبھو سوار ہوا
۲۳ مانند شمع مجلس شب اشک بار پایا
۲۴ مارا زمیں میں گاڑا تب اس کو صبر آیا
۲۵ شکوہ کروں میں کب تک اس اپنے مہرباں کا

غزل نمبر

۲۶ ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
۲۷ سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
۲۸ شب درد و غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا
۲۹ دل میں بھرا ز بسکہ خیال شراب تھا
۳۰ کیا طرح ہے آشنا گاہے گہے نا آشنا
۳۱ گل کو محبوب ہم قیاس کیا
۳۲ مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا
۳۳ اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
۳۴ کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
۳۵ مت ہو دشمن اے فلک مجھ پائمال راہ کا
۳۶ ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا
۳۷ خوبی کا اس کی بسکہ طلب گار ہو گیا
۳۸ تیر جو اس کمان سے نکلا
۳۹ گرمی سے میں تو آتش غم کی پگھل گیا
۴۰ سنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا
۴۱ دل سمجھا نہ محبت کو کچھ ان نے کیا یہ خیال کیا
۴۲ گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
۴۳ دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
۴۴ گل و بلبل بہار میں دیکھا
۴۵ کئی دن سلوک وداع کا مرے در پئے دل زار تھا
۴۶ مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
۴۷ رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا
۴۸ اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
۴۹ ایسا ترا رہگذر نہ ہوگا
۵۰ غم اس کو ساری رات سنایا تو کیا ہوا
۵۱ گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزا
۵۲ دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا

غزل نمبر	
۵۳	یاد ایام کہ یاں ترک شکیبائی تھا
۵۴	اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
۵۵	عالم میں کوئی دل کا طلب گار نہ پایا
۵۶	کیا مرے آنے پہ تو اے بت مغرور گیا
۵۷	خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
۵۸	تا بہ مقدور انتظار کیا
۵۹	شب تھا نالاں عزیز کوئی تھا
۶۰	پھوٹا کیے پیالے لنڈھتا پھرا قرابا
۶۱	دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا
۶۲	سمجھے تھے میر ہم کہ یہ ناسور کم ہوا
۶۳	دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
۶۴	موا میں سجدے میں پر نقش میرا بار رہا
۶۵	جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
۶۶	دل کے تیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
۶۷	گل میں اس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا
۶۸	ادھر آ کر شکار افگن ہمارا
۶۹	گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا
۷۰	سحر گہ عید میں دور سبو تھا
۷۱	راہ دور عشق میں روتا ہے کیا
۷۲	رونا تنک اک تھما تو غم بیکراں سہا
۷۳	بیکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا
۷۴	غمزے نے اس کے چوری میں دل کی ہنر کیا
۷۵	تا کسی سے پاس میرے یار کا آتا گیا
۷۶	ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
۷۷	محبت کا جب روز بازار ہوگا
۷۸	اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
۷۹	کب تلک تو امتحاں میں مجھ سے جدا رہے گا
۸۰	جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا
۸۱	خواب میں تو نظر جمال پڑا

غزل نمبر	
۸۲	نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال لیا
۸۳	نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
۸۴	یہ حسرت ہے مروں اس میں لیے لبریز پیمانا
۸۵	بارہا گور دل جھکا لایا
۸۶	کیا عجب پل میں اگر ترک ہو اس سے جاں کا
۸۷	ہر دم طرف ہے ویسے مزاج کرخت کا
۸۸	ہم عشق میں نہ جانا غم ہی سدا رہے گا
۸۹	بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا برا ہوگا
۹۰	یاں نام یار کس کا ورد زباں نہ پایا
۹۱	پھر شب نہ لطف تھا نہ وہ مجلس میں نور تھا
۹۲	بے حال جائے گر یہ جان پر آرزو کا
۹۳	میں بھی دنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یک جا
۹۴	فلک کا منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا
۹۵	کل شب ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا
۹۶	پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
۹۷	اس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا
۹۸	کب تلک یہ ستم اٹھایئے گا
۹۹	دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
۱۰۰	پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا
۱۰۱	دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
۱۰۲	غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
۱۰۳	چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا
۱۰۴	واں وہ تو گھر سے اپنے پی کر شراب نکلا
۱۰۵	داماں کوہ میں جو میں ڈاڑھ مار رویا
۱۰۶	اس چہرے کی خوبی سے عبث گل کو جتایا
۱۰۷	دل جو زیر غبار اکثر تھا
۱۰۸	تیرا رخ مخطط قرآن ہے ہمارا
۱۰۹	کیا مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا
۱۱۰	جی اپنا میں نے تیرے لیے خوار ہو دیا

غزل نمبر

۱۱۱ خط منھ پہ آئے جاناں خوبی پہ جان دے گا

۱۱۲ ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا

۱۱۳ کل چمن میں گل و سمن دیکھا

۱۱۴ جدا جو پہلو سے وہ دلبر یگانہ ہوا

۱۱۵ کیا دن تھے وے کہ یاں بھی دل آرمیدہ تھا

۱۱۶ کثرت داغ سے دل رشک گلستاں نہ ہوا

۱۱۷ تیرے قدم سے جا لگی جس پہ مرا ہے سر لگا

۱۱۸ قابو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا

۱۱۹ لخت جگر تو اپنے یک لخت رو چکا تھا

۱۲۰ سر دور فلک بھی دیکھوں اپنے روبرو ٹوٹا

۱۲۱ آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا

۱۲۲ غلط ہے عشق میں اے بوالہوس اندیشہ راحت کا

۱۲۳ جو اس شور سے میر روتا رہے گا

۱۲۴ نئی طرزوں سے میخانے میں رنگ مے جھلکتا تھا

۱۲۵ تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا

۱۲۶ دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا

۱۲۷ گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آلوٹا

۱۲۸ برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا

۱۲۹ مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا

۱۳۰ مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبے کا ہمسایا

۱۳۱ نقش بیٹھے ہے کہاں خواہش آزادی کا

۱۳۲ کام پل میں مرا تمام کیا

۱۳۳ رات پیاسا تھا میرے لوہو کا

۱۳۴ آیا تھا خانقہ میں وہ نور دیدگاں کا

۱۳۵ صحرا میں سیل اشک مرا جابجا پھرا

۱۳۶ کس شام سے اٹھا تھا مرے دل میں درد سا

۱۳۷ ترے عشق میں آگے سودا ہوا تھا

۱۳۸ آہ کے تیں دل حیران و خفا کو سونپا

۱۳۹ گلہ نہیں ہے ہمیں اپنی جاں گدازی کا

غزل نمبر

۱۴۰ کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا

۱۴۱ کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا

۱۴۲ سینہ دشنوں سے چاک تا نہ ہوا

۱۴۳ یار عجب طرح نگہ کر گیا

۱۴۴ آہ سحر نے سوزش دل کو مٹا دیا

۱۴۵ اس آستان داغ سے میں زر لیا کیا

۱۴۶ نہیں ایسا کوئی میرا جو ماتم دار ہووے گا

۱۴۷ وہ جو پی کر شراب نکلے گا

۱۴۸ جبکہ تابوت مرا جاے شہادت سے اٹھا

۱۴۹ طفل مطرب جو میرے ہاتھ آتا

۱۵۰ ہو بلبل گلگشت کہ اک دن ہے خزاں کا

۱۵۱ قصہ تمام میر کا شب کو سنا کیا

۱۵۲ مے گلگوں کی بو سے بسکہ میخانہ مہکتا تھا

۱۵۳ اٹھوں نہ خاک سے کشتہ میں کم نگاہی کا

۱۵۴ یک پارہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا

۱۵۵ گرچہ امید امیری پہ میں ناشاد آیا

۱۵۶ جواے قاصد وہ پوچھے میر بھی ایدھر کو چلتا تھا

۱۵۷ کیا کہیے عشق حسن کا آپھی طرف ہوا

۱۵۸ مجھے تو نور نظر نے تنک بھی تن نہ دیا

۱۵۹ تھا زعفراں پہ ہنسنے کو دل جس کی گرد کا

۱۶۰ نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا

۱۶۱ بے تابیوں کے جور سے میں جب کہ مر گیا

۱۶۲ خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا

۱۶۳ دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا

۱۶۴ کس طور تو نے باغ میں آنکھوں کے تیں ملا

۱۶۵ گویا چراغ وقف ہوں میں اس دیار کا

۱۶۶ ہے لب تمکیں علاج میرا

۱۶۷ ابر جب مجھ خاک پر سے ہو گیا

۱۶۸ ترے لعل جاں بخش کو ہم نے ہتلا

غزل نمبر

۱۶۹ ایک عالم ہے کشتہ اس لب کا
۱۷۰ کوہکن نے بھی سر کو پھوڑا تھا
۱۷۱ اس تشنہ کام نے تو پانی بھی پھر نہ مانگا
۱۷۲ صحرا میں رفتہ رفتہ کانٹوں نے سر اٹھایا
۱۷۳ تجھ بن چمن میں جو تھا دل کو ٹٹولتا تھا

دیوان دوم- ردیف الف

۶۶۴ ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
۶۶۵ جلوہ نہیں ہے نظم میں حسن قبول کا
۶۶۶ جو معتقد نہیں ہے علی کے کمال کا
۶۶۷ لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
۶۶۸ پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
۶۶۹ دامن وسیع تھا تو کا ہے کو چشم تر سا
۶۷۰ تیغ ستم سے اس کی مرا سر جدا ہوا
۶۷۱ رفتار و طور و طرز و روش کا یہ ڈھب ہے کیا
۶۷۲ جھمکے دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا
۶۷۳ بہتوں کو آگے تھا یہی آزار عشق کا
۶۷۴ ستم سے گو یہ ترے کشتۂ وفا نہ رہا
۶۷۵ کرتے ہی نہیں ترک بتاں طور جفا کا
۶۷۶ رہتا ہے ہڈیوں سے مری جو ہما لگا
۶۷۷ خط سے وہ زور صفائے حسن اب کم ہو گیا
۶۷۸ کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر گرم رہ ہوا
۶۷۹ مذکور میری سوختگی کا جو چل پڑا
۶۸۰ دل فرط اضطراب سے سیماب سا ہوا
۶۸۱ دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا
۶۸۲ غم ابھی کیا محشر مشہور کا
۶۸۳ نظر میں طور رکھ اس کم نما کا
۶۸۴ وہ ترک مست کسو کی خبر نہیں رکھتا
۶۸۵ گیا میں جان سے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا

غزل نمبر

۶۸۶ میں غش کیا جو خط لے ادھر نامہ بر چلا
۶۸۷ وہ شوخ ہم کو پاؤں تلے ہے ملا کیا
۶۸۸ اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
۶۸۹ کب لطف زبانی کچھ اس غنچہ دہن کا تھا
۶۹۰ یہ روش ہے دلبروں کی نہ کسو سے ساز کرنا
۶۹۱ ایک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا
۶۹۲ اس کام جان و دل سے جو کوئی جدا ہوا
۶۹۳ کل دل آزردہ گلستاں سے گذر ہم نے کیا
۶۹۴ اس قدر آنکھیں چھپاتا ہے تو اے مغرور کیا
۶۹۵ جوں ابر قبلہ دل ہے نہایت ہی بھر رہا
۶۹۶ دل دفعتہً جنوں کا مہیا سا ہو گیا
۶۹۷ دل کی واشد کے لیے کل باغ میں میں ٹک گیا
۶۹۸ پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا
۶۹۹ غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا
۷۰۰ ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا
۷۰۱ تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا
۷۰۲ جی رک گئے اے ہمدم دل خون ہو بھر آیا
۷۰۳ یار ہے میر کا مگر گل سا
۷۰۴ چمن میں جا کے جو میں گرم وصف یار ہوا
۷۰۵ ایک دل کو ہزار داغ لگا
۷۰۶ تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آ گیا
۷۰۷ دل عشق میں خوں دیکھا آنکھوں کو گیا دیکھا
۷۰۸ ناگہ جو وہ صنم ستم ایجاد آ گیا
۷۰۹ گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
۷۱۰ وارد گلشن غزل خواں وہ جو دلبر یاں ہوا
۷۱۱ آیا ہے ابر جب کا قبلے سے تیرۂ تیرا
۷۱۲ یاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پر وہ نہ آ پھرا
۷۱۳ پھریے کب تک شہر میں اب سوئے صحرا رو کیا
۷۱۴ عاشق ترے لاکھوں ہوئے مجھ سا نہ پھر پیدا ہوا

غزل نمبر

۷۱۵ تمام روز جو کل میں پیے شراب پھرا

۷۱۶ لے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا

۷۱۷ اس کام جان و دل نے عالم کا جان مارا

۷۱۸ یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا

۷۱۹ عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا

۷۲۰ مکث طالع دیکھ وہ ایدھر کو چل کر رہ گیا

۷۲۱ طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا

۷۲۲ یہ رنگی بھی ہوتی ہے جی ہی چلا گیا

۷۲۳ سوز دروں سے آخر بھسمنت دل کو پایا

۷۲۴ نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا

۷۲۵ روکش ہوا جو شب وہ بالا ے بام نکلا

۷۲۶ کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا

۷۲۷ کجی اس کی جو میں جتانے لگا

۷۲۸ اللہ رے غرور و ناز تیرا

۷۲۹ آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا

۷۳۰ بالقوہ تک دکھائیے چشم پر آب کا

۷۳۱ خندۂ دنداں نما کرتا جو وہ کافر گیا

۷۳۲ اس بدزباں نے صرف سخن آہ کب کیا

۷۳۳ اب چھاتی کے جلنے نے کچھ طور بدل ڈالا

۷۳۴ طوفان میرے رونے سے آخر کو ہو رہا

۷۳۵ لعل پر کب دل مرا مائل ہوا

۷۳۶ کوئی فقیر یہ اے کاشکے دعا کرتا

۷۳۷ بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا

۷۳۸ حیراں ہے لحظہ لحظہ طرز عجب عجب کا

۷۳۹ سینکڑوں بے کسوں کا جان گیا

۷۴۰ ہنگام شرح غم جگر خامہ شق ہوا

۷۴۱ کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا

۷۴۲ آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا

۷۴۳ سنبل تمھارے گیسوؤں کے غم میں لٹ گیا

غزل نمبر

۷۴۴ سینے میں شوق میر کے سب درد ہو گیا

۷۴۵ کیا تو نمود کس کی کیسا کمال تیرا

۷۴۶ فرو آتا نہیں سر ناز سے اب کے امیروں کا

۷۴۷ ہوئیں رسوائیاں جس کے لیے چھوٹا دیار اپنا

۷۴۸ ربط دل زلف سے اس کی جو نہ چسپاں ہوتا

۷۴۹ جس پہ اس موج سی شمشیر کا اک وار کیا

۷۵۰ شب رفتہ میں اس کے در پر گیا

۷۵۱ بے طاقتی میں تو تو اے میر مر رہے گا

۷۵۲ پند گو مشفق عبث میرا نصیحت گر ہوا

۷۵۳ ٹپکتی پلکوں سے رومال جس گھڑی سرکا

۷۵۴ حلقہ ہوئی وہ زلف کماں کو چھپا رکھا

۷۵۵ میں جوانی میں مے پرست رہا

۷۵۶ چمن بھی ترا عاشق زار تھا

۷۵۷ دل گیا مفت اور دکھ پایا

۷۵۸ چاک کر سینہ دل میں پھینک دیا

۷۵۹ اندوہ و غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا

۷۶۰ منھ پر اس آفتاب کے ہے یہ نقاب کیا

۷۶۱ اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا

۷۶۲ رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا

۷۶۳ عید آئندہ تک رہے گا گلا

۷۶۴ یہ چوٹ کھائی ایسی دل پر کہ جی گنوایا

۷۶۵ سمندر کا میں کیوں احساس سہوں گا

۷۶۶ رکھتا تھا ہاتھ میں سر رشتہ بہت جینے کا

۷۶۷ عشق سے دل پہ تازہ داغ جلا

دیوان سوم- ردیف الف

۱۰۵۵ میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا

۱۰۵۶ دین و دل کے غم کو آساں ناتواں میں لے گیا

۱۰۵۷ میرا ہی مقلد عمل تھا

غزل نمبر

۱۰۵۸ کرتا جنوں جہاں میں بے ننگ و نام آیا
۱۰۵۹ دل اگر کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ یہ دل ہے کیا
۱۰۶۰ ان دلبروں سے رابطہ کرنا ہے کام کیا
۱۰۶۱ چال یہ کیا تھی کہ ایدھر کو گذارا نہ کیا
۱۰۶۲ وہ دل نہیں رہا ہے تعب جو اٹھائے گا
۱۰۶۳ وہ جو گلشن میں جلوہ ناک ہوا
۱۰۶۴ کیا روئیے ہمیں کو یوں آن کر کے مارا
۱۰۶۵ گیا حسن خوبان بدراہ کا
۱۰۶۶ چشم سے خوں ہزار نکلے گا
۱۰۶۷ اعجاز منھ تکے ہے ترے لب کے کام کا
۱۰۶۸ ہوں نشاں کیوں نہ تیر خوباں کا
۱۰۶۹ جس خشم سے وہ شوخ چلا آج شب آیا
۱۰۷۰ کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگانا تھا
۱۰۷۱ سہل ایسا نہ تھا آخر جی سے مرا جانا تھا
۱۰۷۲ تد اس بہشتی رو سے یہ خلطہ بہم کیا
۱۰۷۳ اب کے جو گل کی فصل میں ہم کو جنوں ہوا
۱۰۷۴ رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
۱۰۷۵ ضبط کرتے کرتے اب جو لب کو میں نے وا کیا
۱۰۷۶ سینہ کوبی ہے طپش سے غم ہوا
۱۰۷۷ ہجر کی اک آن میں دل کا ٹھکانا ہوگیا
۱۰۷۸ یاد خط میں اس کے جی بھر آکے گھبراتا رہا
۱۰۷۹ میں گلستاں میں آکے عبث آشیاں کیا
۱۰۸۰ وفا تھی مہر تھی اخلاص تھا تلطف تھا
۱۰۸۱ جنوں میں ساتھ تھا کل لڑکوں کا لشکر جہاں میں تھا
۱۰۸۲ گل بھی ہے معشوق لیکن کب ہے اس محبوب سا
۱۰۸۳ کبھو وہ توجہ ادھر کر رہے گا
۱۰۸۴ میر کل صحبت میں اس کی حرف سر کر رہ گیا
۱۰۸۵ مجھ زار نے کیا گری بازار سے پایا
۱۰۸۶ جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے روسا

غزل نمبر

۱۰۸۷ اگر وہ ماہ نکل گھر سے تک ادھر آتا
۱۰۸۸ وہ کم نما و دل ہے شائق کمال اس کا
۱۰۸۹ زار رکھا بے حال رکھا بے تاب رکھا بیمار رکھا
۱۰۹۰ دل رات دن رہے ہے سینے میں عشق ملتا
۱۰۹۱ بوسہ اس بت کالے کے منھ موڑا
۱۰۹۲ ہے عشق میں صبر ناگوارا
۱۰۹۳ دل عجب چرچے کی جا کہ تھی سودا نہ ہوا
۱۰۹۴ کیا کہے حال کہیں دل زدہ جا کر اپنا
۱۰۹۵ کیا میر دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
۱۰۹۶ ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
۱۰۹۷ دل عجب شہر تھا خیالوں کا
۱۰۹۸ احوال نہ پوچھو کچھ ہم ظلم رسیدوں کا
۱۰۹۹ سطح جو ہاتھوں میں تھا اس کے رخ گلفام کا
۱۱۰۰ کل رات رو کے صبح تلک میں رہا گرا
۱۱۰۱ چاہت کے طرح کش ہو کچھ بھی اثر نہ دیکھا
۱۱۰۲ کیا ہے عشق جب سے میں نے اس ترک سپاہی کا
۱۱۰۳ آنکھوں میں اپنی رات کو خوناب تھا سو تھا

دیوان چہارم- ردیف الف

۱۳۱۲ کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
۱۳۱۳ واجب کا ہو نہ ممکن مصدر صفت ثنا کا
۱۳۱۴ قصہ کہیں تو کیا کہیں ملنے کی رات کا
۱۳۱۵ تجاہل تغافل تساہل کیا
۱۳۱۶ رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا
۱۳۱۷ میں جو نظر سے اس کی گیا تو وہ سرگرم کار اپنا
۱۳۱۸ اے کاش مرے سر پر اک بار وہ آجاتا
۱۳۱۹ مستانہ اگر چہ میں طاعت کو لگا جاتا
۱۳۲۰ یہ دل نے کیا کیا کہ امیر بلا کیا
۱۳۲۱ در پر سے ترے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا

غزل نمبر

۱۳۲۲ دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا
۱۳۲۳ دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا
۱۳۲۴ ہم مست عشق جس کے تھے وہ روٹھ کر گیا
۱۳۲۵ شاید جگر حرارت عشقی سے جل گیا
۱۳۲۶ عشق رسوائی طلب نے مجھ کو سرگرداں کیا
۱۳۲۷ دل سنبھالے کہیں میں کل جو چلا جاتا تھا
۱۳۲۸ ترک لباس سے میرے اسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا
۱۳۲۹ پھرے ہے وحشی سا گم گشتہ عشق کا تیرا
۱۳۳۰ صورت شیریں کے آگے کام اپنا کر گیا
۱۳۳۱ کیا عشق سو پھر مجھے غم رہا
۱۳۳۲ کے گیا مدینے گیا کربلا گیا
۱۳۳۳ عشق کی ہے بیماری ہم کو دل اپنا سب درد ہوا
۱۳۳۴ عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا
۱۳۳۵ اوصاف مو کے شعر سے الجھاؤ پڑ گیا
۱۳۳۶ جان اپنا جو ہم نے مارا تھا
۱۳۳۷ خوب کیا جو اہل کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا
۱۳۳۸ ہم کوے مغاں میں تھے ماہ رمضاں آیا
۱۳۳۹ خوں نہ ہوا دل چاہیے جیسا گو اب کام سے جاوے گا
۱۳۴۰ بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
۱۳۴۱ دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا
۱۳۴۲ اگرچہ جہاں میں نے سب چھان مارا
۱۳۴۳ جگر خوں کیا چشم نم کر گیا
۱۳۴۴ یاری کیے کسو کا کاہے کو کام نکلا
۱۳۴۵ نے ہم سے کچھ نہ اس ستم ایجاد سے ہوا
۱۳۴۶ زار کیا بیمار کیا اس دل نے کیا آزار کیا
۱۳۴۷ سینے کا سوز بہت بھڑکا جلا تن مارا
۱۳۴۸ پیری میں بے دنداں ہو بیٹھے پر افسوس یہ ہم کو رہا
۱۳۴۹ چاہت کا اظہار کیا سو اپنا کام خراب ہوا
۱۳۵۰ تھا محبت سے کبھو ہم میں کبھو یہ غم میں تھا

غزل نمبر

۱۳۵۱ وفاداری نے جی مارا ہمارا

دیوان پنجم - ردیف الف

۱۵۳۴ دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا
۱۵۳۵ بے حرف خامہ دل زدہ حسن قبول کا
۱۵۳۶ عشق تو بن رسوائی عالم باعث ہے رسوائی کا
۱۵۳۷ دور بہت بھاگو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
۱۵۳۸ اگر ہنستا اسے سیر چمن میں اب کے پاؤں گا
۱۵۳۹ رسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا
۱۵۴۰ منھ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا
۱۵۴۱ سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
۱۵۴۲ کیا پوچھو ہو کیا کہیے میاں دل نے بھی کیا کام کیا
۱۵۴۳ عشق ہو حیوان کا یا انس ہو انسان کا
۱۵۴۴ عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گئی آرام گیا
۱۵۴۵ طوف مشہد کو کل جو جاؤں گا
۱۵۴۶ ہر جا پھرا غبار ہمارا اڑا ہوا
۱۵۴۷ پہلو سے اٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا
۱۵۴۸ آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی ادھر سے آوے گا
۱۵۴۹ شیخ حرم سے لڑ کے چلا ہوں اب کعبے میں نہ آوں گا
۱۵۵۰ کیسی سعی حوادث نے کی آخرکار ہلاک کیا
۱۵۵۱ بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
۱۵۵۲ ناگاہ جس کو عشق کا آزار ہو گیا
۱۵۵۳ پھرتے پھرتے اس کے لیے ہیں آخر وحشت خوردہ ہوا
۱۵۵۴ عشق صمد میں جان چلی وہ چاہت کا ارمان گیا
۱۵۵۵ دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
۱۵۵۶ جاذبہ میرا تھا کامل سو بندے کے وہ گھر آیا
۱۵۵۷ اب یاں سے ہم اٹھ جائیں گے خلق خدا ملک خدا
۱۵۵۸ اس کی سی جو چلے ہے راہ تو کیا
۱۵۵۹ بات کہتے جی کا جانا ہو گیا

غزل نمبر

۱۵۶۰ عشق بلا پر شور و شر نے جب میدان میں خم مارا

۱۵۶۱ چاہ میں جور ہم پہ کم نہ ہوا

۱۵۶۲ کل تلک داغوں سے خوں کے دامن زیں پاک تھا

۱۵۶۳ جدا اس سیم تن سے کیسا سونا

۱۵۶۴ سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا

۱۵۶۵ دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا

۱۵۶۶ عشق کیے پچھتائے ہم تو دل نہ کسو سے لگانا تھا

۱۵۶۷ ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا

۱۵۶۸ ایک نہ خواہش بر آئی تا جی کا غبار نکل جاتا

۱۵۶۹ کیا کیا عشق میں رنج اٹھائے دل اپنا سب خون ہوا

۱۵۷۰ آیا سو آب تیغ ہی مجھ کو چٹا گیا

۱۵۷۱ کچھ اندیشہ ہم کو نہیں ہے اپنے حال درہم کا

۱۵۷۲ گلچیں نہیں جو کوئی بھی اس تازہ چمن کا

۱۵۷۳ یہ تو جدائی جوں توں کٹی ہے ملیے گا تو کہیے گا

دیوان ششم - ردیف الف

۱۷۸۴ فلک نے پیس کر سرمہ بنایا

۱۷۸۵ اپنے ہوتے تو باعتاب رہا

۱۷۸۶ بے طاقتی نے دل کی گرفتار کر دیا

۱۷۸۷ موئے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا

۱۷۸۸ سوز دروں سے مجھ پہ ستم برملا ہوا

۱۷۸۹ جمع اس کے نکلے عالم ہو گیا

۱۷۹۰ وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا

۱۷۹۱ باتیں ہماری یاد رہیں پھر ایسی باتیں نہ سنیے گا

۱۷۹۲ تھا اندوہ گرہ مدت سے دل میں خوں ہو درد ہوا

۱۷۹۳ میں رنج عشق کھینچے بہت ناتواں ہوا

۱۷۹۴ جس رفتنی کو عشق کا آزار ہو گیا

۱۷۹۵ دشمن ہو جی کا گاہک ہوتا ہے جس کو چاہا

۱۷۹۶ بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا

غزل نمبر

۱۷۹۷ میں ہوں خاک افتادہ جس آزار کا

۱۷۹۸ جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا

۱۷۹۹ دیر بد عہد وہ جو یار آیا

۱۸۰۰ زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا

۱۸۰۱ ہو کوئی اس بے وفا دلدار سے کیا آشنا

۱۸۰۲ گئے تھے سیر چمن کو اٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا

۱۸۰۳ پڑا تھا شور جیسا ہر طرف اس لاابالی کا

۱۸۰۴ دل جو ناگاہ بے قرار ہوا

۱۸۰۵ جس ستم دیدہ کو اس عشق کا آزار ہوا

۱۸۰۶ آج اس خوش پرکار جواں مطلوب حسین نے لطف کیا

۱۸۰۷ اب یار دو پہر کو کھڑا ٹک جو یاں رہا

۱۸۰۸ سخن مشتاق ہے عالم ہمارا

دیوان اول - ردیف ب

۱۷۴ رکھتا ہے ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب

۱۷۵ اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پر آب روز و شب

۱۷۶ رونا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب

۱۷۷ ہوتا نہ پائے سرو جو جوئے چمن میں آب

۱۷۸ کس کی مسجد کیسے میخانے کہاں کے شیخ و شاب

۱۷۹ دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب

۱۸۰ ہوئے آدم کو بھی بہشت نصیب

دیوان دوم - ردیف ب

۷۶۸ اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب

۷۶۹ داغ ہوں جلتا ہے دل بے طور اب

۷۷۰ وہ جو کشش تھی اس کی طرف سے کہاں ہے اب

۷۷۱ شبنم سے کچھ نہیں ہے گل و یاسمن میں آب

۷۷۲ جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہے اب

۷۷۳ عشاق کے تئیں ہے عجز و نیاز واجب

۷۷۴ تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب

غزل نمبر

۷۷۵ جو کہو تم سو ہے بجا صاحب
۷۷۶ عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کریے اب
۷۷۷ برقع میں کیا چھپیں دے ہو ویں جنھوں کی یہ تاب

دیوان سوم - ردیف ب

۱۱۰۴ ماہ صیام آیا ہے قصد اعتکاف اب
۱۱۰۵ طاقت تعب کی غم میں تمھارے نہیں ہے اب
۱۱۰۶ بولا جو مو پریشاں آنکلے میر صاحب
۱۱۰۷ دل پر تو چوٹ تھی ہی زخمی ہوا جگر سب
۱۱۰۸ شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
۱۱۰۹ سب آتش سوزندۂ دل سے ہے جگر آب
۱۱۱۰ پڑا ہے فرق خورد و خواب میں اب

دیوان چہارم - ردیف ب

۱۳۵۲ ہوا جو دل خوں خرابی آئی ہر ایک اعضا میں ہے فتور اب
۱۳۵۳ کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب
۱۳۵۴ بیکار بھی درکار ہیں سرکار میں صاحب
۱۳۵۵ درد سر کا پہر پہر ہے اب
۱۳۵۶ جوش رونے کا مجھے آیا ہے اب
۱۳۵۷ کیا کریں تدبیر دل مقدور سے باہر ہے اب
۱۳۵۸ خلاف وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب
۱۳۵۹ یار میرا بہت ہے یار فریب
۱۳۶۰ کوئی اپنا نہ یار ہے نہ حبیب

دیوان پنجم - ردیف ب

۱۵۷۴ کب سے صحبت بگڑ رہی ہے کیونکر کوئی بنا دے اب
۱۵۷۵ دل خوں ہوا تھا یکسر پانی ہوا جگر سب
۱۵۷۶ عشق و جنوں کی کیا اب تدبیر ہے مناسب
۱۵۷۷ تاب عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت ہے اب
۱۵۷۸ سادے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب

غزل نمبر

۱۵۷۹ کاوش سے ان پلکوں کی رہتی ہے خلش سی جگر میں اب
۱۵۸۰ باہم ہوئی ہے ترک ملاقات کیا سبب
۱۵۸۱ دل کے گئے بے کس کہلائے ایسا کہاں ہمدم ہے اب

دیوان ششم - ردیف ب

۱۸۰۹ ہے عشق میں جو حال بتر تو ہے کیا عجب
۱۸۱۰ آیا ہے شیب سر پہ گیا ہے شباب اب
۱۸۱۱ منھ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
۱۸۱۲ آئینہ سا جو کوئی یاں آشنا صورت ہے اب
۱۸۱۳ مارے ہی ڈالے ہے جس کا زندگی میں اضطراب
۱۸۱۴ اس مغل زا سے نہ تھی ہر بات کی تکرار خوب

دیوان اول - ردیف ت

۱۸۱ روزانہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات
۱۸۲ سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
۱۸۳ پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
۱۸۴ چھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزار محبت
۱۸۵ جی میں ہے یاد رخ و زلف سیہ فام بہت
۱۸۶ کیا کہیں اپنی اس کی شب کی بات
۱۸۷ ہر صبح دم کروں ہوں الحاح با انابت

دیوان دوم - ردیف ت

۷۷۸ دیر کچھ کھنچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
۷۷۹ ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
۷۸۰ یاد آیا ہے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
۷۸۱ سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات
۷۸۲ کیا پوچھتے ہو آہ مرے جنگجو کی بات
۷۸۳ سنتا نہیں اگرچہ ہمارا نگار بات
۷۸۴ ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
۷۸۵ ہے زباں زد جو سکندر ہو چکا لشکر سمیت

غزل نمبر

۷۸۶ دیکھیے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت

۷۸۷ ملامت گر نہ مجھ کو کر ملامت

دیوان سوم- ردیف ت

۱۱۱۱ شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت

۱۱۱۲ عجب نہیں ہے نہ جانے جو میر چاہ کی ریت

۱۱۱۳ جب سے چلی چمن میں ترے رنگ پاں کی بات

۱۱۱۴ مانند مرغ دوست نہ کہہ بار بار دوست

۱۱۱۵ سیر کی ہم نے اٹھ کے تا صورت

۱۱۱۶ وصل دلبر نہ تک ہوا قسمت

۱۱۱۷ زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت

۱۱۱۸ کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت

۱۱۱۹ خدا جانے ہووے گی کیا نہایت

دیوان چہارم- ردیف ت

۱۳۶۱ جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات

۱۳۶۲ دیر کب رہنا ملے ہے یاں نہیں مہلت بہت

۱۳۶۳ چشم رہنے لگی پر آب بہت

۱۳۶۴ دل نے کام کیے ہیں ضائع دلبر ہے دل خواہ بہت

۱۳۶۵ کرتا ہے گرچہ یاروں سے وہ ٹیڑھی بانکی بات

دیوان پنجم- ردیف ت

۱۵۸۲ دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت

۱۵۸۳ باد صبا نے اہل چمن میں اس چہرے کی چلائی بات

۱۵۸۴ زرد ہیں چہرے سوکھ گئے ہیں یعنی ہیں بیمار بہت

۱۵۸۵ چپکے کھڑا اکڑے ہوتا ہوں ساری ہے الفت کی بات

۱۵۸۶ چشم رہتی ہے اب پر آب بہت

۱۵۸۷ اچٹتی سی لگی اپنے تو وہ تلوار یا قسمت

دیوان ششم- ردیف ت

۱۸۱۵ جو کوئی اس بے وفا سے دل لگاتا ہے بہت

غزل نمبر

۱۸۱۶ منہ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت

۱۸۱۷ کیا کہیں ہے حال دل درہم بہت

۱۸۱۸ باہر چلنے میں آبادی سے کر نہ تغافل یار بہت

دیوان اول- ردیف ٹ

۱۸۸ نہ پایا دل ہوا روز سیہ سے جس کا جا لٹ پٹ

دیوان سوم- ردیف ٹ

۱۱۲۰ کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ

دیوان سوم- ردیف ث

۱۱۲۱ تری جستجو یار کی ہے عبث

دیوان چہارم- ردیف ث

۱۳۶۶ نہیں گر چوٹ دل پر گریہ و زاری کا کیا باعث

۱۳۶۷ عہد اس کا غلط قرار عبث

دیوان پنجم- ردیف ث

۱۵۸۸ دل کو اس بے مہر سے ہم نے لگایا ہے عبث

دیوان اول- ردیف ج

۱۸۹ آئے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج

دیوان چہارم- ردیف ج

۱۳۶۸ حال برا ہے تم کو ہم سے اتنی غفلت کیا ہے آج

۱۳۶۹ ہم تو لب خوش رنگ کو اس کے مانا لعل احمر آج

دیوان پنجم- ردیف ج

۱۵۸۹ کس تازہ مقتل پہ کشندے تیرا ہوا ہے گذارا آج

۱۵۹۰ شہر سے یار سوار ہوا جو سواد میں خوب غبار ہے آج

۱۵۹۱ رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج

۱۵۹۲ کہوں سو کیا کہوں نے صبر نے قرار ہے آج

غزل نمبر

دیوان اول – ردیف چ

۱۹۰ کاش اٹھیں ہم بھی گنہگاروں کے بیچ
۱۹۱ فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ
۱۹۲ کر نہ تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ
۱۹۳ ساتھ ہو اک بےکسی کے عالم ہستی کے بیچ

دیوان دوم – ردیف چ

۷۸۸ آگ سا تو جو ہوا اے گل تر آن کے بیچ
۷۸۹ عشق میں اے طبیب ہاں ٹک سوچ
۷۹۰ دل کھو گیا ہوں میں یہیں دیوانہ پن کے بیچ
۷۹۱ جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ
۷۹۲ آتی ہے خون کی بو دوستی یار کے بیچ

دیوان سوم – ردیف چ

۱۱۲۲ حال کہنے کی کسے تاب اس آزار کے بیچ
۱۱۲۳ کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ
۱۱۲۴ جانا نہ دل کو تھا تری زلف رسا کے بیچ

دیوان چہارم – ردیف چ

۱۳۷۰ آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ
۱۳۷۱ صورت پھرے نہ یار کی کیوں چشم تر کے بیچ
۱۳۷۲ رنج کیا کیا ہم نے کھینچے دوستی یاری کے بیچ
۱۳۷۳ گل منعکس ہوئے ہیں بہت آب جو کے بیچ

دیوان پنجم – ردیف چ

۱۵۹۳ آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان کے بیچ
۱۵۹۴ فصل گل میں اسیر ہوئے تھے من ہی کی رہی من کے بیچ
۱۵۹۵ اس کے رنگ کھلا ہے شاید کوئی پھول بہار کے بیچ
۱۵۹۶ اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ

دیوان ششم – ردیف چ

۱۸۱۹ لطف جیسے ہیں اس کی چاہ کے بیچ

غزل نمبر

۱۸۲۰ وامق و فرہاد و مجنوں کون ہے یاروں کے بیچ
۱۸۲۱ دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ

دیوان اول – ردیف ح

۱۹۴ ہونے لگا گذار غم یار بےطرح
۱۹۵ خاطر کرے ہے جمع وہ ہر بار ایک طرح

دیوان دوم – ردیف ح

۷۹۳ آنے کی اپنے کیا کہیں اس گلستاں کی طرح
۷۹۴ دور گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح

دیوان سوم – ردیف ح

۱۱۲۵ یاد آ گیا تو بہنے لگیں آنکھیں جو کی طرح

دیوان چہارم – ردیف ح

۱۳۷۴ کیا ہم بیاں کسو سے کریں اپنے ہاں کی طرح
۱۳۷۵ مر گیا فرہاد جیسے مرتے بارے اس طرح
۱۳۷۶ پہنچے ہے ہم کو عشق میں آزار ہر طرح

دیوان پنجم – ردیف ح

۱۵۹۷ گھر سے لیے نکلتا ہے تلوار بےطرح
۱۵۹۸ وہ نوبادۂ گلشن خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح

دیوان اول – ردیف خ

۱۹۶ ہے نہیں دشمن جہاں وہ شوخ

دیوان دوم – ردیف خ

۷۹۵ اگرچہ لعل بدخشاں میں رنگ ڈھنگ ہے شوخ

دیوان چہارم – ردیف خ

۱۳۷۷ ہے میرے جو سرشک دمادم کا رنگ سرخ

دیوان پنجم – ردیف خ

۱۵۹۹ جھمک سے اس کے بدن میں ہر ایک جا ہے شوخ

غزل نمبر
١٦٠٠ گلبن چمن کے اس کو جو دیکھتے ہیں گستاخ

دیوان اول- ردیف د

١٩٧ کیا ہے یہ جو گاہے آجاتی ہے آندھی کوئی زرد
١٩٨ آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد
١٩٩ نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد
٢٠٠ ہوں رہگذر میں تیرے ہر نقش پا ہے شاہد
٢٠١ اے گل نو دمیدہ کے مانند
٢٠٢ قفس تو یاں سے گئے پر مدام ہے صیاد
٢٠٣ میرے سنگ مزار پر فرہاد

دیوان دوم- ردیف د

٧٩٦ رہیے بغیر تیرے اے رشک ماہ تا چند
٧٩٧ تجھ بن اے نوبہار کے مانند
٧٩٨ آواز ہماری سے نہ رک ہم ہیں دعا یاد
٧٩٩ اسیر کر کے نہ لی تو نے تو خبر صیاد
٨٠٠ لڑ کے پھر آئے ڈر گئے شاید
٨٠١ بنی تھی کچھ اک اس سے مدت کے بعد

دیوان سوم- ردیف د

١١٢٦ زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند
١١٢٧ ہماری بات کو اے شمع بزم کریو یاد
١١٢٨ عشق تو ہو ہی گیا سب تن میں ہے سو درد درد
١١٢٩ بہت ہے تن درد پر درد زرد

دیوان چہارم- ردیف د

١٣٧٨ زردی عشق سے ہے تن زار بد نمود
١٣٧٩ کب سے ہے باغ کے پس دیوار باش و بود
١٣٨٠ جا دے جدائی کا یہ آزار گاہ باشد
١٣٨١ تن کو جس جا کہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
١٣٨٢ اس کی دوری میں کڑھا کرتے ہیں ہم حد سے زیاد

غزل نمبر
١٣٨٣ شعر دیواں کے میرے کر کر یاد

دیوان پنجم- ردیف د

١٦٠١ اس سے نہ الفت ہو مجھ کو تو ہووے نہ میرا چہرہ زرد
١٦٠٢ کہتے ہو تم کہ یکسر مجھ میں وفا ہے شاید
١٦٠٣ رکھتا ہے دل کنار میں صد پارہ دردمند
١٦٠٤ ہے عشق کا فسانہ میرا نہ یاں زباں زد
١٦٠٥ کیا کہیے ہوئے مملکت ہستی میں وارد
١٦٠٦ کچھ تدبیر بتاؤ ہم کو دل اپنا ہے درد آلود

دیوان چہارم- ردیف ذ

١٣٨٤ درویشی کی جو خشکی ہے سو ہے لذیذ

دیوان اول- ردیف ر

٢٠٤ اودھر تلک ہی چرخ کے مشکل ہے ٹک گذر
٢٠٥ غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر
٢٠٦ نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر
٢٠٧ دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار
٢٠٨ یہ عشق بے اجل کش ہے بس اے دل اب توکل کر
٢٠٩ کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفا کار اس قدر
٢١٠ قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر
٢١١ دل و دماغ و جگر یہ سب اک بار
٢١٢ لبوں پر ہے ہر لحظہ آہ شرر بار
٢١٣ غصے سے اٹھ چلے ہو تو دامن کو جھاڑ کر
٢١٤ مرتے ہیں تیری نرگس بیمار دیکھ کر
٢١٥ دیکھ اس کو ہنستے سب کے دم سے گئے اکھڑ کر
٢١٦ کہتا ہے کون تجھ کو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
٢١٧ شیخی کا اب کمال ہے کچھ اور
٢١٨ دل جو اپنا ہوا تھا زخمی چور
٢١٩ غیروں سے مل چلے تم مست شراب ہو کر
٢٢٠ ہو آدمی اے چرخ ترک گردش ایام کر

غزل نمبر

۲۲۱ رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخرکار
۲۲۲ خط میں ہے کیا سماں پسینے پر
۲۲۳ ہم بھی پھرتے ہیں یک حشم لے کر
۲۲۴ داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر
۲۲۵ پشت پا ماری بسکہ دنیا پر
۲۲۶ جھوٹے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر
۲۲۷ آزار دیکھیے کیا کیا ان پلکوں سے اٹک کر
۲۲۸ نظر کر کے وہ سلک دندان یار
۲۲۹ رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

دیوان دوم- ردیف ر

۸۰۲ رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر
۸۰۳ کیا کیا نہ ہم نے کھینچے آزار تیری خاطر
۸۰۴ اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذار
۸۰۵ آغشتہ خون دل سے سخن تھے زبان پر
۸۰۶ کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر
۸۰۷ مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
۸۰۸ طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اور
۸۰۹ آ ہم نشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر
۸۱۰ آئی ہے اس کے کوچے سے ہو کر صبا کچھ اور
۸۱۱ چمکی ہے جب سے برق سحر گلستاں کی اور
۸۱۲ نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور
۸۱۳ آخر دکھائی عشق نے چھاتی فگار کر
۸۱۴ جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
۸۱۵ رہ جاؤں چپ نہ کیونکے برا جی میں مان کر
۸۱۶ مجھ کو قفس میں سنبل و ریحاں کی کیا خبر
۸۱۷ اب تنگ ہوں بہت میں مت اور دشمنی کر

دیوان سوم- ردیف ر

۱۱۳۰ گرمی سے گفتگو کی کر لے قیاس جاں پر

غزل نمبر

۱۱۳۱ چیں مارا دل غموں نے کوٹ کر
۱۱۳۲ اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
۱۱۳۳ جب ہم کلام ہم سے ہوتا ہے پان کھا کر
۱۱۳۴ پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفائے تن پر
۱۱۳۵ سحر گوش گل میں کہا میں نے جا کر
۱۱۳۶ صاف غلطاں خوں میں ہے نخچیر یار
۱۱۳۷ مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور
۱۱۳۸ دعویٰ ہے یوں ہی اس کا ترے حسن گوش پر
۱۱۳۹ کیا جانیں گے کہ ہم بھی عاشق ہوئے کسو پر

دیوان چہارم- ردیف ر

۱۳۸۵ مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر
۱۳۸۶ مرتے ہیں ہم تو آدم خاکی کی شان پر
۱۳۸۷ کیا صبر ہم نے جو اس کے ستم پر
۱۳۸۸ تجھ کو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر
۱۳۸۹ کل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا بے کل ہو کر
۱۳۹۰ یہ لطف اور پوچھا مجھ سے خطاب کر کر
۱۳۹۱ جدائی تا جدائی فرق ہے ملتے بھی ہیں آ کر
۱۳۹۲ اس رفتہ پاس اس کو لائے تھے لوگ جا کر
۱۳۹۳ بزم میں منھ ادھر کریں کیوں کر

دیوان پنجم- ردیف ر

۱۶۰۷ اپنے سوئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
۱۶۰۸ کئی داغ ایسے جلائے جگر پر
۱۶۰۹ بھروسا اسیری میں تھا بال و پر پر
۱۶۱۰ عشق خدائی خراب ہے ایسا جس سے گئے ہیں گھر کے گھر
۱۶۱۱ بات کہو کیا چپکے چپکے بیٹھ رہو ہو یاں آ کر
۱۶۱۲ ٹیڑھی نگاہ کیا کرتے ہو دم بھر کے یاں آنے پر
۱۶۱۳ روزوں میں رہ سکیں گے ہم بے شراب کیونکر
۱۶۱۴ تڑپے ہے غم زدہ دل لاوے گا تاب کیونکر

غزل نمبر

۱۶۱۵ لاوے جھمکتے رخ کی آئینہ تاب کیونکر
۱۶۱۶ سنا تم نے جو گذرا سانحہ ہجراں میں یاروں پر
۱۶۱۷ اک آدھ دن نکل مت اے ابر ادھر سے ہوکر
۱۶۱۸ عشق ہمارا خون کرے ہے جی نہیں رہتا یار بغیر
۱۶۱۹ خندہ بجائے گریہ و اندوہ و آہ کر
۱۶۲۰ شوریدہ سر رکھا ہے جب سے اس آستاں پر
۱۶۲۱ آیا نہ پھر ادھر وہ مست شراب ہوکر
۱۶۲۲ ابر سیہ قبلے سے اٹھ کر آیا ہے میخانے پر
۱۶۲۳ سعی سے اس کی ہوا مائل گریباں چاک پر

دیوان ششم - ردیف ر

۱۸۲۲ دل گئے آفت آئی جانوں پر
۱۸۲۳ آئے ہو گھر سے اٹھ کر میرے مکاں کے اوپر
۱۸۲۴ آیا جو اپنے گھر سے وہ شوخ پان کھاکر
۱۸۲۵ آیا ہے ابر قبلہ چلا خانقاہ پر
۱۸۲۶ میلان دلبر با ہو کیونکر وفا کے اوپر
۱۸۲۷ زانو پہ سر ہے اکثر مت فکر اس قدر کر
۱۸۲۸ باندھے کمر سحر گہ آیا ہے میرے کیں پر
۱۸۲۹ گل کیا جسے کہیں کہ گلے کا تو ہار کر

دیوان اول - ردیف ڑ

۲۳۰ آشوب دیکھ چشم تری سر رہے ہیں جوڑ

دیوان اول - ردیف ز

۲۳۱ ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا وا ہنوز
۲۳۲ ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز
۲۳۳ مر گیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز
۲۳۴ مجھ کو پوچھا بھی نہ یہ کون ہے غم ناک ہنوز
۲۳۵ ہو چکا خون جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز

دیوان دوم - ردیف ز

۸۱۸ اس شوخ سے سنا نہیں نام صبا ہنوز

غزل نمبر

۸۱۹ ہے میرے لوہو رونے کا آثار سا ہنوز
۸۲۰ کب تک بھلا بتاؤ گے یوں صبح شام روز

دیوان سوم - ردیف ز

۱۱۴۰ ہے تند و تیز اس کی نگاہ اس طرف ہنوز

دیوان چہارم - ردیف ز

۱۳۹۴ ہے زیر خاک لاشہ عاشق طپاں ہنوز
۱۳۹۵ دیوانگی کی ہے وہی زور آوری ہنوز
۱۳۹۶ گرچہ آتے ہیں گل ہزار ہنوز
۱۳۹۷ وہ خط ہے محو ناز ہنوز
۱۳۹۸ خاک ہو کر اڑیں ہیں یار ہنوز
۱۳۹۹ دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز

دیوان پنجم - ردیف ز

۱۶۲۴ اس بستر افسردہ کے گل خوشبو ہیں مرجھائے ہنوز
۱۶۲۵ کب سے گیا ہے آیا نہیں نامہ بر ہنوز
۱۶۲۶ کب سے آنے کہتے ہیں تشریف نہیں لاتے ہیں ہنوز
۱۶۲۷ کب سے قیدی ہیں پہ ہے نالش بسیار ہنوز
۱۶۲۸ سرکش ہے تندخو ہے عجب ہے زباں دراز

دیوان اول - ردیف س

۲۳۶ اے ابر تر تو اور کسی مت کو برس
۲۳۷ کیونکے نکلا جائے بحر غم سے مجھ بے دل کے پاس
۲۳۸ مر گیا میں ملا نہ یار افسوس

دیوان دوم - ردیف س

۸۲۱ گئے جس دم سے ہم اس تندخو پاس
۸۲۲ جب بٹھاویں مجھے جلاد جفا کار کے پاس
۸۲۳ عزت نہیں ہے دل کی کچھ اس دلربا کے پاس
۸۲۴ رہتے تھے ہم دے آنکھ پھریا تو پاس پاس

غزل نمبر

دیوان سوم - ردیف س

۱۱۴۱ گلامت توڑ اپنا اے جرس بس
۱۱۴۲ عشق میں غم نہ چشم تر ہے بس
۱۱۴۳ امیروں تک رسائی ہو چکی بس

دیوان چہارم - ردیف س

۱۴۰۰ مدت ہجر میں کیا کریے بیاں یار کے پاس
۱۴۰۱ کل ہاتھ جا رہا تھا دل بے قرار پاس
۱۴۰۲ اب نہیں ہوتی چشم تر افسوس

دیوان پنجم - ردیف س

۱۶۲۹ یار ہم سے جدا ہوا افسوس
۱۶۳۰ کوئی دن کریے معیشت جا کسو کامل کے پاس
۱۶۳۱ صد پارہ گلا تیرا ہے کر ضبط نفس بس
۱۶۳۲ آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس
۱۶۳۳ کیا کیا تم نے ہم سے کہا تھا کچھ نہ کیا افسوس افسوس

دیوان اول - ردیف ش

۲۳۹ ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
۲۴۰ دل تو افگار ہے جگر ہے ریش

دیوان دوم - ردیف ش

۸۲۵ گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
۸۲۶ کیا کہیے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
۸۲۷ مطلق نہیں ہے ایدھر اس دلربا کی خواہش
۸۲۸ ہم پر روا جو رکھتے ہو جور و جفا ہمیش

دیوان سوم - ردیف ش

۱۱۴۴ اس کے در پر شب نہ کر اے دل خروش
۱۱۴۵ طرح خوش ناز خوش اس کی ادا خوش
۱۱۴۶ فکر میں مرگ کے ہوں سر در پیش

غزل نمبر

۱۱۴۷ ہوں تو دریا پر کیا ترک خروش

دیوان چہارم - ردیف ش

۱۴۰۳ نکلے پردے سے روے یار اے کاش
۱۴۰۴ اس کا خیال آوے ہے عیار کی روش
۱۴۰۵ رہتے ہیں بہت دل کے ہم آزار سے ناخوش

دیوان پنجم - ردیف ش

۱۶۳۴ رکھتے رہے بتوں سے مہر و وفا کی خواہش
۱۶۳۵ رنج و غم آئے بیشتر در پیش
۱۶۳۶ کرکریں ہیں لجوں لطموں کے دڑیڑے سب کے گوش
۱۶۳۷ ادھر آتا بھی وہ سوار اے کاش
۱۶۳۸ غصے میں ناخنوں نے مرے کی ہے کیا تلاش

دیوان اول - ردیف ص

۲۴۱ شیخ ہو دشمن زن رقاص

دیوان سوم - ردیف ص

۱۱۴۸ ہے دل بیتاب کا بھی ویسا رقص

دیوان چہارم - ردیف ص

۱۴۰۶ طائر دل کی طپش سینے میں جانو تم بسمل کا رقص

دیوان پنجم - ردیف ص

۱۶۳۹ شاعری شیوہ ہے شعار اخلاص

دیوان اول - ردیف ض

۲۴۲ سال میں ابر بہاری تجھ سے اک باری ہے فیض

دیوان سوم - ردیف ض

۱۱۴۹ آج رکھ آیا کمر میں پیش قبض

دیوان چہارم - ردیف ض

۱۴۰۷ کیا کہوں کیسا ہے دلبر خود غرض

غزل نمبر

دیوان پنجم - ردیف ض

۱۶۴۰ عالم علم سے اس عالم میں ہر لحظہ طاری ہے فیض

دیوان اول - ردیف ط

۲۴۳ سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط

دیوان دوم - ردیف ط

۸۲۹ عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط
۸۳۰ کرتے نہیں ہیں اس سے نیا کچھ ہم اختلاط

دیوان سوم - ردیف ط

۱۱۵۰ شاید اس سادہ نے رکھا ہے خط
۱۱۵۱ ہم نہ سمجھے رابطہ ان نوخطوں سے تھا غلط

دیوان چہارم - ردیف ط

۱۴۰۸ دل لگی کے تئیں جگر ہے شرط
۱۴۰۹ دل کا لگانا جی کھوتا ہے اس کو جگر ہے پیارے شرط

دیوان پنجم - ردیف ط

۱۶۴۱ جس کو ہوا ہے اس صنم بے وفا سے ربط
۱۶۴۲ عشق کو جرأت و جگر ہے شرط
۱۶۴۳ رکھتا ہے میرے دل سے تمھارا غم اختلاط

دیوان اول - ردیف ظ

۲۴۴ غیر مجھ کو جو کہتے ہیں محظوظ

دیوان سوم - ردیف ظ

۱۱۵۲ جو وہ ہے تو ہے زندگانی سے حظ

دیوان چہارم - ردیف ظ

۱۴۱۰ عشق ہمارا جی مارے ہے ہم ناداں ہیں کیا محظوظ

دیوان پنجم - ردیف ظ

۱۶۴۴ لطف جوانی کے ساتھ گئے پیری نے کیا ہے کیا محظوظ

غزل نمبر

دیوان اول - ردیف ع

۲۴۵ سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آتی ہے شمع
۲۴۶ یوں جلا ڈالا کہ کچھ روشن نہ ہوئی تقریر شمع

دیوان دوم - ردیف ع

۸۳۱ تیرے ہوتے شام کو گر بزم میں آجائے شمع
۸۳۲ اس کے ہوتے بزم میں فانوس میں آتی ہے شمع
۸۳۳ عشق میں کچھ نہیں دوا سے نفع

دیوان سوم - ردیف ع

۱۱۵۳ آگے جب اس آتشیں رخسار کے آتی ہے شمع
۱۱۵۴ ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع

دیوان چہارم - ردیف ع

۱۴۱۱ ایک ہی گل کا صرف کیا ہے میں نے سراپا جیسے شمع

دیوان پنجم - ردیف ع

۱۶۴۵ لیے داغ سر پر جو آئی تھی شمع
۱۶۴۶ کیا جھمکا فانوس میں اپنا دکھلاتی ہے دور سے شمع
۱۶۴۷ آتی ہے مجلس میں تو فانوس میں آتی ہے شمع

دیوان اول - ردیف غ

۲۴۷ ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
۲۴۸ شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ

دیوان دوم - ردیف غ

۸۳۴ اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ

دیوان سوم - ردیف غ

۱۱۵۵ اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ
۱۱۵۶ صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ

غزل نمبر

دیوان چہارم - ردیف غ

۱۴۱۲ ہمارے آگے چمن سے گئی بہار دریغ
۱۴۱۳ دل جگر دونوں پر جلائے داغ

دیوان پنجم - ردیف غ

۱۶۴۸ غم کھنچا رائیگاں دریغ دریغ
۱۶۴۹ ہم کو شہر سے اس مہ کے ہے عزم راہ دروغ دروغ
۱۶۵۰ کیا کہیے میاں اب کے جنوں میں سینہ اپنا یکسر داغ

دیوان اول - ردیف ف

۲۴۹ آج کل کاہے کو بتلاتے ہو گستاخی معاف
۲۵۰ غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
۲۵۱ جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف

دیوان دوم - ردیف ف

۸۳۵ میلان دل ہے زلف سیہ فام کی طرف

دیوان سوم - ردیف ف

۱۱۵۷ کیا پیام و سلام ہے موقوف

دیوان چہارم - ردیف ف

۱۴۱۴ آج ہمارا سر پھرتا ہے باتیں جتنی سب موقوف
۱۴۱۵ میں آگے نہ تھا دیدۂ پرآب سے واقف
۱۴۱۶ نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف

دیوان پنجم - ردیف ف

۱۶۵۱ دیکھ نہ ہر دم اے عاشق قاتل کی تیغ جفا کی طرف
۱۶۵۲ عشق سے ہم کو نگاہ نہیں کچھ ہائے زیان جاں کی طرف
۱۶۵۳ کیا نیچی آنکھوں دیکھو ہو تلوار کی طرف
۱۶۵۴ نظر کیوں گئی رو و مو کی طرف
۱۶۵۵ ہنستے ہی ہنستے مار رکھا تھے جو ہم ظریف

غزل نمبر

۱۶۵۶ بہار و باغ و گل و لالہ دلربا بن حیف
۱۶۵۷ اے تجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف

دیوان اول - ردیف ق

۲۵۲ درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق

دیوان دوم - ردیف ق

۸۳۶ اے رشک برق تجھ سے مشکل ہے کار عاشق
۸۳۷ کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق

دیوان سوم - ردیف ق

۱۱۵۸ کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
۱۱۵۹ گر با دیے میں تجھ کو صبا لے کے جائے شوق

دیوان چہارم - ردیف ق

۱۴۱۷ لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
۱۴۱۸ دل کا مطالعہ کر اے آگہ حقائق
۱۴۱۹ نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرار عشق

دیوان پنجم - ردیف ق

۱۶۵۸ مہر قیامت چاہت آفت فتنہ فساد بلا ہے عشق
۱۶۵۹ ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق
۱۶۶۰ بیتاب ہے دل غم سے نپٹ زار ہے عاشق

دیوان اول - ردیف ک

۲۵۳ بے چین مجھ کو چاہتا ہر دم ہے زیر خاک
۲۵۴ اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
۲۵۵ ہیں بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک
۲۵۶ میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک
۲۵۷ بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک
۲۵۸ شوق ہے تو ہے اس کا گھر نزدیک
۲۵۹ کہیں پہنچو بھی مجھ بے پا و سر تک

غزل نمبر
۲۶۰ دست و پا مارے وقت بسمل تک
۲۶۱ جاتے ہیں لے خرابی کو سیل آسماں تلک
۲۶۲ کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک

دیوان دوم - ردیف ک

۸۳۸ دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھلک
۸۳۹ عزت اپنی اب نہیں ہے یار کو منظور تک
۸۴۰ حالانکہ کام پہنچ گیا کب کا جاں تلک
۸۴۱ ہم بے کسوں کا کون ہے ہجراں میں غم شریک
۸۴۲ چلے ہے باغ کی صبا کیا خاک
۸۴۳ آج کل سے کچھ نہ طوفاں زا ہے چشم گریہ ناک
۸۴۴ سو خونچکاں گلے ہیں لب سے مری زباں تک
۸۴۵ لیا چہرہ دستی سے گر میر سر تک

دیوان سوم - ردیف ک

۱۱۶۰ ہر چند صرف غم ہیں لے دل جگر سے جاں تک

دیوان چہارم - ردیف ک

۱۴۲۰ وحشت ہے ہمیں بھی وہی گھر بار سے اب تک
۱۴۲۱ رہا پھول سا یار نزہت سے اب تک

دیوان پنجم - ردیف ک

۱۶۶۱ اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
۱۶۶۲ دل کی تڑپ نے ہلاک کیا ہے دھڑکے نے اس کے اڑائی خاک
۱۶۶۳ کیا ہم میں رہا گردش افلاک سے اب تک
۱۶۶۴ شاد انھونیوں کا دل غم ناک
۱۶۶۵ اے عشق کیا جو بجھ سا ہوا ناتواں ہلاک

دیوان ششم - ردیف ک

۱۸۳۰ جب کہتے تھے تب تم نے تو گوش ہوش نہ کھولے ٹک
۱۸۳۱ رہے ہیں غش و درد دو دو پہر تک

غزل نمبر
۱۸۳۲ وہ تو نہیں کہ اودھم رہتا تھا آشیاں تک
۱۸۳۳ اس کی رہے گی گرمی بازار کب تلک

دیوان اول - ردیف گ

۲۶۳ جب سے خط ہے سیاہ خال کی تھا نگ

دیوان دوم - ردیف گ

۸۴۶ غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
۸۴۷ کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ
۸۴۸ ہے آگ کا سا نالۂ کاہش فزا کا رنگ
۸۴۹ رو مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ

دیوان سوم - ردیف گ

۱۱۶۱ قتل کر میں دست بوس اس کا کریں فی الفور لوگ
۱۱۶۲ چاک دل ہے انار کے سے رنگ

دیوان چہارم - ردیف گ

۱۴۲۲ اس رنگ سے جو زرد زبوں زار ہیں ہم لوگ
۱۴۲۳ کیا چلے جاتے ہیں جہان سے لوگ

دیوان پنجم - ردیف گ

۱۶۶۶ راہ کی بات کہیں ہم کس سے بے تہ یاں اکثر ہیں لوگ
۱۶۶۷ رہتے ہیں اس سے لاگ پہ ہم بے قرار الگ
۱۶۶۸ وہ نہیں ملتا ایک کسو سے مرتے ہیں ادودھر جا جا لوگ

دیوان اول - ردیف ل

۲۶۴ فصل خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل
۲۶۵ گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل
۲۶۶ کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال
۲۶۷ سیر کر عندلیب کا احوال
۲۶۸ جائیں ہیں فرش رہ تری مت حال حال چل
۲۶۹ شرط یہ ابر میں ہم میں ہے کہ روویں گے کل

غزل نمبر

۲۷۰ مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل
۲۷۱ کرو تم یاد گر ہم کو رہے تم میں بھی اکثر دل
۲۷۲ رہتا نہیں ہے کوئی گھڑی اب تو یار دل
۲۷۳ تو گل باغ پر نہ بلبل پھول
۲۷۴ لٹ گئی اس کو دیکھ گل کی فصل

دیوان دوم - ردیف ل

۸۵۰ مار بھی آسان ہے دشنام سہل
۸۵۱ پوشیدہ کیا رہے ہے قدرت نمائی دل
۸۵۲ مدت تو وا ہوا ہی نہ یہ غنچہ وار دل
۸۵۳ بہت مدت گئی ہے اب تک آ مل

دیوان سوم - ردیف ل

۱۱۶۳ اب کے ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل
۱۱۶۴ نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل
۱۱۶۵ نہ خوشہ یاں نہ دانہ یاں جلانا گھاس کیا حاصل

دیوان چہارم - ردیف ل

۱۴۲۴ بلبل نے کل کہا کہ بہت ہم نے کھائے گل
۱۴۲۵ عشق کی چوٹیں پے در پے جو اٹھائی گئیں گھائل ہے دل
۱۴۲۶ غم مضموں نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
۱۴۲۷ دل تو گداز سب ہے کس کو کوئی کہے دل
۱۴۲۸ حال تو حال زار ہے تا حال
۱۴۲۹ کھنچتا ہے اس طرف ہی کو بے اختیار دل
۱۴۳۰ مت کرو شور و فغاں سے طائر آزار دل

دیوان پنجم ردیف ل

۱۶۶۹ دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
۱۶۷۰ آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
۱۶۷۱ صد ہزار افسوس آ کر خالی پائی جائے گل
۱۶۷۲ رنگا رنگ چمن میں اب کے موسم گل میں آئے گل

غزل نمبر

۱۶۷۳ ہر لحظہ ہے کدورت خاطر سے بار دل
۱۶۷۴ رکھتا نہیں ہے مطلق تاب عتاب اب دل
۱۶۷۵ مدت سے اب وہی ہے مرا ہم کنار دل

دیوان ششم - ردیف ل

۱۸۳۴ چپ رہ اب نالوں سے اے بلبل نہ کر آزار دل
۱۸۳۵ زنہار گلستاں میں نہ کر منھ کو سوئے گل
۱۸۳۶ طریق عشق میں ہے رہنما دل

دیوان اول - ردیف م

۲۷۵ کیا کہوں کیا رکھتے تھے تجھ سے ترے بیمار چشم
۲۷۶ کیا بلبل اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم
۲۷۷ آئے تو ہو طبیب تدبیر گر کرو تم
۲۷۸ جانا کہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم
۲۷۹ کرتے نہیں ہیں دوری سے اب اس کی باک ہم
۲۸۰ نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم
۲۸۱ اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام
۲۸۲ گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
۲۸۳ حذر کہ آہ جگر تفتگاں بلا ہے گرم
۲۸۴ کرتے ہیں گفتگو سحر اٹھ کر صبا سے ہم

دیوان دوم - ردیف م

۸۵۴ کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم
۸۵۵ ہے نہ دل بتوں کا کیا معلوم
۸۵۶ مجھے تو درد سے اک انس ہے وفا کی قسم
۸۵۷ اب سوکھی ہی جاتی ہے سب کشت ہوس ظالم
۸۵۸ محرم سے کسو روبرو ہوں کاش کے اب ہم
۸۵۹ مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد و زن تمام
۸۶۰ بخت سیہ کی نقل کریں کس سے چال ہم
۸۶۱ کون کہتا ہے منھ کو کھولو تم
۸۶۲ موئے جاتے تھے فرط الفت سے ہم

غزل نمبر

۸۲۳ کب تک رہیں گے پہلو لگائے زمیں سے ہم

دیوان سوم - ردیف م

۱۱۶۶ جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم
۱۱۶۷ سرزیر پر ہیں دیر سے اے ہم صفیر ہم
۱۱۶۸ جور ہے یوں ہی غم کے مارے ہم
۱۱۶۹ گئے عشق کی راہ سر کر قدم
۱۱۷۰ میر آج وہ بدست ہے ہشیار رہو تم
۱۱۷۱ آ ٹک شتاب جاتے ہیں ورنہ جہاں سے ہم
۱۱۷۲ بیماری دلی سے زار و نزار ہیں ہم
۱۱۷۳ ہر ہر سخن پہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم

دیوان چہارم - ردیف م

۱۴۳۱ شور سے طائر گلزار کے بیزار ہیں ہم
۱۴۳۲ بن میں چمن میں جی نہیں لگتا یارو کیدھر جاویں ہم
۱۴۳۳ شاید ہم سے ضد رکھتے ہو آتے نہیں ٹک ایدھر تم
۱۴۳۴ پوشاک تنگ پہنے بارے کہاں چلے تم
۱۴۳۵ یارب اس محبوب کو پھر اک نظر دیکھیں گے ہم
۱۴۳۶ صبر کیا جاتا نہیں ہم سے رہ کے جدا نہ ستاؤ تم
۱۴۳۷ ظلم ہوئے ہیں کیا کیا ہم پر صبر کیا ہے کیا کیا ہم
۱۴۳۸ ایک آدھ دن سنو گے سنا کے رہ گئے ہم
۱۴۳۹ حال زخم جگر سے ہے در ہم
۱۴۴۰ تجا ہے حیرت عشق سے گفتگو کو ہم
۱۴۴۱ عشق بتوں سے اب نہ کریں گے عہد کیا ہے خدا سے ہم
۱۴۴۲ چاہیے یوں تھا بگڑی صحبت آپھی آ کے بناتے تم
۱۴۴۳ صبر بہت تھا ایک سمیں میں جا سے اپنی نہ جاتے ہم

دیوان پنجم - ردیف م

۱۶۷۶ عشق ہمارے درپے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم
۱۶۷۷ ڈول لگائے بہتیرے پر ڈھب پہ کبھو نہیں آتے تم
۱۶۷۸ چاہ چھپی بے پردہ ہوئی اب یارب کیدھر جاویں ہم
۱۶۷۹ ہم تو یہی کہتے تھے ہمیشہ دل کو کہیں نہ لگاؤ تم
۱۶۸۰ کیا کریں بے کس ہیں ہم بے بس ہیں ہم بے گھر ہیں ہم
۱۶۸۱ کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
۱۶۸۲ اس کی گلی میں غش جو کیا آ سکے نہ ہم
۱۶۸۳ ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
۱۶۸۴ تظلم کہ کھینچے الم پر الم

دیوان ششم - ردیف م

۱۸۳۷ کھا گئی یاں کی فکر سو موہوم
۱۸۳۸ عشق کیا ہے اس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم
۱۸۳۹ کڑھتے جو رہے ہجر میں بیمار ہوئے ہم
۱۸۴۰ دے ہم ہیں جن کو کہیے آزار دیدہ مردم
۱۸۴۱ کیا زمانہ تھا کہ تھے دلدار کے یاروں میں ہم

دیوان اول - ردیف ن

۲۸۵ بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں
۲۸۶ وحشت میں ہوں بلا گر وادی پر اپنی آؤں
۲۸۷ سوزش دل سے مفت گلتے ہیں
۲۸۸ آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں
۲۸۹ بے روے و زلف یار ہے رونے سے کام یاں
۲۹۰ نہ گیا خیال زلف سیہ جفا شعاراں
۲۹۱ اس کے کوچے سے جو اٹھ اہل وفا جاتے ہیں
۲۹۲ کبھو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
۲۹۳ مستو جب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں
۲۹۴ جنس گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں
۲۹۵ یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں
۲۹۶ راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں
۲۹۷ مشہور ہیں دنوں کی سرے بے قراریاں
۲۹۸ گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخ زشت میں

غزل نمبر

۲۹۹ درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں
۳۰۰ نکلے ہے جنس حسن کسی کاروان میں
۳۰۱ زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
۳۰۲ جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
۳۰۳ تو گلی میں اس کی جا آوے لے اے صبا نہ چنداں
۳۰۴ کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
۳۰۵ دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
۳۰۶ جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں
۳۰۷ ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
۳۰۸ تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں
۳۰۹ سن گوش دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں
۳۱۰ اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں
۳۱۱ پلکوں سے ترے شائق ہم سر جو پٹکتے ہیں
۳۱۲ سب خوبیاں ہیں شیخ مشیخت پناہ میں
۳۱۳ کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں
۳۱۴ جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
۳۱۵ خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں
۳۱۶ وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں
۳۱۷ صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوش دلی کا غم کروں
۳۱۸ کیا میں نے رو کر فشار گریباں
۳۱۹ بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں
۳۲۰ دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
۳۲۱ میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
۳۲۲ اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں
۳۲۳ بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں
۳۲۴ عام حکم شراب کرتا ہوں
۳۲۵ ہم تو مطرب پسر کے جاتے ہیں
۳۲۶ آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں
۳۲۷ مرے آگے نہ شاعر نام پاویں

غزل نمبر

۳۲۸ مثال سایہ محبت میں جال اپنا ہوں
۳۲۹ کھودیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں
۳۳۰ تا پھونکیے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
۳۳۱ نہ اک یعقوب رویا اس الم میں
۳۳۲ چاہتے ہیں یہ بتاں ہم پہ کہ بیداد کریں
۳۳۳ ہجراں کی کوفت کھینچے بے دم سے ہو چلے ہیں
۳۳۴ جب درد دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
۳۳۵ ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
۳۳۶ خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں
۳۳۷ تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
۳۳۸ دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
۳۳۹ جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
۳۴۰ ایسے محروم گئے ہم تو گرفتار چمن
۳۴۱ بزم میں جو ترا ظہور نہیں
۳۴۲ دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں
۳۴۳ ساقی کی باغ پر جو کچھ کم نگاہیاں ہیں
۳۴۴ تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں
۳۴۵ ایک پرواز کو بھی رخصت صیاد نہیں
۳۴۶ آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
۳۴۷ آہ وہ عاشق ستم ترک جفا کرتا نہیں
۳۴۸ لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
۳۴۹ سمجھا تک نہ اپنے تو سود و زیاں کو میں
۳۵۰ کر نالہ کشی کب تئیں اوقات گذاریں
۳۵۱ یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں
۳۵۲ کہے ہے کوہکن کر فکر میری خستہ حالی میں
۳۵۳ آہ اور اشک ہی سدا ہے یاں
۳۵۴ جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں
۳۵۵ خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں
۳۵۶ نہ کیونکے شیخ توکل کو اختیار کریں

غزل نمبر

۳۵۷ یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدح شراب تجھ بن
۳۵۸ تکلیف باغ کن نے کی تجھ خوش دہاں کے تیں
۳۵۹ موئے سہتے سہتے جفاکاریاں
۳۶۰ دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
۳۶۱ کیا ظلم کیا تعدی کیا جور کیا جفائیں
۳۶۲ آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
۳۶۳ گذر جان سے اور ڈر کچھ نہیں
۳۶۴ نالۂ قید قفس سے چھوٹ اب اک دم نہیں
۳۶۵ تری ابرو و تیغ تیز تو ہم دم ہیں یہ دونوں
۳۶۶ لب ترے لعل ناب ہیں دونوں
۳۶۷ مجھ کو مارا بھلا کیا تو نیں
۳۶۸ ہمیشہ دل میں کہتا ہوں یہاں جاؤں وہاں جاؤں
۳۶۹ عشق کرنے کو جگر چاہیے آسان نہیں
۳۷۰ تری زلف سیہ کی یاد میں آنسو جھمکتے ہیں
۳۷۱ فردوس سے کچھ اس کی گلی میں کمی نہیں
۳۷۲ میں ترے کان کھول رکھتا ہوں
۳۷۳ جو ترے لب سے کام رکھتے ہیں
۳۷۴ کر نظر اک دور سے مجھ داغ میں
۳۷۵ تم سے کتنے ہماری جیب میں ہیں
۳۷۶ کر صرف دید عمر پھرے ہے تو یاں کہاں

دیوان دوم — ردیف ن

۸۶۴ مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
۸۶۵ کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب واں عیاں نہیں
۸۶۶ نہ نکلا دوسرا دیسا جہاں میں
۸۶۷ نہیں تمثال لعل دلربا میں
۸۶۸ مر مر گئے نظر کر اس کے برہنہ تن میں
۸۶۹ کن نے لپٹے بال دکھلائے ترے مانی کے تیں
۸۷۰ جانا ادھر سے میر ہے دیسا ادھر کے تیں
۸۷۱ کیا کہوں اول بخود تو دیر میں آتا ہوں میں

غزل نمبر

۸۷۲ مدت ہوئی کہ بیچ میں پیغام بھی نہیں
۸۷۳ دم بہ دم اس ڈھب سے رونا دیر کر آیا ہمیں
۸۷۴ اشک کے جوش سے ہوں شام و سحر پانی میں
۸۷۵ جوشش اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں
۸۷۶ رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں
۸۷۷ کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں
۸۷۸ کیا کلفتیں اٹھائیں ہجراں کے درد و غم میں
۸۷۹ عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
۸۸۰ یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
۸۸۱ کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
۸۸۲ کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں
۸۸۳ آپ اس جنس کے ہیں ہم بھی خریداروں میں
۸۸۴ امید دل دہی تھی جن سے وے آزار کرتے ہیں
۸۸۵ کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں
۸۸۶ محمل نشیں ہیں کتنے خدام یار میں یاں
۸۸۷ آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
۸۸۸ گر کوئی اُمّی کہے کچھ پر کہاں وہ تو کہاں
۸۸۹ بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
۸۹۰ کوچے میں تیرے میر کا مطلق اثر نہیں
۸۹۱ گو جان کر تجھے سب تعبیر کر رہے ہیں
۸۹۲ یوں قیدیوں سے کب تئیں ہم تنگ تر رہیں
۸۹۳ دل کو لکھوں ہوں آ وہ کیا مدعا لکھوں
۸۹۴ جب سے ہے اس کی ابرو سے خم دار درمیاں
۸۹۵ اتفاق ایسا ہے کڑھتے ہی سدا رہتے ہیں
۸۹۶ باغ گو سبز ہوا اب سر گلزار کہاں
۸۹۷ اے مجھ سے تجھ کو سو ملے تجھ سا نہ پایا ایک میں
۸۹۸ اگرچہ اب کے ہم اے ابر خشک مژگاں ہیں
۸۹۹ جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں
۹۰۰ فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں

غزل نمبر
۹۰۱ دل لے کے کیسے کیسے جھگڑے مجادلے ہیں
۹۰۲ محبت نے کھویا کھپایا ہمیں
۹۰۳ جنوں نے تماشا بنایا ہمیں
۹۰۴ کیا عبث مجنوں پئے محمل ہے میاں
۹۰۵ لذت سے درد کی جو کوئی آشنا نہیں
۹۰۶ کیا کہیں آتش ہجراں سے گلے جاتے ہیں
۹۰۷ کیا کہیں پایا نہیں جاتا ہے کچھ تم کیا ہو میاں
۹۰۸ معلوم نہیں کیا ہے لب سرخ بتاں میں

دیوان سوم - ردیف ن

۱۱۷۴ ٹھنڈی سانسیں بھریں ہیں جلتے ہیں کیا تاب میں ہیں
۱۱۷۵ کہے تو ہم نشیں رنگ تصرف کچھ دکھاؤں میں
۱۱۷۶ رو چکا خون جگر سب اب جگر میں خوں کہاں
۱۱۷۷ عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
۱۱۷۸ جمع ہوتے نہیں حواس کہیں
۱۱۷۹ جائیں تو جائیں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
۱۱۸۰ کہاں کے لوگ ہیں خوباں محبت ان کو نہیں
۱۱۸۱ ظلم و ستم کیا جور و جفا کیا جو کچھ کہیے اٹھاتا ہوں
۱۱۸۲ کبھو ملے ہے سو وہ یوں کہ پھر ملا نہ کریں
۱۱۸۳ شعر کچھ میں نے کہے بالوں کی اس کے یاد میں
۱۱۸۴ درویشوں سے تو ان نے ضدیں نکالیاں ہیں
۱۱۸۵ رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
۱۱۸۶ نئی گردش ہے اس کی ہر زماں میں
۱۱۸۷ تیغ کی نوبت کب پہنچے ہے اپنے جی کی غارت میں
۱۱۸۸ تری پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں
۱۱۸۹ نہ کر شوق کشتوں سے جانے کی باتیں
۱۱۹۰ کیا کروں سودائی اس کی زلف کی تدبیر میں
۱۱۹۱ کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
۱۱۹۲ دل عجب جنس گراں قدر ہے بازار نہیں
۱۱۹۳ چمکنا برق کا کرتا ہے کار تیغ ہجراں میں

غزل نمبر
۱۱۹۴ تھا شوق مجھے طالب دیدار ہوا میں
۱۱۹۵ جلا از بس تمھارے طور سے اے جامہ زیباں ہوں
۱۱۹۶ عشق وہ خانماں خراب ہے میاں
۱۱۹۷ گرفتہ دل ہوں سر ارتباط مجھ کو نہیں
۱۱۹۸ جوش غم اٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہے میاں
۱۱۹۹ چنگاریاں گرے ہیں جب پلکیں ہلتیاں ہیں
۱۲۰۰ بہار آئی کھلے گل پھول شاید باغ و صحرا میں
۱۲۰۱ شہروں ملکوں میں جو یہ میر کہاتا ہے میاں
۱۲۰۲ جائے ہے جی نجات کے غم میں
۱۲۰۳ جس کا خوباں خیال لیتے ہیں
۱۲۰۴ دور اس سے جی چکے ہیں ہم اس روزگار میں
۱۲۰۵ کیسی وفا و الفت کھاتے عبث ہو قسمیں
۱۲۰۶ روتے ہیں نالہ کش ہیں یا رات دن جلے ہیں
۱۲۰۷ شرر سے اشک ہیں اب چشم تر میں
۱۲۰۸ اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
۱۲۰۹ نچیں جیسے عاشق اگر دست پائیں
۱۲۱۰ اب کے ماہ رمضاں دیکھا تھا پیمانے میں
۱۲۱۱ میں نالہ کش تھا صبح کو یاد حبیب میں
۱۲۱۲ انھوں ہی کے تو دل شدہ ہم روسیاہ ہیں
۱۲۱۳ مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
۱۲۱۴ ہجر تا چند ہم اب وصل طلب کرتے ہیں
۱۲۱۵ مدت ہوئی کہ کوئی نہ آیا ادھر سے یاں
۱۲۱۶ مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
۱۲۱۷ تا چند وہ ستم کرے ہم درگذر کریں
۱۲۱۸ تکیے میں اپنے دل کا ہم غم کیا کریں ہیں

دیوان چہارم - ردیف ن

۱۴۴۴ ضعف دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں
۱۴۴۵ ہے وضع کشیدہ کا جو شور اس کے جہاں میں
۱۴۴۶ دل کے گئے بے دل کہلائے آگے دیکھیے کیا کیا ہوں

غزل نمبر

۱۴۴۷ کچھ قدر عافیت کی معلوم کی نہ گھر میں
۱۴۴۸ خوبی رو و چشم سے آنکھیں اٹک گئیں
۱۴۴۹ ہم سے اسے نفاق ہوا ہے وفاق میں
۱۴۵۰ صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولیں ہیں
۱۴۵۱ غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
۱۴۵۲ دل کی لاگ بری ہے ہوتی چنگے بھلے مر جاتے ہیں
۱۴۵۳ دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
۱۴۵۴ بھلا ہوا کہ دل مضطرب میں تاب نہیں
۱۴۵۵ ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں
۱۴۵۶ جی مارا بے تابی دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
۱۴۵۷ وہ نہیں اب کہ فریبوں سے لگا لیتے ہیں
۱۴۵۸ تجھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں
۱۴۵۹ ہجر میں روتا ہوں ہر شب میں تو اس صورت سے یاں
۱۴۶۰ داغ فراق سے کیا پوچھو ہو آگ لگائی سینے میں
۱۴۶۱ اب ہوسناک ہی مردم ہیں ترے یاروں میں
۱۴۶۲ عالم علم میں ایک تھے ہم دے حیف ہے ان کو گیان نہیں
۱۴۶۳ یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
۱۴۶۴ پھرا میں صورت احوال ہر یک کو دکھاتا یاں
۱۴۶۵ کس سے مشابہ کہیے اس کو ماہ میں ویسا نور نہیں
۱۴۶۶ کیا کیا جھمک گئے ہیں رخسار یار دونوں

دیوان پنجم - ردیف ن

۱۶۸۵ تاروں کی جیسے دیکھیں ہیں آنکھیں لڑانیاں
۱۶۸۶ رساتے ہو آتے ہو اہل ہوس میں
۱۶۸۷ غم ہجراں میں گھبرا کر اٹھا میں
۱۶۸۸ فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں
۱۶۸۹ کس کو دل سا مکان دیتے ہیں
۱۶۹۰ پلکیں پھری ہیں کھینچی بھویں ہیں ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں
۱۶۹۱ صبر کیا ہے برسوں ہم نے رات سے بے طاقت سے ہیں
۱۶۹۲ ہر چند میرے حق میں کب اس کا ستم نہیں

غزل نمبر

۱۶۹۳ دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
۱۶۹۴ عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
۱۶۹۵ آنکھیں سفید دل بھی جلا انتظار میں
۱۶۹۶ طلب ہے کام دل کی اس کے بالوں کی اسیری میں
۱۶۹۷ دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی کہیے تو جی ماریں ہیں
۱۶۹۸ حسن کیا جنس ہے جی اس پہ لگا بیٹھے ہیں
۱۶۹۹ منھ کیے اودھر زرد ہوئے جاتے ہیں ڈر سے سبک ساراں
۱۷۰۰ حاکم شہر حسن کے ظالم کیونکے ستم ایجاد نہیں
۱۷۰۱ تدبیر کوئی بتا دے جو آپ کو سنبھالیں
۱۷۰۲ مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
۱۷۰۳ ملنے کے دن جب یاد آتے ہیں سدھ بدھ بھولے جاتے ہیں

دیوان ششم - ردیف ن

۱۸۴۲ سر سے ایسی لگی ہے اب کہ جلے جاتے ہیں
۱۸۴۳ ایسے دیکھے ہیں اندھے لوگ کہیں
۱۸۴۴ رابطہ باہم ہے کوئی دن کا یاں
۱۸۴۵ اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آجاتا ہوں
۱۸۴۶ تری راہ میں گرچہ اے ماہ ہوں
۱۸۴۷ بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
۱۸۴۸ اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم دے جدا ہوئے ہیں
۱۸۴۹ بیکار مجھ کو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں
۱۸۵۰ اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں
۱۸۵۱ آئے ہیں میر کافر ہو کر خدا کے گھر میں
۱۸۵۲ آنکھ لگی ہے جب سے اس سے آنکھ لگی زنہار نہیں
۱۸۵۳ طرفہ خوش رو دم خوں ریز ادا کرتے ہیں
۱۸۵۴ ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں
۱۸۵۵ دم ہے مہلت شیب میں جانے کا اپنے غم کہاں
۱۸۵۶ گر روزگار ہے یہی ہجران یار میں
۱۸۵۷ گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں

غزل نمبر

دیوان اول - ردیف و

۳۷۷ فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
۳۷۸ نسیم مصر کب آئی سوادِ شہر کنعاں کو
۳۷۹ قد کھینچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو
۳۸۰ خط لکھ کے کوئی سادہ نہ اس کو ملول ہو
۳۸۱ کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
۳۸۲ مباد کینے پہ اس بت کی طبع آئی ہو
۳۸۳ اے چرخ مت حریف اندوہ بے کساں ہو
۳۸۴ گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو
۳۸۵ آرام ہو چکا مرے جسم نزار کو
۳۸۶ اچھی لگے ہے تجھ بن گلگشت باغ کس کو
۳۸۷ دن گذرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو
۳۸۸ دیبا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو
۳۸۹ خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو
۳۹۰ نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو
۳۹۱ ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رلاتے ہو
۳۹۲ وہی جانے جو حیا کشتہ وفا رکھتا ہو
۳۹۳ مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
۳۹۴ شیخ جی آؤ مصلےٰ گرو جام کرو
۳۹۵ کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
۳۹۶ دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو
۳۹۷ عاشق ہوئے تو گو غم بسیار کیوں نہ ہو
۳۹۸ ایسا ہے ماہ گو کہ وہ سب نور کیوں نہ ہو
۳۹۹ ہر دم وہ شوخ دست بہ شمشیر کیوں نہ ہو
۴۰۰ دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے کے آثار کو
۴۰۱ جو میں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو
۴۰۲ کرتے بیاں جو ہوتے خریدار ایک دو
۴۰۳ حال دل میر کا اے اہل وفا مت پوچھو
۴۰۴ نالۂ شب نے کیا ہے جو اثر مت پوچھو

غزل نمبر

۴۰۵ اس کی طرز نگاہ مت پوچھو
۴۰۶ محرماں بے دلی کا میری سبب مت پوچھو
۴۰۷ فرصت نہیں تنک بھی کہیں اضطراب کو
۴۰۸ کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو
۴۰۹ اجرت میں نامہ کی ہم دیتے ہیں جاں تلک تو
۴۱۰ آنکھوں سے دل تلک ہیں چنے خوان آرزو
۴۱۱ وہی مجھ پہ غصہ وہی یاں سے جا تو
۴۱۲ نہ آدام میں مرغ فریاد کیجو
۴۱۳ اس بے گنہ کے قتل میں اب دیر مت کرو
۴۱۴ میر کے یار کی طرح دیکھو
۴۱۵ نور نظر کو کھوکے میں سوؤں گا دیکھیو
۴۱۶ جیسے نسیم ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو
۴۱۷ مجروح دل کو میرے کانٹوں میں مت گھسیٹو
۴۱۸ عشق میں مرگ ابتدا ہے تو

دیوان دوم - ردیف و

۹۰۹ اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ
۹۱۰ نہ مائل آرسی کا رہ سراپا درد ہوگا تو
۹۱۱ سب حال سے بے خبر ہیں یاں تو
۹۱۲ ملتفت ہوتا نہیں ہے گاہ تو
۹۱۳ اب اسیری سے بچیں تو دیکھیں گے گلشن کبھو
۹۱۴ گل برگ سے ہیں نازک خوبی پا تو دیکھو
۹۱۵ بدزباں ہو جیسے خوش اسلوب ہو
۹۱۶ منعقد کاش مجلس مل ہو
۹۱۷ نہ میرے باعث شور و فغاں ہو
۹۱۸ برسوں میں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو
۹۱۹ ہر صبح شام تو پئے ایذائے میر ہو
۹۲۰ تک لطف سے ملا کر گو پھر کبھو کبھو ہو
۹۲۱ رکھیے گردن کو تری تیغ ستم پر ہو سو ہو
۹۲۲ ظالم ہو میری جان پہ نا آشنا نہ ہو

غزل نمبر

۹۲۳ خدا کرے کہ بتوں سے نہ آشنائی ہو
۹۲۴ تاچند انتظار قیامت شتاب ہو
۹۲۵ سب سرگذشت سن چکے اب چپکے ہو رہو
۹۲۶ لائق نہیں تمھیں کہ ہمیں ناسزا کہو
۹۲۷ مت سنگ یار سے دعواے مساوات کرو
۹۲۸ جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
۹۲۹ لا میری اور یارب آج ایک خوش کمر کو
۹۳۰ مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
۹۳۱ ملا یارب کہیں اس صیدافگن سربسر کیں کو
۹۳۲ کیا چہرے خدا نے دیے ان خوش پسروں کو
۹۳۳ عنایت ازلی سے جو دل ملا مجھ کو
۹۳۴ ہوتی کچھ عشق کی غیرت بھی اگر بلبل کو
۹۳۵ یوں کب ہوا ہے پیارے پاس اپنے تم بلالو

دیوان سوم - ردیف و

۱۲۱۹ قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو
۱۲۲۰ گردش میں وے مست آنکھیں ہیں جیسے بھرے پیمانے دو
۱۲۲۱ دوست رکھتا ہوں بہت اپنے دل بیمار کو
۱۲۲۲ تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
۱۲۲۳ یہ سرا سونے کی جا کہ نہیں بیدار رہو
۱۲۲۴ کرنا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو
۱۲۲۵ سر کاٹ کے ڈلوا دیے انداز تو دیکھو
۱۲۲۶ آرسی اس کے سامنے دھرلو
۱۲۲۷ کھینچا رنج و تعب کا دوستاں عادت کرو
۱۲۲۸ بہر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو
۱۲۲۹ غریب شہر خوباں ہوں مرا کچھ حال مت پوچھو
۱۲۳۰ بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
۱۲۳۱ زلفوں کو میں چھوا سو غصے ہوئے کھڑے ہو
۱۲۳۲ زخموں پہ اپنے لون چھڑکتے رہا کرو

غزل نمبر

۱۲۳۳ سر پہ عاشق کے نہ یہ روز سیہ لایا کرو
۱۲۳۴ کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
۱۲۳۵ کھومت سر چڑھائے دلبروں کے گوندھے بالوں کو
۱۲۳۶ رہتا ہے پیش دیدۂ تر آہ کا سجاؤ
۱۲۳۷ سب کھا گئے جگر تری پلکوں کے کاوکاو
۱۲۳۸ گر قصد ترک سر ہے کبھو شرم مت کرو
۱۲۳۹ دل کیے میں ہوں تو کاہے کو کوئی بے تاب ہو
۱۲۴۰ آج ہمارا جی بے کل ہے تم بھی غفلت مت کریو

دیوان چہارم - ردیف و

۱۴۶۷ دیتی ہے طول بلبل کیا شورش فغاں کو
۱۴۶۸ نہیں ہے تاب تنک تم بھی مت عتاب کرو
۱۴۶۹ وہ گل سا رو سراہوں یا پیچ دار مو کو
۱۴۷۰ عجب گر تیری صورت کا نہ کوئی یار عاشق ہو
۱۴۷۱ تو وہ نہیں کسو کا نہ دل سے یار ہو
۱۴۷۲ دل اس کے مو سے لگ کے پریشاں ہوا نہ تو
۱۴۷۳ کیا کروں میں صبر کم کو اور رنج بیش کو
۱۴۷۴ نازکی کوئی یہ بھی ٹھسک ہے جی کاہے کو کڑھاتے ہو
۱۴۷۵ آج ہمارا سر دکھتا ہے صندل کا بھی نام نہ لو
۱۴۷۶ کام کیے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو
۱۴۷۷ جی رکا رکنے سے پرے کچھ تو
۱۴۷۸ رفتن رنگین گل رویاں سے کیا ٹھہراؤ ہو
۱۴۷۹ جی کی لاگ بلا ہے کوئی دل جینے سے اٹھا بیٹھو
۱۴۸۰ صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ

دیوان پنجم - ردیف و

۱۷۰۴ دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو
۱۷۰۵ اپنے حسن رفتنی پر آج مت مغرور ہو
۱۷۰۶ عاشق ہو تو اپنے تئیں دیوانہ سب میں جاتے رہو
۱۷۰۷ کیا فرض ہستی کی رخصت ہے مجھ کو

غزل نمبر

۱۷۰۸ کیا غیرت سے دل پر تنگ رنج و غم نے دنیا کو
۱۷۰۹ کیا کچھ ہم سے ضد ہے تم کو بات ہماری اڑا دو ہو
۱۷۱۰ کہتے نہ تھے ہم تم سے دل ہاتھ سے مت دیجو
۱۷۱۱ بات کہوں کیا چپکے چپکے دیکھو ہو آئینے کو
۱۷۱۲ صوفیاں خم وا ہوئے ہیں ہائے آنکھیں وا کرو
۱۷۱۳ موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرو
۱۷۱۴ کیونکر مجھ کو نامہ نمط ہر حرف پہ پیچ و تاب نہ ہو
۱۷۱۵ تم کو ہم سے لاگ لگی ہے روتے ہیں تو ہنستے ہو
۱۷۱۶ راہیں رکے پر اس سے ملاقات ہو تو ہو
۱۷۱۷ مژہ وا کرو تمھیں غش ہے کیا کبھو حال پر بھی نظر کرو

دیوان ششم - ردیف و

۱۸۵۸ زمانے نے دشمن کیا یار کو
۱۸۵۹ کن نے کہا کہ مجھ سے بہت کم ملا کرو
۱۸۶۰ کیونکے نیچے ہاتھ کے رکھا دل بیتاب کو
۱۸۶۱ چھوڑا جنوں کے دور میں رسم و رہ اسلام کو
۱۸۶۲ اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
۱۸۶۳ ہاتھ بے سبحہ ٹک رہا نہ کبھو
۱۸۶۴ ٹک نقاب الٹو مت عتاب کرو
۱۸۶۵ بس اب بن چکے رو و موے سمن بو
۱۸۶۶ لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو
۱۸۶۷ چاہت میں خوبرویوں کی کیا جانے کیا نہ ہو

دیوان اول - ردیف ہ

۴۱۹ سو ظلم کے رہتے ہیں سزاوار ہمیشہ
۴۲۰ جگر لوہو کو ترسے ہے میں سچ کہتا ہوں دل خستہ
۴۲۱ ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
۴۲۲ دل پر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہے شیشہ
۴۲۳ جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
۴۲۴ اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ

غزل نمبر

۴۲۵ جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ
۴۲۶ جز جرم عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ
۴۲۷ کہتے ہیں اڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ
۴۲۸ ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
۴۲۹ کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
۴۳۰ دل بجھتا ہی کہیں ہمارا آہ

دیوان دوم - ردیف ہ

۹۳۶ یاد جب آتی ہے وہ زلف سیاہ
۹۳۷ ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ
۹۳۸ پیدا نہیں جہاں میں قید جہاں سے رستہ
۹۳۹ ٹک پاس آکے کیسے صرفے سے ہیں کشیدہ
۹۴۰ پھرتی ہیں اس کی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ
۹۴۱ لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ
۹۴۲ ہم سے کیوں الجھا کرے ہے آ سمجھا اے ناسمجھ
۹۴۳ کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
۹۴۴ بود نقش و نگار سا ہے کچھ
۹۴۵ آوے کہنے میں رہا ہو غم سے گر احوال کچھ
۹۴۶ اب تو صبا چمن سے آتی نہیں ادھر کچھ

دیوان سوم - ردیف ہ

۱۱۴۱ میں کیا کہوں جگر میں لہو میرے کم ہے کچھ
۱۱۴۲ کہتے تو ہیں کہ ہم کو اس کی طلب نہیں کچھ
۱۱۴۳ رستے سے چاک دل کے ہو آگاہ
۱۱۴۴ ہے تمنائے وصال اس کی مری جان کے ساتھ
۱۱۴۵ جانے دے مت اس قدر اب زلف و خط و خال دیکھ
۱۱۴۶ آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
۱۱۴۷ وے دن اب سالتے ہیں جن میں پھرے یار کے ساتھ
۱۱۴۸ نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ
۱۱۴۹ کب تک رہیں گے یارب ہر دم ہم آبدیدہ

غزل نمبر

۱۴۵۰ ادھر مت کر نگاہ تیز جا بیٹھ
۱۴۵۱ کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ

دیوان چہارم - ردیف ہ

۱۴۸۱ یار صد حیف کہ بیگانہ رہا اپنے ساتھ
۱۴۸۲ گرمی سے عاشقی کی آخر کو ہو رہا کچھ
۱۴۸۳ حیرت طلب کو کام نہیں ہے کسو کے ساتھ
۱۴۸۴ سر تو بہت بکھیرا پر فائدہ کیا نہ
۱۴۸۵ غم فوت سے بندے آزاد رہ
۱۴۸۶ چاہ میں دل پر ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے کیا کیا کچھ

دیوان پنجم - ردیف ہ

۱۷۱۸ ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
۱۷۱۹ اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ
۱۷۲۰ ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ
۱۷۲۱ جان چلی جاتی ہے ہماری اس کی اور نظر کے ساتھ
۱۷۲۲ گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
۱۷۲۳ بندہ ہے یا خدا نہیں اس دلربا کے ساتھ
۱۷۲۴ عز و وقار کیا ہے کسو خودنما کے ہاتھ

دیوان ششم - ردیف ہ

۱۸۶۸ ہر چند جذب عشق سے تشریف یاں بھی لائے وہ
۱۸۶۹ اب دل خزاں میں رہتا ہے جی کی رکن کے ساتھ
۱۸۷۰ مرتے ہیں ہم تو اس صنم خودنما کے ساتھ
۱۸۷۱ نظر آیا تھا صبح دور سے وہ
۱۸۷۲ آزار کش کو اس کے آزار ہے ہمیشہ
۱۸۷۳ دل ہے میری بغل میں صد پارہ
۱۸۷۴ مکتوب دیر پہنچا پر دو طرف سے سادہ

دیوان اول - ردیف ی

۴۳۱ دل کو تسکین نہیں اشک دمادم سے بھی

غزل نمبر

۴۳۲ تاب دل صرف جدائی ہو چکی
۴۳۳ آخر ہماری خاک بھی برباد ہو گئی
۴۳۴ یہ چشم آئینہ دار روتھی کسو کی
۴۳۵ ہے غزل میر یہ شفائی کی
۴۳۶ آہ میری زبان پر آئی
۴۳۷ بات شکوے کی ہم نے گاہ نہ کی
۴۳۸ کل میر نے کیا کیا کی مے کے لیے بے تابی
۴۳۹ ہمیں آمد میر کل بھا گئی
۴۴۰ یک سو کشادہ روئی پر چیں نہیں جبیں بھی
۴۴۱ گئی چھاؤں اس تیغ کی سر سے جب کی
۴۴۲ کیسے قدم سے اس کی گلی میں صبا گئی
۴۴۳ خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی طاقت کی
۴۴۴ فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی
۴۴۵ خرابی کچھ نہ پوچھو مملکت دل کی عمارت کی
۴۴۶ میں نے جو بے کسانہ مجلس میں جان کھوئی
۴۴۷ الم سے یاں تئیں میں مشق ناتوانی کی
۴۴۸ لاعلاجی سے جو رہتی ہے مجھے آوارگی
۴۴۹ گیسو سے اس کے میں نے کیوں آنکھ جا لگائی
۴۵۰ دو دن سے کچھ بنی تھی سو پھر شب بگڑ گئی
۴۵۱ کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
۴۵۲ ہو گئی شہر شہر رسوائی
۴۵۳ تو گلے ملتا نہیں ہم سے تو کیسی خرمی
۴۵۴ اب ضعف سے ڈھہتا ہے بے تابی شتابی کی
۴۵۵ مجھ سا بیتاب ہووے جب کوئی
۴۵۶ آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
۴۵۷ چھن گیا سینہ بھی کلیجا بھی
۴۵۸ گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی
۴۵۹ میری پرسش پہ تری طبع اگر آوے گی
۴۶۰ کیا کروں شرح خستہ جانی کی

غزل نمبر

۴۶۱ ہے یہ بازارِ جنوں منڈی ہے دیوانوں کی
۴۶۲ ملا غیر سے جا جفا کیا نکالی
۴۶۳ رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
۴۶۴ اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی
۴۶۵ آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
۴۶۶ غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
۴۶۷ کل بارے ہم اس سے ملاقات ہوگئی
۴۶۸ بغیر دل کہ یہ قیمت ہے سارے عالم کی
۴۶۹ غم سے یہ راہ میں نے نکالی نجات کی
۴۷۰ اب دل کو آہ کرنی ہی صبح و مسا گئی
۴۷۱ کس حسن سے کہوں میں اس کی خوش اختری کی
۴۷۲ دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
۴۷۳ گل کہتے ہیں اس کا سا دہن ہے
۴۷۴ گل گشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے
۴۷۵ کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
۴۷۶ گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
۴۷۷ رہا ہونا نہیں امکان ان ترکیب والوں سے
۴۷۸ کبکوں نے تیری چال جو دیکھی ٹھٹھک گئے
۴۷۹ زندگی ہوتی ہے اپنی غم کے مارے دیکھیے
۴۸۰ کس طور ہمیں کوئی فریبندہ لبھالے
۴۸۱ برنگ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے
۴۸۲ چمن یار تیرا ہوا خواہ ہے
۴۸۳ ڈھب ہیں تیرے سے باغ میں گل کے
۴۸۴ عشق میں نے خوف و خطر چاہیے
۴۸۵ ہستی اپنی حباب کی سی ہے
۴۸۶ شمع صفت جب کبھو مرجائیں گے
۴۸۷ اب جو اک حسرت جوانی ہے
۴۸۸ قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے
۴۸۹ اب ظلم ہے اس خاطر تا غیر بھلا مانے

غزل نمبر

۴۹۰ دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
۴۹۱ بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے
۴۹۲ تیری گلی سے جب ہم عزمِ سفر کریں گے
۴۹۳ آنکھیں لڑا لڑا کر کب تک لگا رکھیں گے
۴۹ تجھ سے دوچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے
۴۹۵ ہو عاجز کہ جسم اس قدر زور سے
۴۹۶ مت ہو مغرور اے کہ تجھ میں زور ہے
۴۹۷ غیر سے اب یار ہوا چاہیے
۴۹۸ یاں سرکشاں جو صاحب تاج و لوا ہوئے
۴۹۹ اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے
۵۰۰ رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
۵۰۱ گرے بحر بلا مژگان تر سے
۵۰۲ بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے
۵۰۳ خوب ہے اے ابر اک شب آؤ باہم رویئے
۵۰۴ نیلا نہیں سپہر تجھے اشتباہ ہے
۵۰۵ نہیں وہ قید الفت میں گرفتاری کو کیا جانے
۵۰۶ جوشِ دل آئے بہم دیدۂ گریان ہوئے
۵۰۷ یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے
۵۰۸ برقعے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
۵۰۹ جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
۵۱۰ لگوائے پتھرے اور برا بھی کہا کیے
۵۱۱ کروں جو آہ زمین و زمان جل جاوے
۵۱۲ گذار خوش نگاہاں جس میں ہے میرا بیاباں ہے
۵۱۳ اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے
۵۱۴ حرم کو جایئے یا دیر میں بسر کریے
۵۱۵ مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے
۵۱۶ اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
۵۱۷ خوش سرانجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے
۵۱۸ ترا اے ناتوانی جو کوئی عالم میں رسوا ہے

غزل نمبر

۵۱۹ گذار ابر اب بھی جب کبھو ادھر کو ہوتا ہے
۵۲۰ ہم تو اس کے ظلم سے ہمدم چلے
۵۲۱ غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
۵۲۲ بند قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے
۵۲۳ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
۵۲۴ توجہ تیری اے حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے
۵۲۵ جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے
۵۲۶ کیا مرے سرورواں کا کوئی مائل ایک ہے
۵۲۷ جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
۵۲۸ شش جہت سے اس میں ظالم بوے خوں کی راہ ہے
۵۲۹ مشکل ہے ہونا روکش رخسار کی جھلک کے
۵۳۰ تا چند ترے غم میں یوں زار رہا کیجے
۵۳۱ طاقت نہیں ہے جی میں نے اب جگر رہا ہے
۵۳۲ قرار دل کا یہ کا ہے کو ڈھنگ تھا آگے
۵۳۳ تجھ بن خراب و خستہ زبوں خوار ہوگئے
۵۳۴ تنگ آئے ہیں دل اس جی سے اٹھا بیٹھیں گے
۵۳۵ نالہ تا آسمان جاتا ہے
۵۳۶ مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
۵۳۷ جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
۵۳۸ نالے کا آج دل سے پھر لب تلک گذر ہے
۵۳۹ ڈھونڈا نہ پایئے جو اس وقت میں سو زر ہے
۵۴۰ شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے
۵۴۱ جب سے اس بے وفا نے بال رکھے
۵۴۲ یاں جو وہ نونہال آتا ہے
۵۴۳ پیری میں کیا جوانی کے موسم کو رویئے
۵۴۴ شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
۵۴۵ کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
۵۴۶ اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے
۵۴۷ نہ تنہا داغ نو سینے پہ میرے اک چمن نکلے

غزل نمبر

۵۴۸ قصد گر امتحان ہے پیارے
۵۴۹ کل وعدہ گاہ میں سے جوں توں کے ہم کو لائے
۵۵۰ قبر عاشق پر مقرر روز آنا کیجیے
۵۵۱ مہوشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جایئے
۵۵۲ غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
۵۵۳ ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پر کتنے
۵۵۴ آہ جس وقت سر اٹھاتی ہے
۵۵۵ طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے
۵۵۶ تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
۵۵۷ جب تک کہ ترا گذر نہ ہووے
۵۵۸ رات گذرے ہے مجھے نزع میں روتے روتے
۵۵۹ یعقوب کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے
۵۶۰ جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
۵۶۱ تمام اس کے قد میں سناں کی طرح ہے
۵۶۲ محمل کے ساتھ اس کے بہت شور میں کیے
۵۶۳ کہاں تک غیر جاسوسی کے لینے کو لگا آوے
۵۶۴ گو ننگ اس کو آوے ہے عاشق کے نام سے
۵۶۵ اچنبھا ہے اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آوے
۵۶۶ حصول کام کا دل خواہ یاں ہوا بھی ہے
۵۶۷ بسکہ دیوانگی حال میں چالاک ہوئے
۵۶۸ صید افگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے
۵۶۹ دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہے
۵۷۰ جہاں میں روز ہے آشوب اس کی قامت سے
۵۷۱ رمق ایک جان وبال ہے کوئی دم جو ہے تو عذاب ہے
۵۷۲ سینہ ہے چاک جگر پارہ ہے دل سب خوں ہے
۵۷۳ کہنا ترے منھ پر تو نپٹ بے ادبی ہے
۵۷۴ دو سونپ دود دل کو میرا کوئی نشاں ہے
۵۷۵ ہمسایۂ چمن یہ نپٹ زار کون ہے
۵۷۶ مجھ سوز بعد مرگ سے آگاہ کون ہے

غزل نمبر

۵۷۷ دیکھا کروں تجھی کو منظور ہے تو یہ ہے
۵۷۸ کوئی ہوا نہ روکش تک میری چشم تر سے
۵۷۹ وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہووے
۵۸۰ رہی نہ پختگی عالم میں دور خامی ہے
۵۸۱ انجام دل غم کش کوئی عشق میں کیا جانے
۵۸۲ جیتے ہو روتے دیکھ کر غم سے
۵۸۳ نالۂ عجز نقص الفت ہے
۵۸۴ پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
۵۸۵ ناز چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے
۵۸۶ تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے
۵۸۷ خورشید تیرے چہرے کے آگو نہ آسکے
۵۸۸ کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے
۵۸۹ آتش کے شعلے سر سے ہمارے گذر گئے
۵۹۰ دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے
۵۹۱ کاتب کہاں دماغ جو اب شکوہ ٹھانیے
۵۹۲ مرے اس رک کے مرجانے سے وہ غافل ہے کیا جانے
۵۹۳ کب تلک جی رکے خفا ہووے
۵۹۴ کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے
۵۹۵ منصف جو تو ہے کب تئیں یہ دکھ اٹھائیے
۵۹۶ نہیں وسواس جی گنوانے کے
۵۹۷ کم فرصتی گل جو کہیں کوئی نہ مانے
۵۹۸ تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے
۵۹۹ چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے
۶۰۰ دل جو پر بے قرار رہتا ہے
۶۰۱ دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے
۶۰۲ جاں گداز اتنی کہاں آواز عود و چنگ ہے
۶۰۳ خنجر بہ کف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہے
۶۰۴ ساقی گھر چاروں اور آیا ہے
۶۰۵ فقیرانہ آئے صدا کر چلے

غزل نمبر

۶۰۶ اپنا سر شوریدہ تو وقف خم چوگان ہے
۶۰۷ خوب تھے وے دن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے
۶۰۸ جس جگہ دور جام ہوتا ہے
۶۰۹ بے تابیوں میں تنگ ہم آئے ہیں جان سے
۶۱۰ چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
۶۱۱ ظالم کہیں تو مل کبھو وارد پے ہوئے
۶۱۲ کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
۶۱۳ بو کہ ہو سوے باغ نکلے ہے
۶۱۴ ہے خاک جیسے ریگ رواں سب نہ آب ہے
۶۱۵ کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے
۶۱۶ ادھر سے ابر اٹھ کر جو گیا ہے
۶۱۷ عمر بھر ہم رہے شرابی سے
۶۱۸ دن دوری چمن میں جو ہم شام کریں گے
۶۱۹ رشک گلشن اگر تو ناز کرے
۶۲۰ نہ رہ دنیا میں دل جمعی سے اے انساں جو دانا ہے
۶۲۱ صبح سے بن علاج تو خوش ہے
۶۲۲ مرے درد دل کا تو یہ جوش ہے
۶۲۳ سوائے سنگدلی اور کچھ ہنر بھی ہے
۶۲۴ سن کے صفت ہم سے خرابات کی
۶۲۵ ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے
۶۲۶ ہم جنوں میں جو خاک اڑاویں گے
۶۲۷ وصل کی جب سے گئی ہے چھوڑ دلداری مجھے
۶۲۸ جوں جوں ساقی تو جام بھرتا ہے
۶۲۹ کیوں گردن ہلال ابھی سے ڈھلک چلی
۶۳۰ اڑا برگ گل کو دکھاتی ہے وادی
۶۳۱ سبھوں کے خط لیے پوشیدہ قاصد آج جاتا ہے
۶۳۲ شوخ عاشق قد کو تیرے سرو یا طوبیٰ کہے
۶۳۳ مرے رنگ شکستہ پہ ہنسے ہیں مرداں سارے
۶۳۴ راہ آنسو کی کب تلک تکیے

غزل نمبر

۶۳۵ چلی جاتی ہی نکلی جان ہے تدبیر کیا کریے
۶۳۶ اس ستم دیدہ کی صحبت سے جگر لوہو ہے
۶۳۷ عمر گذری کہ ترے کوچے کے آنے سے گئے
۶۳۸ حیران اس بھبھوکے پہ سب دوش ہو گئے
۶۳۹ جو سیل سرشک کا چلے ہے
۶۴۰ آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
۶۴۱ ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے
۶۴۲ وعدے ہر روز رہے اور تم آتے ہی رہے
۶۴۳ مہیا جس کنے اسباب ملکی اور مالی تھے
۶۴۴ مدت ہوئی کہ تاب و تواں جی چھپا گئے
۶۴۵ کیا کہوں کچھ بھی اس سے چھوٹا ہے
۶۴۶ ہم رو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے
۶۴۷ یک دم میں خوں تو سوکھا مژگاں پہ ہو کے جاری
۶۴۸ وہ شگفتہ ہے یہ گرفتہ ہے
۶۴۹ اے آفتاب تیرا منھ تو طباق سا ہے
۶۵۰ شاعروں نے بھی فکر کر دیکھے
۶۵۱ کیسے ہی ہوں گے ہم گئے گذرے
۶۵۲ گو شل ہو آنکھ پھوٹی پیر گئی
۶۵۳ ان ساحروں نے ایسے منھ عاشقوں کے باندھے
۶۵۴ یہ نہ منھ دیکھے کی سی میں نے کہی
۶۵۵ غم میں دل صبر و ہوش اے پیارے
۶۵۶ ان نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
۶۵۷ اول عشق ہی میں آخر ہے
۶۵۸ چشم ہر گل پہ اس کی جا دیکھی
۶۵۹ تری ہم چشم نرگس کیا صنم ہے
۶۶۰ اس پہ گویا کہ قرض کھایا ہے
۶۶۱ جو ہوشیار دم میں اس کی امید کیا ہے
۶۶۲ راہ کی بات کھوئے دیتی ہے
۶۶۳ دل رفتہ رفتہ غم میں آدھا نہیں رہا ہے

غزل نمبر

دیوان دوم - ردیف ی

۹۴۷ ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی
۹۴۸ کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
۹۴۹ میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
۹۵۰ کی سیر ہم نے سینۂ یکسر فگار کی
۹۵۱ ٹپہ بازی سے چرخ گرداں کی
۹۵۲ رکھا گنہ وفا کا تقصیر کیا نکالی
۹۵۳ جی رشک سے گئے جو ادھر کو صبا چلی
۹۵۴ آج کچھ بے حجاب ہے وہ بھی
۹۵۵ دزدیدہ نگہ کرنا پھر آنکھ ملانا بھی
۹۵۶ یار بن تلخ زندگانی تھی
۹۵۷ وہ رابطہ نہیں وہ محبت نہیں رہی
۹۵۸ عشق میں ذلت ہوئی خفت ہوئی تہمت ہوئی
۹۵۹ قوت کو پیرانہ سری میں حیرانی ہوئی
۹۶۰ بتوں سے آنکھ کیوں میں نے لڑائی
۹۶۱ مطرب سے غزل میر کی کل میں نے پڑھائی
۹۶۲ تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی
۹۶۳ متاع دل اس عشق نے سب جلا دی
۹۶۴ صبح ہے کوئی آہ کر لیجے
۹۶۵ یک مژہ اے دم آخر مجھے فرصت دیجے
۹۶۶ گر ناز سے وہ سر پہ لے تیغ آنہ پہنچے
۹۶۷ اک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے
۹۶۸ میر ایک دم نہ اس بن تو تو جیا پیارے
۹۶۹ میر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
۹۷۰ اسیر زلف کرے قیدی کمند کرے
۹۷۱ آہ رو کوں جانے والے کس طرح گھر کے ترے
۹۷۲ مت سہل ہمیں سمجھو ایسے ہیں ہم کیا درے دھرے
۹۷۳ بو کیے کھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
۹۷۴ وہی شورش موئے پر بھی ہے اب تک ساتھ یاں میرے

غزل نمبر	
۹۷۵	بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
۹۷۶	کہنے میں جاں بہ لب تھے ہم دوری بتاں سے
۹۷۷	کرتا ہے کب سلوک وہ اہل نیاز سے
۹۷۸	تابوت مرا دیر اٹھا اس کی گلی سے
۹۷۹	کیا خور ہو طرف یار کے روشن گہری سے
۹۸۰	برسوں ہوئے گئے ہوئے اس مہ کو بام سے
۹۸۱	وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشم تر سے
۹۸۲	مرا دل پیر و مرشد ہے مجھے ہے اعتقاد اس سے
۹۸۳	برا کیا ماہیے اب چھیڑ سے یا اس کی گالی سے
۹۸۴	کھینچے جہاں تو تیغ جلادت کے واسطے
۹۸۵	دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے
۹۸۶	بے خودی جو یہ ہے تو ہم آپ میں اب آ چکے
۹۸۷	خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں ہانکے
۹۸۸	دل خوں ہوا ہمارا ٹکڑے ہوئے جگر کے
۹۸۹	کتنے روزوں سے نہ سونے کے ہیں نے کھانے کے
۹۹۰	اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
۹۹۱	غیر کو دیکھے ہے گرمی سے نہ کچھ لاگ لگے
۹۹۲	کب تک احوال یہ جب کوئی تیرا نام لے
۹۹۳	سختیاں کھینچیں سو کھینچیں پھر بھی جو اٹھ کر چلے
۹۹۴	یا پہلے وے نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے
۹۹۵	جیسے اندوہ محرم عشق کب تک دل ملے
۹۹۶	بے مہر و وفا ہے وہ کیا رسم وفا جانے
۹۹۷	الٰہی کہاں منہ چھپایا ہے تو نے
۹۹۸	ویسا ہے یہ جو یوسف شب تیرے ہوتے آوے
۹۹۹	یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے
۱۰۰۰	درونے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک ہوا دیوے
۱۰۰۱	اس شوخ ستم گر کو کیا کوئی بھلا چاہے
۱۰۰۲	دوری میں اس کی گور کنارے ہم آرہے
۱۰۰۳	یک عمر دیدہ ہائے ستم دیدہ تر رہے

غزل نمبر	
۱۰۰۴	یاں ہم براے بیت جو بے خانماں رہے
۱۰۰۵	ایک سمیں تم ہم فقرا سے اکثر صحبت رکھتے تھے
۱۰۰۶	مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے
۱۰۰۷	اب ہم فقیر جی سے دل کو اٹھا کے بیٹھے
۱۰۰۸	ہے جنبش لب مشکل جب آن کے وہ بیٹھے
۱۰۰۹	اب سمجھ آئی مرتبہ سمجھے
۱۰۱۰	اب اپنے قد راست کو خم دیکھتے ہیں ہائے
۱۰۱۱	جاگنا تھا ہم کو سو بیدار ہوتے رہ گئے
۱۰۱۲	گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے
۱۰۱۳	ہم نہ کہتے تھے رہے گا ہم میں کیا یاں سے گئے
۱۰۱۴	دل شتاب اس بزم عشرت سے اٹھایا چاہیے
۱۰۱۵	انکھڑیوں کو اس کی خاطر خواہ کیونکر دیکھیے
۱۰۱۶	گرداب وار یار ترے صدقے جائیے
۱۰۱۷	ٹک ٹھہرنے دے تجھے شوخی تو کچھ ٹھہرائیے
۱۰۱۸	پر نہیں جو اڑ کے اس در جائیے
۱۰۱۹	ان دلبروں کو دیکھ لیا بے وفا ہیں یے
۱۰۲۰	شوق ہم کو کھپائے جاتا ہے
۱۰۲۱	کبھو میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے
۱۰۲۲	چمن کو یاد کر مرغ قفس فریاد کرتا ہے
۱۰۲۳	جب نسیم سحر ادھر جا ہے
۱۰۲۴	کچھ بات ہے کہ گل ترے رنگیں دہاں سا ہے
۱۰۲۵	طپش سے رات کی جوں توں کے جی سنبھالا ہے
۱۰۲۶	چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے
۱۰۲۷	دل بیتاب آفت ہے بلا ہے
۱۰۲۸	شور میرے جنوں کا جس جا ہے
۱۰۲۹	کئی برسوں جگر کا ہی لہو اپنا پیا ہے
۱۰۳۰	کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے
۱۰۳۱	باریک وہ کمر ہے ایسی کہ بال کیا ہے
۱۰۳۲	دل مرا مضطرب نہایت ہے

غزل نمبر

۱۰۳۳ گرمی سے میری ابر کا ہنگامہ سرد ہے
۱۰۳۴ جانے میں قتل کرے ترا اختیار ہے
۱۰۳۵ جنوں کا عبث میرے مذکور ہے
۱۰۳۶ زلف ہی درہم نہیں ابرو بھی پرخم اور ہے
۱۰۳۷ رشتہ کیا ٹھہرے گا یہ جیسے کہ مو نازک ہے
۱۰۳۸ مستی میں جا دے جا مدنظر کہاں ہے
۱۰۳۹ کیا کہیے کلی سا وہ دہن ہے
۱۰۴۰ ہم مست ہو بھی دیکھا آخر مزہ نہیں ہے
۱۰۴۱ کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
۱۰۴۲ یہ رات ہجر کی یاں تک تو دکھ دکھاتی ہے
۱۰۴۳ نہ گلشن میں چمن پر ان نے بلبل تجھ کو جادی ہے
۱۰۴۴ کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے
۱۰۴۵ کس فتنہ قد کی ایسی دھوم آنے کی پڑی ہے
۱۰۴۶ آنکھیں نہیں یاں کھلتیں ایدھر کو نظر بھی ہے
۱۰۴۷ کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
۱۰۴۸ اس شوخ سے ہمیں بھی اب یاری ہوگئی ہے
۱۰۴۹ کہاں یاد قیس اب جو دنیا کرے ہے
۱۰۵۰ کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
۱۰۵۱ ربط دل کو اس بت بے مہر کینہ ور سے ہے
۱۰۵۲ کار دل اس مہ تمام سے ہے
۱۰۵۳ جل گیا دل مگر ایسے جوں بلا نکلے ہے
۱۰۵۴ عبرت سے دیکھ جس جا یاں کوئی گھر بنے ہے

دیوان سوم - ردیف ی

۱۲۵۲ تدبیر غم دل کی بستی میں نہ ٹھہرائی
۱۲۵۳ شور کیا جو اس کی گلی میں رات کو ہیں سب جان گئے
۱۲۵۴ سوز دروں سے آگ لگی ہے سارے بدن میں تب سی ہے
۱۲۵۵ کیسے نحس دلوں میں یارب میں نے اس سے محبت کی
۱۲۵۶ کیسے ناز و تبختر سے ہم اپنے یار کو دیکھا ہے
۱۲۵۷ ناز و ادا کے ساتھ وہ دلبر شکیل ہے

غزل نمبر

۱۲۵۸ برسوں گذرے ہیں ملے کب تئیں یوں پیار رہے
۱۲۵۹ اب تک تو نبھی اچھی اب دیکھیے پیری ہے
۱۲۶۰ سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے
۱۲۶۱ ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے
۱۲۶۲ دیکھیے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
۱۲۶۳ آشوب چشم چشمہ زا اب کوہ و صحرا پر بھی ہے
۱۲۶۴ آنکھوں سے راہ عشق کی ہم جوں نگہ گئے
۱۲۶۵ میر کیوں رہتے ہیں اکثر ان منے
۱۲۶۶ ہم پہ رہتے ہو کیا کر کتے
۱۲۶۷ سب شرم جبین یار سے پانی ہے
۱۲۶۸ جی کے لگنے کی میر کچھ کہہ بھی
۱۲۶۹ کہیں آگ آہ سوزندہ نہ چھاتی میں لگا دیوے
۱۲۷۰ تیر جوڑے وہ ماہ آتا ہے
۱۲۷۱ شائستۂ غم و ستم یار ہم ہوئے
۱۲۷۲ کہی میں ان لبوں کی جاں فزائی
۱۲۷۳ ہوں خاک پا جو اس کی ہر کوئی سر چڑھاوے
۱۲۷۴ بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے
۱۲۷۵ برسوں تک جی کو مار مار رہے
۱۲۷۶ یوں جنوں کرتے جو ہم یاں سے گئے
۱۲۷۷ اے نوخط ایک دن ہے جھگڑا ہمارے تیرے
۱۲۷۸ دو دیدۂ تر اپنے جو یار کو ہیں تکتے
۱۲۷۹ غم مرگ سے دل جگر ریش ہے
۱۲۸۰ گوش ہر یک کا اسی کی اور ہے
۱۲۸۱ شب اگر دل خواہ اپنے بے قراری کیجیے
۱۲۸۲ صدگونہ عاشقی میں ہم نے جفا سہی ہے
۱۲۸۳ کل جوش غم میں آنسو ٹپکے نہ چشم تر سے
۱۲۸۴ برق و شرار و شعلہ و پروانہ سب ہیں یے
۱۲۸۵ خوش طرح مکاں دل کے ڈھانے میں شتابی کی
۱۲۸۶ کوئی ساحر اس کو کچھ جادو کرے

غزل نمبر

۱۲۸۷ حدیث زلف دراز اس کے منھ کی بات بڑی
۱۲۸۸ ہے تماشا حسن و خط حیرت بھی ہے
۱۲۸۹ چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے
۱۲۹۰ یار کا جور و ستم کام ہی کر جاتا ہے
۱۲۹۱ ٹھوکر لگا کے چلنا اس رشک ماہ کو بھی
۱۲۹۲ سنا جاتا ہے اے گھتیے ترے مجلس نشینوں سے
۱۲۹۳ بے تابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے
۱۲۹۴ دشمنوں کے روبرو دشنام ہے
۱۲۹۵ دل عجب نسخۂ تصوف ہے
۱۲۹۶ تسکین دردمندوں کو یارب شتاب دے
۱۲۹۷ نہ جرأت ہے نہ جذبہ ہے نہ یاری بخت بد سے ہے
۱۲۹۸ کٹ کر گریں گے راہ میں مشتاق علف سے
۱۲۹۹ کبھو کچھ میر کی وحشت سے ان گلیوں میں آنے کی
۱۳۰۰ عزیزو کون سی صورت ہے ظاہر اس کے آنے کی
۱۳۰۱ کریہہ الشکل ہیئت آن کر ایسی نہیں دیکھی
۱۳۰۲ دن فصل گل کے اب کے بھی جاتے ہیں باؤ سے
۱۳۰۳ کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے
۱۳۰۴ بتوں کے جرم الفت پر ہمیں زجر و ملامت ہے
۱۳۰۵ خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے
۱۳۰۶ نکلے ہے جی کا رستہ آواز کی رکن سے
۱۳۰۷ کعبے کے در پہ تھے ہم یا دیر میں در آئے
۱۳۰۸ قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے
۱۳۰۹ دل کی بیماری سے طاقت طاق ہے
۱۳۱۰ بات کیا آدمی کی بن آئی
۱۳۱۱ دست بستہ کام ناخن کر گئے

دیوان چہارم - ردیف ی

۱۴۸۷ میں تو تنگ صبری سے اپنی رہ نہیں سکتا اک دم بھی
۱۴۸۸ نقد دل غفلت سے کھویا راہ کھوٹی کر گئے
۱۴۸۹ اے کاش کوئی جا کر کہہ آوے یار سے بھی

غزل نمبر

۱۴۹۰ خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
۱۴۹۱ زور کش ہیں گے عشق کے ہم بھی
۱۴۹۲ لطف ہے کیا انواع ستم جو اس کے کوئی بیان کرے
۱۴۹۳ بے دل ہوئے بے دیں ہوئے بے وقر ہم ات گت ہوئے
۱۴۹۴ باغ میں میر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
۱۴۹۵ حال نہیں ہے دل میں مطلق شور و فغاں رسوائی ہے
۱۴۹۶ دنیا کی قدر کیا جو طلب گار ہو کوئی
۱۴۹۷ ان حنائی دست و پا سے دل لگی سی ہے ابھی
۱۴۹۸ دیر سے ہم کو بھول گئے ہو یاد کرو تو بہتر ہے
۱۴۹۹ ل اہل بصیرت سے کچھ دے ہی دکھادیں گے
۱۵۰۰ جنگل میں چشم کس سے بستی کی رہبری کی
۱۵۰۱ اکثر کی بے دماغی ہر دم کی سرگرانی
۱۵۰۲ چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک بہم غم دل کہا کریں گے
۱۵۰۳ سنو سرگذشت اب ہماری زبانی
۱۵۰۴ چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
۱۵۰۵ ہم اس مرتبہ پھر بھی لشکر گئے
۱۵۰۶ کب وعدے کی رات وہ آئی جو آپس میں نہ لڑائی ہوئی
۱۵۰۷ موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
۱۵۰۸ ہماری تیری مودت ہے دوست داری ہے
۱۵۰۹ نہ خاطر پر الم تیرے نہ دل پر کچھ ستم تیرے
۱۵۱۰ عشق میں کھوئے جاؤ گے تو بات کی تہ بھی پاؤ گے
۱۵۱۱ اب کے سفر کو ہم سے وہ مہ جدا گیا ہے
۱۵۱۲ کبھو سو کریے فراق اس کا تو جی کو میرے کھپا گیا ہے
۱۵۱۳ صبر کر رہ جو وہ عتاب کرے
۱۵۱۴ افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے
۱۵۱۵ حال رہا ہو ہم میں کچھ تو حال کسو سے کہا جاوے
۱۵۱۶ عشق چھپا کر پچھتائے ہم سوکھ گئے رنجور ہوئے
۱۵۱۷ جو بحث جی سے وفا میں ہے سو تو حاضر ہے
۱۵۱۸ ہوتی نہیں تسلی دل گلستاں سے بھی

غزل نمبر

۱۵۱۹ عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے
۱۵۲۰ جب سے ستارہ صبح کا نکلا تب سے آنسو جھمکا ہے
۱۵۲۱ خواہش دل کی کس سے کہیے محرم تو ناپیدا ہے
۱۵۲۲ صبر کیا جاتا نہیں ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
۱۵۲۳ دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے
۱۵۲۴ کلید پیچ اگر رقعہ یار کا آوے
۱۵۲۵ میں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
۱۵۲۶ کیا کیا ہم نے رنج اٹھائے کیا کیا ہم بھی شکیبا تھے
۱۵۲۷ رنج کی اس کے جو خبر گذرے
۱۵۲۸ جب سے آنکھیں کھلی ہیں اپنی درد و رنج و غم دیکھے
۱۵۲۹ خواہش دل سے جی کی تاب گئی
۱۵۳۰ یارب اس کا ستم سہا بھی جائے
۱۵۳۱ اب ترک کر لباس توکل ہی کر رہے
۱۵۳۲ پھر اب چلو چمن میں کھلے غنچے رک گئے
۱۵۳۳ آج ہمیں بے تابی سی ہے صبر کی دل سے رخصت تھی

دیوان پنجم - ردیف ی

۱۷۲۵ رات کو تھا کعبے میں میں بھی شیخ حرم سے لڑائی ہوئی
۱۷۲۶ آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
۱۷۲۷ کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے
۱۷۲۸ کیا کہیے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے
۱۷۲۹ جوں ابر بے کسانہ روتے اٹھے ہیں گھر سے
۱۷۳۰ بسکہ ہے گردون دوں پرور دنی
۱۷۳۱ بسان برق دو جھمکے دکھاوے
۱۷۳۲ کیا خط لکھوں میں رونے سے فرصت نہیں رہی
۱۷۳۳ نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی
۱۷۳۴ ادھر مطرب کا عودی رنگ کب طناز آتا ہے
۱۷۳۵ اس کے رنگ چمن میں شاید اور کھلا ہے پھول کوئی
۱۷۳۶ پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
۱۷۳۷ جب جل گئے تب ان نے کینے کی ادا کی ہے

غزل نمبر

۱۷۳۸ ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی
۱۷۳۹ بے اس کے تیرے حق میں کوئی کیا دعا کرے
۱۷۴۰ عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
۱۷۴۱ عشق کیا سو جان جلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی
۱۷۴۲ یاری کرے جو چاہے کسو سے غم ہی غم یاری میں ہے
۱۷۴۳ دل بھی بھرا رہتا ہے میرا جی بھی رندھا کچھ جاتا ہے
۱۷۴۴ اس مغرور کو کیا ہوتا ہے حال شکستہ دکھائے سے
۱۷۴۵ گردش دنوں کی کم نہ ہوئی کچھ کڑے ہوئے
۱۷۴۶ عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
۱۷۴۷ دل کی لاگ بری ہوتی ہے رہ نہ سکے تک جانے بھی
۱۷۴۸ کوئی نام اس کا نہ لو جبر ہے
۱۷۴۹ ظلم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اٹھے ہیں درد کھنچے
۱۷۵۰ عشق اگر ہے مرو میداں مرد کوئی عرصے میں آئے
۱۷۵۱ ہم پہ خشم و خطاب ہے سو ہے
۱۷۵۲ چلتے ہوئے تسلی کو کچھ یار کہہ گئے
۱۷۵۳ ہائے جوانی وصل میں اس کے کیا کیا لذت پاتے تھے
۱۷۵۴ بات ہماری یاد رہے جی بھولا بھولا جاتا ہے
۱۷۵۵ اس تک کوشش سے بھی نہ پہنچے جان سے آخر سارے گئے
۱۷۵۶ عیدیں آئیں بارہا لیکن نہ وے آکر ملے
۱۷۵۷ کیسی سعی و کشش کوشش سے کعبے گئے بتخانے سے
۱۷۵۸ گئے روزے اب دید وادید ہے
۱۷۵۹ ہجر میں خوں ہوا تھا سب غم سے
۱۷۶۰ اٹکھیلیوں سے چلتے طفلی میں جان مارے
۱۷۶۱ کیا کہیے ویسی صورت گاہے نظر نہ آئی
۱۷۶۲ داد فریاد جابجا کریے
۱۷۶۳ دو چار روز آگے چھاتی گئی تھی کوئی
۱۷۶۴ کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے
۱۷۶۵ جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزاری ہے
۱۷۶۶ درد و غم سے دل کبھو فرصت نہ پائے

غزل نمبر

۱۷۶۷ نوشتہ نامہ آیا یہ کچھ ہمیں لکھا ہے
۱۷۶۸ دل پہلو میں ناتواں بہت ہے
۱۷۶۹ صاحب ہو تم ہمارے بندے ہیں ہم تمھارے
۱۷۷۰ عشق ہمارا در پے جاں ہے کیسی خصومت کرتا ہے
۱۷۷۱ نالہ جب گرم کار ہوتا ہے
۱۷۷۲ سخت بے رحم آہ قاتل ہے
۱۷۷۳ بے کسان عشق تھے ہم غم میں کھپ، سارے گئے
۱۷۷۴ بے یار ہوں بیکس ہوں آگاہ نہیں کوئی
۱۷۷۵ دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے
۱۷۷۶ عشق بلا انگیز مفتن یہ تو کوئی قیامت ہے
۱۷۷۷ اے پریشاں ربط دیکھیں کب تلک یہ دور ہے
۱۷۷۸ گردن کش زمانہ تو تیرا اسیر ہے
۱۷۷۹ ان بلاؤں سے کب رہائی ہے
۱۷۸۰ گل قفس تک نسیم لائی ہے
۱۷۸۱ یارب کوئی دیوانہ بے ڈھنگ سا آجاوے
۱۷۸۲ ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے
۱۷۸۳ یہی عشق ہے جی کھپا جانتا ہے

دیوان ششم – ردیف ی

۱۸۷۵ کہتے ہیں مرنے والے یاں سے گئے
۱۸۷۶ کچھ نہ کی ان نے جس کو چاہا ہے
۱۸۷۷ عشق میں ہم نے جاں کنی کی ہے
۱۸۷۸ میں ہوں تو ہے درمیاں شمشیر ہے
۱۸۷۹ جو جنون وعشق کی تدبیر ہے
۱۸۸۰ دل غم سے خوں ہوا تو بس اب زندگی ہوئی
۱۸۸۱ یار نے ہم سے بے ادائی کی
۱۸۸۲ زمیں اور ہے آسماں اور ہے
۱۸۸۳ کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے
۱۸۸۴ بے لطف یار ہم کو کچھ آسرا نہیں ہے
۱۸۸۵ لاکھوں فلک کی آنکھیں سب مند گئیں ادھر سے
۱۸۸۶ کافر بتوں سے مل کے مسلمان کیا رہے

غزل نمبر

۱۸۸۷ وہ اب ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے
۱۸۸۸ مدت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی
۱۸۸۹ گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
۱۸۹۰ لے عشق میں گئے دل پر اپنی جان سے
۱۸۹۱ کبھو سو کریے علاج اپنا طپیدن دل بلائے جاں ہے
۱۸۹۲ سر راہ چندے انتظاری رہے
۱۸۹۳ کیا منھ لگے گلوں کے شگفتہ دماغ ہے
۱۸۹۴ طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
۱۸۹۵ ہم رو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے
۱۸۹۶ مدت پائے چنار رہے ہیں مدت گلخن تابی کی
۱۸۹۷ خم ہوا قد کماں سا پیر ہوئے
۱۸۹۸ آؤ کبھو تو پاس ہمارے بھی ناز سے
۱۸۹۹ رشک شمشیر ابرو کا خم ہے
۱۹۰۰ جو لوگ آسماں نے یاں خاک کر اڑائے
۱۹۰۱ ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
۱۹۰۲ دے سیہ موئی و گرفتاری
۱۹۰۳ جمع افگنی سے ان نے ترکش کیے ہیں خالی
۱۹۰۴ دوستی نے تو ہماری جاں گدازی خوب کی
۱۹۰۵ اے عشق بے محابا تو نے تو جان مارے
۱۹۰۶ مرغان باغ سارے گویا ہیں اس کے مارے
۱۹۰۷ اس سخن رس سے اگر شب کی ملاقات رہے
۱۹۰۸ کیا عشق بے محابا ستھراؤ کر رہا ہے
۱۹۰۹ کیا طرح ہے یاں جو آئے ہو تو شرمائے ہوئے
۱۹۱۰ چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے
۱۹۱۱ فلک کرنے کے قابل آسماں ہے
۱۹۱۲ ہم رہن بادہ جامۂ احرام کر چکے
۱۹۱۳ عشق کیا کوئی اختیار کرے
۱۹۱۴ سب کام سونپ اس کو جو کچھ کام بھی چلے
۱۹۱۵ اب دشت عشق میں ہیں تنگ آئے جان سے
۱۹۱۶ گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی

دیوان اول

دیوان اول

ردیف الف

(۱)

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا　　پیدا ہر ایک نالے سے شورنشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تیں　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم　　یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر　　کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا　　دیوانہ ہوگیا سو بہت ذی شعور تھا[1]
منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا　　اس رند کی بھی رات گذر گئی جو عور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر　　اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　ق　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سر پرغرور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

(۲)

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا　　آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا
کس رات نظر کی ہے سوے چشمک انجم　　آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن　　ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ　　جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
جانا نہیں کچھ جز غزل آکر کے جہاں میں　　کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا　　جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۳)

نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا
یاد دہ ہے وہ کسو چشم کی گریانی کا

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ہے اس یوسف زندانی کا

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب
ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا

اس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میرؔ ایسی مسلمانی کا

(۴)

جلوۂ مستی عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
دامن تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

دیر میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار
راہ سے میخانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

(۵)

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا

اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میرؔ پر
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

(۶)

شب ہجر میں کم تظلم کیا — کہ ہمسائگاں پر ترحم کیا
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
زمانے نے مجھ جرعہ کش کو ندان — کیا خاک و خشت سر خم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک — پلک تک گیا تو تلاطم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اسے
بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا

(۷)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی — ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں — بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی — کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام — کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں — جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا
کاش اب برقع منھ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے — آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی — رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا
ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے — بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا
کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے — استغنا کی چوگنی ان نے جوں جوں میں ابرام کیا
ایسے آہوے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی — سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(۸)

چمن میں گل نے جو کل دعوی جمال کیا — جمال یار نے منھ اس کا خوب لال کیا
فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر — برنگ سبزۂ نورستہ پائمال کیا

رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی   سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا
مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم   نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو   چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف   کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

(۹)

دیکھے گا جو تجھ رو کو سو حیران رہے گا   وابستہ ترے مو کا پریشان رہے گا
وعدہ تو کیا اس سے دم صبح کا لیکن   اس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان رہے گا
منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا   پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
چھوٹوں کہیں ایذا سے لگا ایک ہی جلاد   تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا
چپٹے رہیں گے دشت محبت میں سر و تیغ   محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز   تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

دل دینے کی ایسی حرکت ان نے نہیں کی
جب تک جیے گا میر پشیمان رہے گا

(۱۰)

تا گور کے اوپر وہ گل اندام نہ آیا   ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا
بے ہوش مئے عشق ہوں کیا میرا بھروسا   آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا
کس دل سے ترا تیر نگہ پار نہ گذرا   کس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا
دیکھا نہ اسے دور سے بھی منتظروں نے   وہ رشک مہ عید لب بام نہ آیا
سو بار بیاباں میں گیا محمل لیلیٰ   مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا
اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو   پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میر کسو کام نہ آیا

(۱۱)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا   کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
شرمندہ ترے رخ سے ہے رخسار پری کا   چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت   اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی   اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا   انصاف طلب ہے تری بے داد گری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو   آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گذرے   مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو   ٹکڑا ہے مرا اشک عقیق جگری کا
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جاکر   تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام   آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

(۱۲)

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا   حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے برے مغبچوں کے تیور لیک   شیخ میخانے سے بھلا کھسکا
داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب   ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
بحر کم ظرف ہے بسانِ حباب   ق   کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا
فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا   آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

(۱۳)

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہوگیا   سنبل چمن کا مفت میں پامال ہوگیا
الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں   دل سا عزیز جان کا جنجال ہوگیا
کیا امتداد مدت ہجراں بیاں کروں   ساعت ہوئی قیامت و مہ سال ہوگیا
دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں   سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہوگیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہوگیا

(۱۴)

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا   جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا   اپنے کیے کا ان نے ثمرہ شتاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے   تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت   اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا
یوں خاک میں ملا یاں اس بن کہ کچھ نہ پوچھو   اس ظلم دیدہ دل کا ہم اضطراب دیکھا[1]
واعظ زبون مت کہہ میخانے کو کہ اس جا   پیراہن نکویاں رہن شراب دیکھا[2]
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

(۱۵)

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا   آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ   ہوسکے تو شمع ساں دیجے رگ گردن جلا
بدرساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ   ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہ نو دامن جلا
کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں   بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا
گرمی اس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب   جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا
ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی   کاٹ اپنی رات کو خار و خس گلخن جلا
سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا   بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا
شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے   دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا
آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

(۱۶)

حال دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سنا   شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سنا
نابلد ہو کے رہ عشق میں پہنچوں تو کہیں   ہمرہ خضر کو یاں کہتے ہیں گمراہ سنا
کوئی ان طوروں سے گذرے ہے ترے غم میں مری   گاہ تونے نہ سنا حال مرا گاہ سنا
خواب غفلت میں ہیں یاں سب تو عبث جاگا میر
بے خبر دیکھا انھیں میں، جنھیں، آگاہ سنا

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمود آباد

(۱۷)

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا — اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا
بسترا تھا چمن میں جوں بلبل — نالہ سرمایۂ توکل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا — موسم گل صفیر بلبل تھا
ان نے پہچان کر ہمیں مارا — منھ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا
شہر میں جو نظر پڑا اس کا — کشتۂ ناز یا تغافل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار — یاد ایام جب تحمل تھا
جا پھنسا دام زلف میں آخر — دل نہایت ہی بے تامل تھا
یوں گئی قد کے خم ہوئے جیسے — عمر اک رہرو سر پل تھا
خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میرؔ نکہت گل تھا

(۱۸)

آگے جمال یار کے معذور ہوگیا — گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہوگیا
اک چشم منتظر ہے کہ دیکھے ہے کب سے راہ — جوں زخم تیری دوری میں ناسور ہوگیا
قسمت تو دیکھ شیخ کو جب لہر آئی تب — دروازہ شیرہ خانے کا معمور ہوگیا
پہنچا قریب مرگ کے وہ صید ناقبول — جو تیری صیدگاہ سے ٹک دور ہوگیا
دیکھا یہ ناونوش کہ نیش فراق سے — سینہ تمام خانۂ زنبور ہوگیا
اس ماہ چاردہ کا چھپے عشق کیونکے آہ — اب تو تمام شہر میں مشہور ہوگیا
شاید کسو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ — میری بغل میں شیشۂ دل چور ہوگیا
لاشہ مرا تسلی نہ زیر زمیں ہوا — جب تک نہ آن کر وہ سر گور ہوگیا[1]
دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں
تیرے غم فراق میں رنجور ہوگیا

(۱۹)

فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا — پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا
بگڑا اگر وہ شوخ تو سنیو کہ رہ گیا — خورشید اپنی تیغ و سپر ہی سنبھالتا
یہ سر تبھی سے گوے ہے میدان عشق کا — پھرتا تھا جن دنوں میں تو گیندیں اچھالتا

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

بن سر کے پھوڑے بنتی نہ تھی کوہکن کے تیں　　خسرو سے سنگ سینہ کو کس طور ناتا

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میر
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ ساتا

(۴۰)

گل شرم سے بہ جائے گا گلشن میں ہوکر آب سا　　برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا
گل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے　　دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا
وہ مایۂ جاں تو کہیں پیدا نہیں جوں کیمیا　　میں شوق کی افراط سے بیتاب ہوں سیماب سا
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں　　اب عیش روز وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا
سناہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا　　اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا
ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچ کر چلے　　اب سجدے ہی میں گذرے ہے قد جو ہوا محراب سا
تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو　　اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا
بہکے جو ہم مست آگئے سو بار مسجد سے اٹھا　　واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

(۴۱)

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا　　نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری　　میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا
میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ　　اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو　　پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا
استادہ جہاں میں تھا میدان محبت میں　　واں رستم اگر آتا تو دیکھ کے ٹل جاتا
وہ سیر کا وادی کے مائل نہ ہوا ورنہ　　آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا
بے تاب و تواں یوں میں کا ہے کو تلف ہوتا　　یاقوتی ترے لب کی ملتی تو سنبھل جاتا
اس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی　　وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

مارا گیا تب گذرا بوسے سے ترے لب کے
کیا میر بھی لڑکا تھا باتوں میں بہل جاتا

(۴۲)

سینو جب وہ کبھو سوار ہوا　　تا بہ روح الامیں شکار ہوا

اس فریبندہ کو نہ سمجھے آہ — ہم نے جانا کہ ہم سے یار ہوا
نالہ ہم خاکساروں کا آخر — خاطر عرش کا غبار ہوا
جو نہ کہنا تھا سو بھی میں نے کہا — دل کی بے طاقتی سے خوار ہوا[1]
پھر گیا ہے زمانہ کیا کہ مجھے — ہوتے خوار ایک روزگار ہوا[2]
مر چلے بے قرار ہوکر ہم — اب تو تیرے تئیں قرار ہوا

وہ جو خنجر بکف نظر آیا
میر سو جان سے نثار ہوا

(۲۳)

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا — القصہ میر کو ہم بے اختیار پایا
احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے — افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا
چیتے جو ضعف ہوکر زخم رسا سے اس کے — سینے کو چاک دیکھا دل کو فگار پایا
شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں — آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا
اتنا نہ تجھ سے ملتے نے دل کو کھوکے روتے — جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
کیا اعتبار یاں کا پھر اس کو خوار دیکھا — جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا

آہوں کے شعلے جس جا اٹھتے تھے میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشت غبار پایا

(۲۴)

مارا زمیں میں گاڑا تب اس کو صبر آیا — اس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا
اس گل زمیں سے اب تک اگتے ہیں سرو مائل — مستی میں جھکتے جس پہ تیرا پڑا ہے سایا
یکساں ہے قتل گہ اور اس کی گلی تو مجھ کو — واں خاک میں میں لوٹا یاں لوہو میں نہایا
پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو — اب کس طرح اطاعت ان کی کروں خدایا
تا چرخ نالہ پہنچا لیکن اثر نہ دیکھا — کرنے سے اب دعا کے میں ہاتھ ہی اٹھایا
تیرا ہی منھ تکے ہے کیا جانیے کہ نوخط — کیا باغ سبز تونے آئینے کو دکھایا
شادابی و لطافت ہرگز ہوئی نہ اس میں — تیری مسوں پہ گرچہ سبزے نے زہر کھایا
آخر کو مر گئے ہیں اس کی ہی جستجو میں — جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اسے نہ پایا
لگتی نہیں ہے دارو ہیں سب طبیب حیراں — اک روگ میں بساہا جی کو کہاں لگایا
کہہ بیچ اس کے منھ کو جی میں ذرا یہاں تو — بارے وہ شوخ اپنی خاطر میں کچھ نہ لایا

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

ہونا تھا مجلس آرا گر غیر کا تجھے تو   مانند شمع مجھ کو کاہے کے تیں جلایا
تھی یہ کہاں کی یاری آئینہ رو کہ تونے
دیکھا جو میرؔ کو تو بے پیچ منھ بنایا

(۲۵)

شکوہ کروں میں کب تک اس اپنے مہرباں کا   القصہ رفتہ رفتہ دشمن ہوا ہے جاں کا
گریے پہ رنگ آیا قید قفس سے شاید   خوں ہوگیا جگر میں اب داغ گلستاں کا
لے جھاڑو ٹوکرا ہی آتا ہے صبح ہوتے   جاروب کش مگر ہے خورشید اس کے ہاں کا
دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو   یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا
ہر صبح میرے سر پر اک حادثہ نیا ہے   پیوند ہو زمیں کا شیوہ اس آسماں کا
ان صید افگنوں کا کیا ہو شکار کوئی ق ہوتا نہیں ہے آخر کام ان کے امتحاں کا
تب تو مجھے کیا تھا تیروں سے صید اپنا   اب کرتے ہیں نشانہ ہر میرے استخواں کا
فتراک جس کا اکثر لوہو میں تر رہے ہے   وہ قصد کب کرے ہے اس صید ناتواں کا
کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو   احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں کا
سجدہ کریں ہیں سن کر اوباش سارے اس کو   سید پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا
ناحق شناسی ہے یہ زاہد نہ کر برابر   طاعت سے سو برس کی سجدہ اس آستاں کا
ہیں دشت اب یہ جیتے بستے تھے شہر سارے   ویرانۂ کہن ہے معمورہ اس جہاں کا[1]
جس دن کہ اس کے منھ سے برقع اٹھے گا سنیو   اس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا
ناحق یہ ظلم کرنا انصاف کہہ پیارے   ہے کون سی جگہ کا کس شہر کا کہاں کا
سودائی ہو تو رکھے بازار عشق میں پا   سر مفت بیچتے ہیں یہ کچھ چلن ہے واں کا
سو گالی ایک چشمک اتنا سلوک تو ہے   اوباش خانہ جنگ اس خوش چشم بدزباں کا
یا روئے یا رلایا اپنی تو یوں ہی گذری ق کیا ذکر ہم صفیراں یاران شادماں کا
قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی   گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا
پوچھو تو میرؔ سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

(۲۶)

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا   دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
قسم جو کھایئے تو طالع زلیخا کی   عزیز مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

(۱) نسخۂ محمود آباد

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے   نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا
وہ کج روش نہ ملا راستے میں مجھ سے کبھی   نہ سیدھی طرح سے ان نے مرا سلام لیا
مزا دکھاویں گے بے رحمی کا تری صیاد   گر اضطراب اسیری نے زیر دام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شور نے روے زمیں تمام لیا

(۲۷)

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا   جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
سب کھلا باغ جہاں الا یہ حیران و خفا   جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
بوے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے باد بہار   ہوگیا ہے چاک دل شاید کسو دل گیر کا
کیونکے نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا   کام ہے اک تیرے منھ پر کھنچنا شمشیر کا
رہگذر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر   اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا
بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردسر   کام یاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
نالہ کش ہیں عہد پیری میں بھی تیرے در پہ ہم   قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا
جو ترے کوچے میں آیا پھر وہیں گاڑا اسے   تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا
خون سے میرے ہوئی یک دم خوشی تم کو تو لیک   مفت میں جاتا رہا جی ایک بے تقصیر کا
لخت دل سے جوں چھڑی پھولوں کی گونتھی ہے دلے   فائدہ کچھ اے جگر اس آہ بے تاثیر کا
گور مجنوں سے نہ جاویں گے کہیں ہم بے نوا   عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا
کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا

(۲۸)

شب درد و غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا   آیا شب فراق تھی یا روز جنگ تھا
کثرت میں درد و غم کی نہ نکلی کوئی طپش   کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا
لایا مرے مزار پہ اس کو یہ جذب عشق   جس بے وفا کو نام سے بھی میرے ننگ تھا
دیکھا ہے صیدگہ میں ترے صید کا جگر   باآنکہ چھن رہا تھا پہ ذوق خدنگ تھا
دل سے مرے لگا نہ ترا دل ہزار حیف   یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاق سنگ تھا
مت کر عجب جو میرؔ ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

(۲۹)

دل میں بھرا زبسکہ خیال شراب تھا   مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا
موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو   جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا
اگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم   صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں   جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا
دل جو نہ تھا تو رات زخودرفتگی میں میرؔ
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

(۳۰)

کیا طرح ہے آشنا گاہے گہے ناآشنا   یا تو بیگانے ہی رہیے ہوجیے یا آشنا
پائمال صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب   سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا
کون سے یہ بحرخوبی کی پریشاں زلف ہے   آتی ہے آنکھوں میں میری موج دریا آشنا
رونا ہی آتا ہے ہم کو دل ہوا جب سے جدا   جاے رونے ہی کی ہے جاوے جب ایسا آشنا[1]
ناسمجھ ہے تو جو میری قدر نہیں کرتا کہ شوخ   کم بہت ملتا ہے پھر دلخواہ اتنا آشنا[2]
بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاشکے   ق   یک مژہ رنگ فراری اس چمن کا آشنا
کو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن   خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا
کیا کروں کس سے کہوں اتنا ہی بیگانہ ہے یار   ق   سارے عالم میں نہیں پاتے کسی کا آشنا
جس سے میں چاہی وساطت ان نے یہ مجھ سے کہا   ہم تو کہتے گر میاں ہم سے وہ ہوتا آشنا
یوں سنا جا ہے کہ کرتا ہے سفر کا عزم جزم   ق   ساتھ اب بیگانہ وضعوں کے ہمارا آشنا
شعر صائبؔ کا مناسب ہے ہماری اور سے   سامنے اس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا
تابجاں ما ہمرہیم و تا بمنزل دیگراں   فرق باشد جان ما از آشنا تا آشنا
داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میرؔ
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

(۳۱)

گل کو محبوب ہم قیاس کیا   فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثال آئینہ   ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن   شوق نے ہم کو بےحواس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے   قیس کی آبرو کا پاس کیا

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد

دور سے چرخ کے نکل نہ سکے   ضعف نے ہم کو مورطاس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی   کیا پتنگے نے التماس کیا
تجھ سے کیا کیا توقعیں تھیں ہمیں   سو ترے ظلم نے نراس کیا(۱)
دیکھا ڈھہتا ہے جن نے خانہ بنا   زیر افلاک سست اساس کیا(۲)
ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اداس کیا

(۳۲)

مفت آبروے زاہد علامہ لے گیا   اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا
داغ فراق و حسرت وصل آرزوے شوق   میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا
پہنچا نہ پہنچا آہ گیا سو گیا غریب   وہ مرغ نامہ بر جو مرا نامہ لے گیا
اس راہزن کے ڈھنگوں سے دیوے خدا پناہ
اک مرتبہ جو میر جی کا جامہ لے گیا

(۳۳)

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا   غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا
موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں   کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا
چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا   بے چارہ کیونکے تا سر دیوار جائے گا
دے گی نہ چین لذت زخم اس شکار کو   جو کھا کے تیرے ہاتھ کی تلوار جائے گا
آوے گی اک بلا ترے سر سن لے اے صبا   زلف سیہ کا اس کی اگر تار جائے گا
باہر نہ آتا چاہ سے یوسف جو جانتا   لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا
تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب   اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا
آئے بن اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر   کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا
کوچے کے اس کے رہنے سے باز آ وگرنہ میر
اک دن تجھے وہ جان سے بھی مار جائے گا

(۳۴)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہوگیا   قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا
بے کسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر   جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمودآباد

کچھ خطرنا کی طریق عشق میں پنہاں نہیں — کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہوکر جو گیا
مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں — ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آکر بال اپنے دھو گیا

(۳۵)

مت ہو دشمن اے فلک مجھ پائمال راہ کا — خاک افتادہ ہوں میں بھی اک فقیر اللہ کا
سینکڑوں طرحیں نکالیں یار کے آنے کی لیک — عذر ہی جا ہے چلا اس کے دل ناخواہ کا
گر کوئی پیرمغاں مجھ کو کرے تو دیکھے پھر — میکدہ سارے کا سارا صرف ہے اللہ کا
کاش تیرے غم رسیدوں کو بلاویں حشر میں — ظلم ہے یک خلق پرآشوب ان کی آہ کا
جو سنا ہشیار اس میخانے میں تھا بےخبر — شوق ہی باقی رہا ہم کو دل آگاہ کا
باندھ مت رونے کا تار اے ناقباحت فہم چشم — اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا
شیخ مت کر ذکر ہر ساعت قیامت کا کہ ہے — عرصۂ محشر نمونہ اس کی بازی گاہ کا
شہر میں کس منھ سے آوے سامنے تیرے کہ شوخ — چھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

سرفرو لاتی نہیں ہمت مری ہر اک کے پاس
ہوں گدائے آستاں میں میر حضرت شاہ کا

(۳۶)

ایسی گلی اک شہر اسلام نہیں رکھتا — جس کوچے میں وہ بت صد بدنام نہیں رکھتا
آزار نہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گل — آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا
ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ — اب جی سے گذر جانا کچھ کام نہیں رکھتا
ہو خشک تو بہتر ہے وہ ہاتھ بہاراں میں — مانند نئے نرگس جو جام نہیں رکھتا
بن اس کی ہم آغوشی بیتاب نہیں اب ہے — مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا
میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا — پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا
وہ مفلس ان آنکھوں سے کیونکر کے بسر آوے — جو اپنی گرہ میں اک بادام نہیں رکھتا
کیا بات کروں اس سے مل جائے جو وہ میں تو — اس ناکسی سے روے دشنام نہیں رکھتا

یوں تو رہ و رسم اس کو اس شہر میں سب سے ہے
اک میر ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

(۳۷)

خوبی کا اس کی بسکہ طلبگار ہوگیا
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہوگیا

کس کو نہیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہوگیا

میں نودمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اٹھ چلا سو گرفتار ہوگیا

ٹھہرا گیا نہ ہو کے حریف اس کی چشم کا
سینے کو توڑ تیر نگہ پار ہوگیا

ہے اس کے حرف زیرلبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہوگیا

تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ
وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہوگیا

کیا کہیے آہ عشق میں خوبی نصیب کی
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہوگیا

آٹھوں پہر لگا ہی پھرے ہے تمھارے ساتھ
کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہوگیا

کب رو ہے اس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میر
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہوگیا

(۳۸)

تیر جو اس کمان سے نکلا
جگر مرغ جان سے نکلا

نکلی تھی تیغ بے دریغ اس کی
میں ہی اک امتحان سے نکلا

گو کٹے سر کہ سوز دل جوں شمع
اب تو میری زبان سے نکلا

آگے اے نالہ ہے خدا کا ناؤں
بس تو تہ آسمان سے نکلا

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں
نہ کبھو بحر و کان سے نکلا

مر گیا جو اسیر قید حیات
تنگنائے جہان سے نکلا

دل سے مت جا کہ حیف اس کا وقت
جو کوئی اس مکان سے نکلا

اس کی شیریں لبی کی حسرت میں
شہد پانی ہو شان سے نکلا

نامرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

(۳۹)

گرمی سے میں تو آتش غم کی پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

ساقی نشے میں تجھ سے لنڈھا شیشۂ شراب — چل اب کہ دخت تاک کا جوبن تو ڈھل گیا
ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار — یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

عریاں تنی کی شوخی سے دیوانگی میں میر
مجنوں کے دشت خار کا داماں بھی چل گیا

(۴۰)

سنا ہے حال ترے کشتگاں بچاروں کا — ہوا نہ گور گڑھا ان ستم کے ماروں کا
ہزار رنگ کھلے گل چمن کے ہیں شاہد — کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا
ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں — نکل کے شہر سے تک سیر کر مزاروں کا
عرق فشانی سے اس زلف کی ہراساں ہوں — بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا
علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے — خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا
تری ہی زلف کو محشر میں ہم دکھا دیں گے — جو کوئی مانگے گا نامہ سیاہکاروں کا
خراش سینۂ عاشق بھی دل کو لگ جائے — عجب طرح کا ہے فرقہ یہ دل فگاروں کا[1]
نگاہ مست کے مارے تری خراب ہیں شوخ — نہ ٹھور ہے نہ ٹھکانا ہے ہوشیاروں کا
کریں ہیں دعوی خوش چشمی آہوان دشت — تک ایک دیکھنے چل ملک ان گنواروں کا
تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اسے — جہاں میں کچھ تو رہا نام بےقراروں کا
تڑپ کے خرمن گل پر کبھی گر اے بجلی — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا
تمھیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور — خدا ہے شیخ جی ہم بھی گناہگاروں کا

اٹھے ہے گرد کی جا نالہ گور سے اس کی
غبار میر بھی عاشق ہے نے سواروں کا

(۴۱)

دل سمجھا نہ محبت کو کچھ ان نے کیا یہ خیال کیا — خون ہو بہ سب آپھی گیا عشق حسن و جمال کیا
آنکھیں فلک سے اس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے — مہندی کے رنگ ان پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا
یوں نکلے ہے فلک ایدھر سے ناز کناں جو جاتے تو — خاک سے سبزہ میری اگا کر ان نے مجھ کو نہال کیا
آگے جواب سے ان لوگوں کے بارے معافی اپنی ہوئی — ہم بھی فقیر ہوئے تھے لیکن ہم نے ترک سوال کیا

حال نہیں ہے عشق سے مجھ میں کس سے میر اب حال کہوں
آپھی چاہ کر اس ظالم کو یہ اپنا میں حال کیا

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۴۲)

گذرا بناے چرخ سے نالہ پگاہ کا   خانہ خراب ہوجیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں   مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن   کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا
یک قطرہ خون ہوکے پلک سے ٹپک پڑا   قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا
تلوار مارنا تو تمھیں کھیل ہے ولے   جاتا رہے نہ جان کسو بے گناہ کا
بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال   احوال کچھ نہ پوچھیے اس روسیاہ کا
ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل   ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو دادخواہ کا
اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس   ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا
ہر لخت دل میں صید کے پیکاں بھی گئے   دیکھا میں شوخ ٹھاٹھ تری صید گاہ کا[۱]

بیمار تو نہ ہووے جیے جب تلک کہ میرؔ
سونے نہ دے گا شور تری آہ آہ کا

(۴۳)

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا   جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں   لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے   ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

(۴۴)

گل و بلبل بہار میں دیکھا   ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا
جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں   یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
جیسا مضطر تھا زندگی میں دل   ووہیں میں نے قرار میں دیکھا[۲]
آبلے کا بھی ہونا دامن گیر   تیرے کوچے کے خار میں دیکھا
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ   اپنے دل کے غبار میں دیکھا
ذبح کر میں کہا تھا مرتا ہوں   دم نہیں مجھ شکار میں دیکھا[۳]

---

(۱) تا (۳) نسخۂ محمودآباد

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

(۴۵)

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپئے دل زار تھا
کبھو درد تھا کبھو داغ تھا کبھو زخم تھا کبھو وار تھا
دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دل خستہ لوہو جو ہوگیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا
دل مضطرب سے گذر گئی شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا
جو نگاہ کی بھی پلک اٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوک بے خطا کسو کے کلیجے کے پار تھا
یہ تمھاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں
وہی آفت دل عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا
نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا
کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

(۴۶)

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا   موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب   کس کی تسکیں کے لیے گھر سے تو باہر نکلا
جیتے جی آہ ترے کوچے سے کوئی نہ پھرا   جو ستم دیدہ رہا جاکے سو مر کر نکلا
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ   جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
اشک تر قطرۂ خوں لخت جگر پارۂ دل   ق   ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہ کر نکلا
کنج کاوی جو کی سینے کی غم ہجراں نے   اس دفینے میں سے اقسام جواہر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۴۷)

رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا — لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا
نہیں ستارے یہ سوراخ پڑ گئے ہیں تمام — فلک حریف ہوا تھا ہماری آہوں کا
گلی میں اس کی پھٹے کپڑوں پر مرے مت جا — لباسِ فقر ہے واں فخر بادشاہوں کا
تمام زلف کے کوچے ہیں مارپیچ اس کی — تجھی کو آوے دلا چلنا ایسی راہوں کا
اسی جو خوبی سے لائے تجھے قیامت میں — تو حرف کن نے کیا گوش دادخواہوں کا
تمام عمر رہیں خاک زیر پا اس کی — جو زور کچھ چلے ہم عجز دست گاہوں کا
کہاں سے تہ کریں پیدا یہ ناظمان حال — کہ پوچ بافی ہی ہے کام ان جلاہوں کا
حساب کا ہے کا روز شمار میں مجھ سے — شمار ہی نہیں ہے کچھ مرے گناہوں کا
تری جو آنکھیں ہیں تلوار کے تلے بھی ادھر
فریب خوردہ ہے تو میرؔ کن نگاہوں کا

(۴۸)

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا — اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
ہم کشتگان عشق ہیں ابرو و چشم یار — سر سے ہمارے تیغ کا سایہ نہ جائے گا
ہم رہروان راہ فنا ہیں برنگ عمر — جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا
پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل — تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اپنے شہید ناز سے بس ہاتھ اٹھا کہ پھر — دیوان حشر میں اسے لایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
ہم بےخودان محفل تصویر اب گئے — آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا
گو بےستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن — سنگ گران عشق اٹھایا نہ جائے گا
ہم تو گئے تھے شیخ کو انسان بوجھ کر — پر اب سے خانقاہ میں جایا نہ جائے گا[1]
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

(۴۹)

ایسا ترا رہگذر نہ ہوگا — ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا
کیا ان نے نشے میں مجھ کو مارا — اتنا بھی تو بے خبر نہ ہوگا

(۱) نسخۂ محمود آباد

دھوکا ہے تمام بحر دنیا　　دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا
آئی جو شکست آئینے پر　　روے دل یار ادھر نہ ہوگا
دشنوں سے کسی کا اتنا ظالم　　ٹکڑے ٹکڑے جگر نہ ہوگا
اب دل کے تئیں دیا تو سمجھا　　محنت زدوں کے جگر نہ ہوگا
دنیا کی نہ کر تو خواست گاری　ق　اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا
آ خانہ خرابی اپنی مت کر　　قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا
ہو اس سے جہاں سیاہ تد بھی　　نالے میں مرے اثر نہ ہوگا

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

(۵۰)

غم اس کو ساری رات سنایا تو کیا ہوا　　یا روز اٹھ کے سر کو پھرایا تو کیا ہوا
ان نے تو مجھ کو جھوٹے بھی پوچھا نہ ایک بار　　میں نے اسے ہزار جتایا تو کیا ہوا
خواہاں نہیں وہ کیوں ہی میں اپنی طرف سے یوں　　دل دے کے اس کے ہاتھ بکایا تو کیا ہوا
اب سعی کر سپہر کہ میرے موئے گئے　　اس کا مزاج مہر پہ آیا تو کیا ہوا
مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد　　دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
میں صید ناتواں بھی تجھے کیا کروں گا یاد　　ظالم اک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں　　ظاہر جہاں سے ہاتھ اٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاک جگر پاوے التیام　　ناصح جو تونے جامہ سلایا تو کیا ہوا

جیتے تو میرؔ ان نے مجھے داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

(۵۱)

گرچہ سردار مزوں کا ہے امیری کا مزا　　چھوڑ لذت کے تئیں لے تو فقیری کا مزا
اے کہ آزاد ہے تک چکھ نمک مرغ کباب　　تا تو جانے کہ یہ ہوتا ہے اسیری کا مزا
لوہو پیتے ہی مرا اشک نہ منھ کو لاگا　　بوسہ جب لے ہے ترے ہونٹوں کی پیری کا مزا[۱]

ہم تو گمراہ جوانی کے مزوں پر ہیں میرؔ
حضرت خضرؔ کو ارزانی ہو پیری کا مزا

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۵۲)

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا   رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
طائر رنگ حنا کی سی طرح   دل نہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منھ کر دل کی اور   اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ کس کو اب دماغ گفتگو
عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

(۵۳)

یاد ایام کہ یاں ترک شکیبائی تھا   ہر گلی شہر کی یاں کوچۂ رسوائی تھا
اتنی گذری جو ترے ہجر میں سو اس کے سبب   صبر مرحوم عجب مونس تنہائی تھا
تیرے جلوے کا مگر رو تھا سحر گلشن میں   نرگس اک دیدۂ حیران تماشائی تھا
یہی زلفوں کی تری بات تھی یا کاکل کی
میرؔ کو خوب کیا میر تو سودائی تھا

(۵۴)

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا   دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
اب اشک حنائی سے جو تر نہ کرے مژگاں   وہ تجھ کف رنگیں کا مارا نہ ہوا ہوگا
ٹک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں   ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
بے نالہ و بے زاری بے خستگی و خواری   امروز کبھی اپنا فردا نہ ہوا ہوگا[1]
ہے قاعدۂ کلی یہ کوے محبت میں   دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا
اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم   یک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے   جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا
جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر   یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا
صد نشتر مژگاں کے لگنے سے نہ نکلا خوں
آگے تجھے میرؔ ایسا سودا نہ ہوا ہوگا

(۵۵)

عالم میں کوئی دل کا طلبگار نہ پایا   اس جنس کا یاں ہم نے خریدار نہ پایا

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ — عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا
غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دست نگاریں — کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا
جاتی ہے نظر خس پہ گہ چشم پریدن — یاں ہم نے پر کاہ بھی بے کار نہ پایا
تصویر کے مانند لگے در ہی سے گذری — مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا
سوراخ ہے سینے میں ہر اک شخص کے تجھ سے — کس دل کے ترا تیر نگہ پار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل — اس باغ میں ہم نے گل بے خار نہ پایا
دم بعد جنوں مجھ میں نہ محسوس تھا یعنی — جامے میں مرے یاروں نے اک تار نہ پایا
آئینہ بھی حیرت سے محبت کی ہوئے ہم — پر سیر ہو اس شخص کا دیدار نہ پایا

وہ کھینچ کے شمشیر ستم رہ گیا جو میرؔ
خوں ریزی کا یاں کوئی سزاوار نہ پایا

(۵۶)

کیا مرے آنے پہ تو اے بت مغرور گیا — کبھی اس راہ سے نکلا تو تجھے گھور گیا
لے گیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اے وائے — آنکھ اس وقت کھلی قافلہ جب دور گیا
گور سے نالے نہیں اٹھتے تو نے اگتی ہے — جی گیا پر نہ ہمارا سر پر شور گیا
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا — ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا
ناتواں ہم ہیں کہ ہیں خاک گلی کی اس کی — اب تو بے طاقتی سے دل کا بھی مقدور گیا
لے کہیں منھ پہ نقاب اپنے کہ اے غیرت صبح — شمع کے چہرۂ رخشاں سے تو اب نور گیا

نالۂ میرؔ نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچے سے اے شوخ وہ رنجور گیا

(۵۷)

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا — کیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم — گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو — کشمکش میں بےقراری کی یہ پھوڑا چھل گیا
قیس کا کیا کیا گیا اودھر دل و دیں ہوش و صبر — جس طرف صحرا سے لیلیٰ کا چلا محمل گیا

رشک کی جاگہ ہے مرگ اس کشتۂ حسرت کی میرؔ
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

(۵۸)

تا بہ مقدور انتظار کیا
دل نے اب زور بے قرار کیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے
کہ جفاکار تجھ سا یار کیا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

ایک ناوک نے اس کی مژگاں کے
طائر سدرہ تک شکار کیا

صد رگ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

(۵۹)

شب تھا نالاں عزیز کوئی تھا
مرغ خوش خواں عزیز کوئی تھا

تھی تمھارے ستم کی تاب اس تک
صبر جو یاں عزیز کوئی تھا

شب کو اس کا خیال تھا دل میں
گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

چاہ بے جا نہ تھی زلیخا کی
ماہ کنعاں عزیز کوئی تھا

اب تو اس کی گلی میں خوار ہے لیک
میر بے جاں عزیز کوئی تھا

(۶۰)

پھوٹا کیے پیالے لنڈھتا پھرا قرابا
مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

حکمت ہے کچھ جو گردوں یکساں پھرا کرے ہے
چلتا نہیں وگرنہ شام و سحر عرابا

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر
یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو خوابا

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

ہر چند ناتواں ہیں پر آگیا جو جی میں
دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

منھ دھوتے وقت اس کے اکثر دکھائی دے ہے
خورشید لے رہا ہے اک روز آفتابا

اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

دل تفتگی کی اپنی ہجراں میں شرح کیا دوں
چھاتی تو میر میری جل کر ہوئی ہے تابا

(۶۱)

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا   پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا
ہوئی ہے اتنی ترے عکس زلف کی حیراں   کہ موج بحر سے مطلق بہا نہیں جاتا
نہیں گذرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پہ آہ   کہ جس میں غم سے ترے جی ڈھہا نہیں جاتا
ستم کچھ آج گلی میں تری نہیں مجھ پر   کب آکے خون میں میں یاں نہا نہیں جاتا

خراب مجھ کو کیا اضطراب دل نے میر
کہ تک بھی اس کنے اس بن رہا نہیں جاتا

(۶۲)

سمجھے تھے میر ہم کہ یہ ناسور کم ہوا   پھر ان دنوں میں دیدۂ خونبار نم ہوا
آئے برنگ ابر عرق ناک تم ادھر   حیران ہوں کہ آج کدھر کو کرم ہوا
تجھ بن شراب پی کے موئے سب ترے خراب   ساقی بغیر تیرے انھیں جام سم ہوا
کافر ہمارے دل کی نہ پوچھ اپنے عشق میں   بیت الحرام تھا سو وہ بیت الصنم ہوا
خانہ خراب کس کا کیا تیری چشم نے   ق   تھا کون یوں جسے تو نصیب ایک دم ہوا
تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری   یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا
آئی نظر جو گور سلیماں کی ایک روز   ق   کوچے پر اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کاے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر   پایان کار مور کی خاک قدم ہوا
افسوس کی بھی چشم تھی ان سے خلاف عقل   ق   بار علاقہ سے تو عبث پشت خم ہوا
اہل جہاں ہیں سارے ترے جیتے جی تلک   پوچھیں گے بھی نہ بات جہاں تو عدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

(۶۳)

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا   جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش   سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
سبک ہے آوے جو مندیل رکھ نماز کو شیخ   رہا ہے کون سا اب وقت سرگرانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں   خیال بھی کبھو گذرا نہ پرفشانی کا
پھرے ہے کھینچے ہی تلوار مجھ پہ ہر دم تو   کہ صید ہوں میں تری دشمنی جانی کا

نمود کرکے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

(۶۴)

موا میں سجدے میں پر نقش میرا بار رہا   اس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا
جنوں میں اب کے مجھے اپنے دل کا غم ہے پہ حیف   خبر لی جب کہ نہ جامے میں ایک تار رہا
بشر ہے وہ پہ کھلا جب سے اس کا دام زلف   سر رہ اس کے فرشتے ہی کا شکار رہا
کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح   تمام عمر ہمیں اس کا انتظار رہا
شراب عیش میسر ہوئی جسے اک شب   پھر اس کو روز قیامت تلک خمار رہا
بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا   ق   وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا   وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
تمام عمر گئی اس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں   وہ دردناک علی الرغم بے قرار رہا
ستم میں غم میں سر انجام اس کا کیا کہیے   ہزاروں حسرتیں تھیں تس پہ جی کو مار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا   رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا
سو اس کو ہم سے فراموش کاریوں لے گئے   کہ اس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

(۶۵)

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا   اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
کاوکاوِ مژۂ یار و دل زار و نزار   گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا   ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہ فنا کا نہیں ہوسکتا پتنگ   اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
پاس ناموس محبت تھا کہ فرہاد کے پاس   بے ستوں سامنے سے اپنے اٹھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے   جستجو کی پہ دل گم شدہ پایا نہ گیا
آتش تیز جدائی میں یکایک اس بن   دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے   پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا
زیر شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا   سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجے
درد دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

(۶۶)

دل کے تیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

کبھو عاشق کا ترے جبہے سے ناخن کا خراش
خط تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا

کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

میں تو تھا صید زبوں صید گہ عشق کے بیچ
آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا

شہر دل آہ عجب جاے تھی پر اس کے گئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح [illegible]

آج رکتی نہیں خامے کی زباں رکھیے معاف
حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا

(۶۷)

گل میں اس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا
ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا

آہ جو نکلی مرے منھ سے تو افلاک کے پاس
اس کے آشوب کے عہدے سے برآیا نہ گیا

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن
جی جو اچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

سرنشین رہ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

حیف دے حسن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
ان کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

منتظر اس کے کرخت ہوگئے بیٹھے بیٹھے
جس کے مردے کو اٹھایا سو لٹایا نہ گیا[1]

خطر راہ محبت کہیں جوں حرف مٹے
جس سے اس طرف کو قاصد بھی چلایا نہ گیا

خوف آشوب سے غوغاے قیامت کے لیے
خون خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا

میر مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخم دل چاک جگر تھا کہ سلایا نہ گیا

(۶۸)

ادھر آکر شکار افگن ہمارا
مشبک کر گیا ہے تن ہمارا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے
ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا

گئے جوں شمع اس مجلس میں جتنے
سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا

بلا جس چشم کو کہتے ہیں مردم
وہ ہے عین بلا مسکن ہمارا

(۱) نسخۂ محمود آباد

ہوا رونے سے راز دوستی فاش   ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا
بہت چاہا تھا ابر تر نے لیکن   نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا
چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں   سنا ہوگا کبھو شیون ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا   سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا
نہ بہکے میکدے میں میرؔ کیونکر
گرو سو جا ہے پیراہن ہمارا

(۶۹)

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا   افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا
مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم   بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا
کیا آرزو تھی جس سے سب چشم ہوگئے ہیں   ہر زخم سو جگہ سے ناسور ہے ہمارا
تھی آہ عشق بازی چوپڑ عجب بچھائی   کچی پڑیں ہیں نردیں گھر دور ہے ہمارا
تاچند پشت پا پر شرم و حیا سے آنکھیں   احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا
بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو   کیا کیجیے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا
ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

(۷۰)

سحرگہ عید میں دور سبو تھا   پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گذرنا   نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ   کہ ہر غنچہ دل پرآرزو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا   جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
کروگے یاد باتیں تو کہوگے   کہ کوئی رفتۂ بسیارگو تھا
جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے   دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا   کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا
کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے   کہ جھونکا باؤ کا کچھ مشک بو تھا
نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کوبکو تھا

(۷۱)

راہ دور عشق میں روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رایگاں کھوتا ہے کیا

(۷۲)

رونا تنک اک تھا تو غم بیکراں سہا — دس دن رہے جہان میں ہم سو رہا دہا
پہلو میں اک گرہ سی تہ خاک ساتھ ہے — شاید کہ مر گئے پہ بھی خاطر میں کچھ رہا
آنکھوں نے رازداری محبت کی خوب کی — آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا
آئے تھے اک امید پہ تیری گلی میں ہم — سو آہ اس طرح سے چلے لوہو میں نہا

کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

(۷۳)

یکسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا — اک دل غمخوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا
پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو — گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا
شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے — رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا
ڈر سے اس شمشیر زن کے جوہر آئینہ ساں — سر سے لے کر پاؤں تک میں غرق آہن میں رہا
ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
درپئے دل ہی رہے اس چہرے کے خال سیاہ — ڈر ہمیں ان چوٹوں کا روز روشن میں رہا

آہ کس انداز سے گذرا بیاباں سے کہ میرؔ
جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

(۷۴)

غمزے نے اس کے چوری میں دل کی ہنر کیا — اس خانماں خراب نے آنکھوں میں گھر کیا
رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم — ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

نافع جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں
آخر انھیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا

مرتا ہوں جان دیں ہیں وطن داریوں پہ لوگ
اور سنتے جاتے ہیں کہ ہر اک نے سفر کیا[1]

کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبت شراب سے آگے سفر کیا

جس دم کہ تیغ عشق کھنچی بوالہوس کہاں
سن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

دل زخمی ہوکے تجھ تیئں پہنچا تو کم نہیں
اس نیم کشتہ نے بھی قیامت جگر کیا

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مست ناز
ذوق خبر ہی نے تو ہمیں بےخبر کیا

وہ دشت خوف ناک رہا ہے مرا وطن
سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے مے گسار
دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے
کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ
یک حرف نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

بے شرم محض ہے وہ گنہگار جن نے میرؔ
ابر کرم کے سامنے دامان تر کیا

(۷۵)

ناکسی سے پاس میرے یار کا آنا گیا
بس گیا میں جان سے اب اس سے یہ جانا گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پرپیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

ایک ہی چشمک تھی فرصت صحبت احباب کی
دیدۂ تر ساتھ لے مجلس سے پیمانہ گیا

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم
مدتیں گذریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

دور تجھ سے میرؔ نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اسے مطلق نہ پہچانا گیا

(۷۶)

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا

اک نگہ سے بیش کچھ نقصاں نہ آیا اس کے تیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

دل نے سر کھینچا دیارعشق میں اے بوالہوس
وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میرؔ سر برآستاں مارا گیا

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

(۷۷)

محبت کا جب روز بازار ہوگا — بکیں گے سر اور کم خریدار ہوگا
تسلی ہوا صبر سے کچھ میں تجھ بن — کبھی یہ قیامت طرحدار ہوگا[۱]
صبا موے زلف اس کا ٹوٹے تو ڈر ہے — کہ اک وقت میں یہ سیہ مار ہوگا[۲]
مرا دانت ہے تیرے ہونٹوں پہ مت پوچھ — کہوں گا تو لڑنے کو تیار ہوگا[۳]
نہ خالی رہے گی مری جا گہ گر میں — نہ ہوں گا تو اندوہ بسیار ہوگا
یہ منصور کا خون ناحق گہ حق تھا — قیامت کو کس کس سے خوں دار ہوگا
عجب شیخ جی کی ہے شکل و شمائل — ملے گا تو صورت سے بیزار ہوگا
نہ رو عشق میں دشت گردی کو مجنوں — ابھی کیا ہوا ہے بہت خوار ہوگا[۴]
کھنچے عہد خط میں بھی دل تیری جانب — کبھو تو قیامت طرحدار ہوگا
زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن — یہ دیوار کا سایہ دیوار ہوگا
نہ مرکر بھی چھوٹے گا اتنا رکے گا — ترے دام میں جو گرفتار ہوگا[۵]

نہ پوچھ اپنی مجلس میں ہے میر بھی یاں
جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہوگا

(۷۸)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ — بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بلب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(۷۹)

کب تک تو امتحاں میں مجھ سے جدا رہے گا — جیتا ہوں تو تجھی میں یہ دل لگا رہے گا
یاں ہجر اور ہم میں بگڑی ہے کب کی صحبت — زخم دل و نمک میں کب تک مزہ رہے گا

---

(۱) تا (۵) نسخۂ محمود آباد

تو برسوں میں ملے ہے یاں فکر یہ رہے ہے　　جی جائے گا ہمارا اک دم کو یا رہے گا
میرے نہ ہونے کا تو ہے اضطراب یوں ہی　　آیا ہے جی لبوں پر اب کیا ہے جا رہے گا[1]
غافل نہ رہیو ہرگز نادان داغِ دل سے　　بھڑکے گا جب یہ شعلہ تب گھر جلا رہے گا
مرنے پہ اپنے مت جا سالک طلب میں اس کی　　گو سر کو کھو رہے گا پر اس کو پا رہے گا
عمرِ عزیز ساری دل ہی کے غم میں گذری　　بیمار عاشقی یہ کس دن بھلا رہے گا
دیدار کا تو وعدہ محشر میں دیکھ کر کر　　بیمارِ غم میں تیرے تب تک تو کیا رہے گا

کیا ہے جو اٹھ گیا ہے پر بستۂ وفا ہے
قیدِ حیات میں ہے تو میرؔ آ رہے گا

(۸۰)

جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا　　تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا
مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے　　کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا
نہ ہوگا وہ دیکھا جسے کبک تو نے　　وہ اک باغ کا سرو اندام ہوگا
نہ نکلا کر اتنا بھی بے پردہ گھر سے　　بہت اس میں ظالم تو بدنام ہوگا
ہزاروں کی یاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں　　تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا
وہ کچھ جانتا ہوگا زلفوں میں پھنسنا　　جو کوئی اسیرِ تہِ دام ہوگا[2]

جگر چاکی ناکامیِ دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہوگا

(۸۱)

خواب میں تو نظر جمال پڑا　　پر مرے جی ہی کے خیال پڑا
وہ نہانے لگا تو سایۂ زلف　　بحر میں تو کہے کہ جال پڑا
میں نے تو سر دیا پر اے جلاد　　کس کی گردن پہ یہ وبال پڑا
شیخ قلاش ہے جوے میں نہ لاؤ　　یاں ہمارا رہے ہے مال پڑا

خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں
میرؔ ہندوستاں میں کال پڑا

(۸۲)

نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال لیا　　کہ کاروان کا کنعاں کے جی نکال لیا
رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بھل ہم بھی　　شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

---
(۱)،(۲) نسخۂ محمود آباد

رہوں ہوں برسوں سے ہم دوش پر کبھو ان نے   گلے میں ہاتھ مرا پیار سے نہ ڈال لیا
بتاں کی میرؔ ستم وہ نگاہ ہے جس نے
خدا کے واسطے بھی خلق کا وبال لیا

(۸۳)

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا   اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا
رسم قلمرو عشق مت پوچھ کچھ کہ ناحق   ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا
تھا بدشراب ساقی کتنا کہ رات مے سے   میں نے جو ہاتھ کھینچا ان نے کنار کھینچا
مستی میں شکل ساری نقاش سے کھنچی پر   آنکھوں کو دیکھ اس کی آخر خمار کھینچا
جی کھنچ رہے ہیں اودھر عالم کا ہوگا بلوہ   گر شانے تو نے اس کی زلفوں کا تار کھینچا
تھا شب کسے کسائے تیغ کشیدہ کف میں   پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا
پھرتا ہے میرؔ تو جو پھاڑے ہوئے گریباں
کس کس ستم زدے نے دامان یار کھینچا

(۸۴)

یہ حسرت ہے مروں اس میں لیے لبریز پیمانہ   مہکتا ہو نپٹ جو پھول سی دارو سے میخانہ
نہ دے زنجیر کے غل ہیں نہ دے جرگے غزالوں کے   مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانہ
مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر یوں لگا کہنے   کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا
نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میرؔ دیوانہ رہا سوداؔ سو مستانہ

(۸۵)

بارے گور دل جھنکا لایا   اب کے شرط وفا بجا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاع دل   سارے عالم میں میں دکھا لایا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش   ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جاکر   اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار   عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(۸۶)

کیا عجب پل میں اگر ترک ہو اس سے جاں کا ہو جو زخمی کبھو برہم زدن مژگاں کا
اٹھتے پلکوں کے گرے پڑتے ہیں لاکھوں آنسو ڈول ڈالا ہے مری آنکھوں نے اب طوفاں کا
جلوۂ ماہ تہ ابر تنک بھول گیا ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا
لہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک ماروں ہوں اب تو یہ رنگ ہے اس دیدۂ اشک افشاں کا
ساکن کو کو ترے کب ہے تماشے کا دماغ آئی فردوس بھی چل کر نہ ادھر کو جھانکا
اٹھ گیا ایک تو اک مرنے کو آبیٹھے ہے قاعدہ ہے یہی مدت سے ہمارے ہاں کا
کار اسلام ہے مشکل ترے خال و خط سے رہزن دیں ہے کوئی دزد کوئی ایماں کا
چارۂ عشق بجز مرگ نہیں کچھ اے میر
اس مرض میں ہے عبث فکر تمھیں درماں کا

(۸۷)

ہر دم طرف ہے ویسے مزاج کرخت کا ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگ سخت کا
سبزان تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت کا
جوں برگ ہاے لالہ پریشان ہوگیا مذکور کیا ہے اب جگر لخت لخت کا
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
خاک سیہ سے میں جو برابر ہوا ہوں میر
سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

(۸۸)

ہم عشق میں نہ جانا غم ہی سدا رہے گا دس دن جو ہے یہ مہلت سو یاں دہا رہے گا
برقع اٹھے پہ اس کے ہوگا جہان روشن خورشید کا نکلنا کیونکر چھپا رہے گا
اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں آتے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہے گا
مذکور یار ہم سے مت ہم نشیں کیا کر دل جو بجا نہیں ہے پھر اس میں جا رہے گا
اس گل بغیر جیسے ابر بہار عاشق نالاں جدا رہے گا روتا جدا رہے گا
دانستہ ہے تغافل غم کہنا اس سے حاصل تم درد دل کہوگے وہ سر جھکا رہے گا
اب جھمکی اس کی تم نے دیکھی کبھو جو یارو برسوں تلک اسی میں پھر دل سدا رہے گا
کس کس کو میر ان نے کہہ کر دیا ہے بوسہ
وہ ایک ہے مفتن یوں ہی چُما رہے گا

(۸۹)

بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا برا ہوگا
مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا

تفحص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا
وہی پاوے گا میرا درد دل جس کا لگا ہوگا

کسو کو شوق یارب بیش اس سے اور کیا ہوگا
قلم ہاتھ آگئی ہوگی تو سو سو خط لکھا ہوگا

دکانیں حسن کی آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی
جو تو بازار میں ہوگا تو یوسف کب بکا ہوگا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

خیال اس بے وفا کا ہم نشیں اتنا نہیں اچھا
گماں رکھتے تھے ہم بھی یہ کہ ہم سے آشنا ہوگا

قیامت کرکے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت
وہ اس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا

عجب کیا ہے ہلاک عشق میں فرہاد و مجنوں کے
محبت روگ ہے کوئی کہ کم اس سے جیا ہوگا

نہ ہو کیوں غیرت گلزار وہ کوچہ خدا جانے
لہو اس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا

بہت ہمسائے اس گلشن کے زنجیری رہا ہوں میں
کبھو تم نے بھی میرا شور نالوں کا سنا ہوگا

نہیں جز عرش جاکہ راہ میں لینے کو دم اس کے
قفس سے تن کے مرغ روح میرا جب رہا ہوگا

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا

(۹۰)

یاں نام یار کس کا درد زباں نہ پایا
پر مطلقاً کہیں ہم اس کا نشاں نہ پایا

وضع کشیدہ اس کی رکھتی ہے داغ سب کو
نیوتا کسو سے ہم وہ ابرو کماں نہ پایا

پایا نہ یوں کہ کریے اس کی طرف اشارت
یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

یہ دل کہ خون ہووے برجا نہ تھا وگرنہ
وہ کون سی جگہ تھی اس کو جہاں نہ پایا

فتنے کی گرچہ باعث آفاق میں وہی تھی
لیکن کمر کو اس کی ہم درمیاں نہ پایا

محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے
جوش جباہ سے ہم وہ آستاں نہ پایا

ایسی ہے میر کی بھی مدت سے رونی صورت
چہرے پہ اس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا

(۹۱)

پھر شب نہ لطف تھا نہ وہ مجلس میں نور تھا
اس روے دل فروز کا سب میں ظہور تھا

کیا کیا عزیز خلع بدن ہائے کر گئے
تشریف تم کو یاں تئیں لانا ضرور تھا

کیونکر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا
یہ بحر موج خیز تو عسرالعبور تھا

زخمی جو اس کے ہاتھ کا نکلا سو چور تھا ۔۔۔ شاید نشے میں اس سے یہ سفاکیاں ہوئیں

جیتے جی پاس ہوکے نہ نکلا کسو کے میر
وہ دور گرد بادیۂ عشق دور تھا

(۹۲)

بے حال جاے گریہ جان پرآرزو کا ۔۔۔ روئے نہ ہم کبھو ٹک دامن پکڑ کسو کا
جاتی نہیں اٹھائی اپنے پہ یہ خشونت ۔۔۔ اب رہ گیا ہے آنا میرا کبھو کبھو کا
اس آستاں سے کس دن پرشور سر نہ پٹکا ۔۔۔ اس کی گلی میں جاکر کس رات میں نہ کوکا
شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشم گریاں ۔۔۔ کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کی جو کا
اپنے تڑپنے کی تو تدبیر پہلے کرلوں ۔۔۔ تب فکر میں کروں گا زخموں کے بھی رفو کا
دانتوں کی نظم اس کے ہنسنے میں جن نے دیکھی ۔۔۔ پھر موتیوں کی لڑ پر ان نے کبھو نہ تھوکا
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ۔۔۔ ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر ۔۔۔ سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
گلیاں بھری پڑی ہیں اے باد زخمیوں سے ۔۔۔ مت کھول پیچ ظالم اس زلف مشک بو کا

دے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں
دینا نہ تھا دل اس کو میں میر آہ چوکا

(۹۳)

میں بھی دنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یک جا ۔۔۔ دل کے سو ٹکڑے مرے پر سبھی نالاں یک جا
پندگویوں نے بہت سینے کی تدبیریں لیں ۔۔۔ آہ ثابت بھی نہ نکلا یہ گریباں یک جا
تیرا کوچہ ہے ستمگار وہ کافر جاگہ ۔۔۔ کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلماں یک جا
سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی ۔۔۔ جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یک جا
کیونکے پڑتے ہیں ترے پاؤں نسیم سحری ۔۔۔ اس کے کوچے میں ہے صد گنج شہیداں یک جا
تو بھی رونے کو ملا دل ہے ہمارا بھی بھرا ۔۔۔ ہوجے اے ابر بیاباں میں گریاں یک جا

بیٹھ کر میر جہاں خوب نہ رویا ہووے
ایسی کوچے میں نہیں ہے ترے جاناں یک جا

(۹۴)

فلک کا منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا ۔۔۔ ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا
ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھیو ۔۔۔ کہیں خیال نہیں یاں بحال آنے کا

تری ہی راہ میں مارے گئے سبھی آخر
سفر تو ہم کو ہے درپیش جی سے جانے کا

بسان شمع جو مجلس سے ہم گئے تو گئے
سراغ کچھ نہ پھر تو نشان پانے کا

چمن میں دیکھ نہیں سکتی ٹک کہ چبھتا ہے
جگر میں برق کے کانٹا مجھ آشیانے کا

ٹک آ تو تا سر بالیں نہ کر تعلل کیا
تجھے بھی شوخ یہی وقت ہے بہانے کا

سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

(۹۵)

کل شب ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا
شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یک جا نہ تھا

شہرۂ عالم اسے یمن محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہم‌نشیں
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

روز و شب گذرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے
اے دل صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا

یاد ایامے کہ اپنے روز و شب کی جاے باش
یا در باز بیاباں یا در میخانہ تھا

جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے
یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا

بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا
ہاتھ اس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

غیر کے کہنے سے مارا ان نے ہم کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

صبح ہوتے وہ بناگوش آج یاد آیا مجھے
جو گرا دامن پہ آنسو گوہر یک دانہ تھا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

رات اس کی چشم میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے
گوش اس کا شب ادھر تا آخر افسانہ تھا

میر بھی کیا مست طافح تھا شراب عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

(۹۶)

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا

اس آئینے کے مانند زنگار جس کو کھاوے
کام اپنا اس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا

جوں نقش پا ہے غربت حیران کار اس کی
آوارہ ہو وطن سے جو یار تک نہ پہنچا

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے　　کار شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
لے چشم نم رسیدہ پانی چوانے کوئی　　وقت اخیر اس کے بیمار تک نہ پہنچا
یہ بخت سبز دیکھو باغ زمانہ میں سے　　پژمردہ گل بھی اپنی دستار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں　　ق خوبی کا کام کس کی اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گل پھر گل سے لے کے تا شمع　　یہ حسن کس کو لے کر بازار تک نہ پہنچا
افسوس میرؔ وے جو ہونے شہید آئے
پھر کام ان کا اس کی تلوار تک نہ پہنچا

(۹۷)

اس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا　　قسمے کہ عشق جی سے مرے تاب لے گیا
کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک　　مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
آوے جو مصطبے میں تو سن لو کہ راہ سے　　واعظ کو ایک جام مئے ناب لے گیا
نے دل رہا بجا ہے نہ صبر و حواس و ہوش　　آیا جو سیل عشق سب اسباب لے گیا
میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا　　رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا
احوال اس شکار زبوں کا ہے جائے رحم　　جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا
منہ کی جھلک سے یار کے بے ہوش ہوگئے
شب ہم کو میرؔ پرتو مہتاب لے گیا

(۹۸)

کب تلک یہ ستم اٹھایئے گا　　ایک دن یوں ہی جی سے جایئے گا
شکل تصویر بے خودی کب تک　　کسو دن آپ میں بھی آیئے گا
سب سے مل چل کہ حادثے سے پھر　　کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پایئے گا
نہ موئے ہم اسیری میں تو نسیم　　کوئی دن اور باؤ کھایئے گا
کہیے گا اس سے قصۂ مجنوں　　یعنی پردے میں غم سنایئے گا
اس کے پابوس کی توقع پر　　اپنے تیں خاک میں ملایئے گا
اس کے پاؤں کو جا لگی ہے حنا　　خوب سے ہاتھ اسے لگایئے گا
شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ　　ق کعبہ و دیر سے بھی جایئے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنایئے گا

(۹۹)

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث — برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر — مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا
گذرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا — یہ دیر ہے زہاد نہ ہو خانۂ خالا
جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش — واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا
دشمن نہ کدورت سے مرے سامنے ہو جو — ق تلوار کے لڑنے کو مرے کچھ حوالا
ناموس مجھے صافی طینت کی ہے ورنہ — رستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پُرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

(۱۰۰)

بلا ٹک جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا — اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا
افسوس میرے مردے پر اتنا نہ کر کہ اب — پچھتانا یوں ہی سا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں — آنکھیں اگر یہی ہیں تو بھر نیند سو چکا
یک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر — جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا
ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی — اس سرزمیں میں تخم محبت میں بو چکا
پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک کا — میں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جام خون میر کو گر منھ وہ دھو چکا

(۱۰۱)

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا — ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
پلکوں سے تیری ہم کو کیا چشم داشت یہ تھی — ان برچھیوں نے بانٹا باہم جگر ہمارا
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے — کیا جانیے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا
ہیں تیرے آئینے کی تمثال ہم نہ پوچھو — اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا
جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن کی فرصت — قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا
کوچے میں اس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا — خون ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے   اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا
سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیے میں   جوں ابر روتے ہوگا جس دم گذر ہمارا
نشوونما ہے اپنی جوں گردباد انوکھی   بالیدہ خاک رہ سے ہے یہ شجر ہمارا
یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا   دامن سے باندھ دامن اے ابرتر ہمارا
جب پاس رات رہنا آتا ہے یاد اس کا   تھمتا نہیں ہے رونا دو دو پہر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میرؔ بار کھولیں
یاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

(۱۰۲)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دل کے جانے کا نہایت غم رہا
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب   خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک   قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمے کو سیاہ   اس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا   تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
زلفیں کھولیں تو تو ٹک آیا نظر   عمر بھر یاں کام دل برہم رہا
اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے   اپنے حق میں آب حیواں سم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی   ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

(۱۰۳)

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا   دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
دہر میں میں خاک بسر ہی رہا   عمر کو اس طور بسر کر گیا
دل نہیں ہے منزل سینہ میں اب   یاں سے وہ بیچارہ سفر کر گیا
حیف جو وہ نسخۂ دل کے اپر   سرسری سی ایک نظر کر گیا
کس کو مرے حال سے تھی آگہی   نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
گو نہ چلا تا مژہ تیر نگاہ   اپنے جگر سے تو گذر کر گیا

مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

(۱۰۴)

واں وہ تو گھر سے اپنے پی کر شراب نکلا
یاں شرم سے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا

آیا جو واقعے میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

دیکھا جو اوس پڑتے گلشن میں ہم تو آخر
گل کا وہ روے خنداں چشم پرآب نکلا

پردے ہی میں چلا جا خورشید تو ہے بہتر
اک حشر ہے جو گھر سے وہ بے حجاب نکلا

کچھ دیر ہی لگی نہ دل کو تو تیر لگتے
اس صید ناتواں کا کیا جی شتاب نکلا

ہر حرف غم نے میرے مجلس کے تیں رلایا
گویا غبار دل کا پڑھتا کتاب نکلا

روے عرق فشاں کو بس پونچھ گرم مت ہو
اس گل میں کیا رہے گا جس کا گلاب نکلا

مطلق نہ اعتنا کی احوال پر ہمارے
نامے کا نامے ہی میں سب پیچ و تاب نکلا

شان تغافل اپنے نوخط کی کیا لکھیں ہم
قاصد موا تب اس کے منھ سے جواب نکلا

کس کی نگہ کی گردش تھی میرؔ رو بہ مسجد
محراب میں سے زاہد مست و خراب نکلا

(۱۰۵)

دامان کوہ میں جو میں ڈاڑھ مار رویا
اک ابر واں سے اٹھ کر بے اختیار رویا

پڑتا نہ تھا بھروسا عہد وفاے گل پر
مرغ چمن نہ سمجھا میں تو ہزار رویا

ہر گل زمین یاں کی رونے ہی کی جگہ تھی
مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

تھی مصلحت کہ رک کر ہجراں میں جان دیجے
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا

اک عجز عشق اس کا اسباب صد الم تھا
کل میرؔ سے بہت میں ہوکر دوچار رویا

(۱۰۶)

اس چہرے کی خوبی سے عبث گل کو جتایا
یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

وہ آئنہ رخسار دم بازپس آیا
جب حس نہ رہا ہم کو تو دیدار دکھایا

کچھ ماہ میں اس میں نہ تفاوت ہوا ظاہر
سو بار نکالا اسے اور اس کو چھپایا

اک عمر مجھے خاک میں ملتے ہوئے گذری
کوچے میں ترے آن کے لوہو میں نہایا

سمجھا تو مجھے مرگ کے نزدیک پس از دیر
رحمت ہے مرے یار بہت دور سے آیا

یہ باغ رہا ہم سے ولے جا نہ سکے ہم
بے بال و پری نے بھی ہمیں خوب اڑایا

میں صید رمیدہ ہوں بیابان جنوں کا
رہتا ہے مرا موجب وحشت مرا سایا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ   یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
رو میں نے رکھا ہے در ترسا بچگاں پر   رکھیو تو مری شرم بڑھاپے میں خدایا
ٹالا نہیں کچھ مجھ کو پتنگ آج اڑاتے   بہتوں کے تئیں باؤ کا رخ ان نے بتایا

ایسے بت بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی
دل میرؔ کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا

(۱۰۷)

دل جو زیرِغبار اکثر تھا   کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن   رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گذرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم   یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بعد یک عمر جو ہوا معلوم   دل اس آئینہ رو کا پتھر تھا
بارے سجدہ ادا کیا تہ تیغ   کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
کیوں نہ ابر سیہ سفید ہوا   جب تلک عہد دیدۂ تر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد   ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل ق رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گذرے   وقت رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال   اک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں   ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر   چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا   ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
عیب طول کلام مت کریو   کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

(۱۰۸)

تیرا رخ مخطط قرآن ہے ہمارا   بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا
گر ہے یہ بے قراری تو رہ چکا بغل میں   دو روز دل ہمارا مہمان ہے ہمارا
ہیں اس خراب دل سے مشہور شہرخوباں   اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا

مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا | یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا
ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے | ان خوں گرفتگاں پر احسان ہے ہمارا
ہم وے ہیں سن رکھو تم مرجائیں رک کے یک جا | کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا
ہیں صید گہ کے میری صیاد کیا نہ دھڑکے | کہتے ہیں صید جو ہے بےجان ہے ہمارا
کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد | دیوان حشر گویا دیوان ہے ہمارا
خورشید رو کا پرتو آنکھوں میں روز ہے گا | یعنی کہ شرق رویہ دالان ہے ہمارا[1]
ماہیت دوعالم کھاتی پھرے ہے غوطے | یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا
نالے میں اپنے ہر شب آتے ہیں ہم بھی پنہاں | غافل تری گلی میں مندان ہے ہمارا[2]
کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس | روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے | گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا
جی جا نہ آہ ظالم تیرا ہی تو ہے سب کچھ | کس منھ سے پھر کہیں جی قربان ہے ہمارا[3]

بنجر زمین دل کی ہے میرؔ ملک اپنی
پر داغ سینہ مہر فرمان ہے ہمارا

(۱۰۹)

کیا مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا | کون سے درد و ستم کا یہ طرفدار نہ تھا
آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ | آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا
دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں | تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
صد گلستاں تہ یک بال تھے اس کے جب تک | طائر جاں قفس تن کا گرفتار نہ تھا
حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتل ناداں ورنہ | بےگنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا
عشق کا جذب ہوا باعث سودا ورنہ | یوسف مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا
نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا | سنگ چھاتی کا تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا

رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میرؔ
درد پنہاں تھے بہت پر لب اظہار نہ تھا

(۱۱۰)

جی اپنا میں نے تیرے لیے خوار ہو دیا | آخر کو جستجو نے تری مجھ کو کھو دیا
بے طاقتی سکوں نہیں رکھتی ہے ہم نشیں | رونے نے ہر گھڑی کے مجھے تو ڈبو دیا
اے ابر اس چمن میں نہ ہوگا گل امید | یاں تخم یاس اشک کو میں پھر کے بو دیا

(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

پوچھا جو میں نے درد محبت سے میرؔ کو
رکھ ہاتھ ان نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

(۱۱۱)

خط منھ پہ آئے جاناں خوبی پہ جان دے گا
ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دے گا

سارے رئیس اعضا ہیں معرض تلف میں
یہ عشق بے محابا کس کو امان دے گا

پاے پر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
ہر خار بادیے کا میرا نشان دے گا

داغ اور سینے میں کچھ بگڑی ہے عشق دیکھیں
دل کو جگر کو کس کو اب درمیان دے گا

نالہ ہمارا ہر شب گذرے ہے آسماں سے
فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا

مت رنگ سے ہمارے پیارے حنا لگاؤ
پابوس پر تمھارے سر سو جوان دے گا

ہو جو نشانہ اس کا اے بوالہوس سمجھ کر
تیروں کے مارے سارے سینے کو چھان دے گا(۱)

اس برہمن پسر کے قشقے پہ مرتے ہیں ہم
ٹک دے گا رو تو گویا جی ہم کو دان دے گا(۲)

گھر چشم کا ڈبو مت دل کے گئے پہ رو رو
کیا میرؔ ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دے گا

(۱۱۲)

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

ہر چند شور محشر اب بھی ہے در پہ لیکن
نکلے گا یار گھر سے ہووے گا جب تماشا

بھڑکے ہے آتش غم منظور ہے جو تجھ کو
جلنے کا عاشقوں کے آ دیکھ اب تماشا

طالع جو میرؔ خواری محبوب کو خوش آئی
پرغم یہ ہے مخالف دیکھیں گے سب تماشا

(۱۱۳)

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بن دیکھا

کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں
عاشقوں کا جلاوطن دیکھا

ذوق پیکان تیر میں تیرے
مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا

گھر کے گھر جلتے تھے پڑے تیرے
داغ دل دیکھے بس چمن دیکھا

ایک چشمک دوصد سنان مژہ
اس نکیلے کا بانکپن دیکھا

شکر زاہد کا اپنی آنکھوں میں
بے عوض خرقہ مرتہن دیکھا(۳)

---

(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

(۱۱۴)

جدا جو پہلو سے وہ دلبر یگانہ ہوا
طپش کی یاں تئیں دل نے کہ دردِ شانہ ہوا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید
سرشک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا

ہم اپنے دل کی چلے دل ہی میں لیے یاں سے
ہزار حیف سر حرف اس سے وا نہ ہوا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میر
سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

(۱۱۵)

کیا دن تھے وے کہ یاں بھی دل آرمیدہ تھا
رو آشیان طائر رنگ پریدہ تھا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

اک وقت ہم کو تھا سر گریہ کہ دشت میں
جو خار خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا

جس صید گاہ عشق میں یاروں کا جی گیا
مرگ اس شکارگہ کا شکار رمیدہ تھا

کوری چشم کیوں نہ زیارت کو اس کی آئے
یوسف سا جس کو مدنظر نوردیدہ تھا(۱)

افسوس مرگ صبر ہے اس واسطے کہ وہ
گل ہائے باغ عشرت دنیا نچیدہ تھا(۲)

مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا

حاصل نہ پوچھ گلشن مشہد کا بوالہوس
یاں پھل ہر اک درخت کا حلق بریدہ تھا

دل بے قرار گریۂ خونیں تھا رات میر
آیا نظر تو بسمل درخوں طپیدہ تھا

(۱۱۶)

کثرت داغ سے دل رشک گلستاں نہ ہوا
میرا دل خواہ جو کچھ تھا وہ کبھو یاں نہ ہوا

جی تو ایسے کئی صدقے کیے تجھ پر لیکن
حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیماں نہ ہوا

آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی
کون سا اشک مرا منبع طوفاں نہ ہوا

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو
ق جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

برق مت خوشے کی اور اپنی بیاں کر صحبت
شکر کر یہ کہ مرا واں دل سوزاں نہ ہوا

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

دل بے رحم گیا شیخ لیے زیر زمیں　　مر گیا پر یہ کہن گبر مسلماں نہ ہوا
کون سی رات زمانے میں گئی جس میں میر
سینۂ چاک سے میں دست و گریباں نہ ہوا

(۱۱۷)

تیرے قدم سے جا لگی جس پہ مرا ہے سر لگا　　گو کہ مرے ہی خون کی دست گرفتہ ہو حنا
سنگ مجھے بجاں قبول اس کے عوض ہزار بار　　تابہ کجا یہ اضطراب دل نہ ہوا ستم ہوا
کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر　　سیر چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا
کن نے بدی ہے اتنی دیر موسم گل میں ساقیا　　دے بھی مئے دوآتشہ زور ہی سرد ہے ہوا
وہ تو ہماری خاک پر آ نہ پھرا کبھی غرض　　ان نے جفا نہ ترک کی اپنی ہی ہم نے کی وفا[1]
فصل خزاں تلک تو میں اتنا نہ تھا خراب گرد　　مجھ کو جنون ہوگیا موسم گل میں، کیا بلا
جان بلب رسیدہ سے اتنا ہی کہنے پائے ہم　　جاوے اگر تو یار تک کہیو ہماری بھی دعا
بوے کباب سوختہ آتی ہے کچھ دماغ میں　　ہووے نہ ہووے اے نسیم رات کسی کا دل جلا
میں تو کہا تھا تیرے تیں آہ سمجھ نہ ظلم کر
آخرکار بے وفا جی ہی گیا نہ میر کا

(۱۱۸)

قابو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا　　دوش ہوا پہ رنگ گل و یاسمن گیا
برگشتہ بخت دیکھ کہ قاصد سفر سے میں　　بھیجا تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا
خاطر نشاں اے صید فگن ہوگی کب تری　　تیروں کے مارے میرا کلیجہ تو چھن گیا
یادش بخیر دشت میں مانند عنکبوت　　دامن کے اپنے تار جو خاروں پہ تن گیا
مارا تھا کس لباس میں عریانی نے مجھے　　جس سے تہ زمین بھی میں بے کفن گیا
آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا　　ہم سے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا
سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

(۱۱۹)

لخت جگر تو اپنے یک لخت روچکا تھا　　اشک فقط کا جھمکا آنکھوں سے لگ رہا تھا
دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں لے آیا　　ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا
اس قید جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت　　ورنہ گلا یہ میرا جوں طوق میں پھنسا تھا

(۱) نسخۂ محمودآباد

مشت نمک کی خاطر اس واسطے ہوں حیراں　　کل زخم دل نہایت دل کو مرے لگا تھا
اے گرد باد مت دے ہر آن عرض وحشت　　میں بھی کسو زمانے اس کام میں بنا تھا
بن کچھ کہے سنا ہے عالم سے میں نے کیا کیا　　پر تو نے یوں نہ جانا اے بے وفا کہ کیا تھا
روتی ہے شمع اتنا ہر شب کہ کچھ نہ پوچھو　　میں سوز دل کو اپنے مجلس میں کیوں کہا تھا
شب زخم سینہ اوپر چھڑکا تھا میں نمک کو　　ناسور تو کہاں تھا ظالم بڑا مزہ تھا(۱)
سر مار کر ہوا تھا میں خاک اس گلی میں　ق　سینے پہ مجھ کو اس کا مذکور نقش پا تھا
سو بخت تیرہ سے ہوں پامالِ صبا میں　　اس دن کے واسطے میں کیا خاک میں ملا تھا
یہ سرگذشت میری افسانہ جو ہوئی ہے　ق　مذکور اس کا اس کے کوچے میں جابجا تھا
سن کر کسی سے وہ بھی کہنے لگا تھا کچھ کچھ　　بے درد کتنے بولے ہاں اس کو کیا ہوا تھا
کہنے لگا کہ جانے میری بلا عزیزاں　　احوال تھا کسی کا کچھ میں بھی سن لیا تھا

آنکھیں مری کھلیں جب جی میر کا گیا تب
دیکھے سے اس کو ورنہ میرا بھی جی جلا تھا

(۱۲۰)

سر دور فلک بھی دیکھوں اپنے روبرو ٹوٹا　　کہ سنگ محتسب سے پائے خم دست سبو ٹوٹا
کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خودنما اتنے　　ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا
کف چالاک میں تیری جو تھا سر رشتہ جانوں کا　　گریباں سے مرے ہر اک ترا ٹانکا رفو ٹوٹا
طراوت تھی چمن میں سرو گویا اشک قمری سے　　ادھر آنکھیں مندیں اس کی کہ ایدھر آب جو ٹوٹا
خطر کر تو نہ لگ چل اے صبا اس زلف سے اتنا　　بلا آوے گی تیرے سر جو اس کا ایک مو ٹوٹا

وہ بے کس کیا کرے کہہ تو رہی دل ہی کی دل ہی میں
نپٹ بے جا ترا دل میر سے اے آرزو ٹوٹا

(۱۲۱)

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا　　عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے امیروں کو منع ہے　　چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرائیو نہ ٹک ابر بہار سے　　میری طرف بھی دیدۂ خونبار دیکھنا
اے ہم سفر نہ آبلے کو پہنچے چشم تر　　لاگا ہے میرے پاؤں میں آ خار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے　　ہشیار زینہار خبردار دیکھنا
صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشک باغ　　تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

(۱) نسخۂ محمودآباد

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر　　اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا
بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر　　ہوجائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا
شاید ہماری خاک سے کچھ ہو بھی اے نسیم　　غربال کرکے کوچۂ دلدار دیکھنا
اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میر
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

(۱۲۲)

غلط ہے عشق میں اے بوالہوس اندیشہ راحت کا　　رواج اس ملک میں ہے درد و داغ و رنج و کلفت کا
زمیں اک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے ماتا ہے　　یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا
جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے　　نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا
ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جان رفتہ مجنوں کی　　موئے پر بھی رہا ہوتا نہیں وابستہ الفت کا
حریف بے جگر ہے صبر ورنہ کل کی صحبت میں　　نیاز و ناز کا جھگڑا گرد تھا ایک جرأت کا
نگاہ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہے　　نہایت تنگ ہے اے صید بسمل وقت فرصت کا
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا　　کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
نگاہ مست نے اس کی لٹائی خانقہ ساری　　پڑا ہے برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا
قدم ٹک دیکھ کر رکھ میر سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

(۱۲۳)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں　　جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح　　تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں　　کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے　　جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے　　ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

(۱۲۴)

نئی طرزوں سے میخانے میں رنگ مے جھلکتا تھا　　گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا

ترے اس خاک اڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت — کلیجا ریگ صحرا کا بھی دس دس گز تھلکتا تھا

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میر کے دل سے
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

(۱۲۵)

تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا — کیا گلہ کیجے غرض اب وہ زمانہ ہی گیا
چشم بن اشک ہوئی یا نہ ہوئی یکساں ہے — خاک میں جب وہ ملا موتی کا دانہ ہی گیا
بر مجنوں میں خردمند کوئی جا نہ سکا — عاقبت سر کو قدم کر یہ دوانہ ہی گیا
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میر کا اس لیت و لعل میں لیکن
نہ گیا ظلم ہی تیرا نہ بہانہ ہی گیا

(۱۲۶)

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ — کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا
دل کی شگفتگی نے ڈرائے رکھا ہمیں — واں چیں جبیں پر آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
مانند حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا — دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں — یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا
گذری مدام اس کی جوانان مست میں — پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

(۱۲۷)

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ لوٹا — یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا
مرا رنگ اڑ گیا جس وقت سنگ محتسب آگے — بغل سے گر پڑا مینا و ساغر چور ہو پھوٹا
مرا وعدہ ہی آپہنچا ترے آنے کے وعدے تک — ہوا میں موت سے سچا رہا اے شوخ تو جھوٹا

کف جاناں سے کیا امکاں رہائی میر کوئی ہو
اچنبھا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگ حنا چھوٹا

(۱۲۸)

برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہل دیں
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قرآن کا

خوبی کو اس کے چہرے کی کیا پہنچے آفتاب
ہے اس میں اس میں فرق زمین آسمان کا

ابلہ ہے وہ جو ہووے خریدار گل رخاں
اس سودے میں صریح ہے نقصان جان کا

کچھ اور گاتے ہیں جو رقیب اس کے روبرو
دشمن ہیں میری جان کے یہ جی ہے تان کا

تسکین اس کی تب ہوئی جب چپ مجھے لگی
مت پوچھ کچھ سلوک مرے بدزبان کا

ق
یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بےخبر
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

توبرسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میر سے
یاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اس جوان کا

(۱۲۹)

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

کیا ہے خوں مرا پامال یہ سرخی نہ چھوٹے گی
اگر قاتل تو اپنے پاؤں سو پانی سے دھووے گا

کوئی رہتا ہے جیتے جی ترے کوچے کے آنے سے
تبھی آسودہ ہوگا میر سا جب جی کو کھووے گا

(۱۳۰)

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبے کا ہمسایا
صنم خانہ ہی یاں اے شیخ تونے کیوں نہ بنوایا

زہے اے عشق کی نیرنگ سازی غیر کو ان نے
جلایا بات کہتے واں ہمیں مرنے کو فرمایا

بھری ہے آگ تیرے درد دل میں میر ایسی تو
کہ کہتے روبرو اس شوخ کے قاصد کا منھ آیا

(۱۳۱)

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہش آزادی کا
ننگ ہے نام رہائی تری صیادی کا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں
دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

تونے تلوار رکھی سر رکھا میں بندہ ہوں
اپنی تسلیم کا بھی اور تری جلادی کا[1]

شہر کی سی رہتی رونق اسی کے جیتے جی
مر گیا قیس جو تھا خانہ خدا وادی کا

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر   رو بہ ویرانی ہو اس کعبے کی آبادی کا

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

(۱۳۲)

کام پی میں مرا تمام کیا   غرض اس شوخ نے بھی کام کیا
سرو و شمشاد خاک میں مل گئے   تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا
سعی طوف حرم نہ کی ہرگز   ق آستاں پر ترے مقام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے   یہیں سے کعبے کو سلام کیا
اس کے عیارپن نے میرے تئیں   خادم و بندہ و غلام کیا
حال بد میں مرے پتنگ آکر   آپ کو سب میں نیک نام کیا
دختر رز سے کیا تھا میرے تئیں   شیخ کی ضد پہ میں حرام کیا(۱)
ہوگیا دل مرا تبرک جب   ق ورد یہ قطعۂ پیام کیا
"دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے   کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا   ٹوپی والوں نے قتل عام کیا"

عشق خوباں کو میر میں اپنا
قبلہ و کعبہ و امام کیا

(۱۳۳)

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا   ہوں دوانہ ترے سگ کو کا
شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو   فکر ہے اپنے ہر بن مو کا
ہے مرے یار کی مسوں کا رشک   کشتہ ہوں سبزۂ لب جو کا
بوسہ دینا مجھے نہ کر موقوف   ہے وظیفہ یہی دعاگو کا
میں نے تلوار سے ہرن مارے   عشق کر تیری چشم و ابرو کا(۲)
شور قلقل کے ہوتی تھی مانع   ریش قاضی پہ رات میں تھوکا
عطرآگیں ہے باد صبح مگر   کھل گیا پیچ زلف خوشبو کا
ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں   کارخانہ ہے واں تو جادو کا
میر ہرچند میں نے چاہا لیک   ق نہ چھپا عشق طفل بدخو کا

نام اس کا لیا ادھر اودھر
اڑ گیا رنگ ہی مرے رو کا

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

(۱۳۴)

آیا تھا خانقہ میں وہ نور دیدگاں کا   تہ کر گیا مصلیٰ عزلت گزیدگاں کا
آخر کو خاک ہونا درپیش ہے سبھوں کو   ٹک دیکھ منھ کدھر ہے قامت خمیدگاں کا
جو خار دشت میں ہے سوچشم آبلہ سے   دیکھا ہوا ہے تیرے محنت کشیدگاں کا
اب زیر خاک رہنا مشکل ہے کشتگاں کو   آرام کھو چلا تو ان آرمیدگاں کا
تیر بلا کا ہر دم اب میر ہے نشانہ
پتھر جگر ہے اس کے آفت رسیدگاں کا

(۱۳۵)

صحرا میں سیل اشک مرا جابجا پھرا   مجنوں بھی اس کی موج میں مدت بہا پھرا
طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب   سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا
آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید   نامے کے انتظار میں قاصد بھلا پھرا
ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تونے کی نگاہ   اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا
دیر و حرم میں کیونکے قدم رکھ سکے گا میر
ایدھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پھرا

(۱۳۶)

کس شام سے اٹھا تھا مرے دل میں درد سا   سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح سرد سا
بیٹھا ہوں جوں غبار ضعیف اب وگرنہ میں   پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
قصد طریق عشق کیا سب نے بعد قیس   لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ نورد سا
حاضر یراق بے مزگی کس گھڑی نہیں   معشوق کچھ ہمارا ہے عاشق نبرد سا
کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

(۱۳۷)

ترے عشق میں آگے سودا ہوا تھا   پر اتنا بھی ظالم نہ رسوا ہوا تھا
خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی   یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا
کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے   گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا
گئی ہوتی سر آبلوں کے پہ ہوئی خیر   بڑا قضیہ خاروں سے برپا ہوا تھا[1]

(۱) نسخۂ محمود آباد

گریباں سے تب ہاتھ اٹھایا تھا میں نے
مری اور دامان صحرا ہوا تھا

زہے طالع اے میرؔ ان نے یہ پوچھا
کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

(۱۳۸)

آہ کے تئیں دل حیران و خفا کو سونپا
میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا

تیرے کوچے میں مری خاک بھی پامال ہوئی
تھا وہ بے درد مجھے جن نے وفا کو سونپا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بت خانے سے
جلد پھر پہنچیو اے میرؔ خدا کو سونپا

(۱۳۹)

گلہ نہیں ہے ہمیں اپنی جاں گدازی کا
جگر پہ زخم ہے اس کی زباں درازی کا

سمند ناز نے اس کے جہاں کیا پامال
وہی ہے اب بھی اسے شوق ترک تازی کا

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے
اتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

الٹ پلٹ مری آہ سحر کی کیا ہے کم
اگر خیال تمھیں ہووے نیزہ بازی کا

بتاؤ ہم سے کوئی آن تم سے کیا بگڑی
نہیں ہے تم کو سلیقہ زمانہ سازی کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

چلو ہو راہ موافق کہے مخالف کے
طریق چھوڑ دیا تم نے دل نوازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

بسان خاک ہو پامال راہ خلق اے میرؔ
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

(۱۴۰)

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے ان نے پردہ سا بنا رکھا

جوں برگ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

کہیے جو تمیز اس کو کچھ اچھے برے کی ہو
دل جس کسو کا پایا چٹ ان نے اڑا رکھا

تھی مسلک الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدہ و دانستہ کس راہ میں پا رکھا

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تونے برقع سے چھپا رکھا

چشمک ہی نہیں تازی شیوے یہ اسی کے ہیں
جھمکی سی دکھا دے کر عالم کو لگا رکھا

تلفنے کے لیے دل کے چھڑکا تھا نمک میں نے / سو چھاتی کے زخموں نے کل دیر مزہ رکھا
کشتے کو اس ابرو کے کیا میل ہو ہستی کی / میں طاق بلند اوپر جینے کو اٹھا رکھا

قطعی ہے دلیل اے میرؔ اس تیغ کی بے آبی
رحم ان نے مرے حق میں مطلق نہ روا رکھا

(۱۴۱)

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہوجائے گا / جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہوجائے گا
خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے / قتل کرتے کرتے تیرے تیں جنوں ہوجائے گا
اس شکار انداز خونیں کا نہیں آیا مزاج / ورنہ آہوے حرم صید زبوں ہوجائے گا
بزم عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تیں / جوں حباب بادہ ساغر سرنگوں ہوجائے گا
تاکجا غنچہ صفت رکنا چمن میں دہر کے / کب گرفتہ دل مرے سینے میں خوں ہوجائے گا[۱]

کیا کہوں میں میرؔ اس عاشق ستم محبوب کو
طور پر اس کے کسو دن کوئی خوں ہوجائے گا

(۱۴۲)

سینہ دشنوں سے چاک تا نہ ہوا / دل جو عقدہ تھا سخت وا نہ ہوا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں / دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
ظلم و جور و جفا ستم بیداد / عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا
ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے / یاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا

میرؔ افسوس وہ کہ جو کوئی
اس کے دروازے کا گدا نہ ہوا

(۱۴۳)

یار عجب طرح نگہ کر گیا / دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی / پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا
جاتا ہے اس بزم سے آیا تو کیا / کوئی گھڑی گو کہ تو رہ کر گیا

وصف خط و خال میں خوباں کے میرؔ
نامۂ اعمال سیہ کر گیا

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۱۴۴)

آہ سحر نے سوزش دل کو مٹا دیا — اس باؤ نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا
سمجھی نہ باد صبح کہ آکر اٹھا دیا — اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا
پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ — پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے — دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا
سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے — یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
اجزا بدن کے جتنے تھے پانی ہو بہ گئے — آخر گداز عشق نے ہم کو بہا دیا
کیا کچھ نہ تھا ازل میں نہ طالع جو تھے درست — ہم کو دل شکستہ قضا نے دلا دیا
گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا — اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا
مدت رہے گی یاد ترے چہرے کی جھلک — جلوے کو جس نے ماہ کے جی سے بھلا دیا
ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں — دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا
بوے کباب سوختہ آئی دماغ میں — شاید جگر بھی آتش غم نے جلا دیا
تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی — درد سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

(۱۴۵)[1]

اس آستان داغ سے میں زر لیا کیا — گل دستہ دستہ جس کو چراغی دیا کیا
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے — سہتا رہا جفائیں میں جب تک جیا کیا
ہو تار تار سیتے ہی سیتے جو اڑ گیا — اب تک عبث میں اپنا گریباں سیا کیا
سن سن کے تیری بات کو کیا کیا نہ کہہ سنا — کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کچھ کیا کیا

اب وہ جگر طپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب
مدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

(۱۴۶)[2]

نہیں ایسا کوئی میرا جو ماتم دار ہووے گا — مگر اک غم ترا اے شوخ بے کس ہو کے روئے گا

---

(۱) اس غزل کے تین شعر (پہلا، دوسرا اور پانچواں) دیوان دوم میں درج تھے۔ چونکہ پوری غزل نسخۂ محمود آباد میں موجود ہے لہٰذا اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ اس کا تیسرا اور چوتھا شعر غیر مطبوعہ ہے۔ مصحح
(۲) نسخۂ محمود آباد

اگر اگتے رہے اے ناامیدی داغ ایسے ہی — تو کاہے کو کوئی تخم تمنا دل میں بوئے گا
الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ جس میں ایک ساعت بھی — میں روؤں گا وہ اپنے ہاتھ میرے منھ کو دھوئے گا
جو ایسے شور سے روتا ہے دن کو میرؔ تو شب کو
نہ سونے دے گا ہمسایوں کو نے یہ آپ سوئے گا

(۱۴۷)(۱)

وہ جو پی کر شراب نکلے گا — کس طرح آفتاب نکلے گا
محتسب میکدے سے جاتا نہیں — یاں سے ہوکر خراب نکلے گا
یہی چپ ہے تو درد دل کہیے — منھ سے کیونکر جواب نکلے گا
جب اٹھے گا جہان سے یہ نقاب — تب ہی اس کا حجاب نکلے گا
عرق اس کے بھی منھ کا بو کچھو — گر کبھو یہ گلاب نکلے گا
آؤ بالیں تلک نہ ہوگی دیر — جی ہمارا شتاب نکلے گا
دفتر داغ ہے جگر اس بن — کسو دن یہ حساب نکلے گا
تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے — جب مرا انتخاب نکلے گا
میرؔ دیکھوگے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خواب نکلے گا

(۱۴۸)(۲)

جب کہ تابوت مرا جائے شہادت سے اٹھا — شعلۂ آہ دل گرم محبت سے اٹھا
عمر گذری مجھے بیمار ہی رہتے ہے بجا
دل عزیزوں کا اگر میری عیادت سے اٹھا

(۱۴۹)(۳)

طفل مطرب جو میرے ہاتھ آتا — چٹکیوں میں رقیب اڑ جاتا
خواب میں بھی رہا تو آنے سے — دیکھنے ہی کا تھا یہ سب ناتا
الفت اس تیغ سے تھی بے حد میرؔ
قتل کرتا تو لوہو جم جاتا

(۱۵۰)(۴)

ہو بلبل گلگشت کہ اک دن ہے خزاں کا — اڑتا ہے ابھی رنگ گل باغ جہاں کا

---

(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد

ہے مجھ کو یقیں تجھ میں وفا ایسی جفا پر — گھر چاک برابر ہوئے اس میرے گماں کا
سینے میں مرے آگ لگی میرے سخن سے — جوں شمع جلایا ہوا ہوں اپنی زباں کا
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا

(۱۵۱)[۱]

قصہ تمام میر کا شب کو سنا کیا — بے درد سر بھی صبح تلک سر دھنا کیا
مل چشم سے نگہ نے دھتورا دیا مجھے
خس بھر نہ چھوڑا دل کو میں تنکے چنا کیا ۱۱۵۵

(۱۵۲)[۲]

مے گلگوں کی بو سے بسکہ میخانہ مہکتا تھا — لب ساغر پہ منھ رکھ رکھ کے ہر شیشہ بہکتا تھا
جلا کیونکر نہ ہوگا آشیان بلبل بے کس
برنگ آتش خس پوش رنگ گل دہکتا تھا

(۱۵۳)[۳]

اٹھوں نہ خاک سے کشتہ میں کم نگاہی کا — دماغ کس کو ہے محشر کی دادخواہی کا
سنو ہو جل ہی بجھوں گا کہ ہو رہا ہوں میں
چراغ مضطرب الحال صبح گاہی کا

(۱۵۴)[۴]

یک پارہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا — وحشت میں جو سیا سو کہیں کا کہیں سیا ۱۱۶۰
محشر سوائے کیا ہو اسے القیام میر
یہ زخم سینہ جائے گا میرا وہیں سیا

(۱۵۵)[۵]

گرچہ امید اسیری پہ میں ناشاد آیا — دام صیاد کا ہوتے ہی خدا یاد آیا
لوہو پینے کو مرا بس تھی مری تشنہ لبی
کاہے کو کیجیے تصدیع یہ جلاد آیا

---

(۱) تا (۵) نسخۂ محمودآباد

(۱۵۶)(۱)

جوا ے قاصد وہ پوچھے میرؔ بھی ادھر کو چلتا تھا تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اس کا جی نکلتا تھا
سماں افسوس و بیتابی سے تھا کل قتل کو میرے
تڑپتا تھا ادھر میں اور ادھر وہ ہاتھ ملتا تھا

(۱۵۷)(۲)

کیا کہیے عشق حسن کا آپھی طرف ہوا دل نام قطرہ خون یہ ناحق تلف ہوا
کیونکر میں فتح پاؤں تری زلفوں پر کہ اب
یک دل شکست خوردہ مرا دو طرف ہوا

(۱۵۸)(۳)

مجھے تو نور نظر نے تنک بھی تن نہ دیا بہار جاتی رہی دیکھنے چمن نہ دیا
لباس دیکھ لیے میں نے تیری پوشش کے کہ بعد مرگ کسھیں نے مجھے کفن نہ دیا
کھلی نہ بات کئی حرف تھے گرہ دل میں
اجل نے اس سے مجھے کہنے اک سخن نہ دیا

(۱۵۹)(۴)

تھا زعفراں پہ ہنسنے کو دل جس کی گرد کا مشتاق منہ مرا ہے اسی رنگ زرد کا
کیا ڈر اسے ہے گرمی خورشید حشر سے
سایہ پڑا ہے جس پہ مری آہ سرد کا

(۱۶۰)(۵)

نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا
تماشے دیکھتے ہنستا چلا آ کرے ہے شیشہ بازی میرا رونا
مرا خوں تجھ پہ ثابت ہی کرے گا کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا
وصیت میرؔ نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

---

(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد

(۵) اس غزل کے تین اشعار (پہلا، تیسرا اور چوتھا) نسخۂ نولکشور میں دیوان اول کے آخر میں درج ہیں۔ لہٰذا یہ غزل دیوان دوم سے نکال کر یہاں رکھی گئی ہے۔ اس کا دوسرا شعر نسخۂ محمود آباد سے ماخوذ ہے۔ مصحح

(۱۶۱)[۱]

بیتابیوں کے جور سے میں جب کہ مر گیا　　ہوکر فقیر صبر مری گور پر گیا
اے آہ سرد عرصۂ محشر میں یخ جما　　جلتا ہوں میں سنوں کہ جہنم ٹھٹھر گیا
کاکل میں نہیں خط میں نہیں زلف میں نہیں　　روز سیہ کے ساتھ مرا دل کدھر گیا
مفلس سو مر گیا نہ ہوا وصل یار کا　　ہجراں میں اس کے جی بھی گیا اور زر گیا

تیری ہی رہگذر میں یہ جی جارہا ہے شوخ
سنیو کہ میرؔ آج ہی کل میں گذر گیا

(۱۶۲)[۲]

خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا　　رکھے ہے شوق اگر رحمت الٰہی کا
سیاہ بخت سے میرے مجھے کفایت تھی　　لیا ہے داغ نے دامن عبث سیاہی کا
نگہ تمام تو اس کی خدا نہ دکھلاوے　　کرے ہے قتل اثر جس کی کم نگاہی کا

کسو کے حسن کے شعلے کے آگے اڑتا ہے
سلوک میرؔ سنو میرے رنگ کاہی کا

(۱۶۳)[۳]

دل گیا رسوا ہوئے آخر کو سودا ہوگیا
اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہوگیا

(۱۶۴)[۴]

کس طور تونے باغ میں آنکھوں کے تیں ملا
نرگس کا جس سے رنگ شکستہ بھی اڑ چلا

(۱۶۵)[۵]

ہر شب جہاں میں جلتے گذرتی ہے اے نسیم
گویا چراغ وقف ہوں میں اس دیار کا

---

(۱) یہ غزل تیسرے غیر مطبوعہ شعر کے بغیر دیوان پنجم میں موجود تھی۔ چونکہ پوری غزل نسخۂ محمودآباد میں چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شامل ہے، لہٰذا دیوان پنجم سے نکال کر اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ مصحح

(۲) یہ غزل تیسرے غیر مطبوعہ شعر کے بغیر دیوان پنجم میں درج تھی۔ چونکہ نسخۂ محمودآباد میں پوری غزل چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے، لہٰذا دیوان پنجم کے بجائے اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ درج بالا متن دیوان پنجم کے مطابق ہے۔ مصحح

(۳) تا (۵) نسخۂ محمودآباد

(۱۶۶)(۱)

ہے لب نمکیں علاج میرا
پر بے مزہ ہے مزاج میرا

(۱۶۷)(۲)

ابر جب مجھ خاک پر سے ہوگیا   ایک دو دم زار باراں رو گیا
کیا کہوں میں میر اپنی سرگذشت
ابتدا ہی قصے میں وہ سو گیا

(۱۶۸)(۳)

ترے لعل جاں بخش کو ہم نے بتلا
کیا آب حیواں کو پانی سے پتلا

(۱۶۹)(۴)

ایک عالم ہے کشتہ اس لب کا
الغرض اس پہ دانت ہے سب کا

(۱۷۰)(۵)

بخت دشمن بلند تھے ورنہ
کوہکن نے بھی سر کو پھوڑا تھا

(۱۷۱)(۶)

دل تاب تک بھی لاتا تو کہنے میں کچھ آتا
اس تشنہ کام نے تو پانی بھی پھر نہ مانگا

(۱۷۲)(۷)

پاے پر آبلہ سے مجھ کو بنی گئی ہے
صحرا میں رفتہ رفتہ کانٹوں نے سر اٹھایا

---

(۱) نسخۂ محمود آباد
(۲) تا (۷) نسخۂ نول کشور

(۱۷۳)(۱)

تجھ بن چمن میں جو تھا دل کو نٹوتا تھا
گل منھ نہ کھولتا تھا بلبل نہ بولتا تھا

ردیف ب

(۱۷۴)

رکھتا ہے ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب
سو جاتے ہیں ولیکن بخت کنار ہر شب

مدت ہوئی کہ اب تو ہم سے جدا رکھے ہے
اس آفتاب رو کو یہ روزگار ہر شب

دیکھیں ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی
رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب

دھوکے ترے کسو دن میں جان دے رہوں گا
کرتا ہے ماہ میرے گھر سے گذار ہر شب

دل کی کدورت اپنی یک شب بیاں ہوئی تھی
رہتا ہے آسماں پہ تب سے غبار ہر شب

کس کے لگا ہے تازہ تیر نگاہ اس کا
اک آہ میرے دل کے ہوتی ہے پار ہر شب

مجلس میں میں نے اپنا سوز جگر کہا تھا
روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب

مایوس وصل اس کے کیا سادہ مردماں ہیں
گذرے ہے میرؔ ان کو امیدوار ہر شب

(۱۷۵)

اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پرآب روز و شب
ٹپکا کرے ہے آنکھوں سے خوناب روز و شب

اک وقت رونے کا تھا ہمیں بھی خیال سا
آئی تھی آنکھوں سے چلی سیلاب روز و شب

اس کے لیے نہ پھرتے تھے ہم خاک چھانتے
رہتا تھا پاس وہ در نایاب روز و شب

قدرت تو دیکھ عشق کی مجھ سے ضعیف کو
رکھتا ہے شاد بے خور و بے خواب روز و شب

سجدہ اس آستاں کا نہیں یوں ہوا نصیب
رگڑا ہے سر میانۂ محراب روز و شب

اب رسم ربط اٹھ ہی گئی ورنہ پیش ازیں
بیٹھے ہی رہتے تھے بہم احباب روز و شب

دل کس کے رو و مو سے لگایا ہے میرؔ نے
پاتے ہیں اس جوان کو بیتاب روز و شب

(۱۷۶)

رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب

(۱) نسخۂ نول کشور

رکنے سے دل کے آج بچا ہوں تو اب جیا　　چھاتی ہی میں رہا ہے مرا دم تمام شب
یہ اتصال اشک جگر سوز کا کہاں　　روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب
شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن　ق　یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
گذرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی گئی زمانے میں بے غم تمام شب

(۱۷۷)

ہوتا نہ پائے سرو جو جوئے چمن میں آب　　تو کون قمریوں کے چواتا دہن میں آب
اس پر لہو کے پیاسے ہیں تیرے لبوں کے رشک　　اک نام کو رہی ہے عقیق یمن میں آب
شب سوز دل کہا تھا میں مجلس میں شمع سے　　روئی ہے یاں تلک کہ بھرا ہے لگن میں آب
دل لے گیا تھا زیرزمیں میں بھرا ہوا　　آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب
رویا تھا تیری چشم و مژہ یاد کرکے میں　　ہے نیزہ نیزہ تب سے نواح ختن میں آب[۱]
ناسور پھونک کے بیچ خبر ہے شرط　　ہے آپ داغ کوچۂ زخم کہن میں آب[۲]
دریا میں قطرہ قطرہ ہے آب گہر کہیں
ہے میر موجزن ترے ہر یک سخن میں آب

(۱۷۸)

کس کی مسجد کیسے میخانے کہاں کے شیخ و شاب　　ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب
تو کہاں اس کی کمر کیدھر نہ کریو اضطراب　　اے رگ گل دیکھیو کھاتی ہے جو تو پیچ و تاب
موند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے　　کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب
تو ہو اور دنیا ہو ساقی میں ہوں مستی ہو مدام　　پر بط صہبا نکالے اڑ چلے رنگ شراب
ہے ملاحت تیرے باعث شور پر تجھ سے نمک　　ٹک تو رہ پیری چلی آتی ہے اے عہد شباب
کب تھی یہ بے جرأتی شایان آہوے حرم　　ذبح ہوتا تیغ سے یا آگ میں ہوتا کباب
کیا ہو رنگ رفتہ کیا قاصد ہو جس کو خط دیا　　جز جواب صاف اس سے کب کوئی لایا جواب
وائے اس جینے پر اے مستی کہ دور چرخ میں　　جام مے پر گردش آوے اور میخانہ خراب
چوب حرفی بن الف بے میں نہیں پہچانتا　　ہوں میں ابجدخواں شناسائی کو مجھ سے کیا حساب
مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آبدار　　مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب
کچھ نہیں بحرجہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد

(۱۷۹)

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب　　عرق شرم میں گیا ہے ڈوب
آئی کنعاں سے باد مصر ولے　　نہ گئی تا بہ کلبۂ یعقوب
بن عصا شیخ یک قدم نہ رکھے　　راہ چلتا نہیں یہ خر بے چوب
اس لیے عشق میں نے چھوڑا تھا　　تو بھی کہنے لگا برا کیا خوب
پی ہوے تو لہو پیا ہوں میں　　محتسب آنکھوں پر ہے کچھ آشوب
میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

(۱۸۰)[۱]

کھا کے دانہ یہ دام بچھوایا
ہوئے آدم کو بھی بہشت نصیب

ردیف ت

(۱۸۱)

روزانہ ملوں یار سے یا شب ہو ملاقات　　کیا فکر کروں میں کہ کسو ڈھب ہو ملاقات
نے بخت کی یاری ہے نہ کچھ جذب ہے کامل　　وہ آپھی ملے تو ملے پھر جب ہو ملاقات
دوری میں کروں نالہ و فریاد کہاں تک　　یک بار تو اس شوخ سے یارب ہو ملاقات
جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی　　کچھ لطف اٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات
وحشت ہے بہت میر کو مل آیئے چل کر
کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

(۱۸۲)

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت　　تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت
تنگ ہوجاوے گا عرصہ خفتگان خاک پر　　گر ہمیں زیرزمیں سونپا دل نالاں سمیت
باغ کر دکھلائیں گے دامان دشت حشر کو　　ہم بھی واں آئے اگر مژگان خون افشاں سمیت
قیس و فرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے　　سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویراں سمیت

---
(۱) نسخۂ نول کشور

اٹھ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میرؔ
پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

(۱۸۳)

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات   ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات
اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ   گذری ہے امیدوار ہر رات
مکھڑے سے اٹھائیں ان نے زلفیں   جانا بھی نہ ہم گئی کدھر رات
تو پاس نہیں ہوا تو روتے   رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات
کیا دن تھے کہ خون تھا جگر میں   رو اٹھتے تھے بیٹھ دوپہر رات
واں تم تو بناتے ہی رہے زلف   عاشق کی بھی یاں گئی گذر رات
ساقی کے جو آنے کی خبر تھی   گذری ہمیں ساری بے خبر رات
کیا سوز جگر کہوں میں ہمدم ق   آیا جو سخن زبان پر رات
صحبت یہ رہی کہ شمع روئی   لے شام سے تا دم سحر رات
کھلتی ہے جب آنکھ شب کو تجھ بن ق   کٹتی نہیں آتی پھر نظر رات
دن وصل کا یوں کٹا کہے تو   کاٹی ہے جدائی کی مگر رات
کل تھی شب وصل اک ادا پر ق   اس کی گئے ہوتے ہم تو مر رات
جاگے تھے ہمارے بخت خفتہ   پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات
کرنے لگا پشت چشم نازک   سوتے سے اٹھا جو چونک کر رات
تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا   ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

پر زلفوں میں منہ چھپا کے پوچھا
اب ہووے گی میرؔ کس قدر رات

(۱۸۴)

چھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزار محبت   مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمار محبت
امکاں نہیں جیتے جی ہو اس قید سے آزاد   مرجائے تبھی چھوٹے گرفتار محبت
تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم   تھا دشمن جانی مرا اقرار محبت
ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں   لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت
اس راز کو رکھ جی ہی میں تا جی بچے تیرا   زنہار جو کرتا ہو تو اظہار محبت
ہر نقش قدم پر ترے سر بیچے ہیں عاشق   ٹک سیر تو کر آج تو بازار محبت

کچھ مست ہیں ہم دیدۂ پرخون جگر سے　　آیا یہی ہے ساغر سرشار محبت
بیکار نہ رہ عشق میں تو رونے سے ہرگز　　یہ گریہ ہی ہے آب رخ کار محبت
مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میرؔ سزاوار محبت

(۱۸۵)

جی میں ہے یاد رخ و زلف سیہ‌فام بہت　　رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت
دست صیاد تلک بھی نہ میں پہنچا جیتا　　بےقراری نے لیا مجھ کو تہ دام بہت
ایک دو چشمک ادھر گردش ساغر کہ مدام　　سر چڑھی رہتی ہے یہ گردش ایام بہت
دل خراشی و جگرچاکی و خون افشانی　　ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت
رہ گیا دیکھ کے تجھ چشم پہ یہ سطر مژہ　　ساقیا یوں تو پڑھے تھے میں خط جام بہت[1]
پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیر زمیں میرؔ ہے آرام بہت

(۱۸۶)

کیا کہیں اپنی اس کی شب کی بات　　کہیے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات
اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے　　پھر کھلے گی زبان جب کی بات
نکتہ دانان رفتہ کی نہ کہو　　بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات
کس کا روئے سخن نہیں ہے ادھر　　ہے نظر میں ہماری سب کی بات
ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے　　غصے میں اس کے زیر لب کی بات
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم　　ہے خدا جانیے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ
اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

(۱۸۷)

ہر صبح دم کروں ہوں الحاح با انابت　　تو بھی مری دعا سے ملتی نہیں اجابت
مت لے حساب طاقت اے ضعف مجھ سے ظالم　　لائق نہیں ہے تیرے یہ کون سی ہے بابت
کیا کیا لکھا ہے میں نے وہ میرؔ کیا کہے گا
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

ردیف ٹ

(۱۸۸)

نہ پایا دل ہوا روز سیہ سے جس کا جا لٹ پٹ — کسو کی زلف ڈھونڈی مو بہ مو کا کل کو سب لٹ لٹ
تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازے کو موندے شب — میں چوکھٹ پر تری کرتا رہا سر کو پٹک کھٹ کھٹ
چنیں لگتی ہیں دل پر بلبلوں کے باغباں تو جو — چمن میں توڑتا ہے ہر سحر کلیوں کے تیں چٹ چٹ

ترے ہجراں کی بیماری میں میرؔ ناتواں کو شب
ہوا ہے خواب سونا آہ اس کروٹ سے اس کروٹ

ردیف ج

(۱۸۹)

آئے ہیں میرؔ منہ کو بنائے خفا سے آج — شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج
واشد ہوئی نہ دل کو فقیروں کے بھی ملے — کھلتی نہیں گرہ یہ کسو کی دعا سے آج
جینے میں اختیار نہیں ورنہ ہم نشیں — ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی خدا سے آج
ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ — ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

تھا جی میں اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر کچھ کہا گیا نہ غم دل حیا سے آج

ردیف چ

(۱۹۰)

کاش انھیں ہم بھی گنہگاروں کے بیچ — ہوں جو رحمت کے سزاواروں کے بیچ
جی سدا ان ابروؤں ہی میں رہا — کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ
چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر — منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ
ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں — شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ
جب سے لے نکلا ہے تو یہ جنس حسن — پڑ گئی ہے دھوم بازاروں کے بیچ
عاشقی و بے کسی و رفتگی — جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ
جو سرشک اس ماہ بن جھمکے ہے شب — وہ چمک کاہے کو ہے تاروں کے بیچ

اس کے آتش ناک رخساروں بغیر — لوٹیے یوں کب تک انگاروں کے بیچ
بیٹھنا غیروں میں کب ہے ننگ یار — پھول گل ہوتے ہی ہیں خاروں کے بیچ

یارو مت اس کا فریب مہر کھاؤ
میر بھی تھے اس کے ہی یاروں کے بیچ

(۱۹۱)

فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ — بھیج دے کیوں نہ زلیخا اسے کنعان کے بیچ
تو نہ تھا مردن دشوار میں عاشق کے آہ — حسرتیں کتنی گرہ تھیں رمق اک جان کے بیچ
چشم بد دور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر — خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریان کے بیچ
حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق — رنگ کچھ اور ہی ہوجائے ہے اک آن کے بیچ
تاک کی چھاؤں میں جوں مست پڑے سوتے ہوں — اینڈتی ہیں نگہیں سایۂ مژگان کے بیچ
جی لیا بوسۂ رخسار مخطط دے کر — عاقبت ان نے ہمیں زہر دیا پان کے بیچ
دعوی خوش دہنی اس سے اسی منھ پر گل — سر تو ٹک ڈال کے دیکھ اپنے گریبان کے بیچ
کرتے ململ کے پہن آتے تو ہو رندوں میں — شیخ صاحب نہ کہیں جھنتے پڑیں شان کے بیچ[1]

کان رکھ رکھ کے بہت درد دل میر کو تم
سنتے تو ہو پہ کہیں درد نہ ہو کان کے بیچ

(۱۹۲)

کر نہ تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ — دن نہ پھر جائیں گے عشاق کے اک رات کے بیچ
حرف زن مت ہو کسی سے تو کہ اے آفت شہر — جاتے رہتے ہیں ہزاروں کے سر اک بات کے بیچ
میری طاعت کو قبول آہ کہاں تک ہوگا — سبحہ اک ہاتھ میں ہے جام ہے اک ہات کے بیچ
سرمگیں چشم پہ اس شوخ کی زنہار نہ جا — ہے سیاہی مژہ میں وہ نگہ گھات کے بیچ
بیٹھیں ہم اس کے سگ کو کے برابر کیوں کر — کرتے ہیں ایسی معیشت تو مساوات کے بیچ
تاب و طاقت کو تو رخصت ہوئے مدت گذری — پندگو یوں ہی نہ کر اب خلل اوقات کے بیچ
زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کروں — ایک دل غم زدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

بے مے و مغبچہ اک دم نہ رہا تھا کہ رہا
اب تلک میر کا تکیہ ہے خرابات کے بیچ

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

(۱۹۳)

ساتھ ہو اک بےکسی کے عالم ہستی کے بیچ
بازخواہ خوں ہے میرا گو اسی بستی کے بیچ

عرش پر ہے ہم نمد پوشان الفت کا دماغ
اوج دولت کا سا ہے یاں فقر کی پستی کے بیچ

ہم سیہ کاروں کا ہنسنا وہ ہے میخانے کی اور
آگئے ہیں میرؔ مسجد میں چلے مستی کے بیچ

ردیف ح

(۱۹۴)

ہونے لگا گداز غم یار بے طرح
رہنے لگا ہے دل کو اب آزار بے طرح

اب کچھ طرح نہیں ہے کہ ہم غم زدے ہوں شاد
کہنے لگا ہے منھ سے ستمگار بے طرح

جاں بر تمھارے ہاتھ سے ہوگا نہ اب کوئی
رکھنے لگے ہو ہاتھ میں تلوار بے طرح

فتنہ اٹھے گا ورنہ نکل گھر سے تو شتاب
بیٹھے ہیں آکے طالب دیدار بے طرح

لوہو میں شور بور ہے دامان وجیب میرؔ
بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

(۱۹۵)

خاطر کرے ہے جمع وہ ہر بار ایک طرح
کرتا ہے چرخ مجھ سے نئے یار ایک طرح

میں اور قیس و کوہکن اب جو زباں پہ ہیں
مارے گئے ہیں سب یہ گنہگار ایک طرح

منظور اس کو پردے میں ہیں بے حجابیاں
کس سے ہوا دوچار وہ عیار ایک طرح

سب طرحیں اس کی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں
پر ہم بھی ہوگئے ہیں گرفتار ایک طرح

گھر اس کے جاکے آتے ہیں پامال ہوکے ہم
کریے مکاں ہی اب سر بازار ایک طرح

گہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
ق آتا نہیں نظر وہ طرحدار ایک طرح

نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح

سو طرح طرح دیکھ طبیبوں نے یہ کہا
ق صحت پذیر ہوئے یہ بیمار ایک طرح(۱)

سو بھی ہزار طرح سے ٹھہراوتے ہیں ہم
تسکین کے لیے تری ناچار ایک طرح(۲)

بن جی دیے ہو کوئی طرح فائدہ نہیں
گر ہے تو یہ ہے اے جگر افگار ایک طرح(۳)

---

(۱) تا (۳) نسخۂ محمودآباد

ہر طرح تو ذلیل ہی رکھتا ہے میرؔ کو
ہوتا ہے عاشقی میں کوئی خوار ایک طرح

ردیف خ

(۱۹۶)[1]

ہے نہیں دشمنِ جہاں وہ شوخ
ان دنوں کچھ ہے مہرباں وہ شوخ

ردیف د

(۱۹۷)

کیا ہے یہ جو گاہے آجاتی ہے آندھی کوئی زرد — یا بگولا جو کوئی سر کھینچے ہے صحرا نورد
شوق میں یہ محملِ لیلیٰ کے ہو کر بے قرار — اک نہاد وادیِ مجنوں سے اٹھ چلتی ہے گرد
وجہ دم سردی نہیں میں جانتا رونے کے بعد — مینھ برسا ہے کہیں شاید ہوا آتی ہے سرد
مار رکھا باطنِ پیرِ مغاں نے شیخ کو — مل گیا اس پیر زن کو غیب سے ایک پیرمرد

ایک شب پہلو کیا تھا گرم ان نے تیرے ساتھ
رات کو رہتا ہے اکثر میرؔ کے پہلو میں درد

(۱۹۸)

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد — ابھریں گے عشق دل سے ترے راز میرے بعد
جینا مرا تو تجھ کو غنیمت ہے ناسمجھ — کھینچے گا کون پھر یہ ترے ناز میرے بعد
شمعِ مزار اور یہ سوزِ جگر مرا — ہر شب کریں گے زندگی ناساز میرے بعد
حسرت ہے اس کے دیکھنے کی دل میں بے قیاس — اغلب کہ میری آنکھیں رہیں باز میرے بعد
کرتا ہوں میں جو نالے سرانجام باغ میں — منھ دیکھو پھر کریں گے ہم آواز میرے بعد
بن گل موا ہی میں تو پہ تو جا کے لوٹیو — صحنِ چمن میں اے پرِ پرواز میرے بعد

بیٹھا ہوں میرؔ مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

---

(۱) نسخۂ نول کشور

(۱۹۹)

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد — آخرکار کیا کہا قاصد
کوئی پہنچا نہ خط مرا اس تک — میرے طالع ہیں نارسا قاصد
سرنوشت زبوں سے زر ہو خاک — راہ کھوٹی نہ کر تو جا قاصد
گر پڑا خط تو تجھ پہ حرف نہیں — یہ بھی میرا ہی تھا لکھا قاصد
یہ تو رونا ہمیشہ ہے تجھ کو — پھر کبھو پھر کبھو بھلا قاصد
اب غرض خامشی ہی بہتر ہے — ق — کیا کہوں تجھ سے ماجرا قاصد
شب کتابت کے وقت گریے میں — جو لکھا تھا سو بہ گیا قاصد
کہنہ قصہ لکھا کروں تا کے — بھیجا کب تک کروں نیا قاصد
ہے طلسمات اس کا کوچہ تو — جو گیا سو وہیں رہا قاصد
باد پر ہے برات جس کا جواب — اس کو گذرے ہیں سالہا قاصد

نامۂ میر کو اڑاتا ہے
کاغذ باد کر گیا قاصد

(۲۰۰)

ہوں رہگذر میں تیرے ہر نقش پا ہے شاہد — اڑتی ہے خاک میری باد صبا ہے شاہد
طوف حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھ کو اے بت — آتا ہے یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد
شرمندۂ اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے — وقت سحر ہے شاہد دست دعا ہے شاہد
نالے میں اپنے پنہاں میں بھی ہوں ساتھ تیرے — شاہد ہے گرد محمل شور درا ہے شاہد

ایذا ہے میر پر جو وہ تو کہوں ہی گا میں
بارے یہ کہہ کہ تیری خاطر میں کیا ہے شاہد

(۲۰۱)

اے گل نودمیدہ کے مانند — ہے تو کس آفریدہ کے مانند
ہم امید وفا پہ تیری ہوئے — ق — غنچۂ دیرچیدہ کے مانند
خاک کو میری سیر کرکے پھرا — وہ غزال رمیدہ کے مانند
سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال — سبزۂ نودمیدہ کے مانند
نہ کٹے رات ہجر کی جو نہ ہو — نالہ تیغ کشیدہ کے مانند
ہم گرفتار حال ہیں اپنے — طائر پربریدہ کے مانند

دل تڑپتا ہے اشکِ خونیں میں   صید در خوں طپیدہ کے مانند
تجھ سے یوسف کو کیونکے نسبت دیں   کب شنیدہ ہو دیدہ کے مانند
میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے لیک
بندۂ زرخریدہ کے مانند

(۲۰۲)

قفس تو یاں سے گئے پر مدام ہے صیاد   چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیاد
بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نہ کر قفس کی فکر   مرا تو کام انھیں میں تمام ہے صیاد
یہی گلوں کو تنک دیکھوں اتنی مہلت ہو   چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیاد
ابھی کہ وحشی ہے اس کشمکش کے بیچ ہے میر
خدا ہی اس کا ہے جو تیرا رام ہے صیاد

(۲۰۳)

میرے سنگ مزار پر فرہاد   رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال   جان کے ساتھ ہے دل ناشاد
موند آنکھیں سفر عدم کا کر   بس ہے دیکھا نہ عالم ایجاد
فکر تعمیر میں نہ رہ منعم   زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں   کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
سنتے ہو تک سنو کہ پھر مجھ بعد   نہ سنوگے یہ نالہ و فریاد
لگتی ہے کچھ سموم سی تو نسیم   خاک کس دل جلے کی دی برباد
بھولا جا ہے غم بتاں میں جی   غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد
تیرے قید قفس کا کیا شکوہ   نالے اپنے سے اپنے سے فریاد
ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز   باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد
ہم کو مرنا یہ ہے کہ کب ہوں کہیں   اپنی قید حیات سے آزاد
ایسا وہ شوخ ہے کہ اٹھتے صبح   جانا سو جاے اس کی ہے معتاد
نہیں صورت پذیر نقش اس کا   یوں ہی تصدیع کھینچے ہے بہزاد
خوب ہے خاک سے بزرگوں کی ق چاہنا تو مرے تئیں امداد
پر مروت کہاں کی ہے اے میر   تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد
نامرادی ہو جس پہ پروانہ
وہ جلاتا پھرے چراغ مراد

ردیف ر

(۲۰۴)

اودھر تلک ہی چرخ کے مشکل ہے ٹک گذر
اے آہ پھر اثر تو ہے برچھی کی چوٹ پر

دھڑکا تھا دل طپیدن شب سے سو آج صبح
دیکھا وہی کہ آنسوؤں میں چو پڑا جگر

ہم تو اسیر کنج قفس ہوکے مرچلے
اے اشتیاق سیر چمن تیری کیا خبر

مت عیب کر جو ڈھونڈوں میں اس کو کہ مدعی
یہ جی بھی یوں ہی جائے گا رہتا ہے تو کدھر

آتی ہی بوجھیو تو بلا اپنے سر صبا
وے مشک فام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر

جاتی نہیں ہے دل سے تری یاد زلف و رو
روتے ہی مجھ کو گذرے ہے کیا شام کیا سحر

کیا جانوں کس کے تیں لب خنداں کہے ہے خلق
میں نے جو آنکھیں کھول کے دیکھیں سو چشم تر

اے سیل ٹک سنبھل کے قدم بادیے میں رکھ
ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کا مری خطر

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تو نہ دیکھ
لیکن کبھو تو میر کے کر حال پر نظر

(۲۰۵)

غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر
پھر دیکھنا ادھر کو آنکھیں ملا ملا کر

ہر گام سد رہ تھی بتخانے کی محبت
کعبے تلک تو پہنچے لیکن خدا خدا کر

نخچیرگہ میں تجھ سے جو نیم کشتہ چھوٹا
حسرت نے اس کو آخر مارا لٹا لٹا کر

اک لطف کی نگہ بھی ہم نے نہ چاہی اس سے
رکھا ہمیں تو ان نے آنکھیں دکھا دکھا کر

ناصح مرے جنوں سے آگہ نہ تھا کہ ناحق
گودڑ کیا گریباں سارا سلا سلا کر

اک رنگ پاں ہی اس کا دل خوں کن جہاں ہے
پھبتا ہے اس کو کرنا باتیں چبا چبا کر

جوں شمع صبح گاہی یک بار بجھ گئے ہم
اس شعلہ خو نے ہم کو مارا جلا جلا کر

اس حرف ناشنو سے صحبت بگڑ ہی جا ہے
ہر چند لاتے ہیں ہم باتیں بنا بنا کر

میں منع میر تجھ کو کرتا نہ تھا ہمیشہ
کھوئی نہ جان تونے دل کو لگا لگا کر

(۲۰۶)

نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر
نہیں اس قافلے میں اہل دل ضبط نفس بہتر

نہ ہونا ہی بھلا تھا سامنے اس چشم گریاں کے
نظر اے ابر تر آپھی نہ آوے گا برس بہتر

سدا ہو خار خار باغباں گل کا جہاں مانع
سمجھ اے عندلیب اس باغ سے کنج قفس بہتر

برا ہے امتحاں لیکن نہ سمجھے تو تو کیا کریے
شہادت گاہ میں لے چل سب اپنے بوالہوس بہتر

سیہ کر دوں گا گلشن دود دل سے باغباں میں بھی
جلا آتش میں میرے آشیاں کے خار و خس بہتر

کیا داغوں سے رشک باغ اے صد آفریں الفت
یہ سینہ ہم کو بھی ایسا ہی تھا درکار بس بہتر

قدم تیرے چھوئے تھے جن نے اب وہ ہاتھ ہی سر ہے
مرے حق میں نہ ہونا ہی تھا یاں تک دسترس بہتر

عبث پوچھے ہے مجھ سے میر میں صحرا کو جاتا ہوں
خرابی ہی پہ دل رکھا ہے جو تو نے تو بس بہتر

(۲۰۷)

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار
اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار

ساقی تو ایک بار تو توبہ مری تڑا
توبہ کروں جو پھر تو ہے توبہ ہزار بار

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

کس ڈھب سے راہ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے
پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

کوچے کی اس کے راہ نہ بتلائی بعد مرگ
دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار

اے پاے خم کہ گردش ساغر ہو دستگیر
مرہون درد سر ہو کہاں تک مرا خمار

وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میر
آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

(۲۰۸)

یہ عشق بے اجل کش ہے بس اے دل اب توکل کر
اگرچہ جان جاتی ہے چلی لیکن تغافل کر

سفر ہستی کا مت کر سرسری جوں باد اے رہرو
یہ سب خاک آدمی تھے ہر قدم پر ٹک تامل کر

سن اے بے درد گلچیں غارت گلشن مبارک ہے
پہ ٹک گوش مروت جانب فریاد بلبل کر

نہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ امید طالع سے
دل بیتاب کو کس منھ سے کہیے ٹک تحمل کر

یہ کیا جانوں کہ کیوں رونے لگا رونے سے رہ کر میں
مگر یہ جانتا ہوں مینھ گھر آتا ہے پھر کھل کر

مرے پاس اس کی خاک پا کو بیماری میں رکھا تھا
نہ آیا سر مرا بالیں پہ ادھر جو گیا ڈھل کر

تجلی جلوہ ہیں کچھ بام و در غم خانے کے میرے
وہ رشک ماہ آیا ہم نشیں بس اب دیا گل کر

تری خاموشی سے قمری ہوا شور جنوں رسوا
ہلا ٹک طوق گردن کو بھی ظالم باغ میں غل کر

گداز عاشق کا میر کے شب ذکر آیا تھا
جو دیکھا شمع مجلس کو تو پانی ہوگئی گھل کر

(۲۰۹)

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفا کار اس قدر
یک سینہ خنجر سیکڑوں یک جان و آزار اس قدر

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر
میں اس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

منزل پہنچنا یک طرف نے صبر ہے نے ہے سکوں
یکسر قدم میں آبلے پھر راہ پرخار اس قدر

ہے جائے ہر دل میں تری آ درگذر کر بے وفا
کر رحم ٹک اپنے اپر مت ہو دل آزار اس قدر

جز کشمکش ہووے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ
یہ بے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتار اس قدر

غیر اور بغل گیری تری عید اور ہم سے بھاگنا
ہم یار ہوں یوں غم زدے خوش ہوئیں اغیار اس قدر

طاقت نہیں ہے بات کی کہتا تھا نعرہ ماریے
کیا جانتا تھا میر ہوجاوے گا بیمار اس قدر

(۲۱۰)

قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر
کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر

نہ دیکھا آخر اس آئینہ رو نے
نظر سے بھی نگاہ واپسیں پر

گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے
دماغ نالہ چرخ ہفتمیں پر

ہوا ہے ہاتھ گلدستہ ہمارا
کہ داغ خوں بہت ہے آستیں پر

خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو
نظر اپنی نہیں ہے مہروکیں پر

پر افشانی قفس ہی کی بہت ہے
کہ پرواز چمن قابل نہیں پر

جگر میں اپنے باقی روتے روتے ق
اگرچہ کچھ نہیں اے ہم نشیں پر

کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

قدم دشت محبت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گام اولیں پر

(۲۱۱)

دل دماغ و جگر یہ سب اک بار
کام آئے فراق میں اے یار

کیوں نہ ہو ضعف غالب اعضا پر
مر گئے ہیں قشون کے سردار

گل پژمردہ کا نہیں ممنون
ہم اسیروں کا گوشۂ دستار

مت نکل گھر سے ہم بھی راضی ہیں
دیکھ لیں گے کبھو سر بازار

سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں
پر کہاں پایئے لب اظہار

سیر کر دشت عشق کا گلشن
غنچے ہو ہو رہے ہیں سو سو خار

روز محشر ہے رات ہجراں کی   ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار
بحث نالہ بھی کیجیو بلبل   پہلے پیدا تو کر لب گفتار
چاک دل پر ہیں چشم صد خوباں   کیا کروں یک انار و صد بیمار
شکر کر داغ دل کا اے غافل   کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
گو غزل ہو گئی قصیدہ سی   عاشقوں کا ہے طول حرف شعار
ہر سحر لگ چلی تو ہے تو نسیم ق   اے سیہ مست ناز ٹک ہشیار
شاخسانے ہزار نکلیں گے   جو گیا اس کی زلف کا اک تار
واجب القتل اس قدر تو ہوں ق   کہ مجھے دیکھ کر کہے ہے پکار
یہ تو آیا نہ سامنے میرے   لاؤ میری میاں سپر تلوار
آ زیارت کو قبر عاشق پر ق   اک طرح کا ہے یاں بھی جوش بہار
نکلے ہے میری خاک سے نرگس   یعنی اب تک ہے حسرت دیدار
میر صاحب زمانہ نازک ہے ق   دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں   اپنے اوپر نہ کیجیے دشوار
چار دن کا ہے مجملہ یہ سب   سب سے رکھیے سلوک ہی ناچار
کوئی ایسا گناہ اور نہیں ق   یہ کہ کیجے ستم کسی پر یار
واں جہاں خاک کے برابر ہے   قدر ہفت آسمان ظلم شعار
یہی درخواست پاس دل کی ہے   نہیں روزہ نماز کچھ درکار
در مسجد پہ حلقہ زن ہو تم   کہ رہو بیٹھ خانۂ خمار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے   لیک ہوجو نہ درپئے آزار

حاصل دو جہان ہے یک حرف
ہو مری جان آگے تم مختار

(۲۱۲)

لبوں پر ہے ہر لحظہ آہ شرر بار   جلا ہی پڑا ہے ہمارا تو گھر بار
ہوئیں کس ستم دیدہ کے پاس یک جا   نگاہیں شرر ریز پلکیں جگر بار
کہو کوئی دیکھے اسے سیر کیونکر   کہ ہے اس تن نازک اوپر نظر بار
حلاوت سے اپنی جو آگاہ ہوں تو   چپک جائیں باہم وے لعل شکر بار
سبک کر دیا دل کی بے طاقتی نے   نہ جانا تھا اس کی طرف ہم کو ہر بار
گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو   کہ جبہ ہے یک بار و عمامہ سر بار

مرے نخلِ ماتم پہ ہے سنگ باراں
نہایت کو لایا عجب یہ شجر بار

ہمیں بار اس در پہ کثرت سے کیا ہو
لگا ہی رہے ہے سدا واں تو دربار

یہ آنکھیں گئیں ایسی ہوکر درافشاں
کہ دیکھے سے آیا تر ابرِ گہربار

کب اس عمر میں آدمی شیخ ہوگا
کتابیں رکھیں ساتھ گو ایک خربار

جہاں میر رہنے کی جا کہ نہیں ہے
چلا چاہیے یاں سے اسباب کر بار

(۲۱۳)

غصے سے اٹھ چلے ہو تو دامن کو جھاڑ کر
جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہوسکے
پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر

منظور ہو نہ پاس ہمارا تو حیف ہے
آئے ہیں آج دور سے ہم تجھ کو تاڑ کر

غالب کہ دیوے قوت دل اس ضعیف کو
تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر

نکلیں گے کام دل کے کچھ اب اہلِ ریش سے
کچھ ڈھیر کر چکے ہیں یہ آئے اکھاڑ کر

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میر
بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر

(۲۱۴)

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں یک بار دیکھ کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیو ٹک کہ جفا کار دیکھ کر

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے پھر اب
کریو ٹک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستمگار دیکھ کر

طالع نے چشم پوشی کی یاں تک کہ ہم نشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

(۲۱۵)

دیکھ اس کو ہنستے سب کے دم سے گئے اکھڑ کر
ٹھہرے ہے آرسی بھی دانتوں زمیں پکڑ کر

کیا کیا نیازطینت اے ناز پیشہ تجھ بن
مرتے ہیں خاک رہ سے گوڑے رگڑ رگڑ کر

قد کش چمن کے اپنی خوبی کو نیو چلے ہیں
پایا پھل اس سے آخر کیا سرو نے اکڑ کر

وہ سر چڑھا ہے اتنا اپنی فروتنی سے
کھویا ہمیں نے اس کو ہر لحظہ پاؤں پڑ کر

پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم
مشہور ہے نگیں جو بیٹھا ہے گھر میں گڑ کر

دوری میں دلبروں کی کٹتی ہے کیونکے سب کی
آدھا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر

اب کیسا زہد و تقویٰ دارو ہے اور ہم ہیں
بنت العنب کے اپنا سب کچھ گیا کھسو کر

دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہے ایک گھر یاں سو صورتیں بگڑ کر

اس پشت لب کے اوپر دانے عرق کے یوں ہیں
یاقوت سے رکھے ہیں جوں موتیوں کو جڑ کر

ناسازگاری اپنے طالع کی کیا کہیں ہم
آیا کبھو نہ یاں تک غیروں سے یار لڑ کر

اپنے مزاج میں بھی ہے میرؔ ضد نہایت
پھر مر ہی کے اٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو اڑ کر

(۲۱۶)

کہتا ہے کون تجھ کو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہوسکے جو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر

وہ جنگ پوش اک دن دامن کشاں گیا تھا
رکھی ہیں جانمازیں اہل ورع نے تہ کر

کیا قصر دل کی تم سے ویرانی نقل کریے
ہو ہوگئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھہ کر

ہم اپنی آنکھوں کب تک یہ رنگ عشق دیکھیں
آنے لگا ہے لوہو رخسار پر تو بہ کر

رنگ شکستہ اپنا بےلطف بھی نہیں ہے
یاں کی تو صبح دیکھے اک آدھ رات رہ کر

برسوں عذاب دیکھے قرنوں تعب اٹھائے
یہ دل حزیں ہوا ہے کیا کیا جفائیں سہ کر

ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا
اسرار عاشقی کا پچھتائے یار کہہ کر

طاعت کوئی کرے ہے جب ابر زور جھومے
گر ہوسکے تو زاہد اس وقت میں گنہ کر

کیوں تو نے آخر آخر اس وقت منھ دکھایا
دی جان میرؔ نے جو حسرت سے اک نگہ کر

(۲۱۷)

شیخی کا اب کمال ہے کچھ اور
حال ہے اور قال ہے کچھ اور

وعدے برسوں کے کن نے دیکھے ہیں
دم میں عاشق کا حال ہے کچھ اور

سہل مت بوجھ یہ طلسم جہاں　　ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
تو رگ جاں سمجھتی ہوگی نسیم　　اس کے گیسو کا بال ہے کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں　　عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور
کوز پشتی پہ شیخ کی مت جاؤ　　اس پہ بھی احتمال ہے کچھ اور
اس میں اس میں بڑا تفاوت ہے　　کبک کی چال ڈھال ہے کچھ اور
میرؔ تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

(۲۱۸)

دل جو اپنا ہوا تھا زخمی چور　　ضبط گریہ سے پڑ گئے ناسور
صبح اس سرد مہر کے آگے　　قرص خورشید ہوگیا کافور
ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر　ق　دولت حسن پر نہ ہو مغرور
عرش پر بیٹھتا ہے کہتے ہیں　　گر اٹھے ہے غبار خاطر مور
شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ
ہے پیارے ہنوز دلی دور

(۲۱۹)

غیروں سے مل چلے تم مست شراب ہوکر　　غیرت سے رہ گئے ہم یک سو کباب ہوکر
اس روے آتشیں سے برقع سرک گیا تھا　　گل بہ گیا چمن میں خجلت سے آب ہوکر
کل رات مند گئی تھیں بہتوں کی آنکھیں غش سے　　دیکھا کیا نہ کر تو سرمست خواب ہوکر
پردہ رہے گا کیونکر خورشید خاوری کا　　نکلے ہے صبح وہ بھی اب بے نقاب ہوکر
یک قطرہ آب میں نے اس دور میں پیا ہے　　نکلا ہے چشم تر سے وہ خون ناب ہوکر
آ بیٹھتا تھا صوفی ہر صبح میکدے میں　　شکر خدا کہ نکلا واں سے خراب ہوکر
شرم و حیا کہاں تک ہیں میرؔ کوئی دن کے
اب تو ملا کرو تم ٹک بے حجاب ہوکر

(۲۲۰)

ہو آدمی اے چرخ ترک گردش ایام کر　　خاطر سے ہی مجھ مست کی تائید دور جام کر
دنیا ہے بے صرفہ نہ ہو رونے میں یا کڑھنے میں تو　　نالے کو ذکر صبح کر گریے کو ورد شام کر
مست جنوں رہ روز و شب شہرہ ہو شہر و دشت میں　　مجلس میں اپنی نقل خوش زنجیر کا بادام کر

جتنی ہو ذلت خلق میں اتنی ہے عزت عشق میں — ناموس سے آ درگذر بے ننگ ہوکر نام کر

مر رہ کہیں بھی میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا
ظالم کسو کا سن کہا کوئی گھڑی آرام کر

(۲۲۱)

رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخرکار — ہاتھ سے جائے گا سررشتۂ کار آخرکار
لوح تربت پہ مری پہلے یہ لکھیو کہ اسے — یار دشمن ہو گیا جان سے مار آخرکار
مشت خاک اپنی جو پامال ہے یاں اس پہ نہ جا — سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخرکار
سیر کر کثرت عالم کی مری جان کہ پھر — تن تنہا ہے تو اور کنج مزار آخرکار(۱)
چشم وا دیکھ کے اس باغ میں کچھ نرگس — آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخرکار
ابتدا ہی میں محبت کی ہوئے ہم تو تمام — ہوتا ہوگا یہی کچھ عشق میں یار آخرکار(۲)

اول کار محبت تو بہت سہل ہے میر
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخرکار

(۲۲۲)

خط میں ہے کیا ساں پسینے پر — موتی گویا جڑے ہیں چنے پر
کوئی ہوتا ہے دل طپش سے برا — ایک دم کے لہو نہ پینے پر
دل سے میرے شکستیں ابھی ہیں — سنگ باراں ہے آبگینے پر
چاک سینے سے کھل گئے ٹانکے — کیا رفو کم ہوا ہے سینے پر

جور دلبر سے کیا ہوں آزردہ
میر اس چار دن کے جینے پر

(۲۲۳)

ہم بھی پھرتے ہیں یک حشم لے کر — دستۂ داغ و فوج غم لے کر
دست کش نالہ پیش رو گریہ — آہ چلتی ہے یاں علم لے کر
مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
اس کے اوپر کہ دل سے تھا نزدیک — غم دوری چلے ہیں ہم لے کر
تیری وضع ستم سے اے بے درد — ایک عالم گیا الم لے کر(۳)
بارہا صیدگہ سے اس کی گئے — داغ یاس آہوے حرم لے کر

---

(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

ضعف یاں تک کھنچا کہ صورت گر   رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر
دل پہ کب اکتفا کرے ہے عشق   جائے گا جان بھی یہ غم لے کر
شوق اگر ہے یہی تو اے قاصد   ہم بھی آتے ہیں اب رقم لے کر
میر صاحب ہی چوکے اے بد عہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

(۲۲۴)

داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر   بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر
اے ابر خشک مغز سمندر کا منھ نہ دیکھ   سیراب تیرے ہونے کو کافی ہے چشم تر
آخر عدم سے کچھ بھی نہ اکھڑا مرا میاں   مجھ کو تھا دست غیب پکڑ لی تری کمر
ہجراں کی شب سے مجھ کو گلہ نہیں کہ ان نے بھی   دیکھی نہیں ہے خواب میں آنکھوں کبھی سحر(۱)
سوتا تھا بےخبر تو نشے میں جو رات کو
سو بار میر نے تری اٹھ اٹھ کے لی خبر

(۲۲۵)

پشت پا ماری بسکہ دنیا پر   زخم پڑ پڑ گیا مرے پا پر
ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز   کہیں دیکھا تھا تجھ کو دریا پر
گرو مے ہوں آؤ شیخ شہر   ابر جھوما ہی جا ہے صحرا پر
دل پرخوں تو تھا گلابی شراب   جی ہی اپنا چلا نہ صہبا پر
یاں جہاں میں کہ شہر کوراں ہے   سات پردے ہیں چشم بینا پر
فرصت عیش اپنی یوں گذری   کہ مصیبت پڑی تمنا پر
طارم تاک سے لہو ٹپکا   سنگ باراں ہوا ہے مینا پر
میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دوبھر ہوا مسیحا پر

(۲۲۶)

جھوٹے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر   انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر
وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے   پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
جھمکے دکھاکے باعث ہنگامہ ہی رہے   پر گھر سے در پہ آئے نہ تم بات مان کر

(۱) نسخۂ محمود آباد

کہتے نہ تھے کہ جان سے جاتے رہیں گے ہم
اچھا نہیں ہے آ نہ ہمیں امتحان کر

کم گو جو ہم ہوئے تو ستم کچھ نہ ہوگیا
اچھی نہیں یہ بات مت اتنی زبان کر

ہم وے ہیں جن کے خوں سے تری راہ سب ہے گل
مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کر

تا کشتۂ وفا مجھے جانے تمام خلق
تربت پہ میری خون سے میرے نشان کر

ناز و عتاب و خشم کہاں تک اٹھائیے
یارب کبھو تو ہم پہ اسے مہربان کر

افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک
چل اب کہ سوویں منھ پہ دوپٹے کو تان کر

(۲۲۷)

آزار دیکھے کیا کیا ان پلکوں سے اٹک کر
جی لے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر

سرو و تدرو دونوں پھر آپ میں نہ آئے
گلزار میں چلا تھا وہ شوخ لٹک لٹک کر

کب آنکھ کھول دیکھا تیرے تئیں سرہانے
ناچار مر گئے ہم سر کو پٹک پٹک کر

حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر

یہ مشت خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر

دل کام چاہتا ہے اب اس کے گیسوؤں سے
واں مر گئے ہیں کتنے برسوں اٹک اٹک کر

ٹک منھ سے اس کے دی شب برقع سرک گیا تھا
جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

دھوا چکے تھے مل کر کل لونڈے میکدے کے
پر سرگراں ہو واعظ جاتا رہا سٹک کر

کل رقص شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
آیا وہ حیز شرعی کتنا مٹک مٹک کر

منزل کی میر اس کی کب راہ تجھ سے نکلے
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

(۲۲۸)[۱]

نظر کرکے وہ سلک دندان یار
ہوئے پانی پانی در شاہوار

(۲۲۹)[۲]

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

---

(۱)،(۲) نسخۂ نول کشور

ردیف ڑ

(۲۳۰)

آشوب دیکھ چشم تری سر رہے ہیں جوڑ
پلکوں کی صف سے بھیڑیں گئیں منھ کو موڑ موڑ

ااکھوں جتن کیے نہ ہوا ضبط گریہ لیک
سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کڑوڑ

زخم دروں سے میرے نہ ٹک بے خبر رہو
اب ضبط گریہ سے ہے ادھر ہی کو سب نچوڑ

گرمی سے برشگال کی پروا ہے کیا ہمیں
برسوں رہی ہے جان کے رکنے کی یاں مروڑ

بلبل کی اور چشم مروت سے دیکھ ٹک
بے درد یوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ

کچھ کوہکن ہی سے نہیں تازہ ہوا یہ کام
بہتیرے عاشقی میں موئے سر کو پھوڑ پھوڑ

بے طاقتی سے میرؔ لگے چھوٹنے پران
ظالم خیال دیکھنے کا اس کے اب تو چھوڑ

ردیف ز

(۲۳۱)

ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا وا ہنوز
بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز

باقی نہیں ہے دل میں یہ غم ہے بجا ہنوز
ٹپکے ہے خون دم بہ دم آنکھوں سے تا ہنوز(۱)

دن رات کو کھنچا ہے قیامت کا اور میں
پھرتا ہوں منھ پہ خاک ملے جابجا ہنوز

خط کاڑھ لا کے تم تو منڈا بھی چلے ولے
ہوتی نہیں ہماری تمھاری صفا ہنوز

غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں
دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز

گذری نہ پار عرش کہ تسکین ہو مجھے
افسوس میری آہ رہی نارسا ہنوز(۲)

احوال نامہ بر سے مرا سن کے کہہ اٹھا
جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز

غنچہ نہ بوجھ دل ہے کسی مجھ سے زار کا
کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز

توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تونے سنگ دل
ہے دل خراش کوچے میں تیرے صدا ہنوز

چلو میں اس کے میرا لہو تھا سو پی چکا
اڑتا نہیں ہے طائر رنگ حنا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میرؔ
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد

(۲۳۲)

ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز — ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز
آتش دل نہیں بجھی شاید — قطرۂ اشک ہے شرارہ ہنوز
خاک میں ہے وہ طفل اشک اس بن — چشم ہے جس کا گاہوارہ ہنوز[۱]
اشک جھمکا ہے جب نہ نکلا تھا — چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز
ایک بار آکے پھر نہیں آیا — عمر کی طرح وہ دوبارہ ہنوز[۲]
لب پہ آئی ہے جان کب کی ہے — اس کی موقوف یک اشارہ ہنوز
کب کی توبہ کی میر نے لیکن — ہے بتر از شراب خوارہ ہنوز[۳]

عمر گذری دوائیں کرتے میر
درد دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز

(۲۳۳)

مر گیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز — تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز
دل بھی پر داغ چمن ہے پر اسے کیا کیجے — جی سے جاتی ہی نہیں حسرت دیدار ہنوز
بہ کیے عمر ہوئی ابر بہاری کو ولے — لہو برسا رہے ہیں دیدۂ خوں بار ہنوز
بد نہ لے جائیو پوچھوں ہوں تجھی سے یہ طبیب — بہ ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز
نا امیدی میں تو مر گئے پہ نہیں یہ معلوم — جیتے ہیں کون سی امید پہ ناچار ہنوز[۴]
بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ — تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز
ایک دن بال فشاں تک ہوئے تھے خوش ہوکر — ہیں غم دل کی اسیری میں گرفتار ہنوز
کوئی تو آبلہ پا دشت جنوں سے گذرا — ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سر خار ہنوز
منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی — جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز
اڑ گئے خاک ہو کتنے ہی ترے کوچے سے — باز آتے نہیں پر تیرے ہوادار ہنوز
ایک بھی زخم کی جا جس کے نہ ہو تن پہ کہیں — ق — کوئی دیتا ہے ستا ویسے کو آزار ہنوز
تک تو انصاف کر اے دشمن جان عاشق — میان سے نکلی پڑے ہے تری تلوار ہنوز
میر کو ضعف میں میں دیکھ کہا کچھ کہیے — ق — ہے تجھے کوئی گھڑی قوت گفتار ہنوز
ابھی اک دم میں زباں چلنے سے رہ جاتی ہے — درد دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز
آنسو بھر لا کے بہت حزن سے یہ کہنے لگا — کیا کہوں تجھ کو سمجھ اس پہ نہیں یار ہنوز

---
(۱) تا (۴) نسخۂ محمودآباد

آنکھوں میں آن رہا جی جو نکلتا ہی نہیں
دل میں میرے ہے گرہ حسرت دیدار ہنوز

(۲۳۴)

مجھ کو پوچھا بھی نہ یہ کون ہے غم ناک ہنوز ۔ ہو چکے حشر میں پھرتا ہوں جگر چاک ہنوز
اشک کی لغزش مستانہ پہ مت کیجو نظر ۔ دامن دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز
ایک بھی تار گریبان کفن بچ نہیں ۔ جم ہوئی بیٹھی ہے چھاتی پہ مری خاک ہنوز(۱)
بھر نظر دیکھنے پاتا نہیں میں نزع میں بھی ۔ منھ کے تیں پھیرے ہی لیتا ہے وہ بیباک ہنوز
بعد مرنے کے بھی آرام نہیں میرؔ مجھے
اس کے کوچے میں ہے پامال مری خاک ہنوز

(۲۳۵)

ہو چکا خون جگر رونا نہیں کچھ کم ہنوز ۔ ہیں مژہ دستور سابق ہی یہ میری نم ہنوز
دل جلوں پر روتے ہیں جن کو ہے کچھ سوز جگر ۔ شمع رکھتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز
وضع یکساں اس زمانے میں نہیں رہتی کہیں ۔ قد ترا چوگاں رہا ہے کس طرح سے خم ہنوز
آرہا ہے جی مرا آنکھوں میں اک پل اور ہوں ۔ پر نہیں جاتا کسی کے دیکھنے کا غم ہنوز
وہ جو عالم اس کے اوپر تھا سو خط نے کھو دیا
مبتلا ہے اس بلا میں میرؔ اک عالم ہنوز

ردیف س

(۲۳۶)

اے ابر تر تو اور کسی سمت کو برس ۔ اس ملک میں ہماری ہے یہ چشم تر ہی بس
حرماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا ۔ اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس
مژگاں بھی یہ تھکیں مرے رونے سے چشم کی ۔ سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہے کوئی خس
مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا ۔ تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس
اے گریہ اس کے دل میں اثر خوب ہی کیا ۔ روتا ہوں جب میں سامنے اس کے تو دے ہے ہنس
اس کی زباں کے عہدے سے کیونکر نکل سکوں ۔ کہتا ہوں ایک میں تو سناتا ہے مجھ کو دس

(۱) نسخۂ محمودآباد

حیراں ہوں میر نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوال دل بہت ہے مجھے فرصت اک نفس

(۲۳۷)

کیونکے نکلا جائے بحرغم سے مجھ بے دل کے پاس   آکے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس
ہے پریشاں دشت میں کس کا غبار ناتواں   گرد کچھ گستاخ آتی ہے چلی محمل کے پاس
گرم ہوگا حشر کو ہنگامۂ دعویٰ بہت   کاشکے مجھ کو نہ لے جاویں مرے قاتل کے پاس
دور اس سے جوں ہوا دل پر بلا ہے مضطرب   اس طرح تڑپا نہیں جاتا کسو بسمل کے پاس
بوے خوں آتی ہے باد صبح گاہی سے مجھے   نکلی ہے بے درد شاید ہو کسو گھائل کے پاس
آہ نالے مت کیا کر اس قدر بیتاب ہو
اے ستم کش میر ظالم ہے جگر بھی دل کے پاس

(۲۳۸)

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس   آہ افسوس صد ہزار افسوس
ہم تو ملتے تھے جب ابا بابا   نہ رہا وو ہیں روزگار افسوس
یوں گنواتا ہے دل کوئی مجھ کو   یہی آتا ہے بار بار افسوس
قتل کر تو ہمیں کرے گا خوشی   یہ توقع تھی تجھ سے یار افسوس
رخصت سیر باغ تک نہ ہوئی   یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس
خوب بدعہد تو نہ مل لیکن   میرے تیرے تھا یہ قرار افسوس
خاک پر میر تیری ہوتا وے
نہ ہوا اتنا اقتدار افسوس

ردیف ش

(۲۳۹)

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش   کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابروے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب   موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش
ان مغبچوں کے کوچے ہی سے میں کیا سلام   کیا مجھ کو طوف کعبہ سے میں رند درد نوش
حیرت سے ہووے پرتو مہ نور آئینہ   تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش
کل ہم نے سیر باغ میں دل ہاتھ سے دیا   ق   اک سادہ گل فروش کا آکر سبد بدوش

جاتا رہا نگاہ سے جوں موسم بہار   آج اس بغیر داغ جگر ہیں سیاہ پوش
شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزور سے   ق   بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دور رفتہ کو   عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش
جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا   وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناو نوش
جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں   ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
جھوے ہے بید جاے جوانان مے گسار   بالاے خم ہے خشت سر پیر مے فروش
میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
پر اے زباں دراز بہت ہوچکی خموش

(۲۴۰)

دل تو افگار ہے جگر ہے ریش   اک مصیبت ہے میرے تیں درپیش
پان تو لیتا جا فقیروں کے   برگ سبز است تحفۂ درویش
ایک دم مہر برسوں تک کینہ   یوں ہی گذری ہے اپنی اس کی ہمیش[1]
فکر کر زاد آخرت کا بھی
میر اگر تو ہے عاقبت اندیش

ردیف ص

(۲۴۱)

شیخ ہو دشمن زن رقاص
کیوں نہ القاص لایحب القاص

ردیف ض

(۲۴۲)

سال میں ابر بہاری تجھ سے اک باری ہے فیض
چشم نم دیدہ سے عاشق کی سدا جاری ہے فیض

(۱) نسخۂ محمود آباد

ردیف ط

(۲۴۳)

سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط ہوتے ہیں یہ لوگ بھی کتنے پریشاں اختلاط
تنگ آیا ہوں میں رشک تنگ پوشی سے تری
اس تن نازک سے یہ جامے کو چسپاں اختلاط

ردیف ظ

(۲۴۴)

غیر مجھ کو جو کہتے ہیں محظوظ
تجھ سے ملتے ہیں رہتے ہیں محظوظ

ردیف ع

(۲۴۵)

سب پہ روشن ہے، کہ شب مجلس میں جب آتی ہے شمع
اس بھبھوکے سے کو بیٹھا دیکھ جل جاتی ہے شمع

(۲۴۶)[۱]

یوں جلا ڈالا کہ کچھ روشن نہ ہوئی تقریر شمع
واہ وا رے آتش جاں سوز پھر تاثیر شمع

ردیف غ

(۲۴۷)

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
تم اور ہم سے محبت تمھیں خلاف خلاف ہم اور الفت خوب دگر دروغ دروغ
غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ
فروغ کچھ نہیں دعوے کو صبح صادق کے شب فراق کو کب ہے سحر دروغ دروغ

(۱) نسخۂ نول کشور

کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میر سے تو
وہ اور اس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

(۲۴۸)

شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ
جائیں گے گر وفا کرے گا دماغ

ردیف ف

(۲۴۹)

آج کل کا ہے کو بتلاتے ہو گستاخی معاف
راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمھارے سب خلاف

آہ برچھی سی لگی تھی تیر سی دل کی طپش
ہجر کی شب مجھ پہ گذری غیرت روز مصاف

ایک دن میں نے لکھا تھا اس کو اپنا درد دل
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف

پاؤں پر سے اپنے میرا سر اٹھانے مت جھکو
تیغ باندھی ہے میاں تم نے کمر میں خوش غلاف

صف الٹ جا عاشقوں کی گر ترے ابرو ہلیں
ایک دم تلوار کے چلنے میں ہووے ملک صاف

شیخ مت روکش ہو مستوں کا تو اس جبے اپر
لیتے استنجے کو ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف

عشق کے بازار میں سودا نہ کیجو تو تو میر
سر کو جب واں بیچ چکتے ہیں تو یہ ہے دست لاف

(۲۵۰)

غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
ہر خوں گرفتہ جائے ہے جلاد کی طرف

کن نے لیا ہے تم سے مچلکا کہ داد دو
ٹک کان ہی رکھا کرو فریاد کی طرف

ہر تار زلف قیمت فردوس ہے ترا
کرتا ہے کون طرۂ شمشاد کی طرف

ہم نے تو پرفشانی نہ جانی کہ ایک بار
پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف

حیران کار عشق ہے شیریں کا نقش میر
کچھ یوں ہی دیکھتا نہیں فرہاد کی طرف

(۲۵۱)

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

کوئی داد دل آہ کس سے کرے
ہر اک ہے سو اس فتنہ گر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ — دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
لگیں ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر — اک آشوب ہے اس کے گھر کی طرف
بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو — ہماری طرف سے سحر کی طرف
بخود کس کو اس تاب رخ نے رکھا — کرے کون شمس و قمر کی طرف
نہ سمجھا گیا ابر کیا دیکھ کر — ہوا تھا مری چشم تر کی طرف
ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل — نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف
مناسب نہیں حال عاشق سے صبر — رکھے ہے یہ دارو ضرر کی طرف
کسے منزل دلکش دہر میں — نہیں میل خاطر سفر کی طرف

رگ جاں کب آتی ہے آنکھوں میں میرؔ
گئے ہیں مزاج اس کمر کی طرف

ردیف ق

(۲۵۲)

درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق — شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

ردیف ک

(۲۵۳)

بے چین مجھ کو چاہتا ہر دم ہے زیر خاک — چھاتی پہ بعد مرگ بھی دل جم ہے زیر خاک
آسودگی جو چاہے تو مرنے پہ دل کو رکھ — آشفتگی طبع بہت کم ہے زیرخاک
تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعد مرگ — مت اضطراب کریو کہ عالم ہے زیر خاک
مجنوں نہ تھا کہ جس کے تئیں سونپ کر مروں — آشفتگی کا مجھ کو نپٹ غم ہے زیر خاک[1]
رویا تھا نزع میں میں اسے یاد کر بہت — اب تک مری ہر ایک مژہ نم ہے زیر خاک

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلم ہے زیر خاک

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۲۵۴)

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک
آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک

بہ بھی گیا بدن کا سب ہوکے گوشت پانی
اب کارد اے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
سوز دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

روتے پھرے ہیں لوہو یک عمر اس گلی میں
باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے
انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگ راہ اپنی کتنے یہاں سے واں تک

ہم بے نصیب سر کو پتھر سے کیوں نہ پھوڑیں
پہنچا کبھو نہ جبہہ اس سنگ آستاں تک

مانند طیر نوپر اٹھے جہاں گئے ہم
دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں وہی کچھ
حاضر ہیں میر ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

(۲۵۵)

ہیں بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک
سوکھا نہیں لوہو در و دیوار سے اب تک

رنگینی عشق اس کے ملے پر ہوئی معلوم
صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دل زار
زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک

ابرو ہی کی جنبش نے یہ ستھراؤ کیے ہیں
مارا نہیں ان نے کوئی تلوار سے اب تک

وعدہ بھی قیامت کا بھلا کوئی ہے وعدہ
پر دل نہیں خالی غم دیدار سے اب تک

مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے
واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک
اک دود سا اٹھتا ہے چمن زار سے اب تک

کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے
پوچھا نہیں ان نے تو ہمیں پیار سے اب تک

اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کسو مرغ گرفتار سے اب تک

خط آئے پہ بھی دن ہے سیہ تم سے ہمارا
جاتا نہیں اندھیر یہ سرکار سے اب تک

نکلا تھا کہیں وہ گل نازک شب مہ میں
سو کوفت نہیں جاتی ہے رخسار سے اب تک

دیکھا تھا کہیں سایہ ترے قد کا چمن میں
ہیں میر جی آوارہ پری دار سے اب تک

(۲۵۶)

میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہے ایک

کچھ ہوا اے مرغ قفس لطف نہ جاوے اس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ — ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے تک کھول کے سن شور جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

(۲۵۷)

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک — کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک
اتنا دن اور دل سے طپش کر لے کاوشیں — یہ مجملہ تمام ہی ہے آج شب تلک
نقاش کیونکے کھینچ چکا تو شبیہ یار — کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اس کا میں اب تلک
شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز — القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک
باقی یہ داستان ہے اور کل کی رات ہے
گر جان میری میرؔ نہ آ پہنچے لب تلک

(۲۵۸)

شوق ہے تو ہے اس کا گھر نزدیک — دوری رہ ہے راہبر نزدیک
آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ — کہتے ہیں دل سے ہے جگر نزدیک
دور والوں کو بھی نہ پہنچے ہم — یہی نہ تم سے ہیں مگر نزدیک(۱)
ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت — تجھ سے سب کچھ ہے چشم تر نزدیک
حرف دوری ہے گرچہ انشا لیک — دیجو خط جا کے نامہ بر نزدیک
دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں — ہم جو تم سے تھے بیشتر نزدیک
خبر آتی ہے سو بھی دور سے یاں — آؤ یک بار بے خبر نزدیک
توشۂ آخرت کا فکر رہے — جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک
دور پھرنے کا ہم سے وقت گیا — پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک
مر بھی رہ میرؔ شب بہت رویا
ہے مری جان اب سحر نزدیک

(۲۵۹)

کہیں پہنچو بھی مجھ بے پا و سر تک — کہ پہنچا شمع ساں داغ اب جگر تک

(۱) نسخۂ محمود آباد

کچھ اپنی آنکھ میں یاں کا نہ آیا — خزف سے لے کے دیکھا دُرِّ تر تک
جسے شب آگ سا دیکھا سلگتے — اسے پھر خاک ہی پایا سحر تک
ترا منھ چاند سا دیکھا ہے شاید — کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک
جب آیا آہ تب اپنے ہی سر پر — گیا یہ ہاتھ کب اس کی کمر تک
ہم آوازوں کو سیر اب کی مبارک — پر و بال اپنے بھی ایسے تھے پر تک
کھنچی کیا کیا خرابی زیر دیوار — ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک
گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق — کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک
یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب ق — تو آتا ہے جگر مژگان تر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں — اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

کہاں پھر شور شیون جب گیا میرؔ
یہ ہنگامہ ہے اس ہی نوحہ گر تک

(۲۶۰)

دست و پا مارے وقت بسمل تک — ہاتھ پہنچا نہ پائے قاتل تک
کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ — سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک
درپئے محمل اس کے جیسے جرس — میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک
بجھ گئے ہم چراغ سے باہر — کہیو اے باد شمع محفل تک

نہ گیا میرؔ اپنی کشتی سے
ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

(۲۶۱)

جاتے ہیں لے خرابی کو سیل آسماں تلک — طوفاں ہے میرے اشک ندامت سے یاں تلک
شاید کہ دیوے رخصت گلشن ہوں بے قرار — میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک
قید قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا — پہنچے نہ ہوتے کاشکے ہم آشیاں تلک
اتنا ہوں ناتواں کہ در دل سے اب گلہ — آتا ہے ایک عمر میں میری زباں تلک

میں ترک عشق کرکے ہوا گوشہ گیر میرؔ
ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تلک

(۲۶۲)

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک — رسوائیاں گئی ہیں عقیق یمن تلک

آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نہ جا سکے — حسن سلوک ضعف سے صحن چمن تلک
تردستیاں ہوں دست و گریباں ہاتھ کی — زیر زمیں بھی پہنچیں گی چاک کفن تلک
روتا ہوں آہوؤں میں تری چشم یاد کر — طوفاں کیے ہیں سینکڑوں دشت ختن تلک(1)
مارا گیا خرام بتاں پر سفر میں میر
اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

ردیف گ

(۲۶۳)

جب سے خط ہے سیاہ خال کی تھانگ — تب سے لٹتی ہے ہند چاروں دانگ
بات اہل کی چلی ہی جاتی ہے — ہے مگر عوج بن عنق کی ٹانگ
بن جو کچھ بن سکے جوانی میں — رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
عشق کا شور کوئی چھپتا ہے — نالۂ عندلیب ہے گل بانگ
اس ذقن میں بھی سبزی ہے خط کی — دیکھو جیدھر کوئیں پڑی ہے بھانگ
کس طرح ان سے کوئی گرم ملے — سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ
چلی جاتی ہے حسب قدر بلند — دور تک اس پہاڑ کی ہے ڈانگ
تفرہ باطل تھا طور پر اپنے — ورنہ جاتے یہ دوڑ ہم بھی پھلانگ
میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا — قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ
میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

ردیف ل

(۲۶۴)

فصل خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل — چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل
اللہ رے عندلیب کی آواز دل خراش — جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ — یہ چشمک پیالہ ہے ساقی ہوائے گل
یہ دیکھ سینہ داغ سے رشک چمن ہے یاں — بلبل ستم ہوا نہ جو تونے بھی کھائے گل
بلبل ہزار جی سے خریدار اس کی ہے — اے گل فروش کریو سمجھ کر بہائے گل

(۱) نسخۂ محمودآباد:

نکلا ہے ایسی خاک سے کس سادہ رو کی یہ — قابل درود بھیجنے کے ہے صفاے گل
مارے سرشک سرخ کے داغوں سے رات کو — بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھاے گل
آ عندلیب صلح کریں جنگ ہوچکی — لے اے زباں دراز تو سب کچھ سواے گل

گل چیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہاے گل

(۲۶۵)

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفاے بلبل — یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جاے بلبل
کر سیر جذب الفت گل چیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صداے بلبل
کھٹکے ہیں خار ہوکر ہر شب دل چمن میں — اتنے لب و دہن پر یہ نالہاے بلبل
یک رنگیوں کی راہیں طے کرکے مر گیا ہے — گل میں رگیں نہیں یہ ہیں نقش پاے بلبل
آئی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن — ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جاے بلبل
پیغام بےغرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں — پہنچی نہ گوش گل تک آخر دعاے بلبل

یہ دل خراش نالے ہر شب کے میر تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شور نواے بلبل

(۲۶۶)

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال — پرواز خواب ہوگئی ہے بال و پر خیال
مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود — جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال
مو کو عبث ہے تاب کلی یوں ہی تنگ ہے — اس کا دہن ہے وہم و گمان و کمر خیال
رخسار پر ہمارے ڈھلکنے کو اشک کے — دیکھے ہے جو کوئی سو کرے ہے گہر خیال

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

(۲۶۷)

سیر کر عندلیب کا احوال — ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال
تب غم تو گئی طبیب ولے — پھر نہ آیا کبھو مزاج بحال
سبزہ نورستہ رہگذار کا ہوں — سر اٹھایا کہ ہوگیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے — آشیاں تھا مرا بھی یاں پرسال
سرد مہری کی بسکہ گل رو نے — اوڑھی ابر بہار نے بھی شال

ہجر کی شب کو یاں تئیں تڑپا
کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال
ہم تو سہ گذرے کج روی تیری
نہ نبھے گی پر اے فلک یہ چال
دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر
لکۂ ابر ہے مرا رومال

(۲۶۸)

جائیں ہیں فرش رہ تری مت حال حال چل
اے رشک حور آدمیوں کی سی چال چل
اک آن میں بدلتی ہے صورت جہان کی
جلد اس نگارخانے سے کر انتقال چل
سالک بہر طریق بدن ہے وبال جاں
یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اس کو ڈال چل
آوارہ میرے ہونے کا باعث وہ زلف ہے
کافر ہوں اس میں ہووے اگر ایک بال چل
دنیا ہے میر حادثہ گاہ مقرری
یاں سے تو اپنا پاؤں شتابی نکال چل

(۲۶۹)

شرط یہ ابر میں ہم میں ہے کہ روویں گے کل
صبح گہ اٹھتے ہی عالم کو ڈبوویں گے کل
آج آوارہ ہو اے بال اسیران قفس
یہ گل و باغ و خیابان نہ ہوویں گے کل
وعدۂ وصل رہا ہے شب آئندہ پہ میر
بخت خوابیدہ جو ٹک جاگتے سوویں گے کل

(۲۷۰)

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل
اس مہلت دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں
اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل
اوباشوں ہی کے گھر تجھے پانے لگے ہیں روز
مارا پڑے گا کوئی طلبگار آج کل
ملنے کی رات داخل ایام کیا نہیں
برسوں ہوئے کہاں تئیں اے یار آج کل
گلزار ہو رہے ہے مرے دم سے کوے یار
اک رنگ پر ہے دیدۂ خوں بار آج کل
تاشام اپنا کام کھنچے کیونکے دیکھیے
پڑتی نہیں ہے جی کو جفا کار آج کل
کہنے تلک تو سنتے ہیں ویرانہ و خراب
آباد ہے سو خانۂ خمار آج کل
ٹھوکر دلوں کو لگنے لگی ہے خرام میں
لاوے گی اک بلا تری رفتار آج کل
ایسا ہی مغبچوں میں جو آتا ہے شیخ جی
تو جارہے ہیں جبہ و دستار آج کل
حیران میں ہی حال کی تدبیر میں نہیں
ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

اچھا نہیں ہے میر کا احوال ان دنوں
غالب کہ ہو چکے گا یہ بیمار آج کل

(۲۷۱)

کرو تم یاد گر ہم کو رہے تم میں بھی اکثر دل   مثل مشہور ہے یہ تو کہ ہے دنیا میں دلبر دل
بھلا تم نقد دل لے کر ہمیں دشمن گنو اب تو
کبھو کچھ ہم بھی کرلیں گے حساب دوستاں در دل

(۲۷۲)

رہتا نہیں ہے کوئی گھڑی اب تو یار دل
آزردہ دل ستم زدہ دل بےقرار دل

(۲۷۳)[۱]

تو گل باغ پر نہ بلبل پھول
وہ بھی ہےگا گلاب کا سا پھول

(۲۷۴)[۲]

لٹ گئی اس کو دیکھ گل کی فصل
سارے گلبن تھے تو کھے بے اصل

ردیف م

(۲۷۵)

کیا کہوں کیا رکھتے تھے تجھ سے ترے بیمار چشم   تجھ کو بالیں پر نہ دیکھا کھولی سو سو بار چشم
ہجر میں پاتا نہیں گریے کے سر رشتے کو میں   ہر سحر اٹھ باندھ دے ہے آنسوؤں کا تار چشم
گویا ناسور زخم دل تھی یہ اے ہم نشیں   پیش ازیں کیا کیا ہمیں دکھلاتی تھی خوں بار چشم
سینکڑوں ہوں کشتنی تو لاویں کچھ تاب نگاہ   ایک دو کا کام کب ہے اس سے ہونا چار چشم
جرم کیا غیروں کا طالع چشم پوشی کرتے ہیں   دیکھ کر احوال میرا موند لے ہے یار چشم
روز و شب وا رہنے سے پیدا ہے میر آثار شوق
ہے کسو نظارگی کا رخنۂ دیوار چشم

(۱)،(۲) نسخۂ نول کشور

(۲۷۶)

کیا بلبل اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم
گل کب رکھے ہے ٹکڑے جگر اس قدر کہ ہم

خورشید صبح نکلے ہے اس نور سے کہ تو
شبنم گرہ میں رکھتی ہے یہ چشم تر کہ ہم

جیتے ہیں تو دکھاویں گے دعواے عندلیب
گل بن خزاں میں اب کے وہ رہتی ہے مر کہ ہم

یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی
کھیلے ہے کون ایسی طرح جان پر کہ ہم

تلواریں تم لگاتے ہو ہم ہیں گے دم بخود
دنیا میں یہ کرے ہے کوئی درگذر کہ ہم

اس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں
اتنی نہیں ہوئی ہے صبا در بہ در کہ ہم

جب جا پھنسا کہیں تو ہمیں یاں ہوئی خبر
رکھتا ہے کون دل تری اتنی خبر کہ ہم(۱)

جیتے ہیں اور روتے ہیں لخت جگر ہے میرؔ
کرتے سنا ہے یوں کوئی قیمہ جگر کہ ہم

(۲۷۷)

آئے تو ہو طبیباں تدبیر گر کرو تم
ایسا نہ ہو کہ میرے جی کا ضرر کرو تم

رنگ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے
ایک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم

تھی چشم داشت مجھ کو اے دلبراں یہ تم سے
دل کو مرے اڑاکر آنکھوں میں گھر کرو تم

اس بزم خوش کے محرم ناآشنا ہیں سارے
کس کو کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

ہے پیچ دار از بس راہ وصال و ہجراں
ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم

یہ ظلم ہے تو ہم بھی اس زندگی سے گذرے
سوگند ہے تمھیں اب جو درگذر کرو تم

روے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر
ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منھ ادھر کرو تم

ہو عاشقوں میں اس کے تو آؤ میرؔ صاحب ق
گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم

کیا لطف ہے دگرنہ جس دم وہ تیغ کھینچے
سینہ سپر کریں ہم قطع نظر کرو تم

(۲۷۸)

جانا کہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم
پر مل چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم

ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں
پھاٹے میں پاؤں دینے کو آئے کہاں سے تم

اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں
کیا کیا دگرنہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم

ٹکے بھی تم ٹھہرتے کہیں دیکھے ہیں تنک
چشم وفا رکھو نہ خسان جہاں سے تم

(۱) نسخۂ محمودآباد

جاؤ نہ دل سے منظر تن میں ہے جا یہی
پچھتاؤگے اٹھوگے اگر اس مکاں سے تم

قصہ مرا سنوگے تو جاتی رہے گی نیند
آرام چشم مت رکھو اس داستاں سے تم

کھل جائیں گی پھر آنکھیں جو مر جائے گا کوئی
آتے نہیں ہو باز مرے امتحاں سے تم

جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم
ہر دم چلے ہی جاتے ہو آب رواں سے تم

رہتے نہیں ہو بن گئے میرؔ اس گلی میں رات
کچھ راہ بھی نکالو سگ و پاسباں سے تم

(۲۷۹)

کرتے نہیں ہیں دوری سے اب اس کی باک ہم
نزدیک اپنے کب کے ہوئے ہیں ہلاک ہم

بیٹھے ہم اپنے طور پہ مستوں میں جب اٹھے
جوں ابرتر لیے اٹھے دامن کو پاک ہم

آہستہ اے نسیم کہ اطراف باغ کے
مشتاق پر فشانی ہیں اک مشت خاک ہم

شمع و چراغ و شعلہ و آتش شرار و برق
رکھتے ہیں دل جلے یہ بہم سب تپاک ہم

مستی میں ہم کو ہوش نہیں نشأتین کا
گلشن میں اینڈتے ہیں پڑے زیر تاک ہم

جوں برق تیرے کوچے سے ہنستے نہیں گئے
مانند ابر جب اٹھے تب گریہ ناک ہم

مدت ہوئی کہ چاک قفس ہی سے اب تو میرؔ
دکھلا رہے ہیں گل کو دل چاک چاک ہم

(۲۸۰)

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم
گئے گذرے ہیں آخر ایسے کیا ہم

کھنچے گی کب وہ تیغ ناز یارب
رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم

نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں کسے پیار
رہیں بے لطفیاں ہی یاں تو باہم

بنے کیا خال و زلف و خط سے دیکھیں
ہوئے ہیں کتنے یہ کافر فراہم

مرض ہی عشق کا بے ڈول ہے کچھ
بہت کرتے ہیں اپنی سی دوا ہم

کہیں پیوند ہوں یارب زمیں کے
پھریں گے اس سے یوں کب تک جدا ہم

ہوس تھی عشق کرنے میں ولیکن
بہت نادم ہوئے دل کو لگا ہم

کب آگے کوئی مرتا تھا کسی پر
جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم

تعارف کیا رہا اہل چمن سے
ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم

موا جس کے لئے اس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میرؔ کا کچھ مدعا ہم

(۲۸۱)

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام — گئے گذرے خضر علیہ السلام
دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی — سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام
مجھے دیکھ منہ پر پریشاں کی زلف — غرض یہ کہ جا تو ہوئی اب تو شام
سر شام سے رہتی ہیں کاہشیں — ہمیں شوق اس ماہ کا ہے تمام
قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی — ق چلے بس تو واں جا کے کریے قیام
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور — نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام
جہاں میرؔ زیر و زبر ہوگیا
خراماں ہوا تھا وہ محشر خرام

(۲۸۲)

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہیں گے معلومات — یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
تم ہی بیگانگی کرو نہ کرو — دلبرو دے ہی آشنا ہیں ہم[۱]
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
سرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم — دیکھ اس وضع سے خفا ہیں ہم
ہے نمک سود سب تن مجروح — تیرے کشتوں میں میرزا ہیں ہم
تیرے کوچے میں تا بہ مرگ رکھا — کشتۂ منت وفا ہیں ہم[۲]
خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ — یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم
آستاں پر ترے ہی گذری عمر — اسی دروازے کے گدا ہیں ہم
ڈرتے ہیں تیری بے دماغی سے — کیونکہ پھر یار جی بلا ہیں ہم[۳]
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گویا جنس نا روا ہیں ہم

(۲۸۳)

حذر کہ آہ جگر تفتگاں بلا ہے گرم — ہمیشہ آگ ہی برسے ہے یاں ہوا ہے گرم
ہزار حیف کہ درگیر صحبت اس سے نہیں — جگر کی آگ نے ہنگامہ کر رکھا ہے گرم
کہاں ہے تیغ و سپر آفتاب کی بارے — وہ سردمہر ہمارا بھی اب ہوا ہے گرم

---
(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

نہ اتنی دارو پی ظالم کہ اس خمار میں ہوں   مزاج گرم ہے پھر اور یہ دوا ہے گرم

گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر
ولیک مجلس دنیا میں اس کی جا ہے گرم

(۲۸۴)

کرتے ہیں گفتگو سحر اٹھ کر صبا سے ہم   لڑنے لگے ہیں ہجر میں اس کے ہوا سے ہم
ہوتا نہ دل کا تا یہ سرانجام عشق میں   لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم
چھوٹا نہ اس کا دیکھنا ہم سے کسو طرح   پایان کار مارے گئے اس ادا سے ہم
داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر   یہ پھول گل چنا کیے باغ وفا سے ہم
غافل نہ اپنی دیدہ درائی سے ہم کو جان   سب دیکھتے ہیں پر نہیں کہتے حیا سے ہم
دو چار دن تو اور بھی آ تو کراہتہ   اب ہو چکے ہیں روز کی تیری جفا سے ہم

آئینے کی مثال پس از صد شکست میر
کھینچا بغل میں یار کو دست دعا سے ہم

ردیف ن

(۲۸۵)

بےکلی بےخودی کچھ آج نہیں   ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے   اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن   مرض عشق کا علاج نہیں

شہر خوبی کو خوب دیکھا میر
جنس دل کا کہیں رواج نہیں

(۲۸۶)

وحشت میں ہوں بلا گر وادی پر اپنی آؤں   مجنوں کی محنتیں سب میں خاک میں ملاؤں
ہنس کر کبھو بلایا تو برسوں تک رلایا   اس کی ستم ظریفی کس کے تئیں دکھاؤں
فریادی ہوں تو ٹپکے لوہو مری زباں سے   نالے کو بلبلوں کے خاطر میں بھی نہ لاؤں
پوچھو نہ دل کے غم کو ایسا نہ ہووے یاراں   مانند روضہ خواں کے مجلس کے تیں رلاؤں
لگتی ہے آگ تن میں دیکھے سے داغ اس کے   اس دل جلے ہوئے پہ کتنا ہی جی جلاؤں[۱]

(۱) نسخۂ محمود آباد

اک دم تو چونک بھی پڑ شور و فغاں سے میرے — اے بخت خفتہ کب تک تیرے تئیں جگاؤں
از خویش رفتہ ہر دم فکر وصال میں ہوں — کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں
عریاں تنی کی شوخی وحشت میں کیا بلا تھی — تہ گرد کی نہ بیٹھی تا تن کے تیں چھپاؤں
اگلے خطوں نے میرے مطلق اثر نہ بخشا — قاصد کے بدلے اب کے جادو مگر چلاؤں
دل تشنگی نے مارا مجھ کو کہاں مژہ دے — اک قطرہ آب تا میں اس آگ کو بجھاؤں

آسودگی تو معلوم اے میرؔ جیتے جی یاں
آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

(۲۸۷)

سوزش دل سے مفت گلتے ہیں — داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم — بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں — جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں
دم آخر ہے بیٹھ جا مت جا — صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
تیرے بےخود جو ہیں سو کیا چیتیں — ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں
فتنہ درسر بتان حشر خرام — ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں
نظر اٹھتی نہیں کہ جب خوباں — سوتے سے اٹھ کے آنکھ ملتے ہیں
اس سرزلف کا خیال نہ چھوڑ — سانپ کے سر ہی یاں کچلتے ہیں
تھے جو اغیار سنگ سینے کے — اب تو کچھ ہم کو دیکھ ٹلتے ہیں
شمع رو موم کے بنے ہیں مگر — گرم ٹک ملیے تو پگھلتے ہیں

میرؔ صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

(۲۸۸)

آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں — جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں
دوزخ کیا ہے سینہ مرا سوز عشق سے — اس دل جلے ہوئے کے سبب ہوں عذاب میں
مت کر نگاہ خشم یہی موت ہے مری — ساقی نہ زہر دے تو مجھے تو شراب میں
بیدار شور حشر نے سب کو کیا ولے — ہیں خون خفتہ اس کے شہیدوں کے خواب میں
دل لے کے رو بھی ٹک نہیں دیتے کہیں گے کیا — خوبان بد معاملہ یوم الحساب میں
جاکر در طبیب پہ بھی میں گرا ولے — جز آہ ان نے کچھ نہ کیا میرے باب میں

عیش و خوشی ہے شیب میں ہوگو پہ وہ کہاں   ق   لذت جو ہے جوانی کے رنج و عتاب میں
دیں عمر خضر موسم پیری میں تو نہ لے   مرنا ہی اس سے خوب ہے عہد شباب میں
آنکلے تھے جو حضرت میر اس طرف کہیں   ق   میں نے کیا سوال یہ ان کی جناب میں
حضرت سنو تو میں بھی تعلق کروں کہیں   فرمانے لاگے روکے یہ اس کے جواب میں
تو جان لیک تجھ سے بھی آئے جو کل تھے یاں
ہیں آج صرف خاک جہان خراب میں

(۲۸۹)

بے روے و زلف یار ہے رونے سے کام یاں   دامن ہے منھ پہ ابر نمط صبح و شام یاں
آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو   عنقا کے طور زیست ہے اپنی بنام یاں
وصف دہن سے اس کے نہ آگے قلم چلے   یعنی کیا ہے خامے نے ختم کلام یاں
غالب یہ ہے کہ موسم خط واں قریب ہے   آنے لگا ہے متصل اس کا پیام یاں
مت کھا فریب عجز عزیزان حال کا   پنہاں کیے ہیں خاک میں یاروں نے دام یاں
کوئی ہوا نہ دست بسر شہر حسن میں   شاید نہیں ہے رسم جواب سلام یاں
ناکام رہنے ہی کا تمھیں غم ہے آج میر
بہتوں کے کام ہوگئے ہیں کل تمام یاں

(۲۹۰)

نہ گیا خیال زلف سیہ جفاشعاراں   نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں
نہ کہا تھا اے رفوگر ترے ٹانکے ہوں گے ڈھیلے   نہ سیا گیا یہ آخر دل چاک بےقراراں
ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے   نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں
خطر عظیم میں ہیں مری آہ و اشک سے سب   کہ جہان رہ چکا پھر جو یہی ہے باد و باراں
کہیں خاک کو کو اس کی تو صبا نہ دیجو جنبش   کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگر جگر نگاراں
رکھے تاج زر کو سر پر چمن زمانہ میں گل   نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں
نہیں تجھ کو چشم عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ   کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں
تو جہاں سے دل اٹھا یاں نہیں رسم دردمندی   کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں
یہ اجل سے جی چھپانا مرا آشکار ہے گا   کہ خراب ہوگا مجھ بن غم عشق گل عذاراں[1]
یہ سنا تھا میر ہم نے کہ فسانہ خواب لا ہے
تری سرگذشت سن کر گئے اور خواب یاراں

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۲۹۱)

اس کے کوچے سے جو اٹھ اہل وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقت خوش ان کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو
در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

جائے گی طاقت پا آہ تو کریے گا کیا
اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں

ایک بیمار جدائی ہوں میں آپھی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

غیر کی تیغ زباں سے تری مجلس میں تو ہم
آکے روز ایک نیا زخم اٹھا جاتے ہیں

عرض وحشت نہ دیا کر تو بگولے اتنی
اپنی وادی پہ کبھو یار بھی آجاتے ہیں

میرؔ صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں لیک
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

(۲۹۲)

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں

عشق آتش بھی جو دیوے تو نہ دم ماریں ہم
شمع تصویر ہیں خاموش جلا کرتے ہیں

جائے ہی نہ مرض دل تو نہیں اس کا علاج
اپنے مقدور تلک ہم تو دوا کرتے ہیں

اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر
شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں

رخصت جنبش لب عشق کی حیرت سے نہیں
مدتیں گذریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعوی مہر
دل ہیں پتھر کے انھوں کے جو وفا کرتے ہیں

تجھ سے لگ جاکے یہ یوں جاتے رہیں مجھ سے حیف
دیدہ و دل نے نہ جانا کہ دغا کرتے ہیں

فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

مجلس حال میں موزوں حرکت شیخ کی دیکھ
حیز شرعی بھی دم رقص مزہ کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں

محض ناکارہ بھی مت جان ہمیں تو کہ کہیں
ایسے ناکام بھی بیکار پھرا کرتے ہیں

تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم
کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں

کیا کہیں میرؔ جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

(۲۹۳)

مستوجب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں　　ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرم وفا ہوں
آتے ہیں مجھے خوب سے دونوں ہنر عشق　　رونے کے تئیں آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں
اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں　　ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردود صبا ہوں
ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک　　از بس کہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
آیا کوئی بھی طرح مرے چین کی ہوگی　　آزردہ ہوں جینے سے میں مرنے سے خفا ہوں[1]
دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر　　ہوں خاک سر راہ کوئی دم میں ہوا ہوں
دل‌خواہ جلا اب تو مجھے اے شب ہجراں　　میں سوختہ بھی منتظر روز جزا ہوں
گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب　　بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں
اتنا ہی مجھے علم ہے کچھ میں ہوں بہر چیز　　معلوم نہیں خوب مجھے بھی کہ میں کیا ہوں
بہتر ہے غرض خامشی ہی کہنے سے یاراں　　مت پوچھو کچھ احوال کہ مر مر کے جیا ہوں[2]
تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر　　جوں شمع سر شام سے تا صبح جلا ہوں

سینہ تو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقت دعا میرؔ کہ اب دل کو لگا ہوں

(۲۹۴)

جنس گراں کو تجھ سے جو لوگ چاہتے ہیں　　وے روگ اپنے جی کو ناحق بساہتے ہیں
اس میکدے میں ہم بھی مدت سے ہیں ولیکن　　خمیازہ کھینچتے ہیں ہر دم جماہتے ہیں
ناموس دوستی سے گردن بندھی ہے اپنی　　جیتے ہیں جب تلک ہم تب تک نباہتے ہیں
سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری　　جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بے ڈول میرؔ صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

(۲۹۵)

یہ ترک ہو کے خشن کج اگر کلاہ کریں　　تو بوالہوس نہ کبھو چشم کو سیاہ کریں
تمھیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا　　ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں
رکھا ہے اپنے تئیں روک روک کر ورنہ　　سیاہ کردیں زمانے کو ہم جو آہ کریں
جو اس کی اور کو جانا ملے تو ہم بھی ضعیف　　ہزار سجدے ہر اک گام سربراہ کریں

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمودآباد

ہوائے میکدہ یہ ہے تو فوت وقت ہے ظلم — نماز چھوڑ دیں اب کوئی دن گناہ کریں
ہمیشہ کون تکلف ہے خوب رویوں کا — گذار ناز سے ایدھر بھی گاہ گاہ کریں
اگر اٹھیں گے اسی حال سے تو کہیو تو — جو روز حشر تجھی کو نہ عذر خواہ کریں
بری بلا ہیں ستم کشتۂ محبت ہم — جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں
اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی ہیں ہم بھی میرؔ
ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں

(۲۹۶)

راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں — اکثر نہیں تو تجھ کو میں گاہ گاہ دیکھوں
جی انتظار کش ہے آنکھوں میں رہگذر پر — آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں
آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری — حسرت یہ تھی کہ اس کو میں اک نگاہ دیکھوں
یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا تھا تجھ کو بستے — کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں
دیکھوں تو چاند اب کا گذرے ہے مجھ کو کیسا — دل ہے کہ تیرے منھ پر بے مہر ماہ دیکھوں
بخت سیہ تو اپنے رہتے ہیں خواب ہی میں — اے رشک یوسف مصر پھر کس کو چاہ دیکھوں[1]
چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں — کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں
آنکھیں تو تو نے دی ہیں اے جرم بخش عالم — کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں
تاریک ہو چلا ہے آنکھوں میں میری عالم — ہوتا ہے کیونکے دل بن میرا تباہ دیکھوں[2]
مرنا ہے یا تماشا ہر اک کی ہے زباں پر — اس مچلے کو چل کر میں خوانخواہ دیکھوں
دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے — ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھوں
ہوں میں نگاہ بسمل گو اک مژہ تھی فرصت
تا میرؔ روئے قاتل تا قتل گاہ دیکھوں

(۲۹۷)

مشہور ہیں دلوں کی مرے بے قراریاں — جاتی ہیں لامکاں کو دل شب کی زاریاں
چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش — اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں
سو بار ہم نے گل کے گئے پر چمن کے بیچ — بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں
کشتے کی اس کے خاک بھرے جسم زار پر — خالی نہیں ہیں لطف سے لوہو کی دھاریاں
تربت سے عاشقوں کے نہ اٹھا کبھو غبار — جی سے گئے ولے نہ گئیں رازداریاں
اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو رویئے — تھیں ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب
روتے گذرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر
کاٹیں تھیں کوہکن نے بہت راتیں بھاریاں

(۲۹۸)

گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخ زشت میں
ان صورتوں کو صرف کرے خاک و خشت میں

رکھتا ہے سوز عشق سے دوزخ میں روز و شب
لے جائے گا یہ سوختہ دل کیا بہشت میں

آسودہ کیونکے ہوں میں کہ مانند گردباد
آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

کب تک خراب سعی طواف حرم رہوں
دل کو اٹھا کے بیٹھ رہوں گا کنشت میں

ماتم کے ہوں زمین پہ خرمن تو کیا عجب
ہوتا ہے نیل چرخ کی اس سبز کشت میں

سرمست ہم ہیں آنکھوں کے دیکھے سے یار کی
کب یہ نشہ ہے دختر رز تجھ پلشت میں

رندوں کے تیں ہمیشہ ملامت کرے ہے تو
آجائیو نہ شیخ کہیں ہشت بھشت میں[۱]

نامے کو چاک کرکے کرے نامہ بر کو قتل
کیا یہ لکھا تھا میر مری سرنوشت میں

(۲۹۹)

درد و اندوہ میں ٹھہرا جو رہا میں ہی ہوں
رنگ رو جس کے کبھو منھ نہ چڑھا میں ہی ہوں

جس پہ کرتے ہو سدا جور و جفا میں ہی ہوں
پھر بھی جس کو ہے گماں تم سے وفا میں ہی ہوں[۲]

بد کہا میں نے رقیبوں کو تو تقصیر ہوئی
کیوں ہے بخشو بھی بھلا سب میں برا میں ہی ہوں

اپنے کوچے میں فغاں جس کی سنو ہو ہر رات
وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلایا
اس بیاباں میں وہ آبلہ پا میں ہی ہوں

لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تاب جفا
اتنا عالم ہے بھرا جاؤ نہ کیا میں ہی ہوں

رک کے جی ایک جہاں دوسرے عالم کو گیا
تن تنہا نہ ترے غم میں ہوا میں ہی ہوں[۳]

اس ادا کو تو ٹک اک سیر کر انصاف کرو ق
وہ برا ہے گا بھلا دوستو یا میں ہی ہوں

میں یہ کہتا تھا کہ دل جن نے لیا کون ہے وہ
یک بیک بول اٹھا اس طرف آ میں ہی ہوں

جب کہا میں نے کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا
کیا کرے گا تو مرا دیکھوں تو جا میں ہی ہوں

---
(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

سنتے ہی ہنس کے ٹک اک سوچیو کیا تو ہی تھا   جن نے شب رو کے سب احوال کہا میں ہی ہوں
میر آوارۂ عالم جو سنا ہے تو نے   خاک آلودہ وہ اے باد صبا میں ہی ہوں

کاسۂ سر کو لیے مانگتا دیدار پھرے
میر وہ جان سے بیزار گدا میں ہی ہوں

(۳۰۰)

نکلے ہے جنس حسن کسی کاروان میں   یہ وہ نہیں متاع کہ ہو ہر دکان میں
جاتا ہے اک ہجوم غم عشق جی کے ساتھ   ہنگامہ لے چلے ہیں ہم اس بھی جہان میں
یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے   یک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں
ہم اس سے آہ سوز دل اپنا نہ کہہ سکے   تھے آتش دروں سے پھپھولے زبان میں
غم کھینچنے کو کچھ تو توانائی چاہیے   ق   سویاں نہ دل میں تاب نہ طاقت ہے جان میں
غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے   ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں
وے دن گئے کہ آتش غم دل میں تھی نہاں   سوزش رہے ہے اب تو ہر اک استخوان میں
دل نذر و دیدہ پیش کش اے باعث حیات   سچ کہہ کہ جی لگے ہے ترا کس مکان میں
کھینچا نہ کر تو تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم   ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبان صبر میر
کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

(۳۰۱)

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں   بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
نہ کھول اے یار میرا گور میں منھ   کہ حسرت ہے مری جاگہ کفن میں
رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے   نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں
جلے دل کی مصیبت اپنے سن کر   لگی ہے آگ سارے تن بدن میں
نہ تجھ بن ہوش میں ہم آئے ساقی   مسافر ہی رہے اکثر وطن میں
خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ   گذرتی خوب تھی دیوانہ پن میں
کہاں کے شمع و پروانے گئے مر   بہت آتش بجاں تھے اس چمن میں
کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں   ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

گداز عشق میں بہ بھی گیا میر
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

(۳۰۲)

جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں   اس راہ میں وے جیسے انجان نکلتے ہیں
کیا تیرستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے   جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے   دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں
گہ لوہو ٹپکتا ہے گہ لخت دل آنکھوں سے   ق   یا ٹکڑے جگر ہی کے ہر آن نکلتے ہیں
کریے تو گلہ کس سے جیسی تھی ہمیں خواہش   اب ویسے ہی یہ اپنے ارمان نکلتے ہیں
جاگہ سے بھی جاتے ہو منھ سے بھی خشن ہوکر   ق   وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں
سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے   برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

ان آئینہ رویوں کے کیا میرؔ بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

(۳۰۳)

تو گلی میں اس کی جا آ و لے اے صبا نہ چنداں   کہ گڑے ہوئے پھر اکھڑیں دل چاک دردمنداں
ترے تیر ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم   مگر آہنی توے ہیں جگر نیازمنداں
کبھو زلف سے بتاں کی نہ ہوا رہا میں ہرگز   یہی ہیں شکارخستہ یہی عنبریں کمنداں
تبھی کوند کوند اتنا تو زمیں سے جائے مل مل   نہیں دیکھے برق تونے دم خندہ اس کے دنداں
میں صفا کیا دل اتنا کہ دکھائی دیوے منھ بھی   و لے مفت اس آئینے کو نہیں لیتے خود پسنداں
کھلیں آنکھیں میں جو دیکھا سو غم اور چشم گریاں   کسے کہتے ہیں نہ جانا دل شاد و روے خنداں

تو زبوں شکار تو تھا و لے میرؔ قتل گہ میں
ترے خوں سے ہیں حنائی کف پاے صید بنداں

(۳۰۴)

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں   اس غم کدے میں آہ دل خوش کہیں نہیں
کرتا ہے ابر دعوی دریادلی عبث   دامن نہیں مرا تو مری آستیں نہیں
آگے تو لعل نو خط خوباں کے دم نہ مار   ہر چند اے مسیح وے باتیں رہیں نہیں
یہ درد اس کے کیونکے کروں دل نشیں کہ آہ   کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں
ماتھا کیا ہے صرف سجود در بتاں   مانند ماہ نو کے مری اب جبیں نہیں
کہتا ہوں حال دل تو کہے ہے کہ مت بکے   کیوں نئیں تری تو بات مرے دل نشیں نہیں[1]

(۱) نسخہ محمود آباد

گھر گھر ہے ملک عشق میں دوزخ کی تاب وتب — بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش یوہیں نہیں
ضائع کیا میں اپنے تئیں تونے کی خوشی — بے مہر کیونکے جانیے تجھ میں کہ کیں نہیں[1]

فکر بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر یک سے میر خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

(۳۰۵)

دعوے کو یار آگے معیوب کرچکے ہیں — اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کرچکے ہیں
مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو — اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کرچکے ہیں
حسن کلام کھینچے کیونکر نہ دامن دل — اس کام کو ہم آخر محبوب کرچکے ہیں
ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں جو ہوگا — ہم اس طرح کے کتنے آشوب کرچکے ہیں
رنگ پریدہ قاصد بادسحر کبوتر — کس کس کے ہم حوالے مکتوب کرچکے ہیں
تنکا نہیں رہا ہے کیا اب نثار کریے — آگے ہی ہم تو گھر کو جاروب کرچکے ہیں
ہر لحظہ ہے تزاید رنج و غم و الم کا — غالب کہ طبع دل کو مغلوب کرچکے ہیں[2]

کیا چاہیے کہ کیا ہے اے میر وجہ ضد کی
سو بار ہم تو اس کو محجوب کرچکے ہیں

(۳۰۶)

جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں — ہو گر شریف مکہ مسلمان ہی نہیں
وہ ترک صید پیشہ مرا قصد کیا کرے — دبلے پنے سے تن میں مرے جان ہی نہیں
خال و خط ایسے فتنے نگاہیں یہ آفتیں — کچھ اک بلا وہ زلف پریشان ہی نہیں
ہیں جزو خاک ہم تو غبار ضعیف سے — سر کھینچنے کا ہم کنے سامان ہی نہیں
دیکھی ہو جس نے صورت دلکش وہ ایک آن — پھر صبر اس سے ہو سکے امکان ہی نہیں
خورشید و ماہ و گل سبھی اودھر رہے ہیں دیکھ — اس چہرے کا اک آئینہ حیران ہی نہیں
یکساں ہے تیرے آگے جو دل اور آرسی — کیا خوب و زشت کی تجھے پہچان ہی نہیں
سجدہ اس آستاں کا نہ جس کے ہوا نصیب — وہ اپنے اعتقاد میں انسان ہی نہیں

کیا تجھ کو بھی جنوں تھا کہ جامے میں تیرے میر
سب کچھ بجا ہے ایک گریبان ہی نہیں

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

(۳۰۷)

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی — اہل نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے — ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں
یارب کسے ہے ناقہ ہر غنچہ اس چمن کا — راہ وفا کو ہم تو مسدود جانتے ہیں
یہ ظلم بے نہایت دشوار تر کہ خوباں — بد وضعیوں کو اپنی محمود جانتے ہیں
کیا جانے داب صحبت از خویش رفتگاں کا — مجلس میں شیخ صاحب کچھ کود جانتے ہیں
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میرؔ مفت ہے وہ
جی کے زیاں کو بھی ہم سود جانتے ہیں

(۳۰۸)

تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں
جب لے نقاب منھ پر تب دید کر کہ کیا کیا — در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے حجابیاں ہیں
چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
جی بکھرے دل ڈھہے ہے سر بھی گرا پڑے ہے — خانہ خراب تجھ بن کیا کیا خرابیاں ہیں
مہمان میرؔ مت ہو خوان فلک پہ ہرگز
خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

(۳۰۹)

سن گوش دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں — مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں
اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغباں — اطراف باغ ہوں گے پڑے مشت پر کہیں
خطرے سے ہونٹ سوکھ ہی جاتے تھے دیکھ کر — آتا نظر ہمیں جو کوئی چشم تر کہیں(۱)
عاشق ترے ہوئے تو ستم کچھ نہ ہوگیا — مرنا پڑا ہے ہم کو خدا سے تو ڈر کہیں
کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں — ق — آشفتہ طبع میرؔ کو پایا اگر کہیں
سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو — جاتا تھا اضطراب زدہ سا ادھر کہیں
لگ چل کے میں برنگ صبا یہ اسے کہا — کاے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں
آشفتہ جا بہ جا جو پھرے ہے تو دشت میں — جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں

(۱) نسخۂ محمود آباد

خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر　　رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدنظر کہیں
آسودگی سی جنس کو کرتا ہے کون سوخت　　جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف　　یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لخت جگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی　　اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں
کہنے لگا وہ ہو کے پرآشفتہ یک بیک　　مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں
آوارگوں کا ننگ ہے سننا نصیحتیں　　مت کہیو ایسی بات تو بار دگر کہیں
تعیین جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد　ق　کہتا تھا ایک روز یہ اہل نظر کہیں
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اٹھا　　کرتا ہے جائے باش کوئی رہگذر کہیں

کتنے ہی آئے لے کے سر پر خیال پر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں ان کا اثر کہیں

(۳۱۰)

اب کچھ ہمارے حال پہ تم کو نظر نہیں　　یعنی تمھاری ہم سے وے آنکھیں نہیں رہیں

اس بزم کے چراغ بجھے تھے جو یار میرؔ
ان کے فروغ باغ میں گل ہیں کہیں کہیں

(۳۱۱)

پلکوں سے ترے شائق ہم سر جو پٹکتے ہیں　　ہر دم جگروں میں کچھ کانٹے سے کھٹکتے ہیں
میں پھاڑ گریباں کو درویش ہوا آخر　　وے ہاتھ سے دامن کو اب تک بھی جھٹکتے ہیں
یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی　　آنسو مری پلکوں سے تارے سے چھٹکتے ہیں
کی راہبری میری صحراے محبت میں　　یاں حضرت خضر آپھی مدت سے بھٹکتے ہیں
جاتے نہ کوئی دیکھا اس تیغ کے منھ اوپر　　واں میان سے وہ لے ہے یاں یار سٹکتے ہیں
کیا تم کو اچنبھا ہے سختی کا محبت میں　　دشوار ہی ہوتا ہے دل جن کے اٹکتے ہیں

تو طرۂ جاناں سے چاہے ہے ابھی مقصد
برسوں سے پڑے ہم تو اے میرؔ لٹکتے ہیں

(۳۱۲)

سب خوبیاں ہیں شیخ مشیخت پناہ میں　　پر ایک حیلہ سازی ہے اس دستگاہ میں
مانند شمع ہم نے حضور اپنے یار کے　　کار وفا تمام کیا ایک آہ میں
میں صید جو ہوا تو ندامت اسے ہوئی　　یک قطرہ خون بھی نہ گرا صیدگاہ میں
پہنچے نہیں کہیں کہ نہیں واں سے اٹھ چلے　　القصہ ایک عمر سے ہم ہیں گے راہ میں

نکلا تھا آستیں سے کل منچے کا ہاتھ
بہتوں کے خرقے چاک ہوئے خانقاہ میں

بخت سیہ تو دیکھ کہ ہم خاک میں ملے
سرمے کی جاے ہو تری چشم سیاہ میں

بیٹھے تھے میر یار کے دیدار کو سو ہم
اپنا یہ حال کرکے اٹھے یک نگاہ میں

(۳۱۳)

کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں
کہا کہ ایسے تو میں مفت مار لایا ہوں

کہے تو نخل صنوبر ہوں اس چمن میں میں
کہ سر سے پاؤں تلک دل ہی بار لایا ہوں

جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دلخواہ
پہ نوح کے سے تو طوفاں ہزار لایا ہوں

نہ تنگ کر اسے اے فکر روزگار کہ میں
دل اس سے دم کے لیے مستعار لایا ہوں

کسی سے مانگا ہے میں آج تک کہ جی لیوے
یہ احتیاج تجھی تک اے یار لایا ہوں[1]

پھر اختیار ہے آگے ترا یہ ہے مجبور
کہ دل کو تجھ تئیں بے اختیار لایا ہوں

یہ جی جو میرے گلے کا ہے ہار تو ہی لے
ترے گلے کے لیے میں یہ ہار لایا ہوں

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

(۳۱۴)

جفائیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

تری گلی سے سدا اے کشندۂ عالم
ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

گیا نظر سے جو وہ گرم طفل آتش باز
ہم اپنے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھیں

ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ
عزیز دوست سبھوں کی جدائیاں دیکھیں

ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا
جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمائیاں دیکھیں

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اس جنگ جو سے ہرگز میر
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

(۳۱۵)

خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں
سرو و قمری شکار ہوتے ہیں

تیرے بالوں کے وصف میں میرے
شعر سب پیچ دار ہوتے ہیں

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

آؤ یادِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ — یہ تغافل شعار ہوتے ہیں
دیکھ لیویں گے غیر کو تجھ پاس — صحبتوں میں بھی یار ہوتے ہیں
صدقے ہولیویں ایک دم تیرے — پھر تو تجھ پر نثار ہوتے ہیں
تو کرے ہے قرار ملنے کا — ہم ابھی بے قرار ہوتے ہیں[1]
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
رفتہ رفتہ یہ طفل خوش ظاہر — فتنۂ روزگار ہوتے ہیں
اس کے نزدیک کچھ نہیں عزت
میرؔ جی یوں ہی خوار ہوتے ہیں

(۳۱۶)

وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں — سارے تیرا خیال رکھتے ہیں
شب جو وہ مہ کبھو رہے ہے یاں — مدتوں یاد سال رکھتے ہیں
ان لبوں کا جواب وہ ہے لعل — ہم تجھی سے سوال رکھتے ہیں
گل ترے روزگار خوبی میں — منھ طمانچوں سے لال رکھتے ہیں
دہن تنگ کے ترے مشتاق — آرزوے محال رکھتے ہیں
خاکِ آدم ہی ہے تمام زمیں — پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں
یہ جو سر کھینچے تو قیامت ہے — دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں
اہل دل چشم سب تری جانب — آئینے کی مثال رکھتے ہیں
گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ
میرؔ جی بھی کمال رکھتے ہیں

(۳۱۷)

صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوش دلی کا غم کروں — اس میں حیراں ہوں بہت کس کس کا میں ماتم کروں
موسم حیرت ہے دل بھر کر تو رونا مل چکا — اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کروں
ہوں سیہ مست سر زلف صنم معذور رکھ — شیخ اگر کعبے سے آوے گفتگو درہم کروں
ریزۂ الماس یا مشت نمک ہے کیا برا — جو میں اپنے ایسے زخم سینہ کو مرہم کروں
گرچہ کس گنتی میں ہوں پر ایک دم مجھ تک تو آ — یا ادھر ہوں یا ادھر کب تک شمار دم کروں
بس بہت رسوا ہوا میں اب نہیں مقدور کچھ — وہ طرح ڈھونڈوں ہوں جس میں ربط تجھ سے کم کروں

(۱) نسخۂ محمود آباد

گودھواں اٹھنے لگا دل سے مرے پر پیچ و تاب
میر اس پر قطع ربط زلف خم در خم کروں

(۳۱۸)

کیا میں نے رو کر فشار گریباں   رگ ابر تھا تار تار گریباں
کہیں دست چالاک ناخن نہ لاگے   کہ سینہ ہے قرب و جوار گریباں
نشاں اشک خونیں کے اڑتے چلے ہیں   خزاں ہو چلی ہے بہار گریباں
جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے   نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں
زیارت کروں دل سے خستہ جگر کی   کہاں ہوگی یارب مزار گریباں
کہیں جائے یہ دور دامن بھی جلدی ق   کہ آخر ہوا روزگار گریباں
پھروں میر عریاں نہ دامن کا غم ہو
نہ باقی رہے خار خار گریباں

(۳۱۹)

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں   طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں   رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں
ظل حق ہم کو بھی دوہیں چاہیے   جوں ہماری ہوتی ہیں پرچھائیاں
اس مژہ برہم زدہ نے بارہا   عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں
نونہال آگے ترے ہیں جیسی ہوں   ڈالیاں ٹوٹی ہوئیں مرجھائیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی کی   آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیش یار   دل میں شکلیں سینکڑوں ٹھہرائیاں
رذیت اپنی اس گلی میں کم نہیں   ہر جگہ ہر بار ماریں کھائیاں
بوسہ لینے کا کیا جس دم سوال   ان نے باتیں ہی ہمیں بتلائیاں
روکشی کو اس کی منہ بھی چاہیے   ماہ کے چہرے پہ ہیں سب جھائیاں
مضطرب ہوکر کیا سب میں سبک   دل نے آخر خفتیں دلوائیاں
چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش   ناز تا کے چند بے پروائیاں
شوق قامت میں ترے اے نونہال   گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر اب
دور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

(۳۲۰)

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں — اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ٹک سن کہ سو برس کی ناموس خامشی کھو — دو چار دل کی باتیں اب منھ پر آئیاں ہیں
ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیری — ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں
آئینہ ہو کہ صورت معنی سے ہے لبالب — راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں
کیا چہرہ تجھ سے ہوگا اے آفتاب طلعت — منھ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو جھائیاں ہیں[1]

کعبے میں میر ہم پر یا سرگراں ہے زاہد
یا بتکدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

(۳۲۱)

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں — اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریاے سخن پر — صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح — میں شانہ صفت سایہ رو زلف بتاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا — میں باعث آشفتگی طبع جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی — میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیر زباں ہوں
ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے — اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں — درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم — اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھے مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

(۳۲۲)

اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں — نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں
جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں
گہے داغ رہتا ہے دل گہ جگر خوں — ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم — ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں
لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو — گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ   اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں
کہاں تک بھلا روؤگے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

(۳۲۳)

بہت ہی اپنے تئیں ہم تو خوار پاتے ہیں   وہ کوئی اور ہیں جو اعتبار پاتے ہیں
تری گلی میں میں رویا تھا دل جلا یک شب   ہنوز واں سے دل داغدار پاتے ہیں
نہ ہوویں شیفتہ کیوں اضطراب پر عاشق   کہ جی کو کھوکے دل بے قرار پاتے ہیں
گلہ عبث ہے تری آستانہ بوسی کا   مسیح و خضر بھی واں کم ہی بار پاتے ہیں
تڑپ ہے قیس کے دل میں تہ زمیں اس سے   ق   غزال دشت نشان مزار پاتے ہیں
وگرنہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں   کسی کا بھی کہیں مشت غبار پاتے ہیں
شتابی آوے اجل میر جاوے یہ رونا
کہ میرے شور سے تصدیع یار پاتے ہیں

(۳۲۴)

عام حکم شراب کرتا ہوں   محتسب کو کباب کرتا ہوں
ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو   تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں
بحث کرتا ہوں ہو کے ابجد خواں   کس قدر بے حساب کرتا ہوں[۱]
کوئی بجھتی ہے یہ بھڑک میں عبث   تشنگی پر عتاب کرتا ہوں
سر تلک آب تیغ میں ہوں غرق   اب تئیں آب آب کرتا ہوں
جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

(۳۲۵)

ہم تو مطرب پسر کے جاتے ہیں   گو رقیباں کچھ اور گاتے ہیں
خاک میں لوٹتے تھے کل تجھ بن   آج لوہو میں ہم نہاتے ہیں
اے عدم ہونے والو تم تو چلو   ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں
ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب   تیری پشتی سے سو سناتے ہیں
دیدہ و دل کا کیا کیا تھا میں   ق   روز آفت جو مجھ پہ لاتے ہیں[۲]

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

کوئی رووے ہے کوئی تڑپے ہے   کیا کروں میرے گھر سے آتے ہیں (۱)
ورنہ میں میر ہوں مرے آگے   دشت غم بھی نہ ٹکنے پاتے ہیں (۲)
کھود گاڑوں زمیں میں دونوں کو   گرچہ یہ آسماں پہ جاتے ہیں (۳)
دیدہ و دل شتاب گم ہوں میر
سر پہ آفت ہمیشہ لاتے ہیں

(۳۲۶)

آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں   پھر آپھی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
پروانہ پھر نہ شمع کی خاطر جلا کرے   گر بزم میں یہ اپنا ترا ماجرا کہوں
مت کر خرام سر پہ اٹھالے گا خلق کو   بیٹھا اگر گلی میں ترا نقش پا کہوں
دل اور دیدہ باعث ایذا و نور عین   کس کے تئیں برا کہوں کس کو بھلا کہوں
آوے سموم جاے صبا باغ سے سدا   گرشمہ اپنے سوز جگر کا میں جا کہوں
جاتا ہوں میر دشت جنوں کو میں اب یہ کہہ
مجنوں کہیں ملے تو تری بھی دعا کہوں

(۳۲۷)

مرے آگے نہ شاعر نام پاویں   قیامت کو مگر عرصے میں آویں
پری سمجھے تجھے وہم و گماں سے   کہاں تک اور ہم اب دل چلاویں
ترے عاشق ترے رسوا کہائے   ترے ہوکر کہہ اب کس کے کہاویں (۴)
مزاج اپنا غیور ازبس پڑا ہے   ترے غم میں کسے خاطر میں لاویں
پھرے ہے شیخ مجلس ہی میں رقصاں   ادھر آنکلے تو ہم بھی نچاویں
نظر اے ابر اب مت آ مبادا   کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں
قدم بوسی تلک مختار ہیں غیر   زیادہ لگ چلیں تو سر میں کھاویں
نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی   ق   بغیر اس کے ملے دنیا سے جاویں
چلی ہے تو تو اے جان الم ناک   ٹک اک رہ جا کہ ہم رخصت ہو آویں
چلا مقدور سے غم میر آگے
زمیں پھٹ جائے یارب ہم سماویں

(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد

(۳۲۸)

مثال سایہ محبت میں جال اپنا ہوں تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں
سرشک سرخ کو جاتا ہوں جو پیے ہر دم لہو کا پیاسا علی الاتصال اپنا ہوں
اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں لیک برنگ مے عرق انفعال اپنا ہوں
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں
ہوئی ہے زندگی دشوار مشکل آساں کر پھروں چلوں تو ہوں پر میں وبال اپنا ہوں
ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں

بلا ہوئی ہے مری گوکہ طبع روشن میر
ہوں آفتاب ولیکن زوال اپنا ہوں

(۳۲۹)

کھودیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں
کیا آگ دے کے طور کو کی ترک سرکشی اس شعلے کی وہی ہیں شرارت کی بانیاں
صحبت رکھا کیا وہ سفیہ و ضلال سے دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
ہم سے تو کینے ہی کی ادائیں چلی گئیں بے لطفیاں یہی یہی نامہربانیاں
تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں
گالی سوائے مجھ سے سخن مت کیا کرو اچھی لگے ہیں مجھ کو تری بدزبانیاں
غیروں ہی کے سخن کی طرف گوش یار تھے اس حرف ناشنو نے ہماری نہ مانیاں
یہ بےقراریاں نہ کبھو ان نے دیکھیاں جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں ان نے میر
کیا خاک میں ملائیں مری جاں فشانیاں

(۳۳۰)

تا پھونکیے نہ خرقۂ طامات کے تئیں حسن قبول کیا ہو مناجات کے تئیں
کیفیتیں اٹھے ہیں یہ کب خانقاہ میں بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں
ذریے خرام ناز سے خوباں کے ہمنشیں ٹھوکر سے یہ اٹھاتے ہیں آفات کے تئیں
ہم جانتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ کہیے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں
خوبی کو اس کے ساعد سیمیں کی دیکھ کر صورت گروں نے کھینچ رکھا ہات کے تئیں
اتنی بھی حرف ناشنوی غیر کے لیے رکھ کان ٹک سنا بھی کرو بات کے تئیں

سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط   کب عاشقی میں پوچھتے ہیں ذات کے تئیں
آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر   کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

آنکھوں نے میر صاحب و قبلہ ورم کیا
حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

(۳۳۱)

نہ اک یعقوبؑ رویا اس الم میں   کنواں اندھا ہوا یوسفؑ کے غم میں
کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میری   نظر آوے ہی گا اب کوئی دم میں

دیا عاشق نے جی تو عیب کیا ہے
یہی میر اک ہنر ہوتا ہے ہم میں

(۳۳۲)

چاہتے ہیں یہ بتاں ہم پہ کہ بیداد کریں   کس کے ہوں کس سے کہیں کس کنے فریاد کریں
ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں   وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں
کعبہ ہوتا ہے دوانوں کا مری گور سے دشت   مجھ سے دو اور گڑیں یاں تو سب آباد کریں
ہم تو راہب نہیں ہیں واقف رسم سجدہ   ہیں کدھر شیخ حرم کچھ ہمیں ارشادکریں

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیے اہل سخن میر کو استاد کریں

(۳۳۳)

ہجراں کی کوفت کھینچے بے دم سے ہو چلے ہیں   سر مار مار یعنی اب ہم بھی سو چلے ہیں
جوئیں رہیں گی جاری گلشن میں ایک مدت   سائے میں ہر شجر کے ہم زور رو چلے ہیں
لبریز اشک آنکھیں ہر بات میں رہا کیں   رو رو کے کام اپنے سب ہم ڈبو چلے ہیں
پچھتایئے نہ کیونکر جی اس طرح سے دے کر   یہ گوہر گرای ہم مفت کھو چلے ہیں

قطع طریق مشکل ہے عشق کا نہایت
وے میر جانتے ہیں اس راہ جو چلے ہیں

(۳۳۴)

جب دردِدل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں   کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں
شاید نکل بھی آوے دل گم جو ہوگیا ہے   اس کی گلی میں بیٹھا میں خاک چھانتا ہوں

اس دردسر کا لکّا سر سے لگا ہے میرے
سو سر کا ہووے صندل میں میر مانتا ہوں

(۳۳۵)

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

بوے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلہ نہیں

نالے کیا نہ کر سنا نوحے مرے پہ عندلیب
بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں

خواب خوش سحر سے شوخ تجھ کو صبا جگا گئی
مجھ پہ عبث ہے بے دماغ میں نے تو کچھ کہا نہیں[1]

چشم سفید و اشک سرخ آہ دل حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے مے نہیں ابر نہیں ہوا نہیں

ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلاے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

آب و ہواے ملک عشق تجربہ کی ہے میں بہت
کر کے دواے درد دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

ہووے زمانہ کچھ سے کچھ چھوٹے ہے دل لگا مرا
شوخ کسی ہی آن میں تجھ سے تو میں جدا نہیں

ناز بتاں اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر
کعبے میں جا کے بیٹھ میاں تیرے مگر خدا نہیں

(۳۳۶)

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں
آرزوے جہان ہوتے ہیں

گوش دیوار تک تو جا نالے
اس میں گل کو بھی کان ہوتے ہیں

کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن
گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں

دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستان ہوتے ہیں

حرف تلخ ان کے کیا کہوں میں غرض
خوبرو بدزبان ہوتے ہیں[2]

غمزۂ چشم خوش قدان زمیں
فتنۂ آسمان ہوتے ہیں

کیا رہا ہے مشاعرے میں اب ق
لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں

میر و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے اک یہ جوان ہوتے ہیں

(۳۳۷)

تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

اک زخم کو میں ریزۂ الماس سے چیرا
دل پر ابھی جراحت نوکار بہت ہیں

(۳۳۸)

کچھ انکھڑیاں ہی اس کی نہیں اک بلا کہ بس — دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر — فرمادے ٹک زباں سے تو پھر یار بہت ہیں
کوئی تو زمزمہ کرے میرا سا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

(۳۳۹)

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں — نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
گریباں شور محشر کا اڑایا دھجیاں کرکر — فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ بل بے تیری ہتھ بلیاں
تفاوت کچھ نہیں شیرین و شکر اور یوسف میں — سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی ہیں ڈلیاں
ترے غمزے نے جو ظلم سے آنکھیں غزالوں کی — بیاباں میں دکھا مجنوں کو پاؤں کے تلے ملیاں
چمن کو آج مارا ہے یہاں تک رشک گل رونے — کہ بلبل سر پٹکتی ہے نہیں منھ کھولتیں کلیاں
مری آہ سحر کی برچھیاں سختی کی تڑپوں پر — نگاہیں کرکے گر پڑتی ہیں بجلی کی بھی اچپلیاں
صنم کی زلف میں کوچہ ہے سربستہ ہر اک مو پر — نہ دیکھی ہوں گی تونے خضر یہ ظلمات میں گلیاں
دوانہ ہوگیا تو میر آخر ریختے کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(۳۴۰)

ایسے محروم گئے ہم تو گرفتار چمن — کہ موئے قید میں دیوار بہ دیوار چمن
سینے پر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم — یہ بھی تختہ کبھو ہووے گا سزاوار چمن
باغباں باغ اجارے ہی اگر دیتا تھا — تھے زر داغ سے ہم بھی تو خریدار چمن
وے گنہگار ہمیں ہیں کہ جنھیں کہتے ہیں — عاشق زار چمن مرغ گرفتار چمن
خون ٹپکے ہے پڑا نوک سے ہر یک کی ہنوز — کس ستم دیدہ کی مژگاں ہیں تہ خار چمن
باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر — عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکار چمن
کم نہیں ہے دل پر داغ بھی اے مرغ اسیر — گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلبگار چمن
گل پہ ایسی تو پڑی اوس خزاں میں کہ نسیم — سرد ہی ہوگئی واں گرمی بازار چمن
کیا جزا ٹھہرتی ہے دیکھیے کل حشر کو میر
داغ ہر ایک مرے دل پہ ہے خوں وار چمن

(۳۴۱)

بزم میں جو ترا ظہور نہیں   شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے لاؤں ایک   یاد رہتی ترے حضور نہیں
خوب پہچانتا ہوں تیرے تئیں   اتنا بھی تو میں بےشعور نہیں(۱)
قتل ہی کر کہ اس میں راحت ہے   لازم اس کام میں مرور نہیں(۲)
فکر مت کر ہمارے جینے کا   ق   تیرے نزدیک کچھ یہ دور نہیں
پھر جئیں گے جو تجھ سا ہے جاں بخش   ایسا جینا ہمیں ضرور نہیں
عام ہے یار کی تجلی میر
خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

(۳۴۲)

دامن پہ تیرے گرد کا کیونکر اثر نہیں   ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں
اتنا رقیب خانہ برانداز سے سلوک   جب آنکلتے ہیں تو سنے ہیں کہ گھر نہیں
خون جگر تو کچھ نہ رہا تو ہی سب ہوا   بس اے سرشک آنکھیں تری کیا مگر نہیں(۳)
داماں و جیب و دیدہ و مژگان و آستیں   اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں
ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن   کم گوشۂ چمن سے ترا رہگذر نہیں
کیوں الاماں کرے ہے دل شب گھڑی گھڑی   برچھی لگاتی آہ ہماری اگر نہیں(۴)
آتا ہی تیرے کوچے میں ہوتا جو میر یاں
کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

(۳۴۳)

ساقی کی باغ پر جو کچھ کم نگاہیاں ہیں   مانند جام خالی گل سب جماہیاں ہیں
تیغ جفائے خوباں بےآب تھی کہ ہمدم   زخم بدن ہمارے تفسیدہ ماہیاں ہیں
مسجد سے میکدے پر کاش یہ ابر روز برسے   واں روسفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں ہیں
جس کی نظر پڑی ہیں ان نے مجھے بھی دیکھا   جب سے وہ شوخ آنکھیں میں نے سراہیاں ہیں
غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہووے   درکار واں گنہ ہیں یاں بےگناہیاں ہیں
یہ ناز و سرگرانی اللہ رے کہ ہر دم   نازک مزاجیاں ہیں یا کج کلاہیاں ہیں
شاہد لوں میر کس کو اہل محلہ سے میں
محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

(۱) ج (۲) نسخۂ محمودآباد

(۳۴۴)

تجھے بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں ۔۔۔ ولے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں
جہاں کے مصطبے میں ست طافح ہی نظر آئے ۔۔۔ نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں
سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح ۔۔۔ وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں
مسافر ہووے جی اس کا خراماں دیکھ کر تجھ کو ۔۔۔ جسے میرے وطن میں کبک خوش رفتار کہتے ہیں
معاذ اللہ دخل کفر ہو اسلام میں کیوں ہی ۔۔۔ ق غلط اور پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں
علم کو کب ہے وجہ تسمیہ لازم سمجھ دیکھو ۔۔۔ سلیمانی میں کیا زنار ہے زنار کہتے ہیں
تری آنکھوں کو آؤں دیکھنے میں تو عجب مت کر ۔۔۔ کہ بہتر ہے عیادت اور انھیں بیمار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں ۔۔۔ کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں
مزے ان کے اڑا لیکن نہ یہ سمجھیں تو بہتر ہے ۔۔۔ کہ خوباں بھی بہت اپنے تئیں عیار کہتے ہیں

سگ کو میر میں اس شیر حق کا ہوں کہ جس کو سب
نبیؐ کا خویش و بھائی حیدر کرار کہتے ہیں

(۳۴۵)

ایک پرواز کو بھی رخصت صیاد نہیں ۔۔۔ ورنہ یہ کنج قفس بیضۂ فولاد نہیں
شیخ عزلت تو تہ خاک بھی پہنچے گی بہم ۔۔۔ مفت ہے سیر کہ یہ عالم ایجاد نہیں
داد لے چھوڑوں میں صیاد سے اپنی لیکن ۔۔۔ ضعف سے میرے تئیں طاقت فریاد نہیں
یوں ہی معذور بھی رکھ یوں تو سمجھ دل میں شیخ ۔۔۔ یہ قدح خوار مرے قابل ارشاد نہیں
بے ستوں بھی ہے وہی اور وہی جوے شیر ۔۔۔ تھا نمک شہرت شیریں کا سو فرہاد نہیں[1]

کیا کہوں میر فراموش کیا ان نے تجھے
میں تو تقریب بھی کی پر تو اسے یاد نہیں

(۳۴۶)

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں ۔۔۔ مہلت ہمیں بسان شرر کم بہت ہے یاں
یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں ۔۔۔ یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں
حاصل ہے کیا سواے ترائی کے دہر میں ۔۔۔ اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں
مائل بہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے ۔۔۔ تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یاں
ہم رہروان راہ فنا دیر رہ چکے ۔۔۔ وقفہ بسان صبح کوئی دم بہت ہے یاں

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

ویسا چمن سے سادہ نکلتا نہیں کوئی
رنگینی ایک اور خم و چم بہت ہے یاں

اعجاز عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جان مجسم بہت ہے یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

دل مت لگا رخ عرق آلود یار سے
آئینے کو اٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

(۳۴۷)

آہ وہ عاشق ستم ترک جفا کرتا نہیں
اور مطلق اب دماغ اپنا وفا کرتا نہیں

بات میں غیروں کو چپ کردوں ولیکن کیا کروں
وہ سخن نشنو تنک میرا کہا کرتا نہیں

روز بدتر جیسے بیمار اجل ہے دل کا حال
یہ سمجھ کر ہم نشیں اب میں دوا کرتا نہیں

گوئیا باب اجابت ہجر میں تیغا ہوا
ورنہ کس شب آپ کو میں بددعا کرتا نہیں

بیکسان عشق اس کے آہ کس کے پاس جائیں
گور بن کوئی صلا میں لب کو وا کرتا نہیں

چھوٹنا ممکن نہیں اپنا قفس کی قید سے
مرغ سیر آہنگ کو کوئی رہا کرتا نہیں

چرخ کی بھی کج ادائی ہم ہی پر جاتی ہے پیش
ناز کو اس سے تو اک دم بھی جدا کرتا نہیں

دیکھ اسے بے دید ہو آنکھوں نے کیا دیکھا بھلا
دل بھی بد کرتا ہے مجھ سے تو بھلا کرتا نہیں

کیونکے دیکھی جائے یہ بیگانہ وضعی مجھ سے شوخ
تو تو ایدھر یک نگاہ آشنا کرتا نہیں(۱)

کیا کہوں پہنچا کہاں تک میر اپنا کارشوق
یاں سے کس دن اک نیا قاصد چلا کرتا نہیں

(۳۴۸)

لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں

سینہ سپر کیا تھا جن کے لیے بلا کا
دے بات بات میں اب تلوار کھینچتے ہیں

مجلس میں تیری ہم کو کب غیر خوش لگے ہے
ہم بیچ اپنے اس کے دیوار کھینچتے ہیں

بے طاقتی نے ہم کو چاروں طرف سے کھویا
تصدیع گھر میں بیٹھے ناچار کھینچتے ہیں

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی
حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں

شکوہ کروں تو کس سے کیا شیخ کیا برہمن
ناز اس بلائے جاں کے سب یار کھینچتے ہیں

(۱) نسخۂ محمود آباد

ناوک سے میر اس کے دل بستگی تھی مجھ کو
پیکاں جگر سے میرے دشوار کھینچتے ہیں

(۳۴۹)

سمجھا تنک نہ اپنے تو سود و زیاں کو میں ۔۔۔ مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں
لاویں اسے بھی بعد مرے میری لاش پر ۔۔۔ یہ کہہ رکھا ہے اپنے ہر اک مہرباں کو میں
گردش فلک کی کیا ہے جو دور قدح میں ہے ۔۔۔ دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
جی جاوے تو قبول ترا غم نہ جائیو ۔۔۔ رکھتا نپٹ عزیز ہوں اس میہماں کو میں
عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے
پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

(۳۵۰)

کر نالہ کشی کب تئیں اوقات گذاریں ۔۔۔ فریاد کریں کس سے کہاں جاکے پکاریں
ہر دم کا بگڑنا تو کچھ اب چھوٹا ہے ان سے ۔۔۔ شاید کسی ناکام کا بھی کام سنواریں
دل میں جو کبھو جوش غم اٹھتا ہے تو تا دیر ۔۔۔ آنکھوں سے چلی جاتی ہیں دریا کی سی دھاریں
کیا ظلم ہے اس خونی عالم کی گلی میں ۔۔۔ جب ہم گئے دوچار نئی دیکھیں مزاریں
جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں ۔۔۔ یاں ہم نے انھیں آنکھوں سے دیکھیں ہیں بہاریں
کیونکر کے رہے شرم مری شہر میں جب آہ ۔۔۔ ناموس کہاں اتریں جو دریا پہ ازاریں
دے ہونٹ کہ ہے شور مسیحائی کا جن کی ۔۔۔ دم لیویں نہ دوچار کو تا جی سے نہ ماریں
منظور ہے کب سے سرشوریدہ کا دینا ۔۔۔ چڑھ جائے نظر کوئی تو یہ بوجھ اتاریں
بالیں پہ سر اک عمر سے ہے دست طلب کا ۔۔۔ جو ہے سو گدا کس کنے جا ہاتھ پساریں
ان لوگوں کے تو گرد نہ پھر سب ہیں لباسی ۔۔۔ سوگز بھی جو یہ پھاڑیں تو اک گز بھی نہ واریں
ناچار ہو رخصت جو منگا بھیجی تو بولا
میں کیا کروں جو میر جی جاتے ہیں سدھاریں

(۳۵۱)

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں ۔۔۔ عمر گذری پر نہ جانا میں کہ کیوں دل گیر ہوں
اتنی باتیں مت بنا مجھ شیفتے سے ناصحا ۔۔۔ پند کے لائق نہیں میں قابل زنجیر ہوں
سرخ رہتی ہیں مری آنکھیں لہو رونے سے شیخ ۔۔۔ مے اگر ثابت ہو مجھ پر واجب التعزیر ہوں
نے فلک پر راہ مجھ کو نے زمیں پر رو مجھے ۔۔۔ ایسے کس محروم کا میں شور بے تاثیر ہوں

جوں کماں گرچہ خمیدہ ہوں پہ چھوٹا اور وہیں — اس کے کوچے کی طرف چلنے کو یارو تیر ہوں(1)
جو مرے حصے میں آوے تیغ جدھر سیل و کارد — یہ فضولی ہے کہ میں ہی کشتۂ شمشیر ہوں
کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی — گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں
یوں سعادت ایک جدھر مجھ کو بھی گذرا ہے — منصفی کیجے تو میں تو محض بے‌تقصیر ہوں(2)
اس قدر بے ننگ خبطوں کو نصیحت شیخ جی
باز آؤ ورنہ اپنے نام کو میں میر ہوں

(۳۵۲)

کہے ہے کوہکن کر فکر میری خستہ حالی میں — الٰہی شکر کرتا ہوں تری درگاہ عالی میں
میں وہ پژمردہ سبزہ ہوں کہ ہوکر خاک سے سرزد — یکایک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں
تو سچ کہہ رنگ۔ پاں ہے یہ کہ خون عشق بازاں ہے — سخن رکھتے ہیں کتنے شخص تیرے لب کی لالی میں
برا کہنا بھی میرا خوش نہ آیا اس کو تو ورنہ — تسلی یہ دل ناشاد ہوتا ایک گالی میں
سرے استاد کو فردوس اعلیٰ میں ملے جاگہ — پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق مجھ کو خورد سالی میں
خرابی عشق سے رہتی ہے دل پر اور نہیں رہتا — نہایت عیب ہے یہ اس دیار غم کے والی میں(3)
نگاہ چشم پر خشم بتاں پر مت نظر رکھنا — ملا ہے زہر اے دل اس شراب پرتگالی میں
شراب خون بن تڑپوں سے دل لبریز رہتا ہے — بھرے ہیں سنگ ریزے میں نے اس مینائے خالی میں
خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہے
یہی تو میر اک خوبی ہے معشوق خیالی میں

(۳۵۳)

آہ اور اشک ہی سدا ہے یاں — روز برسات کی ہوا ہے یاں
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ — کہ کوئی دل جلا گڑا ہے یاں
گو کدورت سے وہ نہ دیوے رو — آرسی کی طرح صفا ہے یاں
ہر گھڑی دیکھتے جو ہو ایدھر — ایسا گہ تم نے آنکلا ہے یاں(4)
رند مفلس جگر میں آہ نہیں — جان محزوں ہے اور کیا ہے یاں
کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے ق — اک ازاں جملہ کربلا ہے یاں
اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے — ہر طرف ظلم ہورہا ہے یاں
صد تمنا شہید ہیں یک جا — سینہ کوبی ہے تعزیہ ہے یاں
دیدنی ہے غرض یہ صحبت شوخ — روز و شب طرفہ ماجرا ہے یاں

---
(1) تا (4 کذا) نسخۂ محمود آباد

خانۂ عاشقاں ہے جاے خوب   جاے رونے کی جا بہ جا ہے یاں
کوہ و صحرا بھی کر نہ جاے باش ق آج تک کوئی بھی رہا ہے یاں
ہے خبر شرط میرؔ سنتا ہے   تجھ سے آگے یہ کچھ ہوا ہے یاں
موت مجنوں کو بھی یہیں آئی
کوہکن کل ہی مر گیا ہے یاں

(۳۵۴)

جہاں اب خارزاریں ہوگئی ہیں   یہیں آگے بہاریں ہوگئی ہیں
جنوں میں خشک ہو رگ ہاے گردن   گریباں کی سی تاریں ہوگئی ہیں
سنا جاتا ہے شہر عشق کے گرد   مزاریں ہی مزاریں ہوگئی ہیں
اسی دریاے خوبی کا ہے یہ شوق   کہ موجیں سب کناریں ہوگئی ہیں
انھیں گلیوں میں جب روتے تھے ہم میرؔ
کئی دریا کی دھاریں ہوگئی ہیں

(۳۵۵)

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں   یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو   کبھو پاتے بھی ہو بحال ہمیں
وہ دہاں وہ کمر ہی ہے مقصود   اور کچھ اب نہیں خیال ہمیں
اس مہ چاردہ کی دوری نے   دس ہی دن میں کیا ہلال ہمیں
نظر آتے ہیں ہوتے جی کے وبال   حلقہ حلقہ تمھارے بال ہمیں
تنگی اس جا کی نقل کیا کریے   یاں سے واجب ہے انتقال ہمیں
صرف للہ خم کے خم کرتے   نہ کیا چرخ نے کلال ہمیں
مغ بچے مال مست ہم درویش   کون کرتا ہے مشت مال ہمیں
کب تک اس تنگنا میں کھینچیے رنج   یاں سے یارب تو ہی نکال ہمیں
ترک سبزان شہر کریے اب   بس بہت کر چکے نہال ہمیں
وجہ کیا ہے کہ میرؔ منھ پہ ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

(۳۵۶)

نہ کیونکے شیخ توکل کو اختیار کریں   زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں

گیا وہ زمزمۂ صبح فصل گل بلبل   دعا نہ پہنچے چمن تک ہم اب ہزار کریں
تمام صید سر تیر جمع ہیں لیکن   نصیب اس کے کہ جس کو ترا شکار کریں
تسلی تو ہو دل بے قرار خوباں سے   یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں
ہمیں تو نزع میں شرمندہ آکے ان نے کیا   رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں
رہی سہی بھی گئی عمر تیرے پیچھے یار   یہ کہہ کہ آہ ترا کب تک انتظار کریں
کریں ہیں حادثے ہر روز وار آخر تو   سنان آہ دل شب کے ہم بھی پار کریں
یہ قتل غیر ہے کیا کام ہم نشیناں آج   جو دشمنی نہ کرے وہ تو اس کو یار کریں

ہوا ہوں خاک رہ اس واسطے کہ خوباں میرؔ
گذار گور پہ میری بھی ایک بار کریں

(۳۵۷)

یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدح شراب تجھ بن   نہ گلے سے میرے اترا کبھو قطرہ آب تجھ بن
یہی بستی عاشقوں کی کبھو سیر کرنے چل تو   کہ محلے کے محلے پڑے ہیں خراب تجھ بن
میں لہو پیوں ہوں غم میں عوض شراب ساقی   شب مہ غم ہوگئی ہے شب ماہتاب تجھ بن
گئی عمر میری ساری جیسے شمع باؤ کے بیچ   یہی رونا جلنا گلنا یہی اضطراب تجھ بن
سبھی آتشیں ہیں نالے سبھی زمہریری آہیں   مری جان پر رہا ہے غرض اک عذاب تجھ بن
ترے غم کا شکر نعمت کروں کیا اے مغبچے میں   نہ ہوا کہ میں نہ کھایا جگرکباب تجھ بن
نہیں جیتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا   مگر آنکہ مر کے کیجے تہ خاک خواب تجھ بن

برے حال ہوکے مرتا جو ورنگ میرؔ کرتا
یہ بھلا ہوا ستمگر کہ موا شتاب تجھ بن

(۳۵۸)

تکلیف باغ کن نے کی تجھ خوش دہاں کے تئیں   دیتا ہے آگ رنگ ترا گلستاں کے تئیں
تنکا بھی اب رہا نہیں شرمندگی ہے جو   گر پڑ کے برق پاوے مرے آشیاں کے تئیں
آئے عدم سے ہستی میں تس پر نہیں قرار   ہے ان مسافروں کا ارادہ کہاں کے تئیں
سناہے سے باغ سے کچھ اٹھتے ہیں حسیم   مرغ چمن نے خوب متھا ہے فغاں کے تئیں
بے رحم تک تو پاؤں تو چھاتی پہ رکھے رہ   مارا بھی ہے کبھی تیں کسی خستہ جاں کے تئیں(1)
اک گردش اے فلک کہ ہو اٹھائے راہ سے   کنعاں کی اور راہ غلط کارواں کے تئیں
تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب   رکھتا ہے منھ میں غنچۂ گل سو زباں کے تئیں

(1) نسخۂ محمودآباد

دیکھے کہاں ہیں زلف تری مردمان شہر
سودا ہوا ہے کہنے لگے اس جواں کے، تیں[1]

ہم تو ہوئے تھے میر سے اس دن ہی ناامید
جس دن سنا کہ ان نے دیا دل بتاں کے تیں

(۳۵۹)

موئے سہتے سہتے جفاکاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

ہماری تو گذری اسی طور عمر
یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں

گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ
نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں

کہاں تک یہ تکلیف مالایطاق
ہوئیں مدتوں نازبرداریاں

خط و کاکل و زلف و انداز و ناز
ہوئیں دام رہ صدگرفتاریاں

کیا دردوغم نے مجھے ناامید
کہ مجنوں کو یہ ہی تھیں بیماریاں

تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

(۳۶۰)

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جاے بجز نام نہیں

خطر راہ وفا بلکہ بہت دور کھنچا
عمر گذری کہ بہم نامہ و پیغام نہیں

راز پوشی محبت کے تئیں چاہیے ضبط
سو تو بیتابی دل بن مجھے آرام نہیں

بےقراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

(۳۶۱)

کیا ظلم کیا تعدی کیا جور کیا جفائیں
اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں

دیکھا کہاں وہ نسخہ اک روگ میں بساہا
جی بھر کبھو نہ پہنچا بہتیری کیں دوائیں

اک رنگ گل نے رہنا یاں یوں نہیں کیا ہے
اس گلشن جہاں میں ہیں مختلف ہوائیں

ہے فرش عرش تک بھی قلب حزیں کا اپنے
اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں

چہرے کے زخم ناخن کے سے کہاں کہ گویا
گھر سے نکلتے ہی ہم تلواریں منھ پہ کھائیں[2]

(۱)، (۲) نسخۂ محمودآباد

شب نالہ آسماں تک جی سخت کرکے پہنچا — تھیں نیم کشتۂ یاس اکثر مری دعائیں
روکش تو ہو ترا پر آئینے میں کہاں یہ — رعنائیاں ادائیں رنگینیاں صفائیں
ہے امر سہل چاہت لیکن نباہ مشکل — پتھر کرے جگر کو تب تو کرے وفائیں

ناز بتان سادہ ہے اللہ اللہ اے میر
ہم خط سے مٹ گئے پر ان کے نہیں ہے بھائیں

(۳۶۲)

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں — تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو — دلک بے قرار رکھتے ہیں
غیر ہی مورد عنایت ہے — ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
نہ نگہ نے پیام نے وعدہ — نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو — لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں
چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور ق — بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

(۳۶۳)

گذر جان سے اور ڈر کچھ نہیں — رہ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
ہے اب کام دل جس پہ موقوف تو — وہ نالہ کہ جس میں اثر کچھ نہیں
ہوا مائل اس سرو کا دل مرا — بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں
نہ کر اپنے محووں کا ہرگز سراغ — گئے گذرے بس اب خبر کچھ نہیں
تری ہوچکی خشک مژگاں کی سب — لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں
حیا سے نہیں پشت پا پر وہ چشم — مرا حال مدنظر کچھ نہیں
کروں کیونکے انکار عشق آہ میں — یہ رونا بھلا کیا ہے گر کچھ نہیں

کمر اس کی رشک رگ جاں ہے میر
غرض اس سے باریک تر کچھ نہیں

(۳۶۴)

نالۂ قید قفس سے چھوٹ اب اک دم نہیں — گوش گل سے لگتے تھے جاکے سو وہ موسم نہیں
ہم پہ کھینچی تیغ تو غیروں کو ٹک لگنے نہ دے — دے اگر ہوویں گے اس کے درمیاں تو ہم نہیں

بت برہمن کوئی نامحرم نہیں اللہ کا
ہے حرم میں شیخ لیکن میر وہ محرم نہیں

(۳۶۵)

تری ابرو و تیغ تیز تو ہم دم ہیں یہ دونوں
ہوئے ہیں دل جگر بھی سامنے رستم ہیں یہ دونوں

نہ کچھ کاغذ میں ہے نہ نے قلم کو درد نالوں کا
لکھوں کیا عشق کے حالات نامحرم ہیں یہ دونوں

لہو آنکھوں سے بہتے وقت رکھ لیتا ہوں ہاتھوں کو
جراحت ہیں اگر دے دونوں تو مرہم ہیں یہ دونوں

کسو چشمے پہ دریا کے دیا اوپر نظر رکھیے
ہمارے دیدۂ نم دیدہ کیا کچھ کم ہیں یہ دونوں

لب جاں بخش اس کے مار ہی رکھتے ہیں عاشق کو
اگرچہ آب حیواں ہیں ولیکن سم ہیں یہ دونوں

نہیں ابرو ہی مائل جھک رہی ہے تیغ بھی ایدھر
ہمارے کشت و خوں میں متفق باہم ہیں یہ دونوں

کھلے سینے کے داغوں پر ٹھہر رہتے ہیں کچھ آنسو
چمن میں مہر ورزی کے گل و شبنم ہیں یہ دونوں

کبھو دل رکنے لگتا ہے جگر گاہے تڑپتا ہے
غم ہجراں میں چھاتی کے ہماری جم ہیں یہ دونوں

خدا جانے کہ دنیا میں ملیں اس سے کہ عقبیٰ میں
مکاں تو میر صاحب شہرۂ عالم ہیں یہ دونوں

(۳۶۶)

لب ترے لعل ناب ہیں دونوں
پر تمامی عتاب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا رویئے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ہے تکلف نقاب وے رخسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم
گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں

کچھ نہ پوچھو کہ آتش غم سے
جگر و دل کباب ہیں دونوں

سو جگہ اس کی آنکھیں پڑتی ہیں
جیسے مست شراب ہیں دونوں

پاؤں میں وہ نشہ طلب کا نہیں
اب تو سرمست خواب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

بحث کاہے کو لعل و مرجاں سے
اس کے لب ہی جواب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

[1](۳۶۷)

مجھ کو مارا بھلا کیا تونیں   پر وفا کا برا کیا تونیں
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں   مرگ فرہاد کیا کیا تونیں
اس کے جور و جفا کی کیا تقصیر   جو کیا سو وفا کیا تونیں
یہ چمن ہے قفس سے پر اے ضعف   مجھ کو بے دست و پا کیا تونیں
کل ہی پڑتی نہیں ہے تجھ بن آج   میرؔ کو کیا بلا کیا تونیں

وہ جو کہتا تھا تو ہی کریو قتل
میرؔ کا سو کہا کیا تونیں

[2](۳۶۸)

ہمیشہ دل میں کہتا ہوں یہاں جاؤں وہاں جاؤں   ترے غم کو اکیلا چھوڑ کر پیارے کہاں جاؤں
لگی آتی ہے واں تک تیرے دامن کی ہوا اڑ کے   میں یہ مشت غبار اپنا چھپانے کو جہاں جاؤں
ادھر صحرائے بیتابی ادھر مشہد ہے اے قاتل   جو فرماوے تو واں جاؤں جو فرماوے تو یاں جاؤں

اگر جیتا رہا اے زلف تو میں میرؔ ہوں سنیو
بلائے ناگہانی کے سر اوپر ناگہاں جاؤں

[3](۳۶۹)

عشق کرنے کو جگر چاہیے آسان نہیں   سب کو دعویٰ ہے ولے ایک میں یہ جان نہیں
غارت دیں میں تگہ تعصی ایماں میں ادا   تجھ کو کافر نہ کہے جو وہ مسلمان نہیں
سرسری ملیے بتوں سے جو نہ ہو تاب جفا   عشق کا ذائقہ کچھ داخل ایمان نہیں
ایک بے درد تجھے پاس نہیں عاشق کا   ورنہ عالم میں کسے خاطر مہمان نہیں
کیونکے غم سرزدہ ہر لحظہ نہ آوے دل میں   گھر ہے درویش کا یاں در نہیں دربان نہیں
ہم نشیں آہ نہ تکلیف شکیبائی کر   عشق میں صبر و تحمل ہو یہ امکان نہیں

کس طرح منزل مقصود پہ پہنچیں گے میرؔ
سفر دور ہے اور ہم کنے سامان نہیں

---

(۱) اس غزل کے صرف تین شعر (پہلا، دوسرا اور چھٹا) دیوان پنجم کی ردیف ی (تونے) کے تحت درج تھے۔ چونکہ پوری غزل درج بالا تیسرے، چوتھے اور پانچویں شعر کے اضافے کے ساتھ نسخۂ محمودآباد میں ردیف ن کے تحت شامل ہے لہٰذا اب اسے دیوان پنجم سے نکال کر یہاں رکھا گیا ہے۔ مصحح

(۲)، (۳) نسخۂ محمودآباد

(۳۷۰)[1]

تری زلف سیہ کی یاد میں آنسو جھمکتے ہیں
اندھیری رات ہے برسات ہے جگنو چمکتے ہیں

(۳۷۱)[2]

فردوس سے کچھ اس کی گلی میں کمی نہیں
پر ساکنوں میں واں کے کوئی آدمی نہیں

(۳۷۲)[3]

نہ سنے گا فغاں مری پھر تو
میں ترے کان کھول رکھتا ہوں

(۳۷۳)[4]

جو ترے لب سے کام رکھتے ہیں
یمنی کو وے نام رکھتے ہیں

(۳۷۴)[5]

کر نظر اک دور سے مجھ داغ میں
آنکھیں نیچی کر گیا گل باغ میں

(۳۷۵)[6]

کیسہ پرزر ہو تو جفاجویاں
تم سے کتنے ہماری جیب میں ہیں

(۳۷۶)[7]

کر صرف دید عمر پھرے ہے تو یاں کہاں
ہے سیر مفت میر تجھے پھر جہاں کہاں

---

(۱) تا (۷) نسخۂ نول کشور

ردیف و

(۳۷۷)

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیر بیاباں کو — نکالا سر سے میرے جائے مو خار مغیلاں کو
وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ رکھا ہے ہم نے یاراں کو — کہ گورستان سے گاڑیں جدا ہم اہل ہجراں کو
نہیں یہ بید مجنوں گردش گردون گرداں نے — بنایا ہے شجر کیا جانیے کس مو پریشاں کو
ہوئے تھے جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ہے — کیا دشوار نادانی سے ہم نے کار آساں کو
کہیں نسل آدمی کی اٹھ نہ جاوے اس زمانے میں — کہ موتی آب حیواں جانتے ہیں آب انساں کو
تجھے گر چشم عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے — تماشا کر غبار افشانی خاک عزیزاں کو
لباس مرد میداں جوہر ذاتی کفایت ہے — نہیں پرواے پوشش معرکے میں تیغ عریاں کو[1]
ہواے ابر میں گرمی نہیں جو تو نہ ہو ساقی — دم افسردہ کردے منجمد رشحات باراں کو
جلیں ہیں کب کی مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے — اس آب چشم کی جوشش نے آتش دی نیستاں کو
وہ کافر عشق کا ہے دل کہ میری بھی رگ جاں تک — سدا زنار ہی تسبیح ہے اس نامسلماں کو[2]
غرور ناز سے آنکھیں نہ کھولیں اس جفا جو نے — ملا پاؤں تلے جب تک نہ چشم صد غزالاں کو
نہ سی چشم طمع خوان فلک پر خام دستی سے — کہ جام خون دے ہے ہر سحر یہ اپنے مہماں کو
زبس صرف جنوں میرے ہوا آہن عجب مت کر — نہ ہو گر حلقۂ در خانۂ زنجیرسازاں کو[3]
بنے ناواقف شادی اگر ہم بزم عشرت میں — دہان زخم دل سمجھے جو دیکھا روے خنداں کو
نہیں ریگ رواں مجنوں کے دل کی بے قراری نے — کیا ہے مضطرب ہر ذرۂ گرد بیاباں کو
کسی کے واسطے رسواے عالم ہو پہ جی میں رکھ — کہ مارا جائے جو ظاہر کرے اس راز پنہاں کو
گری پڑتی ہے بجلی ہی تبھی سے خرمن گل پر — ٹک اک ہنس میرے رونے پر کہ دیکھے تیرے دنداں کو
غرور ناز قاتل کو لیے جا ہے کوئی پوچھے — چلا تو سونپ کر کس کے تئیں اس صید بے جاں کو
وہ تخم سوختہ تھے ہم کہ سرسبزی نہ کی حاصل — ملایا خاک میں دانہ نمط حسرت سے دہقاں کو
ہوا ہوں غنچۂ پژمردہ آخر فصل کا تجھ بن — نہ دے برباد حسرت کشتۂ سردرگریباں کو
غم و اندوہ و بیتابی الم بے طاقتی حرماں — کہوں اے ہم نشیں تا چند غم ہاے فراواں کو
گل و سرو و سمن گر جائیں گے مت سیر گلشن کر — ملا مت خاک میں ان باغ کے رعنا جواناں کو[4]
بہت روئے جو ہم یہ آستیں رکھ منھ پہ اے بجلی — نہ چشم کم سے دیکھ اس یادگار چشم گریاں کو

مزاج اس وقت ہے اک مطلع تازہ پہ کچھ مائل
کہ بے فکر سخن بنتی نہیں ہرگز سخنداں کو

---

(۱) تا (۴) نسخۂ محمودآباد

(۳۷۸)

نسیم مصر کب آئی سواد شہر کنعاں کو
کہ بھر جھولی نہ یاں سے لے گئی گل ہاے حرماں کو
زبان نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا
مری طینت میں یارب سودۂ دل ہاے نالاں کو
کوئی کانٹا سرہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گل گلزار کیا درکار ہے گور غریباں کو
یہ کیا جانوں ہوا سینے میں کیا اس دل کو اب ناصح
سحر خوں بستہ تو دیکھا تھا میں نے اپنی مژگاں کو
گل و سنبل ہیں نیرنگ قضا مت سرسری گذرے
کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بناتے اس گلستاں کو
صداے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے
کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو
کریں بال ملک فرش رہ اس ساعت کہ محشر میں
لہو ڈوبا کفن لاویں شہید ناز خوباں کو
کیا میر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیے
کسو دیوار کے سائے میں منھ پر لے کے داماں کو
بہاے گل پر دیتے ہیں کس محبوب کو کف سے
قلم اس جرم پر کرتا ہے دست گل فروشاں کو
تری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہہ کہاں کھویا
جگر خوں گشتہ دل آزردہ میر اس خانہ ویراں کو

(۳۷۹)

قد کھینچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو
کہتا ہے ترا سایہ پری سے کہ ہے کیا تو
گر اپنی روش راہ چلا یار تو اے کبک
رہ جائے گا دیوار گلستاں سے لگا تو
بے گل نہیں بلبل تجھے بھی چین پہ دیکھیں
مر رہتے ہیں ہم ایک طرف باغ میں یا تو
خوش رو ہے بہت اے گل تر تو بھی ولیکن
انصاف ہے منھ تیرے ہی ویسا ہے بھلا تو
کیا جانیے اے گوہر مقصد تو کہاں ہے
ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن نہ ملا تو
اس جینے سے اب دل کو اٹھا بیٹھیں گے ہم بھی
ہے تجھ کو قسم ظلم سے مت ہاتھ اٹھا تو
منظر میں بدن کے بھی یہ اک طرفہ مکاں تھا
افسوس کہ ٹک دل میں ہمارے نہ رہا تو
تھے چاک گریبان گلستاں میں گلوں کے
نکلا ہے مگر کھولے ہوئے بند قبا تو
بے ہوشی سی آتی ہے تجھے اس کی گلی میں
گر ہوسکے اے میر تو اس راہ نہ جا تو

(۳۸۰)

خط لکھ کے کوئی سادہ نہ اس کو ملول ہو
ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو
چاہوں تو بھر کے کولی اٹھا لوں ابھی تمھیں
کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو
سرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کو خلق کی
شاید کہ راہ یار کی ہی خاک دھول ہو

جاویں نثار ہونے کو ہم کس بساط پر
اک نیم جاں رکھیں ہیں سو وہ جب قبول ہو

ہم ان دنوں میں لگ نہیں پڑتے ہیں صبح و شام
ورنہ دعا کریں تو جو چاہیں حصول ہو

دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ عجول ہو

(۳۸۱)

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
اس سے کیا دل نہاد ہے ہم کو

خط سے نکلے ہے بے وفائی حسن
اس قدر تو سواد ہے ہم کو

آہ کس ڈھب سے رویے کم کم
شوق حد سے زیاد ہے ہم کو

شیخ و پیرمغاں کی خدمت میں
دل سے اک اعتقاد ہے ہم کو

سادگی دیکھ عشق میں اس کے
خواہش جان شاد ہے ہم کو

بدگمانی ہے جس سے تس سے آہ
قصد شوروفساد ہے ہم کو

دوستی ایک سے بھی تجھ کو نہیں
اور سب سے عناد ہے ہم کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

(۳۸۲)

مباد کینے پہ اس بت کی طبع آئی ہو
پھر ایک بس ہے وہی گو ادھر خدائی ہو

مدد نہ اتنی بھی کی بخت ناموافق نے
کہ مدعی سے اسے ایک دن لڑائی ہو

ہنوز طفل ہے وہ ظلم پیشہ کیا جانے
لگادے تیغ سلیقے سے جو لگائی ہو

لبوں سے تیرے تھا آگے ہی لعل سرخ و زرد
قسم ہے میں نے اگر بات بھی چلائی ہو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہو نہ آزادی
کدھر کے ہوجے جو بے بال وپر رہائی ہو

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی
کسو کی جن نے کبھو لات تک کھائی ہو

اس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے
یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو

کبھو ہے چھیڑ کبھو گالی ہے کبھو چشمک
بیان کریے جو ایک اس کی بے ادائی ہو

دیارحسن میں غالب کہ خستہ جانوں نے
دوا کے واسطے بھی مہر تک نہ پائی ہو

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے
اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو

جو کوئی دم ہو تو لوہو سا پی کے رہ جاؤں   غموں کی دل میں بھلا کب تلک سمائی ہو
مغاں سے راہ تو ہوجائے رفتہ رفتہ شیخ   ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو
کہیں تو ہیں کہ عبث میرؔ نے دیا جی کو
خدا ہی جانے کہ کیا جی میں اس کے آئی ہو

(۳۸۳)

اے چرخ مت حریف اندوہ بے کساں ہو   کیا جانے منھ سے نکلے نالے کے کیا سماں ہو
کب تک گرہ رہے گا سینے میں دل کے مانند   اے اشک‌شوق اک دم رخسار پر رواں ہو
ہم دور ماندگاں کی منزل رساں مگر اب   یا ہو صدا جرس کی یا گرد کارواں ہو
مسند نشین ہو گر عرصہ ہے تنگ اس پر   آسودہ وہ کسو کا جو خاک‌آستاں ہو
تاچند کوچہ‌گردی جیسے صبا زمیں پر   اے آہ صبح گاہی آشوب‌آسماں ہو
گر ذوق میر ہے تو آوارہ اس چمن میں   مانند عندلیب گم‌کردہ آشیاں ہو
یہ جان تو کہ ہے اک آوارہ دست بردل   خاک چمن کے اوپر برگ‌خزاں جہاں ہو
کیا ہے حباب ساں یاں آ دیکھ اپنی آنکھوں   گر پیرہن میں میرے میرا تجھے گماں ہو
از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن   کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو
پتھر سے توڑ ڈالوں آئینے کو ابھی میں   گر روے‌خوبصورت تیرا نہ درمیاں ہو
اس تیغ زن سے کہیو قاصد مری طرف سے   اب تک بھی نیم جاں ہوں گر قصد امتحاں ہو
کل بت کدے میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں   کعبے میں آج زاہد گو ہم پہ سرگراں ہو[1]
ہمسایہ اس چمن کے کتنے شکستہ پر ہیں   اتنے لیے کہ شاید اک باؤ گل فشاں ہو
میرؔ اس کو جان کر تو بے‌شبہ ملیو رہ پر
صحرا میں جو نمدمو بیٹھا کوئی جواں ہو

(۳۸۴)

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو   آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو
عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے   آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
یوں عرق جلوہ گر ہے اس منھ پر   جس طرح اوس پھول پر دیکھو
ہر خراش‌جبیں جراحت ہے   ناخن‌شوق کا ہنر دیکھو
تھی ہمیں آرزو لب خنداں   سو عوض اس کے چشم تر دیکھو
رنگ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے   ایک شب اور یاں سحر دیکھو

(۱) نسخۂ محمود آباد

دل ہوا ہے طرف محبت کا — خون کے قطرے کا جگر دیکھو
پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے — یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو
لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

(۳۸۵)

آرام ہوچکا مرے جسم نزار کو — رکھے خدا جہاں میں دل بےقرار کو
پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہا — دیکھا میں آنسوؤں میں دل داغدار کو
برسا تو میرے دیدۂ خوں بار کے حضور — پر اب تک انفعال ہے ابر بہار کو
ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار — پر کیا کروں میں دیدۂ بےاختیار کو
آیا جہاں میں دوست بھی ہوتے ہیں یک دگر — مجھ سے جو دشمنی ہی رہی میرے یار کو
سو باریوں تو غیروں سے کرتے ہو جس کے بات — کچھ منھ بنا رہو ہو ہماری ہی بار کو
سرگشتگی سوائے نہ دیکھا جہاں میں کچھ — اک عمر خضر میر کیا اس دیار کو
کس کس کی خاک اب کی ملانی ہے خاک میں — جاتی ہے پھر نسیم اسی رہگذار کو
اے وہ کوئی جو آج پیے ہے شراب عیش — خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنج و خمار کو
خوباں کا کیا جگر جو کریں مجھ کو اپنا صید — پہچانتا ہے سب کوئی تیرے شکار کو
جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ بدبلا — ق — رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو
گر ساتھ لے گڑا تو دل مضطرب تو میر
آرام ہوچکا ترے مشت غبار کو

(۳۸۶)

اچھی لگے ہے تجھ بن گل گشت باغ کس کو — صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو
بے سوز داغ دل پر گر جی جلے بجا ہے — اچھا لگے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو
صد چشم داغ وا ہیں دل پر مرے میں وہ ہوں — دکھلا رہا ہے لالہ تو اپنا داغ کس کو
گل چین عیش ہوتے ہم بھی چمن میں جاکر — آہ و فغاں سے اپنی لیکن فراغ کس کو
کر شکر چشم پر خوں اے مست دردالفت — دیتے ہیں سرخ مے سے بھر کر ایاغ کس کو[1]
اس کی بلا سے جو ہم اے میر گم بھی ہوویں
ہم سے غریب کا ہو فکر سراغ کس کو

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۳۸۷)

دن گذرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو   رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
سب ہیں دیدار کے مشتاق پر اس سے غافل   حشر برپا ہو کہ فتنہ اٹھے آیا کیا ہو
خاک حسرت زدگاں پر تو گذر بے وسواس   ان ستم کشتوں سے اب عرض تمنا کیا ہو
گر بہشت آوے تو آنکھوں میں مری پھیکی لگے   جن نے دیکھا ہو تجھے محو تماشا کیا ہو
شوق جاتا ہے ہمیں یار کے کوچے کو لیے   جاکے معلوم ہو کیا چاہیے اس جا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ و غم و نالہ و درد   ہجر میں زندگی کرنے کے تئیں کیا کیا ہو

خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میرؔ
یار مستغنی ہے اس کو مری پروا کیا ہو

(۳۸۸)

ویسا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو   اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہوگیا تو
چالیں تمام بے ڈھب باتیں فریب ہیں سب   حاصل کہ اے شکر لب اب وہ نہیں رہا تو
جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہرسحر کے   یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
آ ابر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت   کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہے بلا تو
تقریب پر بھی تو تو پہلو تہی کرے ہے   دس بار عید آئی کب کب گلے ملا تو
تیرے دہن سے اس کو نسبت ہو کچھ تو کہیے   گل گو کرے ہے دعوئ خاطر میں کچھ نہ لا تو
دل کیونکے راست آوے دعوائے آشنائی   دریائے حسن وہ مہ کشتی بہ کف گدا تو
ہر فرد یاس ابھی سے دفتر ہے تجھ گلے کا   ہے قہر جب کہ ہوگا حرفوں سے آشنا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ   جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
منھ کریے جس طرف کو سو ہی تری طرف ہے   پر کچھ نہیں ہے پیدا کیدھر ہے اے خدا تو
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک   دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو
کم میری اور آنا کم آنکھ کا ملانا   کرنے سے یہ ادائیں ہے مدعا کہ جا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے   ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو

کہہ سانجھ کے موئے کو اے میرؔ روئیں کب تک
جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

(۳۸۹)

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو   معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو

سجدے کا کیا مضائقہ محراب تیغ میں — پر یہ تو ہو کہ نعش پہ میری نماز ہو
اک دم تو ہم میں تیغ کو تو بے دریغ کھینچ — تا عشق میں ہوس میں تنک امتیاز ہو
نزدیک سوز سینہ سے رکھ اپنے قلب کو — وہ دل ہی کیمیا ہے جو گرم گداز ہو
ہے فرق ہی میں خیر نہ کر آرزوے وصل — مل بیٹھیے جو اس سے تو شکوہ دراز ہو
جوں توں کے اس کی چاہ کا پردہ کیا ہے میں — اے چشم گریہ ناک نہ افشاے راز ہو
جوں چشم بسملی نہ مندی آوے گی نظر — جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو

ہم سے تو غیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میرؔ
خوش حال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

(۳۹۰)

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو — پھر مر بھی جایئے تو کسو کو خبر نہ ہو
دل پر ہوا سو آہ کے صدمے سے ہو چکا — ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑے جگر نہ ہو
چھتی سی پار عرش کے گذری نہ عاقبت — آہ سحر میں میری کہاں تک اثر نہ ہو
سمجھا ہوں تیری آنکھ چھپانے سے خوش نگاہ — مدنظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہ ہو
کھینچے ہے دل کو زلف سے گاہے نگہ سے گاہ ق — حیراں نہ ہووے کوئی تو اس طرز پر نہ ہو
سو دل سے بھی نہ کام چلے اس کے عشق میں — اک دل رکھوں ہوں میں تو کدھر ہو کدھر نہ ہو
جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک ق — کافر کا بھی گذار الٰہی ادھر نہ ہو
یک جا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ — جس میں بجاے نقش قدم چشم تر نہ ہو
ہر یک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے — ہاں یاں کسو شہید محبت کا سر نہ ہو
چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدان عشق ہیں — تیرا گذار تا کہ کسو نعش پر نہ ہو
دامن کشاں ہی جا کہ طپش پر طپش ہے دفن — زنہار کوئی صدمے سے زیر و زبر نہ ہو
مضطر ہو اختیار کی وہ شکل دل میں میں — اس راہ ہو کے جاؤں یہ صورت جدھر نہ ہو
لیکن عبث نگاہ جہاں کریے اس طرف — امکان کیا کہ خون مرے تا کمر نہ ہو
حیراں ہوں میں کہ ایسی یہ مشہد ہے کون سی — مجھ سے خراب حال کو جس کی خبر نہ ہو
آتا ہے یہ قیاس میں اب تجھ کو دیکھ کر — ظالم جفاشعار ترا رہگذر نہ ہو

اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغاں سب
اس تیرہ روزگار میں تو میرؔ اگر نہ ہو

(۳۹۱)

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رلاتے ہو
آنکھ اٹھاکر جب دیکھے ہیں اوروں میں ہنستے جاتے ہو

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گذرے صبح و شام بتاتے ہو

بکھری رہیں ہیں منھ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکے چھپے ہے خواری شب جب ایسے رات کے ماتے ہو

سرو قد و بالا ہوتا ہے درہم برہم شاخ گل
ناز سے قدکش ہوکے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو

صبح سے یاں پھر جان و دل پر روز قیامت رہتی ہے
رات کبھو آ رہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھلاتے ہو

جن نے تم کو نہ دیکھا ہووے اس سے آنکھیں مارو تم
ایک نگاہ مفتن کر تم سو سو فتنے اٹھاتے ہو

چشم تو ہے اک دید کی جا پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

راحت پہنچی تک تم سے تو رنج اٹھایا برسوں تک
سر سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

ہو کے گدائے کوے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میرؔ جی راتوں کو تم ہر در پر چلاتے ہو

(۳۹۲)

وہی جانے جو حیا کشتہ وفا رکھتا ہو — اور رسوائی کا اندیشہ جدا رکھتا ہو
کام لے یار سے جو جذب رسا رکھتا ہو — یا کوئی آئینہ ساں دست دعا رکھتا ہو
عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب — کریے تدبیر جو یہ درد دوا رکھتا ہو
میں نے آئینہ صفت در نہ کیا بند غرض — اس کو مشکل ہے جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو
ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر — درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
اس سے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ ناشاعر لیک — سیب کچھ اس ذقن آگے جو مزہ رکھتا ہو
آوے ہے پہلے قدم سر ہی کا جانا درپیش — دیکھتا ہو جو رہ عشق میں پا رکھتا ہو
ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی — کہیے اس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو

کیا کرے وصل سے مایوس دل آزردہ جو　　زخم ہی یار کا چھاتی سے لگا رکھتا ہو
کب تلک اس کے اسیران بلا خانہ خراب　ق　ظلم کی تازہ جو ہر روز بنا رکھتا ہو
ایک دم کھول کے زلفوں کی کمندوں کے تئیں　　مدتوں تک دل عاشق کو لگا رکھتا ہو

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

(۳۹۳)

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
قد قامت یہ کچھ ہے تمھارا لیکن قہر قیامت ہو

ربط اخلاص اے دیدہ و دل بھی دنیا میں ایک سے ہوتا ہے
لگ پڑتے ہو جس سے تس سے تم بھی کوئی ملامت ہو

آج سحر ہوتے ہی کچھ خورشید ترے منھ آن چڑھا
روک سکے ہے کون اسے سر جس کے ایسی شامت ہو

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانیے کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی زردی منھ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی ایک
چاہیے رو اس کا سا رو ہو قامت ویسا قامت ہو

مل بیٹھے اس نائی کے سے کوئی گھڑی جو زاہد تو
جتنے بال ہیں سارے سر میں ویسی ہی اس کی حجامت ہو

ہو جو ارادہ یاں رہنے کا رہ سکیے تو رہیے آپ
ہم تو چلے جاتے ہیں ہر دم کس کو قصد اقامت ہو

کس مدت سے دوری میں تیری خاک رہ سے برابر ہوں
کریے رنجہ قدم تک مجھ تک جو کچھ پاس قدامت ہو

منھ پر اس کی تیغ ستم کے سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کج دار و مریز اس طور میں ہو تک یا مت ہو

شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمھارے کیا روویں
ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میرؔ جی تم جو سلامت ہو

(۳۹۴)

شیخ جی آؤ مصلےٰ گرو جام کرو
جنس تقویٰ کے تئیں صرف مئے خام کرو

فرش مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو

دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے
آپ کو مغبچوں کے قابل دشنام کرو

نیک نامی و ثقاہت کو دعا جلد کہو
دین و دل پیش کش سادۂ خود کام کرو

ننگ و ناموس سے اب گذرو جوانوں کی طرح
پر فشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

خوب اگر جرعۂ مے نوش نہیں کرسکتے
خاطر جمع مے آشام سے یہ کام کرو

اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب
خدمت بادہ گساراں ہی سر انجام کرو

مطرب آکر جو کرے چنگ نوازی تو تم
پیرہن مستوں کی تقلید سے انعام کرو

خشکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاس جوش گل و دل گرمی ایام کرو

سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

(۳۹۵)

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو

ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو
نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غم زدگاں
مرگ مجنوں پہ کڑھو ماتم فرہاد کرو

اے اسیران تہ دام نہ تڑپو اتنا
تا نہ بدنام کہیں چنگل صیاد کرو

گو کہ حیرانی دیدار ہے اے آہ و سرشک
کوئی روشن کرو آنکھیں کوئی دل شاد کرو

زاہداں دیتے نشاں ان بتوں کا ڈرتا ہوں
توڑ کر کعبہ کہیں دیر نہ آباد کرو[1]

کیا ہوا ہے ابھی تو ہستی ہی کو بھولے ہو
آخرکار محبت کو تنک اک یاد کرو

اول عشق ہی میں میرؔ جی تم رونے لگے
خاک ابھی منہ کو ملو نالہ و فریاد کرو

(۳۹۶)

دل صاف ہو تو جلوہ کہ یار کیوں نہ ہو
آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

(۱) نسخۂ محمود آباد

عالم تمام اس کا گرفتار کیوں نہ ہو
وہ ناز پیشہ ایک ہے عیار کیوں نہ ہو

مستغنیانہ تو جو کرے پہلے ہی سلوک
عاشق کو فکر عاقبت کار کیوں نہ ہو

رحمت غضب میں نسبت برق و سحاب ہے
جس کو شعور ہو تو گنہگار کیوں نہ ہو

دشمن تو اک طرف کہ سبب رشک کا ہے یاں
در کا شگاف و رخنۂ دیوار کیوں نہ ہو

آیات حق ہیں سارے یہ ذرات کائنات
انکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو

ہر دم کی تازہ مرگ جدائی سے تنگ ہوں
ہونا جو کچھ ہے آہ سو یک بار کیوں نہ ہو

موے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں
اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہ ہو

نزدیک اپنے ہم نے تو سب کر رکھا ہے سہل
پھر میر اس میں مردن دشوار کیوں نہ ہو

(۳۹۷)

عاشق ہوئے تو گو غم بسیار کیوں نہ ہو
ناسور چشم ہو مژہ خوں بار کیوں نہ ہو

کامل ہو اشتیاق تو اتنا نہیں ہے دور
حشر دگر پہ وعدۂ دیدار کیوں نہ ہو

گل گشت کا بھی لطف دل خوش سے ہے نسیم
پیش نظر وگرنہ چمن زار کیوں نہ ہو

مخصوص دل ہے کیا مرض عشق جاں گداز
اے کاش اس کو اور کچھ آزار کیوں نہ ہو

آوے جو کوئی آئینہ بازار دہر میں
بارے متاع دل کا خریدار کیوں نہ ہو

مقصود درد دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہر گلے میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو

شاید کہ آوے پرسش احوال کو کبھو
عاشق بھلا سا ہووے تو بیمار کیوں نہ ہو

تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری ادھر
تو اس ستم کا میر سزاوار کیوں نہ ہو

(۳۹۸)

ایسا ہے ماہ گو کہ وہ سب نور کیوں نہ ہو
ویسا ہے پھول فرض کیا حور کیوں نہ ہو

کھویا ہمارے ہاتھ سے آئینے نے اسے
ایسا جو پاوے آپ کو مغرور کیوں نہ ہو

حق برطرف ہے منکر دیدار یار کے
جو شخص ہووے آنکھوں سے معذور کیوں نہ ہو

گیسوے مشک بو کو اسے ضد ہے کھولنا
پھر زخم دل نگاروں کا ناسور کیوں نہ ہو

صورت تو تیری صفحۂ خاطر پہ نقش ہے
ظاہر میں اب ہزار تو مستور کیوں نہ ہو

صافی شست سے ہے غرض مشق تیر سے
سینہ کسو کا خانۂ زنبور کیوں نہ ہو

مجنوں جو دشت گرد تھا ہم شہر گرد ہیں
آوارگی ہماری بھی مذکور کیوں نہ ہو

تلوار کھینچتا ہے وہ اکثر نشے کے بیچ — زخمی جو اس کے ہاتھ کا ہو چور کیوں نہ ہو
خالی نہیں بغل کوئی دیوان سے مرے — افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو
مجھ کو تو یہ قبول ہوا عشق میں کہ میر
پاس اس کے جب گیا تو کہا دور کیوں نہ ہو

(۳۹۹)

ہر دم وہ شوخ دست بہ شمشیر کیوں نہ ہو — کچھ ہم نے کی ہے ایسی ہی تقصیر کیوں نہ ہو
اب تو جگر کو ہم نے بلا کا ہدف کیا — انداز اس نگاہ کا پھر تیر کیوں نہ ہو
جاتا تو ہے کہیں کو تو اے کاروان مصر — کنعاں ہی کی طرف کو یہ شب گیر کیوں نہ ہو
حیراں ہیں اس قدر کہ اگر اب کے جایئے — پھر منہ ترا نہ دیکھیے تصویر کیوں نہ ہو
تونے تو رفتہ رفتہ کیا ہم کو تنگ خلق — وحشت دلا کہاں تئیں زنجیر کیوں نہ ہو
جوں گل کسو شگفتہ طبیعت کا ہے نشاں — غنچہ بھی کوئی خاطر دل گیر کیوں نہ ہو
ہووے ہزار وحشت اسے تو بھی یار ہے
اغیار تیرے ساتھ جو ہوں میر کیوں نہ ہو

(۴۰۰)

دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے کے آثار کو — لے گئی ہیں دور تڑپیں سایۂ دیوار کو
باب صحت ہے وگرنہ کون کہتا ہے طبیب — جلد اٹھاؤ میرے دروازے سے اس بیمار کو
حشر پہ موقوف تھا سو تو نظر آیا نہ یاں — کیا بلا درپیش آئی وعدۂ دیدار کو(۱)
وے جو مست بے خودی ہیں عیش کرتے ہیں مدام — میکدے میں دہر کے مشکل ہے تک ہشیار کو
نقش شیریں یادگار کوہکن ہے اس میں خوب — ورنہ کیا ہے بے ستوں دیکھا ہے میں کہسار کو
کس قدر الجھیں ہیں میرے تار دامن کے کہ اب — پاؤں میں گڑ کر نہیں چبھنے کی فرصت خار کو
ہے غبار میر اس کے رہگذر میں یک طرف
کیا ہوا دامن کشاں آتے بھی یاں تک یار کو

(۴۰۱)

جو میں نہ ہوں تو کرو ترک ناز کرنے کو — کوئی تو چاہیے جی بھی نیاز کرنے کو
نہ دیکھو غنچۂ نرگس کی اور کھلتے میں — جو دیکھو اس کی مژہ نیم باز کرنے کو
نہ سوئے نیند بھر اس تنگنا میں تا نہ موئے — کہ آہ جا نہ تھی پا کے دراز کرنے کو

(۱) نسخۂ محمود آباد

جو بے دماغی یہی ہے تو بن چکی اپنی　　دماغ چاہیے ہر اک سے ساز کرنے کو
وہ گرم ناز ہو تو خلق پر ترحم کر　　پکارے آپ اجل احتراز کرنے کو
جو آنسو آویں تو پی جا کہ تا رہے پردہ　　بلا ہے چشم تر افشائے راز کرنے کو
سمند ناز سے تیرے بہت ہے عرصہ تنگ　　تنک تو ترک کر اس ترک تاز کرنے کو
بسان زر ہے مرا جسم زار سارا زرد　　اثر تمام ہے دل کے گداز کرنے کو
ہنوز لڑکے ہو تم قدر میری کیا جانو　　شعور چاہیے ہے امتیاز کرنے کو
اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے　　ولیک چاہیے ہے منھ بھی ناز کرنے کو

زیادہ حد سے تھی تابوت میر پر کثرت
ہوا نہ وقت مساعد نماز کرنے کو

(۴۰۲)

کرتے بیاں جو ہوتے خریدار ایک دو　　دیکھا کریں ہیں ساتھ ترے یار ایک دو
قید حیات قید کوئی سخت ہے کہ روز　　مر رہتے ہیں گے اس کے گرفتار ایک دو
کس کس پہ اس کو ہووے نظر یاں ہر ایک شب　　جی دیں ہیں اس کی چشم کے بیمار ایک دو
تو تو دوچار ہوکے گیا کب کا یاں ہنوز　　گذریں ہیں اپنی جان سے ناچار ایک دو
ابروے تیغ زن کی تمھارے تو کیا چلی　　کردے ہے جس کا لاگتے ہی وار ایک دو
تک چشم میں بھی سرے کا دنبالہ کھینچیے　　اس مست کے بھی ہاتھ میں تلوار ایک دو

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو

(۴۰۳)

حال دل میر کا اے اہل وفا مت پوچھو　　اس ستم کشتہ پہ جو گذری جفا مت پوچھو
صبح سے اور بھی پاتا ہوں اسے شام کو تند　　کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو
استخواں توڑے مرے اس کی گلی کے سگ نے　　جس خرابی سے میں واں رات رہا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب　　اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
اشتعالک کی محبت نے کہ دربست پھنکا　　شہر دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو
وقت قتل آرزوے دل جو لگے پوچھنے لوگ　　میں اشارت کی ادھر ان نے کہا مت پوچھو

خواہ مارا انھیں نے میر کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

(۴۰۴)

نالۂ شب نے کیا ہے جو اثر مت پوچھو
ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے جگر مت پوچھو

پوچھتے کیا ہو مرے دل کا تم احوال کہ ہے
جیسے بیمار اجل روز بتر مت پوچھو

مرنے میں بند زباں ہونا اشارت ہے ندیم
یعنی ہے دور کا درپیش سفر مت پوچھو

کیا پھرے وہ وطن آوارہ گیا اب سو گیا
دل گم کردہ کی کچھ خیر خبر مت پوچھو

لذت زہر غم فرقت دلداراں سے
ہووے منھ میں جنھوں کے شہد و شکر مت پوچھو

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی
اپنے ناخن میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو

جوں توں کر حال دل اک بار تو میں عرض کیا
میر صاحب جی بس اب بار دگر مت پوچھو

(۴۰۵)

اس کی طرز نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

کہیں پہنچوگے بے رہی میں بھی
گمرہاں یوں یہ راہ مت پوچھو

لوگرفتار دام زلف اس کا
ہے یکی روسیاہ مت پوچھو

ہیں گی برگشتہ وے صف مژگاں
پھر گئی ہے سپاہ مت پوچھو

تھا کرم پر اسی کے شرب مدام ق
میرے اعمال آہ مت پوچھو

تم بھی اے مالکان روز جزا
بخش دو اب گناہ مت پوچھو

میر عاشق کو کچھ کہے ہی بنے
خواہ وہ پوچھو خواہ مت پوچھو

(۴۰۶)

محرماں بے دلی کا میری سبب مت پوچھو
ایک دم چھوڑ دو یوں ہی مجھے اب مت پوچھو

گریۂ شمع کا اے ہم نفساں میں تھا حریف
گذری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو

سر پر شور سے میرے نہ کرو کوئی سوال
حشر تھے داخل خدام ادب مت پوچھو

لب پہ شیون مژہ پر خون و نگہ میں اک یاس
دن گیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو

میرصاحب نئی یہ طرز ہو اس کی تو کہوں
موجب آزردگی کا وجہ غضب مت پوچھو

(۴۰۷)

فرصت نہیں تنک بھی کہیں اضطراب کو　　کیا آفت آگئی مرے اس دل کی تاب کو
میری ہی چشم تر کی کرامات ہے یہ سب　　پھرتا تھا ورنہ ابر تو محتاج آب کو
گذری ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے　　آنکھیں لگا کے اس سے میں ترسوں ہوں خواب کو
خط آگیا پہ اس کا تغافل نہ کم ہوا　　قاصد مرا خراب پھرے ہے جواب کو
تیور میں جب سے دیکھے ہیں ساقی خمار کے　　پیتا ہوں رکھ کے آنکھوں پہ جام شراب کو
اب تو نقاب منھ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی　　شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو

(۴۰۸)

کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو　　عشق کیسا جس میں اتنی روسیاہی بھی نہ ہو
لطف کیا آزردہ ہوکر آپ سے ملنے کے بیچ　　ٹک تری جانب سے جب تک عذر خواہی بھی نہ ہو
چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں　　ناز بےجا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو
مجمع ترکاں ہے کوئی دیکھیو جاکر کہیں　　جس کا میں کشتہ ہوں اس میں وہ سپاہی بھی نہ ہو
مجھ کو آوارہ جو رکھتا ہے مگر چاہے ہے چرخ　　ماتم آسائش غفراں پناہی بھی نہ ہو[1]
نازبرداری تری کرتے تھے اک امید پر　　راتی ہم سے نہیں تو کج کلاہی بھی نہ ہو

یہ دعا کی تھی تجھے کن نے کہ بہر قتل میر
محضر خونیں پہ تیرے اک گواہی بھی نہ ہو

(۴۰۹)

اجرت میں نامہ کی ہم دیتے ہیں جاں تلک تو　　اب کار شوق اپنا پہنچا ہے یاں تلک تو
آغشتہ میرے خوں سے اے کاش جاکے پہنچے　　کوئی پر شکستہ ٹک گلستاں تلک تو
واماندگی نے مارا اثنائے رہ میں ہم کو　　معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو
افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں　　سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو
آوارہ خاک میری ہو کس قدر الٰہی　　پہنچوں غبار ہوکر میں آسماں تلک تو
آنکھوں میں اشک حسرت اور لب پہ شیون آیا　　اے حرف شوق تو بھی آیا زباں تلک تو[2]

اے کاش خاک ہی ہم رہتے کہ میر اس میں
ہوتی ہمیں رسائی اس آستاں تلک تو

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد

(۴۱۰)[1]

آنکھوں سے دل تلک ہیں چنے خوانِ آرزو   نومیدیاں ہیں کتنی ہی مہمانِ آرزو
یک چشم اس طرف بھی تو کافر کہ تو ہی ہے   دین نگاہ حسرت و ایمانِ آرزو
آیا تو اور رنگ رخ یاس چل بسا   جانے لگا تو چلنے لگی جانِ آرزو
اس مچھلے کو سیر کروں کب تلک کہ ہے   دست ہزار حسرت و دامانِ آرزو
پامال یاس آہ کہاں تک رہوں گا میر
سرمشق کیوں کیا تھا میں دیوانِ آرزو

(۴۱۱)[2]

وہی مجھ پہ غصہ وہی یاں سے جا تو   وہی دور ہو تو وہی پھر نہ آ تو
مرے اس کے وعدہ ملاقات کا ہے   کوئی روز اے عمر کیجیو وفا تو
بہت پوچھیو دل کو میری طرف سے   اگر جائے اس کی گلی میں صبا تو
سفینہ مرا ورطۂ غم سے نکلے   جو ٹک ناخدائی کرے اے خدا تو
سب اسباب ہجراں میں مرنے ہی کے تھے
بھلا میر کیونکر کے جیتا رہا تو

(۴۱۲)[3]

نہ آ دام میں مرغ فریاد کیجیو   ٹک اک خاطر خواب صیاد کیجیو
یہ تہمت بڑی ہے کہ مر گئی ہے شیریں   تحمل ٹک اے مرگ فرہاد کیجیو
غم گل میں مرتا ہوں اے ہم صفیرو   چمن میں جو جاؤ مجھے یاد کیجیو
رہائی مری مدعی ضعف سے ہے   تو صیاد مجھ کو نہ آزاد کیجیو
مرے روبرو آئینہ لے کے ظالم   دم واپسیں میں تو تو شاد کیجیو
جدا تن سے کرتے ہی پامال کرنا
یہ احساں مرے سر پہ جلاد کیجیو

(۴۱۳)[4]

اس بے گنہ کے قتل میں اب دیر مت کرو   جو کچھ کہ تم سے ہو سکے تقصیر مت کرو
ایفائے عہد قتل تو تم کر کے چکے ہو
اتنے بھی خلف وعدہ سے دلگیر مت کرو

(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد

(۴۱۴)[1]

فاتحہ کو نہ آیا بعد از مرگ
میر کے یار کی طرح دیکھو

(۴۱۵)[2]

نور نظر کو کھوکے میں سوؤں گا دیکھیو
دل بھر رہا ہے خوب ہی روؤں گا دیکھیو

(۴۱۶)[3]

جیسے نسیم ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو
خانہ بہ خانہ در بہ در شہر بہ شہر کو بہ کو

(۴۱۷)[4]

لائق نہیں تمھارے مژگان خوش نگاہاں
مجروح دل کو میرے کانٹوں میں مت گھسیٹو

(۴۱۸)[5]

عشق میں مرگ ابتدا لے تو
جو نہ مانو تو انتہا لے تو

ردیف ہ

(۴۱۹)

سو ظلم کے رہتے ہیں سزاوار ہمیشہ
ہم بے گنہ اس کے ہیں گنہگار ہمیشہ

ایک آن گذر جائے تو کہنے میں کچھ آوے
درپیش ہے یاں مردن دشوار ہمیشہ

دشمن کو نہ کیوں شرب مدام آوے میسر
رہتی ہے ادھر ہی نگہ یار ہمیشہ

یوسف سے کئی آن کے تیرے سر بازار
بک جاتے ہیں باتوں میں خریدار ہمیشہ

ہے دامن گل چین چمن جیب ہمارا
دنیا میں رہے دیدۂ خوں بار ہمیشہ

جو بن ترے دیکھے سوا دوزخ میں ہے یعنی
رہتی ہے اسے حسرت دیدار ہمیشہ

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمود آباد (۳) تا (۵) نسخۂ نول کشور

جینا ہے تو بے طاقتی و بے خودی ہے میر
مردہ ہے غرض عشق کا بیمار ہمیشہ

(۴۲۰)

جگر لوہو کو ترسے ہے میں سچ کہتا ہوں دل خستہ — دلیل اس کی نمایاں ہے مری آنکھیں ہیں خوں بستہ
چمن میں دل خراش آواز آتی ہے چلی شاید — پس دیوار گلشن نالہ کش ہے کوئی پر بستہ
جگر سوزاں و دل بریاں برہنہ پا و سر قرباں — تجاوز کیا کروں اس سے کہ ان ہی کا ہوں وابستہ[1]
ترے کوچے میں یکسر عاشقوں کے خار مژگاں ہیں — جو تو گھر سے کبھو نکلے تو رکھیو پاؤں آہستہ
مرے آگے نہیں ہنستا تو آ اک صلح کرتا ہوں — بھلا میں روؤں دو دریا تبسم کر تو یک پستہ
تعجب ہے مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں — سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ
تری گل گشت کی خاطر بنا ہے باغ داغوں سے — پر طاؤس سینہ ہے تمامی دست گلدستہ

بجا ہے گر فلک پر فخر سے پھینکے کلاہ اپنی
کہے جو اس زمیں میں میر یک مصراع برجستہ

(۴۲۱)

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزہ ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بود آدم نمود شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا — دل سے اپنے ہمیں گلہ ہے یہ
شور سے اپنے حشر ہے پردہ — یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض — ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ
نعشیں اٹھتی ہیں آج یاروں کی — آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ
دیکھ بے دم مجھے لگا کہنے — ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میں تو چپ ہوں وہ ہونٹ چاٹے ہے — کیا کہوں ریجھنے کی جا ہے یہ
ہے رے بیگانگی کبھو ان نے — نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
تیغ پر ہاتھ دم بہ دم کب تک — اک لگا چک کہ مدعا ہے یہ

میر کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۴۲۲)

دل پر خوں ہے یہاں تجھ کو گماں ہے شیشہ
شیخ کیوں مست ہوا ہے تو کہاں ہے شیشہ

شیشہ بازی تو ٹک دیکھنے آ آنکھوں کی
ہر پلک پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ

روسفیدی ہے نقاب رخ شور مستی
ریش قاضی کے سبب پنبہ دہاں ہے شیشہ

منزل مستی کو پہنچے ہے انھیں سے عالم
نشۂ مے بلد و سنگ نشاں ہے شیشہ

درمیاں حلقۂ مستاں کے شب اس کی جا تھی
دور ساغر میں مگر پیر مغاں ہے شیشہ

جاکے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں
ق
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کرکے گداز
شکل شیشے کی بنائے ہیں کہاں ہے شیشہ

جھک گیا دیکھ کے میں میرؔ اسے مجلس میں
چشم بد دور طرحدار جواں ہے شیشہ

(۴۲۳)

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
پر ہوسکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

کل بے تکلفی میں لطف اس بدن کا دیکھا
نکلا نہ کر قبا سے اے گل بس اب ڈھپا رہ

عاشق غیور جی دے اور اس طرف نہ دیکھے
وہ آنکھ جو چھپاوے تو تو بھی ٹک کھنچا رہ

پہنچیں گے آگے دیکھیں کس درجہ کو ابھی تو
اس ماہ چاردہ کا سن دس ہے یا کہ بارہ

کھینچا کرے ہے ہر دم کیا تیغ بوالہوس پر
اس ناسزائے خوں کے اتنا نہ سر چڑھا رہ

مستظہر محبت تھا کوہکن وگرنہ
یہ بوجھ کس سے اٹھتا ایک اور ایک گیارہ

ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل
بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے
جوں گرد راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ

اس خط سبز نے کچھ رویت نہ رکھی تیری
کیا ایسی زندگانی جا خضر زہر کھا رہ

حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اچھلنا
کاہے کو جاتے ہیں ہم اے خرس اب بندھا رہ

میں تو ہیں وہم دونوں کیا ہے خیال تجھ کو
جھاڑ آستین مجھ سے ہاتھ آپ سے اٹھا رہ

جیسے خیال مفلس جاتا ہے سو جگہ تو
مجھ بے نوا کے بھی گھر ایک آدھ رات آ رہ

دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا
آئندہ تو بھی ہم سا ہوکر شکستہ پا رہ

جب ہوش میں تو آیا اودھر ہی جاتے پایا
اس سے تو میرؔ چندے اس کوچے ہی میں جا رہ

(۴۲۴)

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ — کیا پوچھتے ہو الحمدللہ
مر جاؤ کوئی پروا نہیں ہے — کتنا ہے مغرور اللہ اللہ
پیر مغاں سے بے اعتقادی — استغفر اللہ استغفر اللہ
کہتے ہیں اس کے تو منھ لگے گا — ہو یوں ہی یارب جوں ہے یہ افواہ
حضرت سے اس کی جانا کہاں ہے — اب مر رہے گا یاں بندہ درگاہ
سب عقل کھوئے ہے راہ محبت — ہو خضر دل میں کیسا ہی گمراہ
مجرم ہوئے ہم دل دے کے ورنہ — کس کو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
کیا کیا نہ ریجھیں تم نے پچائیں — اچھا رجھایا اے مہرباں آہ
گذرے ہے دیکھیں کیونکر ہماری — اس بے وفا سے نے رسم نے راہ
تھی خواہش دل رکھنا حمائل ق — گردن میں اس کی ہر گاہ و بیگاہ
اس پر کہ تھا وہ شہ رگ سے اقرب — ہرگز نہ پہنچا یہ دست کوتاہ
ہے ماسوا کیا جو میرؔ کہیے ق — آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ
جلوے ہیں اس کے شانیں ہیں اس کی — کیا روز کیا خور کیا رات کیا ماہ

ظاہر کہ باطن اول کہ آخر
اللہ اللہ اللہ

(۴۲۵)

جو ہوشیار ہو سو آج ہو شراب زدہ — زمین میکدہ یک دست ہے گی آب زدہ
بنے یہ کیونکے ملے تو ہی یا ہمیں سمجھیں — ہم اضطراب زدہ اور تو حجاب زدہ
کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں — اجل رسیدہ جفا دیدہ اضطراب زدہ
جدا ہو رخ سے تری زلف میں نہ کیوں دل جائے — پناہ لیتے ہیں سائے کی آفتاب زدہ

لگا نہ ایک بھی میرؔ اس کی بیت ابرو کو
اگرچہ شعر تھے سب میرے انتخاب زدہ

(۴۲۶)

جز جرم عشق کوئی بھی ثابت کیا گناہ — ناحق ہماری جان لی اچھے ہو واہ واہ
اب کیسا چاک چاک ہو دل اس کے ہجر میں — گتھواں تو لخت دل سے نکلتی ہے میری آہ
شام شب وصال ہوئی یاں کہ اس طرف — ہونے لگا طلوع ہی خورشید رو سیاہ

گذرا میں اس سلوک سے دیکھا نہ کر مجھے
برچھی سی لاگ جا ہے جگر میں تری نگاہ

دامان و جیب چاک خرابی و خستگی
ان سے ترے فراق میں ہم نے کیا نباہ(۱)

بیتابیوں کو سونپ نہ دینا کہیں مجھے
اے صبر میں نے آن کے لی ہے تری پناہ

خوں بستہ بارے رہنے لگی اب تو یہ مژہ
آنسو کی بوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ

گل سے شگفتہ داغ دکھاتا ہوں تیرے تئیں
گر موافقت کرے ہے فلک مجھ سے سال و ماہ(۲)

گر منع مجھ کو کرتے ہیں تیری گلی سے لوگ
کیونکر نہ جاؤں مجھ کو تو مرنا ہے خوانخواہ(۳)

ناحق الجھ پڑا ہے یہ مجھ سے طریق عشق
جاتا تھا میر میں تو چلا اپنی راہ راہ

(۴۲۷)

کہتے ہیں اڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ
کچھ سنی سوختگاں تم خبر پروانہ

سعی اتنی یہ ضروری ہے اٹھے بزم سلگ
اے جگر تفتگی بے اثر پروانہ

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جاں سوز
پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ

آ پڑا آگ میں اے شمع یہیں سے تو سمجھ
کس قدر داغ ہوا تھا جگر پروانہ

بزم دنیا کی تو دل سوزی سنی ہوگی میر
کس طرح شام ہوئی یاں سحر پروانہ

(۴۲۸)

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ

دل جگر جان یہ بھسمنت ہوئے سینے میں
گھر کو آتش دی محبت نے جلا کیا کیا کچھ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

آہ مت پوچھ ستمگار کہ تجھ سے تھی ہمیں
چشم لطف و کرم و مہر و وفا کیا کیا کچھ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
ق ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ

طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو ایک مری
واسطے تیرے سنا میں نے سنا کیا کیا کچھ

حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

درد دل زخم جگر کلفت غم داغ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

چشم نمناک و دل پر جگر صد پارہ
دولت عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کیا کچھ

تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں
خاک کن کن کی ہوئی صرف بنا کیا کیا کچھ

(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذ و مشفق ق مضطرب ہو کے اسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ
پر کہوں کیا رقم شوق کی اپنے تاثیر ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

(۴۲۹)

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ   جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ
رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے   جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ
مر گئے پر بھی کھلی رہ گئیں آنکھیں اپنی   کون اس طرح موا حسرت دیدار کے ساتھ
شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال   چشم مشتاق لگی جائے ہے طومار کے ساتھ
راہ اس شوخ کی عاشق سے نہیں رک سکتی   جان جاتی ہے چلی خوبی رفتار کے ساتھ
وے دن اب سالتے ہیں راتوں کو برسوں گذرے   جن دنوں دیر رہا کرتے تھے ہم یار کے ساتھ
ذکر گل کیا ہے صبا اب کہ خزاں میں ہم نے   دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ
کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ   دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خونبار کے ساتھ
میری اس شوخ سے صحبت ہے بعینہ ویسی   جیسے بن جائے کسو سادے کو عیار کے ساتھ
دیکھیے کس کو شہادت سے سر افراز کریں   لاگ تو سب کو ہے اس شوخ کی تلوار کے ساتھ
بے کلی اس کی نہ ظاہر تھی جو تو اے بلبل
دم کش میر ہوئی اس لب و گفتار کے ساتھ

(۴۳۰)[۱]

دل سمجھتا ہی نہیں ہمارا آہ
زلف اس کی ہے ایک مار سیاہ

ردیف ی

(۴۳۱)

دل کو تسکین نہیں اشک دمادم سے بھی   اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی
ہم نشیں کیا کہوں اس رشک مہ تاباں بن   صبح عید اپنی ہے بدتر شب ماتم سے بھی
کاش اے جان المناک نکل جاوے تو   اب تو دیکھا نہیں جاتا یہ ستم ہم سے بھی

(۱) نسخۂ نول کشور

آخرکار محبت میں نہ نکلا کچھ کام   سینہ چاک و دل پژمردہ مژہ نم سے بھی
آہ ہر غیر سے تاچند کہوں جی کی بات   عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی
دوری کوچہ میں اے غیرت فردوس تری   کام گذرا ہے مرا گریۂ آدم سے بھی
ہمت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغ خیال
اک پرافشانی میں گذرے سرعالم سے بھی

(۴۳۲)

تاب دل صرف جدائی ہوچکی   یعنی طاقت آزمائی ہوچکی
چھوٹتا کب ہے اسیر خوش زباں   جیتے جی اپنی رہائی ہوچکی
آگے ہو مسجد کے نکلی اس کی راہ   شیخ سے اب پارسائی ہوچکی
درمیاں ایسا نہیں اب آئینہ   میرے اس کے اب صفائی ہوچکی
ایک بوسہ مانگتے لڑنے لگے   اتنے ہی میں آشنائی ہوچکی
بیچ میں ہم ہی نہ ہوں تو لطف کیا   رحم کر اب بے وفائی ہوچکی
آج پھر تھا بے حمیت میرؔ واں
کل لڑائی سی لڑائی ہوچکی

(۴۳۳)

آخر ہماری خاک بھی برباد ہوگئی   اس کی ہوا میں ہم پہ تو بیداد ہوگئی
مدت ہوئی نہ خط ہے نہ پیغام ہے مگر   اک رسم تھی وفا کی پر افتاد ہوگئی
دل کس قدر شگفتہ ہوا تھا کہ رات میرؔ
آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہوگئی

(۴۳۴)

یہ چشم آئینہ دار رو تھی کسو کی   نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی   کہ اس ست پیماں میں بو تھی کسو کی
یہ سرگشتہ جب تک رہا اس چمن میں   برنگ صبا جستجو تھی کسو کی
نہ ٹھہری تنک اک جان بر لب رسیدہ   ہمیں مدعا گفتگو تھی کسو کی
جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو   کہ اس تند سرکش میں خو تھی کسو کی
نہ تھے تجھ سے نازک میانان گلشن   بہت تو کمر جیسے مو تھی کسو کی
دم مرگ دشوار دی جان ان نے
مگر میرؔ کو آرزو تھی کسو کی

(۴۳۵)

ہے غزل میرؔ یہ شفائیؔ کی — ہم نے بھی طبع آزمائی کی
اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی — شب نہ آخر ہوئی جدائی کی
اسی تقریب اس گلی میں رہے — منتیں ہیں شکستہ پائی کی
دل میں اس شوخ کے نہ کی تاثیر — آہ نے آہ نارسائی کی
کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس — ہم نے دیدار کی گدائی کی
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ
کس بھروسے پہ آشنائی کی

(۴۳۶)

آہ میری زبان پر آئی — یہ بلا آسمان پر آئی
عالم جاں سے تو نہیں آیا — ایک آفت جہان پر آئی
پیری آفت ہے پھر نہ تھا گویا — یہ بلا جس جوان پر آئی
ہم بھی حاضر ہیں کھینچیے شمشیر — طبع گر امتحان پر آئی
تب ٹھکانے لگی ہماری خاک — جب ترے آستان پر آئی[(۱)]
آتش رنگ گل سے کیا کہیے — برق تھی آشیان پر آئی
طاقت دل برنگ نکہت گل — پھیر اپنے مکان پر آئی
ہو جہاں میرؔ اور غم اس کا
جس سے عالم کی جان پر آئی

(۴۳۷)

بات شکوے کی ہم نے گاہ نہ کی — بلکہ دی جان اور آہ نہ کی
گل و آئینہ ماہ و خور کن نے — چشم اس چہرے پر سیاہ نہ کی
کعبے سو بار وہ گیا تو کیا — جس نے یاں ایک دل میں راہ نہ کی
واہ اے عشق اس ستمگر نے — جاں فشانی پہ میری واہ نہ کی
جس سے تھی چشم ہم کو کیا کیا میرؔ
اس طرف ان نے اک نگاہ نہ کی

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

(۴۳۸)

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لیے بیتابی — آخر کو گرو رکھا سجادۂ محرابی
جاگا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکب مے ہو — یہ بات جھاتی ہے ان آنکھوں کی بے خوابی
کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و پا کو ہو — اب بڑھ گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی
دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں — کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا — جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی
خوں بستہ نہ کیوں پلکیں ہر لحظہ رہیں میری — جاتے نہیں آنکھوں سے لب یار کے عنابی
جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے — کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی
تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ جلوے میں — ہے خاک سے آج ان کی ہر صحن میں مہتابی

کل میر جو یاں آیا طور اس کا بہت بھایا
وہ خشک لبی تس پہ جامہ گلے میں آبی

(۴۳۹)

ہمیں آمد میر کل بھا گئی — طرح اس میں مجنوں کی سب پا گئی
کہاں کا غبار آہ دل میں یہ تھا — مری خاک بدلی سی سب چھا گئی
کیا پاس بلبل خزاں نے نہ کچھ — گل و برگ بے درد پھیلا گئی
ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے — ہمیں سے وہ کچھ آنکھ شرما گئی
جگر منہ تک آتے نہیں بولتے — غرض ہم بھی کرتے ہیں کیا کیا گئی
نہ ہم رہ کوئی ناکسی سے گیا — مری لاش تا گور تنہا گئی
گھٹا شمع ساں کیوں نہ جاؤں چلا — تب غم جگر کو مرے کھا گئی
کوئی رہنے والی ہے جان عزیز — گئی گر نہ امروز فردا گئی

کیے دست و پا گم جو میر آ گیا
وفا پیشہ مجلس اسے پا گئی

(۴۴۰)

یکسو کشادہ روئی پرچیں نہیں جبیں بھی — ہم چھوڑی مہر اس کی کاش اس کو ہووے کیں بھی
آنسو تو تیرے دامن پونچھے ہے وقت گریہ — ہم نے نہ رکھی منہ پر اے ابر آستیں بھی
کرتا نہیں عبث تو پارہ گلو فغاں سے — گذرے ہے پار دل کے اک نالۂ حزیں بھی
ہوں احتضار میں میں آئینہ رو شتاب آ — جاتا ہے ورنہ غافل پھر دم تو واپسیں بھی

سینے سے تیر اس کا جی کو تو لیتا نکلا　　پر ساتھوں ساتھ اس کے نکلی اک آفریں بھی
ہر شب تری گلی میں عالم کی جان جا ہے　　آگے ہوا ہے اب تک ایسا ستم کہیں بھی
شوخی جلوہ اس کی تسکین کیونکے بخشے　　آئینوں میں دلوں کے جو ہے بھی پھر نہیں بھی
گیسو ہی کچھ نہیں ہے سنبل کی آفت اس کا　　ہیں برق خرمن گل رخسار آتشیں بھی
تکلیف نالہ مت کر اے درد دل کہ ہوں گے　　رنجیدہ راہ چلتے آزردہ ہم نشیں بھی
کس کس کا داغ دیکھیں یارب غم بتاں میں　　رخصت طلب ہے جاں بھی ایمان اور دیں بھی

زیر فلک جہاں تک آسودہ میر ہوتے
ایسا نظر نہ آیا اک قطعۂ زمیں بھی

(۴۴۱)

گئی چھاؤں اس تیغ کی سر سے جب کی　　جلے دھوپ میں یاں تلک ہم کہ تب کی
پڑی خرمن گل پہ بجلی سی آخر　　مرے خوش نگہ کی نگاہ اک غضب کی
کوئی بات نکلے ہے دشوار منھ سے　　تنک اک تو بھی تو سن کسی جاں بلب کی
تو شملہ جو رکھتا ہے خر ہے وگرنہ　　ضرورت ہے کیا شیخ دم اک وجب کی
یکایک بھی آ سر پہ واماندگاں کے　　بہت دیکھتے ہیں تری راہ کب کی
دماغ و جگر دل مخالف ہوئے ہیں　　ہوئی متفق اب ادھر رائے سب کی
تجھے کیونکے ڈھونڈوں کہ سوتے ہی گذری　　تری راہ میں اپنے پائے طلب کی
دل عرش سے گذرے ہے ضعف میں بھی　　یہ زور آوری دیکھو زاری شب کی

عجب کچھ ہے گر میر آوے میسر
گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

(۴۴۲)

کیسے قدم سے اس کی گلی میں صبا گئی　　یوں پھونک کرکے خاک مری سب اڑا گئی
کچھ تھی طپش جگر کی تو بارے مزاج داں　　پر دل کی بےقراری مری جان کھا گئی
کس پاس جا کے بیٹھوں خرابے میں اب میں ہائے　　مجنوں کو موت کیسی شتابی سے آ گئی
کون اس ہوا میں زخمی نہیں میری آہ کا　　بجلی رہی تھی سو بھی تو سینہ دکھا گئی

سودا جو اس کے سر سے گیا زلف یار کا
تو تو بڑی ہی میر کے سر سے بلا گئی

(۴۴۳)

خبر نہ تھی تجھے کیا میرے دل کی طاقت کی — نگاہ چشم ادھر تو نے کی قیامت کی
انھوں میں جو کہ ترے محو سجدہ رہتے ہیں — نہیں ہے قدر ہزاروں برس کی طاعت کی
اٹھائی ننگ سمجھ تم نے بات کے کہتے — وفا و مہر جو تھی رسم ایک مدت کی
رکھیں امید رہائی اسیر کاکل و زلف — مری تو باتیں ہیں زنجیر صرف الفت کی
رہے ہے کوئی خرابات چھوڑ مسجد میں — ہوا منائی اگر شیخ نے کرامت کی
سوال میں نے جو انجام زندگی سے کیا — قد خمیدہ نے سوے زمیں اشارت کی
نہ میری قدر کی اس سنگ دل نے میر کبھو
ہزار حیف کہ پتھر سے میں محبت کی

(۴۴۴)

فکر ہے ماہ کے جو شہر بدر کرنے کی — ہے سزا تجھ پہ یہ گستاخ نظر کرنے کی
کہہ حدیث آنے کی اس کے جو کیا شادی مرگ — نامہ بر کیا چلی تھی ہم کو خبر کرنے کی
کیا جلی جاتی ہے خوبی ہی میں اپنی اے شمع — کہہ پتنگے کے بھی کچھ شام و سحر کرنے کی
اب کے برسات ہی کے ذمے تھا عالم کا وبال — میں تو کھائی تھی قسم چشم کے تر کرنے کی
پھول کچھ لیتے نہ نکلے تھے دل صد پارہ — طرز سیکھی ہے مرے ٹکڑے جگر کرنے کی
ان دنوں نکلے ہے آغشتہ بہ خوں راتوں کو — دھن ہے نالے کو کسو دل میں اثر کرنے کی
عشق میں تیرے گذرتی نہیں بن سر پٹکے — صورت اک یہ رہی ہے عمر بسر کرنے کی
کاروانی ہے جہاں عمر عزیز اپنی میر
رہ ہے درپیش سدا اس کو سفر کرنے کی

(۴۴۵)

خرابی کچھ نہ پوچھو ملکت دل کی عمارت کی — غموں نے آج کل سنیو وہ آبادی ہی غارت کی
نگاہ مست سے جب چشم نے اس کی اشارت کی — حلاوت مے کی اور بنیاد میخانے کی غارت کی
سحرگہ میں نے پوچھا گل سے حال زار بلبل کا — پڑے تھے باغ میں یک مشت پر اودھر اشارت کی
جلایا جس تجلی جلوہ گر نے طور کو ہم دم — اسی آتش کے پرکالے نے ہم سے بھی شرارت کی
نزاکت کیا کہوں خورشید رو کی کل شب مہ میں — گیا تھا سائے سائے باغ تک تس پر حرارت کی
نظر سے جس کی یوسف سا گیا پھر اس کو کیا سوجھے — حقیقت کچھ نہ پوچھو پیر کنعاں کی بصارت کی[1]

(۱) نسخۂ محمودآباد

ترے کوچے کے شوق طوف میں جیسے بگولا تھا
بیاباں میں غبار میر کی ہم نے زیارت کی

(۴۴۶)

میں نے جو بیکسانہ مجلس میں جان کھوئی
سر پر مرے کھڑی ہو شب شمع زور روئی

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر
منھ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

بے طاقتی سے آگے کچھ پوچھتا بھی تھا سو
رونے نے ہر گھڑی کے وہ بات ہی ڈبوئی

بلبل کی بے گلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی

اس ظلم پیشہ کی یہ رسم قدیم ہے گی
غیروں پہ مہربانی یاروں سے کینہ جوئی

نوبت جو ہم سے گاہے آتی ہے گفتگو کی
منھ میں زباں نہیں ہے اس بد زباں کے گوئی

اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میر یاد دیوے
اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

(۴۴۷)

الم سے یاں تئیں میں مشق ناتوانی کی
کہ میری جان نے تن پر مرے گرانی کی

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

ملائی خوب مری خوں میں خاک بسمل گاہ
یہ تھوڑی منتیں ہیں مجھ پہ سخت جانی کی

بتنگ ہوں میں ترے اختلاط سے پیری
قسم ہے اپنی مجھے اس گئی جوانی کی

چلا ہے کھینچنے تصویر میرے بت کی آج
خدا کے واسطے صورت تو دیکھو مانی کی

تری گلی کے ہر اک سگ نے استخواں توڑے
ہماری لاش کی شب خوب پاسبانی کی

رکھے ہیں میر ترے منھ سے بے وفا خاطر
تری جفا کی تغافل کی بدگمانی کی

(۴۴۸)

لاعلاجی سے جو رہتی ہے مجھے آوارگی
کیجیے کیا میر صاحب بندگی بے چارگی

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا یکبارگی

روے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز
رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

اشک خونیں آنکھ میں بھر لا کے پی جاتا ہوں میں
محتسب رکھتا ہے مجھ پر تہمت مے خوارگی

مت فریب سادگی کھا ان سیہ چشموں کا میر
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے بڑی عیارگی

(۴۴۹)

گیسو سے اس کے میں نے کیوں آنکھ جا لگائی — جو اپنے جیسے جی کو ایسی بلا لگائی
تھا دل جو پکا پھوڑا بسیاری الم سے — دکھتا گیا دو چنداں جوں جوں دوا لگائی
ذوق جراحت اس کا کس کو نہیں ہے لیکن — بخت اس کے جس کے ان نے تیغ جفا لگائی
دم بھی نہ لینے پایا پانی بھی پھر نہ مانگا — جس تشنہ لب کو ان نے تلوار آ لگائی
تھا صید ناتواں میں لیکن لہو سے میرے — پاؤں پہ ان نے اپنے بھر کر حنا لگائی
بالعکس آج اس کے سارے سلوک دیکھے — کیا جانوں دشمنوں نے کل اس سے کیا لگائی
جو آنسو پی گیا میں آخر کو میرؔ ان نے
چھاتی جلا جگر میں اک آگ جا لگائی

(۴۵۰)

دو دن سے کچھ بنی تھی سو پھر شب بگڑ گئی — صحبت ہماری یار سے بے ڈھب بگڑ گئی
واشد کچھ آگے آہ سے ہوتی تھی دل کے تیں — اقلیم عاشقی کی ہوا اب بگڑ گئی
گرمی نے دل کی ہجر میں اس کے جلا دیا — شاید کہ احتیاط سے یہ تب بگڑ گئی
خط نے نکل کے نقش دلوں کے اٹھا دیے — صورت بتوں کی اچھی جو تھی سب بگڑ گئی
باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

(۴۵۱)

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر — سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
گل یار کرے ہے گا اسباب سفر شاید — غنچے کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی
اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو
کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

(۴۵۲)

ہوگئی شہر شہر رسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی
یک بیاباں برنگ صوت جرس — مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش　　اس کی تصویر وہ ہے ہرجائی
سر رکھوں اس کے پاؤں پر لیکن　　دست قدرت یہ میں کہاں پائی
میر جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہوگیا ہوں سودائی

(۴۵۳)

تو گلے ملتا نہیں ہم سے تو کیسی خرمی　　عید آئی یاں ہمارے بر میں جامہ ماتمی
جی بھرا رہتا ہے اب آٹھوں پہر مانند ابر　　سینکڑوں طوفاں بغل میں ہے یہ مژگاں ماتمی
حشر کو زیر و زبر ہوگا جہاں سچ ہے ولے　　ہے قیامت شیخ جی اس کارگہ کی برہمی
تجھ سوا محبوب آتش طبع اے ساقی نہیں　　ہو پرستاروں میں تیرے گر پری ہو آدمی
سامنے ہوجائیں اے ظالم تو دونوں ہیں برے　　وہ دم شمشیر تیرا یہ ہماری بے دمی
اس قیامت جلوہ سے بہتیرے ہم سے جی اٹھیں　　مر گئے تو مر گئے ہم اس کی کیا ہوگی کمی
کچھ پریشانی سی ہے سنبل کی جو الجھے ہے میر
یک جہاں برہم کرے زلفوں کی اس کی درہمی

(۴۵۴)

اب ضعف سے ڈھہتا ہے بیتابی شتابی کی　　اس دل کے تڑپنے نے کیا خانہ خرابی کی
ان درس گہوں میں وہ آیا نہ نظر ہم کو　　کیا نقل کروں خوبی اس چہرہ کتابی کی
بھنتے ہیں دل اک جانب سکتے ہیں جگر یک سو　　ہے مجلس مشتاقاں دکان کبابی کی
تلخ اس لب مے گوں سے سب سنتے ہیں کس خاطر　　تہ دار نہیں ہوتی گفتار شرابی کی
یک بو کشی بلبل ہے موجب صد مستی　　پرزور ہے کیا دارو غنچے کی گلابی کی
اب سوز محبت سے سارے جو پھپھولے ہیں　　ہے شکل مرے دل کی سب شیشہ حبابی کی
نشمردہ مرے منھ سے یاں حرف نہیں نکلا
جو بات کہ میں نے کی سو میر حسابی کی

(۴۵۵)

مجھ سا بیتاب ہووے جب کوئی　　بے قراری کو جانے تب کوئی
ہاں خدا مغفرت کرے اس کو　　صبر مرحوم تھا عجب کوئی
جان دے گو مسیح پر اس سے　　بات کہتے ہیں تیرے لب کوئی
بعد میرے ہی ہوگیا سنسان　　سونے پایا تھا ورنہ کب کوئی

اس کے کوچے میں حشر تھے مجھ تک — آہ و نالہ کرے نہ اب کوئی
ایک غم میں ہوں میں ہی عالم میں — یوں تو شاداں ہے اور سب کوئی(۱)
ناسمجھ یوں خفا بھی ہوتا ہے — مجھ سے مخلص سے بے سبب کوئی(۲)
اور محزوں بھی ہم سنے تھے ولے — ق — میر سا ہوسکے ہے کب کوئی
کہ تلفظ طرب کا سن کے کہے
شخص ہوگا کہیں طرب کوئی

(۴۵۶)

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی — دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے — ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
کب تھا یہ شور نوحہ ترا عشق جب نہ تھا — دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی
وہ اور کوئی ہوگی سحر جب ہوئی قبول — شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و رنج — لیکن ہماری جان پہ ایسی بلا نہ تھی
دیکھے دیارِ حسن کے میں کارواں بہت — لیکن کسو کے پاس متاعِ وفا نہ تھی
آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک — آنکھوں میں تیری دخترِ رز کیا حیا نہ تھی
اس وقت سے کیا ہے مجھے تو چراغِ وقف — مخلوق جب جہاں میں نسیم و صبا نہ تھی
پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میر
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

(۴۵۷)

چھن گیا سینہ بھی کلیجا بھی — یار کے تیر جان لے جا بھی(۳)
کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز — سامنے سے مرے ارے جا بھی
حال کہہ چپ رہا جو میں بولا — کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا بھی
میں کہا میر جاں بلب ہے شوخ — ق — تو نے کوئی خبر کو بھیجا بھی
کہنے لاگا نہ واہی بک اتنا
کیوں ہوا ہے سڑی ابے جا بھی

(۴۵۸)

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد (۳) یہ مطلع اگلے شعر سے مربوط ہے۔ مصحح

کب تلک داغ دکھاوے گی اسیری مجھ کو — مر گئے ساتھ کے میرے تو گرفتار کئی
وے ہی چالاکیاں ہاتھوں کی ہیں جو اول تھیں — اب گریباں میں مرے رہ گئے ہیں تار کئی
خوف تنہائی نہیں کر تو جہاں سے تو سفر — ہر جگہ راہ عدم میں ملیں گے یار کئی
اضطراب و قلق و ضعف میں کس طور جیوں — جان واحد ہے مری اور ہیں آزار کئی
کیوں نہ ہوں خستہ بھلا میں کہ ستم کے تیرے — تیر ہیں پار کئی وار ہیں سوفار کئی

اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن
یادگار مژۂ میر ہیں واں خار کئی

(۴۵۹)

میری پرسش پہ تری طبع اگر آوے گی — صورت حال تجھے آپھی نظر آوے گی
محو اس کا نہیں ایسا کہ جو چیتے گا شتاب — اس کے بے خود کی بہت دیر خبر آوے گی
کتنے پیغام چمن کو ہیں سو دل میں ہیں گرہ — کسو دن ہم تئیں بھی باد سحر آوے گی
ابر مت گور غریباں پہ برس غافل آہ — ان دل آزردوں کے جی میں بھی لہر آوے گی

میر میں جیتوں میں آؤں گا اسی دن جس دن
دل نہ تڑپے گا مرا چشم نہ بھر آوے گی

(۴۶۰)

کیا کروں شرح خستہ جانی کی — میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا — تم نے پوچھا تو مہربانی کی
سب کو جانا ہے یوں تو پر اے صبر — آتی ہے اک تری جوانی کی
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق — نہ ملی ایک بوند پانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل — دھوم ہے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

(۴۶۱)

ہے یہ بازار جنوں منڈی ہے دیوانوں کی — یاں دکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کی
کیونکے کہیے کہ اثر گریۂ مجنوں کو نہ تھا — گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی
یہ بگولہ تو نہیں دشت محبت میں سے — جمع ہو خاک اڑی کتنے پریشانوں کی
خانقہ کا تو نہ کر قصد تک اے خانہ خراب — یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی

سیل اشکوں سے بہے صرصر آہوں سے اڑے　　مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوئی ویرانوں کی
دل و دیں کیسے کہ اس رہزن دلہا سے اب　　یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی
کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرت شمع　　کر قدم رنجہ کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی
سرگذشتیں نہ مری سن کہ اچٹتی ہے نیند　　خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی

میکدے سے تو ابھی آیا ہے مسجد میں میر
ہو نہ لغزش کہیں مجلس ہے یہ بیگانوں کی

(۴۶۲)

ملا غیر سے جا جفا کیا نکالی　　اکت لے کے آخر ادا کیا نکالی
طبیبوں نے تجویز کی مرگ عاشق　　مناسب مرض کے دوا کیا نکالی
نہیں اس گذرگہ سے آتی ادھر اب　　نئی راہ کوئی صبا کیا نکالی
دلا اس کے گیسو سے کیوں لگ چلا تو　　یہ اک اپنے جی کی بلا کیا نکالی
رجھا ہی دیا واہ رے قدردانی　　وفا کی ہماری جزا کیا نکالی
دم صبح جوں آفتاب آج ظالم　　نکلتے ہی تیغ جفا کیا نکالی

لگے در بدر میر چلاتے پھرنے
گدا تو ہوئے پر صدا کیا نکالی

(۴۶۳)

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری　　نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا　　خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس　　ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری
وہ نقش پائے ہوں میں مٹ گیا ہو جو رہ میں　　نہ کچھ خبر ہے نہ سدھ ہے گی رہرواں میری
شب اس کے کوچے میں جاتا ہوں اس توقع پر　　کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری
اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا　　گئی یہ عمر عزیز آہ رائیگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا　　گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری
نہیں ہے تاب و تواں کی جدائی کا اندوہ　　کہ ناتوانی بہت ہے مزاج داں میری[1]
رہا میں در پس دیوار باغ مدت لیک　　گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغاں میری
ہوا ہوں گریۂ خونیں کا جب سے دامن گیر　　نہ آستین ہوئی پاک دوستاں میری

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر
پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

(۱) نسخۂ محمودآباد

(۴۶۴)

اب کے بھی میر باغ کی جی میں ہوس رہی اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی
میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک آتی اگرچہ دیر صداے جرس رہی
لطف قباے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز دیکھی نہیں ہے ان نے تری چولی چس رہی
دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی
خالی شگفتگی سے جراحت نہیں کوئی ہر زخم یاں ہے جیسے کلی ہو بکس رہی
دیوانگی کہاں کہ گریباں سے تنگ ہوں گردن مری ہے طوق میں گویا کہ پھنس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میر بھی سو یک نفس رہی

(۴۶۵)

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
درپئے جان ہے قراول مرگ کسو کے تو شکار ہیں ہم بھی
نالے کریو سمجھ کے اے بلبل باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی
مدعی کو شراب ہم کو زہر عاقبت دوست دار ہیں ہم بھی
مضطرب گریہ ناک ہے یہ گل برق ابر بہار ہیں ہم بھی[۱]
گر زخود رفتہ ہیں ترے نزدیک اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی
میر نام اک جواں سنا ہوگا
اسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

(۴۶۶)

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی اے عمر گذشتہ میں تری قدر نہ جانی
تھی آبلۂ دل سے ہمیں تشنگی میں چشم پھوٹا تو نہ آیا نظر اک بوند بھی پانی
مدت سے ہیں اک مشت پر آوارہ چمن میں نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی
بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن لکنت سے الجھ جا کے اسے بات نہ آنی
کیا جانیے کیا کیا میں لکھوں شوق میں قاصد ق پڑھنا نہ کرے خط کا کہیں اس پہ گرانی[۲]

---
(۱)،(۲) نسخۂ محمود آباد

تکلیف نہ کر نامہ کے لکھنے کی تو مجھ کو　　آجائے جو کچھ جی میں ترے کہیو زبانی[1]

یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے　　باقی ہے کسو موے پریشاں کی نشانی

دیکھیں تو سہی کب تئیں نبھتی ہے یہ صحبت　　ہم جی سے ترے دوست ہیں تو دشمن جانی

مجنوں بھی نہ رسواے جہاں ہوتا نہ وہ آپ　　مکتب میں جو کم آتی پہ لیلیٰ تھی دوانی

اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق　ق　وہ اس کی وفاپیشگی وہ اس کی جوانی

یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

(۴۶۷)

کل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہوگئی　　دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی

کن کن مصیبتوں سے ہوئی صبح شام ہجر　　سو زلفیں ہی بناتے اسے رات ہوگئی

گردش نگاہ مست کی موقوف ساقیا　　مسجد تو شیخ جی کی خرابات ہوگئی

ڈر ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے　　آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہوگئی

خورشید سا پیالۂ مے بےطلب دیا　　پیر مغاں سے رات کرامات ہوگئی

کتنا خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں　　نومیدی و امید مساوات ہوگئی

آ شیخ گفتگوے پریشاں پہ تو نہ جا　　مستی میں اب تو قبلۂ حاجات ہوگئی

نک شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر　　گویا کہ کوہ و دشت پہ برسات ہوگئی

دیدار کی گرسنگی اپنی یہیں سے دیکھ　　اک ہی نگاہ یاروں کی اوقات ہوگئی[2]

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

(۴۶۸)

بغیر دل کہ یہ قیمت ہے سارے عالم کی　　کسو سے کام نہیں رکھتی جنس آدم کی

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں　　کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو　　کہ سیر و گشت نہیں رسم اہل ماتم کی

تنک تو لطف سے کچھ کہہ کہ جاں بلب ہوں میں　　رہی ہے بات مری جان اب کوئی دم کی

گذرنے کو تو کج و واکج اپنی گذرے ہے　　جفا جو ان نے بہت کی تو کچھ وفا کم کی

گھرے ہیں درد و الم میں فراق کے ایسے　　کہ صبح عید بھی یاں شام ہے محرم کی

قفس میں میر نہیں جوش داغ سینے پر
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمودآباد

(۴۶۹)

غم سے یہ راہ میں نے نکالی نجات کی — سجدہ اس آستاں کا کیا پھر وفات کی
نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایک دن — ناموس یوں ہی جائے گی آب حیات کی
صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے — مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں — اب بات جاچکی ہے سبھی کائنات کی
پژمردہ اس کلی کے تئیں وا شدن سے کیا — آہ سحر نے دل پہ عبث التفات کی
حور و پری فرشتہ بشر مار ہی رکھا — وزدیدہ تیرے دیکھنے نے جس پہ گھات کی
اس لب شکر کے ہیں گے جہاں ذائقہ شناس — اس جا دعا پہنچتی نہیں ہے نبات کی
عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور — جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی کی مات کی

برقع اٹھا تھا یار کے منھ کا سو میرؔ کل
سنتے ہیں آفتاب نے جوں توں کے رات کی

(۴۷۰)

اب دل کو آہ کرنی ہی صبح و مسا لگی — پژمردہ اس کلی کے تئیں بھی ہوا لگی
کیونکر بجھاؤں آتش سوزان عشق کو — اب تو یہ آگ دل سے جگر کو بھی جا لگی
دل کو گئے ہی یاں سے بنے اب کہ ہر سحر — کوچے میں تیری زلف کے آنے صبا لگی
زلف سیاہ یار کی رہتی ہے چت چڑھی — یہ تازہ میرے جی کو کہاں کی بلا لگی(۱)
بیتابی و شکیب و سفر حاصل کلام — اس دل مریض غم کو نہ کوئی دوا لگی
ڈر مجھ نفس سے غیر کہ پھر جی ہی سے گیا — جس کو کسو ستم زدہ کی بد دعا لگی
لگ جائے چپ نہ تجھ کو تو تو کہیو عندلیب — گر بے گلی نے کی ہمیں تکلیف نالگی
تھا صید ناتواں میں ولے میرے خون سے — پاؤں میں صید بندوں کے بھر کر حنا لگی(۲)

کشتے کا اس کے زخم نہ ظاہر ہوا کہ میرؔ
کس جاے اس شہید کے تیغ جفا لگی

(۴۷۱)

کس حسن سے کہوں میں اس کی خوش اختری کی — اس ماہرو کے آگے کیا تاب مشتری کی
رکھنا نہ تھا قدم یاں جوں باد بے تأمل — سیر اس جہاں کی رہرو پر تو نے سرسری کی
شبہا بحال سگ میں اک عمر صرف کی ہے — مت پوچھ ان نے مجھ سے جو آدمی گری کی

---
(۱)،(۲) نسخۂ محمود آباد

پاے گل اس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
سر پر ہمارے اب کے منت ہے بے پری کی

پیشہ تو ایک ہی تھا اس کا ہمارا لیکن
مجنوں کے طالعوں نے شہرت میں یاوری کی

گریے سے داغ سینہ تازہ ہوئے ہیں سارے
یہ کشت خشک تو نے اے چشم پھر ہری کی

یہ دور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب
رکھیے بناے تازہ اس چرخ چنبری کی

خوباں تمھاری خوبی تاچند نقل کریے
ہم رنجہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی

ہم سے جو میر اڑ کر افلاک چرخ میں ہیں
ان خاک میں ملوں کی کاہے کو ہمسری کی

(۴۷۲)

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے

نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا
شور اک آسماں سے اٹھتا ہے

لڑتی ہے اس کی چشم شوخ جہاں
ایک آشوب واں سے اٹھتا ہے

سدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز
دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

(۴۷۳)

کلی کہتے ہیں اس کا سا دہن ہے
سنا کریے کہ یہ بھی اک سخن ہے

ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جاگہ
الٰہی چشم یا زخم کہن ہے

خبر لے پیر کنعاں کی کہ کچھ آج
نپٹ آوارہ بوے پیرہن ہے

نہیں دامن میں لالہ بے ستوں کے
کوئی دل داغ خون کوہکن ہے

شہادت گاہ ہے باغ زمانہ
کہ ہر گل اس میں اک خونیں کفن ہے

کروں کیا حسرت گل کو وگرنہ
دل پر داغ بھی اپنا چمن ہے

جو دے آرام ٹک آوارگی میر
تو شام غربت اک صبح وطن ہے

(۴۷۴)

گل گشت کی ہوس تھی سو تو گجیر آئے
آئے جو ہم چمن میں ہوکر اسیر آئے

فرصت میں یک نفس کی کیا درد دل سنوگے
آئے تو تم ولیکن وقت اخیر آئے

دلی میں اب کے آکر ان یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

کیا خوبی اس چمن کی موقوف ہے کسو پر
گل گر گئے عدم کو نکھرے نظیر آئے

شکوہ نہیں جو اس کو پروا نہ ہو ہماری
دروازے جس کے ہم سے کتنے فقیر آئے

عمر دراز کیونکر مختار خضر ہے یاں
ایک آدھ دن میں ہم تو جینے سے سیر آئے

نزدیک تھی قفس میں پرواز روح اپنی
غنچے ہو گلبنوں پر جب ہم صفیر آئے

یوں بیٹھے بیٹھے ناگہ گردن لگے ہلانے
سر شیخ جی کے گویا مجلس میں پیر آئے

قامت خمیدہ اپنی جیسے کماں تھی لیکن
قرباں گہ وفا میں مانند تیر آئے

بن جی دیے نہیں ہے امکان یاں سے جانا
بسمل گہ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

(۴۷۵)

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

صورت گر اجل کا کیا ہاتھ تھا کہے تو
کھینچی وہ تیغ ابرو فولاد کے قلم سے

سوزش گئی نہ دل کی رونے سے روز و شب کے
جلتا ہوں اور دریا بہتے ہیں چشم نم سے

طاعت کا وقت گذرا مستی میں آب رز کی
اب چشم داشت اس کے یاں ہے فقط کرم سے

کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیونکے گذرے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

مشہور ہے ساجت میری کہ تیغ بری
پر میں نہ سر اٹھایا ہرگز ترے قدم سے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو
بالیدگی دل ہے مانند شیشہ دم سے

کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب دیکھے
تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

ہستی میں ہم نے آکر آسودگی نہ دیکھی
کھلتیں نہ کاش آنکھیں خواب خوش عدم سے

پامال کرکے ہم کو پچھتاؤگے بہت تم
کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

دل دو ہو میرؔ صاحب اس بدمعاش کو تم
خاطر تو جمع کرلو ٹک قول سے قسم سے

(۴۷۶)

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے
یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے

کوئی ہم سے کھلتے ہیں بند اس قبا کے
یہ عقدے کھلیں گے کسو کی دعا سے

پشیمان توبہ سے ہوگا عدم میں
کہ غافل چلا شیخ لطف ہوا سے

نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں
کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے

جگر سوے مژگاں کھنچا جائے ہے کچھ
مگر دیدۂ تر ہیں لوہو کے پیاسے

اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعصب تجھے ہے عجب ماسوا سے

طبیب سبک عقل ہرگز نہ سمجھا
ہوا درد عشق آہ دونا دوا سے

ٹک اے مدعی چشم انصاف وا کر
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

(۴۷۷)

رہا ہوتا نہیں امکان ان ترکیب والوں سے
کہ بل دے باندھتے ہیں پیچ پگڑی کے بھی بالوں سے

تجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلے سے
تسلی کرتے ہیں ناچار شاعر ان مثالوں سے

بلا کا شکر کر اے دل کہ اب معلوم ہوتی ہے
حقیقت عافیت کی اس گلی کے رہنے والوں سے

نہیں اے ہم نفس اب جی میں طاقت دوری گل کی
جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے آخر شب کے نالوں سے

نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں
کہ آئینے کو ربط خاص ہے صاحب جمالوں سے

کہاں یہ قامت دلکش کہاں پاکیزگی ایسی
ملے ہیں ہم بہت گلزار کے نازک نہالوں سے

ہدف اس کا ہوئے مدت ہوئی سینے کو پر اب تک
گتھا نکلے ہے لخت دل مرا تیروں کے بھالوں سے

ہوا پیرانہ سر عاشق ہو زاہد مضحکہ سب کا
کہن سالی میں ملتا ہے کوئی بھی خورد سالوں سے

رگ گل کوئی کہتا ہے کوئی اے میرؔ مو اس کو
کمر اس شوخ کی بندھتی نہیں ان خوش خیالوں سے

(۴۷۸)

کبکوں نے تیری چال جو دیکھی ٹھٹھک گئے
دل ساکنان باغ کے تجھ سے اٹک گئے

اندوہ وصل و ہجر نے عالم کھپا دیا
ان دو ہی منزلوں میں بہت یار تھک گئے

مطلق اثر نہ اس کے دل نرم میں کیا
ہر چند نالہ ہاے حزیں عرش تک گئے

افراط گریہ سے ہوئیں آبادیاں خراب
سیلاب میرے اشک کے اژدر بھی بھک گئے

وے مے گسار ظرف جنھیں خم کشی کے تھے
بھر کر نگاہ تونے جو کی وہ ہیں چھک گئے

چند اے سپہر چھاتی ہماری جلا کرے — اب داغ کھاتے کھاتے کلیجے تو پک گئے

عشاق پر جو وے صف مژگاں پھریں تو میر
جوں اشک کتنے چو گئے کتنے ٹپک گئے

(۴۷۹)

زندگی ہوتی ہے اپنی غم کے مارے دیکھیے — موند لیں آنکھیں ادھر سے تم نے پیارے دیکھیے
لخت دل کب تک الٰہی چشم سے ٹپکا کریں — خاک میں تا چند ایسے لعل پارے دیکھیے
ہو چکا روز جزا اب اے شہیدان وفا — چونکتے ہیں خون خفتہ کب تمھارے دیکھیے
راہ دور عشق میں اب تو رکھا ہم نے قدم — رفتہ رفتہ پیش کیا آتا ہے بارے دیکھیے
سینۂ مجروح بھی قابل ہوا ہے میر کے — ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھیے
خنجر بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمبدم — چشم سے انصاف کی سینے ہمارے دیکھیے
ایک خوں ہو بہ گیا دو روتے ہی روتے گئے — دیدہ و دل ہوگئے ہیں سب کنارے دیکھیے
شست و شو کا اس کی پانی جمع ہوکر مہ بنا — اور منھ دھونے کے چھینٹوں سے ستارے دیکھیے

رہ گئے سوتے کے سوتے کارواں جاتا رہا
ہم تو میر اس رہ کے خوابیدہ ہیں ہارے دیکھیے

(۴۸۰)

کس طور ہمیں کوئی فریبندہ لبھالے — آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے
سو ظلم اٹھائے تو کبھو دور سے دیکھا — ہرگز نہ ہوا یہ کہ ہمیں پاس بلا لے
اس شوخ کی سرتیز پلک ہیں کہ وہ کانٹا — گڑ جائے اگر آنکھ میں سر دل سے نکالے
عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے
وے دن گئے جو ضبط کی طاقت تھی ہمیں بھی — اب دیدۂ خوں بار نہیں جاتے سنبھالے
احوال بہت تنگ ہے اے کاش محبت — اب دست تلطف کو مرے سر سے اٹھالے
دعواے قیامت کا مرے خوف اسے کیا — اک لطف میں وہ مجھ سے تنک رو کو منالے
کہتے ہیں حجاب رخ دلدار ہے ہستی — دیکھیں گے اگر یوں ہے بھلا جان بھی جا لے

میر اس سے نہ مل آہ کہ ڈرتے ہیں مبادا
بیباک ہے وہ شوخ کہیں مار نہ ڈالے

(۴۸۱)

برنگ بوے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے — کہ ہمراہ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو   وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم   غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش   ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے
تو ہے کس ناحیے سے اے دیارعشق کیا جانوں   ترے باشندگاں ہم کاش سارے بےوفا ہوتے
اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے   جو خاطرخواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے
کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میر کیا جانیں
انھیں معلوم تب ہوتا کہ ویسے سے جدا ہوتے

(۴۸۲)

چمن یار تیرا ہواخواہ ہے   گل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے
سراپا میں اس کے نظر کرکے تم   جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے
تری آہ کس سے خبر پایئے   وہی بےخبر ہے جو آگاہ ہے
مرے لب پہ رکھ کان آواز سن   کہ اب تک بھی یک ناتواں آہ ہے
گذر سر سے تب عشق کی راہ چل   کہ ہر گام یاں اک خطرگاہ ہے
کبھو وادی عشق دکھلایئے   بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
جہاں سے تو رخت اقامت کو باندھ   یہ منزل نہیں بےخبر راہ ہے
نہ شرمندہ کر اپنے منھ سے مجھے   کہا میں نے کب یہ کہ تو ماہ ہے
یہ وہ کارواں گاہ دلکش ہے میر
کہ پھر یاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

(۴۸۳)

ڈھب ہیں تیرے سے باغ میں گل کے   بو گئی کچھ دماغ میں گل کے
جاے روغن دیا کرے ہے عشق   خون بلبل چراغ میں گل کے
دل تسلی نہیں صبا ورنہ   جلوے سب ہیں گے داغ میں گل کے
اس حدیقے کے عیش پر مت جا   مے نہیں ہے ایاغ میں گل کے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب
ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

(۴۸۴)

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے   جان کے دینے کو جگر چاہیے

قابل آغوش ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے — اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہے شناسائے زر داغ دل — اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
سینکڑوں مرتے ہیں سدا پھر بھی یاں — واقعہ اک شام و سحر چاہیے[1]
عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس — داغ بہ دل دست بسر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے
جیسے جرس پارہ گلو کیا کروں — نالہ و افغاں میں اثر چاہیے[2]

خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر
ہم کو جیا بار دگر چاہیے

(۴۸۵)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشم دل کھول اس بھی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
نقطۂ خال سے ترا ابرو — بیت اک انتخاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے
آتش غم میں دل بھنا شاید — دیر سے بو کباب کی سی ہے
دیکھیے ابر کی طرح اب کے — میری چشم پر آب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(۴۸۶)

شمع صفت جب کبھو مر جائیں گے — ساتھ لیے داغ جگر جائیں گے
تند نہ ہو ہم تو موئے پھرتے ہیں — کیا تری ان باتوں سے ڈر جائیں گے
کھل گئے رخسار اگر یار کے — شمس و قمر جی سے اتر جائیں گے
خالی نہ چھوڑیں گے ہم اپنی جگہ — گر یہی رونا ہے تو بھر جائیں گے

راہ دم تیغ پہ ہو کیوں نہ میر
جی پہ رکھیں گے تو گذر جائیں گے

---
(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

(۴۸۷)

اب جو اک حسرت جوانی ہے   عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے
رشک یوسف ہے آہ وقت عزیز   عمر اک بار کاروانی ہے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ   دل میں کوئی غم نہانی ہے
ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ   تاچمن ایک پرفشانی ہے
اس کی شمشیر تیز سے ہمدم   مر رہیں گے جو زندگانی ہے
غم و رنج و الم نکویاں سے   سب تمھاری ہی مہربانی ہے
خاک تھی موجزن جہاں میں اور   ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے
یاں ہوئے میرؔ تم برابر خاک
واں وہی ناز و سرگرانی ہے

(۴۸۸)

قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے   گلوں نے جن کی خاطر خرقے ڈالے
وہ کالا چور ہے خال رخ یار   کہ سو آنکھوں میں دل ہو تو چرالے
نہیں اٹھتا دل محزوں کا ماتم   خدا ہی اس مصیبت سے نکالے
کہاں تک دور بیٹھے بیٹھے کہیے   کبھو تو پاس ہم کو بھی بلالے
دلا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے   نہیں آساں کھلانے سانپ کالے
طپش نے دل جگر کی مار ڈالا   بغل میں دشمن اپنے ہم نے پالے
نہ مہکے بوے گل اے کاش یک چند   ابھی زخم جگر سارے ہیں آلے
کسے قید قفس میں یاد گل کی   پڑے ہیں اب تو جینے ہی کے لالے
ستایا میرؔ غم کش کو کسھوں نے
کہ پھر اب عرش تک جاتے ہیں نالے

(۴۸۹)

اب ظلم ہے اس خاطر تا غیر بھلا مانے   پس ہم نہ برا مانیں تو کون برا مانے
سرمایۂ صدآفت دیدار کی خواہش ہے   دل کی تو سمجھ لیجے گر چشم کہا مانے
مسدود ہی اے قاصد بہتر ہے رہ نامہ   کیا کیا نہ لکھیں ہم تو جو یار لکھا مانے
تنک حال شکستہ کی سنتے ہی میں سب کچھ ہے   پر وہ تو سخن رس ہے اس بات کو کیا مانے
بے طاقتی دل نے سائل بھی کیا ہم کو
پر میرؔ فقیروں کی یاں کون صدا مانے

(۴۹۰)

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے — ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے
عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ — اس طرح کے خرج لاحاصل کو دولت چاہیے
عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا — آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیے
ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن — سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیے
عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو — قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے
نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس — یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے
تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میرؔ صاحب دل سلامت چاہیے

(۴۹۱)

بے یار شہر دل کا ویران ہورہا ہے — دکھلائی دے جہاں تک میدان ہورہا ہے
اس منزل جہاں کے باشندے رفتنی ہیں — ہر اک کے ہاں سفر کا سامان ہورہا ہے
اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنی — آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہورہا ہے
تک زیر طاق نیلی وسواس سے رہا کر — مدت سے گرنے پر یہ ایوان ہورہا ہے[1]
گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی جا ہے — یعنی ہزار جی سے قربان ہورہا ہے
حال زبون اپنا پوشیدہ کچھ نہ تھا تو — سنتا نہ تھا کہ یہ صید بے جان ہورہا ہے
ظالم ادھر کی سدھ لے جوں شمع صبح گاہی — ایک آدھ دم کا عاشق مہمان ہورہا ہے
قرباں کہ محبت وہ جا ہے جس میں ہر سو — دشوار جان دینا آسان ہورہا ہے
ہر شب گلی میں اس کی روتے تو رہتے ہو تم
اک روز میرؔ صاحب طوفان ہورہا ہے

(۴۹۲)

تیری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے — ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے
آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا — تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے
عذر گناہ خوباں بدتر گنہ سے ہوگا — کرتے ہوئے تلافی بےلطف تر کریں گے
سر جائے گا ولیکن آنکھیں ادھر ہی ہوں گی — کیا تیری تیغ سے ہم قطع نظر کریں گے
اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے — کیا جانے یار اس کو کب تک خبر کریں گے

(۱) نسخۂ محمود آباد

گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہمنشیں ہم　　شام غم جدائی کیونکر سحر کریں گے
یہ ظلم بے نہایت دیکھو تو خوبرویاں　　کہتے ہیں جو ستم ہے ہم تجھ ہی پر کریں گے
اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک　　تو یہ ستم کرے گا ہم درگذر کریں گے

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

(۴۹۳)

آنکھیں لڑا لڑا کر کب تک لگا رکھیں گے　　اس پردے ہی میں خوباں ہم کو سلا رکھیں گے
فکر دہن میں اس کی کچھ بن نہ آئی آخر　　اب یہ خیال ہم بھی دل سے اٹھا رکھیں گے
مشت نمک کو میں نے بیکار کم رکھا ہے　　چھاتی کے زخم میرے مدت مزہ رکھیں گے
سبزان شہر اکثر درپے ہیں آبرو کے　　اب زہر پاس اپنے ہم بھی منگا رکھیں گے
آنکھوں میں دلبروں کی مطلق نہیں مروت　　یہ پاس آشنائی منظور کیا رکھیں گے
جیتے ہیں جب تلک ہم آنکھیں بھی لڑتیاں ہیں　　دیکھیں تو جور خوباں کب تک روا رکھیں گے
اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوے کرنے　　شبہاے ماہ چندے تجھ کو چھپا رکھیں گے
مژگان و چشم و ابرو سب ہیں ستم کے مائل　　ان آفتوں سے دل ہم کیونکر بچا رکھیں گے

دیوان میر صاحب ہر اک کی ہے بغل میں
دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا رکھیں گے

(۴۹۴)

تجھ سے دوچار ہوگا جو کوئی راہ جاتے　　پھر عمر چاہیے گی اس کو بحال آتے
گر دل کی بےقراری ہوتی یہی جو اب ہے　　تو ہم ستم رسیدہ کاہے کو جینے پاتے
وے دن گئے کہ اٹھ کر جاتے تھے اس گلی میں　　اب سعی چاہیے ہے بالیں سے سر اٹھاتے
کب تھی ہمیں تمنا اے ضعف یہ کہ تڑپیں　　پر زیر تیغ اس کی ہم تک تو سر ہلاتے
گر جانتے کہ یوں ہی برباد جائیں گے تو　　کاہے کو خاک میں ہم اپنے تئیں ملاتے
شاید کہ خون دل کا پہنچا ہے وقت آخر　　تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے
اس سمت کو پلٹتی تیری نگہ تو ساقی　　حال خراب مجلس ہم شیخ کو دکھاتے
جی دینا دل دہی سے بہتر تھا صدمراتب　　اے کاش جان دیتے ہم بھی نہ دل لگاتے

شب کوتہ اور قصہ ان کا دراز ورنہ
احوال میر صاحب ہم تجھ کو سب سناتے

(۴۹۵)

ہو عاجز کہ جسم اس قدر زور سے ۔۔۔ نہ نکلا کبھو عہدۂ مور سے
بہت دور کوئی رہا ہے مگر ۔۔۔ کہ فریاد میں ہے جرس شور سے
مری خاک تفتہ پہ اے ابرتر ۔۔۔ قسم ہے تجھے ٹک برس زور سے
ترے دل جلے کو رکھا جس گھڑی ۔۔۔ دھواں سا اٹھا کچھ لب گور سے
نہ پوچھو کہ بےاختیاری سے میں ۔۔۔ ہوا اس گلی میں بتر چور سے
نہیں سوجھتا کچھ جو اس بن ہمیں ۔۔۔ بغیر اس کے رہتے ہیں ہم کور سے[1]

جو ہو میرؔ بھی اس گلی میں صبا
بہت پوچھیو تو مری اور سے

(۴۹۶)

مت ہو مغرور اے کہ تجھ میں زور ہے ۔۔۔ یاں سلیماں کے مقابل مور ہے
مر گئے پہ بھی ہے صولت فقر کی ۔۔۔ چشم شیر اپنا چراغ گور ہے
جب سے کاغذ باد کا ہے شوق اسے ۔۔۔ ایک عالم اس کے اوپر ڈور ہے
رہنمائی شیخ سے مت چشم رکھ ۔۔۔ وائے وہ جس کا عصاکش کور ہے
لے ہی جاتی ہے زر گل کو اڑا ۔۔۔ صبح کی بھی باؤ بادی چور ہے
دل کھنچے جاتے ہیں سارے اس طرف ۔۔۔ کیونکے کہیے حق ہماری اور ہے

تھا بلا ہنگامہ آرا میرؔ بھی
اب تلک گلیوں میں اس کا شور ہے

(۴۹۷)

غیر سے اب یار ہوا چاہیے ۔۔۔ ملتجی ناچار ہوا چاہیے
جس کے تئیں ڈھونڈوں ہوں وہ سب میں ہے ۔۔۔ کس کا طلبگار ہوا چاہیے
تا کہ وہ ٹک آن کے پوچھے کبھو ۔۔۔ اس لیے بیمار ہوا چاہیے
زلف کسو کی ہو کہ ہو خال و خط ۔۔۔ دل کو گرفتار ہوا چاہیے
تیغ بلند اس کی ہوئی بوالہوس ۔۔۔ مرنے کو تیار ہوا چاہیے
مصطبۂ بے خودی ہے یہ جہاں ۔۔۔ جلد خبردار ہوا چاہیے
مول ہے بازار کا ہستی کے یہ ۔۔۔ دل کے خریدار ہوا چاہیے
کچھ نہیں خورشید صفت سرکشی ۔۔۔ سایۂ دیوار ہوا چاہیے

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

کر نہ تعلق کہ یہ منزل نہیں　　آہ سبک بار ہوا چاہیے
گو سفری اب نہیں ظاہر میں میر
عاقبت کار ہوا چاہیے

(۴۹۸)

یاں سرکشاں جو صاحب تاج و لوا ہوئے　　پامال ہوگئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
دیکھی نہ ایک چشمک گل بھی چمن میں آہ　　ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے
پچھتاؤگے بہت جو گئے ہم جہان سے　　آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا　　گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے
سر دے کے میر ہم نے فراغت کی عشق میں
ذمے ہمارے بوجھ تھا بارے ادا ہوئے

(۴۹۹)

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے　　اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے
حسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش　　رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے
مت نگاہ مست کو تکلیف کر ساقی زیاد　　ہر طرف تو ہیں گلی کوچوں میں متوالے پڑے
کیونکے طے ہو دشت شوق آخر کو مانند سرشک　　میرے پاؤں میں تو پہلے ہی قدم چھالے پڑے
جوش مارا اشک خونیں نے مرے دل سے زبس　　گھر میں ہمسایوں کے شب لوہو کے پرنالے پڑے
ہیں بعینہ ویسے جوں پردہ کرے ہے عنکبوت　　روتے روتے بسکہ میری آنکھوں میں جالے پڑے
گرمجوشی سے مرے گریے کی شب آنکھوں کی راہ
گوشۂ دامن میں میر آتش کے پرکالے پڑے

(۵۰۰)

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے　　دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے
پاس ناموس عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو　　زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے
اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے
کچھ نہ سمجھے کہ تجھ سے یاروں نے　　کس توقع پہ دل لگائے تھے
فرصت زندگی سے مت پوچھو　　سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے
میر صاحب رلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

(۵۰۱)

گرے بحر بلا مژگان تر سے
نگاہیں اٹھ گئیں طوفان پر سے

(۵۰۲)

ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ   بڑی کلول ٹلی ہے جان پر سے
لیا دل اس خط رو نے میرا   اٹھالوں میں اسے قرآن پر سے
کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا   خدائی صدقے کی انسان پر سے
تفنگ اس کی چلی آواز پر لیک
گئی ہے میر گولی کان پر سے

(۵۰۳)

خوب ہے اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے   پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں   خندۂ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے
شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق   عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم روئیے
دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانند ابر   ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے
ہو جدا فردوس سے یعنی گلی سے یار کی   مدتوں تک کیجیے غم مثل آدم روئیے
اب سے یوں کریے مقرر اٹھیے جب کہسار سے   وادی مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے
عشق میں تقریب گریہ گو نہیں درکار میر
ایک مدت صبر ہی کا رکھیے ماتم روئیے

(۵۰۴)

نیلا نہیں سپہر تجھے اشتباہ ہے   دود جگر سے میرے یہ چھت سب سیاہ ہے
ابر و بہار و بادہ سبھوں میں ہے اتفاق   ساقی جو تو بھی مل چلے تو واہ واہ ہے
سرے سے ایسی آنکھیں تمھاری نہیں لگیں   احوال پر ہمارے تمھیں کب نگاہ ہے
کس کس طرح سے ہاتھ نچاتا ہے وعظ میں   دیکھا جو شیخ شہر عجب دستگاہ ہے
ہے روے بجز میر تری خاک راہ پر
یعنی کہ کام اس کا کچھ اب رو براہ ہے

(۵۰۵)

نہیں وہ قید الفت میں گرفتاری کو کیا جانے — تکلف برطرف بے مہر ہے یاری کو کیا جانے
وہی اک مندرس نالہ مبارک مرغ گلشن کو — وہ اس ترکیب نو کی نالہ و زاری کو کیا جانے
پڑے آسودگان خاک چونکو شور محشر سے — مرا جو کوئی بےخود ہے وہ ہشیاری کو کیا جانے (۱)
ستم ہے تیری خوئے خشمگیں پر ٹک بھی دلجوئی — دل آزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے
گلہ اپنی جفا کا سن کے مت آزردہ ہو ظالم — نہیں تہمت ہے تجھ پر تو جفا کاری کو کیا جانے
پریشاں فوج فوج لخت دل نکلے ہے آنکھوں سے — نپٹ ناداں ہے ... ... (۲)

ترا ابرام اس کی سادگی پر میرؔ میں مانا
بھلا ایسا جو ناداں ہو وہ عیاری کو کیا جانے

(۵۰۶)

جوش دل آئے بہم دیدۂ گریان ہوئے — کتنے اک اشک ہوئے جمع کہ طوفان ہوئے
کیا چھپیں شہر محبت میں ترے خانہ خراب — گھر کے گھر ان کے ہیں اس بستی میں ویران ہوئے
کس نے لی رخصت پرواز پس از مرگ نسیم — مشت پر باغ میں آتے ہی پریشان ہوئے
سبزہ و لالہ و گل ابر و ہوا ہے مے دے — ساقی ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوئے
دیکھتے پھرتے ہیں منہ سب کا سحر آئینے — جلوہگر ہو کہ یہ تجھ بن بہت حیران ہوئے (۳)
دعوی خوش دہنی گرچہ اسے تھا لیکن — دیکھ کر منہ کو ترے گل کے تئیں کان ہوئے
جام خوں بن نہیں ملتا ہے ہمیں صبح کو آب — جب سے اس چرخ سیہ کاسہ کے مہمان ہوئے

اپنے جی ہی نے نہ چاہا کہ پئیں آب حیات
یوں تو ہم میرؔ اسی چشمے پہ بے جان ہوئے

(۵۰۷)

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے — مر جائے ولے اس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے — پر دام محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد — یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
صد نالۂ جانکاہ ہیں وابستہ چمن سے — کوئی بال شکستہ پس دیوار نہ ہووے
پژمردہ بہت ہے گل گلزار ہمارا — شرمندۂ یک گوشۂ دستار نہ ہووے
مانگے ہے دعا خلق تجھے دیکھ کے ظالم — یارب کسو کو اس سے سروکار نہ ہووے

---

(۱)، (۲) کذا، (۳) نسخۂ محمود آباد

کس شکل سے احوال کہوں اب میں الٰہی　　صورت سے مری جس میں وہ بیزار نہ ہووے[1]
ہوں دوست جو کہتا ہوں سن اے جان کے دشمن　ق　بہتر تو تجھے ترک ہے تا خوار نہ ہووے
خوباں برے ہوتے ہیں اگرچہ ہیں نکورو　　بے جرم کہیں ان کا گنہگار نہ ہووے
باندھے نہ پھرے خون پر اپنی تو کمر کو　　یہ جان سبک تن پہ ترے بار نہ ہووے
چلنا ہے رہِ عشق ہی اس پر بھی چلے تو　　پر ایک قدم چل کہیں زنہار نہ ہووے

صحراے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر
یہ سیر سر کوچہ و بازار نہ ہووے

(۵۰۸)

برقعے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے　　اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر　　مجنون زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے
ٹک بعد مرے میرے طرف داروں کنے تو　　کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے
کیا ظرف ہے گردون تنک حوصلہ کا جو　　آشوب فغاں کے مرے عہدے سے بر آوے
ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی　　جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے
مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار　　گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے
کھلنے میں ترے منھ کے کلی پھاڑے گریباں　　ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گل برگ تر آوے
ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوق خبر میں　　اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے
کہتے ہیں ترے کوچے سے میر آنے کہے ہے　　جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہیے
شاید کہ نظیری کے بھی عہدے سے بر آوے

(۵۰۹)

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم　　یہ تو ہو کوئی گور غریباں میں در آوے
میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ　　دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے
کیا جانیں وے مرغان گرفتار چمن کو　　جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے
تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ　　کس واسطے عاشق کی شب غم بسر آوے
ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم ہیں　　وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے
دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت　　اب تو ہی مگر آپ کبھو در سے در آوے

(۱) نسخۂ محمود آباد

واعظ نہیں کیفیت میخانہ سے آگاہ   یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے
صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی   ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرراہ پہ زنہار   ق   کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے
مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

(۵۱۰)

لگوائے پتھرے اور برا بھی کہا کیے   تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کیے
کھینچا تھا آہ شعلہ فشاں نے جگر سے سر   برسوں تئیں پڑے ہوئے جنگل جلا کیے
غنچے نے ساری طرز ہماری ہی اخذ کی   ہم جو چمن میں برسوں گرفتہ رہا کیے
تدبیر عشق میں بھی نہ کرتے قصور یار   جو اس مرض میں ہوتے بھلے ہم دوا کیے
جوں نے نہ تیرے کشتے کے لب سے رہی فغاں   ہر چند بند بند بھی اس کے جدا کیے
کیا حرف دل نشیں ہو مرا جیسے خط مدام   اغیار روسیاہ ترے منھ لگا کیے
پھر شام آشنا نہ کبھو نکلے گل رخاں   ہر صبح ان سے برسوں تئیں ہم ملا کیے
بے عیب ذات ہے گی خدا ہی کی اے بتاں   تم لوگ خوبرو جو کیے بے وفا کیے
اک خاک سی اڑے ہے منھ اوپر وگرنہ میر
اس چشم گریہ ناک سے دریا بہا کیے

(۵۱۱)

کروں جو آہ زمین و زمان جل جاوے   سپہر نیلی کا یہ سائبان جل جاوے
دی آگ دل کو محبت نے جب سے پھرتا ہوں   میں جس طرح کسو کا خانمان جل جاوے
دوا پذیر نہیں اے طبیب تپ غم کی   بدن میں تک رہے تو استخوان جل جاوے
نہ آوے سوز جگر منھ پہ شمع ساں اے کاش   بیان کرنے سے آگے زبان جل جاوے
ہمارے نالے بھی آتش ہی کے ہیں پرکالے   سنے تو بلبل نالاں کی جان جل جاوے
ہزار حیف کہ دل خار و خس سے باندھے کوئی   خزاں میں برق گرے آشیان جل جاوے
متاع سینہ سب آتش ہے فائدہ کس کا   خیال یہ ہے مبادا دکان جل جاوے
نہ پوچھ کچھ لب ترسا بچے کی کیفیت   کہوں تو دختر رز کی فلان جل جاوے
نہ بول میر سے مظلوم عشق ہے وہ غریب
مبادا آہ کرے سب جہان جل جاوے

(۵۱۲)

گلزار خوش نگاہاں جس میں ہے میرا بیاباں ہے
سواد بر مجنوں تو چراگاہ غزالاں ہے

کرے ہے خندۂ دنداں نما تو میں بھی رووں گا
چمکتی زور ہے بجلی مقرر آج باراں ہے

چمن پر نوحہ و زاری سے کس گل کا یہ ماتم ہے
جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے

ہراک مژگاں پہ میری اشک کے قطرے جھمکتے ہیں
تماشا مفت خوباں ہے لب دریا چراغاں ہے

کیا تھا جابجا رنگیں لہو تجھ ہجر میں رو کر
گریباں میر کا دیکھا مگر گلچیں کا داماں ہے

(۵۱۳)

اپنا شعار پوچھو تو مہرباں وفا ہے
پر اس کے جی میں ہم سے کیا جانیے کہ کیا ہے

مت پوچھ میری اس کی شام و سحر کی صحبت
اس طرف سے ہے گالی اس طرف سے دعا ہے(۱)

بالیں پہ میری آکر ٹک دیکھ شوق دیدار
سارے بدن کا جی اب آنکھوں میں آرہا ہے

بے اس کے رک کے مرتے گرمی عشق میں تو
کرتے ہیں آہ جب تک تب تک ہی کچھ ہوا ہے

شکوہ ہے رونے کا یہ بے گانگی سے تیری
مژگان تر وگرنہ آنکھوں میں آشنا ہے

مت کر زمین دل میں تخم امید ضائع
بونا جو یاں اگا ہے سو اگتے ہی جلا ہے

شرمندہ ہوتے ہیں گے خورشید و ماہ دونوں
خوبی نے تیرے منھ کی ظالم قراں کیا ہے

اے شمع بزم عاشق روشن ہے یہ کہ تجھ بن
آنکھوں میں میری عالم تاریک ہوگیا ہے

جیتے ہی جی تلک ہیں سارے علاقے سو تو
عاشق ترا مجرد فارغ ہی ہو چکا ہے

آزردگی عبث کیوں تشہیر و قتل و ایذا
فرمایئے تو وہ کچھ جو کچھ کہ مدعا ہے(۲)

صد سحر و یک رقیمہ خط میر جی کا دیکھا
قاصد نہیں چلا ہے جادو مگر چلا ہے

(۵۱۴)

حرم کو جایئے یا دیر میں بسر کریے
تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

وہ مست ناز تو مچلا ہے کیا جتایئے حال
جو بے خبر ہو بھلا اس کے تئیں خبر کریے

ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام
شب فراق کس امید پر سحر کریے

جہاں کا دید بجز ماتم نظارہ نہیں
کہ دیدنی ہی نہیں جس پہ یاں نظر کریے

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

جیوں سے جاتے ہیں ناچار آہ کیا کیا لوگ   کبھو تو جانب عشاق بھی گذر کریے
ستم اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اب اس کو
جو دل میں آوے تو ٹک رحم میر پر کریے

(۵۱۵)

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے   قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے
عریانی آشفتہ کہاں جائے پس از مرگ   کشتہ ہے ترا اور یہی بے کفنی ہے
سمجھے ہے نہ پروانہ نہ تھامے ہے زباں شمع   وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے
لیتا ہی نکلتا ہے مرا لخت جگر اشک   آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے
بلبل کی کف خاک بھی اب ہوگی پریشاں   جامے کا ترے رنگ ستمگر چمنی ہے
کچھ تو ابھر اے صورت شیریں کہ دکھاؤں   فرہاد کے ذمے بھی عجب کوہ کنی ہے
ہوں گرم سفر شام غریباں سے خوشی ہوں   اے صبح وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے
ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن   ق   ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے
ہر اشک مرا ہے در شہوار سے بہتر   ہر لخت جگر رشک عقیق یمنی ہے
بگڑی ہے نپٹ میر طپش اور جگر میں
شاید کہ مرے جی ہی پر اب آن بنی ہے

(۵۱۶)

اب کرکے فراموش تو ناشاد کروگے   پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے
زنہار اگر خستہ دلاں بے ستوں جاؤ   ٹک پاس ہنرمندی فرہاد کروگے
غیروں پہ اگر کھینچوگے شمشیر تو خوباں   اک اور مری جان پہ بیداد کروگے
جاکہ نہیں یاں رویئے جس پر نہ کھڑے ہو   کچھ شور ہی شر پر تو مجھے یاد کروگے
اس دشت میں اے راہرواں ہر قدم اوپر   مانند جرس نالہ و فریاد کروگے
گر دیکھوگے تم طرز کلام اس کی نظر کر
اے اہل سخن میر کو استاد کروگے

(۵۱۷)

خوش سر انجام تھے وے جلد جو ہشیار ہوئے   ہم تو اے ہم نفساں دیر خبردار ہوئے
بے قراری سے دل زار کی آزار ہوئے   خواہش اس حد کو کھنچی آہ کہ بیمار ہوئے[1]

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

جنس دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا — یک نگہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے
عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتی منزل قدس — وے بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے
سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو — ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے
اس ستمگار کے کوچے کے ہواداروں میں — نام فردوس کا ہم لے کے گنہگار ہوئے
وعدۂ حشر تو موہوم نہ سمجھے ہم آہ — کس توقع پہ ترے طالب دیدار ہوئے
سستی بخت تو ٹک دیکھ کہ اس چاہت پر — معتقد غیر ہوئے ہم نہ وفادار ہوئے(۱)

میر صاحب سے خدا جانے ہوئی کیا تقصیر
جس سے اس ظلم نمایاں کے سزاوار ہوئے

(۵۱۸)

ترا اے ناتوانی جو کوئی عالم میں رسوا ہے — توانائی کا منھ دیکھا نہیں ان نے کہ کیسا ہے
نیاز ناتواں کیا ناز سرو قد سے بر آوے — مثل مشہور ہے یہ تو کہ دست زور بالا ہے
ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھوؤ اشک آنکھو تم — کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے
کیا اے سایۂ دیوار تونے مجھ سے رو پنہاں — مرے اب دھوپ میں جلنے ہی کا آثار پیدا ہے
بھلے کو اپنے سب دوڑے ہیں یہ اپنا برا چاہے — چلن اس دل کا تم دیکھو تو دنیا سے نرالا ہے
رہو ٹک دور ہی پھرنے دو کوچوں میں مجھے لڑکو — کرو گے تنگ اسے تم اور تو نزدیک صحرا ہے

گلہ سن پیچش کاکل کا مجھ سے یوں لگا کہنے
تو اپنی فصد کر جلدی کہ تجھ کو میر سودا ہے

(۵۱۹)

گذار ابر اب بھی جب کبھو ایدھر کو ہوتا ہے — ہماری بیکسی پر زار باراں دیر روتا ہے
ہوا مذکور نام اس کا کہ آنسو بہ چلے منھ پر — ہمارے کام سارے دیدۂ تر ہی ڈبوتا ہے
بجا ہے سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہوتے ہیں — جو ہمدم ایسے جاتے ہیں تو ماتم سخت ہوتا ہے
نہ کی نشوونما کاہل نہ کام اپنا کیا حاصل — فلک کوئی بھی دل سے تخم کو بے وقت بوتا ہے
ہلانا ابروؤں کا لے ہے زیر تیغ عاشق کو — پلک کا مارنا برچھی کلیجے میں چبھوتا ہے
کہاں اے رشک آب زندگی ہے تو کہ یاں تجھ بن — ہر اک پاکیزہ گوہر جی سے اپنے ہاتھ دھوتا ہے
لگا مردے کو میرے دیکھ کر وہ تابجھ کہنے — جوانی کی ہے نیند اس کو کہ اس غفلت سے سوتا ہے
پریشاں گرد سا گاہے جو ٹل جاتا ہے صحرا میں — اسی کی جستجو میں خضر بھی اوقات کھوتا ہے

نہ رکھو کان نظم شاعران حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سنئے کہ موتی سے پروتا ہے

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۵۲۰)

ہم تو اس کے ظلم سے ہمدم چلے   رہ سکے ہے تو تو رہ یاں ہم چلے
ٹوٹے جوں لالہ ستاں سے ایک پھول   ہم لے یاں سے داغ یک عالم چلے
جنبش ابرو تو واں رہتی نہیں   کب تلک تلوار یاں ہر دم چلے
نم جگر کے آیا آخر ہوگئے   اشک خونیں کچھ مژہ پر جم چلے
دیکھیے بخت زبوں کیا کیا دکھائے   تم تو خوباں ہم سے ہو برہم چلے
بھاگنے پر بیٹھے تھے گویا غزال   تیری آنکھیں دیکھتے ہی رم چلے
مجھ سے ناشائستہ کیا دیکھا کہ میرؔ
آتے آتے کچھ جو آنسو تھم چلے

(۵۲۱)

غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے   اس کتے نے کرکے دلیری صید حرم کو مارا ہے
باغ کو تجھ بن اپنے بھائیں آتش دی ہے بہاراں نے   ہر غنچہ اخگر ہے ہم کو ہر گل ایک انگارا ہے
جب تجھ بن لگتا ہے تڑپنے جائے ہے نکلا ہاتھوں سے   ہے جو گرہ سینے میں اس کو دل کہیے یا پارہ ہے
راہ حدیث جو ٹک بھی نکلے کون سکھائے ہم کو پھر   روئے سخن پر کس کو دے وہ شوخ بڑا عیارہ ہے
کام اس کا ہے خوں افشانی ہر دم تیری فرقت میں   چشم کو میری آکر دیکھ اب لوہو کا فوارہ ہے
بال کھلے وہ شب کو شاید بستر ناز پہ سوتا تھا   آئی نسیم صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے
کس دن دامن کھینچ کے ان نے یار سے اپنا کام لیا
مدت گذری دیکھتے ہم کو میرؔ بھی اک ناکارہ ہے

(۵۲۲)

بند قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے   خمیازہ کش جو ہوں گے ملنے کے کیا کریں گے
رونا یہی ہے مجھ کو تیری جفا سے ہر دم   یہ دل دماغ دونوں کب تک وفا کریں گے
ہے دین سر کا دینا گردن پہ اپنی خوباں   جیتے ہیں تو تمھارا یہ قرض ادا کریں گے
درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی رخصت   گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے
آخر تو روزے آئے دو چار روز ہم بھی   ترسابچوں میں جا کر دارو پیا کریں گے
کچھ تو کہے گا ہم کو خاموش دیکھ کر وہ   اس بات کے لیے اب چپ ہی رہا کریں گے(۱)
عالم مرے ہے تجھ پر آئی اگر قیامت   تیری گلی کے ہر سو محشر ہوا کریں گے

(۱) نسخۂ محمود آباد

دامان دشت سوکھا ابروں کی بے تہی سے — جنگل میں رونے کو اب ہم بھی چلا کریں گے
لائی تری گلی تک آوارگی ہماری — ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کریں گے

احوال میر کیونکر آخر ہو ایک شب میں
اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

(۵۲۳)

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
جن کی خاطر کی استخواں شکنی — سو ہم ان کے نشان تیر ہوئے
نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں — ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے
آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں — ان دنوں تم بہت شریر ہوئے
اپنے روتے ہی روتے صحرا کے — گوشے گوشے میں آب گیر ہوئے
ایسی ہستی عدم میں داخل ہے — ق — نے جواں ہم نہ طفل شیر ہوئے
ایک دم تھی نمود بود اپنی — یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے
یعنی مانند صبح دنیا میں — ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے
میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

(۵۲۴)

توجہ تیری اے حیرت مری آنکھوں پہ کیا کم ہے — جو میں ہر اک مژہ دیکھوں کہ یہ تر ہے کہ یہ نم ہے
کرے ہے مو پریشاں غم وفا تو تعزیہ تو لے — حیا کر حق صحبت کی کہ اس بیکس کا ماتم ہے
دورنگی دہر کی پیدا ہے یاں سے دل اٹھا اپنا — کسو کے گھر میں شادی ہے کہیں ہنگامۂ غم ہے

کہیں آشفتگاں سے میر مقصد ہووے ہے حاصل
جو زلفیں اس کی درہم ہیں مرا بھی کام برہم ہے

(۵۲۵)

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے — درد بے اختیار اٹھتا ہے
اب تلک بھی مزار مجنوں سے — ناتواں اک غبار اٹھتا ہے

ہے بگولا غبار کس کا میر
کہ جو ہو بے قرار اٹھتا ہے

(۵۲۶)

کیا مرے سرِ رواں کا کوئی مائل ایک ہے　　سینکڑوں ہم خوں گرفتہ ہیں وہ قاتل ایک ہے
راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو　　ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے
اس مرے بت نے سبھوں کو حق سے توڑ اپنا کیا　　کام میں اپنے بھی وہ معبود باطل ایک ہے
کیا عرب میں کیا عجم میں ایک لیلیٰ کا ہے شور　　مختلف ہوں گو عبارات ان کا محمل ایک ہے
ایک سے ہے خرمنِ غم دانۂ اشک ایک سے　　دیدہ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے
اس شکار افگن کے کوچے سے نہیں جاتا ہے ظلم　　ایک اگر جی سے گیا تو نیم بسمل ایک ہے
چشم و ابرو ناز و خوبی زلف و کاکل خال و خط　　دیکھیے کیا ہو بلائیں اتنی ہیں دل ایک ہے

کام کچھ دنیا کی آسانی میں ہو تو میرؔ کر
مردن دشوار بھی درپیش منزل ایک ہے

(۵۲۷)

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے　　ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے
اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی میں تاب　　کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے
وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے رو کے تئیں　　بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے
فرہاد و قیس ساتھ کے سب کب کے چل بسے　　دیکھیں تباہ کیونکے ہو اب ہم چھڑے رہے
کس کے تئیں نصیب گل فاتحہ ہوئے　　ہم سے ہزاروں اس کی گلی میں گڑے رہے
برسوں تلک نہ آنکھ ملی ہم سے یار کی　ق　پھر گو کہ ہم بصورت ظاہر اڑے رہے

یعنی کہ اپنے عشق کے حیران کار میرؔ
دیوار کے سے نقش در اوپر کھڑے رہے

(۵۲۸)

شش جہت سے اس میں ظالم بوے خوں کی راہ ہے　　تیرا کوچہ ہم سے تو کہہ کس کی بسمل گاہ ہے
ایک نبھنے کا نہیں مژگاں تلک بوجھل ہیں سب　　کاروانِ لختِ دل ہر اشک کے ہمراہ ہے
ہم جوانوں کو نہ چھوڑا اس سے سب پکڑے گئے　　یہ دوسالہ دخترِ رز کس قدر شتاہ ہے
پابرہنہ خاک سر میں مو پریشاں سینہ چاک　　حال میرا دیکھنے آ تیرے ہی دلخواہ ہے

اس جنوں پر میرؔ کوئی بھی پھرے ہے شہر میں
جادۂ صحرا سے کر سازش جو تجھ سے راہ ہے

(۵۲۹)

مشکل ہے ہونا روکش رخسار کی جھلک کے   ہم تو بشر ہیں اس جا پر جلتے ہیں ملک کے
مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر   دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے
کہتے ہیں گور میں بھی ہیں تین روز بھاری   جاویں کدھر الٰہی مارے ہوئے فلک کے
لاتے نہیں نظر میں غلطانی گہر کو   ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے
کل اک مژہ نچوڑے طوفان نوح آیا
فکر فشار میں ہوں میر آج ہر پلک کے

(۵۳۰)

تاچند ترے غم میں یوں زار رہا کیجے   امید عیادت پر بیمار رہا کیجے
نے اب ہے جگرکاوی نے سینہ خراشی ہے   کچھ جی میں یہ آئے ہے بیکار رہا کیجے
کیفیت چشماں اب معلوم ہوئی اس کی   یہ مست ہیں وہ خونی ہشیار رہا کیجے
دل جاؤ تو اب جاؤ ہو خوں تو جگر ہووے   اک جان ہے کس کس کے غمخوار رہا کیجے
ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کرے ہے تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجے

(۵۳۱)

طاقت نہیں ہے جی میں نے اب جگر رہا ہے   پھر دل ستم رسیدہ اک ظلم کر رہا ہے
مارا ہے کس کو ظالم اس بے سلیقگی سے   دامن تمام تیرا لوہو میں بھر رہا ہے
پہنچا تھا تیغ کھینچے مجھ تک جو بولے دشمن   کیا مارتا ہے اس کو یہ آپھی مر رہا ہے
آنے کہا ہے میرے خوش قد نے رات گذرے   ہنگامۂ قیامت اب صبح پر رہا ہے
چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میر کو ٹک
خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

(۵۳۲)

قرار دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے   ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے
اٹھائیں تیرے لیے بد زبانیاں ان کی   جنھوں کی ہم کو خوشامد سے ننگ تھا آگے
ہماری آہوں سے سینے پہ ہوگیا بازار   ہر ایک زخم کا کوچہ جو تنگ تھا آگے
رہا تھا شمع سے مجلس میں دوش کتنا فرق   کہ جل بجھے تھے یہ ہم پر پتنگ تھا آگے

کیا خراب تغافل نے اس کے ورنہ میرؔ
ہر ایک بات پہ دشنام و سنگ تھا آگے

(۵۳۳)

تجھ بن خراب و خستہ زبوں خوار ہوگئے
کیا آرزو تھی ہم کو کہ بیمار ہوگئے

خوبی بخت دیکھ کہ خوبان بے وفا
بے پیچ میرے درپئے آزار ہوگئے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم
اٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہوگئے

وہ تو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہوگئے

اپنی یگانگی ہی کیا کرتے ہیں بیاں
اغیار روسیاہ بہت یار ہوگئے

لائی تھی شیخوں پر بھی خرابی تری نگاہ
بے طالعی سے اپنی وے ہشیار ہوگئے

کیسے ہیں وے کہ جیتے ہیں صد سال ہم تو میرؔ
اس چار دن کی زیست میں بیزار ہوگئے

(۵۳۴)

تنگ آئے ہیں دل اس جی سے اٹھا بیٹھیں گے
بھوکوں مرتے ہیں کچھ اب یار بھی کھا بیٹھیں گے

اب کے بگڑے گی اگر ان سے تو اس شہر سے جا
کسو ویرانے میں تکیہ ہی بنا بیٹھیں گے

معرکہ گرم تو تنک ہونے دو خونریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے

ہوگا ایسا بھی کوئی روز کہ مجلس سے کبھو
ہم تو ایک آدھ گھڑی اٹھ کے جدا بیٹھیں گے

جا نہ اظہار محبت پہ ہوسناکوں کی
وقت کے وقت یہ سب منھ کو چھپا بیٹھیں گے

دیکھیں وہ غیرت خورشید کہاں جاتا ہے
اب سر راہ دم صبح سے آ بیٹھیں گے

بھیڑ ٹلتی ہی نہیں آگے سے اس ظالم کے
گردنیں یار کسی روز کٹا بیٹھیں گے

کب تلک گلیوں میں سودائی سے پھرتے رہیے
دل کو اس زلف مسلسل سے لگا بیٹھیں گے

شعلہ افشاں اگر ایسی ہی رہی آہ تو میرؔ
گھر کو ہم اپنے کسو رات جلا بیٹھیں گے

(۵۳۵)

نالہ تا آسمان جاتا ہے
شور سے جیسے بان جاتا ہے

دل عجب جاے ہے ولیکن مفت
ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے

گاہے آتا ہوں آپ میں سو بھی
جیسے کوئی میہمان جاتا ہے[1]

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

کیا خرابی ہے میکدے کی سہل
محتسب اک جہان جاتا ہے

جب سرراہ آوے ہے وہ شوخ
ایک عالم کا جان جاتا ہے

اس سخن ناشنو سے کیا کہیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

عشق کے داغ کا عبث ہے علاج
کوئی اب یہ نشان جاتا ہے

گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور
سو طرف ہی گمان جاتا ہے

میر تو عمر طبعی کو پہنچا
عشق میں جوں جوان جاتا ہے

(۵۳۶)

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمھیں یاد رہے

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے تب کیا تھا شیخ
ہم حرم میں بھی رہے تو ترے داماد رہے

دور اتنی تو نہیں شام اجل دوری میں
تا سحر ایسی ہی جو زاری و فریاد رہے

سر تو کٹوا ہی چکے میر تڑپ سے تو بچیں
جو تنک اک پاؤں رکھے چھاتی پہ جلاد رہے

(۵۳۷)

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

آہ سحر کی میری برچھی کے وسوسے سے
خورشید کے منھ اوپر اکثر سپر رہے ہے

آگہ تو رہیے اس کی طرز رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

ان روزوں اتنی غفلت اچھی نہیں ادھر سے
اب اضطراب ہم کو دو دو پہر رہے ہے

آب حیات کی سی ساری روش ہے اس کی
پر جب وہ اٹھ چلے ہے ایک آدھ مر رہے ہے

تلوار اب لگا ہے بے ڈول پاس رکھنے
خون آج کل کسو کا وہ شوخ کر رہے ہے

در سے کبھو جو آتے دیکھا ہے میں نے اس کو
تب سے ادھر ہی اکثر میری نظر رہے ہے

آخر کہاں تلک ہم اک روز ہو چکیں گے
برسوں سے وعدۂ شب ہر صبح پر رہے ہے

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصل گل میں نادان گھر رہے ہے

(۵۳۸)

نالے کا آج دل سے پھر لب تلک گذر ہے
ٹک گوش رکھیو ایدھر ساتھ اس کے کچھ خبر ہے

اے حب جاہ والو جو آج تاجور ہے
کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے

اب کی ہوائے گل میں سیرابی ہے نہایت
جوئے چمن پہ سبزہ مژگان چشم تر ہے

اے ہم صفیر بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

شمع اخیر شب ہوں سن سرگذشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے

تو ہی زمام اپنی ناقے تڑا کہ مجنوں
مدت سے نقش پا کے مانند راہ پر ہے

ہم مست عشق واعظ بے ہیچ بھی نہیں ہیں
غافل جو بے خبر ہیں کچھ ان کو بھی خبر ہے

اب پھر ہمارا اس کا محشر میں ماجرا ہے
دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف دادگر ہے

آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں
جوں نخل خشک ہم کو نے سایہ نے ثمر ہے

کر میر اس زمیں میں اور اک غزل تو موزوں
ہے حرف زن قلم بھی اب طبع بھی ادھر ہے

(۵۳۹)

ڈھونڈا نہ پایئے جو اس وقت میں سو زر ہے
پھر چاہ جس کی مطلق ہے ہی نہیں ہنر ہے

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکان شیشہ گر ہے

ڈھاہا جنوں نے اس کو ان پر خرابی آئی
جانا گیا اسی سے دل بھی کسو کا گھر ہے

تجھ بن شکیب کب تک بے فائدہ ہوں نالاں
مجھ نالہ کش کے تو اے فریادرس کدھر ہے

صید افگنو ہمارے دل کو جگر کو دیکھو
اک تیر کا ہدف ہے اک تیغ کا سپر ہے

اہل زمانہ رہتے اک طور پر نہیں ہیں
ہر آن مرتبے سے اپنے انھیں سفر ہے

کافی ہے مہر قاتل محضر پہ خوں کے میرے
پھر جس جگہ یہ جاوے اس جا ہی معتبر ہے

تیری گلی سے بچ کر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں
ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہے

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میر اب تو
آنکھوں میں لخت دل ہے یا پارۂ جگر ہے

(۵۴۰)

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے
اس دل جلے کے تاب کے لانے کو عشق ہے

سر مار مار سنگ سے مردانہ جی دیا
فرہاد کے جہان سے جانے کو عشق ہے

اٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانند گردباد
آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے

بس اے سپہر سعی سے تیری تو روز و شب
یاں غم ستانے کو ہے جلانے کو عشق ہے

بیٹھی جو تیغ یار تو سب تجھ کو کھا گئی — اے سینے تیرے زخم اٹھانے کو عشق ہے
اک دم میں تونے پھونک دیا دو جہاں کے تیں — اے عشق تیرے آگ لگانے کو عشق ہے
سودا ہو تب ہو میرؔ کو تو کریے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

(۵۴۱)

جب سے اس بے وفا نے بال رکھے — صید بندوں نے جال ڈال رکھے
ہاتھ کیا آوے وہ کمر ہے ہیچ — یوں کوئی جی میں کچھ خیال رکھے
رہرو راہ خوفناک عشق — چاہیے پاؤں کو سنبھال رکھے
پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے — وہ ہی جانے جو ایسا حال رکھے
ایسے زر دوست ہو تو خیر ہے اب — ملیے اس سے جو کوئی مال رکھے
بحث ہے ناقصوں سے کاش فلک — مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے
سمجھے انداز شعر کو میرے
میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

(۵۴۲)

یاں جو وہ نونہال آتا ہے — جی میں کیا کیا خیال آتا ہے
اس کے چلنے کی آن کا بے حال — مدتوں میں بحال آتا ہے
پر تو گذرا قفس ہی میں دیکھیں — اب کے کیسا یہ سال آتا ہے
شیخ کی تو نماز پر مت جا — بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے
آرسی کے بھی گھر میں شرم سے میرؔ
کم ہی وہ بے مثال آتا ہے

(۵۴۳)

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو روئیے — اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سوئیے
رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم — آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑوئیے
اخلاص دل سے چاہیے سجدہ نماز میں — بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے
کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں — اس آب گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے
مطلب کو تو پہنچتے نہیں اندھے کے سے طور — ہم مارتے پھرے ہیں یونہیں چتے ٹوئیے
اب جان جسم خاکی سے تنگ آگئی بہت — کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

آلودہ اس گلی کی جو ہوں خاک سے تو میرؔ
آب حیات سے بھی نہ دے پاؤں دھوئیے

(۵۴۴)

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے — جان کو اپنی گل مہتاب انگارے ہوئے
گور پر میری پس از مدت قدم رنجہ کیا — خاک میں مجھ کو ملا کر مہرباں بارے ہوئے
آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر — حلق بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے
وعدے ہیں سارے خلافی حرف ہیں یکسر فریب — تم لڑکپن میں کہاں سے ایسے عیارے ہوئے
پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں — سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے ہارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
تم جو ہم سے مل چلے ٹک رشک سب کرنے لگے — مہرباں جتنے تھے اپنے مدعی سارے ہوئے
آج میرے خون پر اصرار ہر دم ہے تمھیں — آئے ہو کیا جانیے تم کس کے سنکارے ہوئے
لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے — شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

استخواں ہی رہ گئے تھے یاں دم خوں ریز میرؔ
دانتے پڑ کر ٹیچے اس شوخ کے آرے ہوئے

(۵۴۵)

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
جرس راہ میں جملہ تن شور ہے — مگر قافلے سے کوئی دور ہے
تمنائے دل کے لیے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
نہ ہو کس طرح فکر انجام کار — بھروسا ہے جس پر سو مغرور ہے
پلک کی سیاہی میں ہے وہ نگاہ — کسو کا مگر خون منظور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج — گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل — وہی بے قراری بدستور ہے
نہ دیکھا کہ لوہو تھما ہو کبھو — مگر چشم خونبار ناسور ہے
ٹک گرم تو سنگ ریزے کو دیکھ — نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے

بہت سعی کریے تو مر رہیے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

(۵۴۶)

اب میرؔ جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے
پیشانی پہ دے قشقہ زنار پہن بیٹھے

آزردہ دل الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں
سب رو اٹھے گی مجلس جو کر کے سخن بیٹھے

عریاں پھریں کب تک اے کاش کہیں آ کر
دہ گرد بیاباں کی بالائے بدن بیٹھے

پیکان خدنگ اس کا یوں سینے کے اودھر ہے
جوں مار سیہ کوئی کاڑھے ہوئے پھن بیٹھے

جز خط کے خیال اس کے کچھ کام نہیں ہم کو
سبزی پیے ہم اکثر رہتے ہیں مگن بیٹھے

شمشیر ستم اس کی اب گو کہ چلے ہر دم
شوریدہ سر اپنے سے ہم باندھ کفن بیٹھے

بس ہو تو ادھر اودھر یوں پھرنے نہ دیں تجھ کو
ناچار ترے ہم یہ دیکھیں ہیں چلن بیٹھے

(۵۴۷)

نہ تنہا داغ تو سینے پہ میرے اک چمن نکلے
ہر اک لخت جگر کے ساتھ سو زخم کہن نکلے

گماں کب تھا یہ پروانے پر اتنا شمع روئے گی
کہ مجلس میں سے جس کے اشک کے بھر بھر لگن نکلے

کہاں تک ناز برداری کروں شام غریباں کی
کہیں گرد سفر سے جلد بھی صبح وطن نکلے

جنوں ان شوخوں پر ہاتھ کی چالاکیاں ایسی
میں ضامن ہوں اگر ثابت بدن سے پیرہن نکلے

حرم میں میرؔ جتنا بت پرستی پر ہے تو مائل
خدا ہی ہو تو اتنا بتکدے میں برہمن نکلے

(۵۴۸)

قصد گر امتحان ہے پیارے
اب تلک نیم جان ہے پیارے

سجدہ کرنے میں سر کٹیں ہیں جہاں
سو ترا آستان ہے پیارے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

کام میں قتل کے مرے تن دے
اب تلک مجھ میں جان ہے پیارے

یاری لڑکوں سے مت کرے ان کا
عشق......ن ہے پیارے[1]

چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس
یہ ہمارا نشان ہے پیارے

شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جن نے خاک
یہ وہی آسمان ہے پیارے

جا چکا دل تو یہ یقینی ہے ق
کیا اب اس کا بیان ہے پیارے

پر تبسم کے کرنے سے تیرے
کنج لب پر گمان ہے پیارے

---

(۱) نسخۂ محمود آباد (کذا)

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

(۵۴۹)

کل وعدہ گاہ میں سے جوں توں کے ہم کو لائے — ہونٹوں پہ جان آئی پر آہ وے نہ آئے
زخموں پہ زخم جھیلے داغوں پہ داغ کھائے — یک قطرہ خون دل نے کیا کیا ستم اٹھائے
اس کی طرف کو ہم نے جب نامہ بر چلائے — ان کا نشاں نہ پایا خط راہ میں سے پائے
خوں بستہ جب تلک تھیں دریا رکے کھڑے تھے — آنسو گرے کروڑوں پلکوں کے ٹک ہلائے
اس جنگ جو کے زخمی اچھے نہ ہوتے دیکھے — گل جب چمن میں آئے وے زخم سب دکھائے
بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں — پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے
پر کی بہار میں جو محبوب جلوہ گر تھے — سو گردش فلک نے سب خاک میں ملائے
ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے — تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
چھاتی سراہ ان کی پائیز میں جنھوں نے — خار و خس چمن سے ناچار دل لگائے
آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم — بے دردی فلک نے وے نقش سب مٹائے
مدت ہوئی تھی بیٹھے جوش و خروش دل کو — ٹھوکر نے اس نگہ کی آشوب پھر اٹھائے
اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ — کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے
دل گرمیاں انھوں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں — ق — مجلس میں جب گئے ہم غیرت نے جی جلائے

جیتے تو میرؔ ہر شب اس طرز عمر گذری
پھر گور پر ہماری لے شمع گو کہ آئے

(۵۵۰)

قبر عاشق پر مقرر روز آنا کیجیے — جو گیا ہو جان سے اس کو بھی جانا کیجیے
رات دارو پیجیے غیروں میں بے لیت و لعل — یاں سحر سر دکھنے کا ہم سے بہانہ کیجیے
ٹک تمھارے ہونٹ کے ہلنے سے یاں ہوتا ہے کام — اتنی اتنی بات جو ہووے تو مانا کیجیے
گوشۂ چشم بتاں یا کنج لب اس وقت میں — جا کہیں ہو تو دل اپنے کا ٹھکانا کیجیے
سیکھیے غیروں کے ہاں چھپ چھپ کے علم تیر پھر — سارے عالم میں ہمارے تیں نشانہ کیجیے
رفتہ رفتہ قاصدوں کو رتّی اس سے ہوئی — جی میں ہے اب کے مقرر اپنا جانا کیجیے
نکلے ہے آنکھوں سے تو گرد کدورت جائے اشک — تا کجا تیری گلی میں خاک چھانا کیجیے

آبشار آنے لگے آنسو کے پلکوں سے تو میر
کب تلک یہ آب چادر منھ پہ تانا کیجیے

(۵۵۱)

مہوشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جایئے   اب کہو اس شہر نا پرساں سے کیدھر جایئے
کام دل کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں کیونکر بنے   آیئے تاچند نا امید پھر کر جایئے
مضطرب اس آستاں سے اٹھ کے کچھ پایا نہ رد   منھ رہا ہے کیا جو پھر اب اس کے در پر جایئے
بعد طوف قیس ہوجے زائر فرہاد بھی   دشت سے اٹھے تو کوہوں میں مقرر جایئے
شوق تھا جو یار کے کوچے ہمیں لایا تھا میر
پاؤں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جایئے

(۵۵۲)

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مرجائے   یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گذر جائے
ہے طرفہ مفتن نگہ اس آئینہ رو کی   اک پل میں کرے سینکڑوں خوں اور مکر جائے
نے بتکدہ ہے منزل مقصود نہ کعبہ   جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے
ہر صبح تو خورشید ترے منھ پہ چڑھے ہے   ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اتر جائے
یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ   ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے
ہم تازہ شہیدوں کو نہ آ دیکھنے نازاں   دامن کی تری زہ کہیں لوہو میں نہ بھر جائے
گریے کو مرے دیکھ ٹک اک شہر کے باہر   اک سطح ہے پانی کا جہاں تک کہ نظر جائے
مت بیٹھ بہت عشق کے آزردہ دلوں میں   نالہ کسو مظلوم کا تاثیر نہ کر جائے
اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

(۵۵۳)

ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پر کتنے   پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے
میں نے اس قطعۂ صناع سے سر کھینچا ہے   کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے
کشور عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے   ہر گلی کوچے میں اوجڑ پڑے تھے گھر کتنے
آہ نکلی ہے یہ کس کی ہوس سیر بہار   آتے ہیں باغ میں آوارہ ہوئے پر کتنے
دیکھیو پنجۂ مژگاں کی ٹک آتش دستی   ہر سحر خاک میں ملتے ہیں دُرِ تر کتنے
کب تلک یہ دل صد پارہ نظر میں رکھیے *   اس پر آنکھیں ہی سیے رہتے ہیں دلبر کتنے

عمر گذری کہ نہیں دودۂ آدم سے کوئی
جس طرف دیکھیے عرصے میں ہیں اب خر کتنے

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

(۵۵۴)

آہ جس وقت سر اٹھاتی ہے
عرش پر برچھیاں چلاتی ہے

ناز بردار لب ہے جاں جب سے
تیرے خط کی خبر کو پاتی ہے

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو
بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

چشم بد دور چشم تر اے میر
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

(۵۵۵)

طاقت نہیں ہے دل میں نے جی بجا رہا ہے
کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے

جیب اور آستیں سے رونے کا کام گذرا
سارا نچوڑ اب تو دامن پہ آرہا ہے

اب چیت گر نہیں کچھ تازہ ہوا ہوں بیکل
آیا ہوں جب بخود میں جی اس میں جارہا ہے

کاہے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی
راز محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

گرد رہ اس کی یارب کس اور سے اٹھے گی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

بندے تو طرحدارو ہیں طرح کش تمھارے
پھر چاہتے ہو کیا تم اب اک خدا رہا ہے

دیکھ اس دہن کو ہر دم اے آرسی کہ یوں ہی
خوبی کا در کسو کے منھ پر بھی وا رہا ہے

وے لطف کی نگاہیں پہلے فریب ہیں سب
کس سے وہ بےمروت پھر آشنا رہا ہے

اتنا خزاں کرے ہے کب زرد رنگ پر یاں
تو بھی کسو نگہ سے اے گل جدا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سمیں میں اب کیا مزہ رہا ہے

اب چاہتا نہیں ہے بوسہ جو تیرے لب سے
جینے سے میر شاید کچھ دل اٹھا رہا ہے

(۵۵۶)

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے

نہ پوچھو کہ احوال ناگفتہ بہ ہے
مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے

دل زخم خوردہ کے اور اک لگائی
مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے

جو خوشہ تھا صد خرمن برق تھا یاں
جلایا ہوا ہوں میں حاصل کا اپنے (۱)

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

ٹک ابرو کو میری طرف کیجے مائل — کبھو دل بھی رکھ لیجے مائل کا اپنے
ہوا دفتر قیس آخر ابھی یاں — سخن ہے جنوں کے اوائل کا اپنے
بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا — ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے
مقام فنا واقعے میں جو دیکھا
اثر بھی نہ تھا گور منزل کا اپنے

(۵۵۷)

جب تک کہ ترا گذر نہ ہووے — جلوہ مری گور پر نہ ہووے
لے تیغ و سپر کو تو جدھر ہو — خورشید کا منہ ادھر نہ ہووے
گھر دود جگر سے بھر گیا آہ — کب تک مری چشم تر نہ ہووے(۱)
رونے کی ہے جاگہ آہ کریے — پھر دل میں ترے اثر نہ ہووے
بیمار رہے ہیں اس کی آنکھیں — دیکھو کسو کی نظر نہ ہووے
رکتی نہیں تیغ نالہ ہرگز — جب تک کہ جگر سپر نہ ہووے
کر بےخبر اک نگہ سے ساقی — لیکن کسو کو خبر نہ ہووے
نسخے ترے موے عنبریں کے — کیونکر جنیں عبیر گر نہ ہووے
رکھ دیکھ کے راہ عشق میں پاے
یاں میر کسو کا سر نہ ہووے

(۵۵۸)

رات گذرے ہے مجھے نزع میں روتے روتے — آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے
کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل — خواب ہوجائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے
داغ اگتے رہے دل میں مری نومیدی سے — ہارا میں تخم تمنا کو بھی بوتے بوتے(۲)
جی چلا تھا کہ ترے ہونٹ مجھے یاد آئے — لعل پائیں ہیں میں اس جی ہی کے کھوتے کھوتے(۳)
جم گیا خوں کف قاتل پہ ترا میر زبس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

(۵۵۹)

یعقوبؑ کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے — سو کاروان مصر سے کنعاں تلک گئے
بارے نسیم ضعف سے کل ہم اسیر بھی — سناہٹے میں جی کے گلستاں تلک گئے

---
(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

رہنے نہ دیں گے دشت میں مجنوں کو چین سے   گر ہم جنوں کے مارے بیاباں تلک گئے
کو موسم شباب کہاں گل کے دماغ   بلبل وہ چہچہے انھیں یاراں تلک گئے
کچھ آبلے دیے تھے رہ آورد عشق نے   سو رفتہ رفتہ خار مغیلاں تلک گئے
پھاڑا تھا جیب پی کے مےشوق میں نے میر
مستانہ چاک لوٹتے داماں تلک گئے

(۵۶۰)

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے   اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
ہوتا نہیں ہے اس لب نوخط پہ کوئی سبز   عیسیٰ و خضر کیا سبھی یک بار مر گئے
یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ   سر کو پٹک کے ہم پس دیوار مر گئے
صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں   گویا متاع دل کے خریدار مر گئے
مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں   تھا جن سے لطف زندگی وے یار مر گئے
گر زندگی یہی ہے جو کرتے ہیں ہم اسیر   تو وے ہی جی گئے جو گرفتار مر گئے[1]
افسوس وے شہید کہ جو قتل گاہ میں   لگتے ہی اس کے ہاتھ کی تلوار مر گئے
تجھ سے دو چار ہونے کی حسرت کے مبتلا   جب جی ہوئے وبال تو ناچار مر گئے
گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

(۵۶۱)

تمام اس کے قد میں سناں کی طرح ہے   رنگیلی نپٹ اس جواں کی طرح ہے
برے ہوتا احوال کو سن کے میرے   بھلا تو ہی کہہ یہ کہاں کی طرح ہے
اڑے خاک گاہے رہے گاہ ویراں   ق   خراب و پریشاں یہاں کی طرح ہے
تعلق کرو میر اس پر جو چاہو
مری جان یہ کچھ جہاں کی طرح ہے

(۵۶۲)

محمل کے ساتھ اس کے بہت شور میں کیے   نالوں نے میرے ہوش جرس کے اڑا دیے
فصاد خوں فساد پہ ہے مجھ سے ان دنوں   نشتر نہ تو لگا دے تو میرا لہو پیے
عشق بتاں سے نبض مری دیکھ کر حکیم   کہنے لگا خدا ہی ہو اب تو تو یہ جیے[2]

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

صوت جرس کی طرز بیاباں میں ہائے میر
تنہا چلا ہوں میں دل پر شور کو لیے

(۵۶۳)

کہاں تک غیر جاسوسی کے لینے کو لگا آوے — الٰہی اس بلائے ناگہاں پر بھی بلا آوے
رکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے — بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ ٹک ہوا آوے
ترا آنا ہی اب مرکوز ہے ہم کو دم آخر — یہ جی صدقے کیا تھا پھر نہ آوے تن میں یا آوے
یہ رسم آمد و رفت دیار عشق تازہ ہے — ہنسی وہ جائے میری اور رونا یوں چلا آوے
اسیری نے چمن سے میری دل گرمی کو دھو ڈالا — وگرنہ برق جا کر آشیاں میرا جلا آوے
امید رحم ان سے سخت نافہمی ہے عاشق کی — یہ بت سنگیں دلی اپنی نہ چھوڑیں گر خدا آوے
یہ فن عشق ہے آوے اسے طینت میں جس کی ہو — تو زاہد پیر نابالغ ہے بے تہ تجھ کو کیا آوے
ہمارے دل میں آنے سے تکلف غم کو بیجا ہے — یہ دولت خانہ ہے اس کا وہ جب چاہے چلا آوے

برنگ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گذرے
میسر میر صاحب گر دل بے مدعا آوے

(۵۶۴)

گو ننگ اس کو آوے ہے عاشق کے نام سے — ہے میر کام میرے تئیں اپنے کام سے
درد صفر ہی خوب پئیں جس میں صاف ہے — کیا میکشوں کو اول ماہ صیام سے
صیاد عرض حال کروں اور تجھ سے کیا — ظاہر ہے اضطراب مرا زیر دام سے[1]

پڑھتے نہیں نماز جنازے پہ اس کے میر
دل میں غبار جس کے ہو خاک امام سے

(۵۶۵)

اچنبھا ہے اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آوے — وگر قصہ کہوں اپنا تو سنتے اس کو خواب آوے
بھرا ہے دل مرا جام لبالب کی طرح ساقی — گلے لگ خوب روؤں میں جو مینائے شراب آوے
بغل پروردۂ طوفاں ہوں میں یہ موج ہے میری — بیاباں میں اگر روؤں تو شہروں میں بھی آب آوے

لپیٹا ہے دل سوزاں کو اپنے میر نے خط میں
الٰہی نامہ بر کو اس کے لے جانے کی تاب آوے

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۵۶۶)

حصول کام کا دلخواہ یاں ہوا بھی ہے ۔۔۔ سماجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہے
موئے ہی جاتے ہیں ہم دردِ عشق سے یارو ۔۔۔ کسو کے پاس اس آزار کی دوا بھی ہے
اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر ۔۔۔ صنم کدے میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے
یہ کہیے کیونکے کہ خوباں سے کچھ نہیں مطلب ۔۔۔ لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھ تو مدعا بھی ہے
ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں ۔۔۔ نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے
جو کھولوں سینۂ مجروح تو نمک چھڑکے ۔۔۔ جراحت اس کو دکھانے کا کچھ مزہ بھی ہے
کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہیے ۔۔۔ ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہے
ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن ۔۔۔ کہیں ہجوم سے اندوہ غم کے جا بھی ہے
غم فراق ہے دنبالہ گرد عیش وصال ۔۔۔ فقط مزہ ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے
قبول کریے تری رہ میں جی کو کھو دینا ۔۔۔ جو کچھ بھی پایئے تجھ کو تو آشنا بھی ہے
جگر میں سوزن مژگاں کے تیں کڈھب نہ گڑو ۔۔۔ کسو کے زخم کو تونے کبھو سیا بھی ہے

گذار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

(۵۶۷)

بسکہ دیوانگی حال میں چالاک ہوئے ۔۔۔ سو گریبان مرے ہاتھ سے یاں چاک ہوئے
سر رگڑ پاؤں پہ قاتل کے کٹائی گردن ۔۔۔ اپنے ذمے سے تو صد شکر کہ ہم پاک ہوئے

پائمالی سے فراغت ہی نہیں میرؔ ہمیں
کوے دلبر میں عبث آن کے ہم خاک ہوئے

(۵۶۸)

صیدافگنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے ۔۔۔ اس دل کے تئیں پیش کش تیر کریں گے
فریاد اسیران محبت نہیں بے ہیچ ۔۔۔ یہ نالے کسو دل میں بھی تاثیر کریں گے
دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل ۔۔۔ آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے
وا اس سے سرحرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے ۔۔۔ ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
رسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں ۔۔۔ مر جاوے گا تو نعش کو تشہیر کریں گے
یارب وہ بھی دن ہوئے گا جو مصر سے چل کر ۔۔۔ کنعاں کی طرف قافلے شب گیر کریں گے
ہر چند کہ ان ترکوں میں ہو جلد مزاجی ۔۔۔ پر کام میں ملنے کے یہ تاخیر کریں گے(۱)

(۱) نسخۂ محمودآباد

شب دیکھی ہے زلف اس کی بجز دام اسیری
کیا یار اب اس خواب کی تعبیر کریں گے

غصے میں تو ہووے گی توجہ تری ایدھر
ہر کام میں ہم جان کے تقصیر کریں گے

نکلا نہ مناجاتیوں سے کام کچھ اپنا
اب کوئی خراباتی جواں پیر کریں گے

مکھڑے کے ترے دیکھنے والوں کے مقابل
لاوے گا کوئی مہ کو تو تعزیر کریں گے(۱)

شیخوں کے نہ جا سبحہ و سجادہ پہ ہرگز
مقدور تلک اپنے یہ تزویر کریں گے(۲)

بازیچہ نہیں میرؔ کے احوال کا لکھنا
اس قصے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

(۵۶۹)

دل کی طرف کچھ آہ سے دل کا لگاؤ ہے
ٹک آپ بھی تو آیئے یاں زور باؤ ہے

اٹھتا نہیں ہے ہاتھ ترا تیغ جور سے
ناحق کشی کہاں تئیں یہ کیا سبھاؤ ہے

باغ نظر ہے چشم کے منظر کا سب جہاں
ٹک ٹھہرو یاں تو جانو کہ کیسا دکھاؤ ہے

تقریب ہم نے ڈالی ہے اس سے جوئے کی اب
جو بن پڑے ہے ٹک تو ہمارا ہی داؤ ہے

ٹپکا کرے ہے آنکھ سے لوہو ہی روز و شب
چہرے پہ میرے چشم ہے یا کوئی گھاؤ ہے

ضبط سرشک خونیں سے جی کیونکے شاد ہو
اب دل کی طرف لوہو کا سارا بہاؤ ہے

اب سب کے روزگار کی صورت بگڑ گئی
لاکھوں میں ایک دو کا کہیں کچھ بناؤ ہے

چھاتی کے میری سارے نمودار ہیں یہ زخم
پردہ رہا ہے کون سا اب کیا چھپاؤ ہے

عاشق کہیں جو ہوگے تو جانوگے قدر میرؔ
اب تو کسی کے چاہنے کا تم کو چاؤ ہے

(۵۷۰)

جہاں میں روز ہے آشوب اس کی قامت سے
اٹھے ہے فتنہ ہر اک شوخ تر قیامت سے

موا ہوں ہو کے دل افسردہ رنج کلفت سے
اگے ہے سبزۂ پژمردہ میری تربت سے

جہاں ملے تہاں کافر ہی ہونا پڑتا ہے
خدا پناہ میں رکھے بتوں کی صحبت سے

تسلی ان نے نہ کی ایک دو سخن سے کبھو
جو کوئی بات کہی بھی تو آدھی لکنت سے

پلک کے مارتے ہم تو نظر نہیں آتے
سخن کرو ہو عبث تم ہماری فرصت سے

امیرزادوں سے دلی کے مل نہ تا مقدور
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

یہ جہل دیکھ کہ ان سمجھے میں اٹھا لایا
گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے

رہا نہ ہوگا بجود صانع ازل بھی تب
بنایا ہوگا جب اس منھ کو دست قدرت سے

---

(۱)،(۲) نسخۂ محمودآباد

وہ آنکھیں پھیرے ہی لیتا ہے دیکھتے کیا ہو　　معاملت ہے ہمیں دل کی بے مروت سے
جو سوچے ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر
خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے

(۵۷۱)

رمق ایک جان وبال ہے کوئی دم جو ہے تو عذاب ہے　　دل داغ گشتہ کباب ہے جگر گداختہ آب ہے
مری خلق محو کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خموش کب　　مرا حرف رشک کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھ بھی تو نامہ بر کوئی حق منھ میں ترے نہاں　　تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جواب خط کا جواب ہے
رہے حال دل کا جو ایک سا تو رجوع کرتے کہیں بھلا　　سو تو یہ کبھو ہمہ داغ ہے کبھو نیم سوز کباب ہے
کہیں گے کہو تمھیں لوگ کیا یہی آرسی یہی تم سدا　　نہ کسو کی تم کو ہے ٹک حیا نہ ہمارے منھ سے حجاب ہے
چلو میکدے میں بسر کریں کہ رہی ہے کچھ برکت وہیں　　لب ناں تو واں کا کباب ہے دم آب واں کا شراب ہے
نہیں کھلتیں آنکھیں تمھاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو　　یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب　　تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا　　یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لحہ لحہ عتاب ہے
تو جہاں کے بحر عمیق میں سر پرہوا نہ بلند کر　　کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو موج پر کا حباب ہے
رکھو آرزو مئے خام کی کرو گفتگو خط جام کی　　کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

(۵۷۲)

سینہ ہے چاک جگر پارہ ہے دل سب خوں ہے　　تس پہ یہ جان بلب آمدہ بھی محزوں ہے
اس سے آنکھوں کو ملا جی میں رہے کیونکر تاب　　چشم اعجاز مژہ سحر نگہ افسوں ہے
آہ یہ رسم وفا ہووے برافتاد کہیں　　اس ستم پر بھی مرا دل اسی کا ممنوں ہے
کبھو اس دشت سے اٹھتا ہے جو ایک ابر تنک　　گرد نمناک پریشاں شدۂ مجنوں ہے
کیونکے بے بادہ لب جو پہ چمن میں رہیے　　عکس گل آب میں تکلیف مئے گلگوں ہے
پار بھی ہو نہ کلیجے کے تو پھر کیا بلبل　　مصرع نالہ جگر کاوی ہے گو موزوں ہے
شہر کتنا جو کوئی ان میں سرشک افشاں ہو　　رو کش گریۂ غم حوصلۂ ہاموں ہے
خون ہر یک رقم شوق سے ٹپکے تھا ولے　　وہ نہ سمجھا کہ مرے نامے کا کیا مضموں ہے
میر کی بات پہ ہر وقت یہ جھنجھلایا نہ کر
سڑی ہے خبطی ہے وہ شیفتہ ہے مجنوں ہے

(۵۷۳)

کہنا ترے منہ پر تو نپٹ بے ادبی ہے
زاہد جو صفت تجھ میں ہے سو زن جلبی ہے

اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے

ہر اک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لیے تیار
کوئی ہفت گزی مغ کوئی دہ وجبی ہے

اے چرخ نہ تو روز سیہ میر پہ لانا
بیچارہ وہ اک نعرہ زن نیم شبی ہے

(۵۷۴)

دو سونپ دود دل کو میرا کوئی نشاں ہے
ہوں میں چراغ کشتہ باد سحر کہاں ہے

بیٹھا جگر سے اپنے کھینچوں ہوں اس کے پیکاں
جینے کی اور سے تو خاطر مری نشاں ہے

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا ولیکن
اے شمع کچھ تو کہہ تو تیرے بھی تو زباں ہے

بھڑکے ہے آتش گل اے ابر تر ترحم
گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے

ہم زمزمہ تو ہو کے مجھ نالہ کش سے چپ رہ
اے عندلیب گلشن تیرا لب و دہاں ہے

کس دور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو
پیوند ہو زمیں کا جیسا یہ آسماں ہے

کتنی ہی جی نے تجھ سے لی خاک کر اڑائی
وابستگی کر اس سے پر وہی جہاں ہے(۱)

ہے قتل گاہ کس کی کوچہ ترا ستمگر
یک عمر خضر ہوگئی خوں متصل رواں ہے(۲)

پیرِ مغاں سعادت تیری جو ایسا آوے
یہ میر مے کشوں میں اک طرز کا جواں ہے

(۵۷۵)

ہمسایۂ چمن یہ نپٹ زار کون ہے
نالان و مضطرب پس دیوار کون ہے

مژگاں بھی پھر گئیں تری بیمار چشم دیکھ
دکھ درد میں سوائے خدا یار کون ہے

نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش
کیا جانیے قفس میں گرفتار کون ہے

آیا نہ آشیانۂ بلبل میں کام بھی
مجھ سا تو خار باغ میں بیکار کون ہے

کیا فکر ملک گیری میں ہے تجھے جو پیش ازیں
ان میں سے تو ہی دیکھ جہاندار کون ہے(۳)

بازار دہر میں ہے عبث میر عرض مہر
یاں ایسی جنس کا تو خریدار کون ہے

(۱ کذا) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

(۵۷۶)

مجھ سوز بعد مرگ سے آگاہ کون ہے　　شمع مزار میر بجز آہ کون ہے
بیکس ہوں مضطرب ہوں مسافر ہوں بے وطن　　دوری راہ بن مرے ہمراہ کون ہے
لبریز جس کے حسن سے مسجد ہے اور دیر　　ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے
رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں　　مانند نقش پا یہ سر راہ کون ہے

ایسا اسیر خستہ جگر میں سنا نہیں
ہر آہ میر جس کی ہے جانکاہ کون ہے

(۵۷۷)

دیکھا کروں تجھی کو منظور ہے تو یہ ہے　　آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہے تو یہ ہے
نزدیک تجھ سے سب ہے کیا قتل کیا جلانا　　ہم غمزدوں سے ملنا اک دور ہے تو یہ ہے
رونے میں دن کٹیں ہیں آہ و فغاں سے راتیں　　گر شغل ہے تو یہ ہے مذکور ہے تو یہ ہے
چاک جگر کو میرے بےجا ہے جو کہو تم　　گر زخم ہے تو یہ ہے ناسور ہے تو یہ ہے
اٹھتے ہی صبح کے تیں عاشق کو قتل کرنا　　خوباں کی سلطنت میں دستور ہے تو یہ ہے[۱]
کہتا ہے کوئی عاشق کوئی کہے ہے خبطی　　دنیا سے بھی نرالا رنجور ہے تو یہ ہے

کیا جانوں کیا کسل ہے واقع میں میر کے تیں
دو چار روز سے جو مشہور ہے تو یہ ہے

(۵۷۸)

کوئی ہوا نہ روکش ٹک میری چشم تر سے　　کیا کیا نہ ابر آکر یاں زور زور برسے
وحشت سے میری یارو خاطر نہ جمع رکھیو　　پھر آوے یا نہ آوے نوپر اٹھا جو گھر سے
اب جوں سرشک ان سے پھرنے کی چشم مت رکھ　　جو خاک میں ملے ہیں گر کر تری نظر سے
دیدارخواہ اس کے کم ہوں تو شور کم ہو　　ہر صبح اک قیامت اٹھتی ہے اس کے در سے
داغ ایک ہو جلا بھی خوں ایک ہو بہا بھی　　اب بحث کیا ہے دل سے کیا گفتگو جگر سے
دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے　　بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے
انجام کار بلبل دیکھا ہم اپنی آنکھوں　　آوارہ تھے چمن میں دو چار ٹوٹے پر سے
بے طاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا　　آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے
دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو آہ نکلی　　سب یار جاچکے تھے آئے جو ہم سفر سے

آوارہ میر شاید واں خاک ہوگیا ہے
یک گرد اٹھ چلے ہے گاہ اس کی رہگذر سے

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

(۵۷۹)

وعدہ وعید پیارے کچھ تو قرار ہووے   دل کی معاملت ہے کیا کوئی خوار ہووے
فتراک سے نہ باندھے دیکھے نہ تو تڑپنا   کس آرزو پہ کوئی تیرا شکار ہووے
ازبس لہو پیا ہے میں تیرے غم میں گل رو   تربت سے میری شاید حشر بہار ہووے
مرنا بھلا ہے ظالم اس زندگی بد سے   یوں چاہیے کہ کوئی تجھ سے نہ یار ہووے(۱)
میں مست مرگیا ہوں کرنا عجب نہ ساقی   گر سنگ شیشہ میرا سنگ مزار ہووے
وابست آسماں کا ملنا ہے خاک ہی میں   اس بے مدار اوپر کس کا مدار ہووے(۲)
اے غیر میرؔ تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

(۵۸۰)

رہی نہ پختگی عالم میں دور خامی ہے   ہزار حیف کمینوں کا چرخ حامی ہے
نہ اٹھ تو گھر سے اگر چاہتا ہے ہوں مشہور   نگیں جو بیٹھا ہے گڑ کر تو کیسا نامی ہے
ہوئی ہیں فکریں پریشان میرؔ یاروں کی
حواس خمسہ کرے جمع سو نظامی ہے

(۵۸۱)

انجام دل غم کش کوئی عشق میں کیا جانے   کیا جانیے کیا ہوگا آخر کو خدا جانے
واں آرسی ہے وہ ہے یاں سنگ ہے چھاتی ہے   گذرے ہے جو کچھ ہم پر سو اس کی بلا جانے
ناصح کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی   ہے حق بطرف اس کے چکھے تو مزہ جانے
میں خط جبیں اپنا یارو کسے دکھلاؤں   قسمت کے لکھے کے تیں یاں کون مٹا جانے
بے طاقتی دل نے ہم کو نہ کیا رسوا   ہے عشق سزا اس کو جو کوئی چھپا جانے
اس مرتبہ ناسازی نبھتی ہے دلا کوئی   کچھ خُلق بھی پیدا کر تا خلق بھلا جانے
لے جایئے میرؔ اس کے دروازے کی مٹی بھی
اس درد محبت کی جو کوئی دوا جانے

(۵۸۲)

ہنستے ہو روتے دیکھ کر غم سے   چھیڑ رکھی ہے تم نے کیا ہم سے
مند گئی آنکھ ہے اندھیرا پاک   روشنی ہے سو یاں مرے دم سے
تم جو دلخواہ خلق ہو ہم کو   دشمنی ہے تمام عالم سے

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

درہمی آگئی مزاجوں میں　　آخر ان گیسوان درہم سے
سب نے جانا کہیں یہ عاشق ہے　　بہ گئے اشک دیدۂ نم سے
مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو　　کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے
اکثر آلات جور اس سے ہوئے　ق　آفتیں آئیں اس کے مقدم سے
دیکھ دے پلکیں برچھیاں چلیاں　　تیغ نکلی اس ابروے خم سے
کوئی بیگانہ گر نہیں موجود　ق　منھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے
وجہ پردے کی پوچھیے بارے　　ملیے اس کے کسو جو محرم سے
در پئے خون میرؔ ہی نہ رہو
ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

(۵۸۴)

نالۂ عجز نقص الفت ہے　　رنج و محنت کمال راحت ہے
عشق ہی گریۂ ندامت ہے　　ورنہ عاشق کو چشم خفت ہے
تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں　　دل آزردہ گر سلامت ہے
دل میں ناسور پھر جدھر چاہے　　ہر طرف کوچۂ جراحت ہے
رونا آتا ہے دم بدم شاید　　کسو حسرت کی دل سے رخصت ہے
فتنے رہتے ہیں اس کے سائے میں　　قد و قامت ترا قیامت ہے
نہ تجھے رحم نے اسے تک صبر　　دل پہ میرے عجب مصیبت ہے
تو تو نادان ہے نپٹ ناصح　ق　کب موثر تری نصیحت ہے
دل پہ جب میرے آکے یہ ٹھہرا　　کہ مجھے خوش دلی اذیت ہے
رنج و محنت سے باز کیونکے رہوں　　وقت جاتا رہے تو حسرت ہے
کیا ہے پھر کوئی دم کو کیا جانو　　دم غنیمت میاں جو فرصت ہے
تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے　ق　چاہیے یوں جو فی الحقیقت ہے
تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ　　واعظا اپنی اپنی قسمت ہے
ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ　　شمع مجلس کی رونی صورت ہے
باطل السحر دیکھ باطل تھے　　تیری آنکھوں کا سحر آفت ہے
ابر تر کے حضور پھوٹ بہا　　دیدۂ تر کو میرے رحمت ہے
گاہ نالاں طپاں گہے بے دم　　دل کی میرے عجب ہی حالت ہے[1]

(۱) نسخۂ محمود آباد

کیا ہوا گر غزل قصیدہ ہوئی عاقبت قصۂ محبت ہے
تربت میرؔ پر ہیں اہل سخن ق ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بخدا واجب الزیارت ہے

(۵۸۴)

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لیے ہم نے اک بات بنا لی ہے

دیکھی کو نہ کچھ پوچھو اک بھرت کا ہے گڑوا
ترکیب سے کیا کہیے سانچے میں کی ڈھالی ہے

ہم قد خمیدہ سے آغوش ہوئے سارے
پر فائدہ تجھ سے تو آغوش وہ خالی ہے

عزت کی کوئی صورت دکھلائی نہیں دیتی
چپ رہیے تو چشمک ہے کچھ کہیے تو گالی ہے

دو گام کے چلنے میں پامال ہوا عالم
کچھ ساری خدائی سے وہ چال نرالی ہے

ہے گی تو دو سالہ پر ہے دختر رز آفت
کیا پیر مغاں نے بھی اک چھوکری پالی ہے

خونریزی میں ہم سوں کی جو خاک برابر ہیں
کب سر تو فرو لایا ہمت تری عالی ہے

جب سر چڑھے ہوں ایسے تب عشق کریں سو بھی
جوں توں یہ بلا سر سے فرہاد نے ٹالی ہے

ان مغبچوں میں زاہد پھر سرزدہ مت آنا
مندیل تری اب کے ہم نے تو بچالی ہے

کیا میرؔ تو روتا ہے پامالی دل ہی کو
ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھا لی ہے

(۵۸۵)

تازہ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے
ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخ زعفراں ہے

گر اس چمن میں وہ بھی اک ہی لب و دہاں ہے
لیکن سخن کا تجھ سے غنچے کو منہ کہاں ہے

ہنگام جلوہ اس کے مشکل ہے ٹھہرے رہنا
چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جاں ہے

پتھر سے توڑنے کے قابل ہے آرسی تو
پر کیا کریں کہ پیارے منہ تیرا درمیاں ہے

باغ و بہار ہے وہ میں کشت زعفراں ہوں
جو لطف اک ادھر ہے تو یاں بھی اک سماں ہے

ہر چند ضبط کریے چھپتا ہے عشق کوئی
گذرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے ہی سے عیاں ہے

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو
گر خاک ہے اڑے ہے ور آب ہے رواں ہے

چرچا رہے گا اس کا تا حشر مے کشاں میں
خونریزی کی ہماری رنگین داستاں ہے

ازخویش رفتہ اس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے، وہ آپ میں کہاں ہے

(۵۸۶)

تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے   کیا جی تدرو کا جو ترے آگے چل سکے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے   فانوس کی سی شمع جو پردے میں جل سکے
کہتا ہے کون تجھ کو کہ اے سینہ رک نہ جا   اتنا تو ہو کہ آہ جگر سے نکل سکے
گر دوپہر کو اس کو نکلنے دے نازکی   حیرت سے آفتاب کی پھر دن نہ ڈھل سکے
کیا اس غریب کو ہو سرمایۂ ہما   جو اپنی بے دماغی سے کبھی نہ جھل سکے
ہے جائے حیف بزم جہاں مل لے اے پتنگ   اپنے اپر جو کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے
ہے وہ بلائے عشق کہ آئے سو آئے ہے   کلول نہیں ہے ایسی محبت کہ ٹل سکے[(۱)]
کس کو ہے آرزوئے افاقت فراق میں   ایسا تو ہو کہ کوئی گھڑی جی سنبھل سکے
مت ابر چشم کم سے مری چشم تر کو دیکھ   چشمہ ہے یہ وہ جس سے کہ دریا ابل سکے
کہتا ہے وہ تو ایک کی دس میر کم سخن   اس کی زباں کے عہدے سے کیونکر نکل سکے

تغییر قافیہ سے یہ طرحی غزل کہوں
تا جس میں زور کچھ تو طبیعت کا چل سکے

(۵۸۷)

خورشید تیرے چہرے کے آگو نہ آسکے   اس کو جگر بھی شرط ہے جو تاب لا سکے
ہم گرم رو ہیں راہ فنا کے شرر صفت   ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے
غافل نہ رہیو آہ ضعیفوں سے سرکشاں   طاقت ہے اس کو یہ کہ جہاں کو جلا سکے
میرا جو بس چلے تو منادی کیا کروں   تا اب سے دل نہ کوئی کسو سے لگا سکے
تدبیر جیب پارہ نہیں کرتی فائدہ   تا صبح جگر کا چاک سلا جو سلا سکے
اس کا کمال چرخ پہ سر کھینچتا نہیں   اپنے تئیں جو خاک میں کوئی ملا سکے
یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ تو ہے بوالہوس   کھانا تجھے حرام ہے جو زخم کھا سکے
اس رشک آفتاب کو دیکھے تو شرم سے   ماہ فلک نہ شہر میں منھ کو دکھا سکے
کیا دل فریب جائے ہے آفاق ہم نشیں   ق   دو دن کو یاں جو آئے سو برسوں نہ جا سکے
مشعر ہے اس پہ مردن دشوار رفتگاں   یعنی جہاں سے دل کو نہ آساں اٹھا سکے

بدلوں گا اس غزل کے بھی میں قافیے کو میر
پھر فکر گو نہ عہدے سے اس کے بر آسکے

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۵۸۸)

کیا غم میں ویسے خاک فتادہ سے ہو سکے
دامن پکڑ کے یار کا جو ٹک نہ رو سکے

ہم ساری ساری رات رہے گریہ ناک لیک
مانند شمع داغ جگر کا نہ دھو سکے

رونا تو ابر کا سا نہیں یار جانتے
اتنا تو رویئے کہ جہاں کو ڈبو سکے

تیغ برہنہ کف میں وہ بیداگر ہے آج
ہے مفت وقت اس کو جو کوئی جان کھو سکے[1]

برسوں ہی منتظر سر رہ پر ہمیں ہوئے
اس قسم کا تو صبر کسو سے نہ ہو سکے

رہتی ہے ساری رات مرے دم سے چہل میر
نالہ رہے تو کوئی محلے میں سو سکے

(۵۸۹)

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گذر گئے
بس اے تب فراق کہ گرمی میں مر گئے

منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آہ
جن کا کیا سراغ سنا وے گذر گئے

مشت نمک سے بھی تو کبھو یاد کر ہمیں
اب داغ کھاتے کھاتے فلک جی تو بھر گئے

ناصح نہ روویں کیونکے محبت کے جی کو ہم
اے خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے

تلوار آپ کھینچے حاضر ہے یاں بھی سر
بس عاشقی کی ہم نے جو مرنے سے ڈر گئے

کر دیں گے آسمان و زمیں ایک حشر کو
اس معرکے میں یارجی ہم بھی اگر گئے

یہ راہ و رسم دل شدگاں گفتنی نہیں
ق جانے دے میر صاحب و قبلہ جدھر گئے

روز وداع اس کی گلی تک تھے ہم بھی ساتھ
جب دردمند ہم کو وے معلوم کر گئے

کر یک نگاہ یاس کی ٹپ دے سے رو دیا
پھر ہم ادھر کو آئے میاں وے ادھر گئے

(۵۹۰)

دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے
مرنا پڑا ضرور ترے غم میں اب مجھے

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے
لے جائیں گے جنازہ کشاں یاں سے کب مجھے

ٹک داد میری اہل محلہ سے چاہیو
تجھ بن خراب کرتے رہے ہیں یہ سب مجھے

طوفاں بجائے اشک ٹپکتے تھے چشم سے
اے ابر تر دماغ تھا رونے کا جب مجھے

دو حرف اس کے منہ کے تو لکھ بھیجیو شتاب
قاصد چلا ہے چھوڑ کے تو جاں بلب مجھے

کچھ ہے جواب جو میں کروں حشر کو سوال
مارا تھا تونے جان سے کہہ کس سبب مجھے

غیراز خموش رہنے کہ ہونٹوں کے سوکھنے
لیکن نہیں ہے یار جھگڑنے کا ڈھب مجھے

---

(۱) نسخۂ محمودآباد

پوچھا تھا راہ جاتے کہیں ان نے میرؔ کو
آتا ہے اس کی بات کا اب تک عجب مجھے

(۵۹۱)

کاتب کہاں دماغ جو اب شکوہ لکھایئے   بس ہے یہ ایک حرف کہ مشتاق جانیے
غیروں کا ساتھ موجب صد وہم ہے بتاں   اس امر میں خدا بھی کہے تو نہ مانیے
شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ   جب سوئیے تو چادر مہتاب تانیے
اپنا یہ اعتقاد ہے تجھ جستجو میں یار ق   لے اس سرے سے اس سرے تک خاک چھانیے
پھر یا نصیب یہ بھی ہے طالع کی یاوری   مر جائیں ہم تو اس پہ بھی ہم کو نہ جانیے

لوٹے ہے خاک و خون میں غیروں کے ساتھ میرؔ
ایسے تو نیم کشتہ کو ان میں نہ سانیے

(۵۹۲)

مرے اس رک کے مرجانے سے وہ غافل ہے کیا جانے   گذرنا جان سے آساں بہت مشکل ہے کیا جانے
کوئی سر سنگ سے مارو کسی کا واپسیں دم ہو   وہ آئینے میں اپنے ناز پر مائل ہے کیا جانے
نظر مطلق نہیں ہجراں میں اس کو حال پر میرے   مرا دل اس کے غم میں گویا اس کا دل ہے کیا جانے
جنونی خبطی دیوانہ سڑا کوئی عشق کو سمجھے   فلاطوں سے نہیں یاں بحث وہ عاقل ہے کیا جانے
تڑپنا نقش پائے ناقہ پر جانے ہے اک مجنوں   بیاباں میں وہ لیلیٰ کا کدھر محمل ہے کیا جانے
پڑھایا اس کو بہتیرا کہ مت لا راز دل منہ پر   پہ طفل اشک کو دیکھا تو ناقابل ہے کیا جانے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یوہیں سوداؔ کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

(۵۹۳)

کب تلک جی رکے خفا ہووے   آہ کریے کہ ٹک ہوا ہووے
جی ٹھہر جائے یا ہوا ہووے   دیکھیے ہوتے ہوتے کیا ہووے
کر نمک سود سینۂ مجروح   جی میں گر ہے کہ کچھ مزہ ہووے[1]
کاہش دل کی کیجیے تدبیر   جان میں کچھ بھی جو رہا ہووے
چپ کا باعث ہے بے تمنائی   کہیے کچھ بھی تو مدعا ہووے
بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم   دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

---
(۱) نسخۂ محمود آباد

مر گئے ہم تو مر گئے تو جی — دل گرفتہ تری بلا ہووے
عشق کیا ہے درست اے ناصح — جانے وہ جس کا دل لگا ہووے
پھر نہ شیطاں سجود آدم سے — شاید اس پردے میں خدا ہووے
نہ سنا رات ہم نے اک نالہ
غالبًا میر مر رہا ہووے

(۵۹۴)

کچھ تو کہہ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے — دن گذر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے
رہ گئے گاہ تبسم پہ گہے بات ہی پر — بارے اے ہم نشیں اوقات چلی جاتی ہے
ٹک تو وقفہ بھی کر اے گردش دوراں کہ یہ جان — عمر کے حیف ہی کیا سات چلی جاتی ہے
یاں تو آتی نہیں شطرنج زمانہ کی چال — اور واں بازی ہوئی مات چلی جاتی ہے
روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف — عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے
شیخ بے نفس کو نزلہ نہیں ہے ناک کی راہ — یہ ہے جریان منی دھات چلی جاتی ہے[1]
خرقہ مندیل و ردا مست لیے جاتے ہیں — ق — شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے
ہے موذن جو بڑا مرغ مصلی اس کی — مستوں سے نوک ہی کی بات چلی جاتی ہے
پاؤں رکتا نہیں مسجد سے دم آخر بھی — مرنے پر آیا ہے پر لات چلی جاتی ہے
ہر سحر درپئے آرام ہے آشاماں ہے — مکر و طامات کی اک گھات چلی جاتی ہے
ایک ہم ہی سے تفاوت ہے سلوکوں میں میر
یوں تو اوروں کی مدارات چلی جاتی ہے

(۵۹۵)

منصف جو تو ہے کب تئیں یہ دکھ اٹھائیے — کیا کیجے میری جان اگر مر نہ جائیے
اظہار راز عشق کیے بن رہے نہ اشک — اس طفل ناسمجھ کو کہاں تک پڑھائیے
تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا — اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے
فکر معاش یعنی غم زیست تا بہ کے — مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے
جاتے ہیں کیسی کیسی لیے دل میں حسرتیں — ٹک دیکھنے کو جاں بلبوں کے بھی آئیے
لوٹوں ہوں جیسے خاک چمن پر میں اے سپہر — گل کو بھی میری خاک پہ دو دن لٹائیے
ہوتا نہیں ہوں حضرت ناصح میں بے دماغ — کر کرکے پوچ گوئی مری جان کھائیے[2]
پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

(۵۹۶)

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغییر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے

بس ہیں دو برگ گل قفس میں صبا
نہیں بھوکے ہم آب و دانے کے

مرنے پر بیٹھے ہیں سنو صاحب
بندے ہیں اپنے جی چلانے کے

اب گریباں کہاں کہ اے ناصح
چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے

چشم انجم سپہر جھپکے ہے
صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمھارے آنے کے

کب تو سوتا تھا گھر مرے آکر
جاگے طالع غریب خانے کے

مژہ ابرو نگہ سے اس کی میرؔ ق
کشتہ ہیں اپنے دل لگانے کے

تیر و تلوار و سیل یک جا ہیں
سارے اسباب مار جانے کے

(۵۹۷)

کم فرصتی گل جو کہیں کوئی نہ مانے
ایسے گئے ایام بہاراں کہ نہ جانے

تھے شہر میں اے رشک پری جتنے سیانے
سب ہوگئے ہیں شور ترا سن کے دوانے

ہمراہ جوانی گئے ہنگامے اٹھانے
اب ہم بھی نہیں وے رہے نے دے ہیں زمانے

پیری میں جو باقی نہیں جامے میں تو کیا دور
پھٹنے لگے ہیں کپڑے جو ہوتے ہیں پرانے

مرتے ہی سنے ہم نے کسل مند محبت
اس درد میں کس کس کو کیا نفع دوا نے

ہے کس کو میسر تری زلفوں کی اسیری
شانے کے نصیبوں میں تھے یوں ہاتھ بندھانے

ٹک آنکھ بھی کھولی نہ زخود رفتہ نے اس کے
ہرچند کیا شور قیامت نے سرہانے

لوہے کے توے ہیں جگر اہل محبت
رہتے ہیں ترے تیرستم ہی کے نشانے

کاہے کو یہ انداز تھا اعراض بتاں کا
ظاہر ہے کہ منھ پھیر لیا ہم سے خدا نے

ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہیں اب چھاؤں
کن کن روشوں ہم کو پھرایا ہے ہوا نے

کب کب مری عزت کے لیے بیٹھے ہو ٹک پاس
آئے بھی جو ہو تو مجھے مجلس سے اٹھانے

پایا ہے نہ ہم نے دل گم گشتہ کو اپنے
خاک اس کی سرراہ کی کوئی کب تئیں چھانے

کچھ تم کو ہمارے جگروں پر بھی نظر ہے
آتے جو ہو ہر شام و سحر تیر لگانے

مجروح بدن سنگ سے طفلاں کے نہ ہوتے — کم جاتے جو اس کوچے میں پر ہم تھے دوانے
آنے میں تعلل ہی کیا عاقبت کار — ہم جی سے گئے پر نہ گئے اس کے بہانے
گلیوں میں بہت ہم تو پریشاں سے پھرے ہیں
اوباش کسو روز لگا دیں گے ٹھکانے

(۵۹۸)

تن ہجر میں اس یار کے رنجور ہوا ہے — بے طاقتی دل کو بھی مقدور ہوا ہے
پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال — یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے
بے خوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات — افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے
کل صبح ہی مستی میں سرِراہ نہ آیا — یاں آج مرا شیشۂ دل چور ہوا ہے
کیا سوجھے اسے جس کے ہو یوسف ہی نظر میں — یعقوب بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے
پر شور سے ہے عشق مغنی پسراں کے — یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے
تلوار لیے پھرنا تو اب اس کا سنا میں — نزدیک مرے کب کا یہ سر دور ہوا ہے
خورشید کی محشر میں طپش ہوگی کہاں تک — کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے
اے رشکِ سحر بزم میں لے منھ پہ نقاب اب — اک شمع کا چہرہ ہے سو بے نور ہوا ہے
اس شوق کو ٹک دیکھ کہ چشم نگراں ہے
جو زخم جگر کا مرے ناسور ہوا ہے

(۵۹۹)

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کہیے — ہر سرحرف پہ فریاد نہایت کہیے
گو کہ سر خاک قدم پر ترے لوٹے اس میں — اپنا شیوہ ہی نہیں یہ کہ شکایت کہیے
ہم جگر سوختوں کے جی میں جو آوے تو ابھی — دود دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کہیے
عشق میں آپ کے گذری نہ ہماری تو مگر — عوض جور و جفا ہم پہ عنایت کہیے
مت چلا عشق کی رہ کی کہ کہے ہے یاں خضر — آپھی گمراہ ہیں ہم کس کو ہدایت کہیے
کس کے کہنے کی ہے تاثیر کہ اک میر ہی سے
رمز و ایما و اشارات و کنایت کہیے

(۶۰۰)

دل جو پر بےقرار رہتا ہے — آج کل مجھ کو مار رہتا ہے

تیرے بن دیکھے میں مکدر ہوں — آنکھوں پر اب غبار رہتا ہے
جبر یہ ہے کہ تیری خاطر دل — روز بے اختیار رہتا ہے
دل کو مت بھول جانا میرے بعد — مجھ سے یہ یادگار رہتا ہے
دور میں چشم مست کے تیری — فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے
بسکہ تیرا ہوا بلا گرداں — سر کو میرے دوار رہتا ہے
ہر گھڑی رنجش ایسی باتوں میں — کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے
تجھ بن آئے ہیں تنگ جینے سے — مرنے کا انتظار رہتا ہے
دل کو گو ہاتھ میں رکھو اب تم — کوئی یہ بے قرار رہتا ہے
غیر مت کھا فریب خلق اس کا — کوئی دم میں وہ مار رہتا ہے
پی نہ ہرگز شراب جیسا چاہ ق — اس کے نشے کا تار رہتا ہے(۱)
پر ہو پیمانہ عمر کا جب تک — تب تلک یہ خمار رہتا ہے(۲)
دلبرو دل چراتے ہو ہر دم — یوں کہیں اعتبار رہتا ہے

کیوں نہ ہووے عزیز دلہا میر
کس کے کوچے میں خوار رہتا ہے

(۶۰۱)

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے — جو ہے سو کوئی دم کو فیصل ہے
کثرت غم سے دل لگا رکنے — حضرت دل میں آج دنگل ہے
روز کہتے ہیں چلنے کو خوباں — لیکن اب تک تو روز اول ہے
چھوڑ مت نقد وقت نسیہ پر — آج جو کچھ ہے سو کہاں کل ہے
بند ہو تجھ سے یہ کھلا نہ کبھو — دل ہے یا خانۂ مقفل ہے
سینہ چاکی بھی کام رکھتی ہے — یہی کر جب تلک معطل ہے
اب کے ہاتھوں میں شوق کے تیرے — دامن بادیہ کا آنچل ہے
تک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ — دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے
ہجر باعث ہے بدگمانی کا — غیرت عشق ہے تو کب کل ہے

مر گیا کوہکن اسی غم میں
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

---
(۱)، (۲) نسخۂ محمود آباد

(۶۰۲)

جاں گداز اتنی کہاں آواز عود و چنگ ہے ۔۔۔ دل کے سے نالوں کا ان پردوں میں کچھ آہنگ ہے
رو و خال و زلف ہی ہیں سنبل و سبزہ و گل ۔۔۔ آنکھیں ہوں تو یہ چمن آئینۂ نیرنگ ہے
بے ستوں کھودے سے کیا آخر ہوئے سب کار عشق ۔۔۔ بعد ازاں اے کوہکن سر ہے ترا اور سنگ ہے
آہ ان خوش قامتوں کو کیونکے بر میں لایئے ۔۔۔ جن کے ہاتھوں سے قیامت پر بھی عرصہ تنگ ہے
عشق میں وہ گھر ہے اپنا جس میں سے مجنوں یہ ایک ۔۔۔ ناخلف سارے قبیلے کا ہمارے ننگ ہے
چشم کم سے دیکھ مت قمری تو اس خوش قد کو ٹک ۔۔۔ آہ بھی سرو گلستان شکست رنگ ہے
ہم سے تو جایا نہیں جاتا کہ یکسر دل میں واں ۔۔۔ دو قدم اس کی گلی کی راہ سو فرسنگ ہے
ایک بوسے پر تو کی ہے صلح پر اے زود رنج ۔۔۔ تجھ کو مجھ کو اتنی اتنی بات اوپر جنگ ہے
پاؤں میں چوٹ آنے کے پیارے بہانے جانے دے ۔۔۔ پیش رفت آگے ہمارے کب یہ عذر لنگ ہے
فکر کو نازک خیالوں کے کہاں پہنچے ہیں یار ۔۔۔ ق ۔۔۔ ورنہ ہر مصرع یہاں معشوق شوخ و شنگ ہے
سرسری کچھ سن لیا پھر واہ وا کر اٹھ گئے ۔۔۔ شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

صبر بھی کریے بلا پر میرؔ صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

(۶۰۳)

خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہوگیا ہے ۔۔۔ ملک ان ستم زدوں کا سب پاک ہوگیا ہے
جس سے اسے لگاؤں روکھا ہی ہو ملے ہے ۔۔۔ سینے میں جل کر ازبس دل خاک ہوگیا ہے
کیا جالوں لذت درد اس کی جراحتوں کی ۔۔۔ یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہوگیا ہے
صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا ۔۔۔ اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہوگیا ہے
دیوار کہنہ ہے یہ مت بیٹھ اس کے سائے ۔۔۔ اٹھ چل کہ آسماں تو کاواک ہوگیا ہے
شرم و حیا کہاں کی ہر بات پر ہے شمشیر ۔۔۔ اب تو بہت وہ ہم سے بے باک ہوگیا ہے
ہر حرف بسکہ رویا ہے حال پر ہمارے ۔۔۔ قاصد کے ہاتھ میں خط نمناک ہوگیا ہے[1]

زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا ہے

(۶۰۴)

ساقی گھر چاروں اور آیا ہے ۔۔۔ دے بھی ے ابر زور آیا ہے

(۱) نسخۂ محمود آباد

ذوق تیرے وصال کا میرے   ننگے سر تا بہ گور آیا ہے(1)

بوجھ اٹھاتا ہوں ضعف کا شاید   ہاتھ پاؤں میں زور آیا ہے(2)

غارت دل کرے ہے ابرسیاہ   بے طرح گھر میں چور آیا ہے

آج تیری گلی سے ظالم میر
لوہو میں شور بور آیا ہے

(۶۰۵)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   کہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی   کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

پڑے ایسے اسباب پایان کار   کہ ناچار یوں جی جلا کر چلے(3)

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے   ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری   سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بےخود کیا   ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی   حق بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے   نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں   چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے

نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے   ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

گئی عمر در بند فکر غزل   سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

(۶۰۶)

اپنا سرشوریدہ تو وقف خم چوگان ہے   آ بوالہوس گر ذوق ہے یہ گو ہے یہ میدان ہے

عالم سری تقلید سے خواہش تری کرنے لگا   میں تو پشیماں ہو چکا لوگوں کو اب ارمان ہے

ہر چند بیش از بیش ہے دعویٰ تو رونے کا تجھے   پر دیدۂ نمناک بھی اے ابرتر طوفان ہے

اس بے دمی میں بھی کبھو دل بھر اٹھے ہے دم ترا   آ تک شتابی بے وفا اب تک تو مجھ میں جان ہے

ہر لحظہ خنجر درمیاں ہر دم زباں زیر زباں   وہ طور وہ اسلوب ہے یہ عہد یہ پیمان ہے

(۱) تا (۳) نسخۂ محمود آباد

اس آرزوے وصل نے مشکل کیا جینا مرا ۔ ورنہ گذرنا جان سے اتنا نہیں آسان ہے
بس بے وقاری ہو چکی گلیوں میں خواری ہو چکی
اب پاس کر ٹک میر کا دو چار دن مہمان ہے

(۶۰۷)

خوب تھے وے دن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے ۔ غمزدوں اندوہ گینوں ظلم کے ماروں میں تھے
دشمنی جانی ہے اب تو ہم سے غیروں کے لیے ۔ اک سماں سا ہو گیا وہ بھی کہ ہم یاروں میں تھے
مت تبختر سے گذر قمری ہماری خاک پر ۔ ہم بھی اک سرو رواں کے ناز برداروں میں تھے
مر گئے لیکن نہ دیکھا تو نے ادھر آنکھ اٹھا ۔ آہ کیا کیا لوگ ظالم تیرے بیماروں میں تھے
شیخ جی مندیل کچھ بگڑی سی ہے کیا آپ بھی ۔ رندوں بانکوں میکشوں آشفتہ دستاروں میں تھے(۱)
گرچہ جرم عشق غیروں پر بھی ثابت تھا و لے ۔ قتل کرنا تھا ہمیں ہم ہی گنہگاروں میں تھے
اک رہا مژگاں کی صف میں ایک کے ٹکڑے ہوئے
دل جگر جو میر دونوں اپنے غم خواروں میں تھے

(۶۰۸)

جس جگہ دور جام ہوتا ہے ۔ واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم تو اک حرف کے نہیں ممنون ۔ کیسا خط و پیام ہوتا ہے
تیغ ناکاموں پہ نہ ہر دم کھینچ ۔ اک کرشمے میں کام ہوتا ہے
پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش ۔ روز ان کا بھی شام ہوتا ہے
زخم بن غم بن اور غصہ بن ۔ اپنا کھانا حرام ہوتا ہے
شیخ کی سی ہی شکل ہے شیطان ۔ جس پہ شب احتلام ہوتا ہے
قتل کو میں کہا تو اٹھ بولا ۔ آج کل صبح و شام ہوتا ہے(۲)
آخر آؤں گا نعش پہ اب آ ۔ کہ یہ عاشق تمام ہوتا ہے(۳)
میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

(۶۰۹)

بیتابیوں میں تنگ ہم آئے ہیں جان سے ۔ وقت شکیب خوش کہ گیا درمیان سے
داغ فراق و حسرت وصل آرزوے دید ۔ کیا کیا لیے گئے ترے عاشق جہان سے(۴)

---
(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد

ہم خامشوں کا ذکر تھا شب اس کی بزم میں   نکلا نہ حرف خیر کسو کی زبان سے
آب خنجر سے بھی نہ گئی سوزش جگر   کیا جانیے یہ آگ ہے کس دودمان سے
جز عشق جنگ دہر سے مت پڑھ کہ خوش ہیں ہم   اس قصے کی کتاب میں اس داستان سے
آنے کا اس چمن میں سبب بےکلی ہوئی   جوں برق ہم تڑپ کے گرے آشیان سے
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ عاشق ہے تو کہیں   القصہ خوش گذرتی ہے اس بدگمان سے
کہنے کی میرے تجھ سے نہ چاہے گا کوئی داد   میں کہہ مروں گا اپنے ہر اک مہربان سے[1]
داغوں سے ہے چمن جگر میر دہر میں
ان نے بھی گل چنے بہت اس گلستان سے

(۶۱۰)

چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے   اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے
حسرت لطف عزیزان چمن جی میں رہی   سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ ہم نے
جی میں تھا عرش پہ جا باندھیے تکیہ لیکن   بسترا خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
بعد یک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا   ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے
یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم   چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے
بارے کل باغ میں جا مرغ چمن سے مل کر   خوبی گل کا مزہ خوب اڑایا ہم نے
تازگی داغ کی ہر شام کو بے پیچ نہیں   آہ کیا جانے دیا کس کا بجھایا ہم نے
دشت و کہسار میں سر مار کے چندے تجھ بن   قیس و فرہاد کو پھر یاد دلایا ہم نے
بےکلی سے دل بیتاب کی مر گذرے تھے   سو تہ خاک بھی آرام نہ پایا ہم نے
یہ ستم تازہ ہوا اور کہ پائیز میں میر
دل خس و خار سے ناچار لگایا ہم نے

(۶۱۱)

ظالم کہیں تو مل کبھو دارو پیے ہوئے   پھرتے ہیں ہم بھی ہاتھ میں سر کو لیے ہوئے
آؤگے ہوش میں تو ٹک اک سدھ بھی لیجیو   اب تو نشے میں جاتے ہو غفلت کیے ہوئے
جی ڈوبتا ہے اس گہر تر کی یاد میں   پایان کار عشق میں ہم مرجیے ہوئے
سی چاک دل کہ چشم سے تا صبح لہو تھے   ہوتا ہے کیا ہمارے گریباں سیے ہوئے
کافر ہوئے بتوں کی محبت میں میر جی
مسجد میں آج آئے تھے قشقہ دیے ہوئے

(۱) نسخۂ محمودآباد

(۶۱۲)

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے

جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے رہیے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے

جہاں کی مسلخ تمام حسرت نہیں ہے تس پر نگہ کی فرصت
نظر پڑے گی بسان بسمل کبھو جو مژگاں کو وا کروگے

اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہوکر اڑا کروگے

بلا ہے ایسا طپیدن دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دست بر دل رہا کروگے

عدم میں ہم کو یہ غم رہے گا کہ اوروں پر اب ستم رہے گا
تمھیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پر آخر جفا کروگے

اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے

حرم کو محراب تیغ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بسان بسمل مری طرف سے ادا کروگے

لُم محبت سے میر صاحب بتنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کروگے

(۶۱۳)

بو کہ ہو سوے باغ نکلے ہے
باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

ہے جو اندھیر شہر میں خورشید
دن کو لے کر چراغ نکلے ہے

چوبکاری ہی سے رہے گا شیخ
اب تو لے کر چماغ نکلے ہے

دے ہے جنبش جو واں کی خاک کو باؤ
جگر داغ داغ نکلے ہے

ہر سحر حادثہ مری خاطر
بھر کے خوں کا ایاغ نکلے ہے

اس گلی کی زمین تفتہ سے
دل جلوں کا سراغ نکلے ہے

شاید اس زلف سے لگی ہے میر
باؤ میں اک دماغ نکلے ہے

(۶۱۴)

ہے خاک جیسے ریگ رواں سب نہ آب ہے
دریاے موج خیز جہاں کا سراب ہے

روز شمار میں بھی محاسب ہے گر کوئی
تو بےحساب کچھ نہ کر آخر حساب ہے

اس شہر دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے

منھ پر لیے نقاب تو اے ماہ کیا چھپے
آشوب شہر حسن ترا آفتاب ہے

کس رشک گل کی باغ میں زلف سیہ کھلی
موج ہوا میں آج نپٹ پیچ و تاب ہے

کیا دل مجھے بہشت میں لے جائے گا بھلا
جس کے سبب یہ جان پہ میری عذاب ہے

سن کان کھول کر کہ تنک جلد آنکھ کھول غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
رہ آشنائے لطف حقیقت کے بحر کا ہے رشک زلف وچشم جو موج حباب ہے
آتش ہے سوز سینہ ہمارا مگر کہ میرؔ
تاے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

(۶۱۵)

کیا کیا بیٹھے بگڑ بگڑ تم پر ہم تم سے بنائے گئے
چپکے باتیں اٹھائے گئے سر گاڑے ووہیں آئے گئے
اٹھے نقاب جہاں سے یارب جس سے تکلف بیچ میں ہے
جب نکلے اس راہ سے ہوکر منہ تم ہم سے چھپائے گئے
کب کب تم نے سچ نہیں مانیں جھوٹی باتیں غیروں کی
تم ہم کو یوں ہی جلائے گئے وے تم کو ووہیں لگائے گئے
صبح وہ آفت اٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سرجوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے
اللہ رے یہ دیدہ درائی ہوں نہ مکدر کیونکے ہم
آنکھیں ہم سے ملائے گئے پھر خاک میں ہم کو ملائے گئے
آگ میں غم کی ہو کے گداز اس جسم ہوا سب پانی سا
یعنی بن ان شعلہ رخوں کے خوب ہی ہم بھی تائے گئے
ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بھی حد ایک آخر ہوتی ہے
کشتے اس کی تیغ ستم کے گورتیں کب لائے گئے
خضر جو مل جاتا ہے گاہے آپ کو بھولا خوب نہیں
کھوئے گئے اس راہ کے ورنہ کاہے کو پھر پائے گئے
مرنے سے کیا میرؔ جی صاحب ہم کو ہوش تھے کیا کریے
جی سے ہاتھ اٹھائے گئے پر اس سے دل نہ اٹھائے گئے

(۶۱۶)

ادھر سے ابر اٹھ کر جو گیا ہے ہماری خاک پر بھی رو گیا ہے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے
مقامر خانۂ آفاق وہ ہے کہ جو آیا ہے یاں کچھ کھو گیا ہے

کچھ آؤ زلف کے کوچے میں درپیش ‏ مزاج اپنا ادھر اب تو گیا ہے
سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

(۶۱۷)

عمر بھر ہم رہے شرابی سے ‏ دل پرخوں کی اک گلابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آہ ‏ رات گذرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ‏ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا ‏ داغ ہوں اس کی بےحجابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے

(۶۱۸)

دن دوری چمن میں جو ہم شام کریں گے ‏ تا صبح دوصد نالہ سر انجام کریں گے
ہوگا ستم و جور سے تیرے ہی کنایہ ‏ دوشخص جہاں شکوۂ ایام کریں گے
آمیزش بےجا ہے تجھے جن سے ہمیشہ ‏ وے لوگ ہی آخر تجھے بدنام کریں گے
نالوں سے سرے رات کے غافل نہ رہا کر ‏ اک روز یہی دل میں ترے کام کریں گے
گر دل ہے یہی مضطرب الحال تو اے میر
ہم زیر زمیں بھی بہت آرام کریں گے

(۶۱۹)[1]

رشک گلشن اگر تو ناز کرے ‏ رنگ رو کو چمن نیاز کرے
تیری ابرو جدھر کو مائل ہے
ایک عالم ادھر نماز کرے

(۶۲۰)[2]

نہ رہ دنیا میں دلجمعی سے اے انساں جو دانا ہے ‏ سفر کا بھی رہے خطرہ کہ اس منزل سے جانا ہے
چلے آتے تھے جو آنا فانا دیکھ حسرت کو
وے آنسو بھی لگے آنکھیں چرانے کیا زمانہ ہے

---

(۱)، (۲) نسخۂ محمودآباد

(۶۲۱)[۱]

صبح سے بن علاج تو خوش ہے تیرا بیمار آج تو خوش ہے
میر پھر کہیو سرگذشت اپنی
بارے یہ کہہ مزاج تو خوش ہے

(۶۲۲)[۲]

مرے درد دل کا تو یہ جوش ہے کہ عالم جوان سیہ پوش ہے
کیا روبرو اس کے کیوں آئینہ کہ بے ہوشی اس کا دم اور ہوش ہے
کبھو تیر سا اس کماں میں بھی آ کہ خمیازہ کش میری آغوش ہے
بلاؤں میں اس دور بد کی تو ہمیں
جہاں میں خوشا حال مے نوش ہے

(۶۲۳)[۳]

سوائے سنگ دلی اور کچھ ہنر بھی ہے بتاں دلوں میں تمھارے خدا کا ڈر بھی ہے
ترے فراق میں کچھ کھا کے سو رہا ہوں میں
تو کس خیال میں ہے تجھ کو کچھ خبر بھی ہے

(۶۲۴)[۴]

سن کے صفت ہم سے خرابات کی عقل گئی زاہد بد ذات کی
جی میں ہمارے بھی تھا پیویں شراب پیر مغاں تو نے کرامات کی
کوئی رمق جان تھی تن میں مرے سو بھی ترے غم کی مدارات کی
یاد میں تجھ زلف کی گریہ سے شوخ
روز مرا رات ہے برسات کی

(۶۲۵)[۵]

ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے معشوق بھی ہمارا محبوب آدمی ہے
انسان ہو جو کچھ ہے ادراک سرلولاک
ناداں زمیں زماں سے مطلوب آدمی ہے

(۱) تا (۵) نسخۂ محمود آباد

(٦٢٦)[۱]

ہم جنوں میں جو خاک اڑاویں گے　　دشت میں آندھیاں چلا دیں گے

میرے دامن کے تار خاروں کو
دشت میں پگڑیاں بندھاویں گے

(٦٢٧)[۲]

وصل کی جب سے گئی ہے چھوڑ دلداری مجھے　　ہجر کی کرنی پڑی ہے نازبرداری مجھے

میں گریباں پھاڑتا ہوں وہ سلا دیتا ہے میر
خوش نہیں آتی نصیحت گر کی غم خواری مجھے

(٦٢٨)[۳]

جوں جوں ساقی تو جام بھرتا ہے　　میری توبہ کا جان ڈرتا ہے

میر کر عاشقوں کی جانبازی　　کوئی سکتا ہے کوئی مرتا ہے

میرؔ ازبسکہ ناتواں ہوں میں
جی مرا سائیں سائیں کرتا ہے

(٦٢٩)[۴]

کیوں گردن ہلال ابھی سے ڈھلک چلی　　ابرو تو یک طرف پلک اس کی نہیں ہلی

ہمت دے بادتند کو ایسی کہ بعد مرگ
مشت غبار میرؔ نجف پہنچے یاعلی

(٦٣٠)[۵]

اڑا برگ گل کو دکھاتی ہے وادی　　کہو کس طرح سیکھیں صبا چورہادی

میں لبریز تجھ نام سے جوں نگیں تھا　　رہی لوح تربت مری کیوں کے سادی

ترے غم میں ہے زیست اور موت یکساں　　نہ مرنے کا ماتم نہ جینے کی شادی

میں ہوں بےنوا میرؔ ایسا کہ شب کو
فغاں سے کہوں تک کھڑے رہیو ہادی

(۱) تا (۵) نسخۂ محمودآباد

(۶۳۱)[۱]

سبھوں کے خط لیے پوشیدہ قاصد آن جاتا ہے　　چلا ہے یار کے کوچے کو اور مجھ سے چھپاتا ہے
تو خاطر جمع رکھ دامن کہ اب شہر گریباں سے　　تری خاطر ہزاروں چاک تحفہ ہاتھ لاتا ہے
بتاں کے ہجر میں روتا ہوں شب کو اور سحر ہر دم
ہنسے ہے دور سے مجھ پر خدا یہ دن دکھاتا ہے

(۶۳۲)[۲]

شوخ عاشق قد کو تیرے سرو یا طوبیٰ کہے　　کچھ ٹھہرتی ہی نہیں کوئی کہے تو کیا کہے
کیا تفاوت ہے بڑے چھوٹے میں گر سمجھے کوئی
کیا عجب ہے مشک کو سقا اگر دریا کہے

(۶۳۳)[۳]

مرے رنگ شکستہ پہ ہنسے ہیں مرداں سارے　　ہوا ہوں زعفراں کا کھیت تیرے عشق میں پیارے
عرق گرتا ہے تیری زلف سے اور دل سہمتا ہے
کہ شب تاریک ہے اور ٹوٹتے ہیں دم بدم تارے

(۶۳۴)[۴]

راہ آنسو کی کب تلک تکیے　　خون دل ہی کا اب مزہ چکھیے
آتش غم میں جل رہے ہیں ہما　　چشم مجھ استخواں پہ مت رکھیے
سو گیا وہ سمجھ کے افسانہ　　درد دل اب کہاں تلک بکیے
بید سا کانپتا تھا مرتے وقت
میرؔ کو رکھیو مجنوں کے تکیے

(۶۳۵)[۵]

چلی جاتی ہی نکلی جان ہے تدبیر کیا کریے　　مداوا سے مرض گذرا کہو اب میرؔ کیا کریے
نہ رکھا کرکے زنجیری پریشاں دل ہمارے کو　　ہوئی یہ اب تو تیری زلف سے تقصیر کیا کریے
کریں استادگی آیا تھا جی پہ قتل ہونے میں　　یہ اپنا کام ہے قاتل یہ اس کو دیر کیا کریے
نہیں آتا ہے کوئی ڈھب ہمیں آسودہ ہونے میں
بھلا تو ہی بتا اے خاطر دلگیر کیا کریے

---
(۱) تا (۵) نسخۂ محمود آباد

(۶۳۶)(۱)

اس ستم دیدہ کی صحبت سے جگر لوہو ہے　　آب ہو جائے کہ یہ دل خلۂ پہلو ہے

خون ہوتا نظر آتا ہے کسی کا مجھ کو
ہر نگہ ساتھ ترے مصلحت ابرو ہے

(۶۳۷)(۲)

عمر گذری کہ ترے کوچے کے آنے سے گئے
دور سے ایک نظر دیکھ کے جانے سے گئے

(۶۳۸)(۳)

حیران اس بھبھوکے پہ سب دوش ہوگئے
شمع و چراغ بزم میں خاموش ہوگئے

(۶۳۹)(۴)

جو سیل سرشک کا چلے ہے
دریا کے بھی ہونٹ جا سلے ہے

(۶۴۰)(۵)

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

(۶۴۱)(۶)

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے
پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

(۶۴۲)(۷)

وعدے ہر روز رہے اور تم آتے ہی رہے
ہم کو دیکھو کہ لگے چلنے تو جاتے ہی رہے

---

(۱) تا (۴) نسخۂ محمود آباد
(۵) تا (۷) نسخۂ نول کشور

(۶۴۳)[۱]

مہیا جس کنے اسباب ملکی اور مالی تھے
وہ اسکندر گیا یاں سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے

کلاہ کج سے ہر غنچے کی پیدا ہے گلستاں میں
کہ کیا کیا اس چمن میں دلبروں کے لا ابالی تھے

(۶۴۴)[۲]

مدت ہوئی کہ تاب و تواں جی چھپا گئے
بیتاب کر کے خاک میں ہم کو ملا گئے

وے دن گئے کہ آٹھ پہر اس کے پاس تھے
اب آگئے تو دور سے کچھ غم سنا گئے

(۶۴۵)[۳]

کیا کہوں کچھ بھی اس سے چھوٹا ہے
ملک دل ان نے صاف لوٹا ہے

خاک سے میر کیوں نہ یکساں ہوں
مجھ پہ تو آسمان ٹوٹا ہے

(۶۴۶)[۴]

ہم رو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے
جی میں ہے کبھو حال غریبانہ کہیں گے

موقوف غم میر کی شب ہوچکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

(۶۴۷)[۵]

یک دم میں خوں تو سوکھا مژگاں پہ ہوکے جاری
کر اے طپش جگر کی اب تو ہی آبیاری

(۶۴۸)[۶]

نسبت مہ ہے دور اس گل سے
وہ شگفتہ ہے یہ گرفتہ ہے

(۱) تا (۶) نسخۂ نول کشور

(٦۴٩)(۱)

کس رو سے اس کے ہوگا تو نقطے سے مقابل
اے آفتاب تیرا منہ تو طباق سا ہے

(٦۵٠)(۲)

مصرع زلف کا نہ پایا پیچ
شاعروں نے بھی فکر کر دیکھے

(٦۵۱)(۳)

کوچۂ یار سے نہ جاویں گے
کیسے ہی ہوں گے ہم گئے گذرے

(٦۵۲)(۴)

پیر کنعاں سے گیا کب دردِ عشق
گو شل ہو آنکھ پھوٹی پیر گئی

(٦۵۳)(۵)

وابستہ دلبروں کے خاموش ہیں ہمیشہ
ان ساحروں نے ایسے منہ عاشقوں کے باندھے

(٦۵۴)(٦)

آرسی آرسی وہ ہے وہ ہے
یہ نہ منہ دیکھے کی سی میں نے کہی

(٦۵۵)(٧)

غم میں دل صبر و ہوش اے پیارے
ہاتھ کانوں پہ رکھ گئے سارے

---

(۱) تا (۷) نسخۂ نول کشور

(۶۵۶)[۱]

ان نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینے کے توتے سے

(۶۵۷)[۲]

دیکھتا ہوں تو کام میرا میرؔ
اول عشق ہی میں آخر ہے

(۶۵۸)[۳]

چشم ہر گل پہ اس کی جا دیکھی
اسی کی باغ میں ہوا دیکھی

(۶۵۹)[۴]

تری ہم چشم نرگس کیا صنم ہے
لکھا ہے گر کہیں سہوالقلم ہے

(۶۶۰)[۵]

نقد دل چھوڑتے نہیں خوباں
اس پہ گویا کہ قرض کھایا ہے ۳۶۶۰

(۶۶۱)[۶]

مایوس وصل اس کا چتون میں مت کہو تم
جو ہو شمار دم میں اس کی امید کیا ہے

(۶۶۲)[۷]

خضر رہ عشق میں نہ ڈھونڈ کہ یاں
راہ کی بات کھوئے دیتی ہے

(۶۶۳)[۸]

غالب ہے کوئی دن کو ڈھونڈو تو پھر نہ پاؤ
دل رفتہ رفتہ غم میں آدھا نہیں رہا ہے

(۱) تا (۸) نسخۂ نول کشور

دیوان دوم

دیوان دوم

ردیف الف

(۶۶۴)

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اس کے لیے کائنات کا[1]

بکھری ہے زلف اس رخ عالم فروز پر
ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

در پردہ وہ ہی معنی مقوم نہ ہوں اگر
صورت نہ پکڑے کام فلک کے ثبات کا

ہیں مستحیل خاک سے اجزاے نوخطاں
کیا سہل ہے زمیں سے نکلنا نبات کا

مستہلک اس کے عشق کے جانیں ہیں قدر مرگ
عیسیٰ و خضر کو ہے مزہ کب وفات کا

اشجار ہوویں خامہ و آب سیہ بحار
ق
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اس کی صفات کا

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہے دید چشم دل کے کھلے عین ذات کا

ہر صفحے میں ہے محو کلام اپنا دس جگہ
مصحف کو کھول دیکھ ٹک انداز بات کا

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہے گفتگو
مذکور ذکر یاں نہیں صوم و صلوٰت کا

کیا میرؔ تجھ کو نامہ سیاہی کا فکر ہے
ختم رسل سا شخص ہے ضامن نجات کا

(۶۶۵)

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسن قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعت رسولؐ کا

حق کی طلب ہے کچھ تو محمدؐ پرست ہو
ایسا وسیلہ ہے بھی خدا کے حصول کا

مطلوب ہے زمان و مکان و جہان سے
محبوب ہے ملک کا فلک کا عقول کا

احمدؐ کو ہم نے جان رکھا ہے وہی احد
مذہب کچھ اور ہوگا کسی بوالفضول کا

جن مردماں کو آنکھیں دیاں ہیں خدا نے دے
سرمہ کریں ہیں رہ کی تری خاک دھول کا

مقصود ہے علیؑ کا ولی کا سبھی کا تو
ہے قصد سب کو تیری رضا کے حصول کا

تھی گفتگوے باغ فدک جز فساد کی
ق
جانے ہے جس کو علم ہے دیں کے اصول کا

دعویٰ جو حق شناسی کا رکھیے سو اس قدر
پھر جان بوجھ کریے تلف حق بتولؑ کا

پرواے حشر کیا ہے تجھے میرؔ شاد رہ
ہے عذر خواہ جرم جو وہ تجھ ملول کا

---

(۱) مطلع کے ساتھ اگلے دو شعر مربوط ہیں۔ مصحح

(٦٦٦)

جو معتقد نہیں ہے علیؑ کے کمال کا ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا
عزت علیؑ کی قدر علیؑ کی بہت ہے دور مورد ہے ذوالجلال کے عز و جلال کا
پایا علیؑ کو جا کے محمدؐ نے اس جگہ جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا
رکھنا قدم پہ اس کے قدم کب ملک سے ہو مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا
شخصیت ایسی کس کی تھی ختم رسل کے بعد تھا مشورت شریک حق لایزال کا
توڑا بتوں کو دوش نبیؐ پر قدم کو رکھ چھوڑا نہ نام کعبہ میں کفر و ضلال کا
راہ خدا میں ان نے دیا اپنے بھی تئیں یہ جود منھ تو دیکھو کسو آشنال کا
نسبت نہ بندگی کی ہوئی جس کی واں درست رونا مجھے ہے حشر میں اس کی ہی چال کا
فکر نجات میرؔ کو کیا مدح خواں ہے وہ
اولاد کا علیؑ کی محمدؐ کی آل کا

(٦٦٧)

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزہ جانا
ہم جاہ و حشم یاں کا کیا کہیے کہ کیا جانا خاتم کو سلیماں کی انگشتر پا جانا
یہ بھی ہے ادا کوئی خورشید نمط پیارے منھ صبح دکھا جانا پھر شام چھپا جانا
کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی جانے ہے خدا اس کو میں تجھ کو خدا جانا
تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا
گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کے اس دشت میں سر گاڑے جوں سیل چلا جا تا
اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے اچھا نہیں چہرے پر لوہو کا بہا جانا
یہ نقش دلوں پر سے جانے کا نہیں اس کو عاشق کے حقوق آکر ناحق بھی مٹا جانا
ڈھب دیکھنے کا ایدھر ایسا ہی تمھارا تھا جاتے تو ہو پر ہم سے ٹک آنکھ ملا جانا
اس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر واں سے اک زخم زباں تازہ ہر روز اٹھا جانا
اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جاویں اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا
کیا پانی کے مول آکر مالک نے گہر بیچا ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا
ہے میری تری نسبت روح اور جسد کی سی کب آپ سے میں تجھ کو اے جان جدا جانا
جاتی ہے گذر جی پر اس وقت قیامت سی یاد آوے ہے جب تیرا یک بارگی آ جانا
برسوں سے مرے اس کے رہتی ہے یہی صحبت تیغ اس کو اٹھانا تو سر مجھ کو جھکا جانا
کب میرؔ بسر آئے تم ویسے فریبی سے
دل کو تو لگا بیٹھے لیکن نہ لگا جانا

(۶۶۸)

پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا — دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا
کاٹے ہیں خاک اڑا کر جوں گردباد برسوں — گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اس بن خراب کیا کیا
کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش — اس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا
انواع جرم میرے پھر بےشمار و بےحد — روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا
اک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھو — جل جل کے ہم ہوئے ہیں اس بن کباب کیا کیا
افراط شوق میں تو رویت رہی نہ مطلق — کہتے ہیں میرے منھ پر اب شیخ و شاب کیا کیا
پھر پھر گیا ہے آکر منھ تک جگر ہمارے — گذرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا
آشفتہ اس کے گیسو جب سے ہوئے ہیں منھ پر — تب سے ہمارے دل کو ہے پیچ و تاب کیا کیا

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میرؔ جی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

(۶۶۹)

دامن وسیع تھا تو کاہے کو چشم تر سا — رحمت خدا کی تجھ کو اے ابر زور برسا
شاید کباب کر کر کھایا کبوتر ان نے — نامہ اڑا پھرے ہے اس کی گلی میں پر سا
وحشی مزاج ازبس مانوس بادیہ ہیں — ان کے جنوں میں جنگل اپنا ہوا ہے گھر سا
جس ہاتھ میں رہا کی اس کی کمر ہمیشہ — اس ہاتھ مارنے کا سر پر بندھا ہے کر سا
سب پیچ کی یہ باتیں ہیں شاعروں کی ورنہ — باریک اور نازک مو کب ہے اس کمر سا
طرز نگاہ اس کی دل لے گئی سبھوں کے — کیا مومن و برہمن کیا گبر اور ترسا
تم واقف طریق بےطاقتی نہیں ہو — یاں راہ دو قدم ہے اب دور کا سفر سا
کچھ بھی معاش ہے یہ کی ان نے ایک چشمک — جب مدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا
ٹک ترک عشق کریے لاغر بہت ہوئے ہم — آدھا نہیں رہا ہے اب جسم رنج فرسا
واعظ کو یہ جلن ہے شاید کہ فربہی سے — رہتا ہے حوض ہی میں اکثر پڑا مگر سا

انداز سے ہے پیدا سب کچھ خبر ہے اس کو
گو میرؔ بے سر و پا ظاہر ہے بے خبر سا

(۶۷۰)

تیغ ستم سے اس کی مرا سر جدا ہوا — شکر خدا کہ حق محبت ادا ہوا
قاصد کو دے کے خط نہیں کچھ بھیجنا ضرور — جاتا ہے اب تو جی ہی ہمارا چلا ہوا

وہ تو نہیں کہ اشک تھمے ہی نہ آنکھ سے / نکلے ہے کوئی لخت دل اب سو جلا ہوا
حیران رنگ باغ جہاں تھا بہت رکا / تصویر کی کلی کی طرح دل نہ وا ہوا
عالم کی بے فضائی سے تنگ آگئے تھے ہم / جاکہ سے دل گیا جو ہمارا بجا ہوا
در پے ہمارے جی کے ہوا غیر کے لیے / انجام کار مدعی کا مدعا ہوا
اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے / جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا
بدتر ہے زیست مرگ سے ہجران یار میں / بیمار دل بھلا نہ ہوا تو بھلا ہوا

کہتا تھا میر حال تو جب تک تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

(٦٧١)

رفتار و طور و طرز و روش کا یہ ڈھب ہے کیا / پہلے سلوک ایسے ہی تیرے تھے اب ہے کیا
ہم دل زدہ نہ رکھتے تھے تم سے یہ چشم داشت / کرتے ہو قہر لطف کی جاکہ غضب ہے کیا
عزت بھی بعد ذلت بسیار چھیڑ ہے / مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا
آئے ہم آپ میں تو نہ پہچانے پھر گئے / اس راہ صعب عشق میں یارو تعب ہے کیا
حیراں ہیں اس دہن کے عزیزان خوردہ بیں / یہ بھی مقام ہائے تامل طلب ہے کیا
آنکھیں جو ہوویں تیری تو تو عین کر رکھے / عالم تمام گر وہ نہیں تو یہ سب ہے کیا
اس آفتاب بن نہیں کچھ سوجھتا ہمیں / گر یہ ہی اپنے دن ہیں تو تاریک شب ہے کیا
تم نے ہمیشہ جور و ستم بے سبب کیے / اپنا ہی ظرف تھا جو نہ پوچھا سبب ہے کیا
کیونکر تمھاری بات کرے کوئی اعتبار / ظاہر میں کیا کہو ہو سخن زیر لب ہے کیا

اس مہ بغیر میر کا مرنا عجب ہوا
ہر چند مرگ عاشق مسکیں عجب ہے کیا

(٦٧٢)

جھمکے دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا / آئی قیامت ان نے جو پردہ اٹھا دیا
اس فتنے کو جگا کے پشیماں ہوئی نسیم / کیا کیا عزیز لوگوں کو ان نے سلا دیا
اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر / گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا
جانی نہ قدر اس گہر شب چراغ کی / دل ریزۂ خزف کی طرح میں اٹھا دیا
تقصیر جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی / جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکا دیا
گرمی چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں / اب دل فسردگی سے ہوں جیسے بجھا دیا

وہ آگ ہو رہا ہے خدا جانے غیر نے — میری طرف سے اس کے تئیں کیا لگا دیا
اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش — سو تونے مار مار کے آکر بچھا دیا
اب گھٹتے گھٹتے جان میں طاقت نہیں رہی — ٹک لگ چلی صبا کہ دیا سا بڑھا دیا
تنگی لگا ہے کرنے دم اپنا بھی ہر گھڑی — کڑھنے نے دل کے جی کو ہمارے کھپا دیا
کی چشم تونے باز کہ کھولا در ستم — کس مدعی خلق نے تجھ کو جگا دیا

کیا کیا زیان میر نے کھینچے ہیں عشق میں
دل ہاتھ سے دیا ہے جدا سر جدا دیا

(۶۷۳)

بہتوں کو آگے تھا یہی آزار عشق کا — جیتا رہا ہے کوئی بھی بیمار عشق کا
بے پردگی بھی چاہ کا ہوتا ہے لازمہ — کھلتا ہی ہے نہان یہ اسرار عشق کا
زندانی سینکڑوں مرے آگے رہا ہوئے — چھوٹا نہ میں ہی تھا جو گنہگار عشق کا
خواہان مرگ میں ہی ہوا ہوں مگر نیا — جی بیچے ہی پھرے ہے خریدار عشق کا
منصور نے جو سر کو کٹایا تو کیا ہوا — ہر سر کہیں ہوا ہے سزاوار عشق کا
اتنا وہی سنا ہمہ حسرت جہان سے — ہوتا ہے جس کسو سے بہت پیار عشق کا
بعد میرے آج تک سر نہیں بکا — اک عمر سے کساد ہے بازار عشق کا
جاوے دل کہیں تو اسے جی میں اپنے رکھ — رکھتا نہیں شگون کچھ اظہار عشق کا
چھوٹا جو مر کے قید عبارات میں پھنسا — القصہ کیا رہا ہو گرفتار عشق کا
مشکل ہے عمر کاٹنی تلوار کے تلے — ق — سر میں خیال گو کہ رکھیں یار عشق کا
واں رستموں کے دعوے کو دیکھا ہے ہوتے قطع — پورا جہاں لگا ہے کوئی وار عشق کا

کھوئے رہا نہ جان کو ناآزمودہ کار
ہوتا نہ میر کاش طلبگار عشق کا

(۶۷۴)

ستم سے گو یہ ترے کشتۂ وفا نہ رہا — رہے جہان میں تو دیر میں رہا نہ رہا
کب اس کا نام لیے غش نہ آگیا مجھ کو — دل ستم زدہ کس وقت اس میں جا نہ رہا
ملانا آنکھ کا ہر دم فریب تھا دیکھا — پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا
موئے تو ہم پہ دل پُر کو خوب خالی کر — ہزار شکر کسو سے ہمیں گلہ نہ رہا
ادھر کھلی مری چھاتی ادھر نمک چھڑکا — جراحت اس کو دکھانے کا اب مزہ نہ رہا

ہوا ہوں تنگ بہت کوئی دن میں سن لیجو
کہ جی سے ہاتھ اٹھاکر وہ اٹھ گیا نہ رہا

ستم کا اس کے بہت میں نزار ہوں ممنون ق
جگر تمام ہوا خون و دل بجا نہ رہا

اگرچہ رہ گئے تھے استخوان و پوست ولے
لگائی ایسی کہ تسمہ بھی پھر لگا نہ رہا

حمیت اس کے تئیں کہتے ہیں جو میر میں تھی
گیا جہاں سے پہ تیری گلی میں آ نہ رہا

(۶۷۵)

کرتے ہی نہیں ترک بتاں طور جفا کا
شاید ہمیں دکھلاویں گے دیدار خدا کا

ہے ابر کی چادر شفقی جوش سے گل کے
میخانے کے ہاں دیکھیے یہ رنگ ہوا کا

بہتیری گرو جنس کلالوں کے پڑی ہے
کیا ذکر ہے واعظ کے مصلی و ردا کا

مرجائے گا باتوں میں کوئی غمزدہ یوں ہی
ہر لحظہ نہ ہو ممتحن ارباب وفا کا

تدبیر تھی تسکیں کے لیے لوگوں کی ورنہ
معلوم تھا مدت سے ہمیں نفع دوا کا

ہاتھ آئینہ رویوں سے اٹھا بیٹھیں نہ کیونکر
بالعکس اثر پاتے تھے ہم اپنی دعا کا

آنکھ اس کی نہیں آئینے کے سامنے ہوتی
حیرت زدہ ہوں یار کی میں شرم و حیا کا

برسوں سے تو یوں ہے کہ گھٹا جب امنڈ آئی
تب دیدۂ تر سے بھی ہوا ایک جھڑا کا

آنکھ اس سے نہیں اٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اس کی کف پا کا

تلوار کے سائے ہی میں کاٹے ہے تو اے میر
کس دل‌زدہ کو ہوئے ہے یہ ذوق فنا کا

(۶۷۶)

رہتا ہے ہڈیوں سے مری جو ہما لگا
کچھ درد عاشقی کا اسے بھی مزہ لگا

غافل نہ سوز عشق سے رہ پھر کباب ہے
گر لائحہ اس آگ کا تک دل کو جا لگا

دیکھا ہمیں جہاں وہ تہاں آگ ہوگیا
بھڑکا رکھا ہے لوگوں نے اس کو لگا لگا

مہلت تنک بھی ہو تو سخن کچھ اثر کرے
میں اٹھ گیا کہ غیر ترے کانوں آ لگا

اب آب چشم ہی ہے ہمارا محیط خلق
دریا کو ہم نے کب کا کنارے رکھا لگا

ہر چند اس کی تیغ ستم تھی بلند لیک
وہ طور بد ہمیں تو قیامت بھلا لگا

مجلس میں اس کی بار نہ مجھ کو ملی کبھو
دروازے ہی سے گرچہ بہت میں رہا لگا

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی منہ بگڑ گیا
کیا اتنی میری بات کا تم کو برا لگا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہوگئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

(۶۷۷)

خط سے وہ زور صفاے حسن اب کم ہوگیا
چاہ یوسف تھا ذقن سو چاہ رستم ہوگیا

سینہ کوبی سنگ سے دل خون ہونے میں رہی
حق بجانب تھا ہمارے سخت ماتم ہوگیا

ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہوگیا

آنکھ کے لڑتے تری آشوب سا برپا ہوا
زلف کے درہم ہوئے اک جمع برہم ہوگیا

اس لب جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے
آب حیواں یمن طالع سے مرے سم ہوگیا

وقت تب تک تھا تو سجدہ مسجدوں میں کفر تھا
فائدہ اب جب کہ قد محراب سا خم ہوگیا

عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا
وحشت دل بڑھ گئی آرام جاں رم ہوگیا

جی کھنچے جاتے ہیں فرط شوق سے آنکھوں کی اور
جن نے دیکھا ایک دم اس کو سو بے دم ہوگیا

ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلاف چشم داشت
اپنا عزرائیل وہ جان مجسم ہوگیا

کیا کہوں کیا طرحیں بدلیں چاہ نے آخر کو میرؔ
تھا گرہ جو درد چھاتی میں سو اب غم ہوگیا

(۶۷۸)

کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر گرم رہ ہوا
برسوں سے صوفیوں کا مصلّیٰ تو تہ ہوا

معلوم تیرے چہرۂ پرنور کا سا لطف
بالفرض آسماں پہ گیا پھول مہ ہوا

پوچھ اس سے درد ہجر کو جس کا بہ نازکی
جاکہ سے اپنے عضو کوئی بے جگہ ہوا

ہم پلہ اپنا کون ہے اس معرکے کے بیچ
کس کے ترازو یار کا تیر نگہ ہوا

ایسا فقیر ہونا بھلا کیا ضرور تھا
دونوں جہاں میں میرؔ عبث روسیہ ہوا

(۶۷۹)

مذکور میری سوختگی کا جو چل پڑا
مجلس میں سن سپند یکایک اچھل پڑا

پہنچے ہے کوئی اس تن نازک کے لطف کو
گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

میں جو کہا اک آگ سی سلگے ہے دل کے بیچ
کہنے لگا کہ یوں ہی کوئی دن تو جل پڑا

بل کیوں نہ کھایئے کہ لگا رہنے اب تو واں
بالوں میں اور پیچ میں پگڑی کے بل پڑا

تھے اختلال اگرچہ مزاجوں میں کب سے لیک
ہلنے میں اس پلک کے نہایت خلل پڑا

رہتا نہیں ہے آنکھ سے آنسو ترے لیے
دیکھی جو اچھی شے تو یہ لڑکا مچل پڑا

سر اس کے پاؤں سے نہیں اٹھتے ستم ہے میرؔ
گر خوش غلاف نیچہ اس کا اگل پڑا

(۶۸۰)

دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا　　چہرہ تمام زرد زرِ ناب سا ہوا
شاید جگر گداختہ یک لخت ہوگیا　　کچھ آب دیدہ رات سے خوناب سا ہوا
وے دن گئے کہ اشک سے چھڑکاؤ سا کیا　　اب رونے لگ گئے ہیں تو تالاب سا ہوا
اک دن کیا تھا یار نے قد ناز سے بلند　　خجلت سے سرو جوے چمن آب سا ہوا
کیا اور کوئی روئے کہ اب جوشِ اشک سے　　حلقہ ہماری چشم کا گرداب سا ہوا
قصہ تو مختصر تھا ولے طول کو کھنچا　　ایجاز دل کے شوق سے اطناب سا ہوا
عمامہ ہے موذنِ مسجد کہ بارخر　　قد تو ترا خمیدہ ہو محراب سا ہوا
بات اب تو سن کہ جاے سخن حسن میں ہوئی　　خط پشتِ لب کا سبزۂ سیراب سا ہوا
چل باغ میں بھی سوتے سے اٹھ کر کبھو کہ گل　　تک تک کے راہ دیدۂ بےخواب سا ہوا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

(۶۸۱)

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا　　خانہ خراب ہوجیو آئینہ ساز کا
ہوتا ہے کون دست بسر واں غرور سے　　گالی ہے اب جواب سلام نیاز کا
ہم تو سمندِ ناز کے پامال ہوچکے　　اس کو وہی ہے شوق ابھی ترک تاز کا
ہے کیمیاگران محبت میں قدر خاک　　پر وقر کچھ نہیں ہے دلِ بےگداز کا
اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو　　کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا
کوتاہ تھا فسانہ جو مرجاتے ہم شتاب　　جی پر وبال سب ہے یہ عمر دراز کا
مارا نہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو ہزار حیف　　کشتہ ہوں یار میں تو ترے امتیاز کا
ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے　　انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

پھر میرؔ آج مسجد جامع کے تھے امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

(۶۸۲)

غم ابھی کیا محشر مشہور کا　　شور سا ہے تو ولیکن دور کا
حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول　　بات کہتے سر کٹا منصور کا
ہیچ سے کب کا گیا اب ذکر کیا　　اس دل مرحوم کا مغفور کا

طرفہ آتش خیز سنگستاں ہے دل   مقتبس یاں سے ہے شعلہ طور کا
مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز   ق   مت جھکو سر گو کسو مغرور کا
ٹھیکری کو قدر ہے اس کو نہیں   ٹوٹے جب کاسہ سرِ فغفور کا
ہو کھڑا وہ تو پری سی ہے کھڑی   ق   منھ کھلے تو جیسے چہرہ حور کا
دیکھ اسے کیونکر ملک جھپک نہ ہوں   آنکھ کے آگے یہ بکا نور کا

چشم بہنے سے کبھو رہتی نہیں
کچھ علاج اے میر اس ناسور کا

(۶۸۳)

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا   بھروسا کیا ہے عمر بے وفا کا
گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے   کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا
پرستش اب اسی بت کی ہے ہر سو   رہا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
بلا ہیں قادرانداز اس کی آنکھیں   کیا یکہ جنازہ جس کو تاکا
بجا ہے عمر سے اب ایک حسرت   گیا وہ شور سر کا زور پا کا
مداوا خاطروں سے تھا وگرنہ   ق   ہدایت مرتبہ تھا انتہا کا
لگا تھا روگ جب سے یہ تبھی سے   اثر معلوم تھا ہم کو دوا کا
مروت چشم رکھنا سادگی ہے   نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا
کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے   پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا
نہ جا تو دور صوفی خانقہ سے   ہمیں تو پاس ہے ابر و ہوا کا
نہ جانوں میر کیوں ایسا ہے چپکا   ق   نمونہ ہے یہ آشوب و بلا کا

کرو دن ہی سے رخصت ورنہ شب کو
نہ سونے دے گا شور اس بے نوا کا

(۶۸۴)

وہ ترک مست کسو کی خبر نہیں رکھتا   کہ میں شکار زبوں ہوں جگر نہیں رکھتا
بلا سے آنکھ جو پڑتی ہے اس کی دس جاگہ   ہمارا حال تو مدنظر نہیں رکھتا
رہے نہ کیونکے یہ دل باختہ سدا تنہا   کہ کوئی آوے کہاں میں تو گھر نہیں رکھتا
جنھوں کے دم میں ہے تاثیر اور وے ہیں لوگ   ہمارا نالۂ جانکاہ اثر نہیں رکھتا
کہیں ہیں اب کے بہت رنگ اڑ چلا گل کا   ہزار حیف کہ میں بال و پر نہیں رکھتا

تو کوئی زور ہی نسخہ ہے اے مفرح دل　　کہ طبع عشق میں ہرگز ضرر نہیں رکھتا
خدا کی اور سے ہے سب یہ اعتبار ارنہ　　جو خوب دیکھو تو میں کچھ ہنر نہیں رکھتا
غلط ہے دعویٰ عشق اس فضول کا بے ریب　　جو کوئی خشک لب اور چشم تر نہیں رکھتا
جدا جدا پھرے ہے میرؔ سب سے کس خاطر
خیال ملنے کا اس کے اگر نہیں رکھتا

(۶۸۵)

گیا میں جان سے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا　　قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا
پھرا تھا دور اس سے مدتوں میں کوہ و صحرا میں　　بلاکر پاس اپنے مجھ کو بٹھلاتا تو کیا ہوتا
ہوئے آخر کو سارے کام ضائع ناشکیبی سے　　کوئی دن اور تاب ہجر دل لاتا تو کیا ہوتا
دم بسمل ہمارے زیر لب کچھ کچھ کہا سب نے　　جو وہ بے رحم بھی کچھ منھ سے فرماتا تو کیا ہوتا
کہے سے غیر کے وہ توڑ بیٹھا دوہیں یاروں سے　　کیے جاتا اگر ٹک چاہ کا ناتا تو کیا ہوتا
کبھو سرگرم بازی ہمدموں سے یاں بھی آجاتا　　ہمیں یک چند اگر وہ اور بہلاتا تو کیا ہوتا
گئے لے میرؔ کو کل قتل کرنے اس کے در پر سے
جو وہ بھی گھر سے باہر اپنے ٹک آتا تو کیا ہوتا

(۶۸۶)

میں غش کیا جو خط لے ادھر نامہ بر چلا　　یعنی کہ فرط شوق سے جی بھی ادھر چلا
سدھ لے گئی تری بھی کوئی زلف مشک بو　　گیسوے پیچدار جو منھ پر بکھر چلا
لڑکا ہی تھا نہ قاتل ناکردہ خوں ہنوز　　کپڑے گلے کے سارے مرے خوں میں بھر چلا
اے مایۂ حیات گیا جس کنے سے تو　　آفت رسیدہ پھر وہ کوئی دم میں مر چلا
تیاری آج رات کہیں رہنے کی سی ہے　　کس خانماں خراب کے اے مہ تو گھر چلا
دیکھوگے کوئی گوشہ نشیں ہو چکا غریب　　تیرمژہ اس ابرو کماں کا اگر چلا
بے مے رہا بہار میں ساری ہزار حیف　　لطف ہوا سے شیخ بہت بے خبر چلا
ہم سے تکلف اس کا چلا جائے ہے وہی　　کل راہ میں ملا تھا سو منھ ڈھانپ کر چلا
یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخ زرد پر مرے
کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

(۶۸۷)

وہ شوخ ہم کو پاؤں تلے ہے ملا کیا　　اس دل نے کس بلا میں ہمیں مبتلا کیا

چھاتی کبھو نہ ٹھنڈی کی لگ کر گلے سے آہ　　دل اس سے دور سینے میں اکثر جلا کیا
کس وقت شرح حال سے فرصت ہمیں ہوئی　　کس دن نیا نہ قاصد ادھر سے چلا کیا
ہم تو گمان دوستی رکھتے تھے پر یہ دل　　دشمن عجب طرح کا بغل میں پلا کیا

کیا لطف ہے جیے جو برے حال کوئی میر
جینے سے تونے ہاتھ اٹھایا بھلا کیا

(۶۸۸)

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا　　آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا
برقع اٹھاکے دیکھے ہے منھ سے کبھو ادھر　　بارے ہوا ہے ان دنوں رفع حجاب سا
وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھا بھرا بھرا　　اب اس کو دیکھیے تو ہے اک گھر خراب سا
جس روز آگے دیکھا تھا جیسا سو اب نہیں　　دل رہ گیا ہے سینے میں جل کر کباب سا
اس عمر میں یہ ہوش کہ کہنے کو نرم گرم　　بگڑا رہے ہے ساختہ مست شراب سا
ہے یہ فریب شوق کہ جاتے ہیں خط چلے　　واں سے وگرنہ کب کا ہوا ہے جواب سا
کیا سطر موج اشک روانی کے ساتھ ہے　　مشتاق گریہ ابر ہے چشم پرآب سا
دوزخ ہوا ہے ہجر میں اس کے جہاں ہمیں　　سوز دروں سے جان پہ ہے اک عذاب سا
مدت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے　　رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اضطراب سا

مواج آب سا ہے ولیکن اڑے ہے خاک
ہے میر بحر بے تہ ہستی سراب سا

(۶۸۹)

کب لطف زبانی کچھ اس غنچہ دہن کا تھا　　برسوں ملے پر ہم سے صرفہ ہی سخن کا تھا
اسباب مہیا تھے سب مرنے ہی کے لیکن　　اب تک نہ موئے ہم جو اندیشہ کفن کا تھا
بلبل کو موا پایا کل پھولوں کی دوکاں پر　　اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا
بے ڈول قدم تیرا پڑتا تھا لڑکپن میں　　رونا ہمیں اول ہی اس تیرے چلن کا تھا
مرغان قفس سارے تسبیح میں تھے گل کی　　ہر چند کہ ہر اک کا ڈھلکا ہوا منکا تھا
سب سطح ہے پانی کا آئینے کا سا تختہ　　دریا میں کہیں شاید عکس اس کے بدن کا تھا
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے　　معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
بھوؤں تئیں تم جس دن کج نکلے تھے اک بچہ　　اس دن ہی تمھیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا

رہ میر غریبانہ جاتا تھا چلا روتا
ہر گام گلہ لب پر یاران وطن کا تھا

(۶۹۰)

یہ روش ہے دلبروں کی نہ کسو سے ساز کرنا / کوئی خاک سے ہو یکساں وہی ان کو ناز کرنا
کوئی عاشقوں بتاں کی کرے نقل کیا معیشت / انھیں ناز کرتے رہنا انھیں جی نیاز کرنا
رہیں بند میری آنکھیں شب و روز ضعف ہی میں / نہ ہوا مجھے میسر کبھو چشم باز کرنا
یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں / مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا
نہیں کچھ رہا تو لڑکا تجھے پر ضرور ہے اب / ہوس اور عاشقی میں ٹک اک امتیاز کرنا
کوئی عاشقوں کی پھپٹ کھٹوں نے اٹھائی بھی ہے / انھیں بات ہو جو تھوڑی اسے بھی دراز کرنا

یہی میر کھینچے قشقہ در دیر پر تھے ساجد
نہیں اعتماد قابل انھوں کا نماز کرنا

(۶۹۱)

ایک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا / کیا جانیے کہ میر زمانے کو کیا ہوا
دکھلاتے کیا ہو دست حنائی کا مجھ کو رنگ / ہاتھوں سے میں تمھارے بہت ہوں جلا ہوا
سوزش وہی تھی چھاتی میں مرنے تلک مرے / اچھا ہوا نہ داغ جگر کا لگا ہوا
سر ہی چڑھا رہے ہے ہر اک بادہ خوار کے / ہے شیخ شہر یا کوئی ہے جن پڑھا ہوا
ظاہر کو گو درست رکھا مر کے میں ولے / دل کا لگاؤ کوئی رہا ہے چھپا ہوا
ازخویش رفتہ میں ہی نہیں اس کی راہ میں / آتا نہیں ہے پھر کے ادھر کا گیا ہوا
یوں پھر اٹھا نہ جائے گا اے ابر دشت سے / گر کوئی رونے بیٹھ گیا دل بھرا ہوا
لے کر جواب خط کا نہ قاصد پھرا کبھو / کیا جانے سرنوشت میں کیا ہے لکھا ہوا
گو پیس مارے مہندی کے رنگوں فلک ولے / چھوٹے نہ اس سے اس کا لگا یا بندھا ہوا
اٹھتے تعب فراق کے جی سے کہاں تلک / دل جو بجا رہا نہ ہمارا بجا ہوا
دامن سے منھ چھپائے جنوں کب رہا چھپا / سو جا سے سامنے ہے گریباں پھٹا ہوا
دیکھا نہ ایک گل کو بھی چشمک زنی میں ہائے / جب کچھ رہا نہ باغ میں تب میں رہا ہوا
کیا جانیے ملاپ کے کہتے ہیں یہ لوگ / برسوں ہوئے کہ ہم سے تو وہ ہے لڑا ہوا
بحر بلا سے کوئی نکلتا مرا جہاز / بارے خدائے عزّ وجل ناخدا ہوا

اس بحر میں اک اور غزل تو بھی میر کہہ
دریا تھا تو تو تیری روانی کو کیا ہوا

(۶۹۲)

اس کام جان و دل سے جو کوئی جدا ہوا
دیکھا پھر اس کو خاک میں ہم نے ملا ہوا

کر ترک گرچہ بیٹھے ہیں پر ہے وہی تلاش
رہتا نہیں ہے ہاتھ ہمارا اٹھا ہوا

کھینچا بغل میں میں جو اسے مست پا کے رات
کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشہ ہوا

نے صبر ہے نہ ہوش ہے نے عقل ہے نہ دین
آتا ہے اس کے پاس سے عاشق لٹا ہوا

اٹھتا ہے میرے دل سے کبھو جوش سا تو پھر
جاتا ہے دونوں آنکھوں سے دریا بہا ہوا

جوں صید نیم کشتہ تڑپتا ہے ایک سا
کیا جانیے کہ دل کو مرے کیا بلا ہوا

خط آئے پر جو گرم وہ پرکار مل چلا
میں سادگی سے جانا کہ اب آشنا ہوا

ہم تو لگے کنارے ہوئے غیر ہم کنار
ایکوں کی عید ایکوں کے گھر میں دہا ہوا

جوں برق مجھ کو ہنستے نہ دیکھا کسو نے آہ
پایا تو ابر سا کہیں روتا کھڑا ہوا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

پایا مجھے رقیب نے آ اس کی زیر تیغ
دل خواہ بارے مدعی کا مدعا ہوا

بیمار مرگ سا تو نہیں روز اب بتر
دیکھا تھا ہم نے میرؔ کو کچھ تو بھلا ہوا

(۶۹۳)

کل دل آزردہ گلستاں سے گذر ہم نے کیا
گل لگے کہنے کبھو منہ نہ ادھر ہم نے کیا

کر گئی خواب سے بیدار تمھیں صبح کی باؤ
بے دماغ اتنے جو ہو ہم پہ مگر ہم نے کیا

سیدھے تلوار کے منہ پر تری ہم آئے چلے
کیا کریں اس دل خستہ کو سپر ہم نے کیا

نیچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں
کج تری دیکھ کے اے شوخ حذر ہم نے کیا

پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی
کیا کہیں عمر کو اس طرح بسر ہم نے کیا

کھا گیا ناخن سرتیز جگر دل دونوں
رات کی سینہ خراشی میں ہنر ہم نے کیا

کام ان ہونٹوں سے وہ لے جو کوئی ہم سا ہو
دیکھتے دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر ہم نے کیا

جیسے حسرت لیے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

بارے کل ٹھہر گئے ظالم خونخوار سے ہم
منفعل کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

اس رخ و زلف کی تسبیح ہے یاں اکثر میرؔ
ورد اپنا یہی اب شام و سحر ہم نے کیا

(۶۹۴)

اس قدر آنکھیں چھپاتا ہے تو اے مغرور کیا
ٹک نظر ایدھر نہیں کہ اس سے ہے منظور کیا

وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو
لاگ دل کی چاہیے ہے یاں قریب و دور کیا

ہو خرابی اور آبادی کی عاقل کو تمیز
ہم دِوانے ہیں ہمیں ویران کیا معمور کیا

اٹھ نہیں سکتا ترے در سے شکایت کیا مری
حال میں اپنے ہوں عاجز میں مجھے مقدور کیا

سب ہیں یکساں جب فنا یک بارگی طاری ہوئی
ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا سرِ فغفور کیا

لطف کے حرف و سخن پہلے جو تھے بہرِ فریب
مدتیں جاتی ہیں ان باتوں کا اب مذکور کیا

دیکھ بہتی آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ
یہ نہیں اب تک ہوا منھ کا ترے ناسور کیا

میں تو دیکھوں ہوں تمھارے منھ کو تم نے دل لیا
تم مجھے رہتے ہو اکثر مجلسوں میں گھور کیا

ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے
آرسی جا دیکھ گھر برسے ہے منھ پر نور کیا

سنگ بالیں میرؔ کا جو باٹ کا روڑا ہوا
سخت کر جی کو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا

(۶۹۵)

جوں ابرِ قبلہ دل ہے نہایت ہی بھر رہا
رونا مرا سنوگے کہ طوفان کر رہا

شب میکدے سے وارد مسجد ہوا تھا میں
پر شکر ہے کہ صبح تئیں بے خبر رہا

مل جس سے ایک بار نہ پھر تو ہوا دوچار
رک رک کے وہ ستم زدہ ناچار مر رہا

تسکین دل ہو تب کہ کبھو آگیا بھی ہو
برسوں سے اس کا آنا یہی صبح پر رہا

اس زلف و رخ کو بھولے مجھے مدتیں ہوئیں
لیکن مرا نہ گریۂ شام و سحر رہا

رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے
اس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا

اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ پوچھے ہے بار بار
کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منھ ہے اتر رہا

اک دم میں یہ عجب کہ مرے سر پہ پھر گیا
جو آبِ تیغ برسوں تری تا کمر رہا

کاہے کو میں نے میرؔ کو چھیڑا کہ ان نے آج
یہ دردِ دل کہا کہ مجھے دردِ سر رہا

(۶۹۶)

دل دفعتہً جنوں کا مہیا سا ہوگیا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہوگیا

ٹک جوش سا اٹھا تھا مرے دل سے رات کو
دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہوگیا

بے رونقی باغ ہے جنگل سے بھی پرے
گل سوکھ تیرے ہجر میں کانٹا سا ہوگیا

جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا　　اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہوگیا
کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے یوں ہی
مرنا بھی میر جی کا تماشا سا ہوگیا

(۶۹۷)

دل کی واشد کے لیے کل باغ میں میں تک گیا　　سن گلہ بلبل سے گل کا اور بھی جی رک گیا
عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں　　لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا
ہم نہ کہتے تھے کہ غافل خاک ہو پیش از فنا　　دیکھ اب پیری میں قد تیرا کدھر کو جھک گیا
خدمت معقول ہی سب مغبچے کرتے رہے　　شیخ آیا میکدے کی اور جب تب ٹھک گیا
میر اس قاضی کے لونڈے کے لیے آخر موا
سب کو قضیہ اس کے جینے کا تھا بارے چک گیا

(۶۹۸)

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا　　اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا
کیا جانیں ہم اسیر قفس زاد اے نسیم　　گل کیسے باغ کہتے ہیں کس کو بہار کیا
آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید　　پھر اور کوئی اس کا کرے انتظار کیا
سیکھی ہے طرح سینہ فگاری کی سب مری　　لائے تھے ساتھ چاک دل ایسا انار کیا
سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ　　ہم اس کی خاک راہ ہیں ہم سے غبار کیا
نے وہ نگہ چبھی ہے نہ وے پلکیں گڑ گئیں　　کیا جانیے کہ دل کو ہے یہ خار خار کیا
لیتا ہے ابر اب تئیں اس ناچے سے آب　　روئے ہیں ہم بھی برسوں تئیں زار زار کیا
عاشق کے دل سے رکھ نہ تسلی کی چشم داشت　　ہے برق پارہ یہ اسے آوے قرار کیا
صحبت رہی بگڑتی ہی اس کینہ ور سے آہ　　ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہے پیار کیا
مارا ہو ایک دو کو تو ہو مدعی کوئی　　کشتوں کا اس کے روز جزا میں شمار کیا
مدت سے جرگہ جرگہ سرتیر ہیں غزال　　کم ہوگیا ہے یاروں کا ذوق شکار کیا
پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم　　کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا
آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وقر میر
یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

(۶۹۹)

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا　　ہونٹ پر رنگ پان ہے گویا

میرے مردے سے بھی وہ چوکے ہے　　اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
چاہیے جیتے گذرے اس کا نام　　منہ میں جب تک زبان ہے گویا
سربسر کیں ہے لیک وہ پرکار　　دیکھو تو مہربان ہے گویا
حیرت روے گل سے مرغ چمن　　چپ ہے یوں بےزبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کب ہے　　میکدہ اک جہان ہے گویا
جائے ہے شور سے فلک کی طرف　　نالۂ صبح بان ہے گویا
بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند　　یہ زمین آسمان ہے گویا
وہی شور مزاج شیب میں ہے
میر اب تک جوان ہے گویا

(۷۰۰)

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا　　بالیں کی جاے ہر شب یاں سنگ زیر سر تھا
ان ابرو و مژہ سے کب میرے جی میں ڈر تھا　　تیغ و سناں کے منہ پر اکثر مرا جگر تھا
ان خوبصورتوں کا کچھ لطف کم ہے مجھ پر　　یک عمر ورنہ اس جا پریوں ہی کا گذر تھا
تیشے سے کوہکن کے کیا طرفہ کام نکلا　　اپنے تو ناخنوں میں اس طور کا ہنر تھا
عصمت کو اپنی واں تو روتے ملک پھریں ہیں　　لغزش ہوئی جو مجھ سے کیا عیب میں بشر تھا
کل ہم وہ دونوں یکجا ناگاہ ہوگئے تھے　　وہ جیسے برق خاطف میں جیسے ابرتر تھا
ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اس کے　　مرغ چمن اگرچہ یک‌مشت بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہے　　سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا
رشک اس شہید کا ہے خضر و مسیح کو بھی　　جو کشتہ اس کی جانب دوگام پیشتر تھا
ہشیاری اس کی دیکھو کیفی ہو مجھ کو مارا　　تا سن کے سب کہیں یہ وہ مست و بے خبر تھا
صد رنگ ہے خرابی کچھ تو بھی رہ گیا ہے　　کیا نقل کریے یارو دل کوئی گھر سا گھر تھا
تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے　　چاروں طرف سے جنگل جلتا دہر دہر تھا
جب نالہ‌کش ہوا وہ تب مجلسیں رلائیں
تھا میر دل‌شکستہ یا کوئی نوحہ‌گر تھا

(۷۰۱)

تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا　　زیر لب جب کچھ کہا وہ مر گیا
تڑپے زیر تیغ ہم بےڈول آہ　　دامن پاک اس کا خوں میں بھر گیا

خاک ہے پکڑے اگر سونا بھی پھر — ہاتھ سے جس کے وہ سیمیں بر گیا
کیا بندھا ہے اس کے کوچے میں طلسم — پھر نہ آیا جو کوئی اودھر گیا
خانداں اس بن ہوئے کیا کیا خراب — آج تک وہ شوخ کس کے گھر گیا
ابرو و مژگاں ہی میں کاٹی ہے عمر — کیا سنان و تیغ سے میں ڈر گیا

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں
میر تو دانا تھا یہ کیا کر گیا

(۷۰۲)

جی رک گئے اے ہمدم دل خون ہو بھر آیا — اب ضبط کریں کب تک منھ تک تو جگر آیا
تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا — سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نہ نظر آیا
بے سدھ پڑے ہیں سارے سجادوں پہ اسلامی — دارو پیے وہ کافر کاہے کو ادھر آیا
ہر خستہ ترا خواہاں یک زخم دگر کا تھا — کی مشق ستم تونے پر خون نہ کر آیا
گل برگ ہی کچھ تنہا پانی نہیں خجلت سے — جنبش سے ترے لب کی یاقوت بھی تر آیا
بالفعل تو ہے قاصد محو اس خط و گیسو کا — ٹک چیتے تو ہم پوچھیں کیا لے کے خبر آیا
تابوت پہ بھی میرے پتھر پڑے لے جاتے — اس نخل میں ماتم کے کیا خوب ثمر آیا
بے حق بہ طرف اس کے یوں جس کے گیا ہو تو — کج ایسی تری دیکھی ہم کو بھی خطر آیا
کیا کہیے کہ پتھر سے سر مارتے ہم گذرے — یوں اپنا زمانہ تو بن یار بسر آیا
صنعت گریاں ہم نے کیں سینکڑوں یاں لیکن — جس سے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہنر آیا

در ہی کے تئیں تکتے پتھرا گئیں آنکھیں تو
وہ ظالم سنگیں دل کب میر کے گھر آیا

(۷۰۳)

یار ہے میر کا مگر گل سا — کہ سحر نالہ کش ہے بلبل سا
یاں کوئی اپنی جان دو دشوار — واں وہی ہے سو ہے تساہل سا
دود دل کو ہمارے ٹک دیکھو — یہ بھی پر پیچ اب ہے کاکل سا
شوق واں اس کے لمبے بالوں کا — یاں چلا جائے ہے تسلسل سا
کب تھی جرأت رقیب کی اتنی — تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا
اک نگہ ایک چشمک ایک سخن — اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
بارے مستوں نے ہوشیاری کی — دے کے کچھ محتسب کا منھ جھلسا
شرم آتی ہے پہنچتے اودھر — خط ہوا شوق سے ترسل سا

ٹوٹی زنجیر پاے میرؔ مگر
رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

(۷۰۴)

چمن میں جاکے جو میں گرم وصف یار ہوا
گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا

تمھارے ترکش مژگاں کی کیا کروں تعریف
جو تیر اس سے چلا سو جگر کے پار ہوا

ہماری خاک پہ اک بیکسی برستی ہے
ادھر سے ابر جب آیا تب اشکبار ہوا

کریں نہ کیونکے یہ ترکاں بلندپروازی
انھوں کا طائر سدرہ نشیں شکار ہوا

کبھو بھی اس کو نہ دل سے ملتے پایا پھر
فریب تھا وہ کوئی دن جو ہم سے یار ہوا

بہت دنوں سے درونے میں اضطراب سا تھا
جگر تمام ہوا خون تب قرار ہوا

شکیب میرؔ جو کرتا تو وقر رہ جاتا
ادھر کو جاکے عبث یہ حبیب خوار ہوا

(۷۰۵)

ایک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا

اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے
شمع سے جیسے لیں چراغ لگا

خوبی یک پیچہ بند خوباں کی
خوب باندھوں گا گر دماغ لگا

پاؤں دامن میں کھینچ لیں گے ہم
ہاتھ گر گوشۂ فراغ لگا

میرؔ اس بے نشاں کو پایا جان
کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

(۷۰۶)

تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آگیا
ہنس کے اس پرچے کو میرے ہی گلے بندھوا گیا

دست و پا گم کرنے سے میرے کھلے اسرار عشق
دیکھ کر کھویا گیا سا مجھ کو ہر یک پا گیا

داغ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو
عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا

ہم بشر عاجز ثبات پا ہمارا کس قدر
دیکھ کر اس کو ملک سے بھی نہ یاں ٹھہرا گیا

یار کے بالوں کا بندھنا قہر ہے پگڑی کے ساتھ
ایک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا

ہم نہ جانا اختلاط اس طفل بازی کوش کا
گرم بازی آگیا تو ہم کو بھی بہلا گیا

کیا کروں ناچار ہوں مرنے کو اب تیار میں
دل کی روز و شب کی بیتابی سے جی گھبرا گیا

جی کوئی لگتا ہے اس کے اٹھ گئے پر باغ میں
گل نے بہتیرا کہا ہم سے نہ تک ٹھہرا گیا

ہوگئے تحلیل سب اعضا مرے پاکر گداز   رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا
یوں تو کہتا تھا کوئی ویسے کو باندھے ہے گلے
پر وہ پھندنا سا جو آیا میر بھی پھندلا گیا

(۷۰۷)

دل عشق میں خوں دیکھا آنکھوں کو گیا دیکھا   پیغمبر کنعاں نے دیکھا نہ کہ کیا دیکھا
مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی   آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزہ دیکھا
یک بار بھی آنکھ اپنی اس پر نہ پڑی مرتے   سو مرتبہ بالیں سے ہم سر کو اٹھا دیکھا
کاہش کا مری اب یہ کیا تجھ کو تعجب ہے   بیماری دل والا کوئی بھی بھلا دیکھا
آنکھیں گئیں پھر تجھ بن کیا کیا نہ عزیزوں کی   پر تونے مروت سے ٹک ان کو نہ جا دیکھا
جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہر محبت میں   کچھ ساری خدائی سے یہ طور نیا دیکھا
کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اٹھایا ہے
اے میر تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

(۷۰۸)

تاکہ جو وہ صنم ستم ایجاد آگیا   دیکھے سے طور اس کے خدا یاد آگیا
پھوڑا تھا سر تو ہم نے بھی پر اس کو کیا کریں   جو چشم روزگار میں فرہاد آگیا
اپنا بھی قصد تھا سر دیوار باغ کا   توڑا ہی تھا قفس کو پہ صیاد آگیا
جور و ستم اٹھانے ہی اس سے بنیں گے شیخ   مسجد میں گر وہ عاشق بیداد آگیا
دیکھیں گے آدمی کی روش میر ہم تری
گر سامنے سے ٹک وہ پری زاد آگیا

(۷۰۹)

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا   آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا
برسوں یک بوسۂ لب مانگتے جاتے ہیں ہمیں   رات آتے ہی کہا تم نے جو مانا کیا تھا
دیکھنے آئے دم نزع لیے منہ پہ نقاب   آخری وقت مرے منہ کا چھپانا کیا تھا
جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم   جی کے تیں اپنے کبھو ہم نے نہ جانا کیا تھا
مدعی ہوتے ہیں اک آن میں اب تو دلدار   مہر جب رسم تھی یارب وہ زمانہ کیا تھا
عزت و عشق کہاں جمع ہوئے اے ہمدم   ننگ خواری تھا اگر دل کا لگانا کیا تھا
گر خط سبز سے اس کے نہ تمھیں تھی کچھ لاگ
پھر بھلا میر جی یہ زہر کا کھانا کیا تھا

(۷۱۰)

وارد گلشن غزل‌خواں وہ جو دلبر یاں ہوا — دامن گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہوا
طائران باغ کو تھا بیت‌بخشی کا دماغ — پر ہر اک درد سخن سے میر کے نالاں ہوا
دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشم زخم — دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
سبز بختی پر ہے اس کی طائر سدرہ کو رشک — جو شکار اس تیغ کے سائے تلے بے جاں ہوا
خاک پر بھی دوڑتی ہے چشم مہر و ماہ چرخ — کس دنی الطبع کے گھر جا کے میں مہماں ہوا
تھا جگر میں جب تلک قطرہ ہی تھا خوں کا سرشک — اب جو آنکھوں سے تجاوز کر چلا طوفاں ہوا
اس کے میرے بیچ میں آئینہ آیا تھا ولے — صورت احوال ساری دیکھ کر حیراں ہوا
دل نے خوں ہو عشق خوباں میں بھی کیا بدلے ہیں رنگ — چہروں کو غازہ ہوا ہونٹوں کا رنگ پاں ہوا
تم جو کل اس راہ نکلے برق سے ہنستے گئے — ابر کو دیکھو کہ جب آیا ادھر گریاں ہوا
جی سے جانا بن گیا اس بن ہمیں لیں مارتے — کام تو مشکل نظر آتا تھا پر آساں ہوا

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

(۷۱۱)

آیا ہے ابر جب کا قبلے سے تیرا تیرا — مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا
خجلت سے ان لبوں کے پانی ہو بہ چلے ہیں — قند و نبات کا بھی نکلا ہے خوب شیرا
مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی — جاگہ سے اپنی جانا اپنا نہیں وتیرا
اس راہزن سے مل کر دل کیونکے کھو نہ بیٹھیں — انداز و ناز اچکے غمزہ اٹھائی گیرا
کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی — شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا
آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو — حیران چشم عاشق دکھے ہے جیسے ہیرا
نیت پہ سب بنا ہے یاں مسجد اک بڑی تھی — پیر مغاں موا سو اس کا بنا حظیرا
ہمراہ خوں تلک ہو ٹک پاؤں کے چھوئے سے — ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہوا کبیرا

غیرت سے میر صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو سینہ جو ان کا چیرا

(۷۱۲)

یاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پر وہ نہ آ پھرا — دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا
آیا نہ پھر وہ آئینہ‌رو ٹک نظر مجھے — میں منھ پر اپنے خاک ملے جا بہ جا پھرا

کیا اور جی رندھے کسو کا تیرے ہجر میں
سو بار اپنے منھ سے جگر تو گیا پھرا

اللہ رے دلکشی کہیں دیکھا جو گرم ناز
جوں سایہ اس کے ساتھ ملک پھر لگا پھرا

سن لیجو ایک بار مسافر ہی ہوگیا
بیمار عشق گور سے گو بارہا پھرا

کہہ وہ شکستہ پا ہمہ حسرت نہ کیونکے جائے
جو ایک دن نہ تیری گلی میں چلا پھرا

طالع پھرے سپہر پھرا قلب پھر گئے
چندے وہ رشک ماہ جو ہم سے جدا پھرا

پر بے نمک ہے ملنے کی اس وقت میں تلاش
بارے وہ ربط و دوستی سب کا مزہ پھرا

آنسو گرا نہ راز محبت کا پاس کر
میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا

بےصرفہ رونے لگ گئے ہم بھی اگر کبھو
تو دیکھیو کہ بادیہ سارا بہا پھرا

بندہ ہے پھر کہاں کا جو صاحب ہو بے دماغ
اس سے خدائی پھرتی ہے جس سے خدا پھرا

خانہ خراب میر بھی کتنا غیور تھا
مرتے موا پر اس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

(۷۱۳)

پھرتے کب تک شہر میں اب سوے صحرا رو کیا
کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یک سو کیا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کیے ہیں آج کل
چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا

نکہت خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے
اس سبب گل کو چمن کے دیر میں نے بو کیا

کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوبرو اس کو کیا لیکن بہت بدخو کیا

جانا اس آرام گہ سے ہے بعینہ بس یہی
جیسے سوتے سوتے ایدھر سے ادھر پہلو کیا

عزلتی اسلام کے کیا کیا پھرے ہیں جیب چاک
تو نے مائل کیوں ادھر کو گوشۂ ابرو کیا

وہ اتوکش کا مجھی پر کیا ہے سرگرم جفا
مارے تلواروں کے ان نے بہتوں کو اتو کیا

ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں
جن نے بالش خواب کا برسوں سرا بازو کیا

پھول نرگس کا لیے بھیچک کھڑا تھا راہ میں
کس کی چشم پرفسوں نے میر کو جادو کیا

(۷۱۴)

عاشق ترے لاکھوں ہوئے مجھ سا نہ پھر پیدا ہوا
تجھ پر کوئی اے کام جاں دیکھا نہ یوں مرتا ہوا

مدت ہوئی الفت گئی برسوں ہوئے طاقت گئی
دل مضطرب ایسا نہ تھا کیا جانیے اب کیا ہوا

کل صبح سیر باغ میں دل اور میرا رک گیا
بلبل نہ بولا منھ سے کچھ گل تک نہ مجھ سے وا ہوا

وے دن گئے جو یاں کبھو اٹھتا تھا دل سے جوش سا
اب لگ گئے رونے جہاں پل مارتے دریا ہوا

کتنوں کے دل بے جاں ہوئے کتنے نہ جانا کیا ہوئے / چلنے میں اس کے دو قدم ہنگامہ اک برپا ہوا
مستی میں لغزش ہوگئی معذور رکھا چاہیے / اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا
جوں حسن ہے اک فتنہ گر توں عشق بھی ہے پردہ در / وہ شہرۂ عالم ہوا میں خلق میں رسوا ہوا
زہاد و مجنوں ووں گئے ہم اور وامق یوں چلے / اس عارضے سے چاہ کے وہ کون سا اچھا ہوا
یا حرف خط ہے درمیاں یا گیسوؤں کا ہے بیاں
کیا میر صاحب کے تئیں پھر ان دنوں سودا ہوا

(۲۱۵)

تمام روز جو کل میں پیے شراب پھرا / بسان جام لیے دیدۂ پرآب پھرا
اثر بن آہ کے وہ منھ ادھر نہ ہوتا تھا / ہوا پھری ہے مگر کچھ کہ آفتاب پھرا
نہ لکھے خط کی نمط ہوگئیں سفید آنکھیں / تجھے بھی عشق ہے قاصد بھلا شتاب پھرا
وہ رشک گنج ہی نایاب تھا بہت ورنہ / خرابہ کون سا جس میں نہ میں خراب پھرا
کسو سے حرف محبت کا فائدہ نہ ہوا / بغل میں میں تو لیے یاں بہت کتاب پھرا
لکھا تو دیکھ کر قاصد پھرا جو مدت میں / جواب خط کا مرے صاف بے جواب پھرا
کہیں ٹھہرنے کی جا یاں نہ دیکھی میں نے میر
چمن میں عالم امکاں کے جیسے آب پھرا

(۲۱۶)

لے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا / بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا
اڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں / کس کے غبار دل سے یہ خاکداں بنایا
اک رنگ پر نہ رہنا یاں کا عجب نہیں ہے / کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا
آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کہے تو / جبھوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا
سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آگئی تھی مٹی / جو چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا
نقش قدم سے اس کے گلشن کی طرح ڈالی / گرد رہ اس کی لے کر سرو رواں بنایا
ہونے پہ جمع اپنے پھولا بہت تھا لیکن / کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا
اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت / معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
دل تک ادھر نہ آیا ایدھر سے کچھ نہ پایا / ق کہنے کو ترک لے کر اک سوانگ یاں بنایا
دریوزہ کرتے گذری گلیوں میں عمر اپنی / درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا
وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

(۷۱۷)

اس کام جان و دل نے عالم کا جان مارا   زلفوں کی درہمی سے برہم جہان مارا
بلبل کا آتشیں دم دل کو لگا ہمارے   ایسا کنھوں نے جیسے چھاتی میں بان مارا
خوں کچھ نہ تھا ہمارا مرکوز خاطر اس کو   للہ اک ہمیں بھی یوں درمیان مارا
سرچشمہ حسن کا وہ آیا نظر نہ مجھ کو   اس راہزن نے غافل کیا کاروان مارا
صبر و حواس و دانش سب عشق کے زبوں ہیں   میں کاوش مژہ سے عالم کو چھان مارا
کیا خون کا مزہ ہے اے عشق تجھ کو ظالم   ایک ایک دم میں تو نے سو سو جوان مارا
ہم عاجزوں پر آ کر یوں کوہ غم گرا ہے   جیسے زمیں کے اوپر اک آسمان مارا
کب جی بچے ہے یارو خوش رو و مو بتاں سے   گر صبح بچ گیا تو پھر شام آن مارا

کہتے نہ تھے کہ صاحب اتنا کڑھا نہ کریے
اس غم نے میر تم کو جی سے ندان مارا

(۷۱۸)

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا   انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا   منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحربیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا   ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک   آندھی تھی بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
کس مرتبہ تھی حسرت دیدار مرے ساتھ   جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا
مجنوں کو عبث دعوی وحشت ہے مجھی سے   جس دن کہ جنوں مجھ کو ہوا تھا وہ کہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے   وہ گنج اسی کنج خرابی میں نہاں تھا
کس زور سے فرہاد نے خارا شکنی کی   ہر چند کہ وہ بےکس و بےتاب و تواں تھا

گو میر جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشاں تھا

(۷۱۹)

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا   یا تن آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا
دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سدھ لیجے کبھو   اجڑی اس بستی کو پھر تو نے بسایا ہوتا
عزت اسلام کی کچھ رکھ لی خدا نے ورنہ   زلف نے تیری تو زنار بندھایا ہوتا
گھر کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی   اپنے دروازے تلک تو بھی تو آیا ہوتا

جو ہے سو بے خود رفتار ہے تیرا اے شوخ — اس روش سے نہ قدم تو نے اٹھایا ہوتا
اب تو صد چند ستم کرنے لگے تم اے کاش — عشق اپنا نہ تمھیں میں نے جتایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں — اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا
دل پہ رکھتا ہوں کبھو سر سے کبھو ماروں ہوں — ہاتھ پاؤں کو نہ میں تیرے لگایا ہوتا
کم کم اٹھتا وہ نقاب آہ کہ طاقت رہتی — کاش یک بار ہمیں منھ نہ دکھایا ہوتا

میر اظہار محبت میں گیا جی نہ ترا
ہائے نادان بہت تو نے چھپایا ہوتا

(۷۲۰)

مکث طالع دیکھ وہ ایدھر کو چل کر رہ گیا — رات جو تھی چاند سا گھر سے نکل کر رہ گیا
خواب میں کل پاؤں اپنے دوست کے ملتا تھا میں — آنکھ دشمن کھل گئی سو ہاتھ مل کر رہ گیا
ہم تو تھے سرگرم پابوسی خدا نے خیر کی — نیچہ کل خوش غلاف اس کا اگل کر رہ گیا
ہم بھی دنیا کی طلب میں سر کے بل ہوتے کھڑے — بارے اپنا پاؤں اس رہ میں بچل کر رہ گیا
کیا کہوں بیتابی شب سے کہ ناچار اس بغیر — دل مرے سینے میں دو دو ہاتھ اچھل کر رہ گیا
کیا ہمیں کو یار کے تیغے نے کھا کر دم لیا — ایسے بجتیروں کو یہ اژدر نگل کر رہ گیا
دو قدم ساتھ اس جفا جو کے چلا جاتا ہے جی — بوالہوس عیار تھا دیکھا نہ ٹل کر رہ گیا
آنکھ کچھ اپنی ہی اس کے سامنے ہوتی نہیں — جن نے وہ خونخوار سج دیکھی دہل کر رہ گیا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جاے میر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

(۷۲۱)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا — نہ پیش آوے اگر مرحلہ جدائی کا
ہوا ہے کنج قفس ہی کی بے پری میں خوب — کہ پر کے سال تلک لطف تھا رہائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے — دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا
نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی — جگر ہے خستہ ترے پنجۂ حنائی کا
نہیں جہان میں کس طرف گفتگو دل سے — یہ ایک قطرۂ خوں ہے طرف خدائی کا
کسو پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں — خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا
بجا رہا نہ دل شیخ شور محشر سے — جگر بھی چاہیے ہے کچھ تھامنا اوائی کا
رکھا ہے باز ہمیں در بدر کے پھرنے سے — سروں پہ اپنے ہے احساں شکستہ پائی کا

ملا کہیں تو دکھا دیں گے عشق کا جنگل   بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہنمائی کا
نہ انس مجھ سے ہوا اس کو میں ہزار کہا   جگر میں داغ ہے اس گل کی بیوفائی کا

جہاں سے میر ہی کے ساتھ جانا تھا لیکن
کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا

(۷۲۲)

یہ رفتگی بھی ہوتی ہے جی ہی چلا گیا   کل حال میر دیکھ کے غش مجھ کو آگیا
کیا کہیے ایک عمر میں دے لب ہلے تھے کچھ   سو بات پان کھاتے ہوئے وہ چبا گیا
ثابت ہے اس کے پہلو سے پہنچے ہے ہم کو رنج   دیکھا نہ درد دل کے کہے سر جھکا گیا
نالاں ہے عندلیب گل آشفتہ رفتہ سرو   ٹک بیٹھ کر چمن میں وہ فتنہ اٹھا گیا
پڑھتا تھا میں تو سبحہ لیے ہاتھ میں درود   صلواتیں مجھ کو آکے وہ ناحق سنا گیا
رکھنا نشان قبر کا میری نہ خوش کیا   آیا سو اور خاک میں مجھ کو ملا گیا
منصف ہو تو ہی شیخ کہ اس مست ناز بن   ہم آپ سے بھلا گئے تجھ سے رہا گیا
ہرگز بجھی نہ سر سے لگی آہ عشق میں   مانند شمع داغ ہی سب ہم کو کھا گیا
کیوں میں کہا کہ نس کے نمک زخم پر چھڑک   بے لطف اس کے ہونے میں سارا مزہ گیا
آنسو تو ڈر سے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب   اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا
وقت اخیر کیا یہ ادا تھی کہ غش سے میں   جب آنکھ کھولی بالوں میں منہ کو چھپا گیا

کیا پوچھتے ہو داغ کیا مرگ میر نے
مر کر وہ سینہ سوختہ چھاتی جلا گیا

(۷۲۳)

سوز دروں سے آخر بھسمنت دل کو پایا   اس آگ نے بھڑک کر دربست گھر جلایا
جی دے کے لیتے ایسے معشوق بے بدل کو   یوسف عزیز دلہا سستا بہت بکایا
زلف سیاہ اس کی جاتی نہیں نظر سے   اس چشم روسیہ نے روز سیہ دکھایا
نام اس کا سن کے آنسو گر ہی پڑے پلک سے   دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا
تھا لطف زیست جن سے وے اب نہیں میسر   مدت ہوئی کہ ہم نے جینے سے ہاتھ اٹھایا
مہندی لگی تھی تیرے پاؤں میں کیا پیارے   ہنگام خون عاشق سر پر جو تو نہ آیا
یہ پیروی کسو سے کاہے کو ہوسکے ہے   رکھتا ہے داغ ہم کو قامت کا اس کی سایا
دیکھی نہ پیش جاتے ہرگز خرد وری میں   دانستہ باؤلا ہم اپنے تئیں بنایا

رہتی تھی بے دماغی اک شور ما و من میں — آنکھوں کے مند گئے پر آرام سا تو پایا

گل پھول سے بھی تو جو لیتا ہے منھ کو پھیرے
مکھڑے سے کس کے تونے اے میر دل لگایا

(۷۲۴)

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا — شاعری تو شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہوگئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثال عنقا لیک — شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو — سو دلوں کا غبار ہے اپنا

صرفہ آزار میر میں نہ کرو
خستہ اپنا ہے زار ہے اپنا

(۷۲۵)

روکش ہوا جو شب وہ بالاے بام نکلا — ماہ تمام یارو کیا ناتمام نکلا
ہو گوشہ گیر شہرت مدنظر اگر ہے — عنقا کی طرح اپنا عزلت سے نام نکلا
تھا جن کو عاشقی میں دعواے پختہ مغزی — سودا انھوں کا آخر دیکھا تو خام نکلا
نومید قیس پایا ناکام کوہکن کو — اس عشق فتنہ گر سے وہ کس کا کام نکلا

کیونکر نہ مر رہے جو بیتاب میر سا ہو
ایک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

(۷۲۶)

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا — اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا
غم میں جاتی ہے عمر دہ روزہ — اپنے ہاں سے دہا نہیں جاتا
طاقت دل تلک تعب کھینچے — اب ستم تک سہا نہیں جاتا
اس در تر کا حیرتی ہے بحر — تب تو اس سے بہا نہیں جاتا

کب تری رہ میں میر گردآلود
لوہو میں آ نہا نہیں جاتا

(۷۲۷)

کجی اس کی جو میں جتانے لگا — مجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا
تحمل نہ تھا جس کو تک سو وہ میں — ستم کیسے کیسے اٹھانے لگا
رندھے عشق میں کوئی یوں کب تلک — جگر آہ منھ تک تو آنے لگا
پریشاں ہیں اس وقت میں نیک و بد — موا جو کوئی وہ ٹھکانے لگا
کروں یاد اسے ہوں جو میں آپ میں — سو یاں جی ہی اب بھول جانے لگا
پس از عمر اودھر گئی تھی نگاہ — سو آنکھیں وہ مجھ کو دکھانے لگا
نہیں رہتے عاقل علاقے بغیر
کہیں میر دل کو دوانے لگا

(۷۲۸)

اللہ رے غرور و ناز تیرا — مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا
ہم سے کہ تجھی کو جانتے ہیں — جاتا نہیں احتراز تیرا
مل جن سے شراب تو پیے ہے — کہہ دیتے ہیں وہ ہی راز تیرا
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

(۷۲۹)

آنسو مری آنکھوں میں ہر دم جو نہ آجاتا — تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
اصلح ہے حجاب اس کا ہم شوق کے ماروں سے — بے پردہ جو وہ ہوتا تو کس سے رہا جاتا
طفلی کی ادا تیری جاتی نہیں یہ جی سے — ہم دیکھتے تجھ کو تو تو منھ کو چھپا جاتا
صد شکر کہ داغ دل افسردہ ہوا ورنہ — یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
ان آنکھوں سے ہم چشمی بر جا ہے جو میں جل کر — بادام کو کل یارو مجلس ہی میں کھا جاتا
صحبت سگ و آہو کی یک عمر رہی باہم — وہ بھاگتا مجھ سے تو میں اس سے لگا جاتا
گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو — جی خودبخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا
جوں ابر نہ تھم سکتا آنکھوں کا مری جھمکا — جوں برق اگر وہ بھی جھمکی سی دکھا جاتا
تکلیف نہ کی ہم نے اس وحشی کو مرنے کی
تھا میر تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا

(۷۳۰)

بالقوہ ٹک دکھایئے چشم پرآب کا
دامن پکڑ کے رویئے یک دم سحاب کا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں
عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

دریا دلی جنھیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
دیکھا ہے واژگوں ہی پیالہ حباب کا

شاید کہ قلب یار بھی ٹک اس طرف پھرے
میں منتظر زمانے کے ہوں انقلاب کا

بارے نقاب دن کو جو رکھتا ہے منھ پہ تو
پردہ سا رہ گیا ہے کچھ اک آفتاب کا

تلوار بن نکلتے نہیں گھر سے ایک دم
خوں کر رہوگے تم کسو خانہ‌خراب کا

بے ہوش دیکھ آگے مرے ساتھ غیر کے
رکھتا ہے پاؤں مست ہو جیسے شراب کا

مجنوں میں اور مجھ میں کرے کیوں نہ فرق عشق
چھپتا نہیں مزہ تو جلے سے کباب کا

رو فرصت جوانی پہ جوں ابر بے‌خبر
انداز برق کا سا ہے عہد شباب کا

واں سے تو نامہ بر کو ہے کب کا جواب صاف
میں سادگی سے لاگو ہوں خط کے جواب کا

ٹپکا کرے ہے زہر ہی صرف اس نگاہ سے
وہ چشم گھر ہے غصہ و ناز و عتاب کا

لائق تھا دیکھنے ہی کے مصراع قد یار
میں معتقد ہوں میر ترے انتخاب کا

(۷۳۱)

خندۂ دنداں نما کرتا جو وہ کافر گیا
گوہر تر جوں سرشک آنکھوں سے سب کی گر گیا

کیا گذر کوے محبت میں ہنسی ہے کھیل ہے
پاؤں رکھا جس نے ٹک اودھر پھر اس کا سر گیا

کیا کوئی زیر فلک اونچا کرے فرق غرور
ایک پتھر حادثے کا آلگا سر چپ گیا

نیزہ بازان مژہ میں دل کی حالت کیا کہوں
ایک ناکبی سپاہی دکھنیوں میں گھر گیا

بعد مدت اس طرف لایا تھا اس کو جذب عشق
بخت کی برگشتگی سے آتے آتے پھر گیا

تیز دست اتنا نہیں وہ ظلم میں اب فرق ہے
یعنی لوہا تھا کڑا تیغ ستم کا کر گیا

سخت ہم کو میر کے مرجانے کا افسوس ہے
تم نے دل پتھر کیا وہ جان سے آخر گیا

(۷۳۲)

اس بد زباں نے صرف سخن آہ کب کیا
چپکے ہی چپکے ان نے ہمیں جاں بلب کیا

طاقت سے میرے دل کی خبر تجھ کو کیا نہ تھی
ظالم نگاہ خشم ادھر کی غضب کیا

یکساں کیا نہیں ہے ہمیں خاک رہ سے آج
ایسا ہی کچھ سلوک کیا ان نے جب کیا

عمامہ لے کے شیخ کہیں میکدے سے جا — بس مغبچوں نے حد سے زیادہ ادب کیا

اس رخ سے دل اٹھایا تو زلفوں میں جا پھنسا — القصہ اپنے روز کو ہم نے بھی شب کیا

ظاہر ہوا نہ مجھ پہ کچھ اس ظلم کا سبب — کیا جانوں خون ان نے مرا کس سبب کیا

کچھ آگے آئے ہوتے جو منظور لطف تھا — ہم جی سے اپنے جاچکے تم قصد تب کیا

بچھڑے تمھارے اپنا عجب حال ہوگیا — جس کی نگاہ پڑ گئی ان نے عجب کیا

برسوں سے اپنے دل کی ہے دل میں کہ یار نے — اک دن جدا نہ غیر سے ہم کو طلب کیا

کی زندگی سو وہ کی موئے اب سو اس طرح
جو کام میر جی نے کیا سو کڈھب کیا

(۷۳۳)

اب چھاتی کے جلنے نے کچھ طور بدل ڈالا — سب درد ہو شدت کا اس دل ہی کو دل ڈالا

ہم عاجزوں کا کھونا مشکل نہیں ہے ایسا — کچھ چونٹیوں کو لے کر پاؤں تلے مل ڈالا

اٹکھیلی کی بھی اس کی دل تاب نہیں لاتا — کیا پگڑی کے پیچوں میں لے بالوں کو بل ڈالا

تشویش سے اب خالی کس دن ہے مزاج اپنا — اس دل کی خلش نے بھی کیا آہ خلل ڈالا

مجھ مست کو کیا نسبت اے میر مسائل سے
منہ شیخ کا مسجد میں میں رک کے مسل ڈالا

(۷۳۴)

طوفان میرے رونے سے آخر کو ہورہا — یوناں کی طرح بستی یہ سب میں ڈبو رہا

بہتوں نے چاہا کہیے پہ کوئی نہ کہہ سکا — احوال عاشقی کا مری گوگو رہا

آخر موا ہی واں سے نکلا سنا اسے — کوچے میں اس کے جا کے ستم دیدہ جو رہا

آنسو تھما نہ جب سے گیا وہ نگاہ سے — پایان کار آنکھوں کو اپنی میں رو رہا

کیا بےشریک زندگی کی شیخ شہر نے — نباش بھی وہی تھا وہی مردہ شو رہا

یاروں نے جل کے مردے سے میرے کیا خطاب — روتے تھے ہم تو دل ہی کو تو جی بھی کھو رہا

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منڈکری سی مار سو رہا

(۷۳۵)

لعل پر کب دل مرا مائل ہوا — اس لب خاموش کا قائل ہوا

لڑ گئیں آنکھیں اٹھائی دل نے چوٹ — یہ تماشائی عبث گھائل ہوا

ناشکیبی سے گئی ناموس فقر عاقبت بوسے کا میں سائل ہوا
ایک تھے ہم دے نہ ہوتے ہست اگر اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا
میر ہم کس ذیل میں دیکھ اس کی آنکھ
ہوش اہل قدس کا زائل ہوا

(۷۳۶)

کوئی فقیر یہ اے کاشکے دعا کرتا کہ مجھ کو اس کی گلی کا خدا گدا کرتا
کبھو جو آن کے ہم سے بھی تو ملا کرتا تو تیرے جی میں مخالف نہ اتنی جا کرتا
چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا
فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا
علاج عشق نے ایسا کیا نہ تھا اس کا جو کوئی اور بھی مجنوں کی کچھ دوا کرتا
قدم کے چھونے سے استادگی مجھی سے ہوئی کبھو وہ یوں تو مرے ہاتھ بھی لگا کرتا
بدی نتیجہ ہے نیکی کا اس زمانے میں بھلا کسو سے جو کرتا تو تو برا کرتا
تلاطم آنکھ کے صد رنگ رہتے تھے تجھ بن کبھو کبھو جو یہ دریاے خوں چڑھا کرتا
کہاں سے نکلی یہ آتش نہ جانتا تھا میں شروع ربط میں اس کے جو دل جلا کرتا
گلی سے یار کی ہم لے گئے سر پرشور وگرنہ شام سے ہنگامہ ہی رہا کرتا
خراب مجھ کو کیا دل کی لاگ نے ورنہ فقیر تکیے سے کاہے کو یوں اٹھا کرتا
گئے پہ تیرے نہ تھا ہم نفس کوئی اے گل کبھو نسیم سے میں درد دل کہا کرتا
کہیں کی خاک کوئی منھ پہ کب تلک ملتا خراب و خوار کہاں تک بھلا پھرا کرتا
موئی ہی رہتی تھی عزت مری محبت میں ہلاک آپ کو کرتا نہ میں تو کیا کرتا
ترے مزاج میں تاب تعب تھی میر کہاں
کسو سے عشق نہ کرتا تو تو بھلا کرتا

(۷۳۷)

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا ہوا ابر رحمت گنہگار سا
کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
گل و سرو اچھے سبھی ہیں ولے نہ نکلا چمن میں کوئی یار سا
جو ایسا ہی تم ہم کو سمجھو ہو سہل ہمیں بھی یہ جینا ہے دشوار سا

فلک نے بہت کھینچے آزار لیک   نہ پہنچا بہم اس دل آزار سا
مگر آنکھ تیری بھی چپکی کہیں   ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا
چمن ہووے جو انجمن تجھ سے واں   لگے آنکھ میں سب کی گل خار سا
کھڑے منتظر ضعف جو آگیا   گرا اس کے در پر میں دیوار سا
دکھاؤں متاع وفا کب اسے   لگا واں تو رہتا ہے بازار سا
عجب کیا جو اس زلف کا سایہ دار   پھرے راتوں کو بھی پری دار سا

نہیں میر مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

(۷۳۸)

حیراں ہے لحظہ لحظہ طرز عجب عجب کا   جو رفتۂ محبت واقف ہے اس کے ڈھب کا
کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یاں نہیں ہے   یہ وجہ ہے کہ عارف منھ دیکھتا ہے سب کا
نسبت درست جس کی اس رو و مو سے پائی   ہے درہم اور برہم حال اس کے روز و شب کا
افسوس ہے نہیں تو انصاف دوست ورنہ   شایان لطف دشمن شائستہ میں غضب کا
سودائی ایک عالم اس کا بنا پھرے ہے   ہر چند عزلتی ہے وہ خال کنج لب کا
منھ اس کے منھ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں   اب ہاتھ سے دیا ہے سررشتہ میں ادب کا

کیا آج کل سے اس کی یہ بے توجہی ہے
منھ ان نے اس طرف سے پھیرا ہے میر کب کا

(۷۳۹)

سینکڑوں بیکسوں کا جان گیا   پر یہ تیرا نہ امتحان گیا
وائے احوال اس جفاکش کا   عاشق اپنا جسے وہ جان گیا
داغ حرماں ہے خاک میں بھی ساتھ   جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے   آج سو سو طرف گمان گیا
حرف نشنو کوئی اسے بھی ملا   تب تو میں نے کہا سو مان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا   ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی   ق   ایک میرا ہی یوں نہ جان گیا
اب جو عیسیٰ فلک پہ ہے وہ بھی   شوق میں برسوں خاک چھان گیا

کون جی سے نہ جائے گا اے میر
حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

(۷۴۰)

ہنگام شرح غم جگر خامہ شق ہوا   سوز دروں سے نامہ کباب ورق ہوا
بندہ خدا ہے پھر تو اگر گذرے آپ سے   مرتا ہے جو کوئی اسے کہتے ہیں حق ہوا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبط شوق   یہ شہر جب تمام لٹا تب نسق ہوا
وہ رنگ وہ روش وہ طرح سب گئی بباد   آتے ہی تیرے باغ میں منہ گل کا فق ہوا
برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا   سو دیدہ اب گداختہ ہوکر شفق ہوا
لے کر زمیں سے تابہ فلک رک گیا ہے آہ   کس دردمندعشق کو یارب قلق ہوا
اس نو ورق میں میرؔ جو تھا شرح و بسط سے
بیٹھا جو دب کے میں تو ترا اک سبق ہوا

(۷۴۱)

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا   دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
منظر خراب ہونے کو ہے چشم تر کا حیف   پھر دید کی جگہ نہیں جو یہ مکاں گرا
روح القدس کو سہل کیا یار نے شکار   اک تیر میں وہ مرغ بلند آشیاں گرا
پہنچایا مجھ کو عجز نے مقصود دل کے تیں   یعنی کہ اس کے در ہی پہ میں ناتواں گرا
شور اک مری نہاد سے تجھ بن اٹھا تھا رات   جس سے کیا خیال کہ یہ آسماں گرا
کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے   پتھر بھی واں کے جل گئے جاکر جہاں گرا
ڈوبا خیال چاہ زنخداں میں اس کے میرؔ
دانستہ کیوں کنوئیں میں بھلا یہ جواں گرا

(۷۴۲)

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہوچکا   واں کام ہی رہا تجھے یاں کام ہوچکا
یا خط چلے ہی آتے تھے یا حرف ہی نہیں   شاید کہ سادگی کا وہ ہنگام ہوچکا
موہم گیا وہ ترک محبت کا ناصحا   میں اب تو خاص و عام میں بدنام ہوچکا
ناآشنائے حرف تھا وہ شوخ جب تبھی   ہم سے تو ترک نامہ و پیغام ہوچکا
تڑپے ہے جب کہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہوچکا

(۷۴۳)

سنبل تمھارے گیسوؤں کے غم میں لٹ گیا   ابرو کی تیغ دیکھ مہ عید کٹ گیا

عالم میں جاں کے مجھ کو تنزہ تھا اب تو میں — آلودگی جسم سے مانی میں اٹ گیا
ظلم و جفا و جور پہ اصرار اس قدر — ہٹ دیکھ دیکھ تیری دل اپنا بھی ہٹ گیا
اب وہ سماں نہیں ہے کہ وہ کام جان خلق — مغموم ہم کو دیکھ کے دوڑا لپٹ گیا
دشوار سیتے ہیں گے جو بے ڈھب پھٹے ہے جیب — بے طوریوں سے اس کی دل اپنا تو پھٹ گیا
دامان و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا — اب کے یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا
خاطر اگر ہو جمع پریشانی بھی نبھے — سو دل تو دو طرف تری زلفوں سے بٹ گیا
ٹک رات اس کے منھ سے ہوا تھا مقابلہ — پھر ماہ چاردہ کو جو دیکھا تو گھٹ گیا
کیا پوچھو ہو نصیب ہمارے الٹ گئے — چل کر ادھر کو یار پھر اودھر الٹ گیا

بلبل کی اور گل کی جو صحبت کی سیر میرؔ
دل اپنا دلبروں کی طرف سے اچٹ گیا

(۷۴۴)

سینے میں شوق میرؔ کے سب درد ہوگیا — دل پر رکھا تھا ہاتھ سو منھ زرد ہوگیا
نکلا تھا آج صبح بہت گرم ہو ولے — خورشید اس کو دیکھتے ہی سرد ہوگیا
بے پردہ اس کی شوخی قیامت ہے دیکھیو — یاں خاک سی اڑا دی فلک گرد ہوگیا
کشتی ہر اک فقیر کی بھردی شراب سے — اس دور میں کلال عجب مرد ہوگیا

دفتر لکھے ہیں میرؔ نے دل کے الم کے یہ
یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہوگیا

(۷۴۵)

کیا تو نمود کس کی کیسا کمال تیرا — اے نقش وہم آیا کیدھر خیال تیرا
کیا ہے جو ہو زنخ زن مہ پاس کا ستارہ — ہے داغ جان عالم ٹھوڑی کا خال تیرا
اے گل مغل بچہ وہ مرزا ہے اس کے آگے — کچھ بھی بھلا لگے ہے منھ لال لال تیرا
تجھ روے خوے فشاں سے انجم ہی کیا خجل ہیں — ہے آفتاب کو بھی اے ماہ سال تیرا
اب صبح پاس گل کے ہوکر نہیں نکلتی — دیکھا نسیم نے بھی شاید جمال تیرا
پہلا قدم ہے انساں پامال مرگ ہونا — کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
ہوگی جو چل سرمو پنہاں نہیں رہے گی — اک دن زبان ہوگا ایک ایک بال تیرا
تفصیل حال میری تھی باعث کدورت — سو جی کو خوش نہ آیا ہرگز ملال تیرا

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ حال تیرا

(۷۴۶)

فرو آتا نہیں سر ناز سے اب کے امیروں کا
اگرچہ آسماں تک سور جاوے ہم فقیروں کا

تبسم سحر ہے جب پان سے لب سرخ ہوں اس کے
دلوں میں کام کر جاتا ہے یاں جادو کے تیروں کا

سرکنا اس کے درباں پاس سے ہے شب کو بھی مشکل
سر زنجیر زیر سر رکھے ہے ہم امیروں کا

گئے بہتوں کے سر لڑکوں نے جو یہ باندھنوں باندھے
شہید اک میں نہیں ان باندھنوں کے سرخ چیروں کا

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں
چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہم صفیروں کا

ہمارے دیکھتے زیر نگیں تھا ملک سب جن کے
کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا

دل پر کو تو ان پلکوں ہی نے سب چھان مارا تھا
کیا میرؔ ان نے خالی یوں ہی ترکش اپنے تیروں کا

(۷۴۷)

ہوئیں رسوائیاں جس کے لیے چھوٹا دیار اپنا
ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا

خدا جانے ہمیں اس بے خودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہوگئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

ذلیل اس کی گلی میں ہوں تو ہوں آزردگی کیسی
کہ رنجش اس جگہ ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا

اگرچہ خاک اڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی
ولے نکلا نہ خاطرخواہ رونے سے غبار اپنا

کہا بد وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے
ہوا صحبت میں ان لڑکوں کی ضائع روزگار اپنا

کریں جو ترک عزلت واسطے مشہور ہونے کے
مگر شہروں میں کم ہے جیسے عنقا اشتہار اپنا

دل بے تاب و بے طاقت سے کچھ چلتا نہیں ورنہ
کھڑا بھی واں نہ جا کر ہوں اگر ہو اختیار اپنا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آ کر
جہاں سے لوگ سب رخت سفر کرتے ہیں بار اپنا

نہ ہو یوں میکدہ مسجد سا پر واں ہوش جاتے ہیں
ہوا ہے دونوں جا کہ ایک دو باری گذار اپنا

سراپا آرزو ہم لوگ ہیں کاہے کو رندوں میں
رہے ہیں اب تلک جیتے ولے دل مار مار اپنا

گیا وہ بوجھ سب ہلکے ہوئے ہم میرؔ آخر کو
مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا

(۷۴۸)

ربط دل زلف سے اس کی جو نہ چسپاں ہوتا
اس قدر حال ہمارا نہ پریشاں ہوتا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجھلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

میری زنجیر کی جھنکار نہ کوئی سنتا
شور مجنوں نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منھ تکتا
دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

وصل کے دن سے بدل کیونکے شب ہجراں ہو — شاید اس طور میں ایام کا نقصاں ہوتا
طور اپنے پہ جو ہم روتے تو پھر عالم میں — دیکھتے تم کہ وہی نوح کا طوفاں ہوتا
دل میں کیا کیا تھا ہمارے جو نہ ہوجاتی یاس — یہ نگر کاہے کو اس طرح سے ویراں ہوتا
خاک پا ہو کے ترے قد کا چمن میں رہتا — سرو اتنا نہ اکڑتا اگر انساں ہوتا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

(۷۴۹)

جس پہ اس موج سی شمشیر کا اک وار کیا — کام اس شوق کے ڈوبے ہوئے کا پار کیا
آگیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز — ہوکے میں خاک برابر اسے ہموار کیا
کیا کروں جنس وفا پھیرے لیے جاتا ہوں — بخت بد نے نہ اسے دل کا خریدار کیا
اتفاق ایسے پڑے ہم تو منافق ٹھہرے — چرخ ناساز نے غیروں سے اسے یار کیا
ایسے آزار اٹھانے کا ہمیں کب تھا دماغ — کوفت نے دل کی تو جینے سے بھی بیزار کیا
جی ہی جاتے سنے ہیں عشق کے مشہور ہوئے — کیا کیا ہم نے کہ اس راز کو اظہار کیا
دیکھے اس ماہ کو جو کتنے مہینے گذرے — بڑھ گئی کاہش دل ایسی کہ بیمار کیا
نالۂ بلبل بے دل ہے پریشان بہت — موسم گل نے مگر رخت سفر بار کیا

میر اے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

(۷۵۰)

شب رفتہ میں اس کے در پر گیا — سگ یار آدم گری کر گیا
شکستہ دل عشق کی جان کیا — نظر پھیری تونے تو وہ مر گیا
ہوئے یار کیا کیا خراب اس بغیر — وہ کس خانہ آباد کے گھر گیا
کشندہ تھا لڑکا ہی ناکردہ خوں — مجھے دیکھ کر محتضر ڈر گیا

بہت رفتہ رہتے ہو تم اس کے اب
مزاج آپ کا میر کیدھر گیا

(۷۵۱)

بے طاقتی میں تو تو اے میر مر رہے گا — ایسی طپش سے دل کی کوئی جگر رہے گا
کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم — جوں نقش پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا

مت کر لڑکپن اتنا خونریزی میں ہماری — اس طور لوہو میں تو دامن کو بھر رہے گا
آگاہ پائے ہم نے کھوئے گئے سے یعنی — پہنچی خبر ادھر کی دل بےخبر رہے گا
فردا کا سوچ تجھ کو کیا آج ہی پڑا ہے — کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا
لوگوں کا پاس ہم کو مارے رکھے ہے ورنہ — ماتم میں دل کے شیون دو دوپہر رہے گا
پایان کار دیکھیں کیا ہووے دل کی صورت — ایسا ہی جو وہ چہرہ پیش نظر رہے گا
اب رنگی رویہ اپنا کیا ہے میں نے — میرا یہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کر رہے گا

ہم کوئی بیت جاکر اس ہی کے منہ سنیں گے
وحشت زدہ کسو دن گر میرؔ گھر رہے گا

(۷۵۲)

پندگو مشفق عبث میرا نصیحت گر ہوا — سختیاں جو میں بہت کھینچیں سو دل پتھر ہوا
گاڑ کر مٹی میں روے بجز کیا ہم ہی موئے — خون اس کے رہگذر کی خاک پر اکثر ہوا
اب اٹھا جاتا نہیں مجھ پاس پھر ٹک بیٹھ کر — گرد اس کے جو پھرا سر کو مرے چکر ہوا
کب کھبا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسا صبح تھا — پھول خوش رنگ اور اس کے فرش پر بچھ کر ہوا
کیا سنی تم نے نہیں بدحالی فرہاد و قیس — کون سا بیمار دل کا آج تک بہتر ہوا
کون کرتا ہے طرف مجھ عاشق بیتاب کی — صورت خوش جن نے دیکھی اس کی سو اودھر ہوا
جل گیا یاقوت اس کے لعل لب جب ہل گئے — گوہر خوش آب انداز سخن سے تر ہوا
کیا کہوں اب کے جنوں میں گھر کا بھی رہنا گیا — کام جو مجھ سے ہوا سو عقل سے باہر ہوا
شب نہ کرتا شور اس کوچے میں گر میں جانتا — اس کی بے خوابی سے ہنگامہ مرے سر پر ہوا
ہووے یارب ان سیہ رو آنکھوں کا خانہ خراب — یک نظر کرتے ہی میرے دل میں اس کا گھر ہوا

استخواں سب پوست سے سینے کے آتے ہیں نظر
عشق میں ان لوخطوں کے میرؔ میں مسطر ہوا

(۷۵۳)

ٹپکتی پلکوں سے رومال جس گھڑی سرکا — طرف ہوا نہ کبھو ابر دیدۂ تر کا
کبھو تو دیر میں ہوں میں کبھو ہوں کعبے میں — کہاں کہاں لیے پھرتا ہے شوق اس در کا
غم فراق سے پھر سوکھ کر ہوا کانٹا — بچھا جو پھول اٹھا کوئی اس کے بستر کا
اسیر جرگے میں ہوجاؤں میں تو ہوجاؤں — وگرنہ قصد ہو کس کو شکار لاغر کا
ہمیں کہ جلنے سے خوگر ہیں آگ میں ہے عیش — محیط میں تو تلف ہتا ہے سمندر کا

قریب خط کا نکلنا ہوا سو خط موقوف　　غبار دور ہو کس طور میرے دلبر کا
بتا کے کعبے کا رستہ اسے بھلاؤں راہ　　نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا
کسو سے مل چلے تک وہ تو ہے بہت ورنہ　　سلوک کاہے کو شیوہ ہے اس ستمگر کا
شکستہ بالی و لب‌بستگی پر اب کی نہ جا　　چمن میں شور مرا اب تلک بھی ہے پر کا
تلاش دل نہیں کام آتی اس زنخ میں گئے　　کہ چاہ میں تو ہے مرنا برا شناور کا
پھرے ہے خاک ملے منھ پہ یا نمد پہنے　　یہ آئینہ ہے نظرکردہ کس قلندر کا
نہ ترک عشق جو کرتا تو میر کیا کرتا
جفاکشی نہیں ہے کام نازپرور کا

(۷۵۴)

حلقہ ہوئی وہ زلف کماں کو چھپا رکھا　　طاق بلند پر اسے سب نے اٹھا رکھا
اس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل رہی　　گو چرخ نے بصورت ظاہر جدا رکھا
گڑوا دیا ہو مار کر اک دو کو تو کہوں　　کب ان نے خون کر نہ کسو کا دبا رکھا
ٹک میں لگا تھا اس نمکی شوخ کے گلے　　چھاتی کے میرے زخموں نے برسوں مزہ رکھا
کاہے کو آئے چوٹ کوئی دل پہ شیخ کے　　اس بوالہوس نے اپنے تئیں تو بچا رکھا
ہم سر ہی جاتے عشق میں اکثر سنا کیے　　اس راہ خوفناک میں کیوں تم نے پا رکھا
آزار دل نہیں ہے کسو دین میں درست　　کیا جانوں ان بتوں نے ستم کیوں روا رکھا
کیا میں ہی محو چشمک انجم ہوں خلق کو　　اس مہ نے ایک جھمکی دکھاکر لگا رکھا
کیا زہر چشم یار کو کوئی بیاں کرے　　جس کی طرف نگاہ کی اس کو سلا رکھا
ہر چند شعر میر کا دل معتقد نہ تھا
پر اس غزل کو ہم نے بھی سن کر لکھا رکھا

(۷۵۵)

میں جوانی میں مے‌پرست رہا　　گردن شیشہ ہی میں دست رہا
در میخانہ میں مرے سر پر　　ظل ممدود دار بست رہا
سر پہ پتھر جنوں میں کب نہ پڑے　　یہ سبو ثابت شکست رہا
ہاتھ کھینچا سو پیر ہوکر جب　　تب گنہ کرنے کا نہ دست رہا
آنسو پی پی گیا جو برسوں میں　　دل درونے میں آب‌خست رہا
جب کہو تب بلند کھینچے اسے　　قد خوباں کا سرو پست رہا
میر کے ہوش کے ہیں ہم عاشق
فصل گل جب تلک تھی مست رہا

(۷۵۶)

چمن بھی ترا عاشق زار تھا　　گل سرخ اک زرد رخسار تھا
گئی نیند شیون سے بلبل کی رات　　کہیں دل ہمارا گرفتار تھا
قد یار کے آگے سرو چمن　　کھڑا دور جیسے گنہگار تھا
یہی جنس دل کی گراں قدر تھی　　ولے جب تلک تو خریدار تھا
بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ　　کہ چسپاں ہمیں بھی کہیں پیار تھا
مجھے اے دل چاک کیا شانہ سا　　کسو زلف سے کچھ سروکار تھا
گیا میرؔ یاں سے کروگے جو یاد
کہوگے کہ مسکیں عجب یار تھا

(۷۵۷)[1]

دل گیا مفت اور دکھ پایا　　ہوکے عاشق بہت میں پچھتایا
مر گئے پر بھی سنگ سار کیا　　نخل ماتم مرا یہ پھل لایا
صحن میں میرے اے گل مہتاب　　کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا
یہ شب ہجر ہے کھڑی نہ رہے　　ہو سفیدی کا جس جگہ سایا
جب سے بےخود ہوا ہوں اس کو دیکھ
آپ میں میرؔ پھر نہیں آیا

(۷۵۸)

چاک کر سینہ دل میں پھینک دیا　　کھینچے ایذا ہمیشہ کس کی بلا
تم کو جیتا رکھے خدا اے بتاں　　مر گئے ہم تو کرتے کرتے وفا
اٹھ گیا میرؔ وہ جو بالیں سے
پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

(۷۵۹)

اندوہ و غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا　　اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا
اچھا نہیں ہے رفتن رنگیں بھی اس قدر　　سنیو کہ اس کی چال پر اک آدھ خوں ہوا
جی میں تھا خوب جاکے خرابے میں روئیے　　سیلاب آیا آکے چلا کیا شگوں ہوا

---

(۱) یہ غزل ایک شعر کے اضافے کے ساتھ دیوان پنجم میں بھی شامل تھی۔ وہاں سے اسے نکال دیا گیا ہے اور یہاں اس کا متن دیوان پنجم کے مطابق رکھا گیا ہے۔ مصحح

نخچیرگاہ عشق میں افراط صید سے　　روح الامیں کا نام شکار زبوں ہوا
ہوں داغ نازکی کہ کیا تھا خیال بوس　　گلبرگ سا وہ ہونٹ جو تھا نیلگوں ہوا
میں دور ہوں اگرچہ برابر ہوں خاک سے　　اس رہ میں نقش پا ہی مرا رہ‌نموں ہوا
میرؔ ان نے سرگذشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

(۷۶۰)

منھ پر اس آفتاب کے ہے یہ نقاب کیا　　پردہ رہا ہے کون سا ہم سے حجاب کیا
اے ابرتر یہ گریہ ہمارا ہے دیدنی　　برسے ہے آج صبح سے چشم پرآب کیا
دم گنتے گنتے اپنی کوئی جان کیوں نہ دو　　وہ پاس آن بیٹھے کسو کے حساب کیا
سو بار اس کے کوچے تلک جاتے ہیں چلے　　دل ہے اگر بجا تو یہ ہے اضطراب کیا
بس اب نہ منھ کھلاؤ ہمارا ڈھکے رہو　　محشر کو ہم سوال کریں تو جواب کیا
دوزخ سو عاشقوں کو تو دوزخ نہیں رہا　　اب واں گئے پہ ٹھہرے ہے دیکھیں عذاب کیا
ہم جل کے ایک راکھ کی ڈھیری بھی ہوگئے　　ہے اب تکلف آگے جلے گا کباب کیا
ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں　　گرداب کیسا موج کہاں ہے حباب کیا
دیکھا پلک اٹھاکے تو پایا نہ کچھ اثر　　اے عمر برق جلوہ گئی تو شتاب کیا
ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ‌خراب کیا

(۷۶۱)

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا　　کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ　　ہائے رے چشم دلبراں کی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہے　　سنتے ہو میرے بدزباں کی ادا
دل چلے جائے ہیں خرام کے ساتھ　　دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا
خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

(۷۶۲)

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا　　چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا
نہ ہوتا میں حسرت میں محتاج گریہ　　جو کچھ آنسوؤں کو پس انداز کرتا

نہ ٹھہرا مرے پاس دل ورنہ اب تک   اسے ایسا ہی میں تو جانباز کرتا
جو جانوں کہ درپے ہے ایسا وہ دشمن   تو کاہے کو الفت سے میں ساز کرتا
تو تمکین سے کچھ نہ بولا وگرنہ   مسیحا صنم ترک اعجاز کرتا
گلوگیر ہی ہوگئی یاوہ گوئی   رہا میں خموشی کو آواز کرتا

زیارت گہ کبک تو ہو بلا سے
تک آ میر کی خاک پہ ناز کرتا

(۷۶۳)[1]

عید آئندہ تک رہے گا گلا   ہوگئی عید تو گلے نہ ملا
ڈوبے لوہو میں دیکھتے سرخار   حیف کوئی بھی آبلہ نہ چھلا
ابر جاتا رہا رہیں بوندیں   اب تو ساقی مجھے شراب پلا[2]

میر افسردہ دل چمن میں پھرا
غنچۂ دل کہیں نہ اس کا کھلا

(۷۶۴)

یہ چوٹ کھائی ایسی دل پر کہ جی گنوایا   یعنی جدائی کا ہم صدمہ بڑا اٹھایا
مدت میں وہ ہوا شب ہم بستر آکے میرا   خوابیدہ طالعوں نے اک خواب سا دکھایا
الجھاؤ پڑ گیا سو سلجھی نہ اپنی اس کی   جھگڑے رہے بہت سے گذرے بہت قضایا
آئینہ رو ہمارا آیا نہ نزع میں بھی   وقت اخیر ان نے کیا خوب منہ چھپایا
اس بے مروتی کو کیا کہتے ہیں بتاؤ   ہم مارے بھی گئے پر وہ نعش پر نہ آیا
وہ روے خوب اب کے ہرگز گیا نہ دل سے   جب گل کھلا چمن میں تب داغ ہم نے کھایا
خلطہ ہمارا اس کا حیرت ہی کی جگہ ہے   ڈھونڈا جہاں ہم اس کو واں آپ کو ہی پایا
طرز نگہ سے اس کی بے ہوش کیا ہوں میں ہی   ان مست انکھڑیوں نے بہتیروں کو سلایا
آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا   خواب عدم سے ہم کو کاہے کے تیں جگایا
باقی نہیں رہا کچھ گھٹتے ہی گھٹتے ہم میں   بیماری دلی نے چنگا بہت بنایا
تونے کہ پاؤں دل سے باہر نہیں رکھا ہے   عیارپن یہ کن نے تیرے تئیں سکھایا

کس دن ملائمت کی اس بت نے میر ہم سے
سختی کھنچے نہ کیونکر پتھر سے دل لگایا

---

(۱) یہ غزل چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ دیوان پنجم میں بھی شامل تھی۔ لہٰذا وہاں سے نکال دی گئی ہے۔ متن یہاں دیوان پنجم کے مطابق رکھا گیا ہے۔ مصحح

(۲) نسخۂ محمود آباد

(۷۶۵)[1]

سمندر کا میں کیوں احساں سہوں گا ۔ نہیں کیا سیل اشک اس پر بہوں گا
نہ تو آوے نہ جاوے بے قراری ۔ یوں ہی اک دن سنا میں مر رہوں گا
ترے غم کے ہیں خواہاں سب نہ کھا غم ۔ کمی کیا ہوگی جو اک میں نہ ہوں گا
نہ وہ آوے نہ جاوے بے قراری ۔ کسو دن میرؔ یوں ہی مر رہوں گا
اگر جیتا رہا میں میرؔ اے یار
تو شب کو موبمو قصہ کہوں گا

(۷۶۶)

رکھتا تھا ہاتھ میں سررشتہ بہت سینے کا ۔ رہ گیا دیکھ رفو چاک مرے سینے کا
اے طپش لوہو پیے میرا جو تو جھوٹ کہے ۔ کس سے یہ قاعدہ سیکھا ہے لہو پینے کا
اس میں حیران ہوں کس کس کا گلہ تجھ سے کروں ۔ بدگمانی کا تغافل کا ترے کینے کا
میرؔ کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

(۷۶۷)

عشق سے دل پہ تازہ داغ جلا ۔ اس سیہ خانے میں چراغ جلا
میرؔ کی گری تم سے اچرج ہے
کس سے ملتا ہے یہ دماغ جلا

ردیف ب

(۷۶۸)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب ۔ مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
جب میں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں ۔ یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک ۔ کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
بخت سیہ نے دیر میں کل یاوری سی کی ۔ تھی دشمنوں سے اس کو لڑائی تمام شب
بیٹھے ہی گذری وعدے کی شب وہ نہ آپھرا ۔ ایذا عجب طرح کی اٹھائی تمام شب

---

(۱) یہ غزل چند الفاظ کی تبدیلی اور تبدیل شدہ مقطع کے ساتھ دیوان پنجم میں بھی درج تھی۔ لہٰذا وہاں سے نکال دی گئی ہے۔ یہاں متن دیوان پنجم کے مطابق ہے۔ مندرج مقطع سے پہلے والا شعر دیوان پنجم میں بطور مقطع شامل تھا۔ مصحح

سناہٹے سے دل سے گذر جائیں سو کہاں
بلبل نے گو کی نالہ‌سرائی تمام شب

تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

(۷۶۹)

داغ ہوں جلتا ہے دل بےطور اب
دیکھیے کیا گل کھلے ہے اور اب

زخم دل غائر ہو پہنچا تا جگر
تم لگے کرنے ہماری غور اب

شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میر کے
اس قلمرو میں ہے ان کا دور اب

(۷۷۰)

وہ جوشش تھی اس کی طرف سے کہاں ہے اب
تیر و کماں ہے ہاتھ میں سینہ نشاں ہے اب

اتنا بھی منھ چھپانا خط آئے پہ وجہ کیا
لڑکا نہیں ہے نام خدا تو جواں ہے اب

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے
سیل بہار آنکھوں سے میری رواں ہے اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
بارگران عشق و دل ناتواں ہے اب

نکلی تھی اس کی تیغ ہوئے خوش نصیب لوگ
گردن جھکائی میں تو سنا یہ اماں ہے اب

زردی رنگ ہے غم پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہے منھ سے ہمارے عیاں ہے اب

پیش از دم سحر مرا رونا لہو کا دیکھ
پھولے ہے جیسے سانجھ وہی یاں سماں ہے اب

نالاں ہوئی کہ یاد ہمیں سب کو دے گئی
گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہے اب

برسوں ہوئے گئے اسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

(۷۷۱)

شبنم سے کچھ نہیں ہے گل و یاسمن میں آب
دیکھ اس کو بھر بھر آوے ہے سب کے دہن میں آب

لو سدھ شتاب فاتحۂ گریہ ناک کی
آیا نہیں ہے دیر سے جوے چمن میں آب

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا
کرتا ہے کام آگ کا ایسی جلن میں آب

تھا گوش زد کہ گوروں میں لگ لگ اٹھے ہے آگ
یاں طل بھرے ہوئے کے سبب ہے کفن میں آب

جی ڈوب جائے دیکھیں جہاں بھر نظر ادھر
تم کہتے ہو نہیں مرے چاہ ذقن میں آب

لب تشنگان عشق کے ہیں کام کے وہ لعل
کیا آپ کو جو ہووے عقیق یمن میں آب

تب قیس جنگلوں کے تئیں آگ دے گیا
ہم بھر چلے ہیں رونے سے اب سارے بن میں آب

کن سوز دل کو میرے بہت روئی رات شمع　　بیرون بزم لائے ہیں بھر بھر لگن میں آب

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
در سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

(۷۷۲)

جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہے اب　　ہر روز دل کو سوز ہے ہر شب تعب ہے اب
سدھ کچھ سنبھالتے ہی وہ مغرور ہوگیا　　ہر آن بے دماغی و ہر دم غضب ہے اب
دوری سے اس کی آہ عجب حال میں ہیں لوگ　　کچھ بھی جو پاس وہ نہ کرے تو عجب ہے اب
طاقت کہ جس سے تاب جفا تھی سو ہوچکی　　تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہے اب
دریا چلا ہے آج تو بوس و کنار کا　　گر جی چلاوے کوئی دوانہ تو ڈھب ہے اب
جاں بخشیاں جو پیشتر از خط کیا کیے　　ان ہی لبوں سے خلق خدا جاں بلب ہے اب
رنجش کی وجہ آگے تو ہوتی بھی تھی کوئی　　روپوش ہم سے یار جو ہے بے سبب ہے اب
نے چاہ وہ اسے ہے نہ مجھ کو ہے وہ دماغ　　جانا مرا ادھر کو بشرط طلب ہے اب

جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہے دن ہے میر
جو شب کو جایئے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

(۷۷۳)

عشاق کے تئیں ہے عجز و نیاز واجب　　ہے فرض عین رونا دل کا گداز واجب
یوں سرفرو نہ لاوے ناداں کوئی وگرنہ　　رہنا نمود میں ہے جیسے نماز واجب
ناسازی طبیعت ایسی پھر اس کے اوپر　　ہے ہر کسو سے مجھ کو ناچار ساز واجب
لڑکا نہیں رہا تو جو کم تمیز ہووے　　عشق و ہوس میں اب ہے کچھ امتیاز واجب

صرفہ نہیں ہے مطلق جان عزیز کا بھی
اے میر تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب

(۷۷۴)

تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب　　میں اٹھ گیا ولے نہ اٹھا بیچ سے حجاب
اس آفتاب حسن کے جلوے کی کس کو تاب　　آنکھیں ادھر کیے سے بھر آتا ہے دوہیں آب
اس عمر برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم　　جو کام پیش آوے تجھے اس میں ہو شتاب
غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ　　یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب
اس موج خیز دہر نے کس کے اٹھائے ناز　　کج بھی ہوا نہ خوب کلہ گوشۂ حباب

یہ بستیاں اجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دل ہوگیا خراب جہاں پھر رہا خراب

بیتابیاں بھری ہیں مگر کوٹ کوٹ کر
خرقے میں جیسے برق ہمارے ہے اضطراب

تک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ
اس درس گہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب

مجنوں نے ریگ بادیہ سے دل کے غم گنے
ہم کیا کریں کہ غم ہیں ہمارے تو بے حساب

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

شاید کہ ہم کو بوسہ بہ پیغام دست دے
پھرتا ہے بیچ میں تو بہت ساغر شراب

ہے ان بھوؤں میں خال کا نقطہ دلیل فہم
کی ہے سمجھ کے بیت کسو نے یہ انتخاب

گذرے ہے میر لوٹتے دن رات آگ میں
ہے سوز دل سے زندگی اپنی ہمیں عذاب

(۷۷۵)

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب
ہم برے ہی سہی بھلا صاحب

سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے تم
اب تو ہیں حرف آشنا صاحب

نہ دیا رحم تک بتوں کے تئیں
کیا کیا ہائے یہ خدا صاحب

بندگی ایک اپنی کیا کم ہے
اور کچھ تم سے کہیے کیا صاحب

مہرافزا ہے منھ تمھارا ہی
کچھ غضب تو نہیں ہوا صاحب

خط کے پھٹنے کا تم سے کیا شکوہ
اپنے طالع کا یہ لکھا صاحب

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

شوق رخ یاد لب غم دیدار
جی میں کیا کیا مرے رہا صاحب

بھول جانا نہیں غلام کا خوب
یاد خاطر رہے مرا صاحب

کن نے سن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

(۷۷۶)

عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کریے اب
جہاں تک آن بیٹھے ہم کہا آرام کریے اب

ہزاروں خواہش مردہ نے سر دل سے نکالا ہے
قیامت جی پہ ہے دیدار کو تک عام کریے اب

بلا آشوب تھا گو جان پر آغاز الفت میں
ہوا سو تو ہوا اندیشۂ انجام کریے اب

بہت کی یاصنم گوئی ہوئے مشہور کافر ہم
وظیفہ کوئی دن اپنا خدا کا نام کریے اب

زباں خامہ کے جلتے ہی ہزاروں اشک گرتے ہیں
حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کریے اب

کہاں تک کام ناکام اس جفا جو کے لیے مریے
اگر تلوار ہاتھ آوے تو اپنا کام کریے اب

فسانہ شاخ در شاخ اس نہال حسن کے غم کا
کہاں اے میرؔ بے برگ و نوا اتمام کریے اب

(۷۷۷)

برقع میں کیا چھپیں وے ہوویں جنھوں کی یہ تاب
رخسار تیرے پیارے ہیں آفتاب مہتاب

انگل ہمیں کو ان نے آخر ہدف بنایا
ہرچند ہم بلاکش تھے ایک تیر پرتاب

کچھ قدر میں نہ جانی غفلت سے رفتگاں کی
آنکھیں سی کھل گئیں اب جب صحبتیں ہوئیں خواب

ان بن ہی کے سبب ہیں اس لالچی سے سارے
یاں ہے فقیری محض واں چاہیے ہے اسباب

اس بحر حسن کے تیں دیکھا ہے آپ میں کیا
جاتا ہے صدقے اپنے جو لحظہ لحظہ گرداب

اچرج ہے یہ کہ مطلق کوئی نہیں ہے خواہاں
جنس وفا اگرچہ ہے گی بہت ہی کیاب

تھی چشم یہ رکے گا پلکوں سے گریہ لیکن
ہوتی ہے بند کوئی تنکوں سے راہ سیلاب

تو بھی تو مختلط ہو سبزے میں ہم سے ساقی ق
لے کر بغل میں ظالم مینائے بادۂ ناب

نکلی ہیں اب کے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

کیا لعل لب کسو کے اے میرؔ چت چڑھے ہیں
چہرے پہ تیرے ہر دم بہتا رہے ہے خوناب

ردیف ت

(۷۷۸)

دیر کچھ کھنچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا-اپنا جو ہوا اس سے سو وہ بات کی بات

گفتگو شاہد و مے سے ہے نہ غیبت نہ گلہ
خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

سن کے آواز سگ یار ہوئے ہم خاموش
بولتے واں ہیں جہاں ہووے مساوات کی بات

منھ ادھر اور سخن زیرلبی غیر کے ساتھ
اس فریبندہ کی ناگفتنی ہے گھات کی بات

اس لیے شیخ ہے چپکا کہ پڑے شہر میں شور
ہم سمجھتے ہیں یہ شیادی و طامات کی بات

یہ کس آشفتہ کی جمعیت دل تھی منظور
بال بکھرے ترے منھ پر کہیں ہیں رات کی بات

گفتگو دشمنوں سے اس ماہ کے کریے اے میرؔ
کاہش افزا ہے کروں اس کی اگر ذات کی بات

(۷۷۹)

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت   سو التفات کم ہے دل آزاریاں بہت
دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراط اشتیاق   لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت
جب تک ملی جلی سی جفائیں تھیں اٹھ سکیں   کرنے لگے ہو اب تو ستمگاریاں بہت
آزار میں تو عشق کے جاتا ہے بھول جی   یوں تو ہوئیں تھیں یاد میں بیماریاں بہت
شکوہ خراب ہونے کا کیا چاہیے میر
ایسی تو اے عزیز ہیں یاں خواریاں بہت

(۷۸۰)

یاد ایامے کہ ہنگامہ رہا کرتا تھا رات
شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات

(۷۸۱)

کام کیا تھا جیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں   سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات
جن دنوں کھینچا تھا سر اس بادشاہ حسن نے   ہر گلی میں اک فقیر اس کو دعا کرتا تھا رات
اب جہاں کچھ بات چھیڑی سوچ لایا پیش ازیں   میں کہا کرتا غم دل وہ سنا کرتا تھا رات
ہجر میں کیا کیا سمیں دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں   زرد رخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات
کیا کہوں پھر کیسے کیسے دن دکھاتا سالہا   وہ سخن نشنو جو ٹک میرا کہا کرتا تھا رات
دیکھنے والے ترے دیکھے میں سب اے رشک شمع   جوں چراغ وقف دل سب کا جلا کرتا تھا رات
بعد میرے اس غزل پر بھی بہت روویں گے لوگ   میں بھی ہر ہر بیت پر اس کی بکا کرتا تھا رات
دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہل روزگار
میر اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات

(۷۸۲)

کیا پوچھتے ہو آہ مرے جنگجو کی بات   گویا وفا ہے عہد میں اس کے کبھو کی بات
اس باغ میں نہ آئی نظر خرمی مری   گر سبز بھی ہوا ہوں تو جیسے کسو کی بات
آئینہ پانی پانی رہا اس کے سامنے   کہیے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات
سر گل نے پھر جھکا کے اٹھایا نہ شرم سے   گلزار میں چلی تھی کہیں اس کے رو کی بات
حرمت میں مے کی کہنے سے واعظ کے ہے فتور   کیا اعتبار رکھتی ہے اس پوچ گو کی بات

ہم سوختوں میں آتش سرکش کا ذکر کیا
چل بھی پڑی ہے بات تو اس تندخو کی بات

کیا کوئی زلف یار سے حرف و سخن کرے
رکھتی ہے میرؔ طول بہت اس کے مو کی بات

(۷۸۳)

سنتا نہیں اگرچہ ہمارا نگار بات
پر منھ پہ آ ہی جاتی ہے بے اختیار بات

بلبل کے بولنے سے ہے کیوں بے دماغ گل
آپس میں یوں تو ہوتی ہے یارو ہزار بات

منھ تک رہو جو ہو وہ فریبندہ حرف زن
اس تھوڑے سن و سال میں یہ پیچدار بات

بوسہ دے چپکے لب کا کہ تب کچھ مزہ نہیں
پاوے گی سارے شہر میں جب اشتہار بات

ہے کس کی صوت انکر اصوات واعظا
کب آدمی کی جنس کرے ہے پکار بات

آہو کو اس کی چشم سخن گو سے مت ملا
شہری سے کرسکے ہے کہیں بھی گنوار بات

یوں بار گل سے اب کے جھکے ہیں نہال باغ
جھک جھک کے جیسے کرتے ہیں دوچار یار بات

آزردہ دل کو حرف پہ لانے کا لطف کیا
کرتی ہے خونچکاں مرے لب سے گذار بات

مرجاں کوئی کہے ہے کوئی ان لبوں کو لعل
کچھ رفتہ رفتہ پا ہی رہے گی قرار بات

یوں چپکے چپکے میرؔ تلف ہوگا کب تلک
کچھ ہووے بھڑ کر اس سے بھی کر ایک بار بات

(۷۸۴)

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمے نہ کبھو منھ پر آئی بات

جانے نہ مجھ کو جو یہ تصنع تو اس سے کر
تس پر بھی تو چھپی نہیں رہتی بنائی بات

لگ کر تدرو رہ گئے دیوار باغ سے
رفتار کی جو تیری صبا نے چلائی بات

کہتے تھے اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک
وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات

اب تو ہوئے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
واں تونے کچھ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات

بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہے ہے کسو کی اڑائی بات

بھڑکا تھا رات دیکھ کے وہ شعلہ‌خو مجھے
کچھ روسیہ رقیب نے شاید لگائی بات

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات

اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

خط لکھتے لکھتے میرؔ نے دفتر کیے رواں
افراط اشتیاق نے آخر بڑھائی بات

(۷۸۵)

بے زباں زد جو سکندر ہو چکا لشکر سمیت
سر بھی اس کا کھپ گیا آخر کو یاں افسر سمیت

چشمے آب شور کے نکلا کریں گے واں جہاں
رکھیں گے مجھ تلخ کام غم کو چشم تر سمیت

ہم اٹھے روتے تو لی گردوں نے پھر راہ گریز
بیٹھ جاوے گا یہ ماتم خانہ بام و در سمیت

مستی میں شرم گنہ سے میں جو رویا ڈاڑھ مار
گر پڑا بےخود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت

بعث اپنا خاک سے ہوگا گر اس شورش کے ساتھ
عرش کو سر پر اٹھالیں گے ہم محشر سمیت

کب تلک یوں لوہو پیتے ہاتھ اٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھرلی ہم نے کل خنجر سمیت

گنج قاروں کا سا یاں کس کے کنے تھا سو تو میر
خاک میں ملتا ہے اب تک اپنے مال و زر سمیت

(۷۸۶)

دیکھیے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت
کوفت گذرے ہے فراق یار میں جی پر بہت

دل کی دیکھی ہے خرابی کثرت اندوہ سے
جیسے رہ پڑتا ہے دشمن کا کہیں لشکر بہت

ہم نشیں جا بیٹھ محنت کش کوئی دل چاہیے
عشق تیرا کام ہے تو ہے بغل پرور بہت

بس نہیں مجھ ناتواں کا ہائے جو کچھ کرسکوں
مدعی پرچک سے اس کی پڑ گیا ہے در بہت

سخت کر جی کیونکے یک باری کریں ہم ترک شہر
ان گلی کوچوں میں ہم نے کھائے ہیں پتھر بہت

دیکھ روے زرد پر بھی میرے آنسو کی ڈھلک
اے کہ تونے دیکھی ہے غلطانی گوہر بہت

ہم نفس کیا مجھ کو تو رویا کرے ہے روز و شب
رہ گئے ہیں مجھ سے کوے یار میں مرکر بہت

کم مجھی سے بولنا کم آنکھ مجھ پر کھولنا
اب عنایت یار کی رہتی ہے کچھ ادھر بہت

کیا سبب ہے اب مکاں پر جو کوئی پاتا نہیں
میر صاحب آگے تو رہتے تھے اپنے گھر بہت

(۷۸۷)

ملامت گر نہ مجھ کو کر ملامت
جلے کو اور تو اتنا جلا مت

گلے مل عید قرباں کو سبھوں کے
ہمارا آہ تم کاٹو گلا مت

تری ناآشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت

بہت رونے نے رسوا کر دکھایا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

کبھو تلوار وہ کھینچے ہے اے میر
لڑی قسمت تو سر کو ٹک ہلا مت

ردیف چ

(۷۸۸)

آگ سا تو جو ہوا اے گل تر آن کے بیچ — صبح کی باؤ نے کیا پھونک دیا کان کے بیچ
ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا — اک خلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ
باوجود ملکیت نہ ملک میں پایا — وہ تقدس کہ جو ہے حضرت انسان کے بیچ
پاسباں سے ترے کیا دور جو ہو ساز رقیب — ہے نہ اک طرح کی نسبت سگ و دربان کے بیچ
جیسی عزت مری دیواں میں امیروں کے ہوئی — ویسی ہی ان کی بھی ہوگی مرے دیوان کے بیچ
ساتھ ہے اس سر عریاں کے یہ وحشت کرنا — پگڑی الجھی ہے مری اب تو بیابان کے بیچ
وے پھری پلکیں اگر کھب گئیں جی میں تو وہیں — رخنے پڑ جائیں گے واعظ ترے ایمان کے بیچ
کیا کہوں خوبی خط دیکھ ہوئی بند آواز — سرمہ گویا کہ دیا ان نے مجھے پان کے بیچ
گھر میں آئینے کے کب تک تمھیں نازاں دیکھوں — کبھو تو آؤ مرے دیدۂ حیران کے بیچ

میرزائی کا کب اے میرؔ چلا عشق میں کام
کچھ تعب کھینچنے کو تاب تو ہو جان کے بیچ

(۷۸۹)

عشق میں اے طبیب ہاں ٹک سوچ — پاے جاں درمیاں ہے یاں ٹک سوچ
بے تأمل اداے کیں مت کر — قتل میں میرے مہرباں ٹک سوچ
سرسری مت جہاں سے جا غافل — پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہے کیوں یاں تو — یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن — یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گل [illegible] و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

فائدہ سر جھکے کا شیب میں میرؔ
پیری سے آگے اے جواں ٹک سوچ

(۷۹۰)

دل کھو گیا ہوں میں یہیں دیوانہ پن کے بیچ — تم بھی تو دیکھو زلف شکن در شکن کے بیچ
کیا جانے دل میں چاؤ تھے کیا کیا دم وصال — مجبور اس کا تھا ہمہ حسرت کفن کے بیچ
کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز — عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ

سن اے جنوں کہ مجھ میں نہیں کچھ سواے دم
تار ایک رہ گیا ہے یہی پیرہن کے بیچ

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکھن کے بیچ

ستھرائی اور نازکی گلبرگ کی درست
پر ویسی بو کہاں کہ جو ہے اس بدن کے بیچ

بلبل خموش و لالہ و گل دونوں سرخ و زرد
ق شمشاد محو بے کلی اک نسترن کے بیچ

کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ

یا ساتھ غیر کے ہے تمھیں ویسی بات چیت
ق سو سو طرح کے لطف ہیں اک اک سخن کے بیچ

یا پاس میرے لگتی ہے چپ ایسی آن کر
گویا زباں نہیں ہے تمھاری دہن کے بیچ

فرہاد و قیس و میر یہ آوارگان عشق
یوں ہی گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

(۷۹۱)

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ
دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ

کس کی خوبی کے طلبگار ہیں عزت طلباں
خرتے بکنے کو چلے آتے ہیں بازار کے بیچ

خضر و عیسیٰ کے تئیں نام کو جیتا سن لو
جان ہے ورنہ کب اس کے کسو بیمار کے بیچ

اگلے کیا بیچ تمھارے نہ تھے بس عاشق کو
بال جو اور گھرنے لگے دستار کے بیچ

عشق ہے جس کو ترا اس سے تو رکھ دل کو جمع
زندگی کی نہیں امید اس آزار کے بیچ

ہم بھی اب ترک وفا ہی کریں گے کیا کریے
جنس یہ کھپتی نہیں آپ کی سرکار کے بیچ

دیدنی دشت جنوں ہے کہ پھپھولے پا کے
میں نے موتی سے پرو رکھے ہیں ہر خار کے بیچ

پردہ اٹھتا ہے تو پھر جان پر آ بنتی ہے
خوبی عاشق کی نہیں عشق کے اظہار کے بیچ

اس زمیں میں غزل اک اور بھی موزوں کر میر
پاتے ہیں زور ہی لذت تری گفتار کے بیچ

(۷۹۲)

آتی ہے خون کی بو دوستی یار کے بیچ
جی لیے ان نے ہزاروں کے یوں ہی پیار کے بیچ

حیف وہ کشتہ کہ سو رنج سے آوے تجھ تک
اور رہ جائے تری ایک ہی تلوار کے بیچ

گرچہ چھپتی نہیں ہے چاہ پہ رہ منکر پاک
جی ہی دینا پڑے ہے عشق کے اقرار کے بیچ

نالہ شب آوے قفس سے تو گل اب اس پہ نہ جا
یہی ہنکار سی ہے مرغ گرفتار کے بیچ

انس کرتا تو ہے وہ مجھ کو خرد باختہ جان
جیت میں اپنی نکالی ہے اسی ہار کے بیچ

چال کیا کبک کی اک بات چلی آتی ہے
لطف نکلے ہیں ہزاروں تری رفتار کے بیچ

تو جو جاتا ہے چمن میں تو تماشے کے لیے
موسم رفتہ بھی پھر آوے ہے گلزار کے بیچ

داغ چیچک نہ اس افراط سے تھے مکھڑے پر
کن نے گاڑی ہیں نگاہیں ترے رخسار کے بیچ

کھنچے شمشیرزنی سے کف نازک میں ہیں
یہ جگرداری تھی کس خوں کے سزاوار کے بیچ

توبہ صد بار کہ مستی میں پرو ڈالے ہیں
دانے تسبیح کے میں رشتۂ زنار کے بیچ

حلقۂ گیسوے خوباں پہ نہ کر چشم سیاہ
میر امرت نہیں ہوتا دہن مار کے بیچ

ردیف ح

(۷۹۳)

آنے کی اپنے کیا کہیں اس گلستاں کی طرح
ہر گام پر تلف ہوئے آب رواں کی طرح

کیا میں ہی چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں
اچھی لگے ہے سب کو مرے بد زباں کی طرح

آگے تو بےطرح نہ کبھو کہتے تھے ہمیں
اب تازہ یہ نکالی ہے تم نے کہاں کی طرح

یہ شور دل‌خراش کب اٹھتا تھا باغ میں
سیکھے ہے عندلیب بھی ہم سے فغاں کی طرح

کرتے تو ہو ستم پہ نہیں رہنے کے حواس
کچھ اور ہوگئی جو کسو خستہ‌جاں کی طرح

نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا
کہتے ہیں ساری عرش میں ہے اس مکاں کی طرح

مرغ چمن نے زور رلایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی شب اک روضہ‌خواں کی طرح

لگ کر گلے سے اس کے بہت میں بکا کیا
ملتی تھی سرو باغ میں کچھ اس جواں کی طرح

جو کچھ نہیں تو بجلی سے ہی پھول پڑ گیا
ڈالی چمن میں ہم نے اگر آشیاں کی طرح

یہ باتیں رنگ رنگ ہماری ہیں ورنہ میر
آجاتی ہے کلی میں کبھو اس دہاں کی طرح

(۷۹۴)

دور گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح
بھر نہ آویں کیونکے آنکھیں میری پیمانے کی طرح

آگیا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار
اس کی آمد میں ہے ساری فصل گل آنے کی طرح

چشمک انجم میں اتنی دلکشی آگے نہ تھی
سیکھ لی تاروں نے اس کی آنکھ جھمکانے کی طرح

ہم گرفتاروں سے وحشت ہی کرے ہے وہ غزال
کوئی تو بتلاؤ اس کے دام میں لانے کی طرح

ایک دن دیکھا جو ان نے بید کو تو کہہ اٹھا
اس شجر میں کتنی ہے اس میرے دیوانے کی طرح

آج کچھ شہر وفا کی کیا خرابی ہے نئی
عشق نے مدت سے یاں ڈالی ہے ویرانے کی طرح

پیچ سا کچھ ہے کہ زلف و خط سے ایسا ہے بناؤ
ہے دل صدچاک میں بھی ورنہ سب شانے کی طرح

کس طرح جی سے گذر جاتے ہیں آنکھیں موند کر
دیدنی ہے دردمندوں کے بھی مر جانے کی طرح

ہے اگر ذوق وصال اس کا تو جی کھو بیٹھیے
ڈھونڈ کر اک کاڑھیے اب اس کے بھی پانے کی طرح

یوں بھی سر چڑھتا ہے اے ناصح کوئی مجھ سے کہ ہائے — ایسے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح

جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کڑھنے میں میر
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

ردیف خ

(۷۹۵)

اگرچہ لعل بدخشاں میں رنگ ڈھنگ ہے شوخ — پہ تیرے دونوں لبوں کا بھی کیا ہی رنگ ہے شوخ
کبھو تو نمو چلا کر ستم کھنچیں کب تک — کماں کے طور سے تو سخت خانہ جنگ ہے شوخ
سکھائیں کن نے تجھے آہ ایسی اچپلیاں — کہ برق پر تری شوخی سے کام تنگ ہے شوخ
بغیر بادہ تو یوں گرم آکے کب ملتا — نشہ ہے زور تجھے اس کی یہ ترنگ ہے شوخ
جگر میں کس کے ترے ہاتھ سے نہیں سوراخ — ملک تلک تو ترا زخمی خدنگ ہے شوخ
صنم فراق میں میں تیرے کچھ تو کر رہتا — پہ کیا کروں کہ مرا ہاتھ زیر سنگ ہے شوخ
خیال چاہ کے سررشتے کا تجھے کب ہے — ترے تو ہاتھ میں شام و سحر پتنگ ہے شوخ
ابھی تو آنے میں عرصہ ہے کچھ قیامت کے — قد بلند کو کھینچ اپنے کیا درنگ ہے شوخ

برآر میر سے کس طرح تیری صحبت ہو
تجھے تو نام سے اس خستہ جاں کے ننگ ہے شوخ

ردیف د

(۷۹۶)

رہیے بغیر تیرے اے رشک ماہ تا چند — آنکھوں میں یوں ہماری عالم سیاہ تا چند
اب دیکھنے میں پیارے تک تو بڑھا عنایت — کوتاہ تر پلک سے ایدھر نگاہ تا چند
خط سے جو ہے گرفتہ وہ مہ نہیں نکلتا — مانند چشم اختر ہم دیکھیں راہ تا چند
عمر عزیز ساری منت ہی کرتے گذری — بے جرم آہ رہیے یوں عذرخواہ تا چند
یاں ناز و سرکشی سے کیا دیکھتا نہیں ہے — کج اس چمن میں ٹھہری گل کی کلاہ تا چند
جب مہ ادھر سے نکلا جانا وہ گھر سے نکلا — رکھتا ہے داغ دیکھیں یہ اشتباہ تا چند

ایذا بھی کھینچ چکیے گر جو ہفتے عشرے کی ہو
اس طرح مرتے رہیے اے میر آہ تا چند

(۷۹۷)

تجھ بن اے نوبہار کے مانند
چاک ہے دل انار کے مانند

پہنچی شاید جگر تک آتش عشق
اشک ہیں سب شرار کے مانند

کو دماغ اس کی رہ سے اٹھنے کا
بیٹھے اب ہم غبار کے مانند

کوئی نکلے کلی تو لالے کی
اس دل داغدار کے مانند

سرو کو دیکھ غش کیا ہم نے
تھا چمن میں وہ یار کے مانند

ہار کر شب گلے پڑے اس کے
ہم بھی پھولوں کے ہار کے مانند

برق تڑپی بہت ولے نہ ہوئی
اس دل بے قرار کے مانند

ان نے کھینچی تھی صیدگہ میں تیغ ق
برق ابر بہار کے مانند

اس کے گھوڑے کے آگے سے نہ ٹلے
ہم بھی دبلے شکار کے مانند

زخم کھا بیٹھیو جگر پر مت ق
تو بھی مجھ دل فگار کے مانند

اس کی سرتیز ہر پلک ہے میر
خنجر آبدار کے مانند

(۷۹۸)

آواز ہماری سے نہ رک ہم ہیں دعا یاد
آوے گی بہت ہم بھی فقیروں کی صدا یاد

ہر آن وہ انداز ہے جس میں کہ کھپے جی
اس مخترع جور کو کیا کیا ہے ادا یاد

کیا صحبتیں اگلی گئیں خاطر سے ہماری
اپنی بھی وفا یاد ہے اس کی بھی جفا یاد

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت تھیں
اس نسخے کی کوئی نہ رہی حیف دوا یاد

کیا جائے کبھی بوس لب یار کی لذت
جب تک جئیں گے ہم کو رہے گا وہ مزہ یاد

جی بھول گیا دیکھ کے چہرہ وہ کتابی
ہم عصر کے علامہ تھے پر کچھ نہ رہا یاد

سب غلطی رہی بازی طفلانہ کی یک سو
وہ یاد فراموش تھے ہم کو نہ کیا یاد

کعبے تو گئے بھول کے ہم دیر کا رستہ
آتا تھا ولے راہ میں ہر گام خدا یاد

اک لطف کے شرمندہ نہیں میر ہم اس سے
گو یاں سے گئے ان نے بہت ہم کو کیا یاد

(۷۹۹)

اسیر کر کے نہ لی تو نے تو خبر صیاد
اڑا کیے مرے پرکالۂ جگر صیاد

پھریں گے لوٹتے صحن چمن میں باؤ کے ساتھ
موئے گئے بھی مرے مشت بال و پر صیاد

رہے گی ایسی ہی گر بے کلی ہمیں اس سال
تو دیکھیو کہ رہے ہم قفس میں مر صیاد

چمن کی باؤ کے آتے خبر نہ اتنی رہی
کہ میں کدھر ہوں کدھر ہے قفس کدھر صیاد

شکستہ بالی کو چاہے تو ہم سے ضامن لے
شکار موسمِ گل میں ہمیں نہ کر صیاد
ہوا نہ وا درِ گلزار اپنے ڈھب سے کبھو
کھلا سو منھ پہ ہمارے قفس کا در صیاد
سنا ہے بھڑکی ہے اب کی بہت ہی آتشِ گل
چمن میں اپنے بھی ہیں خار و خس کے گھر صیاد
لگی بہت رہیں چاکِ قفس سے آنکھیں لیک
پڑا نہ اب کے کوئی پھول گل نظر صیاد
اسیر میرؔ نہ ہوتے اگر زباں رہتی
ہوئی ہماری یہ خوش خوانی سحر صیاد

(۸۰۰)

لڑ کے پھر آئے ڈر گئے شاید
بگڑے تھے کچھ سنور گئے شاید
سب پریشاں دلی میں شب گذری
بال اس کے بکھر گئے شاید
کچھ خبر ہوتی تو نہ ہوتی خبر
صوفیاں بے خبر گئے شاید
ہیں مکان و سرا و جا خالی
یار سب کوچ کر گئے شاید
آنکھ آئینہ رو چھپاتے ہیں
دل کو لے کر مکر گئے شاید
لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا
زخم اب دل کے بھر گئے شاید
اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں
حضرت خضر مر گئے شاید
بے کلی بھی قفس میں ہے دشوار
کام سے بال و پر گئے شاید
شور بازار سے نہیں اٹھتا
رات کو میرؔ گھر گئے شاید

(۸۰۱)

بنی تھی کچھ اک اس سے مدت کے بعد
سو پھر بگڑی پہلی ہی صحبت کے بعد
جدائی کے حالات میں کیا کہوں
قیامت تھی ایک ایک ساعت کے بعد
موا کوہکن بے ستوں کھود کر
یہ راحت ہوئی ایسی محنت کے بعد
لگا آگ پانی کو دوڑے ہے تو
یہ گرمی تری اس شرارت کے بعد
کہے کو ہمارے کب ان نے سنا
کوئی بات مانی سو منت کے بعد
سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو
لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد
نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

ردیف ر

(۸۰۲)

رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر — لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زماں زمیں پر
آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی — ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر
میں مشت خاک یارب بارگراں غم تھا — کیا کہیے آ پڑا ہے اک آسماں زمیں پر
آنکھیں ہی بچھ رہی ہیں لوگوں کی تیری رہ میں — ٹک دیکھ کر قدم رکھ اے کام جاں زمیں پر
خاک سیہ سے یکساں ہر ایک ہے کہے تو — مارا اٹھا فلک نے سارا جہاں زمیں پر
چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری — جوں ابر ہم نہ روئے اس بن کہاں زمیں پر
آتا نہ تھا فرو سر جن کا کل آسماں سے — ہیں ٹھوکروں میں ان کے آج استخواں زمیں پر
جو کوئی یاں سے گذرا کیا آپ سے نہ گذرا — پانی رہا کب اتنا ہوکر رواں زمیں پر
پھر بھی اٹھالی سر پر تم نے زمیں سب آکر — کیا کیا ہوا تھا تم سے کچھ آگے یاں زمیں پر
کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجز واں تکبر — وے آسمان پر ہیں میں ناتواں زمیں پر
پست و بلند یاں کا ہے اور ہی طرف سے — اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر
قصر جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے — شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
یاں خاک سے انھوں کی لوگوں نے گھر بنائے — آثار ہیں جنھوں کے اب تک عیاں زمیں پر

کیا سر جھکا رہے ہو میرؔ اس غزل کو سن کر
بارے نظر کرو ٹک اے مہرباں زمیں پر

(۸۰۳)

کیا کیا نہ ہم نے کھینچے آزار تیری خاطر — اب ہوگئے ہیں آخر بیمار تیری خاطر
غیروں کی بے دماغی بیتابی چھاتی داغی — یہ سب ستم اٹھائے اے یار تیری خاطر
کیا جانیے کہ ہے تو کیا جنس بیش قیمت — جاتے ہیں بگڑی جاے بازار تیری خاطر
اک بار تو نے آکر خاطر نہ رکھی میری — میں جی سے اپنے گذرا سو بار تیری خاطر
میں کیا کہ آہ کافر دیں کے اکابروں نے — قشقے لگائے پہنے زنار تیری خاطر
گو دل دھسک ہی جاوے آنکھیں ابل ہی آویں — سب اونچ نیچ کی ہے ہموار تیری خاطر
ایک آن تیرے ابرو ایدھر جھکے نہ پائے — سو سو میں میں نے کھینچی تلوار تیری خاطر
کیا چیز ہے تو پیارے مفلس ہیں داغ تیرے — پیسے لیے پھرے ہیں زردار تیری خاطر

تجھ سے دوچار ہونا پھر آہ بن نہ آیا
دی جان میرؔ جی نے ناچار تیری خاطر

(۸۰۴)

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذار
کہیو ہم صحرانوردوں کا تمامی حال زار

خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

طائر خوش زمزمہ کنج قفس میں ہے خموش
چہچہے چہیاں کریں ہیں صحن گلشن میں ہزار

برگ گل سے بھی کیا نہ ایک نے ٹک ہم کو یاد
نامہ و پیغام و پرسش بے مراتب درکنار

بے خلش کیونکر نہ ہو گرم سخن گلزار میں
میں قفس میں ہوں کہ میرا تھا دلوں میں خارخار

بلبل خوش لہجہ کے جائے پہ گو غوغائیاں
طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار

طائران خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے
شور سے ان کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار

شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی
شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے انھوں کا اشتہار

کیا کہوں سوے چمن ہوتا جو میں سرگرم گشت
پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار

شور سن سن کر غزل خوانی کا میری ہم صفیر
غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگ شاخسار

خوش نوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش
جن کو میں کرتا مخاطب ان کو ہوتا افتخار

بعضوں کو رشک قبول خاطر و لطف سخن
بعضوں کا سینہ فگار و بعضوں کا دل داغدار

ایکوں کے ہونٹوں کے اوپر آفریں استاد تھا
ایک کہتے تھے رسوخ دل ہے اپنا استوار

ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذات سامی ہی کو ہم سب خاکسار

نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم
بیٹھ کر کہتے تھے منھ پر میرے بعضے بعضے یار

بندگی ہے خدمت عالی میں ہم کو دیر سے
کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار

سو نہ خط ان کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک
واہ وا ہے رابطہ رحمت ہے یہ اخلاص و پیار

رفتہ رفتہ ہوگئیں آنکھیں مری دونوں سفید
بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار

لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز
تو بھی ہوتا اس دل بے تاب و طاقت کو قرار

سو تو یک نوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس
ان ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار

جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کا ہے کا پاس
آفریں صد آفریں اے مردمان روزگار

اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں
گو چمن میں خوش کی تم نے میری جاے نالہ وار

ہے مثل مشہور یہ عمر سفر کوتاہ ہے
طالع برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار

اک پر افشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا
سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہوویں گی فگار

منھ پہ آویں گے سخن آلودۂ خون جگر
کیونکہ یاران زماں سے چاک ہے دل جوں انار

لب سے لے کر تا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے — لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار
چپ بھلی گو تلخ کامی کھینچنی اس میں پڑے — بیت بحثی طبع نازک پر ہے اپنی ناگوار
آج سے کچھ بے حسابی جور کن مردم نہیں — ان سے اہل دل سدا کھینچے ہیں رنج بے شمار
بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میرؔ — کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار

کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں
بے تہی کرتے رہیں گے حاسدان نابکار

(۸۰۵)

آغشتہ خون دل سے سخن تھے زبان پر — رکھے نہ تم نے کان تک اس داستان پر
کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز — آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
یہ دلبری کے فن و فریب اتنی عمر میں — جھنجھلاہٹ اب تو آوے ہے اس کے سیان پر
محتاج کر خدا نہ نکالے کہ جوں ہلال — تشہیر کون شہر میں ہو پارہ نان پر
دیکھا نہ ہم نے چھوٹ میں یاقوت کی کبھو — تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگ پان پر
کیا رہروان راہ محبت ہیں طرفہ لوگ — اغماض کرتے جاتے ہیں جی کے زیان پر
پہنچا نہ اس کی داد کو مجلس میں کوئی رات — مارا بہت پتنگ نے سر شمع دان پر
یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی — ٹھہرو بقدر یک مژہ تم اس مکان پر
بزاز کے کو دیکھ کے خرقے بہت پھٹے — بیٹھا وہ اس قماش سے آکر دکان پر

موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میرؔ جی
رہ جائے کوئی بات کسو کی زبان پر

(۸۰۶)

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر — اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان پر
کچھ ان دنوں اشارۂ ابرو ہیں تیز تیز — کیا تم نے پھر رکھی ہے یہ تلوار سان پر
تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو — اس مشت خاک کا ہے دماغ آسمان پر
کس پر تھے بے دماغ کہ ابرو بہت ہے خم — کچھ زور سا پڑا ہے کہیں اس کمان پر
کس رنگ راہ پائے نگاریں سے تو چلا — ہونے لگے ہیں خون قدم کے نشان پر
چرچا سا کر دیا ہے مرے شور عشق نے — مذکور اب بھی ہے یہ ہر اک کی زبان پر
پی پی کے اپنا لوہو رہیں گو کہ ہم ضعیف — جوں رینگتی نہیں ہے انھوں کے تو کان پر
یہ وہم ہے کہ اور کا ہے میرے تیں خیال — تو مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان پر

کیفیتیں ہزار ہیں اس کامِ جاں کے بیچ — دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر

دامن میں آج میر کے داغِ شراب ہے
تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

(۸۰۷)

مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر — غمزے ہیں بلا ان کو نہ سنکار دیا کر
آئینے کی مشہور پریشاں نظری ہے — تو سادہ ہے ایسوں کو نہ دیدار دیا کر
سو بار کہا غیر سے صحبت نہیں اچھی — اس جیف کو مجلس میں نہ تو بار دیا کر
کیوں آنکھوں میں سرمے کا تو دنبالہ رکھے ہے — مت ہاتھ میں ان مستوں کے تلوار دیا کر

کچھ خوب نہیں اتنا ستانا بھی کسو کا
ہے میر فقیر اس کو نہ آزار دیا کر

(۸۰۸)

طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اور — بے لطفیاں کرو ہو یہ تس پر غضب ہے اور
ہر چند چپ ہوں لیک مرا حال ہے عجب — احوال پرسی تو نہ کرے تو عجب ہے اور
آنکھ اس کی اس طرح سے نہیں پڑتی تک ادھر — اب خوب دیکھتے ہیں تو چتون کا ڈھب ہے اور
کیا کہیے حال دل کا جدائی کی رات میں — گذرے ہے کب کہانی کہے سے یہ شب ہے اور
دل لے چکے دکھا کے رخِ خوب کو تبھی — اب منہ چھپا جو بیٹھے یہ حسنِ طلب ہے اور
اس دل لگے کے روگ کو نسبت مرض سے کیا — اپنا یہ جلتے رہنا ہے کچھ اور تب ہے اور
طور اگلے تیرے ملتے نہیں اس طرح سے تک — وہ اور کچھ تھا ہم سے تو پیارے یہ اب ہے اور
کیا بات تیری اے ہمہ عیاری و فریب — آنکھیں کہیں ہیں اور سخن زیرِ لب ہے اور

اسبابِ مرگ کے تو مہیا ہیں سارے میر
شاید کہ زندگانی کا اپنی سبب ہے اور

(۸۰۹)

آ ہم نشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر — جاتی ہیں یوں ہی ناداں جانیں ترس ترس کر
فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا — چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر
ہم موے ناتواں تھے سو ہو چکے ہیں کب کے — نکلے ہو تم پیارے کس پر کمر کو کس کر
جی رک گیا کہیں تو پھر ہوئے گا اندھیرا — مت چھیڑ ابر مجھ کو یوں ہی برس برس کر
کیا ایک تنگ میں ہوں اس زلفِ پرشکن سے — اس دام میں موئے ہیں بہتیرے صید پھنس کر

اک جمع کے سر اوپر روز سیاہ لایا — پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھڑس کر
اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے — ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر
صیاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں ٹک — دیوار باغ کو تو بارے درِ قفس کر

بے بس ہے میر تجھ بن رہتا نہیں دل اس کا
ٹک تو بھی اے ستم جو جور و ستم کو بس کر

(۸۱۰)

آئی ہے اس کے کوچے سے ہوکر صبا کچھ اور — کیا سر میں خاک ڈالتی ہے اب ہوا کچھ اور
تدبیر دوستوں کی مجھے نفع کیا کرے — بیماری اور کچھ ہے کریں ہیں دوا کچھ اور
مستان عشق و اہل خرابات میں ہے فرق — مے خوارگی کچھ اور ہے یہ نشہ تھا کچھ اور
کیا نسبت اس کی قامت دلکش سے سرو کو — انداز اس کا اور کچھ اس کی ادا کچھ اور
مانجا جو آرسی نے بہت آپ کو تو کیا — رخسار کے ہے سطح کی اس کے صفا کچھ اور
اس کی زیادہ گوئی سے دل داغ ہوگیا — شکوہ کیا جب اس سے تب ان نے کہا کچھ اور
اس طور سے تمھارے تو مرتے نہیں ہیں ہم — اب واسطے ہمارے نکالو جفا کچھ اور
صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا — ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگان عشق
ہے میر راہ و رسم دیار وفا کچھ اور

(۸۱۱)

چمکی ہے جب سے برق سحر گلستاں کی اور — جی لگ رہا ہے خار و خس آشیاں کی اور
وہ کیا یہ دل لگے ہے فنا میں کہ رفتگاں — منھ کرکے بھی نہ سوئے کبھو پھر جہاں کی اور
رنگ سخن تو دیکھ کہ حیرت سے باغ میں — رہ جاتے ہیں گے دیکھ کے گل اس دہاں کی اور
آنکھیں سی کھل ہی جائیں گی جو مرگیا کوئی — دیکھا نہ کر غضب سے کسو خستہ جاں کی اور
کیا بےخبر ہے رفتن رنگین عمر سے — جوے چمن میں دیکھ ٹک آب رواں کی اور
یاں تاب سعی کس کو مگر جذب عشق کا — لاوے اسی کو کھینچ کسو ناتواں کی اور
یارب ہے کیا مزہ سخن تلخ یار میں — رہتے ہیں کان سب کے اسی بد زباں کی اور
یا دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر — اب دیکھتا نہیں ہے کوئی اس مکاں کی اور
آیا کسے تکدر خاطر ہے زیر خاک — جاتا ہے اکثر اب تو غبار آسماں کی اور

کیا حال ہوگیا ہے ترے غم میں میر کا
دیکھا گیا نہ ہم سے تو ٹک اس جواں کی اور

(۸۱۲)

نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور
مگر اور تھے تب ہوئے ہو اب اور

ادا کچھ ہے انداز کچھ ناز کچھ
تہ دل ہے کچھ اور زیر لب اور

لب سرخ کو ٹک دکھاتے نہیں
طرح پان کھانے کی تھی کچھ جب اور

نہ گرمی نہ جوشش نہ اب وہ تپاک
تکلف نہیں اس میں تھے تم تب اور

زمانہ مرا کیونکے یکساں رہے
اٹھاویں گے تیرے ستم یہ کب اور

جدا اتفاقاً رہا ایک میر
وگرنہ ملے یوں تو اس سے سب اور

(۸۱۳)

آخر دکھائی عشق نے چھاتی فگار کر
تصدیع کھینچی ہم نے یہ کام اختیار کر

اس باعث حیات سے کیا کیا ہیں خواہشیں
پر دم بخود ہی رہتے ہیں ہم جی کو مار کر

ٹک سامنے ہوا کہ نہ ایماں نہ دین و دل
کافر کو بھی نہ اس سے الٰہی دوچار کر

جا شوق پہ نہ جا تن زار و نزار پہ
اے ترک صید پیشہ ہمیں بھی شکار کر

وہ سخت باز داؤ میں آتا نہیں ہے ہائے
کس طور جی کو ہم نہ لگا بیٹھیں ہار کر

ہم آپ سے گئے تو گئے پر بسان نقش
بیٹھا تو روز حشر تئیں انتظار کر

کن آنکھوں دیکھیں رنگ خزاں کے کہ باغ سے
گل سب چلے ہیں رخت سفر اپنا بار کر

جل تھل بھریں نہ جب تئیں دم تب تئیں نہ لیں
ہم اور ابر آج اٹھے ہیں قرار کر

اک صبح میری چھاتی کے داغوں کو دیکھ تو
یہ پھول گل بھی زور رہے ہیں بہار کر

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

(۸۱۴)

جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالم تصویر بھی آخر

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہوجاتی ہے تقصیر بھی آخر

کلیجہ چھن گیا پر جان سختی کش بدن میں ہے
ہوئے اس شوخ کے ترکش کے سارے تیر بھی آخر

نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر

سرد کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

(۸۱۵)

رہ جاؤں چپ نہ کیونکے برا جی میں مان کر
آؤ بھلا کبھو تو سو جاؤ زبان کر

کہتے ہیں چلتے وقت ملاقات ہے ضرور
جاتے ہیں ہم بھی جان سے ٹک دیکھو آن کر

کیا لطف تھا کہ میکدے کی پشت بام پر
سوتے تھے مست چادر مہتاب تان کر

آیا نہ چل کے یاں تئیں وہ باعث حیات
مارا ہے ان نے جان سے ہم کو تو جان کر

ایسے ہی تیز دست ہو خونریزی میں تو پھر
رکھوگے تیغ جور کی یک چند میان کر

یہ بے مروتی کہ نگہ کا مضائقہ
اتنا تو میری جان نہ مجھ سے سیان کر

رنگین گور کرنی شہیدوں کی رسم ہے
تو بھی ہماری خاک پہ خوں کے نشان کر

رکھنا تھا وقت قتل مرا امتیاز ہائے
سو خاک میں ملایا مجھے سب میں سان کر

تم تیغ جور کھینچ کے کیا سوچ میں گئے
مرنا ہی اپنا جی میں ہم آئے ہیں ٹھان کر

وے دن گئے کہ طاقت دل کا تھا اعتماد
اب یوں کھڑے کھڑے نہ مرا امتحان کر

اس گوہر مراد کو پایا نہ ہم نے میر
پایان کار مر گئے یوں خاک چھان کر

(۸۱۶)

مجھ کو قفس میں سنبل و ریحاں کی کیا خبر
کہہ اے نسیم صبح گلستاں کی کیا خبر

رہتا ہے ایک نشہ انھیں جن کو ہے شناخت
ہے زاہدوں کو مستی و عرفاں کی کیا خبر

ٹک پوچھتے جو آن نکلتا کوئی ادھر
اب بعد مرگ قیس بیاباں کی کیا خبر

برباد جائے یاں کوئی دولت تو کیا عجب
آئی ہے تم کو ملک سلیماں کی کیا خبر

آیا ہے ایک شہر غریباں سے تازہ تو
میر اس جوان حال پریشاں کی کیا خبر

(۸۱۷)

اب تنگ ہوں بہت میں مت اور دشمنی کر
لاگو ہو میرے جی کا اتنی ہی دوستی کر

جب تک شگاف تھے کچھ اتنا نہ جی رکے تھا
پچھتائے ہم نہایت سینے کے چاک سی کر

قصہ نہیں سنا کیا یوسف ہی کا جو تونے
اب بھائیوں سے چندے تو گرگ آشتی کر

ناسازی و خشونت جنگل ہی چاہتی ہے
شہروں میں ہم نہ دیکھا بالیدہ ہوتے کیکر

کچھ آج اشک خونیں میں نے نہیں چھپائے | رہ رہ گیا ہوں برسوں لوہو کو اپنے پی کر
کس مردنی کو اس بن بھاتی ہے زندگانی | بس جی چکا بہت میں اب کیا کروں گا جی کر
حرف غلط کو سن کر درپے نہ خوں کے ہونا | جو کچھ کیا ہے میں نے پہلے اسے سہی کر
دن رات کڑھتے کڑھتے میں بھی بہت رکا ہوں | جو تجھ سے ہو سکے سو اب تو بھی مت کمی کر
رہتی ہے سو نکوئی رہتا نہیں ہے کوئی | تو بھی جو یاں رہے تو زنہار مت بدی کر
تھی جب تلک جوانی رنج و تعب اٹھائے
اب کیا ہے میر جی میں ترک ستمگری کر

ردیف ز

(۸۱۸)

اس شوخ سے سنا نہیں نام صبا ہنوز | غنچہ ہے وہ گلی نہیں اس کو ہوا ہنوز
عاشق کے اس کو گریۂ خونیں کا درد کیا | آنسو نہیں ہے آنکھ سے جس کی گرا ہنوز
کیا جانے وہ کہ گذرے ہے یاروں کے جی پہ کیا | مطلق کسو سے اس کا نہیں دل لگا ہنوز
برسوں میں نامہ بر سے مرا نام جو سنا | کہنے لگا کہ زندہ ہے وہ تنگ کیا ہنوز
گھگھیاتے رات کے تئیں باچھیں تو پھٹ گئیں | ناواقف قبول ہے لیکن دعا ہنوز
کیا کیا کرے ہے جھٹیں قاصد سے لیتے خط | حالانکہ وہ ہوا نہیں حرف آشنا ہنوز
سو بار ایک دم میں گیا ڈوب ڈوب جی | پر بحر غم کی پائی نہ کچھ انتہا ہنوز
خط سے ہے بے وفائی حسن اس کی آئینہ | ہم سادگی سے رکھتے ہیں چشم وفا ہنوز
سو عقدے فرط شوق سے پیش آئے دل کو یاں | واں بند اس قبا کے نہیں ہوتے وا ہنوز
یاں میر ہم تو پہنچ گئے مرگ کے قریب
واں دلبروں کو ہے وہی قصد جفا ہنوز

(۸۱۹)

ہے میرے لوہو رونے کا آثار سا ہنوز | کوچہ کوئی کوئی ہے چمن زار سا ہنوز
کب تک کھنچے گی صبح قیامت کی شام کو | عرصے میں میں کھڑا ہوں گنہگار سا ہنوز
مدت ہوئی کہ خون جگر میں نہیں ولے | جاتا ہے آنسوؤں کا چلا تار سا ہنوز
سایہ سا آگیا تھا نظر اس کا ایک دن | مبہوت میں پھروں ہوں پری دار سا ہنوز
برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ | نکلا نہیں ہے ایک رخ یار سا ہنوز
دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اسے کہیں | گل حیرتی ہے صورت دیوار سا ہنوز

مدت سے ترک عشق کیا میر نے ولے
زار و زبون و زرد ہے بیمار سا ہنوز

(۸۲۰)

کب تک بھلا بتاؤگے یوں صبح و شام روز — آؤ کبھیں کہ رہتے ہیں رفتہ تمام روز
وہ سرکشی سے گو متوجہ نہ ہو ادھر — ہم عاجزانہ کرتے ہیں اس کو سلام روز
گہ رنج کھینچنے کو کبھے کہ ہلاک کو — پہنچے ہے ہم کو اس سے نیا اک پیام روز
منظور بندگی نہیں میری تو کیا کروں — حاضر ہے اپنی اور سے یوں تو غلام روز

برسوں ہوئے کہ رات کو ٹک بیٹھتے نہیں
رہتے ہیں تم کو میر جی کیا ایسے کام روز

ردیف س

(۸۲۱)

گئے جس دم سے ہم اس تندخو پاس — رہے خنجر ستم ہی کے گلو پاس
قیامت ہے نہ اے سرمایۂ جاں — نہ ہووے وقت مرنے کے بھی تو پاس
رلایا ہم نے پہروں رات اس کو — کہا یہ قصۂ غم جس کسو پاس
کبھیں اک دور کی سی کچھ تھی نسبت — رکھا تھا آئینے کو اس کے رو پاس
دل اے چشم مروت کیوں نہ خوں ہو — تجھے ہم جب نہ تب دیکھیں عدو پاس
یہی گالی یہی جھڑکی یہی چھیڑ — نہ کچھ میرا کیا تونے کبھو پاس

چل اب اے میر بس اس سرو قد بن
بہت رویا چمن کی آب جو پاس

(۸۲۲)

جب بٹھاویں مجھے جلاد جفاکار کے پاس — تو بھی ٹک آن کھڑا ہوجو گنہگار کے پاس
دردمندوں سے تمھیں دور پھرا کرتے ہو کچھ — پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس
چشم مست اپنی سے صحبت نہ رکھاکر اتنی — بیٹھیے بھی تو بھلا مردم ہشیار کے پاس
خندہ و چشمک و حرف و سخن زیرلبی — کہیے جو ایک دو افسون ہوں دلدار کے پاس
داغ ہونا نظر آتا ہے دلوں کا آخر — یہ جو اک خال پڑا ہے ترے رخسار کے پاس
خط نمودار ہوئے اور بھی دل ٹوٹ گئے — یہ بلا نکلی نئی زلف شکن دار کے پاس

در گلزار پہ جانے کے نصیب اپنے کہاں
یوں ہی مرے گا قفس کی کبھو دیوار کے پاس
کیا رکھا کرتے ہو آئینے سے صحبت ہر دم
ٹک کبھو بیٹھو کسی طالب دیدار کے پاس
دل کو یوں لیتے ہو کھٹکا نہیں ہونے پاتا
تربیت پائی ہے تم نے کسو عیار کے پاس
مورچہ جیسے لگے تنگ شکر کو آکر
خط نمودار ہے یوں لعل شکر بار کے پاس
جس طرح کفر بندھا ہے گلے اسلام کہاں
یوں تو تسبیح بھی ہم رکھتے ہیں زنار کے پاس
ہم نہ کہتے تھے نہ مل مغبچوں سے اے زاہد
ابھی تسبیح دھری تھی تری دستار کے پاس
نارسائی بھی نوشتے کی مرے دور کھنچی
اتنی مدت میں نہ پہنچا کوئی خط یار کے پاس
اختلاط ایک تمھیں میر ہی غم کش سے نہیں
جب نہ تب یوں تو نظر آتے ہو دوچار کے پاس

(۸۲۳)

عزت نہیں ہے دل کی کچھ اس دلربا کے پاس
رہتی ہے آرسی ہی دھری خودنما کے پاس
پہروں شبوں کو غم میں ترے جاگتے رہے
ہو آہنیں جگر سو کرے بے وفا کے پاس
راہ و روش رکھیں ہیں جدا دردمند عشق
زنہار یہ کڑھے نہیں ہوتے دوا کے پاس
کیا جانے قدر غنچۂ دل باغباں پسر
ہوتی گلابی ایسی کسو میرزا کے پاس
جو دیر سے حرم کو گئے سو وہیں موئے
آتا نہیں ہے جا کے کوئی پھر خدا کے پاس
کیا جانیے کہ کہتے ہیں کس کو یگانگی
بیگانے ہی سے ہم رہے اس آشنا کے پاس
میر اس دل گرفتہ کی یاں تو ملی نہ داد
عقدہ یہ لے کے جاؤں گا مشکل کشا کے پاس

(۸۲۴)

رہتے تھے ہم وے آٹھ پہر یا تو پاس پاس
یا اب پھٹک نہیں ہے کہیں ان کے آس پاس
تا لوگ بدگماں نہ ہوں آئے نہ اس کی اور
ہم تو کیا ہے عشق میں دور از قیاس پاس
گر ہی پڑے جو دیکھے ہے تنکا بھی گر کہیں
مایہ نہیں ہے کچھ فلک بے سپاس پاس
شیخ ان لبوں کے بوسے کو اس ریش سے نہ جھک
رکھتا ہے کون آتش سوزندہ گھاس پاس
تم نے تو قدر کی ہے متاع وفا کی خوب
بیچیں گے اب یہ جنس کسو دل شناس پاس
آلودہ کر نہ مستی سے جامے کو جسم کے
ہشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پاس
وحشی ہے میر ربط ہے اس سے خلاف عقل
بیٹھے سو جا کے کیا کوئی ایسے اداس پاس

ردیف ش

(۸۲۵)

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش　　رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش
یہ جو دو آنکھیں مند گئیں میری　　اس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش
کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں　　رکھتے میرے بھی غم شمار اے کاش
جان آخر تو جانے والی تھی　　اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش
اس میں راہ سخن نکلتی تھی　　شعر ہوتا ترا شعار اے کاش
خاک بھی وہ تو دیوے گا برباد　　نہ بناویں مرا مزار اے کاش
شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر　　اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش
مرتے بھی تو ترے ہی کوچے میں　　ملتی یاں جاے گوردار اے کاش
ان لبوں کے گلے سے دل ہے بھرا　　چل پڑے بات پیش یار اے کاش

بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

(۸۲۶)

کیا کہیے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش　　یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش
لے ہاتھ میں قفس ٹک صیاد چل چمن تک　　مدت سے ہے ہمیں بھی سیر بہار خواہش
نے کچھ گنہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں　　رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
حالانکہ عمر ساری مایوس گذری تس پر　　کیا کیا رکھیں ہیں اس کے امیدوار خواہش
غیرت سے دوستی کی کس کس سے ہوجے دشمن　　رکھتا ہے یاری ہی کی سارا دیار خواہش
ہم مہرورز کیونکر خالی ہوں آرزو سے　　شیوہ یہی تمنا فن و شعار خواہش
اٹھتی ہے موج ہر یک آغوش ہی کی صورت　　دریا کو ہے یہ کس کا بوس و کنار خواہش
صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جادہ غیرت گل　　عاشق کی ایک پاوے کیونکر قرار خواہش
یک بار بر نہ آئی اس سے امید دل کی　　اظہار کرتے کب تک یوں بار بار خواہش

کرتے ہیں سب تمنا پر میر جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایان کار خواہش

(۸۲۷)

مطلق نہیں ہے ایدھر اس دلربا کی خواہش
کیا جانیے کہ کیا ہے یارو خدا کی خواہش

دیکھیں تو تیغ اس کی اب کس کے سر چڑھے ہے
رکھتے ہیں یار جی میں اس کی جفا کی خواہش

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

اقلیم حسن سے ہم دل پھیر لے چلے ہیں
کیا کریے یاں نہیں ہے جنس وفا کی خواہش

خون جگر ہی کھانا آغاز عشق میں ہے
رہتی ہے اس مرض میں پھر کب غذا کی خواہش

وہ شوخ دشمن جاں اے دل تو اس کا خواہاں
کرتا ہے کوئی ظالم ایسی بلا کی خواہش

میرے بھی حق میں کر ٹک ہاتھوں کو میر اونچا
رکھتا ہے اہل دل سے ہر اک دعا کی خواہش

(۸۲۸)

ہم پر روا جو رکھتے ہو جور و جفا ہمیش
خوبی رہا کرے ہے مری جان کیا ہمیش

کس اعتبار دل کے تئیں گل کہیں ہیں لوگ
مجھ پاس تو مندی ہی کلی سا رہا ہمیش

کچھ عہد میں ہمارے محبت ہوئی ہے ننگ
آپس میں ورنہ رسم تھی مہر و وفا ہمیش

فرصت مرض سے دل کے ہمیں کب ہوئی تنک
تھوڑی بہت چلی ہی گئی ہے دوا ہمیش

اب عید بھی بغیر ملے اس کے ہے دہا
رہتا تھا جو ہمارے گلے ہی لگا ہمیش

ہم تو جو رفتنی ہیں ملے ہی رہیں تو خوب
رہتا نہیں ہے کوئی بغیر از خدا ہمیش

واقف نہیں ہوں میر سے تو پر تمام شب
کرتا ہے شور آن کے اک بے نوا ہمیش

ردیف ط

(۸۲۹)

عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط
اول گام ترک سر ہے شرط

دعویٰ عشق یوں نہیں صادق
زردی رنگ و چشم تر ہے شرط

خامی جاتی ہے کوئی گھر بیٹھے
پختہ کاری کے تیں سفر ہے شرط

قصد حج ہے تو شیخ کو لے چل
کعبے جانے کو یہ بھی خر ہے شرط

قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے
اس کی نقادی کو نظر ہے شرط

حق کے دینے کو چاہیے ہے کیا
یاں نہ اسباب نے ہنر ہے شرط

دل کا دینا ہے سہل کیا اے میر
عاشقی کرنے کو جگر ہے شرط

(۸۳۰)

کرتے نہیں ہیں اس سے نیا کچھ ہم اختلاط ہوتا تھا اگلے لوگوں میں بھی باہم اختلاط
ٹک گرم میں ملوں تو مجھی سے ملے خنک اوروں سے تو وہی ہے اسے ہر دم اختلاط
ایسا نہ ہو کہ شیخ دغا دیوے ہم‌نشیں ابلیس سے کرے ہے کوئی آدم اختلاط
بیگانگی مجھی سے چلی جاتی ہے خصوص رکھتا ہے یوں تو یار سے اک عالم اختلاط
کس طور اتفاق پڑی صحبت اس سے دیر
ہے میرؔ بے دماغ و قیامت کم اختلاط

ردیف ع

(۸۳۱)

تیرے ہوتے شام کو گر بزم میں آجائے شمع ہو خجل ایسی کہ منھ اپنا نہ پھر دکھلائے شمع
کیا جلے جاتے ہیں تجھ سے سب دیے سے دیکھتے گر یہی یاں کا ہے ڈھب تو حیف مجلس وائے شمع
کس کے تیں ہوتا ہے قطع زندگانی کا یہ شوق سر کٹانے کو گلے میں جمع ہیں رگ ہائے شمع
کچھ نہیں بجھ میں درونے کی جلن سے اس طرح کھا چلا ہے جیسے اک ہی داغ سر تا پائے شمع
داغ ہوکر جان دی ان نے تمھارے واسطے
مشت خاک میرؔ پر سو تم نہ لے کر آئے شمع

(۸۳۲)

اس کے ہوتے بزم میں فانوس میں آتی ہے شمع یعنی اس آتش کے پرکالے سے شرماتی ہے شمع
ہر زماں جاتی ہے گھٹتی سامنے تیرے کھڑی جوش غم سے آپ ہی اپنے تئیں کھاتی ہے شمع
بیٹھے اس مہ کے کسو کو دیکھتا ہے کب کوئی رنگ رو کو بزم میں ہر چند جھمکاتی ہے شمع
باد سے جنبش میں کچھ رہتی نہیں ہے متصل اس بھبھوکے سے جو گھٹتی ہے سو جھنجھلاتی ہے شمع
چھوڑتی ہے لطف کیا افسردگی خاطر کی میرؔ
آگے اس کے چہرۂ روشن کے بجھ جاتی ہے شمع

(۸۳۳)

عشق میں کچھ نہیں دوا سے نفع کڑھیے کب تک نہ ہو بلا سے نفع
کب تلک ان بتوں سے چشم رہے ہو رہے گا بس اب خدا سے نفع
میں تو غیر از ضرر نہ دیکھا کچھ ڈھونڈو تم یار و آشنا سے نفع

مختتم جان گر کسو کے تئیں — پہنچے ہے تیرے دست و پا سے نفع

اب فقیروں سے کہہ حقیقت دل
میرؔ شاید کہ ہو دعا سے نفع

ردیف غ

(۸۳۴)

اب اس کے غم سے جو کوئی چاہے سو کھائے داغ — باقی نہیں ہے چھاتی میں اپنی تو جاے داغ
چشم و دل و دماغ و جگر سب کو رو رہے — اس عشق خانہ سوز نے کیا کیا دکھائے داغ
جی جل گیا تقرب اغیار دیکھ کر — ہم اس گلی میں جب گئے تب واں سے لائے داغ
کیا لالہ ایک داغ پہ پھولے ہے باغ میں — بہتیرے ایسے چھاتی پہ ہم نے جلائے داغ
کیا شیخ کے ورع میں تردد ہے ہم نے آپ — سو بار اس کے کرتے سے مے کے دھلائے داغ
آخر کو روے کار سے پردہ اٹھے گا کیا — مقدور تک تو چھاتی کے ہم نے چھپائے داغ

دل کی گرہ میں غنچۂ لالہ کے رنگ میرؔ
سوز دروں سے کچھ نہیں ہے اب سوائے داغ

ردیف ف

(۸۳۵)

میلان دل ہے زلف سیہ فام کی طرف — جاتا ہے صید آپ سے اس دام کی طرف
دل اپنا عدل داور محشر سے جمع ہے — کرتا ہے کون عاشق بدنام کی طرف
اس پہلوے فگار کو بستر سے کام کیا — مدت ہوئی کہ چھوٹی ہے آرام کی طرف
یک شب نظر پڑا تھا کہیں تو سو اب مدام — رہتی ہے چشم ماہ ترے بام کی طرف
آنکھیں جنھوں کی زلف و رخ یار سے لگیں — وے دیکھتے نہیں سحر و شام کی طرف
جوں چشم یار بزم میں اگلا پڑے ہے آج — ٹک دیکھ شیخ مے کے بھرے جام کی طرف
خارا شگاف و سینہ خراش ایک سے نہیں — لیکن نظر نہیں ہے تجھے کام کی طرف
دل پک رہے ہیں جن کے انھیں ملنے میں ہے شوق — میلان طبع کبؔ ہے کسو خام کی طرف

دیکھی ہے جب سے اس بت کافر کی شکل میرؔ
جاتا نہیں ہے جی تنک اسلام کی طرف

ردیف ق

(۸۳۶)

اے رشک برق تجھ سے مشکل ہے کار عاشق   اک جھمکے میں کہاں پھر صبر و قرار عاشق
خاک سیہ سے یکساں تیرے لیے ہوا ہوں   تو بھی تو ایک شب ہو شمع مزار عاشق
اے بحر حسن ہووے یہ آگ سرد ٹک تب   جوں موج ہو لبالب تجھ سے کنار عاشق
دلخواہ کوئی دلبر ملتا تو دل کو دیتے   گر چاہنے میں ہوتا کچھ اختیار عاشق
پلکوں کی اس کی کاوش ہر دم جب ایسی ہووے   مشکل کہ جی سے جاوے پھر خار خار عاشق
کیا جانے محو جو ہو اپنے ہی رو و مو کا   گذرے ہے کس طرح سے لیل و نہار عاشق
خواری کا موجب اپنی ہے اضطراب ہر دم   دل سمجھے تو رہے بھی کچھ اعتبار عاشق
آنکھوں تلے سے سرکے وہ چشم مست ٹک تو   جاتا دکھائی دیوے رنج و خمار عاشق
کیا بوجھ بھاری سے میں ناکام کاٹتا ہوں   دنیا سے ہے نرالا کچھ کاروبار عاشق

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو شعار عاشق

(۸۳۷)

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق   جان کا روگ ہے بلا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو   سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں   کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے   یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
گر پرستش خدا کی ثابت کی   کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق
دلکش ایسا کہاں ہے دشمن جاں   مدعی ہے پہ مدعا ہے عشق
ہے ہمارے بھی طور کا عاشق   جس کسی کو کہیں ہوا ہے عشق
کوئی خواہاں نہیں محبت کا   تو کہے جنس ناروا ہے عشق

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ردیف ک

(۸۳۸)

دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھلک   جاتی نہیں ہے اشک کی رخسار کے ڈھلک

یارب اک اشتیاق نکلتا ہے چال سے — ملتے پھریں ہیں خاک میں کس کے لیے فلک
طاقت ہو جس کے دل میں وہ دو چار دن رہے — ہم ناتوان عشق تمھارے کہاں تلک
برسوں ہوئے کہ جان سے جاتی نہیں خلش — ٹک ہل گئی تھی آگے مرے وہ پھری پلک
آئی نہ ہاتھ میر کی میت پہ کل نماز
تابوت پر تھی اس کے نپٹ کثرت ملک

(۸۳۹)

عزت اپنی اب نہیں ہے یار کو منظور تک — پاس جاتا ہوں تو کہتا ہے کہ بیٹھو دور تک
حال میرا شہر میں کہتے رہیں گے لوگ دیر — اس فسانے کے تئیں ہونے تو دو مشہور تک
پشت پا مارے ہیں شاہی پر گداے کوے عشق — دیکھو تم یاں کا خدا کے واسطے دستور تک
چاہنے کا مجھ سے بے قدرت کا کیا ہے اعتبار — عشق کرنے کو کسو کے چاہیے مقدور تک
حق تو سب کچھ تھا ہی ناحق جان دی کس واسطے — حوصلے سے بات کرتا کاشکے منصور تک
منکر حسن بتاں کیونکر نہ ہووے شیخ شہر — حق ہے اس کی اور وہ آنکھوں سے ہے معذور تک
پھر کہیں کیا دل لگایا میر جو ہے زرد رو
منھ پر آیا تھا ترے دو چار دن سے نور تک

(۸۴۰)

حالانکہ کام پہنچ گیا کب کا جاں تلک — آتی نہیں ہے تو بھی شکایت زباں تلک
اس رشک مہ کے دل میں نہ مطلق کیا اثر — ہرچند پہنچی میری دعا آسماں تلک
جو آرزو کی اس سے سو دل میں ہی خوں ہوئی — نومید یوں بسر کرے کوئی کہاں تلک
کھینچا کیے وہ دور بہت آپ کو سدا — ہمسائے ہم موا کیے آئے نہ یاں تلک
بلبل قفس میں اس لب و لہجہ پہ یہ فغاں — آواز ایک ہو رہی ہے گلستاں تلک
پچھتائے اٹھ کے گھر سے کہ جوں نو دمیدہ پر — جانا بنا نہ آپ کو پھر آشیاں تلک
ہم صحبتی یار کو ہے اعتبار شرط
اپنی پہنچ تو میر نہیں پاسباں تلک

(۸۴۱)

ہم بیکسوں کا کون ہے ہجراں میں غم شریک — تنہائی ایک ہے سو ہے اس کے ستم شریک
دم رک کے دو ہیں کبھو اگر مر نہ جائے وہ — ہو میرے حال کا جو کوئی ایک دم شریک
خوں ہوتے ہوتے ہو چکے آخر کہاں تلک — اب دل جگر کہیں نہیں ہیں تیرے ہم شریک

دل تنگ ہو جیے تو نہ ملیے کسو کے ساتھ　　ہوتے ہیں ایسے وقت میں یہ لوگ کم شریک
شاید کہ سرنوشت میں مرنا ہے گھٹ کے میرؔ
کاغذ نہ محرم غم دل نے قلم شریک

(۸۴۲)

چلے ہے باغ کی صبا کیا خاک　　دل جلا کوئی ہوگیا کیا خاک
ہے غبار اس کے خط سے دل میں بہت　　باہم اب ہوئے گی صفا کیا خاک
ہم گرے اس کے در ہی پر مر کر　　اور کوئی کرے وفا کیا خاک
خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو　　ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک
سب موئے ابتدائے عشق ہی میں　　ہووے معلوم انتہا کیا خاک
خاک پر ہے سدا جبین نیاز　　اور کوئی ہو جبہہ سا کیا خاک
تربت میرؔ پر چلے تم دیے
اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک

(۸۴۳)

آج کل سے کچھ نہ طوفاں زا ہے چشم گریہ ناک　　موجزن برسوں سے ہے دریا ہے چشم گریہ ناک
یوں نہ روؤ تو نہ روؤ ورنہ رود و چاہ سے　　ہر قدم اس دشت میں پیدا ہے چشم گریہ ناک
دل سے آگے تک قدم رکھو تو پھر بھی دلبرو　　سیر قابل دیدنی اک جا ہے چشم گریہ ناک
بے گداز دل نہیں امکان رونا اس قدر　　تہ کو پہنچو خوب تو پردہ ہے چشم گریہ ناک
سوجھتا اپنا کرے کچھ ابر تو ہے مصلحت　　جوش غم سے جیسے نابینا ہے چشم گریہ ناک
سبز ہے رونے سے میرے گوشہ گوشہ دشت کا　　باعث آبادی صحرا ہے چشم گریہ ناک
وے حنائی پا مری آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں میرؔ
یعنی ہر دم اس کے زیر پا ہے چشم گریہ ناک

(۸۴۴)

سو خونچکاں گلے ہیں لب سے مری زباں تک　　جی رندھ گیا ہے ظالم اب رحم کر کہاں تک
ملنے میں میرے گاہے تک تن دیا نہ ان نے　　حاضر رہا ہوں میں تو اپنی طرف سے جاں تک
ہر چند میں نے سر پر اس رہ کی خاک ڈالی　　لیکن نہ پہنچیں آنکھیں اس پاؤں کے نشاں تک
ان ہڈیوں کا جلنا کوئی ہما سے پوچھو　　لاتا نہیں ہے منھ وہ اب میرے استخواں تک
اس کی گلی کے سگ سے کی ہے موافقت میں　　اس راہ سے بھی پہنچیں شاید کہ پاسباں تک

ابر بہار نے شب دل کو بہت جلایا
تھا برق کا چمکنا خاشاک آشیاں تک

اس مہ کے گوش تک تو ہرگز نہیں پہنچتی
گو آہ بےسرایت جاتی ہے آسماں تک

قید قفس میں مرنا کب شوق کا ہے مانع
پہنچیں گے مشت پر بھی اڑ کر یہ گلستاں تک

ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں ہے نہ ہونا
آتا نظر نہیں کچھ جاوے نظر جہاں تک

جاتی ہیں خط کے پیچھے جوں مہر آنکھیں میری
اب کارشوق میرا پہنچا ہے میر یاں تک

(۸۴۵)

لیا چہرہ دتی سے گر تیر سر تک
نہ پہنچا کبھو ہاتھ اس کی کمر تک

مجھے نیند کیسی کہ مانند انجم
کھلی رہتی ہیں میری آنکھیں سحر تک

اٹھا پاس بےاختیاری سے سب کا
بکا بیٹھے کرتے ہیں دو دو پہر تک

دماغ اور دل ہیں سراسیمہ دونوں
سرزخم شاید کہ پہنچا جگر تک

بلا شور و ہنگامہ ہے دل زدوں کا
قیامت کیے جائے ہے اس کے گھر تک

نہ دے ماریں چوکھٹ سے سر کو تو کبھو
رسائی ہوا چاہیے اس کے در تک

محبت میں جی سے گئے میر آخر
خبر گفتنی ہے یہ ہر بےخبر تک

ردیف گ

(۸۴۶)

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

مجنوں و کوہکن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

کیونکر کہیں کہ شہر وفا میں جنوں نہیں
اس خصم جاں کے سارے دوانے ہیں یاں کے لوگ

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسو کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز بہی درمیاں کے لوگ

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کام جاں کے لوگ

پتی کو اس چمن کی نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرم روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیرچشم ہیں کوے بتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ

(۸۴۷)

کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ
اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ

گلشن بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب
پر اس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام
ہر گام راہ عشق میں گویا دبی ہے آگ

جل جل کے سب عمارت دل خاک ہوگئی
کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ

اب گرم و سرد دہر سے یکساں نہیں ہے حال
پانی ہے دل ہمارا کبھی تو کبھی ہے آگ

کیونکر نہ طبع آتشیں اس کی ہمیں جلائے
ہم مشت خس کا حکم رکھیں وہ پری ہے آگ

کب لگ سکے ہے عشق جہاں سوز کو ہوس
ماہی کی زیست آب سمندر کا جی ہے آگ

روز ازل سے آتے ہیں ہوتے جگر کباب
کیا آج کل سے عشق کی یارو جلی ہے آگ

انگارے سے نہ گرتے تھے آگے جگر کے لخت
جب تب ہماری گود میں اب تو بھری ہے آگ

یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں
یہ کیسی عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

(۸۴۸)

ہے آگ کا سا نالۂ کاہش فزا کا رنگ
کچھ اور صبح دم سے ہوا ہے ہوا کا رنگ

دیکھے ادھر تو مجھ سے نہ یوں آنکھ وہ چھپائے
ظاہر ہے میرے منہ سے مرے مدعا کا رنگ

کس بے گنہ کے خوں میں ترا پڑ گیا ہے پاؤں
ہوتا نہیں ہے سرخ تو ایسا حنا کا رنگ

ہے کہ شکستہ رنگی خورشید کیا عجب
ہوتا ہے زرد بیشتر اہل فنا کا رنگ

گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکے رشک سے
کس مرتبے میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

رہتا تھا ابتدائے محبت میں منہ سفید
اب زرد سب ہوا ہوں یہ ہے انتہا کا رنگ

داروے لعل گوں نہ پیو میرزا ہو تم
گرمی پہ ہے دلیل بہت اس دوا کا رنگ

خوبی ہے اس کی حیز تحریر سے بروں
کیا اس کا طور حسن لکھوں کیا ادا کا رنگ

پوچھیں ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ

مقدور تک نہ گذرے مرے خوں سے یار میرؔ
غیروں سے کیا گلہ ہے یہ ہے آشنا کا رنگ

(۸۴۹)

رہ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ　　بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ
مظاہر سب اس کے ہیں ظاہر ہے وہ　　تکلف ہے یاں جو چھپاتے ہیں لوگ
عجب کی جگہ ہے کہ اس کی جگہ　　ہمارے تئیں ہی بتاتے ہیں لوگ
رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا　　کبھو آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ
اس ابرو کماں پر جو قرباں ہیں ہم　　ہمیں کو نشانہ بناتے ہیں لوگ
نہ سویا کوئی شور شب سے مرے　　قیامت اذیت اٹھاتے ہیں لوگ

ان آنکھوں کے بیمار ہیں میرؔ ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

ردیف ل

(۸۵۰)

مار بھی آسان ہے دشنام سہل　　یار اگر ہے اہل تو ہے کام سہل
جوں نگیں میں کی جگرکاوی بہت　　کیا نکلتا ہے کسو کا نام سہل
جان دی یاروں نے تب آنکھیں لگیں　　کن نے پایا آہ یاں آرام سہل
مدعی ہو چشم شوخ یار کا　　کیا نگاہوں میں ہوا بادام سہل

تم نے دیکھا ہوگا لچھن میرؔ کا
ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل

(۸۵۱)

پوشیدہ کیا رہے ہے قدرت نمائی دل　　دیکھی نہ بے ستوں میں زورآزمائی دل
ہے تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب　　دے راہ کب دکھائی بے رہنمائی دل
اندوہ و غم سے اکثر رہتا ہوں میں مکدر　　کیا خاک میں ملی ہے میری صفائی دل
پیش آوے کوئی صورت منھ موڑتے نہیں وے　　آئینہ ساں جنھیں ہے کچھ آشنائی دل
مر تو نہیں گیا میں پر جی ہی جانتا ہے　　گذرے ہے شاق مجھ پر جیسی جدائی دل
اس دامگہ میں اس کے سارے فریب ہی ہیں　　آتی نہیں نظر کچھ مجھ کو رہائی دل

گر رنگ ہے چلا ہے در بو ہے تو ہوا ہے
کہہ میرؔ اس چمن میں کس سے لگائیے دل

(۸۵۲)

مدت تو وا ہوا ہی نہ یہ غنچہ وار دل
اب جو کھلا سو جیسے گل بے بہار دل

ہے غم میں یاد کس کو فراموش کار دل
اب آ بنی ہے جی پہ رہا درکنار دل

دشوار ہے ثبات بہت ہجر یار میں
یاں چاہیے ہے دل سو کہاں میرے یار دل

وہ کون سی امید برآئی ہے عشق میں
رہتا ہے کس امید پہ امیدوار دل

ظالم بہت ضرور ہے ان بیکسوں کا پاس
ناچار اپنے رہتے ہیں جو مار مار دل

تم پر تو صاف میری کدورت کھلی ہے آج
مدت سے ہے ملال کے زیرغبار دل

مائل ادھر کے ہونے میں مجبور ہیں سبھی
کھنچتا ہے اس کی اور کو بے اختیار دل

حد ہے گی دلبری کی بھی اے غیرت چمن
ہو آدمی صنوبر اگر لاوے بار دل

داخل یہ اضطراب تنک آبیوں میں ہے
رکھتی نہیں ہے برق ہی کچھ بے قرار دل

کیا ہیں گرسنہ چشم دل اب کے یہ دلبراں
تسکین ان کی ہو نہ جو لیویں ہزار دل

جوں سیب ہیں ذقن کے چمن زار حسن میں
یوں باغ حسن میں بھی ہیں رنگیں انار دل

ہم سے جو عشق کشتہ جئیں تو عجب ہے میر
چھاتی ہے داغ ٹکڑے جگر کے فگار دل

(۸۵۳)

بہت مدت گئی ہے اب تک آ مل
کہاں تک خاک میں میں تو گیا مل

تک اس بے رنگ کے نیرنگ تو دیکھ
ہوا ہر رنگ میں جوں آب شامل

نہیں بھاتا ترا مجلس کا ملنا
ملے تو ہم سے تو سب سے جدا مل

غنیمت جان فرصت آج کے دن
سحر کیا جانے کیا ہو شب ہے حامل

اگرچہ ہم نہیں ملنے کے لائق
کسو تو طرح ہم سے بھی بھلا مل

لیا زاہد نے جام بادہ کف پر
بحمداللہ کھلا عقد انامل

وہی پہنچے تو پہنچے آپ ہم تک
نہ یاں طالع رسا نے جذب کامل

ہوا دل عشق کی سختی سے ویراں
ملائم چاہیے تھا یاں کا عامل

پس از مدت سفر سے آئے ہیں میر
گئیں وہ اگلی باتیں تو ہی جا مل

ردیف م

(۸۵۴)

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم		عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم
سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے		پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے		عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم
کیونکے گرد علاقہ بیٹھ سکے		دامن دل جھٹک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو		ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم
ان نے دینے کہا تھا بوسۂ لب		اس سخن پر اٹک رہے ہیں ہم
نقش پا سی رہی ہیں کھل آنکھیں		کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم
دست دے گی کب اس کی پابوسی		دیر سے سر پٹک رہے ہیں ہم
بے ڈھب اس پاس ایک شب تھے گئے		سو کئی دن سرک رہے ہیں ہم
خام دستی نے ہائے داغ کیا		پوچھتے کیا ہو پک رہے ہیں ہم

میرؔ شاید لیں اس کی زلف سے کام
برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

(۸۵۵)

ہے تہ دل بتوں کا کیا معلوم		نکلے پردے سے کیا خدا معلوم
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے		سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
علم سب کو ہے یہ کہ سب تو ہے		پھر ہے اللہ کیسا نامعلوم
گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن		ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم
عشق جانا تھا مار رکھے گا		ابتدا میں تھی انتہا معلوم
ان سیہ چشم دلبروں سے ہمیں		تھی وفا چشم سو وفا معلوم
طرز کینے کی کوئی چھپتی ہے		مدعی کا ہے مدعا معلوم
عشق ہے اے طبیب جی کا روگ		لطف کر ہے جو کچھ دوا معلوم

دل بجا ہو تو میرؔ کچھ کھاوے
کڑھنے پچنے میں اشتہا معلوم

(۸۵۶)

مجھے تو درد سے اک انس ہے وفا کی قسم
یہی سبب ہے جو کھائی ہے میں دوا کی قسم

کل ان نے تیغ رکھی درمیاں کہ قطع ہے اب
قسم جو بیچ میں آئی سو اس ادا کی قسم

حنا لگی ترے ہاتھوں سے میں گیا پیسا
جگر تمام ہے خوں مجھ کو تیرے پا کی قسم

فقیر ہونے نے سب اعتبار کھویا ہے
قسم جو کھاؤں تو کہتے ہیں کیا گدا کی قسم

قدم تلے ہی رہا اس کے یہ سر پرشور
جو کھایئے تو مرے طالع رسا کی قسم

سروں پہ ہاتھ کبھو تیغ پر کبھو اس کا
کچھ ایک قسم نہیں میرے آشنا کی قسم

جدال دیر کے رہبان سے کہاں تک میر
اٹھو حرم کو چلو اب تمھیں خدا کی قسم

(۸۵۷)

اب سوکھی ہی جاتی ہے سب کشت ہوس ظالم
اے ابر تر آکر ٹک ایدھر بھی برس ظالم

صیاد بہار اب کے سب لوٹوں گا کیا میں ہی
ٹک باغ تلک لے چل میرا بھی قفس ظالم

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
نے رحم ترے جی میں نے دل میں ترس ظالم

کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے
مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھڑس ظالم

جوں ابر میں روتا تھا جوں برق تو ہنستا تھا
صحبت نہ رہی یوں ہی ایک آدھ برس ظالم

کیا کھولے ہوئے محمل یاں گرم حکایت ہے
چل راہ میں کچھ کہتا مانند جرس ظالم

مطلق نہیں گنجائش اب حوصلے میں اپنے
آزار کوئی کھینچے یوں کب تئیں بس ظالم

سررشتۂ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تار نفس ظالم

تاچند رہے گا تو یوں داغ غم اس مہ کا
چھاتی تو گئی تیری اے میر جھلس ظالم

(۸۵۸)

محرم سے کسو روبرو ہوں کاشکے اب ہم
بے وجہ غضب رہنے کا پوچھیں جو سبب ہم

تدبیریں کریں اپنے تن زار و زبوں کی
افراط سے اندوہ کی ہوں آپ میں جب ہم

تو لاگو نہ ہو جی کا تو ناچار ہیں ورنہ
اس جنس گراں مایہ سے گذرے نہیں کب ہم

یک سلسلہ ہے قیس کا فرہاد کا اپنا
جوں حلقۂ زنجیر گرفتار ہیں سب ہم

کس دن نہ ملا غیر سے تو گرم علی الرغم
رہتے ہیں یوں ہی لوٹتے انگاروں پہ شب ہم

مجمع میں قیامت کے اک آشوب سا ہوگا
آنکلے اگر عرصے میں یوں نالہ بلب ہم

کیا معرفت اس سے ہوئی یاروں کو نہ سمجھے   اب تک تو نہیں پاتے ہیں کچھ یار کے ڈھب ہم
گہ نوچ لیا منھ کو گہے کوٹ لی چھاتی   دل تنگی ہجراں سے ہیں مغلوب غضب ہم
آغاز محبت میں تمامی ہوئی اپنی   اے واے ہوئے خاک بسر راہ طلب ہم

تربت سے ہماری نہ اٹھی گرد بھی اے میؔر
جی سے گئے لیکن نہ کیا ترک ادب ہم

(٨٥٩)

مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد و زن تمام   دفتر لکھے گئے نہ ہوا پر سخن تمام
اب چھیڑیے جہاں وہیں گویا ہے درد سب   پھوڑا سا ہوگیا ہے ترے غم میں تن تمام
آیا تھا گرم صید وہ جیدھر سے دشت میں   دیکھا ادھر ہی گرتے ہیں اب تک ہرن تمام
آوارہ گردباد سے تھے ہم پہ شہر میں   کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام
کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا   اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام
اس کار دست بستہ پہ رنجھا نہ مدعی   کیونکر نہ کام اپنا کرے کوہکن تمام
اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی   دیکھا برنگ آب رواں یہ چمن تمام
نکلے ہیں گل کے رنگ گلستاں میں خاک سے   یہ وے ہیں اس کے عشق کے خونیں کفن تمام
تہ صاحبوں کی آئی نکل میکدے گئے   گروی تھے اہل صومعہ کے پیرہن تمام
میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر   مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہل وطن تمام

کچھ ہند ہی میں میؔر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

(٨٦٠)

بخت سیہ کی نقل کریں کس سے چال ہم   مہندی لگی قدم سے ہوئے پائمال ہم
کیونکر نہ اس چمن میں ہوں اتنے نڈھال ہم   یاں پھول سونگھ سونگھ رہے ماہ و سال ہم
یا ہر گلی میں سینکڑوں جس جا ملیح تھے   یا زلف و خط کو دیکھتے ہیں خال خال ہم
گذرے ہے جی میں گہ وہ دہن گاہ وہ کمر   کیا جانیں لوگ رکھتے ہیں کیا کیا خیال ہم
جاتیں نہیں اٹھائی یہ اب سرگرانیاں   مقدور تک تو اپنے گئے ٹال ٹال ہم
لوہو کہاں ہے گریۂ خونیں سے تن کے بیچ   کرتے ہیں منھ کو اپنے طمانچوں سے لال ہم
وہ تو ہی ہے کہ مرتے ہیں سب تیرے طور پر   حور و پری کو جان کے کب ہیں دوال ہم
گذرے ہے بسکہ اس کی جدائی دلوں پہ شاق   منھ نوچ نوچ لے ہیں علی الاتصال ہم
منظور سجدہ ہے ہمیں اس آفتاب کا   ظاہر میں یوں کریں ہیں نماز زوال ہم

ظاہر ہوئے تمھیں بھی ہمارے دم اور ہوش
آئے نہ پھر تمھارے گئے تک بحال ہم

مطلق جہاں میں رہنے کو جی چاہتا نہیں
اب تم بغیر اپنے ہوئے ہیں وبال ہم

نقصان ہوگا اس میں نہ ظاہر کہاں تلک
ہوویں گے جس زمانے کے صاحب کمال ہم

تھا کب گماں ملے گا وہ دامن سوار میر
کل راہ جاتے مفت ہوئے پائمال ہم

(۸۶۱)

کون کہتا ہے منھ کو کھولو تم
کاشکے پردے ہی میں بولو تم

حکم آب رواں رکھے ہے حسن
بہتے دریا میں ہاتھ دھولو تم

کیا سراہیں ہم اپنی جنس کو لیک
دل عجب ہے متاع جو لو تم

جانا آیا ہے اب جہاں سے ہمیں
تھوڑی تو دور ساتھ ہو لو تم

جب میسر ہو بوسہ اس لب کا
چپکے ہی ہو رہو نہ بولو تم

پنجہ مرجاں کا پھر دھرا ہی رہے
ہاتھ خوں میں مرے ڈبولو تم

دست دے ہے کسے پلک سی میل
دل جہاں پاؤ اب پرولو تم

آتے ہیں متصل چلے آنسو
آہ کب تک یہ موتی رولو تم

رات گذری ہے سب تڑپتے میر
آنکھ لگ جائے تک تو سولو تم

(۸۶۲)

موئے جاتے تھے فرط الفت سے ہم
جیے ہیں خدا ہی کی قدرت سے ہم

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر
پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

نہیں دیکھتے صبح اب آرسی
خفا رہتے ہیں اپنی صورت سے ہم

جو دیکھو وہ قامت تو معلوم ہو
کہ روکش ہوئے ہیں قیامت سے ہم

نہ تک لا سکا تاب جلوے کی دل
گلہ رکھتے ہیں صبر و طاقت سے ہم

نہ مانی کوئی ان نے پھر روٹھ کر
مناتے رہے رات منت سے ہم

خدا سے بھی شب کو دعا مانگتے
نہ اس کا لیا نام غیرت سے ہم

رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب
اسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم

بھری آنکھیں لوہو سے رہنے لگیں
یہ رنگ اپنا دیکھا مروت سے ہم

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

(۸۶۳)

کب تک رہیں گے پہلو لگائے زمیں سے ہم — یہ درد اب کہیں گے کسو شانہ بیں سے ہم
تلواریں کتنی کھائی ہیں سجدے میں اس طرح — فریادی ہوں گے مل کے لہو کو جبیں سے ہم
فتراک تک یہ سر جو نہ پہنچا تو یا نصیب — مدت لگے رہے ترے دامان زیں سے ہم
ہوتا ہے شوق وصل کا انکار سے زیاد — کب تجھ سے دل اٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم
چھاجے جو پیش دستی کرے نور ماہ پر — دیکھی عجب سفیدی تری آستیں سے ہم
یہ شوق صید ہونے کا دیکھو کہ آپ کو — دکھلایا صیدگہ میں یسار و یمیں سے ہم
تکلیف درد دل کی نہ کر تنگ ہوں گے لوگ — یہ بات روز کہتے رہے ہم نشیں سے ہم
اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں — سونا لیا ہے گودوں میں بھر کر وہیں سے ہم

آوارہ گردی اپنی کھنچی میر طول کو
اب چاہیں گے دعا کسو عزلت نشیں سے ہم

ردیف ن

(۸۶۴)

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں — چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز — لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں کشتے ہم — درد جانکاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں
جی اگر زلفوں کے سودے میں ترے دوں تو نہ بول — پہلی قیمت کے تئیں مشک بہا کہتے ہیں

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

(۸۶۵)

کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب واں عیاں نہیں — جن کے نشاں تھے فیلوں پر ان کا نشاں نہیں
دفتر بنے کہانی بنی مثنوی ہوئی — کیا شرح سوز عشق کروں میں زباں نہیں
اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا — مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں
ہنگامہ و فساد کی باعث ہے وہ کمر — پھر آپ خوب دیکھیے تو درمیاں نہیں
جی ہی نکل گیا جو گیا یار پاس سے — جسم ضعیف و زار میں اب میرے جاں نہیں
ہے عشق ہی سے چار طرف بحث و گفتگو — شور اس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں

اس عہد کو نہ چاہیے اگلا سا عہد میر
وہ دور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

(۸۶۶)

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں　　وہی اک جنس ہے اس کارواں میں
کیا منھ بند سب کا بات کہتے　　بلا کچھ سحر ہے اس کی زباں میں
اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے　　ہمیں سب جانتے ہیں ہندوستاں میں
نیا آناً فآناً اس کو دیکھا　　جدا تھی شان اس کی ہر زماں میں
کھنچی رہتی ہے اس ابروے خم سے　　کوئی کیا شاخ نکلی ہے کماں میں
جبیں پر چین رہتی ہے ہمیشہ　　بلا کینہ ہے اپنے مہرباں میں
نیا ہے کیا شگوفہ یہ کہ اکثر　　رہا ہے پھول پڑتا گلستاں میں
کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی　　پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں
پھرے ہے چھانتا ہی خاک اے میر
ہوس کیا ہے مزاج آسماں میں

(۸۶۷)

نہیں تبخال لعل دلربا میں　　گہر پہنچا بہم آب بقا میں
غریبانہ کوئی شب روز کر یاں　　ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں
اٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہو کر　　اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں
کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا　　عجب نسبت ہے بندے میں خدا میں
کفن میں ہی نہ پہنا وہ بدن دیکھ　　کھنچے لوہو میں بہتیروں کے جامیں
ادھر جانے کو آندھی تو ہے لیکن　　سبک پائی سی ہے باد صبا میں
بلا تہ دار بحر عشق نکلا　　نہ ہم نے انتہا لی ابتدا میں
ملے برسوں وہی بیگانہ ہے وہ　　ہنر ہے یہ ہمارے آشنا میں
اگرچہ خشک ہیں جیسے پر کاہ
اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

(۸۶۸)

مر مر گئے نظر کر اس کے برہنہ تن میں　　کپڑے اتارے ان نے سر کھینچے ہم کفن میں
گل پھول سے کب اس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں　　لائی بہار ہم کو زورآوری چمن میں
اب لعل نو خط اس کے کم بخشتے ہیں فرحت　　قوت کہاں رہے ہے یاقوتی کہن میں
یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا　　پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہورہا ہے اب شیخ و برہمن میں

آجاتے شہر میں تو جیسے کہ آندھی آئی
کیا وحشتیں کیا ہیں ہم نے دوان پن میں

ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ہے ہمارے اے میر ہر سخن میں

(۸۶۹)

کن نے لپٹے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں
ان نے جو اس طول سے کھینچا پریشانی کے تئیں

کشتۂ انداز کس کا تھا نہ جانا وہ جواں
لے رہے تھے کچھ ملک اک نعش قربانی کے تئیں

چشم کم سے اشک خونیں کو نہ دیکھو زینہار
ڈھونڈتے ہیں مردم اس یاقوت سیلانی کے تئیں

طائران خوش معاش اس باغ کے ہم تھے کبھو
اب ترستے ہیں قفس میں اک پر افشانی کے تئیں

ہے جہان تنگ سے جانا بعینہ اس طرح
قتل کرنے لے چلیں ہیں جیسے زندانی کے تئیں

یہ کہاں بنت العنب سے اٹھتی ہیں کیفیتیں
ہونٹوں سے کیا اس کے نسبت ایسی مستانی کے تئیں

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روے یار کا
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ہے طفل اشک
روؤں کیا اے ہم نشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

کچھ نظر میں نے نہ کی جی کے زیاں پر اپنے ہائے
دوست میں رکھے گیا اس دشمن جانی کے تئیں

جب جلے چھاتی بہت تب اشک افشاں ہو نہ میر
کیا جو چھڑکا اس دہکتی آگ پر پانی کے تئیں

(۸۷۰)

جانا ادھر سے میر ہے ویسا ادھر کے تئیں
بیماریوں میں جیسے بدلتے ہیں گھر کے تئیں

کب ناخنوں سے چہرہ بچے اس صفا سے ہوں
رجھواڑ تم نہیں ہو جو دیکھو ہنر کے تئیں

خستے کو اس نگہ کے طبیبوں سے کام کیا
ہمدم مجھے دکھا کسو صاحب نظر کے تئیں

فردوس ہو نصیب پدر آدمی تھا خوب
دل کو دیا نہ ان نے کسو خوش پسر کے تئیں

ٹک دل کی بے قراری میں جاتے ہیں جی چلے
ہر دم طپش سرا ہے میرے جگر کے تئیں

تم دل سے جو گئے سو خرابی بہت رہی
پھر بھی بساؤ آ کے اس اجڑے نگر کے تئیں

اللہ رے نازکی نہیں آتی خیال میں
کس کس طرح سے باندھتے ہیں اس کمر کے تئیں

حالت یہ ہے کہ بے خبری دم بہ دم ہے یاں
دے اب تلک بھی آتے نہیں ٹک خبر کے تئیں

مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمیں نہیں
کیا جانیے کہ میر گئے ہم کدھر کے تئیں

(۸۷۱)

کیا کہوں اول بخود تو دیر میں آتا ہوں میں
پھر جو یاد آتا ہے وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

داغ ہوں کیونکر نہ میں درویش یارو جب نہ تب
بوریا پوشوں ہی میں وہ شعلہ‌خو پاتا ہوں میں

ہجر میں اس طفل بازی کوش کے رہتا ہوں جب
جا کے لڑکوں میں تنک اپنے دل کو بہلاتا ہوں میں

ہوں گرسنہ‌چشم میں دیدار خوباں کا بہت
دیکھنے پر ان کے تلواریں کھڑا کھاتا ہوں میں

آب سب ہوتا ہوں پاکر آپ کو جیسے حباب
یعنی اس ننگ عدم ہستی سے شرماتا ہوں میں

ایک جا کہ کب ٹھہرنے دے ہے مجھ کو روزگار
کیوں تم اکتاتے ہو اتنا آج کل جاتا ہوں میں

ہے کمال عشق پر بے طاقتی دل کی دلیل
جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں

آسماں معلوم ہوتا ہے ورے کچھ آ گیا
دور اس سے آہ کیسا کیسا گھبراتا ہوں میں

بس چلے تو راہ اودھر کی نہ جاؤں لیک میرؔ
دل مرا رہتا نہیں ہر چند سمجھاتا ہوں میں

(۸۷۲)

مدت ہوئی کہ بیچ میں پیغام بھی نہیں
نامے کا اس کی مہر سے اب نام بھی نہیں

ایام ہجر کریے بسر کس امید پر
ملنا انھوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں

پروا اسے ہو کاہے کو ناکام گر مروں
اس کام جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں

روویں اس اضطراب دلی کو کہاں تلک
دن رات ہم کو ایک دم آرام بھی نہیں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

(۸۷۳)

دم بہ دم اس ڈھب سے رونا دیر کر آیا ہمیں
کیا لہو اپنا پیا تب یہ ہنر آیا ہمیں

گرچہ عالم جلوہ گاہ یار یوں بھی تھا ولے
آنکھیں جوں موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں

ہم تبھی سمجھے تھے اب اس سادگی پر حرف ہے
خط نکلنے سے جو نامہ بیشتر آیا ہمیں

پاس آتا یک طرف مطلق نہیں اب اس کے پاس
کچھ گئے گذرے سے سمجھا وہ پسر آیا ہمیں

تجھ تک اس بے طاقتی میں کیا پہنچنا سہل تھا
غش ترے کوچے میں ہر ہر گام پر آیا ہمیں

صبح نکلا تھا پسر تلوار جوں خورشید لے
دیکھ کر خونخوار بج اس کی خطر آیا ہمیں

کر چلا بے‌خود غم زلف دراز دلبراں
دور کا اے میرؔ درپیش اب سفر آیا ہمیں

(۸۷۴)

اشک کے جوش سے ہوں شام و سحر پانی میں
جیسے ماہی ہے مجھے سیر و سفر پانی میں

شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی میں
گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں[(۱)]

ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہر تر پانی میں

رونے سے بھی نہ ہوا سبز درخت خواہش
گرچہ مرجاں کی طرح تھا یہ شجر پانی میں

موج گریہ کی وہ شمشیر ہے جس کے ڈر سے
جوں کشف خصم چھپا زیر سپر پانی میں

بیٹھنے سے کسو دل صاف کے سرمت تو چڑھے
خوب سا کر لے تامل تو اتر پانی میں

آتش عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

جوشش اشک میں شب دل بھی گیا سینے سے
کچھ نہ معلوم ہوا ہائے اثر پانی میں

بردباری ہی میں کچھ قدر ہے گو جی ہو فنا
عود پھر لکڑی ہے ڈوبے نہ اگر پانی میں

چشم تر ہی میں رہے کاش وہ روے خوش رنگ
پھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں

روؤں تو آتش دل شمع نمط بجھتی نہیں
مجھ کو لے جاکے ڈبو دیویں مگر پانی میں

گریۂ زار میں بیتابی دل طرفہ نہیں
سینکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

برگ گل جوں گذر آب سے آتے ہیں چلے
رونے سے دوہیں مرے لخت جگر پانی میں

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اس کی جیسے
بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

وہ گہر آنکھ سے جاوے تو تھمے آنسو میرؔ
اتنا رویا ہوں کہ ہوں تا بہ کمر پانی میں

(۸۷۵)

جوشش اشک سے ہوں آٹھ پہر پانی میں
گرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں

ضبط گریہ نے جلایا ہے دروںہ سارا
دل اچنبھا ہے کہ ہے سوختہ تر پانی میں

آب شمشیر قیامت ہے برندہ اس کی
یہ گوارائی نہیں پاتے ہیں ہر پانی میں

طبع دریا جو ہو آشفتہ تو پھر طوفاں ہے
آہ بالوں کو پراگندہ نہ کر پانی میں

غرق آب اشک سے ہوں لیک اڑا جاتا ہوں
جوں سمک گوکہ مرے ڈوبے ہیں پر پانی میں

مردم دیدۂ تر مردم آبی ہیں مگر
رہتے ہیں روز و شب و شام و سحر پانی میں

ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے
اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں

گریۂ شب سے بہت آنکھ ڈرے ہے میری
پاؤں رکھتے ہی نہیں بار دگر پانی میں

فرط گریہ سے ہوا میرؔ تباہ اپنا جہاز
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

---

(۱) اس مطلعے سے اگلا شعر مربوط ہے۔ مصحح

(۸۷۶)

رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں
کہ مل جاتا ہے ان جوؤں کا پانی بحر رحمت میں

سنبھالے سدھ کہاں سر ہی فرو لاتا نہیں ہرگز
وگرنہ مان جاتا تھا کہاں تھوڑی سی منت میں

گئے دن متصل جانے کے اس کی اور اٹھ اٹھ کر
نقاہت ہوگیا اب تو بہت پاؤں کی طاقت میں

تحمل ہوسکا جب تک بدن میں تاب و طاقت تھی
قیامت اب گذر جاتی ہے جی پر ایک ساعت میں

عجب کیا ہے جو یاران چمن کو ہم نہ پہچانیں
رہائی اتفاق اپنی پڑی ہے ایک مدت میں

سلاتا تیغ خوں میں گر نہ میرے تو قیامت تھی
اٹھا تھا روز محشر کا سا فتنہ رات صحبت میں

کوئی عمامہ لے بھاگا کنھوں نے پیرہن پھاڑا
بہت گستاخیاں یاروں نے کیں واعظ کی خدمت میں

ملا تیوری چڑھائے تو لگا ابرو بھی خم کرنے
موثر کچھ ہوا سر مارنا محراب طاعت میں

قدم پر رکھ قدم اس کے بہت مشکل ہے مر جانا
سرآمد ہوگیا ہے میرؔ فن مہر و الفت میں

(۸۷۷)

کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں
دل تو کچھ دھنسکا ہی جاتا ہے کروں سو کیا کروں

لوہو روتا ہوں میں ہر اک حرف خط پر ہمدماں
اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں

چال اپنی چھوڑتا ہرگز نہیں وہ خوش خرام
شور سے کب تک قیامت ایک میں برپا کروں

مصلحت ہے میری خاموشی ہی میں اے ہم نفس
لوہو ٹپکے بات سے جو ہونٹ اپنے وا کروں

دل پریشانی مجھے دے ہے بکھیرے گل کے رنگ
آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ میں یکجا کروں

ایک چشمک ہی چلی جاتی ہے گل کی میری اور
یعنی بازار جنوں میں جاؤں کچھ سودا کروں

خوار تو آخر کیا ہے گلیوں میں تونے مجھے
تو سہی اے عشق جو تجھ کو بھی میں رسوا کروں

خاک اڑاتا اشک افشاں آن نکلوں میں تو پھر
دشت کو دریا کروں بہتی کے تیں صحرا کروں

کعبے جانے سے نہیں کچھ شیخ مجھ کو اتنا شوق
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

اب کے ہمت صرف کر جو اس سے جی اپنے مرا
پھر دعا اے میرؔ مت کریو اگر ایسا کروں

(۸۷۸)

کیا کوفتیں اٹھائیں ہجراں کے درد و غم میں
تڑپا ہزار نوبت دل ایک ایک دم میں

گو قیس منھ کو نوچے فرہاد سر کو چیرے
یہ کیا عجب ہے ایسے ہوتے ہیں لوگ ہم میں

اہل نظر کسو کو ہوتی ہے محرمیت
آنکھوں کے اندھے ہم تو مدت رہے حرم میں

کلفت میں گزری ساری مدت تو زندگی کی   آسودگی کا منہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں

کرتے ہیں میر مل کر واعظ سے جس دم کا
کیا یہ بھی آگئے ہیں اس پوچ گو کے دم میں

(۸۷۹)

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں   اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
بے کلی دل ہی کی تماشا ہے   برق میں ایسے اضطراب کہاں
خط کے آئے پہ کچھ کہے تو کہے   ابھی مکتوب کا جواب کہاں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ   ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں   مجھ بلانوش کو شراب کہاں
عشق ہے عاشقوں کے جلنے کو   یہ جہنم میں ہے عذاب کہاں
داغ رہتا دل و جگر کا دیکھ   جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں
محو ہیں اس کتابی چہرے کے   عاشقوں کو سر کتاب کہاں

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

(۸۸۰)

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں   اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں
ایک ایک قرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو   جام شراب پر نہ کرو میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ   جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام سے   یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں
معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے   تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں
بھاگی نماز جمعہ تو جاتی نہیں ہے کچھ   چلتا ہوں میں بھی ٹک تو رہو میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

(۸۸۱)

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں   ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں
پاس ظاہر تک نہ کرتے شب تو ہم   بھر رہے تھے خوب روتے عشق میں
خواب میں دیکھا اسی کو ایک رات   برسوں کاٹے ہم نے سوتے عشق میں

کاش پی جایا ہی کرتے اشک کو   داغ دل پر کے تو دھوتے عشق میں

دیکھے ہیں کیا کیا ڈھلکتے اشک میرؔ
بیٹھے موتی سے پروتے عشق میں

(۸۸۲)

کرتے ہیں جوکہ جی میں ٹھانے ہیں   خوبرو کس کی بات مانے ہیں
میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں   پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں
جا ہمیں اس گلی میں گر رہنا   ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں
پوچھ اہل طرب سے شوق اپنا   وے ہی جانیں جو خاک چھانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن   وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور   اب مرے عہد میں فسانے ہیں
دل پریشاں ہوں میں تو خوش وے لوگ   عشق میں جن کے جی ٹھکانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں   شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

(۸۸۳)

آپ اس جنس کے ہیں ہم بھی خریداروں میں   پگڑی جاے بکے جس کے لیے بازاروں میں
باغ فردوس کا ہے رشک وہ کوچہ لیکن   آدمی ایک نہیں اس کے ہواداروں میں
ایک کے بھی وہ برے حال میں آیا نہ کبھو   لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں
دوستی کس سے ہوئی آنکھ کہاں جاکے لڑی   دشمنی آئی جسے دیکھتے ہی یاروں میں
ہائے رے ہاتھ جہاں چوٹ پڑی دو ہی کیا   الغرض ایک ہے وہ شوخ ستمگاروں میں
کشمکش جس کے لیے یہ ہے شمار دم یہ   ان نے ہم کو نہ گنا اپنے گرفتاروں میں
کیسی کیسی ہے عناصر میں بھی صورت بازی   شعبدے لاکھوں طرح کے ہیں انھیں چاروں میں
مشفقو ہاتھ مرے باندھو کہ اب کے ہر دم   جا الجھتے ہیں گریبان کے دو تاروں میں
حسب قسمت سبھوں نے کھائے تری تیغ کے زخم   تا کس اک نکلے ہمیں خوں کے سزاواروں میں

اضطراب و قلق و ضعف ہیں گر میرؔ بھی
زندگی ہو چکی تو اپنی ان آزاروں میں

(۸۸۴)

امید دل وہی تھی جن سے وے آزار کرتے ہیں
بہت پرہیز کر ہم سے ہمیں بیمار کرتے ہیں

کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہوگا
بھری مجلس میں بیٹھے عشق کے اقرار کرتے ہیں

نشاں دے ہیں جہاں اس کا وہ ہرجائی نہیں ملتا
محلے کے ہمیں اب لوگ یوں ہی خوار کرتے ہیں

حجاب ناکسی سے مر گئے روپوش کب تک ہوں
جنھوں سے عاشقی ہم کو سو ہم سے عار کرتے ہیں

چھپا لیتا ہے مجھ سے چاند سا منھ وہ خدا جانے
سخن ساز اس کنے جاجا کے کیا اظہار کرتے ہیں

الف کی رمز اگر سمجھا اٹھا دل بحث علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں

بہت ہے تیز آب جدول شمشیر خوباں کا
اسے پھر پار کردیں ہیں یہ جس پر وار کرتے ہیں

الوکھا تو کہ یاں فکر اقامت تجھ کو ہے ورنہ
سب اس دلکش جگہ سے رخت اپنا بار کرتے ہیں

بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے ان کا
کسو بے مہر کے تیں میر شاید پیار کرتے ہیں

(۸۸۵)

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں
یارب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں

گرمی نہیں ہے ہم سے وہ اے رشک آفتاب
اب آگیا ہے فرق بہت اس تپاک میں

اس ڈھنگ سے ہلا کہ بجا دل نہیں رہے
اس گوش کے گہر سے دم آئے ہیں ناک میں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہیے لطافت اس تن نازک کی میر کیا
شاید یہ لطف ہوگا کسو جان پاک میں

(۸۸۶)

محمل نشیں ہیں کتنے خدام یار میں یاں
لیلیٰ کا ایک ناقہ سو کس قطار میں یاں

سن شور کل قفس میں دل داغ سب ہوا ہے
کیا پھول گل کھلے ہیں اب کے بہار میں یاں

کب روشنی ہو میرے رونے میں ابر تجھ سے
دریا بھرے ہیں ایک اک دامن کے تار میں یاں

تم تو گئے دکھاکر ٹک برق کے سے جھمکے
آیا بہت تفاوت صبر و قرار میں یاں

ہم مر گئے ولیکن سوز دروں وہی ہے
ایک آگ لگ اٹھی ہے کنج مزار میں یاں

ہجراں کی ہر گھڑی ہے سو سو برس تعب سے
روز شمار یارو ہے کس شمار میں یاں

جن راتوں میر ہم کو رونے کا مشغلہ تھا
رہتا تھا بحر اعظم سو تو کنار میں یاں

(۸۸۷)

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں — الا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں
خاک ہوئے برباد ہوئے پامال ہوئے سب محو ہوئے — اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں
زردی رخ رونا ہر دم کا شاہد دو جب ایسے ہوں — چاہت کا انصاف کرو تم کیونکر ہم انکار کریں
باغ میں اب آجاتے ہیں تو صرفہ اپنا چپ میں ہے — خوبی بیاں کر تیری ہم کیا گل کو گلے کا ہار کریں
شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہے — کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منت ہم سو بار کریں
ہم تو فقیر ہیں خاک برابر آ بیٹھے تو لطف کیا — ننگ جہاں لگتا ہو ان کو واں وے ایسی عار کریں
پتا پتا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے — اور کہے تو جس سے اے گل بے برگی اظہار کریں
کیا ان خوش ظاہر لوگوں سے ہم یہ توقع رکھتے تھے — غیر کو لے کر پاس بیٹھیں ہم کو گلیوں میں خوار کریں

میرؔ جی ہیں گے ایک جو آئے کیا ہم ان سے درد کہیں
کچھ بھی جو سن پاویں تو یہ مجلس میں بستار کریں

(۸۸۸)

گر کوئی اعمیٰ کہے کچھ پر کہاں وہ تو کہاں — لے گئے پیش فلک اس مہ کا ایسا رو کہاں
گل کو کیا نسبت ہے تجھ سے میں نہ مانوں زینہار — رنگ اگر بالفرض تیرا سا ہوا یہ بو کہاں
عشق لاتا ہے بروے کار مجنوں سا کبھو — بید بہتیرے کھڑے ہیں وے پریشاں مو کہاں
دیکھیاں کجیاں کمانوں کی بھی خم محراب کے — پر دلوں کو کھینچتے ہیں جیسے دے ابرو کہاں
سنبل آپھی آپ پیچ و تاب یوں کھایا کرے — یار کی سی زلف کے وے حلقہ حلقہ مو کہاں
آگے یہ آنکھیں گلے کی ہار ہی رہتی تھیں روز — اب جگر میں خوں نہیں وے سہرے سے آنسو کہاں

میرؔ سچ کہتا تھا جنت ہو نصیب اس کے تئیں
حور کا چہرہ کہاں اس کا رخ نیکو کہاں

(۸۸۹)

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں — بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں
پوچھا کیے ہیں مجھ سے گل برگ لب کو تیرے — بلبل کے ہاتھ جب میں گلزار میں لگا ہوں
اب کارشوق دیکھوں پہنچے مرا کہاں تک — قاصد کے پیچھے میں بھی بے طاقت اٹھ چلا ہوں
تجھ سے متاع خوش کا کیونکر نہ ہوں معرف — یوسف کے ہاتھ پیارے کچھ میں نہیں بکا ہوں
گل پھول کوئی کب تک جھڑجھڑ کے گرتے دیکھے — اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں
کیا کیا کیا تامل اس فکر میں گیا گھل — سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانیے کہ کیا ہوں

ایک آدھ دم میں میں تو شبنم نمط ہوا ہوں ہوتا ہے گرم کیا تو اے آفتاب خوبی
وہ سرکشی کہاں ہے اب تو بہت دبا ہوں پیری سے جھکتے جھکتے پہنچا ہوں خاک تک میں
مجھ کو بلا ہے وحشت اے میر دور اس سے
جاگہ سے جب اٹھا ہوں آشوب سا اٹھا ہوں

(۸۹۰)

کوچے میں تیرے میر کا مطلق اثر نہیں — کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں
ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف — مر جانا آنکھیں موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز — کیا اے شب فراق تجھی کو سحر نہیں
ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ہے لیک — دامن ہمارا ابر کے مانند تر نہیں
گلگشت اپنے طور پہ ہے سو تو خوب یاں — شائستۂ پریدن گلزار پر نہیں
کیا ہو جے حرف زن گذر دوستی سے آہ — خط لے گیا کہ راہ میں پھر نامہ بر نہیں
آنکھیں تمام خلق کی رہتی ہیں اس کی اور — مطلق کسو کو حال پہ میرے نظر نہیں
کہتے ہیں سب کہ خون ہی ہوتا ہے اشک چشم — راتوں کو گر بکا ہے یہی تو جگر نہیں
جاکر شراب خانے میں رہتا نہیں تو پھر
یہ کیا کہ میر جمعے ہی کی رات گھر نہیں

(۸۹۱)

گو جان کر تجھے سب تعبیر کر رہے ہیں — ہم لوگ تیرے اوپر سو جی سے مر رہے ہیں
کھنچتا چلا ہے اب تو تصدیق کو تصور — ہر لحظہ اس کے جلوے پیش نظر رہے ہیں
نکلے ہوس جو اب بھی ہو وا رہی قفس سے — شائستۂ پریدن دوچار پر رہے ہیں
کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر — اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں
کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں — جوں چشمہ یوں ہی برسوں ہم چشم تر رہے ہیں
نے غم ہے ہم کو یاں کا نے فکر کچھ ہے واں کا — صدقے جنوں کے کیا ہم بے درد سر رہے ہیں
پاس ایک دن بھی اپنا ان نے نہیں کیا ہے — ہم دور اس سے بے دم دو دو پہر رہے ہیں
کیا یہ سرائے فانی ہے جائے باش اپنی — ہم یاں مسافرانہ آکر اتر رہے ہیں
ایسا نہ ہو کہ چھیڑے یک بار پھوٹ بہیے — ہم پکے پھوڑے کے اب مانند بھر رہے ہیں
اس میکدے میں جس جا ہشیار چاہیے تھے — رحمت ہے ہم کو ہم بھی کیا بے خبر رہے ہیں
گو راہ عشق میں ہو شمشیر کے دم اوپر — وسواس کیا ہے ہم تو جی سے گذر رہے ہیں
چل ہم نشیں بنے تو ایک آدھ بیت سنیے
کہتے ہیں بعد مدت میر اپنے گھر رہے ہیں

(۸۹۲)

یوں قیدیوں سے کب تئیں ہم تنگ تر رہیں — جی چاہتا ہے جا کے کسو اور مر رہیں
اے کاش ہم کو سکر کی حالت رہے مدام — تا حال کی خرابی سے ہم بےخبر رہیں
رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں کہیں — دو تین آکے لوٹے مسافر اتر رہیں
وعدہ تو تب ہو صبح کا جب ہم بھی جاں بلب — جیسے چراغ آخر شب تا سحر رہیں
آوارگی کی سب ہیں یہ خانہ خرابیاں — لوگ آویں دیکھنے کو بہت ہم جو گھر رہیں
ہم نے بھی نذر کی ہے کہ پھریے چمن کے گرد — یارب قفس کے چھوٹنے تک بال و پر رہیں
ان دلبروں کی آنکھ نہیں جاے اعتماد — جب تک رہیں یہ چاہیے پیش‌نظر رہیں
فردا کی فکر آج نہیں مقتضاے عقل — کل کی بھی دیکھ لیویں گے کل ہم اگر رہیں

تیغ و تبر رکھا نہ کرو پاس میرؔ کے
ایسا نہ ہو کہ آپ کو ضائع دے کر رہیں

(۸۹۳)

دل کو لکھوں ہوں آہ وہ کیا مدعا لکھوں — دیوانے کو جو خط لکھوں بتلاؤ کیا لکھوں
کیا کیا لقب ہیں شوق کے عالم میں یار کے — کعبہ لکھوں کہ قبلہ اسے یا خدا لکھوں
حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب — اس دردمند عشق کی میں کیا دوا لکھوں
وحشت زدوں کو نامہ لکھوں ہوں نہ کس طرح — مجنوں کو اس کے حاشیے پر میں دعا لکھوں

کچھ روبرو ہوئے پہ جو سلجھے تو سلجھے میرؔ
جی کے الجھنے کا اسے کیا ماجرا لکھوں

(۸۹۴)

جب سے ہے اس کی ابروے خمدار درمیاں — رہتی ہے میرے خلق کے تلوار درمیاں
برپا ہوا ہجوم سے اک حشر تازہ واں — آیا جہاں کہیں قدم یار درمیاں
اس کام جاں میں ہم میں ہوا ہے حجاب چشم — یوں رہیے آہ کب تئیں دیوار درمیاں
سو بار اس سے فتنے جہاں میں اٹھے ولے — دیکھی نہ ہم نے وہ کمر اک بار درمیاں
کیا کہیے آہ جی کو قیامت ہے انتظار — آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیاں
رکھ دی ہے کتنے روزوں سے تلوار یار نے — کوئی نہیں ہے خوں کا سزاوار درمیاں
ثابت ہے ساری خلق کے اوپر کہ تو ہے ایک — حاجت نہیں جو آوے یہ تکرار درمیاں
آیا کیے دماغ کے اعضا میں یہ فتور — ٹھہرے قشون کیا نہیں سردار درمیاں

بازار میں دکھائی ہے کب ان نے جنس حسن — جو بک نہیں گئے ہیں خریدار درمیاں
دیکھیں چمن جو سینۂ پر داغ سے بڑھیں — بیداد ہے یہ قطعۂ گلزار درمیاں
کھنچنے نہ پائی اس کی تو تلوار بھیڑ میں — مارا گیا عبث یہ گنہگار درمیاں
اب کے جنوں کے بیچ گریباں کا ذکر کیا — کہیے بھی جو رہا ہو کوئی تار درمیاں

کتنے دلوں سے میرؔ کا نالہ نہیں سنا
شاید نہیں ہے اب وہ گرفتار درمیاں

(۸۹۵)

اتفاق ایسا ہے کڑھتے ہی سدا رہتے ہیں — ایک عالم میں ہیں ہم وے پہ جدا رہتے ہیں
برسے تلوار کہ حائل ہو کوئی سیل بلا — پیش کچھ آؤ ہم اس کوچے میں جا رہتے ہیں
کام آتا ہے میسر کسے ان ہونٹوں سے — بابت بوسہ ہیں پر سب کو چما رہتے ہیں
دشت میں گرد رہ اس کی اٹھے ہے جیدھر سے — وحش و طیر آنکھیں ادھر ہی کو لگا رہتے ہیں
کیا تری گرمی بازار کہیں خوبی کی — سینکڑوں آن کے یوسف سے بکا رہتے ہیں
بسترا خاک رہ اس کی تو ہے اپنا لیکن — گریۂ خونیں سے لوہو میں نہا رہتے ہیں
کیوں اڑاتے ہو بلایا ہمیں کب کب ہم آپ — جیسے گردان کبوتر یہیں آ رہتے ہیں
حق تلف کن ہیں بتاں یاد دلاؤں کب تک — ہر سحر صحبت دوشیں کو بھلا رہتے ہیں

یاد میں اس کے قد و قامت دلکش کی میرؔ
اپنے سر ایک قیامت نئی لا رہتے ہیں

(۸۹۶)

باغ گو سبز ہوا اب سرگلزار کہاں — دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
تم تو اب آنے کو پھر کہہ چلے ہو کل لیکن — بےکلی ایسا ہی رہا شب تو یہ بیمار کہاں
دل کی خواہش ہو کسو کو تو کبھی دل کی نہیں — اب یہی جنس بہت ہے پہ خریدار کہاں
خاک یاں چھانتے ہی کیوں نہ پھرو دل کے لیے — ایسا پہنچے ہے بہم پھر کوئی غم خوار کہاں
دم زدن مصلحت وقت نہیں اے ہمدم — جی میں کیا کیا ہے مرے پر لب اظہار کہاں
شیخ کے آنے ہی کی دیر ہے میخانے میں پھر — سبحہ سجادہ کہاں جبہ و دستار کہاں
ہم سے ناکس تو بہت پھرتے ہیں جی دیتے ولے — زخم تیغ اس کے اٹھانے کا سزاوار کہاں
تو نے بھی گرد رخ سرخ نکالا خط سبز — باغ شاداب جہاں میں گل بےخار کہاں
خبط نے عقل کے سر رشتے کیے گم سارے — اب جو ڈھونڈو تو گریباں میں کوئی تار کہاں
گو کہ گردن تئیں یاں کوئی لہو میں بیٹھے — ہاتھ اٹھاتا ہے جفا سے وہ ستم گار کہاں

ڈوبا لوہو میں پڑا تھا ہمگی پیکر میرؔ
یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

(۸۹۷)

اے مجھ سے تجھ کو سو ملے تجھ سا نہ پایا ایک میں
سو سو کہیں تو نے مجھے منھ پر نہ لایا ایک میں

عالم کی میں نے سیر کی مجھ کو جو خوش آیا سو تو
سب سے رہا محظوظ تو تجھ کو نہ بھایا ایک میں

یہ جوشِ غم ہوتے بھی ہیں یوں ابرتر روتے بھی ہیں
چشم جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک میں

تھا سب کو دعوئ عشق کا لیکن نہ ٹھہرا کوئی بھی
دانستہ اپنی جان سے دل کو اٹھایا ایک میں

ہیں طالب صورت سبھی مجھ پر ستم کیوں اس قدر
کیا مجرم عشق بتاں یاں ہوں خدایا ایک میں

بجلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چکے
جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں

سو رنگ وہ ظاہر ہوا کوئی نہ جاگہ سے گیا
دل کو جو میرے چوٹ تھی طاقت نہ لایا ایک میں

اس گلستاں سے منفعت یوں تو ہزاروں کو ہوئی
دیکھا نہ سرو و گل کا یاں تک سر پہ سایہ ایک میں

رسم کہن ہے دوستی ہوتی بھی ہے الفت بہم
میں کشتنی ٹھہرا جو ہوں کیا دل لگایا ایک میں

جن جن نے دیکھا تھا اسے بے خود ہوا چیتا بھی پھر
پر میرؔ جیتے جی بخود ہرگز نہ آیا ایک میں

(۸۹۸)

اگرچہ اب کے ہم اے ابر خشک مژگاں ہیں
پہ جوش دل میں کبھو آگیا تو طوفاں ہیں

صنم پرستی میں اے راہباں نہ کی تقصیر
تم اہل صومعہ سے پوچھو وے مسلماں ہیں

کریں انھوں پہ بھلا کس طرح نظر گستاخ
بتانِ شہر ہمارے تو دین و ایماں ہیں

چمن میں جاکے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں

رہے ہیں دیکھ جو تصویر سے ترے منھ کو
ہماری آنکھ سے ظاہر ہے یہ کہ حیراں ہیں

رہا ہے کون سا پردہ ترے ستم کا شوخ
کہ زخم سینہ ہمارے سبھی نمایاں ہیں

شبیہ شکل سا ہے حال ضبط عشق کے بیچ
کہ رنگ روپ ہے سب کچھ ولیک بے جاں ہیں

بنے تو عزت عشاق میں نہ کر تقصیر
کہ ایسے لوگ پیارے عزیز مہماں ہیں

جو ابر دشت میں برسے تو ہم اڑاویں خاک
وہ میرؔ آب ہے ہم یاں کے میر ساماں ہیں

(۸۹۹)

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں
عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں

خوب رو ہی فقط نہیں وہ شوخ
حسن کیا کیا ادائیں کیا کیا ہیں

فکر تعمیر دل کسو کو نہیں
ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں

گہ نسیم و صبا ہے گاہ سموم — اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں
شور ہے ترک شیخ کا لیکن — چپکے چپکے دعائیں کیا کیا ہیں

منظر دیدہ قصر دل اے میر
شہر تن میں بھی جائیں کیا کیا ہیں

(۹۰۰)

فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں — پلک سے پلک آشنا ہی نہیں
گلہ عشق کا بدو خلقت سے ہے — غم دل کو کچھ انتہا ہی نہیں
محبت جہاں کی تہاں ہو چکی — کچھ اس روگ کی بھی دوا ہی نہیں
دکھایا کیے یار اس رخ کا سطح — کہیں آرسی کو حیا ہی نہیں
وہ کیا کچھ نہیں حسن کے شہر میں — نہیں ہے تو رسم وفا ہی نہیں
چمن محو اس روے خوش کا ہے سب — گل تر کی اب وہ ہوا ہی نہیں

نہیں دیر اگر میر کعبہ تو ہے
ہمارے کوئی کیا خدا ہی نہیں

(۹۰۱)

دل لے کے کیسے کیسے جھگڑے مجادلے ہیں — بدوضع یاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں
گھبرانے لگتیاں ہیں رک رک کے تن میں جانیں — کرتے ہیں جو وفائیں ان ہی کے حوصلے ہیں
کیا قدر تھی سخن کی جب یاں بھی صحبتیں تھیں — ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں
جب کچھ تھی جہت مجھ سے تب کس سے ملتے تھے تم — اطراف کے یہ بے تہ اب تم سے آملے ہیں
تھا واجب الترحم مظلوم عشق تھا میں — اس کشتۂ ستم کو تم سے بہت گلے ہیں
سوز دروں سے کیونکر میں آگ میں نہ لوٹوں — جوں شیشۂ حبابی سب دل پر آبلے ہیں
میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے — یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مساہلے ہیں
اندیشہ زاد رہ کا رکھیے تو ہے مناسب — چلنے کو یاں سے اکثر تیار قافلے ہیں

پانچوں حواس گم ہیں ہر اک کے اس کمیں میں
کیا میر جی ہی تنہا ان روزوں وہ دلے ہیں

(۹۰۲)

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں — بہت ان نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں
پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم — ہوا ہے کہے تو کہ سایہ ہمیں

گہے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں
بٹھا اس کی خاطر میں نقش وفا نہیں تو اٹھالے خدایا ہمیں
ملے ڈالے ہے دل کوئی عشق میں یہ کیا روگ یارب لگایا ہمیں
ہوئی اس گلی میں تو مٹی عزیز ولے خواریوں سے اٹھایا ہمیں
جوانی دوانی سنا کیا نہیں حسینوں کا ملنا ہی بھایا ہمیں
نہ سمجھی گئی دشمنی عشق کی بہت دوستوں نے جتایا ہمیں
کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میر
بہت اس غزل پر رلایا ہمیں

(۹۰۳)

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں
سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں
یہی تا دم مرگ بیتاب تھے نہ اس بن ٹک صبر آیا ہمیں
شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا انھیں نے کنارے لگایا ہمیں
ہمارا نہیں تم کو کچھ پاس رنج یہ کیا تم نے سمجھا ہے آیا ہمیں
لگی سر سے جوں شمع پا تک گئی سب اس داغ نے آہ کھایا ہمیں
جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں
ازل میں ملا کیا نہ عالم کے تئیں قضا نے یہی دل دلایا ہمیں
رہا تو تو اکثر الم ناک میر
ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

(۹۰۴)

کیا عبث مجنوں پئے محمل ہے میاں یہ دوانہ باؤلا عاقل ہے میاں
قند کا کون اس قدر مائل ہے میاں جو ہے ان ہونٹوں ہی کا قائل ہے میاں
ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں
چشم تر کی خیر جاری ہے سدا سیل اس دروازے کا سائل ہے میاں
مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں
دل کی پامالی ستم ہے قہر ہے کوئی یوں دلتا ہے آخر دل ہے میاں
آج کیا فردائے محشر کا ہراس صبح دیکھیں کیا ہو شب حامل ہے میاں

دل تڑپتا ہی نہیں کیا چاہیے
کس شکار انداز کا بسمل ہے میاں

چاہیے پیش از نماز آنکھیں کھلیں
حیف اس کا وقت جو غافل ہے میاں

رنگ بے رنگی جدا تو ہے ولے
آب سا ہر رنگ میں شامل ہے میاں

سامنے سے ٹک ٹلے تو دق نہ ہو
آسماں چھاتی پر اپنی سل ہے میاں

دل لگی اتنی جہاں میں کس لیے
رہگذر ہے یہ تو کیا منزل ہے میاں

بے تہی دریاے ہستی کی نہ پوچھ
یاں سے واں تک سو جگہ ساحل ہے میاں

چشم حق بیں سے کرو ٹک تم نظر
دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہے میاں

دردمندی ہی تو ہے جو کچھ کہ ہے
حق میں عاشق کے دوا قاتل ہے میاں

برسوں ہم روتے پھرے ہیں ابر سے
زانو زانو اس گلی میں گل ہے میاں

کہنہ سالی میں ہے جیسے خورد سال
کیا فلک پیری میں بھی جاہل ہے میاں

کیا دل مجروح و محزوں کا گلہ
ایک غمگیں دوسرے گھائل ہے میاں

دیکھ کر سبزہ ہی خرم دل کو رکھ
مزرع دنیا کا یہ حاصل ہے میاں

مستعدوں پر سخن ہے آج کل
شعر اپنا فن سو کس قابل ہے میاں

کی زیارت میرؔ کی ہم نے بھی کل
لاابالی سا ہے پر کامل ہے میاں

(۹۰۵)

لذت سے درد کی جو کوئی آشنا نہیں
سو لطف کیوں نہ جمع ہوں اس میں مزہ نہیں

ہر آن کیا عوض ہے دعا کا بدی ولے
تم کیا کرو بھلے کا زمانہ رہا نہیں

روے سخن جو ہے تو مرا چشم دل کی اور
تم سے خدانخواستہ مجھ کو گلہ نہیں

تلوار ہی کھنچا کی ترے ہوتے بزم میں
بیٹھا ہے کب تو آکے کہ فتنہ اٹھا نہیں

مل دیکھے ایسے دلبر ہرجائی سے کوئی
بے جا نہیں ہے دل جو ہمارا بجا نہیں

ہو تم جو میرے حیرتی فرط شوق وصل
کیا جانو دل کسو سے تمھارا لگا نہیں

آئینے پر سے ٹک نہیں اٹھتی تری نظر
اس شوق کش کے منھ سے تجھے کچھ حیا نہیں

رنگ اور بو تو دلکش و دلچسپ ہیں کمال
لیکن ہزار حیف کہ گل میں وفا نہیں

تیر ستم کا تیرے ہدف کب تلک رہوں
آخر جگر ہے لوہے کا کوئی توا نہیں

ان نے تو آنکھیں موند لیاں ہیں ادھر سے واں
ایک آدھ دن میں دیکھیے یاں کیا ہے کیا نہیں

اٹھتے ہو میرؔ دیر سے تو کعبے چل رہو
مغموم کاہے کو ہو تمھارے خدا نہیں

(٩٠٦)

کیا کہیں آتش ہجراں سے گلے جاتے ہیں   چھاتیاں سلگیں ہیں ایسی کہ جلے جاتے ہیں
گوہر گوش کسو کا نہیں جی سے جاتا   آنسو موتی سے مرے منھ پہ ڈھلے جاتے ہیں
یہی مسدود ہے کچھ راہ وفا ورنہ بہم   سب کہیں نامہ و پیغام چلے جاتے ہیں
بارحرمان و گل و داغ نہیں اپنے ساتھ   شجر باغ وفا پھولے پھلے جاتے ہیں
حیرت عشق میں تصویر سے رفتہ ہی رہے   ایسے جاتے ہیں جو ہم بھی تو بھلے جاتے ہیں
ہجر کی کوفت جو کھینچے ہیں انھیں سے پوچھو   دل دیے جاتے ہیں جی اپنے ملے جاتے ہیں
یاد قد میں ترے آنکھوں سے بہیں ہیں جوئیں   گر کسو باغ میں ہم سرو تلے جاتے ہیں
دیکھیں پیش آوے ہے کیا عشق میں اب تو جوں سیل   ہم بھی اس راہ میں سر گاڑے چلے جاتے ہیں

پُرغباری جہاں سے نہیں سدھ میرؔ ہمیں
گرد اتنی ہے کہ مٹی میں رلے جاتے ہیں

(٩٠٧)

کیا کہیں پایا نہیں جاتا ہے کچھ تم کیا ہو میاں   کھو گئے دنیا سے تم ہو اور اب دنیا ہو میاں
مت حنائی پاؤں سے چل کر کہیں جایا کرو   دلی ہے آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں
دل جہاں کھویا گیا کھویا گیا پھر دیکھیے   کون مرتا ہے جیے ہے کون ناپیدا ہو میاں
دل کو لے کر صاف یوں آنکھیں ملاتا ہے کوئی   تب تلک ہی لطف ہے جب تک کہ کچھ پردہ ہو میاں
ایک جنبش میں ترے ابرو کی ٹل جاتی ہے بھیڑ   درمیاں آوے اگر تلوار تو پرچھا ہو میاں
برسوں تک چھایا رہا ہے چشم تر پر ابر سا   پاٹ دامن کا نچوڑوں کوئی تو دریا ہو میاں
شہر میں تو موسم گل میں نہیں لگتا ہے جی   یا گریباں کوہ کا یا دامن صحرا ہو میاں
مدعی عشق تو ہیں عزلتی شہر لیک   جب گلی کوچوں میں کوئی اس طرح رسوا ہو میاں

گفتگو اتنی پریشاں حال کی یہ درہمی
میرؔ کچھ دل تنگ ہے ایسا نہ ہو سودا ہو میاں

(٩٠٨)

معلوم نہیں کیا ہے لب سرخ بتاں میں   اس آتش خاموش کا ہے شور جہاں میں
یوسف کے تئیں دیکھ نہ کیوں بند ہوں بازار   یہ جنس نکلتی نہیں ہر اک کی دکاں میں
یک پرچۂ اشعار سے منھ باندھے سبھوں کے   جادو تھا مرے خامے کی گویا کہ زباں میں
یہ دل جو شکستہ ہے سو بے لطف نہیں ہے   ٹھہرو کوئی دم آن کے اس ٹوٹے مکاں میں

3

میں لگ کے گلے خوب ہی رویا لب جو پر — ملتی تھی طرح اس کی بہت سرو رواں میں
کیا قہر ہوا دل جو دیا لڑکوں کو میں نے — چرچا ہے یہی شہر کے اب پیر و جواں میں

وے یاسمن تازہ شگفتہ میں کہاں میر
پائے گئے لطف اس کے جو پاؤں کے نشاں میں

ردیف و

(۹۰۹)

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ — کاہے کو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ
یہ چاند کے سے ٹکڑے چھپتے نہیں چھپائے — ہر چند اپنے منھ کو برقع میں تم چھپاؤ
دوچار تیر یارو اس سے بھلی ہے دوری — تم کھینچ کھینچ مجھ کو اس پلے پر نہ لاؤ
ہو شرم آنکھ میں تو بھاری جہاز سے ہے — مت کرکے شوخ چشمی آشوب سا اٹھاؤ
اب آتے ہو تو آؤ ہر لحظہ جی گھٹے ہے — پھر لطف کیا جو آکر آدھا بھی تم نہ پاؤ
تھی سحر یا نگہ تھی ہم آپ کو تھے بھولے — اس جادوگر کو یارو پھر بھی ٹک دکھاؤ

بارے گئے سو گذرے جی بھر بھر آتے ہیں کیا
آئندہ میر صاحب دل مت کہیں لگاؤ

(۹۱۰)

نہ مائل آرسی کا رہ سراپا درد ہوگا تو — نہ ہو گلچین باغ حسن ظالم زرد ہوگا تو
یہ پیشہ عشق کا ہے خاک چھنوائے گا صحرا کی — ہزار اے بے وفا جوں گل چمن پرورد ہوگا تو
غبار اٹھنے لگے گا تیری اس نازک طبیعت سے — بسان گردباد آخر بیاباں گرد ہوگا تو
علاقہ دل کا لکھوائے گا دفتر ہاتھ سے تیرے — تجرد کے جریدوں میں قلم سا فرد ہوگا تو

نہ یک دم صبح تک بھی آنکھ لگنے دے گا دل جلنا
یہی پھر میر سا سرگرم آہ سرد ہوگا تو

(۹۱۱)

سب حال سے بےخبر ہیں یاں تو — برہم زدہ شہر ہے جہاں تو
اس تن پہ نثار کرتے لیکن — اپنی بھی نظر میں ٹھہرے جاں تو
برباد نہ دے کہیں سراسر — رہتی نہیں شمع ساں زباں تو
کیا اس کے گئے ہے ذکر دل کا — ویران پڑا ہے یہ مکاں تو

کیا کیا نہ عزیز خوار ہوں گے — ہونے دو اسے ابھی جواں تو
غنچہ لگے منہ تمھارے لیکن — صحبت کا اسے بھی ہو دہاں تو
کیا اس سے رکھیں امید بہبود — پھرتا ہے خراب آسماں تو
یہ طالع نارسا بھی جاگیں — سو جائے ٹک اس کا پاسباں تو

مت تربت میرؔ کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

(۹۱۲)

ملتفت ہوتا نہیں ہے گاہ تو — کس قدر مغرور ہے اللہ تو
مجھ سے کتنے جان سے جاتے رہے — کس کی میت کے گیا ہمراہ تو
بےخودی رہتی ہے اب اکثر مجھے — حال سے میرے نہیں آگاہ تو
اس کے دل میں کام کرنا کام ہے — یوں فلک پر کیوں نہ جا اے آہ تو
فرش ہیں آنکھیں ہی تیری راہ میں — آہ ٹک تو دیکھ کر چل راہ تو
جی تلک تو منہ نہ موڑیں تجھ سے ہم — کر جفا و جور خاطرخواہ تو
کاہش دل بھی دو چنداں کیوں نہ ہو — آنکھ میں آوے نہ دو دو ماہ تو
دل دہی کیا کی ہے یوں ہی چاہیے — اے زہے تو آفریں تو واہ تو

میرؔ تو تو عاشقی میں کھپ گیا
مت کسی کو چند روز اب چاہ تو

(۹۱۳)

اب اسیری سے بچیں تو دیکھیں گے گلشن کبھو — تھا ہمارا بھی چمن میں اے صبا مسکن کبھو
ہم بھی ایک امید پر اس صیدگہ میں ہیں پڑے — کہتے ہیں آتا ہے ایدھر وہ شکارافگن کبھو
بند پایا جیب میں یا سر سے مارا تنگ ہو — دست کوتہ میں نہ آیا اپنے وہ دامن کبھو
یار کی برگشتہ مژگاں سے نہ دل کو جمع رکھ — بد بلا ہے پھر کھڑی ہووے جو یہ پلٹن کبھو
جان کوئی کیوں نہ دو اس بے مروت کے لیے — آشنا ہوتا نہیں وہ دوستی دشمن کبھو
ہوں تو نالاں زیر دیوار چمن پر ضعف سے — گوش زد گل کے نہیں ہوتا مرا شیون کبھو

دل مگر ان جامہ زیبوں کو دیا ہے میرؔ نے
اس طرح پھرتے نہ تھے دے چاک پیراہن کبھو

(۹۱۴)

گل برگ سے ہیں نازک خوبی پا تو دیکھو | کیا ہے جھمک کفک کی رنگ حنا تو دیکھو
ہر بات پر خشونت طرز جفا تو دیکھو | ہر لحہ بے ادائی اس کی ادا تو دیکھو
سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت | اس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئے پر مرکر چمن سے نکلی | اس مرغ شوق کش کی تک تم وفا تو دیکھو
طرزیں عبث کرد ہو غش رہنے پر ہمارے | دو چار دن کسو سے دل کو لگا تو دیکھو
ہونا پڑے ہے دشمن ہر گام اپنی جاں کا | کوچے میں دوستی کے ہر کوئی آ تو دیکھو
پیری میں مول لے ہے منعم حویلیوں کو | ڈھہتا پھرے ہے آپھی اس پر بنا تو دیکھو
ڈوبی ہے کشتی میری بحر عمیق غم میں | بیگانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو
آئے جو ہم تو ان نے آنکھوں میں ہم کو رکھا | اہل ہوس سے کوئی اودھر کو جا تو دیکھو
ہے اس چمن میں وہ گل صد رنگ محو جلوہ | دیکھو جہاں وہی ہے کچھ اس سوا تو دیکھو

اشعار میر پر ہے اب ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

(۹۱۵)

بدزباں ہو جیسے خوش اسلوب ہو | کیا کہیں جو کچھ کہ ہو تم خوب ہو
بےنقابی اس کی ہے ہم پر ستم | لائیے منھ پر تو وہ محجوب ہو
ایسا شہر حسن ہی ہے تازہ رسم | دوستی باہم جہاں معیوب ہو
مطلب عمدہ ہے دل لے تو رکھو | گاہ باشد تم کو بھی مطلوب ہو
چاہیے ہے اور کچھ عاشق کو کیا | جان کا خواہاں اگر محبوب ہو
لوہو پینا جان کھانا دیکھیے | کیا مزاج عشق میں مرغوب ہو

جو کہو ہو سو مخالف عقل کے
میر صاحب تم مگر مجذوب ہو

(۹۱۶)

منعقد کاش مجلس مل ہو | درمیاں تو ہو سامنے گل ہو
گرمیاں متصل رہیں باہم | نے تساہل ہو نے تغافل ہو
اب دھواں یوں جگر سے اٹھتا ہے | جیسے پرپیچ کوئی کاکل ہو
نہ تو طالع نہ جذب پھر دل کو | کس بھروسے پہ تک تحمل ہو

لگ نہ چل اے نسیم باغ کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا گل ہو

ادھ جلا لالہ ساں رہا تو کیا
داغ بھی ہو تو کوئی بالکل ہو

طول رکھتا ہے درد دل میرا
لکھنے بیٹھوں تو خط ترسل ہو

ہوجو مجھ بادہ کش کے عرس میں تو
جبکہ قلقل سے شیشے کی قل ہو

دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن
بوے گل ہو صفیر بلبل ہو

مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

منکشف ہو رہا ہے حال میر
کاش ٹک یار کو تامل ہو

(۹۱۷)

نہ میرے باعث شور و فغاں ہو
ابھی کیا جانیے یاں کیا سماں ہو

یہی مشہور عالم ہیں دوعالم
خدا جانے ملاپ اس سے کہاں ہو

جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا
وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہو

نہ ہووے وصف ان بالوں کا مجھ سے
اگر ہر مو مرے تن پر زباں ہو

جگر تو چھن گیا تیروں کے مارے
تمھاری کس طرح خاطر نشاں ہو

نہ دل سے جا خدا کی تجھ کو سوگند
خدائی میں اگر ایسا مکاں ہو

تم اے نازک تناں ہو وہ کہ سب کے
تمناے دل و آرام جاں ہو

ہلے ٹک لب کہ اس نے مار ڈالا
کہے کچھ کوئی گر جی کی اماں ہو

سنا ہے چاہ کا دعویٰ تمھارا ق
کہو جو کچھ کہ چاہو مہرباں ہو

کنارہ یوں کیا جاتا نہیں پھر
اگر پاے محبت درمیاں ہو

ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر
تمھاری بات کیا ہے تم جواں ہو

(۹۱۸)

برسوں میں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو
پھر برسوں تئیں پیارے جی سے نہیں جاتے ہو

آتے ہو کبھو یاں تو ہم لطف نہیں پاتے
سو آفتیں لاتے ہو سو فتنے اٹھاتے ہو

رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمھیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

ایسی ہی زباں ہے تو کیا عہدہ برآ ہوں گے
ہم ایک نہیں کہتے تم لاکھ سناتے ہو

خوش کرنے سے ٹک ایسے ناخوش ہی رکھا کریے
ہنستے ہو گھڑی بھر تو پہروں ہی رلاتے ہو

اک خلق تلاشی ہے تم ہاتھ نہیں لگتے
لڑکے تو ہو پر سب کو نالے ہی بتاتے ہو

مدت سے تمھارا کب ادھر کو تہ دل ہے
کاہے کو تصنع سے یہ باتیں بناتے ہو

کچھ عزت کفر آخر اے دیر کے باشندو
مجھ سہل سے کو کیوں تم زنار بندھاتے ہو

آوارہ اسے پھرتے پھر برسوں گذرتے ہیں
تم جس کسو کو اپنے ٹک پاس بٹھاتے ہو

دل کھول کے مل چلیے جو میر سے ملنا ہے
آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منھ بھی چھپاتے ہو

(۹۱۹)

ہر صبح شام تو ہے ایذائے میر ہو
ایسا نہ ہو کہ کام ہی اس کا اخیر ہو

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

جنت کی منت ان کے دماغوں سے کب اٹھے
خاک رہ اس کی جن کے کفن کا عبیر ہو

کیا یوں ہی آب و تاب سے ہو بیٹھیں کار عشق
سوکھے جگر کا خوں تو رواں جوے شیر ہو

چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشک باغ
جوش بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو

یاں برگ گل اڑاتے ہیں پرکالۂ جگر
جا عندلیب تو نہ مری ہم‌صفیر ہو

اس کے خیال خط میں کسے یاں دماغ حرف
کرتی ہے بےمزہ جو قلم کی صریر ہو

زنہار اپنی آنکھ میں آتا نہیں وہ صید
چھوٹا دوسار جس کے جگر میں نہ تیر ہو

ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی برے
پھر درگذر یہ کرتے نہیں گوکہ پیر ہو

کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو

دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو
جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

تسکین دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس
انصاف کریے کب تئیں مخلص حقیر ہو

یک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

(۹۲۰)

ٹک لطف سے ملا کر گو پھر کبھو کبھو ہو
سو تب تلک کہ مجھ کو ہجراں سے تیرے خو ہو

کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے
اے عشق بے محابا دنیا ہو اور تو ہو

ایسے کہوکے کچھ تو ہم چپکے ہو رہیں گے
ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو

کیا ہے جواب ظالم پرسش کے روز کبھو   جو روسیاہ یہ بھی واں آکے روبرو ہو
پرخوں ہمارے دل سے کتنی ہے تو مشابہ   ق   شاید کلی تجھے بھی اس گل کی آرزو ہو
خط اس کے پشت لب کا ساکت کرے گا تجھ کو   کبھو اگر تفاوت اس میں بقدرمو ہو
کھولے تھے بال کن نے ہنگام صبح اپنے   آئی ہے اے صبا تو ایسی جو مشک بو ہو
درویشی سے بھی اپنی نکلے ہے میرزائی   نقش حصیر تن پر ایسے ہیں جوں اتو ہو
مت التیام چاہے پھر دل شکستگاں سے   ممکن نہیں کہ شیشہ ٹوٹا ہوا رفو ہو
کہتے ہو کانپتا ہوں جوں بید عاشقی سے
تم بھی تو میر صاحب کتنے خلاف گو ہو

(۹۲۱)

رکھیے گردن کو تری تیغ ستم پر ہو سو ہو   جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ہو سو ہو
قطرہ قطرہ اشک باری تو کجا پیش سحاب   ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو
بند میں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر   یہ فضولی ہے فقیری میں میسر ہو سو ہو
آنکلوں ہے ترے جاتا ہوں کب جوں ابر شب   تیر باراں ہو کہ برسے تیغ یک سر ہو سو ہو
صاحبی کیسی جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا   پھر تو خواری بے وقاری بندہ پرور ہو سو ہو
کب تلک فریاد کرتے یوں پھریں اب قصد ہے   داد لیجے اپنی اس ظالم سے اڑ کر ہو سو ہو
بال تیرے سر کے آگے تو جیوں کے ہیں وبال   سر منڈا کر ہم بھی ہوتے ہیں قلندر ہو سو ہو
سختیاں دیکھیں تو ہم سے چند کھنچواتا ہے عشق   دل کو ہم نے بھی کیا ہے اب تو پتھر ہو سو ہو
کہتے ہیں ٹھہرا ہے تیرا اور غیروں کا بگاڑ
ہیں شریک اے میر ہم بھی تیرے بہتر ہو سو ہو

(۹۲۲)

ظالم ہو میری جان پہ ناآشنا نہ ہو   بے رحمی اتنی عیب نہیں بے وفا نہ ہو
کرتی ہے عشق بازی کو بے مائگی وبال   کیا کھیلے وہ جوا جسے کچھ آسرا نہ ہو
ہجر بتاں میں طبع پراگندہ ہی رہی   کافر بھی اپنے یار سے یارب جدا نہ ہو
آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھ   کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو
کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو   اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو
رک جائے دم گر آہ نہ کریے جہاں کے بیچ   اس تنگنائے میں کریں کیا جو ہوا نہ ہو
طرز سخن تو دیکھ ٹک اس بدمعاش کی   دل داغ کس طرح سے ہمارا بھلا نہ ہو

شکوہ سیاہ‌چشمی کا سن ہم سے یہ کہا　　سرمہ نہیں لگانے کا میں تم خفا نہ ہو

جی میں تو ہے کہ دیکھیے آوارہ میرؔ کو
لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو

(۹۲۳)

خدا کرے کہ بتوں سے نہ آشنائی ہو　　کہ پھر موئے ہی بنے ہے اگر جدائی ہو
بدن نما ہے ہر آئینہ لوح تربت کا　　نظر جسے ہو اسے خاک خودنمائی ہو
بدی نوشتے کی تحریر کیا کروں اپنے　　کہ نامہ پہنچے تو پھر کاغذ ہوائی ہو
فرو نہ آوے سر اس کا طواف کعبہ سے　　نصیب جس کے ترے در کی جبہہ سائی ہو
ہماری چاہ نہ یوسفؑ ہی پر ہے کچھ موقوف　　نہیں ہے وہ تو کوئی اور اس کا بھائی ہو
گلی میں اس کی رہا جا کے جو کوئی سو رہا　　وہی تو جاوے ہے واں جس کسو کی آئی ہو
لب سوال نہ اک بوسے کے لیے کھولوں　　ہزار مہر و محبت میں بےنوائی ہو
زمانہ یار نہیں اپنے بخت سے اتنا　　کہ مدعی سے اسے ایک دن لڑائی ہو
جفا و جور و ستم اس کے آپ ہی سہیے　　جو اپنے حوصلہ میں کچھ بھی اب سمائی ہو
ہزار موسم گل تو گئے اسیری میں　　دکھائی دے ہے موئے ہی پہ اب رہائی ہو

چمکتے دانتوں سے اس کے ہوئی ہے روکش میرؔ
عجب نہیں ہے کہ بجلی کی جگ ہنسائی ہو

(۹۲۴)

تاچند انتظار قیامت شتاب ہو　　وہ چاند سا جو نکلے تو رفع حجاب ہو
احوال کی خرابی مری پہنچی اس سرے　　اس پر بھی وہ کہے ہے ابھی تک خراب ہو
یاں آنکھیں مندتے دیر نہیں لگتی میری جاں　　میں کان کھولے رکھتا ہوں تیرے شتاب ہو
پھولوں کے عکس سے نہیں جوے چمن میں رنگ　　گل بہ چلے ہیں شرم سے اس منہ کی آب ہو
یاں جرم گنتے انگلیوں کے خط بھی مٹ گئے　　واں کس طرح سے دیکھیں ہمارا حساب ہو
غفلت ہے اپنی عمر سے تم کو ہزار حیف　　یہ کاروان جانے پہ تم مست خواب ہو
شان تغافل اس کی لکھی ہم سے کب گئی　　جب نامہ بر ہلاک ہو تب کچھ جواب ہو
لطف شراب ابر سے ہے سو نصیب دیکھ　　جب لیویں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
ہستی پر ایک دم کی تمھیں جوش اس قدر　　اس بحرموج خیز میں تم تو حباب ہو
جی چاہتا ہے عیش کریں ایک رات ہم　　تو ہووے چاندنی ہو گلابی شراب ہو

پر پیچ و تاب دود دل اپنا ہے جیسے زلف   جب اس طرح سے جل کے درونہ کباب ہو

آگے زبان یار کے خط کھینچے سب نے میر
پہلی جو بات اس کی کہیں تو کتاب ہو

(۹۲۵)

سب سرگذشت سن چکے اب چپکے ہو رہو   آخر ہوئی کہانی مری تم بھی سو رہو
جوش محیط عشق میں کیا جی سے گفتگو   اس گوہر گرامی سے اب ہاتھ دھو رہو
فندق تو ہے پہ یہ بھی تماشے کا رنگ ہے   تک انگلیوں کو خون میں میرے ڈبو رہو
اتنا سیاہ خانۂ عاشق سے ننگ کیا   کتنے دنوں میں آئے ہو یاں رات تو رہو
ٹھہراؤ تم کو شوخی سے جوں برق تک نہیں   ٹھہرے تو ٹھہرے دل بھی مرا نچلے جو رہو
ہم خواب تجھ سے ہو کے رہا جاوے کس طرح   ملتے ہوئے سمجھ کے کہا کر رہو رہو

خطرہ بہت ہے میر رہ صعب عشق میں
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو

(۹۲۶)

لائق نہیں تمھیں کہ ہمیں ناسزا کہو   پر ہے یہی ہمارے کیے کی سزا کہو
چپکے رہے بھی چین نہیں تب کہے ہے یوں   لب بستہ بیٹھے رہتے جو ہو مدعا کہو
پیغام بر تو یارو تمھیں میں کروں ولے   کیا جانوں جاکے حق میں مرے اس سے کیا کہو
اب نیک و بد پہ عشق میں مجھ کو نظر نہیں   اس میں مجھے برا کہو کوئی بھلا کہو
سر خاک آستاں پہ تمھاری رہا مدام   اس پر بھی یا نصیب جو تم بے وفا کہو
برسوں تلک تو گھر میں بلا گالیاں دیاں   اب در پہ سن کے کہنے لگے ہیں دعا کہو
صحبت ہماری اس کی جو ہے گفتنی نہیں   کیا کہیے گر کہے کوئی یہ ماجرا کہو
یارو خصوصیت تو رہے اپنی اس کے ساتھ   میرا کہو جو حال تو اس سے جدا کہو
آشفتہ مو حواس پریشاں خراب حال   دیکھو مجھے تو خبطی دوانہ سڑا کہو

کب شرح شوق ہوسکے پر تو بھی میر جی
خط تم نے جو لکھا اسے کیا کیا لکھا کہو

(۹۲۷)

مت سگ یار سے دعواے مساوات کرو   اس کنے بیٹھنے پاؤ تو مباہات کرو
صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو پھر افسوس   متصل ہوسکے تو ہم سے ملاقات کرو

دیدنی ہے یہ ہوا شیخ جی سے کوئی کہے   کہ چلو میکدے تک تم تو کرامات کرو
تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھو آئینہ   اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب کوئی بات کرو
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع
میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

(۹۲۸)

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو   گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو
جوں نے نہ زار نالی سے ہم ایک دم رہیں   تم بند بند کیوں نہ ہمارا جدا کرو
سوتے کے ہوتے یوں ہی نہ رہ جائیں ہم کبھو   آنکھیں ادھر سے موند نہ اپنی لیا کرو
سودے میں اس کے بک گئے ایسے کئی ہزار   یوسف کا شور دور ہی سے تم سنا کرو
ہوتے ہو بے دماغ تو دیکھو ہو ٹک ادھر   غصے ہی ہم پہ کاش کے اکثر رہا کرو
یہ اضطراب دیکھ کہ اب دشمنوں سے بھی   کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو
دم رکتے ہیں سیاہی مژگاں ہی دیکھ کر   سرمہ لگا کے اور ہمیں مت خفا کرو
پورا کریں ہیں وعدے کو اپنے ہم آج کل   وعدے کے تیں وصال کے تم بھی وفا کرو
دشمن ہیں اپنے جی کے تمھارے لیے ہوئے   تم بھی حقوق دوستی کے کچھو ادا کرو
اپنا چلے تو آپھی ستم سب اٹھایئے   تم کون چاہتا ہے کسو پر جفا کرو
ہر چند ساتھ جان کے ہے عشق میر لیک
اس درد لاعلاج کی کچھو تو دوا کرو

(۹۲۹)

لا میری اور یارب آج ایک خوش کمر کو   قدرت سے اس کے دل کی کل پھیر دے ادھر کو
بے طاقتی میں شب کی پوچھو نہ ضبط میرا   ہاتھوں میں دل کو رکھا دانتوں تلے جگر کو
پھولا پھلا نہ اب تک ہرگز درخت خواہش   برسوں ہوئے کہ دوں ہوں خون دل اس شجر کو
ہے روزگار میرا ایسا سیہ کہ یارو   مشکل ہے فرق کرنا ٹک شام سے سحر کو
ہرچند ہے سخن کو تشبیہ در سے لیکن   باتیں مری سنو تو تم پھینک دو گہر کو
نزدیک ہے کہ جاویں ہم آپ سے اب آؤ   ملتے ہیں دوستوں سے جاتے ہوئے سفر کو
کب میر ابر ویسا برساوے کر اندھیری
جیسا کہ روتے ہم نے دیکھا ہے چشم تر کو

(۹۳۰)

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو   مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

پھرتے ہیں چنانچہ لیے خدام سلاتے ‌‌ درویشوں کے پیراہن صد چاک قصب کو[1]
کیا وجہ کہیں خوں‌شدن دل کی پیارے ‌‌ دیکھو تو ہو آئینے میں تم جنبش لب کو
برسوں تئیں جب ہم نے تردد کیے ہیں تب ‌‌ پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو
ہے رحم کو بھی راہ دل یار میں بارے ‌‌ جاگہ نہیں یاں ورنہ کہیں اس کے غضب کو
کیا ہم سے گنہگار ہیں یہ سب جو موئے ہیں ‌‌ کچھ پوچھو نہ اس شوخ کی رنجش کے سبب کو
دل دینے سے اس طرح کے جی کاش کے دیتے ‌‌ یوں کھینچے کوئی کب تئیں اس رنج و تعب کو
حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق ‌‌ کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے ڈھب کو

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

(۹۳۱)

ملا یا رب کہیں اس صید افگن سربسر کیں کو ‌‌ کہ افشاں کیجے خون اپنے سے اس کے دامن زیں کو
گئے وے سابقے سارے خصوصیت رہے پیارے ‌‌ کبھو در تک تو آ بارے ہمارے دل کی تسکیں کو
پیے جاتے نہیں بس اب لہو کے گھونٹ یہ مجھ سے ‌‌ بہت پی پی گیا ڈر سے ترے میں اشک خونیں کو
نہ لکھیں یار کو محضر ہمارے خون ناحق کا ‌‌ دکھا دیویں گے ہم محشر میں اس کے دست رنگیں کو
بجز حیرت نہ بن آوے گی کوئی شکل پھر اس سے ‌‌ دکھایا ہم نے گر چہرہ ترا صورت گرچیں کو
ابھر کر سنگ کے تختے سے پھر دیکھا کیا اودھر ‌‌ محبت ہوگئی تھی کوہکن سے نقش شیریں کو
ہم اس کے چاند سے منہ کے ہیں عاشق مہ سے کیا ہم کو ‌‌ سر اپنا کیک ہی مارا کرے اس خشت سیمیں کو
ہوئے کیا کیا مقدس لوگ آوارہ ترے غم میں ‌‌ سبک پا کر دکھایا شوخ تونے اہل تمکیں کو
بہت مدت ہوئی صحرا سے مجنوں کی خبر آئے ‌‌ نہیں معلوم پیش آیا ہے کیا اس یار دیریں کو
لیے تسبیح ہاتھوں میں جو تو باتیں بناتا ہے ‌‌ نہیں دیکھا ہے واعظ تونے اس غارت‌گر دیں کو

گیا کوچے سے تیرے اٹھ کے میر آشفتہ سر شاید
پڑا دیکھا تھا میں نے رہ میں اس کے سنگ بالیں کو

(۹۳۲)

کیا چہرے خدا نے دیے ان خوش پسروں کو ‌‌ دیتا تھا تنک رحم بھی بیدادگروں کو
آنکھوں سے ہوئی خانہ‌خرابی دل اے کاش ‌‌ کر لیتے تبھی بند ہم ان دونوں دروں کو
پرواز گلستاں کے تو شائستہ نہ نکلے ‌‌ پروانہ نمط آگ ہم اب دیں گے پروں کو
سب طائر قدسی ہیں یہ جو زیر فلک ہیں ‌‌ موندا ہے کہاں عشق نے ان جانوروں کو

---

(۱) یہ شعر مطلع کے ساتھ مربوط ہے۔ مصحح

زنہار ترے دل کی توجہ نہ ہو ایدھر
آگے ترے ہم کاڑھ رکھیں گر جگروں کو
پیراہن صدچاک سلاتے ہیں مرا لوگ
تہ سے نہیں مطلق خبر ان بےخبروں کو
جوں اشک جہاں جاتے رہیں گے تو گئے پھر
دیکھا کرو ٹک آن کے ہم دیدہ تروں کو
اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو
آداب جنوں چاہیے ہم سے کوئی سیکھے
دیکھا ہے بہت یاروں نے آشفتہ سروں کو
اندیشہ کی جاگہ ہے بہت میرجی مرنا
درپیش عجب راہ ہے ہم نوسفروں کو

(۹۳۳)

عنایت ازلی سے جو دل ملا مجھ کو
محل شکر ہے آتا نہیں گلہ مجھ کو
تنک شراب ضعیف الدماغ ہوں ساقی
دم سحر مئے پرزور مت پلا مجھ کو
پڑا رہے کوئی مردہ سا کب تلک خاموش
ہلا کہیں لب جاں بخش کو جلا مجھ کو
جنوں میں سخت ہے اس زلف سے علاقۂ دل
خوش آگیا ہے نہایت یہ سلسلہ مجھ کو
فلک کی چرخ زنی برسوں ہو تو مجھ سا ہو
سمجھ سمجھ کے تنک خاک میں ملا مجھ کو
رہا تھا خوں تئیں ہمرہ سو آپھی خون ہے حیف
رفیق تجھ سا ملے گا کہاں دلا مجھ کو
درستی جیب کی اتنی نہیں ہے اے ناصح
بنے تو سینۂ صدچاک دے سلا مجھ کو
ہوا ہوں خاک پہ دل کی وہی ہے ناصافی
ابھی اس آئینے کی کرنی ہے جلا مجھ کو
نگر کہ مردن دشوار میر سہل ہے شوخ
ہلاک کرتا ہے تیرا مساہلہ مجھ کو

(۹۳۴)

ہوتی کچھ عشق کی غیرت بھی اگر بلبل کو
صبح کی باؤ سے لگ لگنے نہ دیتی گل کو
میں نے سر اپنا دھنا تھا تبھی اس شوخ نے جب
پگڑی کے پیچ سے باندھا تھا اٹھا کاکل کو
مستی ان آنکھوں سے نکلے ہے اگر دیکھو خوب
خلق بدنام عبث کرتی ہے جام مل کو
جیسے ہوتی ہے کتاب ایک ورق بن ناقص
نسبت تام اسی طور ہے جز سے کل کو
ایک لٹکے ہی میں بل سارے نکل جاتے میر
پیچ اس زلف کے دینے تھے دکھا سنبل کو

(۹۳۵)

یوں کب ہوا ہے پیارے پاس اپنے تم بلالو
دو باتیں گر لکھوں میں دل کو ٹک اک لگالو

اب جو نصیب میں ہے سو دیکھ لوں گا میں بھی ۔۔۔ تم دست لطف اپنا سر سے مرے اٹھا لو
جنبش بھی اس کے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیو ۔۔۔ یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
دو نعروں ہی میں شب کے ہوگا مکان ہو کا ۔۔۔ سن رکھو کان رکھ کر یہ بات بستی والو
نام خدا ستم میں تم نامور تو ہو ہی ۔۔۔ پر ایک دو کو یوں ہی للہ مار ڈالو
زلف اور خال و خط کا سودا نہیں ہے اچھا ۔۔۔ یارو بنے تو سر سے جلد اس بلا کو ٹالو
یاران رفتہ ایسے کیا دورتر گئے ہیں ۔۔۔ ٹک کرکے تیزگامی اس قافلے کو جالو
بازاری سارے وے ہی کہتے ہیں راز بیٹھے ۔۔۔ جن کو ہمیں کہا ہے تم منھ سے مت نکالو

یوں رفتہ اور بےخود کب تک رہا کروگے
تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

ردیف ہ

(۹۳۶)

یاد جب آتی ہے وہ زلف سیاہ ۔۔۔ سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہے آہ
کھل گیا منھ اب تو اس محبوب کا ۔۔۔ کچھ سخن کی بھی نکل آوے گی راہ
شرم کرنی تھی مرا سر کاٹ کر ۔۔۔ سو تو ان نے اور ٹیڑھی کی کلاہ
یار کا وہ ناز اپنا یہ نیاز ۔۔۔ دیکھیے ہوتا ہے کیونکر یوں نباہ
دین میں اس کافر بےرحم کے ۔۔۔ اجر اک رکھتا ہے خون بےگناہ
پتھروں سے سینہ کوبی میں نے کی ۔۔۔ دل کے ماتم میں مری چھاتی سراہ
مول لے چک مجھ کو آنکھیں موند کر ۔۔۔ دیکھ تو قیمت ہے میری اک نگاہ
لذت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں ۔۔۔ پاس ہے رنڈی ولے ہے ضعف باہ
روٹھ کر کیا آپ سے ملنے میں لطف ۔۔۔ ہووے وہ بھی تو کبھو ٹک عذرخواہ
ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں ولے ۔۔۔ آہ اک منھ سے نکل جاتی ہے گاہ
اس کے رو کے رفتہ ہی آئے ہیں یاں ۔۔۔ آج سے تو کچھ نہیں یہ جی کی چاہ
دیکھ رہتے دھوکے اس رخسار کے ۔۔۔ دایہ منھ دھوتے جو کہتی ماہ ماہ

شیخ تونے خوب سمجھا میر کو
واہ وا اے بےحقیقت واہ واہ

(۹۳۷)

ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ ۔۔۔ اس چال پر چلے گی تلوار رفتہ رفتہ

ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے / کیا آ گیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
کیا کہیے کیونکے جانیں بے پردہ جاتیاں ہیں / اس معنی کا بھی ہوگا اظہار رفتہ رفتہ
یہ ہی سلوک اس کے اکثر چلے گئے تو / بیٹھیں گے اپنے گھر ہم ناچار رفتہ رفتہ
پامال ہوں کہ اس میں ہوں خاک سے برابر / اب ہوگیا ہے سب کچھ ہموار رفتہ رفتہ
چاہت میں دخل مت دے زنہار آرزو کو / کردے ہے دل کی خواہش بیمار رفتہ رفتہ
خاطر نہ جمع رکھو ان پلکوں کی خلش سے / سر دل سے کاڑھتے ہیں یاں خار رفتہ رفتہ
تھے ایک ہم وے دونوں سو اتحاد کیسا / ہر بات پر اب آئی تکرار رفتہ رفتہ

گر بت کدے میں جانا ایسا ہے میر جی کا
تو تار سبحہ ہوگا زنار رفتہ رفتہ

(۹۳۸)

پیدا نہیں جہاں میں قید جہاں سے رستہ / مانند برق ہیں یاں وے لوگ جستہ جستہ
ظالم بھلی نہیں ہے برہم زنی مژگاں / مر جائے گا کسو دن یوں کوئی سینہ خستہ
پاے حنائی اس کے ہاتھوں ہی پر رکھے ہیں / پر اس کو خوش نہ آیا یہ کار دست بستہ
شہر چمن سے کچھ کم دشت جنوں نہیں ہے / یاں گل ہیں رستہ رستہ واں باغ دستہ دستہ

معمار کا وہ لڑکا پتھر ہے اس کی خاطر
کیوں خاک میں ملا تو اے میر دل شکستہ

(۹۳۹)

ٹک پاس آکے کیسے صرفے سے ہیں کشیدہ / گویا کہ ہیں یہ لڑکے پیر زمانہ دیدہ
اب خاک تو ہماری سب سبز ہو چلی ہے / کب منھ ادھر کرے گا وہ آہوے رمیدہ
یوسف سے کوئی کیونکر اس ماہ کو ملاوے / ہے فرق رات دن کا از دیدہ تا شنیدہ
بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا / ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
کیا وسوسہ ہے مجھ کو عزت سے جینے کا یاں / نکلا نہ میرے دل سے یہ خار ناخلیدہ
ہم کاڑھ کر جگر بھی آگے تمھارے رکھا / پھر یا نصیب اس پر تم جو ہوئے کبیدہ
سائے سے اپنے وحشت ہم کو رہی ہمیشہ / جوں آفتاب ہم بھی کیسے رہے جریدہ
منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو / پھل وہ درخت لایا آخر سر بریدہ

ذوق سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

(۹۴۰)

پھرتی ہیں اس کی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ — رہتا ہے آب دیدہ یاں تا گلے ہمیشہ
تصدیع ایک دو دن ہووے تو کوئی کھینچے — تڑپے جگر ہمیشہ چھاتی جلے ہمیشہ
اک اس مغل بچے کو وعدہ وفا نہ کرنا — کچھ جا کہیں تو کرنا آرے بلے ہمیشہ
کب تک وفا کرے گا یوں حوصلہ ہمارا — دل چپیے درد اکثر غم جی ملے ہمیشہ
اس جسم خاکی سے ہم مٹی میں اٹ رہے ہیں — یوں خاک میں کہاں تک کوئی رلے ہمیشہ
آئندہ و روندہ باد سحر کبوتر — قاصد نیا ادھر کو کب تک چلے ہمیشہ
مسجد میں چل کے ملیے جمعے کے دن بنے تو
ہوتے ہیں میر صاحب واں دن ڈھلے ہمیشہ

(۹۴۱)

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ — چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ
وقت کڑھنے کے ہاتھ دل پر رکھ — جان جاتی رہے نہ آہ کے ساتھ
عشق میں ترک سر کیے ہی بنے — مشورت تو بھی کر کلاہ کے ساتھ
ہو اگرچند آسماں پہ ولے — نسبت اس مہ کو کیا ہے ماہ کے ساتھ
سفری وہ جو مہ ہوا تا دیر — چشم اپنی تھی گرد راہ کے ساتھ
جاذبہ تو ان آنکھوں کا دیکھا — جی کھنچے جاتے ہیں نگاہ کے ساتھ
میر سے تم برے ہی رہتے ہو
کیا شرارت ہے خیرخواہ کے ساتھ

(۹۴۲)

ہم سے کیوں الجھا کرے ہے آ سمجھ اے ناسمجھ — کج طبیعت جو مخالف ہیں انھوں سے جا سمجھ
یار کی ان بھولی باتوں پر نہ جا اے ہمنشیں — ایک فتنہ ہے وہ اس کو آہ مت لڑکا سمجھ
خوبرو عشاق سے بد پیش آتے ہی سنے — گرچہ خوش ظاہر ہیں یہ پر ان کو مت اچھا سمجھ
باغباں بے رحم گل بے دید موسم بے وفا — آشیاں اس باغ میں بلبل نے باندھا کیا سمجھ
میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش — کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ
دور سے دیکھی جو بدحالی وہیں سے ٹل گیا — دو قدم آگے نہ آیا مجھ کو وہ مرتا سمجھ
میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں
کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اس کو سادہ سا سمجھ

(۹۴۳)

کھنچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ

دل نہیں جمع چشمِ تر سے اب
پھیلتا سا چلا یہ دریا کچھ

شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو
شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا
کم تماشا نہیں یہ پردہ کچھ

خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا
آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ

یاس سے مجھ کو بھی ہو استغنا
گو نہ ہو اس کو میری پروا کچھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی ہی نہ دنیا کچھ

اب تو بگڑے ہی جاتے ہیں خوباں
رنگِ صحبت نہیں ہے اچھا کچھ

کچھ کہو دور ہے بہت وہ شوخ
اپنے نزدیک تو نہ ٹھہرا کچھ

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

(۹۴۴)

بود نقش و نگار سا ہے کچھ
صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

منھ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ
کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

منتظر اس کی گرد راہ کے تھے
آنکھوں میں سو غبار سا ہے کچھ

ضعفِ پیری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ

کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم
اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

اس کی برہم زنی مژگاں سے
دل میں اب خار خار سا ہے کچھ

جیسے عنقا کہاں ہیں ہم اے میر
شہروں میں اشتہار سا ہے کچھ

(۹۴۵)

آوے کہنے میں رہا ہو غم سے گر احوال کچھ
جاں بہ لب رہتے ہیں پر کہتے نہیں ہیں حال کچھ

بے زری سے داغ ہیں لیکن لبوں پر مہر ہے
کہیے حاجت اپنی لوگوں سے جو دے ہوں مال کچھ

کام کو مشکل دل پر آرزو نے کردیا
یاس کلی ہوچکے تو پھر نہیں اشکال کچھ

دل ترا آیا کسو کے پیچ میں جو سدھ گئی
متصل بکھرے رہا کرتے ہیں منھ پر بال کچھ

ماہ سے ماہی تلک اس داغ میں ہیں مبتلا
کیا بلائے جان ہے میرا تمھارا حال کچھ

ایک دن کنج قفس میں ہم کہیں رہ جائیں گے / بے کلی گل بن بہت رہتی ہے اب کے سال کچھ

کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتنا شوق میر
بہ چلی ہے دیکھ کر اس کو تمھاری رال کچھ

(۹۴۶)

اب تو صبا چمن سے آتی نہیں ادھر کچھ / ہم تک نہیں پہنچتی گل کی خبر عطر کچھ
ذوق خبر میں ہم تو بے ہوش ہوگئے تھے / کیا جانے کب وہ آیا ہم کو نہیں خبر کچھ
یہ طشت و تیغ ہے اب یہ میں ہوں اور یہ تو / ہے ساتھ میرے ظالم دعویٰ تجھے اگر کچھ
وے دن گئے کہ بے غم کوئی گھڑی کٹے تھی / تھمتے نہیں ہیں آنسو اب تو پہر پہر کچھ
ان اجڑی بستیوں میں دیوار و در ہیں کیا کیا / آثار جن کے ہیں یہ ان کا نہیں اثر کچھ
واعظ نہ ہو معارض نیک و بد جہاں سے / جو ہوسکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھ
آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہے اب / مجھ کو بغیر اس کے آتا نہیں نظر کچھ
ہم نے تو ناخنوں سے منھ سارا نوچ ڈالا / اب کوہکن دکھاوے رکھتا ہے گر ہنر کچھ
تلوار کے تلے ہی کاٹی ہے عمر ساری / ابروے خم سے اس کے ہم کو نہیں ہے ڈر کچھ

گہ شیفتہ ہیں مو کے گہ باؤلے ہیں رو کے
احوال میر جی کا ہے شام کچھ سحر کچھ

ردیف ی

(۹۴۷)

ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی / ایک دل قطرۂ خوں تس پہ جفا کیا کیا کی
کس کو لاگی کہ نہ لوہو میں ڈبایا اس کو / اس کی شمشیر کی جدول بھی بہا کیا کیا کی
جان کے ساتھ ہی آخر مرض عشق گیا / جی بھلا تک نہ ہوا ہم نے دوا کیا کیا کی
ان نے چھوڑی نہ طرف جور و جفا کی ہرگز / ہم نے یوں اپنی طرف سے تو وفا کیا کیا کی
سجدہ اک صبح ترے در کا کروں اس خاطر / میں نے محراب میں راتوں کو دعا کیا کیا کی
آگ سی پھنکتی ہی دن رات رہا کی تن میں / جان غمناک ترے غم میں جلا کیا کیا کی

میر نے ہونٹوں سے اس کے نہ اٹھایا جی کو
خلق اس کے تئیں یہ سن کے کہا کیا کیا کی

(۹۴۸)

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی ——— دھوم ہے پھر بہار آنے کی
دل کا اس کنج لب سے دے ہیں نشاں ——— بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور ——— ہے یہ تقریب جی کے جانے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شب آتش شوق ——— تھی خبر گرم اس کے آنے کی
خضر اس خط سبز پر تو موا ——— دھن ہے اب اپنے زہر کھانے کی
دل صد چاک باب زلف ہے لیک ——— باؤ سی بندھ رہی ہے شانے کی
کسو کم ظرف نے لگائی آہ ——— تجھ سے میخانے کے جلانے کی
ورنہ اے شیخ شہر واجب تھی ——— جام داری شراب خانے کی

جو ہے سو پائمال غم ہے میر
چال بے ڈول ہے زمانے کی

(۹۴۹)

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی ——— اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں ——— خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج ——— اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے ——— اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا ——— پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی
کرکے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے ——— وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دوانی اس کی
اس کا وہ عجز تمھارا یہ غرور خوبی ——— منتیں ان نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی
کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشک بہار ——— رقعہ واریں ہیں یہ اوراق خزانی اس کی
سرگذشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا ——— سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو ——— شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
میان سے نکلی ہی پڑتی تھی تمھاری تلوار ——— کیا عوض چاہ کا تھا خصمی جانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے ——— دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

(۹۵۰)

کی سیر ہم نے سینۂ یکسر فگار کی ——— اس تختے نے بھی اب کے قیامت بہار کی

دریاے حسن یار تلاطم کرے کہیں
خواہش ہے اپنے جی میں بھی بوس و کنار کی

اپنا بھی جی اسیر تھا آواز عندلیب
دل میں چبھا کی رات کو جوں نوک خار کی

آنکھیں غبار لائیں مری انتظار میں
دیکھوں تو گرد کب اٹھے اس رہ گذار کی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منھ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

اب گرد سر پھروں ترے ہوں میں فقیر محض
رکھتا تھا ایک جان سو تجھ پر نثار کی

کیا صید کی تڑپ کو اٹھائے دماغ یار
نازک بہت ہے طبع مرے دل شکار کی

رکھتا نہیں طریق وفا میں کبھو قدم
ہم کچھ نہ سمجھے راہ و روش اپنے یار کی

کیا جانوں چشم تر سے ادھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میرؔ سمندر کے پار کی

(۹۵۱)

ٹپہ بازی سے چرخ گرداں کی
سر ہمارے ہیں گوے میداں کی

جی گیا اس کے تیر کے ہمراہ
تھی تواضع ضرور مہماں کی

ہیں لیے آبروے خنجر و تیغ
ترچھی پلکیں تری بھویں بانکی

پھوڑ ڈالیں گے سر ہی اس در پر
منت اٹھتی نہیں ہے درباں کی

سر دامن سے گفتگو کریے
بات بگڑی لب گریباں کی

اس بت شوخ کی ہے طینت میں
دشمنی میرے دین و ایماں کی

آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

(۹۵۲)

رکھا گنہ وفا کا تقصیر کیا نکالی
مارا خراب کر کر تعزیر کیا نکالی

رہتی ہے چت چڑھی ہی دن رات تیری صورت
صفحے پہ دل کے میں نے تصویر کیا نکالی

چپ بھی مری جتائی اس سے مخالفوں نے
بات اور جب بنائی تقریر کیا نکالی

بس تھی ہمیں تو تیری ابرو کی ایک جنبش
خوں ریزی کو ہماری شمشیر کیا نکالی

کی اس طبیب جاں نے تجویز مرگ عاشق
آزار کے مناسب تدبیر کیا نکالی

دل بند ہے ہمارا موج ہواے گل سے
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی

نامے پہ لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میرؔ بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

(۹۵۳)

جی رشک سے گئے جو ادھر کو صبا چلی
کیا کہیے آج صبح عجب کچھ ہوا چلی

کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرم راہ
کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

تو دو قدم جو راہ چلا گرم اے نگار
مہندی کفک کی آگ دلوں میں لگا چلی

فتنہ ہے اس سے شہر میں برپا ہزار جا
تلوار اس کی چال پہ کیا ایک جا چلی

یہ جور و جورکش تھے کہاں آگے عشق میں
تجھ سے جفا و میرؔ سے رسمِ وفا چلی

(۹۵۴)

آج کچھ بےحجاب ہے وہ بھی
کیا ہی مست شراب ہے وہ بھی

میں ہی جلتا نہیں جدا دل سے
دور مجھ سے کباب ہے وہ بھی

سائل بوسہ سب گئے محروم
ایک حاضر جواب ہے وہ بھی

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

کم نہیں کچھ صبا سے اشک گرم
قاصد پرشتاب ہے وہ بھی

حسن سے دود دل نہیں خالی
زلف پرپیچ و تاب ہے وہ بھی

خانہ آباد کعبے میں تھا میرؔ
کیا خدائی خراب ہے وہ بھی

(۹۵۵)

دزدیدہ نگہ کرنا پھر آنکھ ملانا بھی
اس لوٹتے دامن کو پاس آکے اٹھانا بھی

پامالی عاشق کو منظور رکھے جانا
پھر چال کڈھب چلنا ٹھوکر نہ لگانا بھی

برقع کو اٹھا دینا پر آدھے ہی چہرے سے
کیا منھ کو چھپانا بھی کچھ جھمکی دکھانا بھی

دیکھ آنکھیں مری نیچی اک مارنا پتھر بھی
ظاہر میں ستانا بھی پردے میں جتانا بھی

صحبت ہے یہ ویسی ہی اے جان کی آسائش
ساتھ آن کے سونا بھی پھر منھ کو چھپانا بھی

(۹۵۶)

یار بن تلخ زندگانی تھی
دوستی مدعی جانی تھی

سر سے اس کی ہوا گئی نہ کبھو
عمر برباد یوں ہی جانی تھی

لطف پر اس کے ہم‌نشیں مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

ہاتھ آتا جو تو تو کیا ہوتا
برسوں تک ہم نے خاک چھانی تھی

شیب میں فائدہ تامل کا
سوچنا تب تھا جب جوانی تھی

میرے قصے سے سب کی گئیں نیندیں
کچھ عجب طور کی کہانی تھی

عاشقی جی ہی لے گئی آخر
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

اس رخِ آتشیں کی شرم سے رات
شمع مجلس میں پانی پانی تھی

پھر سخن نشنوی ہے ویسی ہی
رات ایک آدھ بات مانی تھی

کوے قاتل سے بچ کے نکلا خضر
اسی میں اس کی زندگانی تھی

فقر پر بھی تھا میرؔ کے اک رنگ
کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

(۹۵۷)

وہ رابطہ نہیں وہ محبت نہیں رہی
اس بے وفا کو ہم سے کچھ الفت نہیں رہی

دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا
اب میری اس کی آنکھ میں عزت نہیں رہی

رندھنے سے جی کے کس کو رہا ہے دماغ حرف
دم لینے کی بھی ہم کو تو فرصت نہیں رہی

تھی تاب جی میں جب تئیں رنج و تعب کھنچے
وہ جسم اب نہیں ہے وہ قدرت نہیں رہی

منعم امل کا طول یہ کس جینے کے لیے
جتنی گئی اب اتنی تو مدت نہیں رہی

دیوانگی سے اپنی ہے اب ساری بات خبط
افراط اشتیاق سے وہ مت نہیں رہی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

(۹۵۸)

عشق میں ذلت ہوئی خفت ہوئی تہمت ہوئی
آخر آخر جان دی یاروں نے یہ صحبت ہوئی

عکس اس بے دید کا تو متصل پڑتا تھا صبح
دن چڑھے کیا جانوں آئینے کی کیا صورت ہوئی

لوحِ سینہ پر مری سو نیزۂ خطی لگے
خستگی اس دل شکستہ کی اسی بابت ہوئی

کھولتے ہی آنکھیں پھر یاں موندنی ہم کو پڑیں
دید کیا کوئی کرے وہ کس قدر مہلت ہوئی

پاؤں میرا کلبۂ احزاں میں اب رہتا نہیں
رفتہ رفتہ اس طرف جانے کی مجھ کو لت ہوئی

مر گیا آوارہ ہوکر میں تو جیسے گردباد
پر جسے یہ واقعہ پہنچا اسے وحشت ہوئی

شاد و خوش طالع کوئی ہوگا کسو کو چاہ کر
میں تو کلفت میں رہا جب سے مجھے الفت ہوئی

دل کا جانا آج کل تازہ ہوا ہو تو کہوں — گذرے اس بھی سانحے کو ہم‌نشیں مدت ہوئی
شوق دل ہم ناتوانوں کا لکھا جاتا ہے کب — اب تلک آپھی پہنچنے کی اگر طاقت ہوئی
کیا کف دست ایک میداں تھا بیاباں عشق کا — جان سے جب اس میں گذرے تب ہمیں راحت ہوئی
یوں تو ہم عاجزترین خلق عالم ہیں ولے — دیکھیو قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی
گوش زد چٹ پٹ ہی مرنا عشق میں اپنے ہوا — کس کو اس بیماری جانکاہ سے فرصت ہوئی
بے زباں جو کہتے ہیں مجھ کو سو چپ رہ جائیں گے — معرکے میں حشر کے گر بات کی رخصت ہوئی
ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل — چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی
اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا — پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

کم کسو کو میر کی میت کی ہاتھ آئی نماز
نعش پر اس بے سر و پا کی بلا کثرت ہوئی

(۹۵۹)

قوت کو پیرانہ سر دلی میں حیرانی ہوئی — اب کے جو آئے سفر سے خوب مہمانی ہوئی
باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار — عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی
لوہو پانی ایک دونوں نے کیا میرا ندان — یعنی دل لوہو ہوا سب چشم سب پانی ہوئی
کیا چھپا کچھ رہ گیا ہے مدعائے خط شوق — رقعہ دار اب اشک خونیں سے تو افشانی ہوئی
آنکھ اٹھا کر تک جو دیکھا گھر کے گھر بٹھلا دیے — اک نگہ میں سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوئی
مرتبہ واجب کا سمجھے آدمی ممکن نہیں — فہم سودائی ہوا یاں عقل دیوانی ہوئی
چاہ کر اس بے وفا کو آخر اپنی جان دی — دوستی اس کی ہماری دشمن جانی ہوئی
بلبل اس خوبی سے گل ہے سیما سیمائے یار — تو عبث اے بے حقیقت غنچہ پیشانی ہوئی
شیخ مت یاد بتاں کو رات کا سا ذکر جان — یا صنم گوئی ہماری کیا خداخوانی ہوئی
غنچۂ گل ہے گلابی پھول ہے جام شراب — توڑتے تو توڑی توبہ اب پشیمانی ہوئی
چشم ہوتے ہوتے تر کچھ سب بھری رہنے لگی — اب ہوئی خطرے کی جا گہ کشتی طوفانی ہوئی
دل تڑپتا تھا نہایت جان دے تسکین کی — بارے اپنی ایسی مشکل کی بھی آسانی ہوئی

جب سے دیکھا اس کو ہم نے جی ڈھہا جاتا ہے میر
اس خرابی کی یہ چشم روبہ بانی ہوئی

(۹۶۰)

بتوں سے آنکھ کیوں میں نے لڑائی — طرف ہے مجھ سے اب ساری خدائی
نرا دھوکا ہی ہے دریائے ہستی — نہیں کچھ تہ سے تجھ کو آشنائی

بگڑتی ہی گئی صورت ہماری
گئے پر دل کے پھر کچھ بن نہ آئی

نہ نکلا ایک شب اس راہ وہ ماہ
بہت کی ہم نے طالع آزمائی

کہا تھا میں نہ دیکھو غیر کی اور
سو تم نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی

نہ ملیے خاک میں کہہ کیونکے پیارے
گذرتی ہے کڑی تیری جدائی

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو
دریغا عمر نے کی بے وفائی

گلے اس مہ نے لگ کر ایک دو رات
مہینوں تک مری چھاتی جلائی

نہ تھا جب درمیاں آئینہ تب تک
تھی یک صورت کہ ہو جاوے صفائی

نظر اس کی پڑی چہرے پہ اپنے
نمدپوشوں سے آنکھ اب کب ملائی

بڑھائی کس قدر بات اس کے قد کی
قیامت میرؔ صاحب ہیں چوائی

(۹۶۱)

مطرب سے غزل میرؔ کی کل میں نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی[1]

اس مطلع جاں‌سوز نے آ اس کے لبوں پر
کیا کہیے کہ کیا صوفیوں کی چھاتی جلائی

خاطر کے علاقے کے سبب جان کھپائی
اس دل کے دھڑکنے سے عجب کوفت اٹھائی

گو اس رخ مہتابی سے واں چاندنی چھٹکی
یاں رنگ‌شکستہ سے بھی چھٹتی ہے ہوائی

ہر بحر میں اشعار کہے عمر کو کھویا
اس گوہر نایاب کی کچھ بات نہ پائی

بھیڑیں ٹلیں اس ابروے خم دار کے ہلتے
لاکھوں میں اس اوباش نے تلوار چلائی

دل اور جگر جل کے مرے دونوں ہوئے خاک
کیا پوچھتے ہو عشق نے کیا آگ لگائی

قاصد کے تصنع نے کیا دل کے تئیں داغ
بیتاب مجھے دیکھ کے کچھ بات بنائی

چپکی ہے مری آنکھ لب لعل بتاں سے
اس بات کے تیں جانتی ہے ساری خدائی

میں دیر پہنچ کر نہ کیا قصد حرم پھر
اپنی سی جرس نے کی بہت ہرزہ درائی

فریاد انھیں رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح
بلبل نے مری طرز سخن صاف اڑائی

مجلس میں مرے ہوتے رہا کرتے ہو چپکے
یہ بات مری ضد سے تمھیں کن نے بتائی

گردش میں جو ہیں میرؔ مہ و مہر و ستارے
دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

(۹۶۲)

تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی
کاہشیں کیا کیا اٹھا جاتا ہے جی

(۱) اس مطلعے کے ساتھ دوسرا شعر مربوط ہے اور یہ دونوں اشعار تیسرے شعر سے بھی ربط رکھتے ہیں۔ مصحح

یوں تو مروے سے پڑے رہتے ہیں ہم　　پر وہ آتا ہے تو آجاتا ہے جی
ہائے اس کے شربتی لب سے جدا　　کچھ بتاشا سا گھلا جاتا ہے جی
اب کے اس کی راہ میں جو ہو سو ہو　　یا دب ہی آتا ہے یا جاتا ہے جی
کیا کہیں تم سے کہ اس شعلے بغیر　　جی ہمارا کچھ جلا جاتا ہے جی
عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا　　ہولے ہولے کوئی کھا جاتا ہے جی
اٹھ چلے پر اس کے غش کرتے ہیں ہم　　یعنی ساتھ اس کے چلا جاتا ہے جی
آ نہیں پھرتا وہ مرتے وقت بھی　　حیف ہے اس میں رہا جاتا ہے جی
رکھتے تھے کیا کیا بنائیں پیشتر　　سو تو اب آپھی ڈھہا جاتا ہے جی
آسماں شاید ورے کچھ آگیا　　رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی

کاشکے برقع رہے اس رخ پہ میر
منھ کھلے اس کے چھپا جاتا ہے جی

(۹۶۳)

متاع دل اس عشق نے سب جلا دی　　کوئی دن ہی میں خاک سی یاں اڑا دی
دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا　　نہ خضر و بلد یاں نہ رہبر نہ ہادی
مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے　　نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی
نہ پوچھو کہ چھاتی کے جلنے نے آخر　　عجب آگ دل میں جگر میں لگا دی
وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے　　یہ رسم کہن آہ تم نے اٹھا دی
جدا ان غزالان شہری سے ہوکر　　پھرے ہم بگولے سے وادی بہ وادی
صبا اس طرف کو چلی جل گئے ہم　　ہوا یہ سبب اپنے مرنے کا بادی
وہ نسخہ جو دیکھا بڑھا روگ دل کا　　طبیب محبت نے کیسی دوا دی
ملے قصر جنت میں پیر مغاں کو　　ہمیں زیر دیوار میخانہ جا دی

نہ ہو عشق کا شور تا میر ہرگز
چلے بس تو شہروں میں کریے منادی

(۹۶۴)

صبح ہے کوئی آہ کر لیجے　　آسماں کو سیاہ کر لیجے
چشم گل باغ میں مندی جا ہے　　جو بنے اک نگاہ کر لیجے

ابر رحمت ہے جوش میں مے دے
یعنی ساقی گناہ کر لیجے

(۹۶۵)

یک مژہ اے دم آخر مجھے فرصت دیجے — چشم بیمار کے دیکھ آنے کی رخصت دیجے
نو گرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد — موسم گل رہے جب تک مجھے مہلت دیجے
خوار و خستہ کئی پامال تری راہ میں ہیں — کیجیے رنجہ قدم ان کو بھی عزت دیجے[1]
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے — کس کو لے مریے میاں اور کسے تہمت دیجے
چھوٹے ہیں قید قفس سے تو چمن تک پہنچیں — اتنی اے ضعف محبت ہمیں طاقت دیجے
مر گیا میر نہ آیا ترے جی میں اے شوخ
اپنے محنت زدہ کو بھی کبھی راحت دیجے

(۹۶۶)

گر ناز سے وہ سر پر لے تیغ آ نہ پہنچے — منزل کو عاشق اپنے مقصد کی جا نہ پہنچے
جیتے رہیں گے کیونکر ہم اے طبیب ناداں — بیمار ایسے تس پر مطلق دوا نہ پہنچے
لائق ترے نہیں ہے خصمی غیر لیکن — وہ باز کیونکے آوے جب تک سزا نہ پہنچے
ہر چند بہر خوباں سر سجدوں میں مارے — پر ان کے دامنوں تک دست دعا نہ پہنچے
بن آہ دل کا رکنا بے جا نہیں ہمارا — کیا حال ہووے اس کا جس کو ہوا نہ پہنچے
اپنے سخن کی اس سے کس طور راہ نکلے — خط اس طرف نہ جاوے قاصد گیا نہ پہنچے
وہ میر شاہ خوبی پھر قدر دور اس کی
درویش بےنوا کی اس تک صدا نہ پہنچے

(۹۶۷)

اک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے — حیرت سے ہم تو چپ ہیں کچھ تم بھی بولو پیارے
زخم اس کے ہاتھ کے جو سینے پہ ہیں نمایاں — چھاتی لگے رہیں گے زیر زمیں بھی سارے
ہیں بدمزاج خوباں پر کس قدر ہیں دلکش — پائے کہاں گلوں نے یہ مکھڑے پیارے پیارے
بیٹھیں ہیں رونے کو تو دریا ہی رو اٹھیں ہیں — جوش و خروش یہ تھے تب ہم لگے کنارے
لاتے نہیں ہو مطلق سر تم فرو خدا سے — یہ ناز خوبرویاں بندے ہیں ہم تمھارے
کوئی تو ماہ پارہ اس بھی رواق میں ہے — چشمک زنی میں شب کو یوں ہی نہیں ہیں تارے
لگ کر گلے نہ سوئے اس منہ پہ منہ نہ رکھا — جی سے گئے ہم آخر ان حسرتوں کے مارے
بیتابی ہے دنوں کو بے خوابی ہے شبوں کو — آرام و صبر دونوں مدت ہوئی سدھارے

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

آفاق میں جو ہوتے اہلِ کرم تو سنتے — ہم برسوں رعد آسا بیتاب ہو پکارے
جل بجھیے اب تو بہتر مانند برقِ خاطف — جوں ابر کس کے آگے دامن کوئی پسارے
ہم نے تو عاشقی میں کھویا ہے جان کو بھی
صدقے ہیں میر جی کے وے ڈھونڈتے ہیں وارے

(۹۶۸)

میر ایک دم نہ اس بن تو تو جیا پیارے — کیا کہہ کے تجھ کو رودیں یہ کیا کیا پیارے
رنگین ہم تو تجھ کو ایسا نہ جانتے تھے — تو نے تو عاشقوں کا لوہو پیا پیارے
دل کے تو زخم کا کچھ ہوتا نہیں تدارک — گو چاک سینہ تو نے میرا سیا پیارے
اس دام گاہ میں ہم جوں صید نیم بسمل — تڑپے بہت پہ تو نے کب دل لیا پیارے
ہو داغ میر تجھ بن مر بھی گیا ولے تو
آیا نہ گور پر ٹک لے کر دیا پیارے

(۹۶۹)

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے — پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے
خشک سالِ وفا میں اک مدت — پلکیں لوہو میں تر رہیں پیارے
یک نظر دیکھنے کی حسرت میں — آنکھیں تو پانی ہو بہیں پیارے
پہنچی ہے ضعف سے یہ اب حالت — جہاں پہنچا رہا وہیں پیارے
تجھ گلی میں رہے ہے میر مگر
دیکھیں ہیں جب نہ تب نہیں پیارے

(۹۷۰)

اسیر زلف کرے قیدی کمند کرے — پسند اس کی ہے وہ جس طرح پسند کرے
ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے — خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے
بڑوں بڑوں کو جھکاتے ہی سر بنے اس دم — پکڑ کے تیغ وہ اپنی اگر بلند کرے
بیان دل کے بھی جلنے کو کریے مجلس میں — اچھلنے کودنے کو ترک اگر سپند کرے
نہ مجھ کو راہ سے لے جائے مکر دنیا کا — ہزار رنگ یہ فرتوت گو چھچھند کرے
سوائے اس کے بڑی داڑھی میں ہے کیا اے شیخ — کہ جو کوئی تجھے دیکھے سو ریش خند کرے
دکھاوے آنکھ کبھو زلف کھولے منہ پہ کبھو — کبھو خرام سے رستے کے رستے بند کرے
اگرچہ سادہ ہے لیکن زبون دل کو — ہزار پیچ کرے لاکھ لاکھ فند کرے
سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میر ہے سحر
زبان خلق کو کس طور کوئی بند کرے

(۹۷۱)

آہ روکوں جانے والے کس طرح گھر کے ترے　　گاڑ دیویں کاش مجھ کو بیچ میں در کے ترے
لالہ وگل کیوں نہ چھپکے اپنی آنکھوں میں لگیں　　دیکھنے والے ہیں ہم تو رنگ احمر کے ترے
بے پروبالی سے اب کے گو کہ بلبل تو ہے چپ　　یاد ہیں سب کے تئیں وے چہچہے پر کے ترے
آج کا آیا تجھے کیا پاوے ہم حیران ہیں　　ڈھونڈنے والے جو ہیں اے شوخ اکثر کے ترے
دیکھ اس کو حیف کھا کر سب مجھے کہنے لگے　　وائے تو گر ہیں یہی اطوار دلبر کے ترے
تازہ تر ہوتے ہیں نوگل سے بھی اے نازک نہال　　صبح اٹھتے ہیں بچھے جو پھول بستر کے ترے
مشک عنبر طبلہ طبلہ کیوں نہ ہو کیا کام ہے　　ہم دماغ آشفتہ ہیں زلف معنبر کے ترے
جی میں وہ طاقت کہاں جو ہجر میں سنبھلے رہیں　　اب ٹھہرتے ہی نہیں ہیں پاؤں ٹک سر کے ترے
داغ پیسے سے جو ہیں بلبل کے دل پر کس کے ہیں　　یوں تو اے گل ہیں ہزاروں آشنا زر کے ترے
کوئی آب زندگی پیتا ہے یہ زہراب چھوڑ　　خضر کو ہنستے ہیں سب مجروح خنجر کے ترے
نوح کا طوفاں ہمارے کب نظر چڑھتا ہے میر
جوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے

(۹۷۲)

مت سہل سمجھو ایسے ہیں ہم کیا ورے دھرے　　ظاہر تو پاس بیٹھے ہیں پر ہیں بہت پرے
سختی بہت ہے پاس و مراعات عشق میں　　پتھر کے دل جگر ہوں تو کوئی وفا کرے
خالی کروں ہوں رو رو کے راتوں کو دل کے تئیں　　انصاف کر کہ یوں کوئی دن کب تلک بھرے
رندھنے نے جی کے خاک میں ہم کو ملا دیا　　گویا کہ آسمان بہت آگیا ورے
داڑھی کو تیری دیکھ کے ہنستے ہیں لڑکے شیخ　　اس ریش خند کو بھی سمجھ ٹک تو مسخرے
جل تھل فقط نہیں مرے رونے سے بھر گئے　　جنگل پڑے تھے سوکھے سو وہ بھی ہوئے ہرے
جی کو بچا رکھیں گے تو جانیں گے عشق میں
ہر چند میر صاحب قبلہ ہیں منگرے

(۹۷۳)

بو کیے کھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے　　ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے
یار بے پروا و مفتر اور میں بے اختیار　　پیش کچھ جاتی نہیں منت سماجت ہائے رے
سختی کھینچی کوہکن نے قیس نے رنج و تعب　　کیا گئی برباد ان یاروں کی محنت ہائے رے
شور اٹھتا ہے جو ہوتے جلوہ گر ہو ناز سے　　کھنچتا قد کا بلا آفت قیامت ہائے رے
خانقہ والے ہی کچھ تنہا نہیں الفت میں خوار　　کیسے کیسوں کی گئی ہے مفت عزت ہائے رے

عشق میں افسوس سا افسوس اپنا کر چکے   زیر لب کہتے رہے ہم ایک مدت ہائے رے
رکھنے ہی کے ہے قابل یار کی ترکیب میر
واہ وا رے چشم و ابرو قد و قامت ہائے رے

(۹۷۴)

وہی شورش ہوئے پر بھی ہے اب تک ساتھ یاں میرے   ہما کے آشیانے میں جلیں ہیں استخواں میرے
عزیزاں غم میں اپنے یوسف گم گشتہ کے ہر دم   چلے جاتے ہیں آنسو کارواں در کارواں میرے
تمھاری دشمنی ہم دوستوں سے لا نہایت ہے   وگرنہ انتہا کینے کو بھی ہے مہرباں میرے
لب و لہجہ غزل خوانی کا کس کو آج کل ایسا   گھڑی بھر کو ہوئے مرغ چمن ہم داستاں میرے
نظرمت بے پری پر کر کہاں سوے جہاں پھر ہوں   ہوئے پرواز کے قابل یہ ٹوٹے پر جہاں میرے
کہاں تک سر کو دیواروں سے یوں مارا کرے کوئی   رکھوں اس در پہ پیشانی نصیب ایسے کہاں میرے
مجھے پامال کر یکساں کیا ہے خاک سے تو بھی   وہی رہتا ہے صبح و شام درپے آسماں میرے
خزاں کی باؤ سے حضرت میں گلشن کے تطاول تھا   تبرک ہوگئے یک دست خارآشیاں میرے
کہا میں شوق میں طفلان تہ بازار کے کیا کیا   سخن مشتاق ہیں اب شہر کے پیر و جواں میرے
زمیں سر پر اٹھا لی کبک نے رفتار رنگیں سے   خراماں ناز سے ہو تو بھی اے سرو رواں میرے
سخن کیا میر کریے حسرت و اندوہ و حرماں سے
بیاں حاجت نہیں حالات ہیں سارے عیاں میرے

(۹۷۵)

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے   نہال سبز جھوے ہیں گلستاں میں شرابی سے
گروں ہوں ہر قدم پر میں ڈھہا جاتا ہے جی ہر دم   پہنچتا ہوں کبھو در پر ترے سو اس خرابی سے
نہ ٹھہری ایک چشمک بھی بسان برق آنکھوں میں   کلیجہ جل گیا اے عمر تیری تو شتابی سے
نکل آتے ہو گھر سے چاند سے یہ کیا طرح پکڑی   قیامت ہو رہے گی ایک دن اس بےحجابی سے
یہ جھگڑا تنگ آ کر میں رکھا روزشمار اوپر   کروں کیا تم تو لڑنے لگتے ہو حرف حسابی سے
بہت رویا نوشتے پر میں اپنے دیکھ قاصد کو   کہ سر ڈالے غریب آتا تھا خط کی بےجوابی سے
مبادا کارواں جاتا رہے تو صبح سوتا ہو
بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تیری دیر خوابی سے

(۹۷۶)

کعبے میں جاں بہ لب تھے ہم دوری بتاں سے   آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے دہاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

سبزان باغ سارے دیکھے ہوئے ہیں اپنے
دلچسپ کاہے کو ہیں اس بے وفا جواں سے

کی شست وشو بدن کی جس دن بہت کی ان نے
دھوئے تھے ہاتھ میں نے اس دن ہی اپنی جاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر یک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

(۹۷۷)

کرتا ہے کب سلوک وہ اہل نیاز سے
گفتار اس کی کبر سے رفتار ناز سے

یوں کب ہمارے آنسو پچھیں ہیں کہ تونے شوخ
دیکھا کبھو ادھر مژۂ نیم باز سے

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھ کر بھی کچھ نہ کہہ
سر شمع کا کٹے ہے زبان دراز سے

اب جا کسو درخت کے سائے میں بیٹھیے
اس طور پھریے کب تئیں بے برگ و ساز سے

یہ کیا کہ دشمنوں میں مجھے ساننے لگے
کرتے کسو کو ذبح بھی تو امتیاز سے

مانند شمع ٹپکے ہی پڑتے ہیں اب تو اشک
کچھ جلتے جلتے ہوگئے ہیں ہم گداز سے

شاید کہ آج رات کو تھے میکدے میں میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہر نماز سے

(۹۷۸)

تابوت مرا دیر اٹھا اس کی گلی سے
اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

آتش بہ جگر اس در نایاب سے سب ہیں
دریا بھی نظر آئے اسی خشک لبی سے

گر ٹھہرے ملک آگے انھوں کے تو عجب ہے
پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو پری سے

نکلا جو کوئی واں سے تو پھر مر ہی کے نکلا
اس کوچے سے جاتے ہوئے دیکھا کسے جی سے

ہمسائے مجھے رات کو رویا ہی کرے ہیں
سوتے نہیں بے چارے مری نالہ کشی سے

تم نے تو ادھر دیکھنے کی کھائی ہے سوگند
اب ہم بھی لڑا بیٹھتے ہیں آنکھ کسی سے

چھاتی کہیں پھٹ جائے کہ تنگ دل بھی ہوا کھائے
اب دم تو لگے رکنے ہماری خفگی سے

اس شوخ کا تمکین سے آنا ہے قیامت   اکتانے لگے ہم نفساں تم تو ابھی سے
نالاں مجھے دیکھے ہیں بتاں تس پہ ہیں خاموش   فریاد ہے اس قوم کی فریادرسی سے
تالو سے زباں رات کو مطلق نہیں لگتی   عالم ہے سیہ خانہ مری نوحہ گری سے

بے رحم وہ تجھ پاس لگا بیٹھنے جب دیر
ہم میر سے دل اپنے اٹھائے تھے تبھی سے

(۹۷۹)

کیا خور ہو طرف یار کے روشن گہری سے   مانا ہے حضور اس کے چراغ سحری سے
سبزان چمن ہوویں برابر ترے کیوں کر   لگتا ہے ترے سائے کو بھی ننگ پری سے
ہشیار کہ ہے راہ محبت کی خطرناک   مارے گئے ہیں لوگ بہت بے خبری سے
ایک آن میں رعنائیاں تیری تو ہیں سو سو   کب عہدہ برآئی ہوئی اس عشوہ گری سے
زنجیر تو پاؤں میں لگی رہنے ہمارے   کیا اور ہو رسوا کوئی آشفتہ سری سے
جب لب ترے یاد آتے ہیں آنکھوں سے ہماری   تب ٹکڑے نکلتے ہیں عقیق جگری سے

عشق آنکھوں کے نیچے کیے کیا میر چھپے ہے
پیدا ہے محبت تری مژگاں کی تری سے

(۹۸۰)

برسوں ہوئے گئے ہوئے اس مہ کو بام سے   کاہش مجھے جو ہے وہی ہوتی ہے شام سے
تڑپے اسیر ہوتے جو ہم یک اٹھا غبار   سوجھا نہ ہم کو دیر تلک چشم دام سے
دنبال ہر نگاہ ہے صد کاروان اشک   برسے ہے چشم ابر بڑی دھوم دھام سے
محو اس دہان تنگ کے ہیں کوئی کچھ کہو   رہتا ہے ہم کو عشق میں کام اپنے کام سے
یوسف کے پیچھے خوار زلیخا عبث ہوئی   کب صاحبی رہی ہے مل ایسے غلام سے
لڑکے ہزاروں جھولی میں پتھر لیے ہیں ساتھ   مجنوں پھرا ہے کاہے کو اس ازدحام سے
وہ ناز سے چلا کہیں تو حشر ہو چکے   پھر بحث آپڑے گی اسی کے خرام سے
جھک جھک سلام کرنے سے سرکش ہوا وہ اور   ہو بیٹھے ناامید جواب سلام سے
وے دن گئے کہ رات کو یک جا معاش تھی   آتا ہے اب تو ننگ اسے میرے نام سے
سرگرم جلوہ بدر ہو ہر چند شب کو لیک   کب جی لگیں ہیں اپنے کسو ناتمام سے

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے

(۹۸۱)

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشم تر سے		ابر کیا کیا اٹھے ہنگامے سے کیا کیا برسے
ہو برافروختہ وہ بت جو مئے احمر سے		آگ نکلے ہے تماشے کے تئیں پتھر سے
ڈھب کچھ اچھا نہیں برہم زدن مژگاں کا		کاٹ ڈالے گا گلا اپنا کوئی خنجر سے
تھا نوشتے میں کہ یوں سوکھ کے مریے اس بن		استخواں تن پہ نمودار ہیں سب مسطر سے
یوں تو دس گز کی زباں ہم بھی بتاں رکھتے ہیں		بات کو طول نہیں دیتے خدا کے ڈر سے
سیر کرنے جو چلے ہے کبھو وہ فتنہ خرام		شہر میں شور قیامت اٹھے ہے ہر گھر سے
عشق کے کوچے میں پھر پاؤں نہیں رکھنے کے ہم		اب کے ٹل جاتی ہے کلول یہ اگر سر پر سے
مہر کی اس سے توقع غلطی اپنی تھی		کہیں دلداری ہوئی بھی ہے کسو دلبر سے
کوچۂ یار ہے کیا طرفہ بلاخیز مقام		آتے ہیں فتنہ و آشوب چلے اودھر سے

ساتھ سونا جو گیا اس کا بہت دل تڑپا
برسوں پھر میر یہ پہلو نہ لگے بستر سے

(۹۸۲)

مرا دل پیر و مرشد ہے مجھے ہے اعتقاد اس سے		فراموش آپ کو کرنا محبت میں ہے یاد اس سے
بلا انداز ہے اس کا قیامت ناز ہے اس کا		اٹھے فتنے ہزار اس سے ہوئے لاکھوں فساد اس سے
نزاکت جیسی ہے ویسا ہی دل بھی سخت ہے اس کا		اگرچہ شیشۂ جاں ہے پہ بہتر ہے جماد اس سے
کسے ہیں بند ان نے کیسے کس درویش سے ملیے		جو ایسے سخت عقدوں کی طلب کریے کشاد اس سے
بھلا یوں گھٹ کے مریے کب تلک دل خوں ہوا سارا		جو کوئی دادگر ہووے تو کریے جا کے داد اس سے
لگے ہی ایک دو رہتے ہیں مہلت بات کی کیسی		ہوا ہے دشمنوں کو کچھ قیامت اتحاد اس سے
پہنچ کر تہ کو ہم تو محض محرومی ہی پاتے ہیں		مراد دل کو پہنچا ہوگا کوئی نامراد اس سے
لیے ہی میان سے رہتا ہے کوئی یہ نہیں کہتا		نکالا ہے کہاں کا تونے اے ظالم عناد اس سے

ادھر توبہ کرے ہے میر ادھر لگتا ہے مے پینے
کہاں تک اب تو اپنا اٹھ گیا ہے اعتماد اس سے

(۹۸۳)

برا کیا مانیے اب چھیڑ سے یا اس کی گالی سے		یہی ہے طور اس کا ساتھ اپنے خوردسالی سے
کلی بیرنگ مرجھائی نظر آتی ہے ظاہر ہے		ہماری بے کلی گل ہائے تصویر نہالی سے
بھری آنکھیں کسو کی پونچھتے جو آستیں رکھتے		ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اس دست خالی سے

جو مر رہیے بھی تنگ آ کر تو پروا کچھ نہ ہو اس کو　　پڑا ہے کام مجھ ناکام کو کس لاابالی سے
جہاں رونے لگے تنک بے دماغی وہ لگا کرنے　　قیامت ضد ہے اس کو عاشق کی زارنالی سے
دماغ حرف لعل ناب و برگ گل سے ہے تم کو　　ہمیں جب گفتگو ہے تب کسو کے لب کی لالی سے
ریاضات محبت نے رکھا ہے ہم میں کیا باقی　　نمود اک کرتے ہیں ہم یوں ہی اب شکل مثالی سے
ہم اس راہ حوادث میں بسان سبزہ واقع ہیں　　کہ فرصت سر اٹھانے کی نہیں تک پائمالی سے
سرہانے رکھ کے پتھر خاک پر ہم بے نوا سوئے　　پڑے سر ماریں طالع مند اپنا سنگ قالی سے
کبھو میں عین رونے میں جگر سے آہ کرتا ہوں　　کہ دل اٹھ جائیں یاروں کے ہوائے برشگالی سے
یہی غم اس دہن کا ہے کہ فکر اس کی کمر کی ہے
کہے سو کیا کوئی ہیں میر صاحب کچھ خیالی سے

(۹۸۴)

کھینچے جہاں تو تیغ جلادت کے واسطے　　واں میں بھی ہوں مدام شہادت کے واسطے
سجدہ کوئی کرے تو در یار پر کرے　　ہے جاے پاک شرط عبادت کے واسطے
آئے نہ تم تو درپس دیوار مجھ تلک　　کھینچے ہیں لوگ رنج عیادت کے واسطے
خوش طالعی صبح جو اس منھ پہ ہے سفید　　پھرتا ہے مہ بھی اس ہی سعادت کے واسطے
ہے میر پیر لیک سوے میکدہ مدام
جاتا ہے مغبچوں کی ارادت کے واسطے

(۹۸۵)

دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے　　وحشت بہت تھی طاقت دل ہائے کھو چکے
افراط اشتیاق میں سمجھے نہ اپنا حال　　دیکھے ہیں سوچ کرکے تو اب ہم بھی ہو چکے
کہتا ہے میر سانجھ ہی سے آج درد دل
ایسی کہانی گرچہ نندھی ہے تو سو چکے

(۹۸۶)

بے خودی جو یہ ہے تو ہم آپ میں اب آ چکے　　کیا تمھیں یاں سے چلے جاتے ہو ہم بھی جا چکے
تم یہی کہتے رہے یہ اور گل تازہ کھلا　　زخم بھی ہم نے اٹھائے داغ بھی ہم کھا چکے
ایک بوسہ دے نہ منھ برسوں لگایا واہ واہ　　اب تو ٹک بولو جزا ہم اس عمل کی پا چکے
یاں تلک آنے میں جتنا مکث کرتے ہو کرو　　اب تو جانا جان سے ناچار ہم ٹھہرا چکے
اب چمن میں جا نکلتے ہیں تو جی لگتا نہیں
پھول گل سے میر اس بن دل بہت بہلا چکے

(۹۸۷)

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں ہانکے
اس کی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

ایک ایک بات اوپر ہیں پیچ و تاب سو سو
رہتے نہیں ہیں سیدھے یہ لونڈے ٹیڑھے بانکے

سر کو اس آستاں پر رکھے رہیں تو بہتر
اٹھیے جو اس کے در سے تو ہوجیے کہاں کے

گردش سے ردیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں
جانے ہی کے ہیں لچھن سارے اس آسماں کے

مشتاق ہم جو ایسے سو ہم ہی سے ہے پردہ
جب اس طرف سے نکلے تب منھ کو اپنے ڈھانکے

ہے پرغبار عالم جانا ہی یاں سے اچھا
اس خاکداں میں رہ کر کیا کوئی خاک پھانکے

کل باغ میں گئے تھے روئے چمن چمن ہم
کچھ سرو میں جو پائے انداز اس جواں کے

جاناں کی رہ سے آنکھیں جس تس کی لگ رہی ہیں
رفتہ ہیں لوگ سارے ان پاؤں کے نشاں کے

خمیازہ کش رہے ہے اے میر شوق سے تو
سینے کے زخم کے کہہ کیونکر رہیں گے ٹانکے

(۹۸۸)

دل خوں ہوا ہمارا ٹکڑے ہوئے جگر کے
دیکھا نہ تم نے ایدھر صرفے سے اک نظر کے

چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری
آثار اب تلک ہیں یاروں کی چشم تر کے

رہنے کی اپنے جا تو نے دیر ہے نہ کعبہ
اٹھیے جو اس کے در سے تو ہوجیے کدھر کے

اس شعر و شاعری پر اچھی بندھی نہ ہم سے
محو خیال شاعر یوں ہی ہیں اس کمر کے

دنیا میں ہے بسیرا یارو سرائے کا سا
یہ رہروان ہستی عازم ہیں سب سفر کے

وے یہ ہی چھاتیاں ہیں زخموں سے جو بھری ہیں
کیا ہے جو بوالہوس نے دوچار کھائے چرکے

تہ بےخودی کی اپنی کیا کچھ ورے دھری ہے
ہم بےخبر ہوئے ہیں پہنچے کسو خبر کے

اس آستاں کی دوری اس دل کی ناصبوری
کیا کہیے آہ غم سے گھر کے ہوئے نہ در کے

خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل
پاؤں کنے سے اس کے پر میر جی نہ سرکے

(۹۸۹)

کتنے روزوں سے تہ دونے کے ہیں نے کھانے کے
دل جو یہ ہے تو ہم آرام نہیں پانے کے

ہائے کس خوبی سے آوارہ رہا ہے مجنوں
ہم بھی دیوانے ہیں اس طور کے دیوانے کے

عزم ہے جزم کہ اب کے حرکت شہر سے کر
ہوجے دل کھول کے ساکن کسو ویرانے کے

آہ کیا سہل گذر جاتے ہیں جی سے عاشق
ڈھب کوئی سیکھ لے ان لوگوں سے مرجانے کے

جو مر رہیے بھی تنگ آ کر تو پروا کچھ نہ ہو اس کو — پڑا ہے کام مجھ ناکام کو کس لاابالی سے
جہاں رونے لگے تک بے دماغی وہ لگا کرنے — قیامت ضد ہے اس کو عاشقی کی زارنالی سے
دماغ حرف لعل ناب و برگ گل سے ہے تم کو — ہمیں جب گفتگو ہے تب کسو کے لب کی لالی سے
ریاضات محبت نے رکھا ہے ہم میں کیا باقی — نمود اک کرتے ہیں ہم یوں ہی اب شکل مثالی سے
ہم اس راہ حوادث میں بسان سبزہ واقع ہیں — کہ فرصت سر اٹھانے کی نہیں تک پائمالی سے
سرہانے رکھ کے پتھر خاک پر ہم بے نوا سوئے — پڑے سر ماریں طالع مند اپنا سنگ قالی سے
کبھو میں عین رونے میں جگر سے آہ کرتا ہوں — کہ دل اٹھ جائیں یاروں کے ہوائے برشگالی سے
یہی غم اس دہن کا ہے کہ فکر اس کی کمر کی ہے
کہے سو کیا کوئی ہیں میر صاحب کچھ خیالی سے

(۹۸۴)

کھنچے جہاں تو تیغ جلادت کے واسطے — واں میں بھی ہوں مدام شہادت کے واسطے
سجدہ کوئی کرے تو در یار پر کرے — ہے جاے پاک شرط عبادت کے واسطے
آئے نہ تم تو درپس دیوار مجھ تلک — کھنچے ہیں لوگ رنج عیادت کے واسطے
خوش طالعی صبح جو اس منھ پہ ہے سفید — پھرتا ہے مہ بھی اس ہی سعادت کے واسطے
ہے میر پیر لیک سوے میکدہ مدام
جاتا ہے مغبچوں کی ارادت کے واسطے

(۹۸۵)

دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے — وحشت بہت تھی طاقت دل ہائے کھو چکے
افراط اشتیاق میں سمجھے نہ اپنا حال — دیکھے ہیں سوچ کرکے تو اب ہم بھی ہو چکے
کہتا ہے میر سانجھ ہی سے آج درد دل
ایسی کہانی گرچہ نہ تھی ہے تو سو چکے

(۹۸۶)

بے خودی جو یہ ہے تو ہم آپ میں اب آچکے — کیا تمھیں یاں سے چلے جاتے ہو ہم بھی جا چکے
تم یہی کہتے رہے یہ اور گل تازہ کھلا — زخم بھی ہم نے اٹھائے داغ بھی ہم کھا چکے
ایک بوسہ دے نہ منھ برسوں لگایا واہ واہ — اب تو تک بولو جزا ہم اس عمل کی پا چکے
یاں تلک آنے میں جتنا مکث کرتے ہو کرو — اب تو جانا جان سے ناچار ہم ٹھہرا چکے
اب چمن میں جا نکلتے ہیں تو جی لگتا نہیں
پھول گل سے میر اس بن دل بہت بہلا چکے

(۹۸۷)

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں ہانکے	اس کی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے
ایک ایک بات اوپر ہیں پیچ و تاب سو سو	رہتے نہیں ہیں سیدھے یہ لونڈے ٹیڑھے بانکے
سر کو اس آستاں پر رکھے رہیں تو بہتر	اٹھیے جو اس کے در سے تو ہوجیے کہاں کے
گردش سے روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں	جانے ہی کے ہیں پھن سارے اس آسماں کے
مشتاق ہم جو ایسے سو ہم ہی سے ہے پردہ	جب اس طرف سے نکلے تب منہ کو اپنے ڈھانکے
ہے پرغبار عالم جانا ہی یاں سے اچھا	اس خاکداں میں رہ کر کیا کوئی خاک پھانکے
کل باغ میں گئے تھے روئے چمن چمن ہم	کچھ سرو ہیں جو پائے انداز اس جواں کے
جاناں کی رہ سے آنکھیں جس تس کی لگ رہی ہیں	رفتہ ہیں لوگ سارے ان پاؤں کے نشاں کے

خمیازہ کش رہے ہے اے میر شوق سے تو
سینے کے زخم کے کہہ کیونکر رہیں گے ٹانکے

(۹۸۸)

دل خوں ہوا ہمارا ٹکڑے ہوئے جگر کے	دیکھا نہ تم نے ایدھر صرفے سے اک نظر کے
چشمے کہیں ہیں جوشاں جوئیں کہیں ہیں جاری	آثار اب تلک ہیں یاروں کی چشم تر کے
رہنے کی اپنے جا تو نے دیر ہے نہ کعبہ	اٹھیے جو اس کے در سے تو ہوجیے کدھر کے
اس شعر و شاعری پر اچھی بندھی نہ ہم سے	محوخیال شاعر یوں ہی ہیں اس کمر کے
دنیا میں ہے بسیرا یارو سرائے کا سا	یہ رہروان ہستی عازم ہیں سب سفر کے
دے یہ ہی چھاتیاں ہیں زخموں سے جو بھری ہیں	کیا ہے جو بوالہوس نے دوچار کھائے چرکے
تہ بےخودی کی اپنی کیا کچھ ورے دھری ہے	ہم بےخبر ہوئے ہیں پہنچے کسو خبر کے
اس آستاں کی دوری اس دل کی ناصبوری	کیا کہیے آہ غم سے گھر کے ہوئے نہ در کے

خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل
پاؤں کنے سے اس کے پر میر جی نہ سرکے

(۹۸۹)

کتنے روزوں سے نہ سونے کے ہیں نے کھانے کے	دل جو یہ ہے تو ہم آرام نہیں پانے کے
ہائے کس خوبی سے آوارہ رہا ہے مجنوں	ہم بھی دیوانے ہیں اس طور کے دیوانے کے
عزم ہے جزم کہ اب کے حرکت شہر سے کر	ہوجے دل کھول کے ساکن کسو ویرانے کے
آہ کیا سہل گذر جاتے ہیں جی سے عاشق	ڈھب کوئی سیکھ لے ان لوگوں سے مرجانے کے

جمع کرتے ہو جو گیسوے پریشاں کو مگر
ہو تردد میں کوئی تازہ بلا لانے کے

کاہے کو آنکھ چھپاتے ہو یہی ہے گر چال
ایک دو دن میں نہیں ہم بھی نظر آنے کے

ہاتھ چڑھ جائیو اے شیخ کسو کے نہ کبھو
لونڈے سب تیرے خریدار ہیں میخانے کے

خاک سے چرخ تلک اب تو رکا جاتا ہے
ڈول اچھے نہیں کچھ جان کے گھبرانے کے

لے بھی اے غیرت خورشید کہیں منھ پہ نقاب
مقتضی دن نہیں اب منھ کے یہ دکھلانے کے

لالہ و گل ہی کے مصروف رہو ہو شب و روز
تم مگر میر جی سید ہو گلستانے کے

(۹۹۰)

اس باغ بےثبات میں کیا دل صبا لگے
کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آ لگے

حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے
ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

تیغ اب تو اپنے جی کو بھی لگتی ہے اس نمط
جیسے کسو کے زخم پہ تیر اک نو آ لگے

کس کو خبر ہے کشتی تباہوں کے حال کی
تختہ مگر کنارے کوئی بہ کے جا لگے

ایسے لگے پھرے ہیں بہت سائے کی روش
جانے دے ایسی حور پری سے بلا لگے

وہ بھی چمن فروز تو بلبل ہے سامنے
گل ایسے منھ کے آگے بھلا کیا بھلا لگے

پس جائیں یار آنکھ تری سرمگیں پڑے
دل خوں ہو تیرے پاؤں میں بھر کر حنا لگے

بن ہڈیوں ہماری ہما کچھ نہ کھائے گا
تک چاشنی عشق کا اس کو مزہ لگے

خط مت رکھو کہ اس میں بہت ہیں قباحتیں
دیکھے تمھارے منھ پہ تو تم کو برا لگے

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

سب چاہتے ہیں دیر رہے میر دل زدہ
یارب کسو تو دوست کی اس کو دعا لگے

(۹۹۱)

غیر کو دیکھے ہے گرمی سے نہ کچھ لاگ لگے
اس لیے دیکھ رہا ہے کہ مجھے آگ لگے

آنکھ ہر ایک کی دوڑے ہے کفک پر تیرے
پاؤں سے لگ کے ترے مہندی کو کچھ بھاگ لگے

ہو نہ دیوانہ جو اس گوہر خوش آب کا تو
لب دریا کے تئیں کیوں رہیں یوں جھاگ لگے

اب تو ان گیسوؤں کی یاد میں میں محو ہوا
گو قیامت کو مرے منھ سے ہوں دو ناگ لگے

لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میر
پیچھے ایک ایک کے سو سو پھریں ہیں ڈاگ لگے

(۹۹۲)

کب تلک احوال یہ جب کوئی تیرا نام لے
عاشق بے حال دونوں ہاتھ سے دل تھام لے

ناتوانی سے اگر مجھ میں نہیں ہے جی تو کیا
عشق جو چاہے تو مردے سے بھی اپنا کام لے

پہلوے عاشق نہ بستر سے لگے تو ہے بجا
دل سی آفت ہو بغل میں جس کے کیا آرام لے

اب دل نالاں پھر اس زلف سیہ میں جاچکا
آج یہ بیمار دیکھیں کس طرح سے شام لے

شاخ گل تیری طرف جھکتی جو ہے اے مست ناز
چاہتی ہے تو بھی میرے ہاتھ سے اک جام لے

دل کی آسائش نہیں امکان زلف یار میں
یہ شکار مضطرب ہے دم نہ زیر دام لے

عزت اے پیر مغاں کچھ حاجیوں کی ہے ضرور
آئے ہیں تیرے کنے ہم جامۂ احرام لے

کیا بلا مفتی کا لونڈا سر چڑھا ہے ان دنوں
آوے ہے گویا کہ مجھ پر قاضی کا اعلام لے

ہم نشیں کہہ مت بتوں کی میر کو تسبیح ہے
کام کیا اس ذکر سے ان کو خدا کا نام لے

(۹۹۳)

سختیاں کھینچیں سو کھینچیں پھر بھی جو اٹھ کر چلے
چلتے اس کوچے سے ہم پر سینکڑوں پتھر چلے

مارگیری سے زمانے کی نہ دل کو جمع رکھ
چال دھیمی اس کی ایسی ہے کہ جوں اجگر چلے

کیونکے ان کا کوئی وارفتہ بھلا ٹھہرا رہے
جنبش ان پلکوں کو ہوتی ہے کہ جوں خنجر چلے

اب جو وہ سرمایۂ جاں یاں تلک آیا تو کیا
راہ تکتے تکتے اس کی ہم تو آخر مر چلے

میں نہ کہتا تھا دم بسمل مرے مت آئیو
لوٹتے دامن کی اپنے زہ لہو میں بھر چلے

چھوڑ جانا جاں بہ لب ہم کو کہاں کا ہے سلوک
گھر کے گھریاں بیٹھے جاتے ہیں تم اٹھ کر گھر چلے

صاف سارا شہر اس انبوہ خط میں لٹ گیا
کچھ نہیں رہتا ہے واں جس راہ ہو لشکر چلے

پاؤں میں مارا ہے تیشہ میں نے راہ عشق میں
ہو سو ہو اب گو کہ آرا بھی مرے سر پر چلے

لائے تھے جا کر ابھی تو اس گلی میں سے پکار
چپکے چپکے میر جی تم اٹھ کے پھر کیدھر چلے

(۹۹۴)

یا پہلے وے نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے
یا اب کی وے ادائیں جو دل سے آہ نکلے

کیونکر نہ چپکے چپکے یوں جان سے گذریے
کہیے بتا جو اس سے باتوں کی راہ نکلے

زردی رنگ و رونا دونوں دلیل کشتن
خوش طالعی سے میری کیا کیا گواہ نکلے

اے کام جاں ہے تو بھی کیا ریجھ کا پچاؤ
مر جایئے تو منھ سے تیرے نہ واہ نکلے

خوبی و دلکشی میں صد چند ہے تو اس سے
تیرے مقابلے کو کس منہ سے ماہ نکلے

یاں مہر تھی وفا تھی واں جور تھے ستم تھے
پھر نکلے بھی تو میرے یہ ہی گناہ نکلے

غیروں سے تو کہے ہے اچھی بری سب اپنی
اے یار کب کے تیرے یہ خیرخواہ نکلے

رکھتے تو ہو مکدر پر اس گھڑی سے ڈریو
جب خاک منہ پہ مل کر یہ روسیاہ نکلے

اک خلق میر کے اب ہوتی ہے آستاں پر
درویش نکلے ہے یوں جوں بادشاہ نکلے

(۹۹۵)

جیسے اندوہِ محرم عشق کب تک دل ملے
عید سی ہو جائے اپنے ہاں لگے جو تو گلے

دین و مذہب عاشقوں کا قابلِ پرسش نہیں
یہ ادھر سجدہ کریں ابرو جدھر اس کی ہلے

یہ نہیں میں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک
آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی اس کے تلووں سے ملے

ہائے کس حسرت سے شبنم نے سحر رو کر کہا
خوش رہو اے ساکنانِ باغ اب تو ہم چلے

مردمانِ شہرِ خوبی پہ کریں کیا دل کو عرض
ایسی جنسِ ناروا کو مفت کوئی واں نہ لے

کل جو ہم کو یاد آیا باغ میں قدِ یار کا
خوب روئے ہر نہالِ سبز کے سائے تلے

جمع کر خاطر مرے جینے سے مجھ کو خوب ہے
جی بچا تب جانیے جب سر سے یہ کلول ٹلے

گرچہ سب ہیں گے مہیاے طریقِ نیستی
ق طے بہت دشوار کی یہ رہگذر ہم نے ولے

ہر قدم پر جی سے جانا ہر دم اوپر بے دمی
لحظہ لحظہ آگے تھے آیا کیا قیامت مرحلے

جلنے کو جلتے ہیں سب کے اندرونے لیک میر
جب کسو کی اس وتیرے سے کہیں چھاتی جلے

(۹۹۶)

بے مہر و وفا ہے وہ کیا رسمِ وفا جانے
الفت سے محبت سے مل بیٹھنا کیا جانے

دل دھڑکے ہے جاتے کچھ بت خانے سے کعبے کو
اس راہ میں پیش آوے کیا ہم کو خدا جانے

ہے محو رخ اپنا تو آئینے میں ہر ساعت
صورت ہے جو کچھ دل کی سو تیری بلا جانے

کچھ اس کی بندھی مٹھی اس باغ میں گذرے ہے
جو زخمِ جگر اپنے جوں غنچہ چھپا جانے

کیا سینے کے جلنے کو خس خس کے اڑاتا ہوں
جب آگ کوئی گھر کو اس طور لگا جانے

میں مٹی بھی لے جاؤں دروازے کی اس کے تو
اس دردِ محبت کی جو کوئی دوا جانے

اپنے تئیں بھی کھانا خالی نہیں لذت سے
کیا جانے ہوں پیشہ چکھے تو مزہ جانے

یوں شہر میں بہتیرے آزاردہندے ہیں
تب جانیے جب کوئی اس ڈھب سے ستا جانے

کیا جانوں رکھو روزے یا دارو پیو شب کو   کردار وہی اچھا تو جس کو بھلا جانے

آگاہ نہیں انساں اے میرؔ نوشتے سے
کیا چاہیے ہے پھر جو طالع کا لکھا جانے

(۹۹۷)

الٰہی کہاں منھ چھپایا ہے تو نے   ہمیں کھو دیا ہے تری جستجو نے
جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی   ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ   رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
رقیبوں سے سر جوڑ بیٹھو ہو کیونکر   ہمیں تو نہیں دیتے ٹک پاؤں چھونے
پھر اس سال سے پھول سونگھا نہ میں نے   دوانہ کیا تھا مجھے تیری بو نے
مداوا نہ کرتا تھا مشفق ہمارا   جراحت جگر کے لگے دکھنے دونے
کڑھایا کسو کو کھپایا کسو کو   برائی ہی کی سب سے اس خوبرو نے
وہ کسریٰ کہ ہے شور جس کا جہاں میں   پڑے ہیں گے اس کے محل آج سونے

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

(۹۹۸)

دیسا ہے یہ جو یوسف شب تیرے ہوتے آوے   جیسے چراغ کوئی مہتاب میں جلاوے
کیا رُکّی سے میری تم گفتگو کرو ہو   کھویا گیا نہیں میں ایسا جو کوئی پاوے
چھاتی کے داغ یکسر آنکھوں سے کھل رہے ہیں   دیکھیں ابھی محبت کیا کیا ہمیں دکھاوے
ہیں پاؤں اس کے نازک گل برگ سے بجا ہے   عاشق جو رہگذر میں آنکھوں کے تیں بچھاوے
یوں خاک منھ پہ مل کر کب تک پھرا کروں میں   یارب زمیں پھٹے تو یہ روسیہ سماوے
اے کاش قصہ میرا ہر فرد کو سنا دیں   تا دل کسو سے اپنا کوئی نہ یاں لگاوے
ترک بتاں کا مجھ سے لیتے ہیں قول یوں ہی   کیا ان سے ہاتھ اٹھاؤں گو اس میں جان جاوے
عاشق کو مر گئے ہی بنتی ہے عاشقی میں   کیا جان جس کی خاطر شرمندگی اٹھاوے

جی میں بگڑ رہا ہے تب میرؔ چپ ہے بیٹھا
چھیڑو ابھی تو کیا کیا باتیں بنا کے لاوے

(۹۹۹)

یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے   یا ابر کوئی آوے اور آکے برس جاوے

شورش کدۂ عالم کہنے ہی کی جا گہ تھی دل کیا کرے جو ایسے ہنگامے میں پھنس جاوے
دل ہے تو عبث نالاں یاران گذشتہ بن ممکن نہیں اب ان تک آواز جرس جاوے
اس زلف سے لگ چلنا اک سانپ کھلانا ہے یہ مارسیہ یارو ناگاہ نہ ڈس جاوے
میخانے میں آوے تو معلوم ہو کیفیت یوں آگے ہو مسجد کے ہر روز عسس جاوے
چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں چپکیں جب پیرہن گل بھی اس خوبی سے چس جاوے

ہے میرؔ عجب کوئی درویش برشتہ دل
بات اس کی سنو تم تو چھاتی بھی بھلس جاوے

(۱۰۰۰)

درونے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک ہوا دیوے مبادا عشق کی گرمی جگر میرا جلا دیوے
کہاں تک یوں پڑے بستر پہ رہیے دور جاناں سے کوئی کاش اس گلی میں ہم کو اک تکیہ بنا دیوے
ہوئے برسوں کہ وہ ظالم رہے ہے مجھ پہ کچھ ٹیڑھا کوئی اس تیغ برکف کو گلے میرے ملا دیوے
وفا کی مزد میں ہم پر جفا و جور کیا کہیے کسو سے دل لگے اس کا تو وہ اس کی جزا دیوے
کہیں کچھ تو برا مانو بھلا انصاف تو کریے بدی کو بھی نہایت ہے تمھیں نیکی خدا دیوے
صنوبر آدمی ہو تو سراپا بار دل لاوے کہاں سے کوئی تازہ دل اسے ہر روز لا دیوے
بہت گمراہ ہے وہ شوخ لگتا ہے کہے کس کے کوئی کیا راہ کی بات اس جفاجو کو بتا دیوے
جگر سب جل گیا لیکن زباں جلتی نہیں اپنی مباد اس آتشیں خو کو مخالف کچھ لگا دیوے

کوئی بھی میرؔ سے دل ریش سے یوں دور پھرتا ہے
ٹک اس درویش سے مل چل کہ تجھ کو کچھ دعا دیوے

(۱۰۰۱)

اس شوخ ستمگر کو کیا کوئی بھلا چاہے جو چاہنے والے کا ہر طور برا چاہے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے
سو رنگ کی جب خوبی پاتے ہو اسی گل میں پھر اس سے کوئی اس بن کچھ چاہے تو کیا چاہے
ہم عجز سے پہنچے ہیں مقصود کی منزل کو گہ خاک میں مل جاوے جو اس سے ملا چاہے
ہوسکتی ہیں سد رہ پلکیں کہیں رونے کی تنکوں سے رکے ہے کب دریا جو بہا چاہے
جب تونے زباں چھوڑی تب کاہے کا صرفہ ہے بے صرفہ کہے کیوں نہ جو کچھ کہ کہا چاہے
دل جاوے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے
خط رسم زمانہ تھی ہم نے بھی لکھا اس کو نہ دل کی لکھے کیونکر عاشق جو لکھا چاہے

رنگِ گل و بوے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں   کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے
ہم میرؔ ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن
رہتا ہے ہوئے بن کب جو کچھ کہ ہوا چاہے

(۱۰۰۲)

دوری میں اس کی گور کنارے ہم آرہے   جی رات دن جنھوں کے کھپیں ان میں کیا رہے
اس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں   ایسے ظہور پر بھی وہ منھ کو چھپا رہے
اب جس کے حسنِ خلق پہ بھولے پھریں ہیں لوگ   اس بے وفا سے ہم بھی بہت آشنا رہے
مجروح ہم ہوئے تو نمک پاشیاں رہیں   ایسی معاش ہووے جہاں کیا مزہ رہے
مرغان باغ سے نہ ہوئی میری دم کشی   نالے کو سن کے وقت سحر دم ہی کھا رہے
چھاتی رکی رہے ہے جو کرتے نہیں ہیں آہ   یاں لطف تب تلک ہی ہے جب تک ہوا رہے
کشتے ہیں ہم تو ذوق شہیدان عشق کے   تیغ ستم کو دیر گلے سے لگا رہے
گاہے کراہتا ہے گہے چپ ہے گاہ ست   ممکن نہیں مریض محبت بھلا رہے
آتے کبھو جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس
آخر کو میرؔ اس کی گلی ہی میں جا رہے

(۱۰۰۳)

یک عمر دیدہ ہاے ستم دیدہ تر رہے   آخر کو پھوٹ پھوٹ بہے قہر کر رہے
ہم نے بھی نذر کی ہے پھریں گے چمن کے گرد   آنے تئیں بہار کے گر بال و پر رہے
کیا کہیے تیرے واسطے اے مایۂ حیات   کیا کیا عزیز اپنے تئیں مار مر رہے
مرتے بھی اپنے ہائے وہ حاضر نہ ہوسکا   ہم اشتیاق کش تو بہت منتظر رہے
مرغان باغ رہتے ہیں اب گھیرے یوں مجھے   ماتم زدوں کے حلقے میں جوں نوحہ گر رہے
آغوش اس سے خالی رہی شب تو تا سحر   جیب و کنار گریۂ خونیں سے بھر رہے
نقش قدم کے طور ترے ہم ہیں پائمال   غالب ہے یہ کہ دیر ہمارا اثر رہے
اب صبر و ہوش و عقل کی میرے یہ ہے معاش   جوں قافلہ لٹا کہیں آکر اتر رہے
لاکھوں ہمارے دیکھتے گھر بار سے گئے   کس خانماں خراب کے دے جا کے گھر رہے
آتا کبھو تو ناز سے دکھلائی دے بھی جا   دروازے ہی کی اور کہاں تک نظر رہے
رکھنا تمھارے پاؤں کا کھوتا ہے سر سے ہوش   یہ چال ہے تو اپنی کسے پھر خبر رہے
کیا بدبلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی
دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر رہے

(۱۰۰۴)

یاں ہم براے بیت جو بے خانماں رہے
سو یوں رہے کہ جیسے کوئی میہماں رہے

تھا ملک جن کے زیرنگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

آنسو چلے ہی آنے لگے منھ پہ متصل
کیا کہیے اب کہ راز محبت نہاں رہے

ہم جب نظر پڑیں تو وہ ابرو کو خم کرے
تیغ اپنے اس کے کب تئیں یوں درمیاں رہے

کوئی بھی اپنے سر کو کٹاتا ہے یوں ولے
جوں شمع کیا کروں جو نہ میری زباں رہے

یہ دونوں چشمے خون سے بھر دوں تو خوب ہے
سیلاب میری آنکھوں سے کب تک رواں رہے

دیکھیں تو مصر حسن میں کیا خواریاں کھنچیں
اب تک تو ہم عزیز رہے ہیں جہاں رہے

مقصود گم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب
چکر میں ورنہ کاہے کو یوں آسماں رہے

کیا اپنی ان کی تم سے بیاں کیجیے معاش
کیں مدتوں رکھا جو ٹک مہرباں رہے

کہ شام اس کے مو سے ہے کہ رو سے اس کے صبح
تم چاہو ہو کہ ایک سا ہی یاں سماں رہے

کیا نذر تیغ عشق سر تیر میں کیا
اس معرکے میں کھیت بہت خستہ جاں رہے

اس تنگناے دہر میں تنگی نفس نے کی
جوں صبح ایک دم ہی رہے ہم جو یاں رہے

اک قافلے سے گرد ہماری نہ ٹک اٹھی
حیرت ہے میر اپنے تئیں ہم کہاں رہے

(۱۰۰۵)

ایک سمیں تم ہم فقرا سے اکثر صحبت رکھتے تھے
اور نہ تھی توفیق تمھیں تو بوسے کی ہمت رکھتے تھے

آگے خط سے دماغ تمھارا عرش پہ تھا ہو وے ہی تم
پاؤں زمیں پر رکھتے تھے تو خدا پر منت رکھتے تھے

اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اٹھاتے تھے جب جی میں طاقت رکھتے تھے

چاہ کے سارے دیوانے پر آپ سے اکثر بیگانے
عاشق اس کے میر کہ ہم سب سے جدی مت رکھتے تھے

ہم تو سزاے تیغ ہی تھے پر ظلم بے حد کیا معنی
اور بھی تجھ سے آگے ظالم اچھی صورت رکھتے تھے

آج غزال اک رہبر ہو کر لایا تربت مجنوں پر
قصد زیارت رکھتے تھے ہم جب سے وحشت رکھتے تھے

کس دن ہم نے سر نہ چڑھا کر ساغر مے کو نوش کیا
دور میں اپنے دختر رز کی ہم اک حرمت رکھتے تھے

کوہکن و مجنون و وامق کس کس کے لیں نام غرض
جی ہی سے جاتے آگے سنے وے لوگ جو الفت رکھتے تھے

چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھتے تھے ہم سرخ و زرد
پھول چمن کے کس کے منھ سے ایسی خجلت رکھتے تھے

کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یاں ناپیدا تھا
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے

جاتوں کے کب ڈھب تھے ایسے چشمک کے تھے کب یہ ڈول
ہائے رے وے دن جن روزوں تم کچھ بھی مروت رکھتے تھے

لعل سے جب دل تھے یہ ہمارے مژگاں سے تھے اشک چشم
کیا کیا کچھ پاس اپنے ہم بھی عشق کی دولت رکھتے تھے

کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاقانہ موئے
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے

(۱۰۰۶)

مجنوں و کوہکن کو آزار ایسے ہی تھے
یہ جان سے گئے سب بیمار ایسے ہی تھے

شمس و قمر کے دیکھے جی اس میں جا رہے ہے
اس دل فروز کے بھی رخسار ایسے ہی تھے

دامن کے پاٹ سارے تختے ہوئے چمن کے
بس اے سرشک خونیں درکار ایسے ہی تھے

لوہو نہ کیوں رلائے ان کا گداز ہونا
یہ دل جگر ہمارے غم خوار ایسے ہی تھے

ہر دم جراحت آسا کب رہتے تھے ٹپکتے
یہ دیدۂ نمیں کیا خوں بار ایسے ہی تھے

آزاردہ دلوں کا جیسا کہ تو ہے ظالم
اگلے زمانے میں بھی کیا یار ایسے ہی تھے

ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغ زمانہ ہم پر
ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے

دیوار سے پٹک سر میں جو موا تو بولا
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

اک حرف کا بھی ان کو دفتر ہے کر دکھانا
کیا کہیے میر جی کے بستار ایسے ہی تھے

(۱۰۰۷)

اب ہم فقیر جی سے دل کو اٹھا کے بیٹھے
اس خصم جاں کے در پر تکیہ بنا کے بیٹھے

مرتے ہوئے بھی ہم کو صورت نہ آ دکھائی
وقت اخیر اچھا منھ کو چھپا کے بیٹھے

عزلت نشیں ہوئے جب دل داغ ہوگیا تب
یعنی کہ عاشقی میں ہم گھر جلا کے بیٹھے

جو کفر جانتے تھے عشق بتاں کو وہ ہی
مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے

شور متاع خوبی اس شوخ کا بلا تھا
بازاری سب دکانیں اپنی بڑھا کے بیٹھے

کیا اپنی اور اس کی اب نقل کریے صحبت
مجلس سے اٹھ گیا وہ ٹک ہم جو آکے بیٹھے

کیا جانے تیغ اس کی کب ہو بلند عاشق
یوں چاہیے کہ سر کو ہر دم جھکا کے بیٹھے

پھولوں کی سیج پر سے جو بے دماغ اٹھے ق
مسند پہ ناز کی جو تیوری چڑھا کے بیٹھے

کیا غم اسے زمیں پر بے برگ و ساز کوئی
خار و خسک ہی کیوں نہ برسوں بچھا کے بیٹھے

وادی قیس سے پھر آئے نہ میر صاحب
مرشد کے ڈھیر پر وے شاید کہ جا کے بیٹھے

(۱۰۰۸)

ہے جنبش لب مشکل جب آن کے وہ بیٹھے
جو چاہیں سو یوں کہہ لیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے

جی ڈوب گئے اپنے اندوہ کے دریا میں
وے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی وہ بیٹھے

کیا رنگ میں شوخی ہے اس کے تن نازک کی
پیراہن اگر پہنے تو اس پہ بھی تہ بیٹھے

سر گل نے اٹھایا تھا اس باغ میں سو دیکھا　　کیا ناز سے یاں کوئی کج کرکے کلہ بیٹھے
مرتے ہوئے پر چاہت ظاہر نہ کی اگلوں نے　　بے حوصلہ تھے ہم جو اس راز کو کہہ بیٹھے
کیا جانے کہ ادھر کا کب قصد کرے گا وہ　　پامال ہوئے ہم تو اس سے سرِ رہ بیٹھے
جو ہاتھ چڑھا اس کے دل خوں ہی کیا اس کا
اس پنجۂ رنگیں کی اے میر نہ کہہ بیٹھے

(۱۰۰۹)

اب سمجھ آئی مرتبہ سمجھے　　گم کیا خود کے تیں خدا سمجھے
اس قدر جی میں ہے دغا اس کے　　کہ دعا کریے تو دغا سمجھے
کچھ سمجھتے نہیں ہمارا حال　　تم سے بھی اے بتاں خدا سمجھے
غلط اپنا کہ اس جفاجو کو　　سادگی سے ہم آشنا سمجھے
نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا　　پر ہمارا نہ مدعا سمجھے
لکھے دفتر کتابیں کیں تصنیف　　پر نہ طالع کا ہم لکھا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

(۱۰۱۰)

اب اپنے قد راست کو خم دیکھتے ہیں ہائے　　ہستی کے تئیں ہوتے عدم دیکھتے ہیں ہائے
سنتے تھے کہ جاتی ہے ترے دیکھنے سے جاں　　اب جان چلی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں ہائے
کیا روتے ہیں یاران گذشتہ کے لیے ہم　　جب راہ میں کچھ نقش قدم دیکھتے ہیں ہائے
کچھ عشق کی آتش کی لپٹ پہنچی ہمیں زور　　سب تن بدن اپنے کو بھسم دیکھتے ہیں ہائے
دل چاک ہے جاں داغ جگر خوں ہے ہمارا　　ان آنکھوں سے انواع ستم دیکھتے ہیں ہائے
مایوس نہ کس طور جہاں سے رہیں ہم میر
اب تاب بہت جان میں کم دیکھتے ہیں ہائے

(۱۰۱۱)

جاگنا تھا ہم کو سو بیدار ہوتے رہ گئے　　کارواں جاتا رہا ہم ہائے سوتے رہ گئے
بوے گل پیش از سحر گلزار سے رخصت ہوئی　　ہم ستم کش روبرو اس کے تو سوتے رہ گئے
جی دیے بن وہ درِ مقصود کب پایا گیا
بے جگر تھے میر صاحب جان کھوتے رہ گئے

(۱۰۱۲)

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے — کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے
ہنستے رہتے تھے جو اس گلزار میں شام و سحر — دیدۂ تر ساتھ لے وے لوگ جوں شبنم گئے
گر ہوا اس باغ کی ہے یہ تو اے بلبل نہ پھول — کوئی دن میں دیکھیو واں وے گئے یاں ہم گئے
کیا کم اس خورشیدرو کی جستجو یاروں نے کی — لوہو روتے جوں شفق پورب گئے پچھم گئے
جی گیا یاں بے دماغی سے انھوں کی اور واں — نے جبیں سے چیں گئی نے ابرووں سے خم گئے
شاید اب ٹکڑوں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا — کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے
گرچہ ہستی سے عدم تک اک مسافت تھی بعید — پر اٹھے جو ہم یہاں سے واں تلک اک دم گئے
کیا معاش اس غم کدے میں ہم نے دس دن کی بہم — اٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لیے ماتم گئے
سبزہ و گل خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی — سو بھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے
مردم دنیا بھی ہوتے ہیں سمجھ کس مرتبہ — آن بیٹھے ناؤں کو تو یاں نگیں سے جم گئے

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر
مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نامحرم گئے

(۱۰۱۳)

ہم نہ کہتے تھے رہے گا ہم میں کیا یاں سے گئے — سو ہی بات آئی اٹھے اس پاس سے جاں سے گئے
کیا بخود رہنا ہمارا کچھ رکھے ہے اعتبار — آپ میں آئے کبھو اب ہم تو مہماں سے گئے
جب تلک رہنا بنا دل تنگ غنچے سے رہے — دیکھیے کیا گل کھلے گا اب گلستاں سے گئے
کیا غزالوں ہی کو ہم بن وحشت بسیار ہے — کوہ بھی نالاں رہے جب ہم بیاباں سے گئے
لائی آفت خانقاہ و مسجد اوپر وہ نگاہ — صوفیاں دیں سے گئے سب شیخ ایماں سے گئے
دور کر خط کو کیا چہرہ کتابی ان نے صاف — اب قیامت ہے کہ سارے حرف قرآں سے گئے

جی تو اس کی زلف میں دل کاکل پیچاں میں میر
جا بھی نکلے اس کنے تو ہم پریشاں سے گئے

(۱۰۱۴)

دل شتاب اس بزم عشرت سے اٹھایا چاہیے — ایک دن تہ کر بساط ناز جایا چاہیے
یہ قیامت اور جی پر کل گئی پائیز میں — دل خس و خاشاک گلشن سے لگایا چاہیے
خانہ ساز دیں جو ہے واعظ سو یہ خانہ خراب — اینٹ کی خاطر جسے مسجد کو ڈھایا چاہیے
کام کیا بال ہما سے چتر شہ سے کیا غرض — سر پر اک دیوار ہی کا اس کی سایہ چاہیے

[illegible] ہر خانقہ والے بہت مغرور ہیں
مست ناز ادھر اسے یک بار لایا چاہیے

کیاریوں ہی میں پڑے رہیے گا سائے کی روش
اپنے ہوتے اب کے موسم گل کا آیا چاہیے

جسم تازہ کر اپنی ناکسی پہ کر نظر
جن سے بگڑا چاہیے ان سے بنایا چاہیے

ہوں سمجھ رہتا ہے ٹک ناچار ہم کو اس کی اور
گرتے پڑتے ضعف میں بھی روز جایا چاہیے

گاہ برقع پوش ہو گہ مو پراگندہ کرو
تم کو ہم سے منھ بہرصورت چھپایا چاہیے

وہ بھی تو ٹک دست و تیغ اپنے کی جانے قدر میر
زخم سارے ایک دن اس کو دکھایا چاہیے

(۱۰۱۵)

انکھڑیوں کو اس کی خاطرخواہ کیونکر دیکھیے
سو طرف جب دیکھ لیجے تب ٹک اودھر دیکھیے

گرچہ زردی رنگ کی بھی ہجر ہی سے ہے و لے
منھ مرا دیکھو ہو کیا یہ کوفت جی پر دیکھیے

اب کے گل ہم بے پروں کی اور چشمک زن ہے زور
اور دل اپنا بھی جلتا ہے بہت پر دیکھیے

آتے ہو جب جان یاں آنکھوں میں آ رہتی ہے آہ
دیکھیے ہم کو تو یوں بیمار و مضطر دیکھیے

اشک پر سرخی ابھی سے ہے تو آگے ہمنشیں
رنگ لاوے کیسے کیسے دیدۂ تر دیکھیے

دیر و کعبہ سے بھی ٹک جھپکی نہ چشم شوخ یار
شوق کی افراط سے تاچند گھر گھر دیکھیے

مر رہے یوں صیدگہ کی کنج میں تو حسن کیا
عشق جب ہے تب گلے کو زیر خنجر دیکھیے

برسوں گذرے خاک ملتے منھ پر آئینے کے طور
کیا غضب ہے آنکھ اٹھا کر ٹک تو ایدھر دیکھیے

دیدنی ہے وجد کرنا میر کا بازار میں
یہ تماشا بھی کسو دن تو مقرر دیکھیے

(۱۰۱۶)

گرداب وار یار ترے صدقے جایئے
دریا کا پھیر پایئے تیرا نہ پایئے

سر مار مار بیٹھے تلف ہوجے کب تلک
ٹک اٹھ کے اب نصیبوں کو بھی آزمایئے

سو شکل سے ہم آئے گئے تیری بزم میں
طنزاً کہا نہ تو نے کبھو یوں کہ آیئے

آئے ہیں تنگ جان سے قیدحیات میں
اس بند سے ہمارے تئیں اب چھڑایئے

کہنے لگا کہ ٹیڑھے بہت ہو رہے ہو تم
دو چار سیدھی سیدھی تمھیں بھی سنایئے

ہے عزم جزم ترک و تجرد کا گر بنے
کیا اس جہان سفلہ سے دل کو لگایئے

تاثیر ہے دعا کو فقیروں کی میرجی
ٹک آپ بھی ہمارے لیے ہاتھ اٹھایئے

(۱۰۱۷)

تک ٹھہرنے دے تجھے شوخی تو کچھ ٹھہرائیے — پیکر نازک کو تیرے کیونکے بر میں لائیے
ساکن دیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے — تو خدا جانے کہاں ہے کیونکے تجھ کو پائیے
دور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اس کی بوے خوش — آپ میں رہیے تو اس کے پاس بھی ٹک جائیے
ان دنوں رنگ اور کچھ ہے اس دل پرخون کا — حق میں میرے آپ ہی کچھ سوچ کر فرمائیے
جی ہی کھپ جاتا ہے غصہ آمیز ایسے لطف سے — ہنس کے جب کہتا ہے سب میں آئیے جی آئیے
دل کے ویراں کرنے میں بیداد کی ہے تو نے ہائے — خوش عمارت ایسے گھر کو اس طرح سے ڈھائیے

رات دن رخسار اس کے چت چڑھے رہتے ہیں میر
آفتاب و ماہ سے دل کب تلک بہلائیے

(۱۰۱۸)

پر نہیں جو اڑ کے اس در جائیے — زندگانی حیف ہے مر جائیے
کچھ نہیں تو شعر ہی کی فکر کر — آئے ہیں جو یاں تو کچھ کر جائیے
قصد ہے کعبے کا لیکن سوچ ہے — کیا ہے منھ جو اس کے در پر جائیے
خانماں آباد جو ہے سو خراب — کس کے اٹھ کر شہر میں گھر جائیے

بیم مردن اس قدر یہ کیا ہے میر
عشق کریے اور پھر ڈر جائیے

(۱۰۱۹)

ان دلبروں کو دیکھ لیا بے وفا ہیں یے — بے دید و بے مروت و ناآشنا ہیں یے
حالانکہ مجسم جان ہیں پر دیکھیے جو خوب — ہیں آرزو دلوں کی بھی یہ مدعا ہیں یے
اب حوصلہ کرے ہے ہمارا بھی تنگیاں — جانے بھی دو بتوں کے تئیں کیا خدا ہیں یے
گل پھول اس چمن کے چلو صبح دیکھ لیں — شبنم کے رنگ پھر کوئی دم میں ہوا ہیں یے
کس دل میں خوبرویوں کی خاطر نہیں جگہ — مغرور اپنی خوبی کے اوپر بجا ہیں یے
ہرچند ان سے برسوں چھپا ہم ملا کیے — ظاہر ولے نہ ہم پہ ہوا یہ کہ کیا ہیں یے

کیا جانو میر صاحب و قبلہ کے ڈھب کو تم
خوبی مسلم ان کی ولے بدبلا ہیں یے

(۱۰۲۰)

شوق ہم کو کھپائے جاتا ہے — جان کو کوئی کھائے جاتا ہے

ہر کوئی اس مقام میں دس روز — اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
کھل گئی بات تھی سو ایک اک پر — تو وہی منھ چھپائے جاتا ہے
یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر — اپنی تکلی لگائے جاتا ہے
روئیے کیا دل و جگر کے تئیں — جی بھی یاں پر تو ہائے جاتا ہے
کیا کیا ہے فلک کا میں کہ مجھے — خاک ہی میں ملائے جاتا ہے
جنھیں کچھ ہے ان کے تیں ہر گام — عرق شرم آئے جاتا ہے
جاے عبرت ہے خاکدان جہاں — تو کہاں منھ اٹھائے جاتا ہے
دیکھ سیلاب اس بیاباں کا — کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

وہ تو بگڑے ہے میر سے ہر دم
اپنی سی یہ بنائے جاتا ہے

(۱۰۲۱)

کبھو میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے — خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجا ٹوٹ جاتا ہے
خرابی دل کی کیا انبوہ درد و غم سے پوچھو ہو — وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
شکست اس رنگ آئی بے خودی عشق میں دل پر — نشے میں مست سے جیسے کہ شیشہ پھوٹ جاتا ہے
نہ روؤں ہووے کیا اٹھ جاؤں کہ ہے افسوس کی جا کہ — جب ایسا طائر خوش لہجہ پھنس کر چھوٹ جاتا ہے

نہیں کچھ عقل میں آتا کہ دیوانہ سا میر ایدھر
کبھو آتا جو ہے کیدھر کو مارے زوٹ جاتا ہے

(۱۰۲۲)

چمن کو یاد کر مرغ قفس فریاد کرتا ہے — کوئی ایسا ستم دنیا میں اے صیاد کرتا ہے
ہوا خانہ خراب آنکھوں کا اشکوں سے تو برجا ہے — رہ سیلاب میں کوئی بھی گھر بنیاد کرتا ہے
ملایا خاک کر دامن سے اشکوں میں ڈبایا پھر — مرے ہاتھوں کی تر دستی گریباں یاد کرتا ہے[۱]

ابھر اے نقش شیریں بے ستوں اوپر تماشا کر
کہ کارستانیاں تیرے لیے فرہاد کرتا ہے

(۱۰۲۳)

جب نسیم سحر ادھر جا ہے — ایک سناہٹا گذر جا ہے
کیا اس آئینہ رو سے کہیے ہائے — وہ زباں کر کے پھر مکر جا ہے

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

جب سے سمجھا کہ ہم چلاؤ ہیں
حال پری تک آکے کر جا ہے
وہ کھلے بال سووے ہے شاید
رات کو جی مرا بکھر جا ہے
دور اگرچہ گیا ہوں میں جی سے
کب وطن میرے یہ خبر جا ہے
وہ اگر چیت چڑھا رہا ایسا
آج کل جی سے مہ اتر جا ہے
جی نہیں میر میں نہ بولو تند
بات کہتے ابھی وہ مر جا ہے

(۱۰۲۴)

کچھ بات ہے کہ گل ترے رنگیں دہاں سا ہے
یا رنگ لالہ شوخ ترے رنگ پاں سا ہے
آیا ہے زیر زلف جو رخسار کا وہ سطح
یاں سانجھ کے تئیں بھی سحر کا سماں سا ہے
ہے جی کی لاگ اور کچھ اے فاختہ ولے
دیکھے نہ کوئی سرو چمن اس جواں سا ہے
کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہے کہ داغ دل
اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے
اس کی گلی کی اور تو ہم تیر سے گئے
گو قامت خمیدہ ہمارا کماں سا ہے
جو ہے سو اپنی فکر خروبار میں ہے یاں
سارا جہان راہ میں اک کارواں سا ہے
کعبے کی یہ بزرگی شرف سب بجا ہے لیک
دلکش جو پوچھیے تو کب اس آستاں سا ہے
عاشق کی گور پر بھی کبھو تو چلا کرو
کیا خاک واں رہا ہے یہی کچھ نشاں سا ہے
زور طبیعت اس کا سنیں اشتیاق تھا
آیا نظر جو میر تو کچھ ناتواں سا ہے

(۱۰۲۵)

طپش سے رات کی جوں توں کے جی سنبھالا ہے
نہیں ہے دل کوئی دشمن بغل میں پالا ہے
حنا سے یار کا پنجہ نہیں ہے گل کے رنگ
ہمارے ان نے کلیجوں میں ہاتھ ڈالا ہے
گیا ہے پیش لے اعجاز عشق سے فرہاد
وگرنہ خس نے کہیں بھی پہاڑ ٹالا ہے
سنا ہے گریۂ خونیں پہ یہ نہیں دیکھا
لہو کا ہر گھڑی آنکھوں کے آگے نالا ہے
رہے خیال نہ کیوں ایسے ماہ طلعت کا
اندھیرے گھر کا ہمارے وہی اجالا ہے
دلوں کو کہتے ہیں ہوتی ہے راہ آپس میں
طریق عشق بھی عالم سے کچھ نرالا ہے
ہزار بار گھڑی بھر میں میر مرتے ہیں
انھوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہے

(۱۰۲۶)

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے

میں اور تو ہیں دونوں مجبورطور اپنے
پیشہ ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہے

روے سخن ہے کیدھر اہل جہاں کا یارب
سب متفق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہے

کچھ بےسبب نہیں ہے خاطر مری پریشاں
دل کا الم جدا ہے غم جان کا جدا ہے

حسن ان بھی معنیوں کا تھا آپھی صورتوں میں
اس مرتبے سے آگے کوئی چلے تو کیا ہے

شادی سے غم جہاں میں وہ چند ہم نے پایا
ہے عید ایک دن تو دس روز یاں دہا ہے

ہے مغتنم جان عاشق وہ محو ناز لیکن
ہر لحظہ بے ادائی یہ بھی تو اک ادا ہے

ہو جائے یاس جس میں سو عاشقی ہے ورنہ
ہر رنج کو شفا ہے ہر درد کو دوا ہے

نایاب اس گہر کی کیا ہے تلاش آساں
جی ڈوبتا ہے اس کا جو تہ سے آشنا ہے

مشفق ملاذ و قبلہ کعبہ خدا پیمبر ق
جس خط میں شوق سے میں کیا کیا اسے لکھا ہے

تاثیر عشق دیکھو وہ نامہ واں پہنچ کر
جوں کاغذ ہوائی ہر سو اڑا پھرا ہے

ہے گرچہ طفل مکتب وہ شوخ ابھی تو لیکن
جس سے ملا ہے اس کا استاد ہو ملا ہے

پھرتے ہو میر صاحب سب سے جدے جدے تم
شاید کہیں تمھارا دل ان دنوں لگا ہے

(۱۰۲۷)

دل بیتاب آفت ہے بلا ہے
جگر سب کھا گیا اب کیا رہا ہے

ہمارا تو ہے اصل مدعا تو
خدا جانے ترا کیا مدعا ہے

محبت کشتہ ہیں ہم یاں کسو پاس
ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے

حرم سے دیر اٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا واں بھی خدا ہے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

کوئی ہے دل کھنچے جاتے ہیں اودھر
فضولی ہے تجسس یہ کہ کیا ہے

مروں میں اس میں یا رہ جاؤں جیتا
یہی شیوہ مرا مہر و وفا ہے

صبا اودھر گل اودھر سرو اودھر
اسی کی باغ میں اب تو ہوا ہے

تماشا کردنی ہے داغ سینہ
یہ پھول اس تختے میں تازہ کھلا ہے

ہزاروں ان نے ایسی کیں ادائیں
قیامت جیسے اک اس کی ادا ہے

جگہ افسوس کی ہے بعد چندے
ابھی تو دل ہمارا بھی بجا ہے

جو چپکے ہوں کہے چپکے ہو کیوں تم ق
کہو جو کچھ تمھارا مدعا ہے

سخن کریے تو ہووے حرف زن یوں   بس اب منھ موندلے میں نے سنا ہے
کب اس بیگانہ خو کو سمجھے عالم   ق   اگرچہ یار عالم آشنا ہے
نہ عالم میں ہے نے عالم سے باہر   پہ سب عالم سے عالم ہی جدا ہے
لگا میں گرد سر پھرنے تو بولا
تمھارا میرؔ صاحب سرپھرا ہے

(۱۰۲۸)

شور میرے جنوں کا جس جا ہے   دخل عقل اس مقام میں کیا ہے
دل میں پھرتے ہیں خال و خط و زلف   مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
شور بازار میں ہے یوسف کا   وہ بھی آ نکلے تو تماشا ہے
برچھیوں میں کہیں نہ بٹ جاوے   دل صفوف مژہ میں تنہا ہے
نظر آئے تھے وے حنائی پا   آج تک فتنہ ایک برپا ہے
دل کھنچے جاتے ہیں اسی کی اور   سارے عالم کی وہ تمنا ہے
برسوں رکھا ہے دیدۂ تر پر   پاٹ دامن کا اپنے دریا ہے
تک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ   دل بھی دامن وسیع صحرا ہے
دلکشی اس کے قد کی سی معلوم   سرو بھی اکؔ جوان رعنا ہے
دست و پا گم کیے ہیں تو نے میرؔ
پیری بے طاقتی سے پیدا ہے

(۱۰۲۹)

کئی برسوں جگر کا ہی لہو اپنا پیا ہے   تب دل کے تئیں خوگر اندوہ کیا ہے
ڈر کیوں نہ محلے میں رہے رونے سے میرے   سیلاب نے اس کوچے میں گھر مول لیا ہے
افسوس ہے نشمردہ قدم تم جو رکھو یاں   اس راہ میں سر یاروں نے ہر گام دیا ہے
کاہش ہے عبث تم کو مرے جینے کی خاطر   بیمار بھلا ایسا کوئی آگے جیا ہے
پلکوں سے رفو ان نے کیا چاک دل میرؔ
کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے

(۱۰۳۰)

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے   دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے
ان چار دن سے ہوں میں افسردہ کچھ وگرنہ   پھوڑا سا دل بغل میں برسوں جلا کیا ہے

اس گل کی اور اپنا تب منھ کیا ہے میں نے
جب آشنا لبوں سے صلِ علیٰ کیا ہے

دل داغ کب نہ دیکھا جی بار کب نہ پایا
کیا کیا نہال خواہش پھولا پھلا کیا ہے

تڑپا ہے ایسا ایسا جو غش رہا ہے مجھ کو
دل اک بغل میں جی کا دشمن پلا کیا ہے

کیا خاک میں ہمیں کو ان نے نیا ملایا
ٹیڑھی ہی چال گردوں اکثر چلا کیا ہے

چلتا نہیں ہے دل پر کچھ اس کے بس وگرنہ
عرش آہ عاجزاں سے اکثر ہلا کیا ہے

ہم گو نہ ہوں جہاں میں آخر جہاں تو ہوگا
تونے بدی تو کی ہے ظالم بھلا کیا ہے

ہے منھ پہ میر کے کیا گرد ملال تازہ
یہ خاک میں ہمیشہ یوں ہی رلا کیا ہے

(۱۰۳۱)

باریک وہ کمر ہے ایسی کہ بال کیا ہے
دل ہاتھ جو نہ آوے اس کا خیال کیا ہے

جو بےکلی ہے ایسی چاہت گلوں کی اتنی
کیا جانے ہم صفیرو تو اب کے سال کیا ہے

پہنچا بہم علاقہ اے عزلتی کسو سے
کرتا معاش اکیلے اتنا کمال کیا ہے

آغاز تو یہ ہے کچھ روتے ہیں خون ہر دم
کیا جانے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے

پامال راہ اس کے کیا کیا عزیز دیکھے
آئی نہ جب سمجھ میں گردوں کی چال کیا ہے

وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پر اس کے
سو جی گئے تھے صدقے اک جان و مال کیا ہے

سرگرم جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے
طرز خرام کیا ہے حسن و جمال کیا ہے

میں بےنوا اڑا تھا بوسے کو ان لبوں کے ق
ہر دم صدا یہی تھی دے گذرو ٹال کیا ہے

پر چپ ہی لگ گئی جب ان نے کہا کہ کوئی
پوچھو تو شاہ جی سے ان کا سوال کیا ہے

گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو
کچھ میر جی تمھارا ان روزوں حال کیا ہے

(۱۰۳۲)

دل مرا مضطرب نہایت ہے
رنج و حرماں کی یہ بدایت ہے

منھ ادھر کر کبھو نہ وہ سویا
کیا دعا شب کی بےسرایت ہے

اب وہ مہ اور ایک مہ سے ملا
چند در چند یہ حکایت ہے

ہر طرف بحث تجھ سے ہے اے عشق
شکر تیرا تری شکایت ہے

ایسے رنج و عنا میں اودھر سے
پرسش حال بھی عنایت ہے

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ
اس ستمگر ہی سے کنایت ہے

مت مراعات غیر رکھ منظور
میرے حق میں یہی رعایت ہے

عاشق اب بڑھ گئے ہمیں چھانٹو
اس میں سرکار کی کفایت ہے

کب ملے میر ملک داروں سے
وہ گداے شہ ولایت ہے

(۱۰۳۳)

گرمی سے میری ابر کا ہنگامہ سرد ہے   آنکھیں اگر یہی ہیں تو دریا بھی گرد ہے
مجنوں کو مجھ سے کیا ہے جنوں میں مناسبت   میں شہر بند ہوں وہ بیاباں نورد ہے
کیا جانیے کہ عشق میں خوں ہوگیا کہ داغ   چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے
واصل بحق ہوئے نہ جو ہم جان سے گئے   غیرت ہو کچھ مزاج میں جس کے وہ مرد ہے
ممکن نہیں کہ وصف علیؑ کوئی کر سکے   تفرید کے جریدے میں وہ پہلی فرد ہے
ٹھہرے نہ چرخ نیلی پہ انجم کی چشم شوخ   اس قصر میں لگا جو ہے کیا لاجورد ہے
کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہیں دردمند
منھ میر جی کا آج نہایت ہی زرد ہے

(۱۰۳۴)

جانے میں قتل گہ سے ترا اختیار ہے   پر جائیں جو گئی ہیں سو رہ پرغبار ہے
ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے   مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے
بس وعدۂ وصال سے کم دے مجھے فریب   آگے ہی مجھ کو تیرا بہت اعتبار ہے
سرتابی اس سے طائرقدسی نہ کر سکے   اس ترک صید بند کا وہ تو شکار ہے
مائل نہیں ہے سرو ہی تنہا تری طرف   گل کو بھی تیرے دیکھنے کا خار خار ہے
پیوند میں زمیں کا ہوا اس گلی میں لیک   یوں بھی کہا نہ ان نے یہ کس کا مزار ہے
کل سرو ناز باغ میں آیا نظر مجھے   میں نے فریب شوق سے جانا کہ یار ہے
اب دیکھ کر قرار کیا کر وصال کا   دل کو بغیر تیرے تنک بھی قرار ہے
مت فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہو   بنیاد زندگانی کی ناپائدار ہے
کب تک ستم کبھو تو دلاسا بھی دیجیے
بالفرض میر ایسا ہی تقصیروار ہے

(۱۰۳۵)

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے   جوانی دوانی ہے مشہور ہے
کہو چشم خوں بار کو چشم تم   خدا جانے کب کا یہ ناسور ہے
فلک پر جو مہ ہے تو روشن ہے یہ   کہ منھ سے ترے نسبت دور ہے

گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ — عجب عشق بازی کا دستور ہے
قیامت ہے ہوگا جو رفع حجاب — نہ بے مصلحت یار مستور ہے
ہم اب ناتوانوں کو مرنا ہے صرف — نہیں وہ کہ جینا بھی منظور ہے
ستم میں ہماری قسم ہے تمھیں — کرو صرف جتنا کہ مقدور ہے
نیاز اپنا جس مرتبے میں ہے یاں — اسی مرتبے میں وہ مغرور ہے
ہوا حال بندے کا گو کچھ خراب — خدائی ابھی اس کی معمور ہے
گیا شاید اس شمع رو کا خیال
کہ اب میر کے منھ پہ کچھ نور ہے

(۱۰۳۶)

زلف ہی درہم نہیں ابرو بھی پرخم اور ہے — یاں تلف ہوتا ہے عالم واں سو عالم اور ہے
پیٹ لینا سر لیے دل کے شروع عشق تھا — سینہ کوبی متصل ہے اب یہ ماتم اور ہے
جوں کف دریا کو دریا سے ہے نسبت دور کی — ابر بھی واں اور کچھ ہے دیدۂ نم اور ہے
رہتے رہتے منتظر آنکھوں میں جی آیا نادان — دم غنیمت جان اب مہلت کوئی دم اور ہے
جی تو جانے کا ہمیں اندوہ ہی ہے لیک میر
حشر کو اٹھنا پڑے گا پھر یہ اک غم اور ہے

(۱۰۳۷)

رشتہ کیا ٹھہرے گا یہ جیسے کہ مو نازک ہے — چاک دل پلکوں سے مت سی کہ رفو نازک ہے
شاخ گل کاہے کو اس لطف سے لچکے ہے کہیں — لاگ والا کوئی دیکھے تجھے تو نازک ہے
چشم انصاف سے برقع کو اٹھا دیکھو اسے — گل کے منھ سے تو کئی پردہ وہ رو نازک ہے
لطف کیا دیوے تمھیں نقش حصیر درویش — بوریا پوشوں سے پوچھو یہ اتو نازک ہے
بیڑے کھاتا ہے تو آتا ہے نظر پان کا رنگ — کس قدر ہائے رے وہ جلد گلو نازک ہے
گل سمجھ کر نہ کہیں بے کلی کرنے لگیو — بلبل اس لالۂ خوش رنگ کی خو نازک ہے
رکھے تاچند خیال اس سرپرشور کا میر
دل تو کانپا ہی کرے ہے کہ سبو نازک ہے

(۱۰۳۸)

مستی میں جا و بے جا مدنظر کہاں ہے — بے خود ہیں اس کی آنکھیں ان کو خبر کہاں ہے
شب چند روز سے میں دیکھا نہیں وہ چہرہ — کچھ سوچ کر منجم بارے قمر کہاں ہے

سیمیں تنوں کا ملنا چاہے ہے کچھ تمول
شاہد پرستیوں کا ہم پاس زر کہاں ہے

جوں آرسی کرے ہے منھ دیکھنے کی باتیں
دل کی توجہ اس کی ہمدم ادھر کہاں ہے

پانی ہو بہ گئے سب اجزا بدن کے لیکن
یوں بھی کہا نہ ان نے وہ چشم تر کہاں ہے

خضر و مسیح سب کو جیتے ہی موت آئی
اور اس مرض کا کوئی اب چارہ گر کہاں ہے

لے اس سرے سے یارو اجڑی ہے اس سرے تک
اقلیم عاشقی میں آباد گھر کہاں ہے

اٹھنے کی اک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

پیرانہ سر چلے ہیں اٹھ کر گلی سے اس کی
کیا پیش آوے دیکھیں وقت سفر کہاں ہے

جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے میکدے کو
پھر میرؔ جمعہ کی شب دو دو پہر کہاں ہے

(۱۰۳۹)

کیا کہیے کلی سا وہ دہن ہے
اس میں بھی جو سوچیے سخن ہے

اس گل کو لگے ہے شاخ گل کب
یہ شاخچہ بندی چمن ہے

وابستگی مجھ سے شیشہ جاں کی
اس سنگ سے ہے کہ دل شکن ہے

کیا سہل گذرتی ہے جنوں سے
تحفہ ہم لوگوں کا چلن ہے

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

وے بند قبا کھلے تھے شاید
صد چاک گلوں کا پیرہن ہے

کہ دیر میں ہیں گہے حرم میں
اپنا تو یہی دوانہ پن ہے

ہم کشتۂ عشق ہیں ہمارا
میدان کی خاک ہی کفن ہے

کر میرؔ کے حال پر ترحم
وہ شہر غریب و بے وطن ہے

(۱۰۴۰)

ہم مست ہو بھی دیکھا آخر مزہ نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشہ نہیں ہے

شوق وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا
باآنکہ ایک دم وہ ہم سے جدا نہیں ہے

ہر صبح اٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے

زیر فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے

آنکھیں ہماری دیکھیں لوگوں نے اشک افشاں
اب چاہ کا کسو کی پردہ رہا نہیں ہے

منھ جن نے میرا دیکھا ایک آہ دل سے کھینچی
اس درد عاشقی کی آیا دوا نہیں ہے

تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں
اب آشنا ہوئے پر آنکھ آشنا نہیں ہے

کرے جو ابتدا تو تا حشر حال کہیے   عاشق کی گفتگو کو کچھ انتہا نہیں ہے
پردہ ہی ہم نے دیکھا چہرے پہ گاہ و بے گہ   اتنا بھی منھ چھپانا کچھ خوش نما نہیں ہے

میں روؤں تم ہنسو ہو کیا جانو میر صاحب
دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

(۱۰۴۱)

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے   کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے
گرد جب اٹھتی ہے اک حسرت سے رہ جاتے ہیں دیکھ   وحشیان دشت کی آنکھ اس شکار افگن پہ ہے
کثرت پیکاں سے تیرے ہوگئی ہیئت ہی اور   اب شرف دل کو ہمارے پارۂ آہن پہ ہے
کون یوں اے ترک رعنا زینت فتراک تھا   خوں سے گل کاری عجب اک زین کے دامن پہ ہے
سر اٹھانے کی نہیں ہے ہم کو فرصت عشق میں   ہر دم اک تیغ جفاے تازہ یاں گردن پہ ہے
نوحہ گر کر مجھ کو دکھلایا غم دل نے ندان   شیون اب موقوف یاروں کا مرے شیون پہ ہے
ہوچکا رہنا مرا بستی میں آخر کب تلک   نالۂ شب سے قیامت روز مرد و زن پہ ہے
خرمن گل سے لگیں ہیں دور سے کوڑوں کے ڈھیر   لوہو رونے سے ہمارے رنگ اک گلخن پہ ہے
وے بھی پلکیں الٹ دیتی ہیں صف اک آن میں   اب لڑائی ہند میں سب اس سیہ پلٹن پہ ہے

تو تو کہتا ہے کہ میں نے اس طرف دیکھا نہیں
خون ناحق میر کا یہ کس کی پھر چتون پہ ہے

(۱۰۴۲)

یہ رات ہجر کی یاں تک تو دکھ دکھاتی ہے   کہ شکل صبح مری سب کو بھول جاتی ہے
طپش کے دم ہی تئیں مجھ سے ہے یہ خوں گری   وگرنہ تیغ تری کب گلے لگاتی ہے
ہنسے ہے چاک قفس کھلکھلا کے مجھ اوپر   چمن کی یاد میں جب بے کلی رلاتی ہے

ہوا ہے میر سے روشن کہ کل جبھی ہے شمع
زباں ہلانے میں پروانے کو جلاتی ہے

(۱۰۴۳)

نہ گلشن میں چمن پر ان نے بلبل تجھ کو جا دی ہے   سپاس ایزد کے کر جن نے کہ یہ ڈالی نوا دی ہے
نہیں تک بیٹھنے دیتے تم اپنی بزم میں ہم کو   مروت رسم تھی مدت کی سو تم نے اٹھا دی ہے
رہائی چنگل باز فلک سے مجھ کو مشکل تھی   مری یہ بند چڑیا کی سی مولا نے چھڑا دی ہے
گلی میں اپنی قدغن کر رکھو آنے نہ پاؤں میں   کہیں کیا اور بھی دل کے لگانے کی منادی ہے

طپش سے رنگ اڑا جاوے قلق سے جان گھبراوے
دیا ہے دل الٰہی ہم کو یا کوئی بلا دی ہے

درگلزار پیش از صبح وا اے باغباں مت کر
اڑا لیتی ہے مٹی بھی صبا اک چور بادی ہے

کوئی صورت نہیں اس گھر سے اب تیرے نکلنے کی
قیامت کی ہے جن نے آرسی تجھ کو دکھا دی ہے

مجھے منظور کیا ہے زلف و خال و خط خوباں سے
خدا نے دیکھنے کی لت سی آنکھوں کو لگا دی ہے

کجی ذہن اس وادی میں گمراہی کی ہے باعث
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

لگا رہتا ہے سینے ہی سے بیٹھا ہوں کہ سوتا ہوں
غرض چھاتی مری داغ جدائی نے جلا دی ہے

نہ چھوٹا دل میں کچھ اس کے گئے پر غارت غم سے
ہزار افسوس کیا بستی محبت نے لٹا دی ہے

نہ کٹتی تنگ نہ ہوتی گر فقیری ساتھ الفت کے
ہمیں جب ان نے گالی دی ہے تب ہم نے دعا دی ہے

ہوئی ہے دل کی محویت سے یکساں یاں غم و فرحت
نہ ماتم مرنے کا ہے میرؔ نے جینے کی شادی ہے

(۱۰۴۴)

کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے
وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے

کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں
یہ گاڑی مری راہ میں بے ڈول اڑی ہے

ہے چشمک انجم طرف اس مہ کے اشارہ
دیکھو تو مری آنکھ کہاں جاکے لڑی ہے

کیا اپنی شرر ریزی کہیں پلکوں کی صف کی
ہم جانتے ہیں ہم پہ جو یہ باڑھ جھڑی ہے

وے دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں
اب یاں ہمیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے

ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے
اک خواہش دل ساتھ مرے جیتی گڑی ہے

کیا نقش میں مجنوں ہی کے تھی رفتگی عشق
لیلیٰ کی بھی تصویر تو حیران کھڑی ہے

جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے
ہر تار نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

کھنچتا ہی نہیں ہم سے قدِ خم شدہ ہرگز
یہ سست کماں ہاتھ پر اب کتنی کڑی ہے

گل کھائے ہیں افراط سے میں عشق میں اس کے
اب ہاتھ مرا دیکھو تو پھولوں کی چھڑی ہے

وہ زلف نہیں منعکس دیدۂ تر میرؔ
اس بحر میں تہ داری سے زنجیر پڑی ہے

(۱۰۴۵)

کس فتنہ قد کی ایسی دھوم آنے کی پڑی ہے
ہر شاخ گل چمن میں بھچک ہوئی کھڑی ہے

واشد ہوئی نہ بلبل اپنی بہار میں بھی
کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گل جھڑی ہے

نادیدنی دکھاوے کیونکر نہ عشق ہم کو
کس فتنۂ زماں سے آنکھ اپنی جا لڑی ہے

وے دن گئے کہ پہروں کرتے نہ ذکر اس کا
اب نام یار اپنے لب پر گھڑی گھڑی ہے

آتش سی پھک رہی ہے سارے بدن میں میرے / دل میں عجب طرح کی چنگاری آ پڑی ہے
کیا کچھ ہمیں کو اس کی تلوار کھا گئی ہے / ایسی ہی اک جڑی ہے اس نے جہاں جڑی ہے
کیا میرؔ سر جھکاویں ہر کم بغل کے آگے
نام خدا انھوں کی عزت بہت بڑی ہے

(۱۰۴۶)

آنکھیں نہیں یاں کھلتیں ایدھر کو نظر بھی ہے / سدھ اپنی نہیں ہم کو کچھ تم کو خبر بھی ہے
گو شکل ہوائی کی سر چرخ تئیں کھینچا / اے آہ شرر افشاں کچھ تجھ میں اثر بھی ہے
اس منزل دلکش کو منزل نہ سمجھیے گا / خاطر میں رہے یاں سے درپیش سفر بھی ہے
مجھ حال شکستہ کی تا چند یہ بے وقری / کچھ کسر میں اب میری اے شوخ کسر بھی ہے
یہ کیا ہے کہ منھ نوچے نے چاک کرے سینہ
کر عرض جو کچھ تجھ میں اے میرؔ ہنر بھی ہے

(۱۰۴۷)

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے / ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر / شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
آرزو اس بلند و بالا کی / کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی / کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب / یعنی اک بات سی بنائی ہے
دل سے نزدیک اور اتنا دور / کس سے اس کو کچھ آشنائی ہے
بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا / عشق کی زور آزمائی ہے
جس مرض میں کہ جان جاتی ہے / دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے
یاں ہوئے خاک سے برابر ہم / واں وہی ناز و خودنمائی ہے
ایسا موتیٰ ہے زندۂ جاوید / رفتۂ یار تھا جب آئی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

(۱۰۴۸)

اس شوخ سے ہمیں بھی اب یاری ہوگئی ہے / شرم انکھڑیوں میں جس کی عیاری ہوگئی ہے
روتا پھرا ہوں برسوں لوہو چمن چمن میں / کوچے میں اس کے یکسر گل کاری ہوگئی ہے
یک جا اٹک کے رہنا ہے ناتمامی ورنہ / سب میں وہی حقیقت یاں ساری ہوگئی ہے

جب خاک کے برابر ہم کو کیا فلک نے
طبع خشن میں تب کچھ ہمواری ہوگئی ہے

مطلق اثر نہ دیکھا مدت کی آہ و زاری
اب نالہ و فغاں سے بیزاری ہوگئی ہے

اس سے دوچار ہونا آتا نہیں میسر
مرنے میں اس سے ہم کو ناچاری ہوگئی ہے

ہر بار ذکر محشر کیا یار کے در اوپر
ایسی تو یاں قیامت سو باری ہوگئی ہے

انداز شوخی اس کے آتے نہیں سمجھ میں
کچھ اپنی بھی طبیعت یاں عاری ہوگئی ہے

شاہی سے کم نہیں ہے درویشی اپنے ہاں تو
اب عیب کچھ جہاں میں ناداری ہوگئی ہے

ہم کو تو درد دل ہے تم زرد کیوں ہو ایسے
کیا میرؔ جی تمھیں کچھ بیماری ہوگئی ہے

(۱۰۴۹)

کہاں یاد قیس اب جو دنیا کرے ہے
کبھو قدرداں عشق پیدا کرے ہے

یہ طفلان بازار جی کے ہیں گاہک
وہی جانتا ہے جو سودا کرے ہے

چھپائیں ہوں آنکھیں ہی ان نے تو کہیے
وہ ہر بات کا ہم سے پردہ کرے ہے

جو رونا ہے راتوں کو اپنا یہی تو
کنارہ کوئی دن میں دریا کرے ہے

ٹھسک اس کے چلنے کی دیکھو تو جانو
قیامت ہی ہر گام برپا کرے ہے

مریں شوق پرواز گلشن میں کیوں نہ
امیروں کی یاں کون پروا کرے ہے

بنی صورتیں کیسی کیسی بگاڑیں
سمجھتے نہیں ہم فلک کیا کرے ہے

خط افشاں کیا خون دل سے تو بولا
بہت اب تو رنگین انشا کرے ہے

ہلاک آپ کو میرؔ مت کر دوانے
کوئی ذی شعور آہ ایسا کرے ہے

(۱۰۵۰)

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے گاہے دعا کرے ہے

دانستہ اپنے جی پر کیوں تو جفا کرے ہے
اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے

فتنہ سپہر کیا کیا برپا کیا کرے ہے
سو خواب میں کبھو تو مجھ سے ملا کرے ہے

کس ایسے سادہ رو کا حیران حسن ہے یہ
مرآت گاہ بیگہ بھچک رہا کرے ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

اس بت کی کیا شکایت راہ و روش کی کریے
پردے میں بدسلوکی ہم سے خدا کرے ہے

گرم آکر ایک دن وہ سینے سے لگ گیا تھا
تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے

کیا چال یہ نکالی ہوکر جوان تم نے
اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

دشمن ہو یار جیسا درپے ہے خوں کے میرے
ہے دوستی جہاں واں یوں ہی ہوا کرے ہے

سمجھا ہے یہ کہ مجھ کو خواہش ہے زندگی کی
کس ناز سے معالج میری دوا کرے ہے

حالت میں غش کی کس کو خط لکھنے کی ہے فرصت
اب جب نہ تب ادھر کو جی ہی چلا کرے ہے

سرکا ہے جب وہ برقع تب آپ سے گئے ہیں
منھ کھولنے سے اس کے اب جی چھپا کرے ہے

بیٹھے ہے یار آکر جس جا پہ ایک ساعت
ہنگامۂ قیامت واں سے اٹھا کرے ہے

سوراخ سینہ میرے رکھ ہاتھ بند مت کر
ان روزنوں سے دل تک کسب ہوا کرے ہے

کیا جانے کیا تمنا رکھتے ہیں یار سے ہم
اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے

گل ہی کی اور ہم بھی آنکھیں لگا رکھیں گے
ایک آدھ دن جو موسم اب کے وفا کرے ہے

گہ سرگذشت ان نے فرہاد کی نکالی ق مجنوں کا گاہے قصہ بیٹھا کہا کرے ہے

ایک آفت زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

(۱۰۵۱)

ربط دل کو اس بت بے مہر کینہ ور سے ہے
کیا کہوں میں آہ مجھ کو کام کس پتھر سے ہے

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

کیوں نہ اے سید پسر دل کھینچے یہ موے دراز
اصل زلفوں کی تری گیسوے پیغمبرؐ سے ہے

کاغذ ابری پہ درد دل اسے لکھ بھیجیے
وہ بھی تو جانے کہ یاں آشوب چشم تر سے ہے

کیا کہیں دل کچھ کھنچے جاتے ہیں ادھر ہر گھڑی
کام ہم بے طاقتوں کو عشق زورآور سے ہے

رحم بھی دینا تھا تھوڑا ہائے اس خوبی کے ساتھ
تجھ سے کیا کل گفتگو یہ داور محشر سے ہے

کیا کروں گا اب کے میں بے پر ہوس گلزار کی
لطف گل گشت اے نسیم صبح بال و پر سے ہے

مرنے کے اسباب پڑتے ہیں بہت عالم میں لیک
رشک اس پر ہے کہ جس کی موت اس خنجر سے ہے

ناز و خشم و بے دماغی اس طرف سے سب ہیں یہ
کچھ کسو بھی طور کی رنجش بھلا ایدھر سے ہے

دیکھ گل کو تک کہ ہر یک سر چڑھا لیتا ہے یاں
اس سے پیدا ہے کہ عزت اس چمن میں زر سے ہے

کانپتا ہوں میں تو تیرے ابروؤں کے خم ہوئے
قشعریرہ کیا مجھے تلوار کے کچھ ڈر سے ہے

اشک پے درپے چلے آتے تھے چشم زار سے
ہر نگہ کا تار مانا رشتۂ گوہر سے ہے

بادیے ہی میں پڑا پاتے ہیں جب تب تجھ کو میر
کیا خفا اے خانماں آباد کچھ تو گھر سے ہے

(۱۰۵۲)

کار دل اس مہ تمام سے ہے — کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے
تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب — شہر پرشور اس غلام سے ہے
بوسہ لے کر سرک گیا کل میں — کچھ کہو کام اپنے کام سے ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے — مدعا ہم کو انتقام سے ہے
کب وہ مغرور ہم سے مل بیٹھا — ننگ جس کو ہمارے نام سے ہے
خوش سرانجام وے ہی ہیں جن کو — اقتدا اولیں امام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے
شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ — اس کی پیدائش احتلام سے ہے
سر جھکاؤں تو اور ٹیڑھے ہو — کیا تمھیں چڑ مرے سلام سے ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

(۱۰۵۳)

جل گیا دل مگر ایسے جوں بلا نکلے ہے — جیسے لوں چلتی مرے منھ سے ہوا نکلے ہے
لخت دل قطرۂ خوں ٹکڑے جگر ہو ہوکر — کیا کہوں میں کہ مری آنکھوں سے کیا نکلے ہے
میں جو ہر سو لگوں ہوں دیکھنے ہو کر مضطر — آنسو ہر میری نگہ ساتھ گتھا نکلے ہے
پارسائی دھری رہ جائے گی مسجد میں شیخ — جو وہ اس راہ کبھو مستی میں آ نکلے ہے
گو کہ پردہ کرے جوں ماہ شب ابر وہ شوخ — کب چھپا رہتا ہے ہرچند چھپا نکلے ہے
بھیڑیں ٹل جاتی ہیں آگے سے اس ابرو کے بلے — سینکڑوں میں سے وہ تلوار چلا نکلے ہے
بنتی ہے سامنے اس کے کیے سجدہ ہی ولے — جی سمجھتا ہے جو اس بت میں ادا نکلے ہے
بد کہیں نالہ کشاں ہم ہیں کہ ہم سے ہر روز — شور و ہنگامے کا اک طور نیا نکلے ہے
اجر سے خالی نہیں عشق میں مارے جانا — دے ہے جو سر کوئی کچھ یاں سے بھی پا نکلے ہے
لگ چلی ہے مگر اس گیسوے عنبر بو سے — ناز کرتی ہوئی اس راہ صبا نکلے ہے
کیا ہے اقبال کہ اس دشمن جاں کے آتے — منھ سے ہر ایک کے سو بار دعا نکلے ہے
سوز سینے کا بھی دلچسپ بلا ہے اپنا — داغ جو نکلے ہے چھاتی سے لگا نکلے ہے
سارے دیکھے ہوئے ہیں دلی کے عطار و طبیب — دل کی بیماری کی کس پاس دوا نکلے ہے
کیا فرخندہ ہے رفتار ہے کینے کی جدا — اور گفتار سے کچھ پیار جدا نکلے ہے

ویسا بے جا نہیں دل میر کا جو رہ نہ سکے
چلتا پھرتا کبھو اس پاس بھی جا نکلے ہے

(۱۰۵۴)

عبرت سے دیکھ جس جا یاں کوئی گھر بنے ہے
پردے میں چشم ڈھکنے دیوار و در بنے ہے

ہیں دل گداز جن کے کچھ چیز مال وے ہیں
ہوتے ہیں ملتفت تو پھر خاک زر بنے ہے

شب جوش غم سے جس دم لگتا ہے دل تڑپنے
ہر زخم سینہ اس دم یک چشم تر بنے ہے

یاں ہر گھڑی ہماری صورت بگڑتی ہے گی
چہرہ ہی واں انھوں کا دو دو پہر بنے ہے

تک رک کے صاف طینت نکلے ہے اور کچھ ہو
پانی گرہ جو ہووے تو پھر گہر بنے ہے

ہے شعبدے کے فن میں کیا دست بے کشوں کو
زاہد انھوں میں جاکر آدم سے خر بنے ہے

نکلے ہے صبح بھی یاں صندل ملے جبیں کو
عالم میں کام کس کا بے دردسر بنے ہے

سارے دکھوں کی اے دل ہوجائے گی تلافی
صحبت ہماری اس کی ٹک بھی اگر بنے ہے

ہر اک سے ڈھب جدا ہے سارے زمانے کا بھی
بنتی ہے جس کسو کی یک طور پر بنے ہے

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

دیوان سوم

دیوان سوم

ردیف الف

(۱۰۵۵)

میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا   خاک ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا
اس سرے دل کی خرابی ہوئی اے عشق دریغ   تو نے کس خانۂ مطبوع کو ویران کیا
ضبط تھا جب تئیں چاہت نہ ہوئی تھی ظاہر   اشک نے بہ کے مرے چہرے پہ طوفان کیا
انتہا شوق کی دل کے جو صبا سے پوچھی   اک کف خاک کو لے ان نے پریشان کیا
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

(۱۰۵۶)

دین و دل کے غم کو آساں ناتواں میں لے گیا   یا محبت کہہ کے یہ بارگراں میں لے گیا
خاک وخوں میں لوٹ کر رہ جانے ہی کا لطف ہے   جان کو کیا جو سلامت نیم جاں میں لے گیا
سرگذشت عشق کی تہ کو نہ پہنچا یاں کوئی   گرچہ پیش دوستاں یہ داستاں میں لے گیا
عرصۂ دشت قیامت باغ ہوجائے گا سب   اس طرح سے جو یہ چشم خوں فشاں میں لے گیا
ذکر دل جانے کا وہ پرکینہ سن کہنے لگا   یہ سناتے ہو کسے کیا مہرباں میں لے گیا
یک جہاں مہر و وفا کی جنس تھی میرے کنے   لیکن اس کو پھیر ہی لایا جہاں میں لے گیا
ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

(۱۰۵۷)

میرا ہی مقلد عمل تھا   مجنوں کے دماغ میں خلل تھا
دل ٹوٹ گیا تو خوں نہ نکلا   شیشہ یہ بہت ہی کم بغل تھا
تھیں سب کی نظر میں اس کی بھودیں   افسوس یہ شعر مبتذل تھا
کیا قدر ہے ریختے کی گو میں   اس فن میں نظیری کا بدل تھا
تھا نزع میں دست میر دل پر
شاید غم کا یہی محل تھا

(١٠٥٨)

کرتا جنوں جہاں میں بے نام و ننگ آیا
اک جمع لڑکوں کا بھی لے لے کے سنگ آیا

شب شمع کی بھی جھپکی مجلس میں لگ گئی تھی
سرگرم شوق مردن جس دم پتنگ آیا

فتنے فساد اٹھیں گے گھر گھر میں خون ہوں گے
گر شہر میں خراماں وہ خانہ جنگ آیا

ہر سر نہیں ہے شایاں شور قلندری کا
گو شیخ شہر باندھے زنجیر و زنگ آیا

چسپاں ہے اس بدن سے پیراہن حریری
اتنی بھی تنگ پوشی جی اب تو تنگ آیا

باتیں ہماری ساری بے ڈھنگیاں ہیں وے ہی
بوڑھے ہوئے پہ ہم کو اب تک نہ ڈھنگ آیا

بشرے کی اپنے رونق اے میر عارضی ہے
جب دل کو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا

(١٠٥٩)

دل اگر کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ یہ دل ہے کیا
ایسے ناداں دلربا کے ملنے کا حاصل ہے کیا

جاننا باطل کسو کو یہ قصور فہم ہے
حق اگر سمجھے تو سب کچھ حق ہے یاں باطل ہے کیا

یاں کوئی دن رات وقفہ کرکے قصد آگے کا کر
کارواں گاہ جہان رفتنی منزل ہے کیا

تک رہے ہیں اس کو سو ہم تک رہے ہیں ایک سے
دیدۂ حیراں ہمارا دیدۂ بسمل ہے کیا

وہ حقیقت ایک ہی ساری نہیں ہے سب میں تو
آب سا ہر رنگ میں یہ اور کچھ شامل ہے کیا

چوٹ میرے دل میں ایسی ہے کہ ہوں میں دم بخود
وہ کشندہ یوں ہی کہتا ہے کہ تو گھائل ہے کیا

کہتے ہیں ظاہر ہے اک ہی لیلی ہفت اقلیم میں
اس عبارت کا نہیں معلوم کچھ محمل ہے کیا

ہم تو سو سو بار مر رہتے ہیں ایک ایک آن میں
عشق میں اس کے گذرنا جان سے مشکل ہے کیا

شاخ پر گل یا نہال ادھر جھکے جاتے ہیں سب
قامت دلکش کا اس کی سرو ہی مائل ہے کیا

مرثیے میرے بھی دل کا رقت آور ہے بلا
محتشم کو میر میں کیا جانوں اور مقبل ہے کیا

(١٠٦٠)

ان دلبروں سے رابطہ کرنا ہے کام کیا
کر اک سلام پوچھنا صاحب کا نام کیا

حیرت ہے کھولیں چشم تماشا کہاں کہاں
حسن و جمال ویسا ہے اس کا خرام کیا

کی اک نگاہ گرم جہاں ان سے مل گئے
عاشق کو دلبروں سے سلام و پیام کیا

شکر خدا کہ سر نہ فرو لائے ہم کہیں
کیا جانیں سجدہ کہتے ہیں کس کو سلام کیا

اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منھ کو رکھ کے ہم
دلچسپ اس مقام میں حرف و کلام کیا

جس جا کہ اس کے چہرے سے کرتے ہیں گفتگو
مرآت و ماہ و گل کا ہے اس جا مقام کیا

کہتا ہے کون بدر میں نقصان کچھ رہا
پر منھ کھلے پہ اس کے ہے ماہ تمام کیا

یہ جانوں ہوں کہ دل کو ہے اس رو دمو سے لاگ
کیا جانوں پیش آوے ہے اب صبح و شام کیا

تسبیح تک تو میر نے رکھا کلال کے
وقت نماز اب بھی ہوئے تھے امام کیا

(۱۰۶۱)

چال یہ کیا تھی کہ ایدھر کو گذارا نہ کیا
دور ہی دور پھرے پاس ہمارا نہ کیا

اس کو منظور نہ تھی ہم سے مروت کرنی
ایک چشمک بھی نہ کی ایک اشارہ نہ کیا

بعد دشنام تھی بوسے کی توقع بھی ولے
تلخ [illegible] کے تئیں ہم نے گوارا نہ کیا

مرکے بے حوصلہ لوگوں میں کہا یافرہاد
چندے پتھر ہی سے سر اور بھی مارا نہ کیا

جی رہے ڈوبتے دریائے غم عشق میں لیک
بوالہوس کی سی طرح ہم نے کنارہ نہ کیا

نیم جاں صدقے کی اس پر نہ زیاں دیکھا نہ سود
ہم تو کچھ دوستی میں وار[illegible] سارا نہ کیا

لے گیا مٹی بھی دروازے کی ان کے میں میر
پر اطبا نے مرے درد کا چارہ نہ کیا

(۱۰۶۲)

وہ دل نہیں رہا ہے تعب جو اٹھائے گا
یا لوہو اشک خونی سے منھ پر بہائے گا

اب یہ نظر پڑے ہے کہ برگشتہ وہ مژہ
کاوش کرے گی تک بھی تو سنبھلا نہ جائے گا

کھینچا جو میں وہ ساعد سیمیں تو کہہ اٹھا
بس بس کہیں ہمیں ابھی صاحب غش آئے گا

ریجھے تو اس کے طور پہ مجلس میں شیخ جی
پھر بھی ملا تو خوب سا ان کو رجھائے گا

جلوے سے اس کے جل کے ہوئے خاک سنگ و خشت
بیتاب دل بہت ہے یہ کیا تاب لائے گا

ہم رہ چکے جو ایسے ہی غم میں کھپا کیے
معلوم جی کی چال سے ہوتا ہے جائے گا

اڑ کر لگے ہے پاؤں میں زلف اس کی پیچ دار
بازی نہیں یہ سانپ جو کوئی کھلائے گا

اڑتی رہے گی خاک جنوں کرتی دشت دشت
کچھ دست اگر یہ بے سر و ساماں بھی پائے گا

درپے ہے اب وہ سادہ قراول پسر بہت
دیکھیں تو میر کے تئیں کوئی بچائے گا

(۱۰۶۳)

وہ جو گلشن میں جلوہ ناک ہوا
پھول غیرت سے جل کے خاک ہوا

اس کے دامن تلک نہ پہنچا ہاتھ تھا سرِ دست جیب چاک ہوا
کس قدر تھا خبیث شیخ شہر اس کے مرنے سے شہر پاک ہوا
ذرے اس رشکِ خور کی گرمی سے کچھ تو ہے ہم سے جو تپاک ہوا
میر بلکان ہوگیا تھا بہت
سو طلب ہی میں پھر ہلاک ہوا

(۱۰۶۴)

کیا روئیے ہمیں کو یوں آن کر کے مارا مہر بت دگر سے طوفان کر کے مارا
تربت کا میری لوحہ آئینے سے کرے ہے یعنی کہ ان نے مجھ کو حیران کر کے مارا
بیگانہ جان ان نے کیا چوٹ رات کو کی منھ دیکھ دیکھ میرا پہچان کر کے مارا
پہلے گلے لگایا پھر دست جور اٹھایا مارا تو ان نے لیکن احسان کر کے مارا
اس سست عہد نے کیا کی تھی قسم مجھی سے بہتوں کو ان نے عہد و پیمان کر کے مارا
حاضر یراق ہونا کاہے کو چاہیے تھا مجھ بےنوا کو کیا کیا سامان کر کے مارا
کہنے لگا کہ شب کو میرے تئیں نشہ تھا
مستانہ میر کو میں کیا جان کر کے مارا

(۱۰۶۵)

گیا حسن خوبان بد راہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا
پشیماں ہوا دوستی کر کے میں بہت مجھ کو ارمان تھا چاہ کا
جگر کی سپر پھوٹ جانے لگی بلا توڑ ہے ناوک آہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے مرا زمزمہ گاہ و بیگاہ کا
رہوں جا کے مر حضرت یار میں یہی قصد ہے بندہ درگاہ کا
کہا ہو دم قتل کچھ تو کہے جواب اس کو کیا میرے خونخواہ کا
عدم کو نہیں مل کے جاتے ہیں لوگ غم اس راہ میں کیا ہے ہمراہ کا
نظر خواب میں اس کے منھ پر پڑی بہت خوب ہے دیکھنا ماہ کا
لگو نہی اگر آنکھ تیری ہو میر
تماشا کر اس کی نظرگاہ کا

(۱۰۶۶)

چشم سے خوں ہزار نکلے گا کوئی دل کا بخار نکلے گا

اس کی نخچیرگہ سے روح الامیں   ہو کے آخر شکار نکلے گا
آندھیوں سے سیاہ ہوگا چرخ   دل کا تب کچھ غبار نکلے گا
ہوئے رہے لاگ تیر مژگاں کی   کس کے سینے کے پار نکلے گا
ناز خورشید کب تلک کھینچیں   گھر سے کب اپنے یار نکلے گا
خون ہی آئے گا تو آنکھوں سے   ایک سیل بہار نکلے گا
عزلت میرؔ عشق میں کب تک
ہو کے بے اختیار نکلے گا

(۱۰۶۷)

اعجاز منھ تکے ہے ترے لب کے کام کا   کیا ذکر یاں مسیح علیہ السلام کا
رقعہ ہمیں جو آوے ہے سو تیر میں بندھا   کیا دیجیے جواب اجل کے پیام کا
کچھ سدھ سنبھالتے ہی رکھی ان نے پگڑی پھیر   ممنون میں نہیں ہوں جواب سلام کا
منھ دیکھو بدر کا کہ تری روکشی کرے   تو یوں ہی نام لے ہے کسو ناتمام کا
نوبت ہے اپنی جب سے یہی کوچ کا ہے شور   بجتا سنا نہیں ہے کبھو یاں مقام کا
کنج لب اس کا دیکھ کے خاموش رہ گئے   یعنی کہ تھا مقام یہ ختم کلام کا
اس رو و مو کے محو کو کیا روزگار سے   جلوہ ہی کچھ جدا ہے مرے صبح و شام کا
صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگرنہ کچھ   جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا
کب اقتدا ہو مجھ سے کسو کی سوائے میرؔ
بندہ ہوں دل سے میں اسی سید امام کا

(۱۰۶۸)

ہوں نشاں کیوں نہ تیر خوباں کا   مجھ پہ تودہ ہوا ہے طوفاں کا
ہاتھ زنجیر ہو جنوں میں رہا   اپنے زنجیرۂ گریباں کا
چپکے دیکھو جھمکتے وے لب سرخ   ذکر یاں کیا ہے لعل و مرجاں کا
ایک رہزن ہے اس کی کافر زلف   غم ہی رہتا ہے دین و ایماں کا
عمر آوارگی میں سب گذری   کچھ ٹھکانا نہیں دل و جاں کا
کافرستاں ہے خال و خط و زلف   وقر کیا ہے دل مسلماں کا
مر گیا میرؔ نالہ کش بیکس
نے نے ماتم میں اس کے منھ ڈھانکا

(۱۰۶۹)

جس خشم سے وہ شوخ چلا آج شب آیا　　آیا کبھو یاں دن کو بھی یوں تو غضب آیا
اس نرگس مستانہ کو کر یاد گرتوں ہوں　　کیا گریۂ سرشار مجھے بےسبب آیا
راہ اس سے ہوئی خلق کو کس طور سے یارب　　ہم کو کبھی ملنے کا تو اس کے نہ ڈھب آیا
کیا پوچھتے ہو دب کے سخن منھ سے نہ نکلا　　کچھ دیکھتے اس کو مجھے ایسا ادب آیا
کہتے تو ہیں میاں طبیعت ہے اسے بھی　　یہ باتیں ہیں ادھر کو مزاج اس کا کب آیا
خوں ہوتی رہی دل ہی میں آرزوئی میری　　کس روز گلہ اس کا مرے تا بہ لب آیا
جی آنکھوں میں آیا ہے جگر منھ تئیں میرے　　کیا فائدہ یاں چل کر اگر یار اب آیا
آتے ہوئے اس کے تو ہوئی بےخودی طاری　　وہ یاں سے گیا اٹھ کے مجھے ہوش جب آیا
جاتا تھا چلا راہ عجب چال سے کل میر
دیکھا اسے جس شخص نے اس کو عجب آیا

(۱۰۷۰)

کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگانا تھا　　اس جان کی جوکھوں کو اس وقت نہ جانا تھا
تھا جسم کا ترک اولیٰ ایام میں پیری کے　　جاتا تھا چلا ہر دم جامہ بھی پرانا تھا
ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے　　اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں تک　　اتنا بھی تمھیں آ کر یاں سر نہ اٹھانا تھا
اک محوتماشا ہیں اک گریہ ہیں قصے کے　　یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانہ تھا
کیونکر گلی سے اس کی میں اٹھ کے چلا جاتا　　یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا
جو تیر چلا اس کا سو میری طرف آیا　　اس عشق کے میداں میں میں ہی تو نشانہ تھا
جب تو نے نظر پھیری تب جان گئی اس کی　　مرنا ترے عاشق کا مرنا کہ بہانہ تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منھ　　کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا
کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن
پردے میں مجھے اپنا احوال سنانا تھا

(۱۰۷۱)

سہل ایسا نہ تھا آخر جی سے مرا جانا تھا　　تک رنجہ قدم کر کر مجھ تک اسے آنا تھا
کیا مو کی پریشانی کیا پردے میں پنہانی　　منھ یار کو ہر صورت عاشق سے چھپانا تھا
لذت سے نہ تھا خالی جانا تہ تیغ اس کی　　اے صید حرم تجھ کو اک زخم تو کھانا تھا
کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں　　اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا
کیا ظلم کیا بےجا مارا جیوں سے ان نے
کچھ شعور بھی تھی اس کی کچھ اس کا ٹھکانا تھا
اے شور قیامت اب مدت سے قیامت ہے
خوابیدہ مرے خوں کو ظالم نہ جگانا تھا
جو باغ و بہار آیا گل پھول تئیں پایا
جلوہ اسے یاں اپنا صدرنگ دکھانا تھا
کہتے نہ تھے ہم واں سے پھر آچکے جیتے تم
میر اس گلی میں تم کو زنہار نہ جانا تھا

(۱۰۷۲)

تب اس بہشتی رو سے یہ خلطہ بہم کیا
جب برسوں ہم نے سورۂ یوسف کو دم کیا
چہرے کو نوچ نوچ لیا چھاتی کوٹ لی
جانے کا دل کے ہم نے بہت غم الم کیا
مربوط اور لوگوں سے شاید کہ وے ہوئے
وہ ربط و رابطہ جو بہت ہم سے کم کیا
کیا کیا سخن زباں پہ مری آئے ہوئے قتل
مانند خامہ گو کہ مرا سر قلم کیا
کی ہم نے تب دروں کی سوزش سے عاقبت
سب تن بدن اس آگ نے اپنا بھسم کیا
یاں اپنے جسم زار پہ تلوار سی لگی
ان نے جو بےدماغی سے ابرو کو خم کیا
اس زندگی سے مارے ہی جانا بھلا تھا میر
رحم ان نے میرے حق میں کیا کیا ستم کیا

(۱۰۷۳)

اب کے جو گل کی فصل میں ہم کو جنوں ہوا
وہ دل کہ جس پہ اپنا بھروسا تھا خوں ہوا
ٹھہرا گیا ہو ٹک بھی تو تم سے بیاں کروں
آتے ہی اس کے رفتن صبر و سکوں ہوا
تھا شوق طوف تربت مجنوں مجھے بہت
اک گردباد دشت مرا رہنموں ہوا
سیلاب آگے آیا چلا جاتے دشت میں
بے اختیار رونے کا میرے شگوں ہوا
جان اس کی تیغ تیز سے رکھ کر دریغ میر
صید حرم ندان شکار زبوں ہوا

(۱۰۷۴)

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
یک رمق جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا
وہ لڑکپن سے نکل کر تیغ چمکانے لگا
خون کرنے کا خیال اب کچھ اسے آنے لگا
لعل جاں بخش اس کے تھے پوشیدہ جوں آب حیات
اب تو کوئی کوئی ان ہونٹوں پہ مر جانے لگا
حیف میں اس کے سخن پر ٹک نہ رکھا گوش کو
یوں تو ناصح نے کہا تھا دل نہ دیوانے لگا

جس دم کے معتقد تم ہوگے شیخ شہر کے
یہ تو البتہ کہ سن کر لعن دم کھانے لگا

گرم ملنا اس گل نازک طبیعت سے نہ ہو
چاندنی میں رات بیٹھا تھا سو مرجھانے لگا

عاشقوں کی پائمالی میں اسے اصرار ہے
یعنی وہ محشر خرام اب پاؤں پھیلانے لگا

چشمک اس مہ کی سی دلکش دید میں آئی نہیں
گو ستارہ صبح کا بھی آنکھ جھپکانے لگا

کیونکر اس آئینہ رو سے میرؔ ملیے بے حجاب
وہ تو اپنے عکس سے بھی دیکھو شرمانے لگا

(۱۰۷۵)

ضبط کرتے کرتے اب جو لب کو میں نے وا کیا
سو بھی رہتا ہوں یہ کہتا ہائے دل نے کیا کیا

آنکھ پڑتی تھی تمھارے منھ پہ جب تک چین تھا
کیا کیا تم نے کہ مجھ بیتاب سے پردہ کیا

گور ہی اس کو جھنکائی عشق جس کے ہاں گیا
اس طبیب بدشگوں نے کس کے تیں اچھا کیا

دیکھ خبطی مجھ کو رستے بند ہوجاتے ہیں اب
عشق نے کیا کوچہ و بازار میں رسوا کیا

لوگ دل دیتے سنے تھے میرؔ دے گذرا ہے جی
لیک اپنے طور پر ان نے بھی اک سودا کیا

(۱۰۷۶)

سینہ کوبی ہے طپش سے غم ہوا
دل کے جانے کا بڑا ماتم ہوا

آنکھیں دوڑیں خلق جا اودھر گری
اٹھ گیا پردہ کہاں اودھم ہوا

کیا لکھوں رویا جو لکھتے جوں قلم
سب مرے نامے کا کاغذ نم ہوا

ہم جو اس بن خوار ہیں حد سے زیاد
یار یاں تک آن کر کیا کم ہوا

آگیا یوں ہی خراماں وہ تو پھر
حشر کا ہنگامہ ہی برہم ہوا

درہمی سے برہمی سے دیکھیو
دونوں عالم کا عجب عالم ہوا

جسم خاکی کا جہاں پردہ اٹھا
ہم ہوئے وہ میرؔ سب وہ ہم ہوا

(۱۰۷۷)

ہجر کی اک آن میں دل کا ٹھکانا ہوگیا
ہر زماں ملتے تھے باہم سو زمانہ ہوگیا

واں تعلل ہی تجھے کرتے گئے شام و سحر
یاں ترے مشتاق کا مرنا بہانہ ہوگیا

شیب میں بھی ہے لباس جسم کا ظاہر قماش
پر اسے اب چھوڑیے جامہ پرانا ہوگیا

کہنے تو کہہ بیٹھے مہ بہتر ہے روے یار سے
شہر میں پھر ہم کو مشکل منھ دکھانا ہوگیا

صد سخن آئے تھے لب تک پر نہ کہنے پائے ایک — ناگہاں اس کی گلی سے اپنا جانا ہوگیا
رہنے کے قابل تو ہرگز تھی نہ یہ عبرت سرائے — اتفاقاً اس طرف اپنا بھی آنا ہوگیا
سینکڑوں افسوں دنوں کو پڑھتے تھے تس پر بھی میر
بیٹھنا راتوں کو باہم اب فسانہ ہوگیا

(۱۰۷۸)

یاد خط میں اس کے جی بھر آکے گھبراتا رہا — رات کا بھی کیا ہی مینہ آیا تھا پر جاتا رہا
کیا قیامت ہوتی بے پردہ ہوئے کیا جانیے — مصلحت ہی ہوگی ہم سے وہ جو شرماتا رہا
قدموزوں یار کا خاطر سے جاتا ہی نہیں — میں اسی مصرع کو ساری عمر ڈولاتا رہا
کل مکل بیتاب دل سے آج کل کی کچھ نہیں — میں تو اس غم کش کو بےکل ہی سدا پاتا رہا
آگ کھا جاتی ہے خشک و تر جو اس کے منہ پڑے — میں تو جیسے شمع اپنے ہی تئیں کھاتا رہا
میری تیری چاہ منہ دیکھے کی ہے جوں آرسی — آنکھ پھیری جس گھڑی پھر کاہے کا ناتا رہا
ہوگئے ہم محتسب کی بےشعوری سے اسیر — شیخ میں کچھ ہوش تھا میخانے سے جاتا رہا
لوگ ہی اس کارواں کے حرف نشنو تھے تمام — راہ چلتے تو جرس ہر گام چلاتا رہا
میر دیوانہ ہے اچھا بات کیا سمجھے مری
یوں تو مجھ سے جب ملا میں اس کو سمجھاتا رہا

(۱۰۷۹)

میں گلستاں میں آکے عبث آشیاں کیا — بلبل نے بھی نہ طور گلوں کا بیاں کیا
پھر اس کے ابرواں کا خم و تاب ہے وہی — تلوار کے تلے بھی مرا امتحاں کیا
دوں کس کو دوش دشمن جانی تھی دوستی — اس سودے میں صریح میں نقصان جاں کیا
گالی ہے حرف یار قلم نے قضا کے ہائے — صورت نکالی خوب ولے بدزباں کیا
اس جنس خوش کے پیچھے کھپا میں چواؤ کیا — میں نے کسو کا کیا کیا اپنا زیاں کیا
لڑکے جہان آباد کے یک شہر کرتے ناز — آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا
میں منتظر جواب کا نامے کے مر گیا
ناچار میر جان کو اودھر رواں کیا

(۱۰۸۰)

وفا تھی مہر تھی اخلاص تھا تلطف تھا — کبھو مزاج میں اس کے ہمیں تصرف تھا
جو خوب دیکھو تو ساری وہی حقیقت ہے — چھپانا چہرے کا عشاق سے تکلف تھا

اسیر عشق نہیں بازخواہ خوں رکھتے ہمارے قتل میں اس کو عبث توقف تھا
نہ پوچھو خوب ہے بدعہدیوں کی مشق اس کو ہزاروں عہد کیے پر وہی تخلف تھا
جہاں میں میر سے کاہے کو ہوتے ہیں پیدا
سنا یہ واقعہ جن نے اسے تاسف تھا

(۱۰۸۱)

جنوں میں ساتھ تھا کل لڑکوں کا لشکر جہاں میں تھا چلے آتے تھے چاروں اور سے پتھر جہاں میں تھا
تجلی جلوہ اس رشکِ قمر کا قرب تھا مجھ کو چلے جاتے تھے واں جائے ملک کے پر جہاں میں تھا
گلی میں اس کی میری رات کیا آرام سے گذری یہی تھا سنگ بالیں خاک تھی بستر جہاں میں تھا
غضب کچھ شور تھا سر میں بلا بے طاقتی جی میں قیامت لحظہ لحظہ تھی مرے دل پر جہاں میں تھا
چبھیں تھیں جی میں وے پلکیں لگیں تھیں دل کو وے بھویں یہی شمشیر چلتی تھی یہی خنجر جہاں میں تھا
خیالِ چشم و روے یار کا بھی طرفہ عالم ہے نظر آیا ہے واں اک عالمِ دیگر جہاں میں تھا
عجب دن میر تھے دیوانگی میں دشت گردی کے
سر اوپر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر جہاں میں تھا

(۱۰۸۲)

گل بھی ہے معشوق لیکن کب ہے اس محبوب سا آگے اس قد کے ہے سرو باغ بے اسلوب سا
اس کے وعدے کی وفا تک وہ کوئی ہووے گا جو ہو معمرِ نوح سا صابر ہو پھر ایوبؑ سا
عشق سے کن نے مرے آکر کیا اس شوخ کو اب مرے آنے سے ہوجاتا ہے وہ محجوب سا
بعد مردن یہ غزل مطرب سے جن نے گوش کی گور کے میری گلے جا لگ کے رویا خوب سا
عاقلانہ حرف زن ہو میر تو کریے بیاں
زیرلب کیا جانیے کہتا ہے کیا مجذوب سا

(۱۰۸۳)

کبھو وہ توجہ ادھر کر رہے گا ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا
ہمارا ہے احوال حیرت کی جاگہ جو دیکھے گا وہ بھی نظر کر رہے گا
نہیں اس طرف میر جانے سے رہتا
رہے گا تو اودھر ہی مر کر رہے گا

(۱۰۸۴)

میرؔ کل صحبت میں اس کی حرف سرکر رہ گیا
پیش جاتے کچھ نہ دیکھی چشم تر کر رہ گیا

خوبی اپنے طالع بد کی کہ شب وہ رشک ماہ
گھر مرے آنے کو تھا سو منھ ادھر کر رہ گیا

طنز و تعریض بتان بے وفا کے در جواب
میں بھی کچھ کہتا خدا سے اپنے ڈر کر رہ گیا

سرگذشت اپنی سبب ہے حیرت احباب کی
جس سے دل خالی کیا وہ آہ بھر کر رہ گیا

میرؔ کو کتنے دنوں سے رہتی تھی بے طاقتی
رات دل تڑپا بہت شاید کہ مر کر رہ گیا

(۱۰۸۵)

مجھ زار نے کیا گرمی بازار سے پایا
کبریت نمط جن نے لیا مجھ کو جلایا

بیتاب تہ تیغ ستم دیر رہا میں
جب تک نہ گئی جان مجھے صبر نہ آیا

جانا فلک دوں نے کہ سرسبز ہوا میں
گر خاک سے سبزہ کوئی پژمردہ اگایا

اس رخ نے بہت صورتیں لوگوں کی بگاڑیں
اس قد نے قیامت کا سا ہنگامہ اٹھایا

مت راہ سخن دے کہ پھر آپھی تو کہے گا
کیوں میں نے محبت کے عبث منھ کو کھلایا

ہر چند کہ تھی ریجھنے کی جاے ترے لب
پر گالیاں دیں اتنی انھوں سے کہ رجھایا

گردش میں رہا کرتے ہیں ہم دید میں ان کی
آنکھوں نے تری خوب سماں ہم کو دکھایا

کس روز یہ اندوہ جگر سوز تھا آگے
کب شب لب و یارب تھی مری یوں ہی خدایا

دن جی کے الجھنے کے ہی جھگڑے میں کٹے ہے
رات اس کے خیالات سے رہتے ہیں قضایا

کیا کہیے دماغ اس کا کہ گلگشت میں کل میرؔ
گل شاخوں سے جھک آئے تھے پر منھ نہ لگایا

(۱۰۸۶)

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رد سا
تب آنکھوں تلے میری اترتا ہے لہو سا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو
خضر آب اسے کہتا ہے آتش کہے موسیٰ

کیا دور ہے شربت پہ اگر قند کے تھوکے
تک جن نے ترے شربتی ان ہونٹوں کو چوسا

دم لابہ کریں شیخ رکھیں شملے تو کیا ہے
ہونا مگر آسان ہے اس کے سگ کو سا

تعبیر جسے کرتے ہیں ہنگامۂ محشر
وہ یار کے کوچے کا ہے کچھ شور غلو سا

آرائش درویشی بھی اپنی نہیں بے لطف
ہے بوریے کا نقش مرے تن پہ اتو سا

کب کی ہے حدیث اس سے سخن کرنے کی میں نے
کیا میرؔ سے بولے کوئی ہے بیہدہ گو سا

(۱۰۸۷)

اگر وہ ماہ نکل گھر سے ٹک ادھر آتا ۔۔۔ تو رک کے منھ تئیں کاہے کو شب جگر آتا
مرید پیرمغاں صدق سے نہ ہم ہوتے ۔۔۔ جو حق شناس کوئی اور بھی نظر آتا
نہ پتھروں سے جو سر کو دو پارہ میں کرتا ۔۔۔ زمانہ غم کا مرے کس طرح بسر آتا
کسو ہنر سے تو ملتے تھے باہم اگلے لوگ ۔۔۔ ہمیں بھی کاشکے ایسا کوئی ہنر آتا

شراب خانے میں شب مست ہو رہا شاید
جو میرؔ ہوش میں ہوتا تو اپنے گھر آتا

(۱۰۸۸)

وہ کم نما و دل ہے شائق کمال اس کا ۔۔۔ جو کوئی اس کو چاہے ظاہر ہے حال اس کا
ہم کیا کریں علاقہ جس کو بہت ہے اس سے ۔۔۔ رکھ دیتے ہیں گلے پر خنجر نکال اس کا
بس ہو تو وام کر بھی اس پر نثار کریے ۔۔۔ یک نقد دل رکھے ہیں سو تو ہے مال اس کا
یہ جانتا تو اس سے ہم خواب میں نہ ہوتا ۔۔۔ پکا خیال جی کا ایسا خیال اس کا
ان زلفوں سے نہ لگ کر چل اے نسیم ظالم ۔۔۔ تاریک ہے جہاں پھر بکا جو بال اس کا
جس داغ سے کہ عالم ہے مبتلا بلا میں ۔۔۔ سو داغ جان عاشق منھ پر ہے خال اس کا
مستانہ ساتھ میرے روتی پھرے ہے بلبل ۔۔۔ گل سے جو دل لگا ہے ابتر ہے حال اس کا
میری طرح جھکے ہیں بےخود ہو سرو و گل بھی ۔۔۔ دیکھا کہیں چمن میں شاید جمال اس کا

کیا تم کو پیار سے وہ اے میرؔ منھ لگاوے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اس کا

(۱۰۸۹)

زار رکھا بے حال رکھا بے تاب رکھا بیمار رکھا ۔۔۔ حال رکھا تھا کچھ بھی ہم نے عشق نے آخر مار رکھا
میلان اس کا تھا کاہے کو جانب الفت کیشوں کے ۔۔۔ اپنی طرف سے ہم نے اب تک اس ظالم سے پیار رکھا
عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے ۔۔۔ دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار رکھا
کیا پوچھو ہو دیں کے اکابر فاضل کامل صابر رنج ۔۔۔ عزت والے کیا لوگوں کو گلیوں میں ان نے خوار رکھا

کام اس سے اک طور پہ لیتے بے طور اس کو ہونے نہ دیتے
حیف ہے میرؔ سپہر دوں نے ہم سے اس کو نہ یار رکھا

(۱۰۹۰)

دل رات دن رہے ہے سینے میں عشق ملتا
ہر چند چاہتا ہوں پر جی نہیں سنبھلتا

اب تو بدن میں سارے اک پھنک رہی ہے آتش
وہ مہ گلے سے لگتا تو یوں جگر نہ جلتا

شب ماہ چاردہ تھا کس حسن سے نمایاں
ہوتا بڑا تماشا جو یار بھی نکلتا

اے رشکِ شمع گویا تو موم کا بنا ہے
مہتاب میں تجھی کو دیکھا ہے یوں پگھلتا

تکلیف باغ ہم کو یاروں نے کی وگرنہ
گل پھول سے کوئی دم اپنا بھی دل بہلتا

رونے کا حرف دیا آنکھوں کو ہے بعینہ
جیسے ہو رود کوئی برسات میں ابلتا

کرتا ہے وے سلوک اب جس سے کہ جان جاوے
ہم میرؔ یوں نہ مرتے اس پر جو دل نہ چلتا

(۱۰۹۱)

بوسہ اس بت کا لے کے منھ موڑا
بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

ہو کے دیوانے ہم ہوئے زنجیر
دیکھ کر اس کے پاؤں کا توڑا

دل نے کیا کیا نہ درد رات دیے
جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا

گرم رفتن ہے کیا سمند عمر
نہ لگے جس کو باؤ کا گھوڑا

کیا کرے بخت مدعی تھے بلند
کوہکن نے تو سر بہت پھوڑا

دل ہی مرغ چمن کا ٹوٹ گیا
پھول گل چیں نے ہائے کیوں توڑا

ہے لبِ بام آفتابِ عمر
کریے سو کیا ہے میرؔ دن تھوڑا

(۱۰۹۲)

ہے عشق میں صبر ناگوارا
پھر صبر بن اور کیا ہے چارا

ان بالوں سے مشک مت خجل ہو
عنبر تو عرق عرق ہے سارا

یوں بات کرے ہے میرے خوں سے
گویا نہیں ان نے مجھ کو مارا

دیکھو ہو تو دور بھاگتے ہو
کچھ پاس نہیں تمھیں ہمارا

تھا کس کو دماغ باغ اس بن
بلبل نے بہت مجھے پکارا

رخسار کے پاس وہ در گوش
ہے پہلوے ماہ میں ستارا

ہوتے ہیں فرشتے صید آکر
آہوے حرم ہیں یاں چکارا

پھولی مجھے دیکھ کر گلوں میں
بلبل کا ہے باغ میں اجارا

جب جی سے گذر گئے ہم اے میرؔ
اس کوچے میں تب ہوا گذارا

(۱۰۹۳)

دل عجب چرچے کی جاگہ تھی سو ویرانہ ہوا
جوش غم سے جی جو بولایا سو دیوانہ ہوا
بزم عشرت پر جہاں کی گوش وا کر جائے چشم
آج یاں دیکھا گیا جو کچھ کل افسانہ ہوا
دیر میں جو میں گدایانہ گیا اودھر کہا
شاہ جی کہیے کدھر سے آپ کا آنا ہوا
کیا کہیں حسرت لیے جیسے جہاں سے کوئی جائے
یار کے کوچے سے اپنا اس طرح جانا ہوا
میرؔ تیر ان جورکیشوں کے جو کھائے بے شمار
چھاتی اب چھلنی ہے میری ہے جگر چھانا ہوا

(۱۰۹۴)

کیا کہے حال کہیں دل زدہ جاکر اپنا
دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا
دوری یار میں ہے حال دل ابتر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا
یک گھڑی صاف نہیں ہم سے ہوا یار کبھی
دل بھی جوں شیشۂ ساعت ہے مکدر اپنا
ہر طرف آئینہ داری میں ہے اس کے رو کی
شوق سے دیکھیے منھ ہووے ہے کیدھر اپنا
لب پہ لب رکھ کے نہ اس گل کے کبھو ہم سوئے
یہ بساط خسک و خار ہے بستر اپنا
کس طرح حرف ہو ناصح کا موثر ہم میں
سختیاں کھینچتے ہی دل ہوا پتھر اپنا
کیسی رسوائی ہوئی عشق میں کیا نقل کریں
شہر و قصبات میں مذکور ہے گھر گھر اپنا
اس گل تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند
رنگوں گل برگ کے ناخن ہے معطر اپنا
تجھ سے بے مہر کے لگ لگنے نہ دیتے ہرگز
زور چلتا کچھ اگر چاہ میں دل پر اپنا
پیش کچھ آؤ یہیں ہم تو ہیں ہر صورت سے
مثل آئینہ نہیں چھوڑتے ہم گھر اپنا
دل بہت کھینچتی ہے یار کے کوچے کی زمیں
لوہو اس خاک پہ گرنا ہے مقرر اپنا
میرؔ خط بھیجے پر اب رنگ اڑا جاتا ہے
کہ کہاں بیٹھے کدھر جاوے کبوتر اپنا

(۱۰۹۵)

گیا میرؔ دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
دنبالہ گرد چشم سیاہ غزال تھا
آخر کو خواب مرگ ہمیں جا سے لے گئی
جی دیتے تک بھی سر میں اسی کا خیال تھا
میں جو کہا کہ دل کو تو تم نے ہرا دیا
بولا کہ ذوق اپنا ہمارا ہی مال تھا

سرو اس طرف کو جیسے کنارے تھا کھڑا — اودھر جو آب جو کے وہ نازک نہال تھا
کیا میرے روزگار کے اہل سخن کی بات — ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب‌کمال تھا
کیا کیا ہوائیں دیدۂ تر سے نظر پڑیں — جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشکال تھا
کہتے تھے ہم تباہ ہے اب حال میر کا
دیکھا نہ تم نے اس میں بھلا کچھ بھی حال تھا

(۱۰۹۶)

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا — کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا
بارہا جاں لب جاں‌بخش سے دی جن نے ہمیں — دشمن جانی ہوا اب وہی جاناں اپنا
خلطے یاد آتے ہیں وے جب کہ بدلتے کپڑے — مجھ کو پہناتے تھے رعنائی کا ساماں اپنا
کیا ہوئی یکجہتی وہ کہ طرف تھے میرے — اب یہ طرفہ ہے کہ منھ کرتے ہیں پنہاں اپنا
جس طرح شاخ پراگندہ نظر آتے ہیں بید — تھا جنوں میں کبھو سر مو سے پریشاں اپنا
مشکلیں سیکڑوں چاہت میں ہمیں آئیں پیش — کام ہو دیکھیے کس طور سے آساں اپنا
دل فقیری سے نہیں میر کسو کا ناساز
خوش ہوا کتنا ہے یہ خانۂ ویراں اپنا

(۱۰۹۷)

دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حسن والوں کا
جی کو جنجال دل کو ہے الجھاؤ — یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
موے دلبر سے مشک بو ہے نسیم — حال خوش اس کے خستہ‌حالوں کا
نہ کہا کچھ نہ آ پھرا نہ ملا — کیا جواب ان مرے سوالوں کا
دم نہ لے اس کی زلفوں کا مارا
میر کاٹا جیے نہ کالوں کا

(۱۰۹۸)

احوال نہ پوچھو کچھ ہم ظلم رسیدوں کا — کیا حال محبت کے آزار کشیدوں کا
دیوانگی عاشق کی سمجھو نہ لباسی ہے — صد پارہ جگر بھی ہے ہم جامہ دریدوں کا
عاشق ہے دل اپنا تو گل‌گشت گلستاں میں — جدول کے کنارے کے نوباوہ دمیدوں کا
ناچار گئے مارے میدان محبت میں — پایا نہ گیا چارہ کچھ اس کے شہیدوں کا
پتے کے کھڑکنے سے ہوتی ہے ہمیں وحشت — کیا طور ہے ہم اپنے سائے سے رمیدوں کا

کیا کیا نہ گیا اس بن صبر اور دماغ و دل   رونق گئی بشرے سے پھر نور بھی دیدوں کا

کرتے ہیں پس از سالے دل شاد گلے لگ کر
سو میر وہ ملنا بھی اب ترک ہے عیدوں کا

(۱۰۹۹)

سطح جو ہاتھوں میں تھا اس کے رخ گلفام کا   ہاتھ ملنا کام ہے اب عاشق بدنام کا
کچھ نہیں عنقا صفت پر شہرۂ آفاق ہوں   سیر کے قابل ہے ہونا چمن میرے نام کا
ہجر کی راتیں بڑی چھوٹی جو ٹک ہوتیں کہیں   اس میں کچھ نقصان ہوتا تھا مگر ایام کا
روؤں یاد زلف میں اس کی تو پھر روتا رہوں   صبح تک جاتا نہیں ہے مینھ آیا شام کا

تاب کس کو اپنا کچا سوت کچھ الجھا ہے میر
گم ہے سررشتہ ہمارے خواب اور آرام کا

(۱۱۰۰)

کل رات رو کے صبح تلک میں رہا گرا   خونبار میری آنکھوں سے کیا جانوں کیا گرا
اب شہر خوش عمارت دل کا ہے کیا خیال   ناگاہ آ کے عشق نے مارا چلا گرا
کیا طے ہو راہ عشق کی عاشق غریب ہے   مشکل گذر طریق ہے یاں رہگرا گرا
لازم پڑی ہے کسل دلی کو فتادگی   بیمار عشق رہتا ہے اکثر پڑا گرا
ٹھہرے نہ اس کے عشق کا سرگشتہ و ضعیف   ٹھوکر کہیں لگی کہ رہا سرپھرا گرا
دے مارنے کو تکیہ سے سر ٹک اٹھا تو کیا   بستر سے کب اٹھے ہے غم عشق کا گرا

پھرتا تھا میر غم زدہ یک عمر سے خراب
اب شکر ہے کہ بارے کسی در پہ جا گرا

(۱۱۰۱)

چاہت کے طرح کش ہو کچھ بھی اثر نہ دیکھا   طرحیں بدل گئیں پر ان نے ادھر نہ دیکھا
خالی بدن جیوں سے یاں ہوگئے ولیکن   اس شوخ نے ادھر کو بھر کر نظر نہ دیکھا
کس دن سرشک خونیں منھ پر نہ بہ کر آئے   کس شب پلک کے اوپر لخت جگر نہ دیکھا
یاں شہر شہر بستی اوجڑ ہی ہوتے پائی   اقلیم عاشقی میں بستا نگر نہ دیکھا
اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا   افسوس پہلے ہم نے ٹک سوچ کر نہ دیکھا
لاتے نہیں فرو سر ہرگز بتاں خدا سے   آنکھوں سے اپنی تم نے ان کا گھر نہ دیکھا

سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل
میر اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا

(۱۱۰۲)

کیا ہے عشق جب سے میں نے اس ترک سپاہی کا
پھروں ہوں چور زخمی اس کی تیغ کم نگاہی کا

اگر ہم قطعۂ شب سا لیے چہرہ چلے آئے
قیامت شور ہوگا حشر کے دن روسیاہی کا

ہوا ہے عارفان شہر کو عرفان بھی اوندھا
کہ ہر درویش ہے مارا ہوا شوق الٰہی کا

ہمیشہ التفات اس کا کسو کے بخت سے ہوگا
نہیں شرمندہ میں تو اس کے لطف گاہ گاہی کا

برنگ کہربائی شمع اس کا رنگ جھمکے ہے
دماغ سیر اس کو کب ہے میرے رنگ کاہی کا

بڑھیں گے عہد کے درویش اس سے اور کیا یارو
کیا ہے لڑکوں نے دینا انھوں کو تاج شاہی کا

خراب احوال کچھ بکتا پھرے ہے دیر و کعبے میں
سخن کیا معتبر ہے میرؔ سے واہی تباہی کا

(۱۱۰۳)

آنکھوں میں اپنی رات کو خوناب تھا سو تھا
جی دل کے اضطراب سے بے تاب تھا سو تھا

آکر کھڑا ہوا تھا بہ صد حسن جلوہ ناک
اپنی نظر میں وہ در نایاب تھا سو تھا

ساون برے نہ بھادوں میں ہم سوکھے اہل درد
سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا

درویش کچھ گھٹا نہ بڑھا ملک شاہ سے
خرقہ کلاہ پاس جو اسباب تھا سو تھا

کیا بھاری بھاری قافلے یاں سے چلے گئے
تجھ کو وہی خیال گراں خواب تھا سو تھا

برسوں سے ہے تلاوت و سجادہ و نماز
پر میل دل جو سوے مئے ناب تھا سو تھا

ہم خشک لب جو روتے رہے جوئیں بہ چلیں
پر میرؔ دشت عشق کا بے آب تھا سو تھا

ردیف ب

(۱۱۰۴)

ماہ صیام آیا ہے قصد اعتکاف اب
جا بیٹھیں میکدے میں مسجد سے اٹھ کے صاف اب

مسلم ہیں رفتہ رو کے کافر ہیں خستہ مو کے
یہ بیچ سے اٹھے گا کس طور اختلاف اب

جو حرف ہیں سو ٹیڑھے خط میں لکھے ہیں شاید
اس کے مزاج میں ہے کچھ ہم سے انحراف اب

مجرم ٹھہر گئے ہم پھرنے سے ساتھ تیرے
بہتر ہے جو رکھے تو اس سے ہمیں معاف اب

گو لگ گیا گلے میں مت کھینچ تیغ مجھ پر
اپنے گنہ کا میں تو کرتا ہوں اعتراف اب

کیا خاک میں ملاکر اپنے تئیں موا ہے
پیدا ہو گور مجنوں تو کیجیے طواف اب

کھنچتے ہیں جامے خوں میں کن کن کے میر دیکھیں
لگتی ہے سرخ اس کے دامن کے تیں سنجاف اب

(۱۱۰۵)

طاقت تعب کی غم میں تمھارے نہیں ہے اب   گویا کہ جان جسم میں سارے نہیں ہے اب
کل کچھ صبا ہوئی تھی گل افشاں قفس میں بھی   وہ بے کلی تو جان کو بارے نہیں ہے اب
جیتے تو لاگ پلکوں کی اس کی کہیں گے ہم   کچھ ہوش ہم کو چھڑیوں کے مارے نہیں ہے اب
زردی چہرہ اب تو سفیدی کو کھنچ گئی   وہ رنگ آگے کا سا پیارے نہیں ہے اب
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں
کل دیر میر میر پکارے نہیں ہے اب

(۱۱۰۶)

بولا جو مو پریشاں آ نکلے میر صاحب   آتا ہوا کہاں سے کہیے فقیر صاحب
ہر لحظہ اک شرارت ہر دم ہے یک اشارت   اس عمر میں قیامت تم ہو شریر صاحب
بندے پہ اب نوازش کیجے تو کیجے ورنہ   کیا لطف ہے جو آئے وقت اخیر صاحب
دل کا الجھنا اپنے ایسا نہیں کہ سلجھے   ہیں دام زلف میں ہم اس کے اسیر صاحب
فکر جگر رہے ہے اس دم غلام کو بھی
جس دم لگو ہو کرنے تم مشق تیر صاحب

(۱۱۰۷)

دل پر تو چوٹ تھی ہی زخمی ہوا جگر سب   ہر دم بھری رہے ہے لوہو سے چشم تر سب
حیف اس سے حال میرا کہتا نہیں ہے کوئی   نالوں سے شب کے میرے رکھتے تو ہیں خبر سب
بجلی سی اک تجلی آئی تھی آسماں سے   آنکھیں لگا رہے ہیں اہل نظر ادھر سب
اس ماہ بن تو اپنی دکھ میں بسر ہوئی تھی   کل رات آگیا تو وہ دکھ گیا بسر سب
کیا فہم کیا فراست ذوق و بصر سماعت   ق   تاب و توان و طاقت یہ کر گئے سفر سب
منزل کو مرگ کی تھا آخر مجھے پہنچنا   بھیجا ہے میں نے اپنا اسباب پیشتر سب
دنیا میں حسن و خوبی میر اک عجیب شے ہے
رندان و پارسا یاں جس پر رکھیں نظر سب

(۱۱۰۸)

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب   اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب

ہم سر بکھیرتے تو وہ تیغ کھنچ نہ سکتی
اپنا گناہ اپنی تقصیر میرصاحب

کھنچتی نہیں کماں اب ہم سے ہوائے گل کی
بادسحر لگے ہے جوں تیر میرصاحب

کب ہیں جوانی کے سے اشعار شورآور
شاید کہ کچھ ہوئے ہیں اب پیر میرصاحب

تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میرصاحب

(۱۱۰۹)

سب آتش سوزندۂ دل سے ہے جگر آب
بے صرفہ کرے صرف نہ کیوں دیدۂ تر آب

پھرتی ہے اڑی خاک بھی مشتاق کسو کی
سر مار کے کرتا ہے پہاڑوں میں بسر آب

کیا کریے اسے آگ سا بھڑکایا ہے جن نے
نزدیک تر اب اس کو کرے غرق مگر آب

دل میں تو لگی دوں سی بھریں چشمے سی آنکھیں
کیا اپنے تئیں روؤں ادھر آگ ادھر آب

کس طور سے بھر آنکھ کوئی یار کو دیکھے
اس آتشیں رخسار سے ہوتی ہے نظر آب

ہم ڈرتے شکررنجی سے کہتے نہیں یہ بھی
خجلت سے ترے ہونٹوں کی ہیں شہد و شکر آب

کس شکل سے اک رنگ پہ رہنا ہو جہاں کا
رہتی ہیں کوئی صورتیں یہ نقش ہیں بر آب

شعلے جو مرے دل سے اٹھیں ہیں سو نہ بیٹھیں
برسوں تئیں چھڑکا کرو تم ان پہ اگر آب

استادہ ہو دریا تو خطرناکی بہت ہے
آ اپنے کھلے بالوں سے زنجیر نہ کر آب

شب روؤں ہوں ایسا کہ جدھر یار کا گھر ہے
جاتا ہوں گلے چھاتی تک اودھر کو اتر آب

اس دشت سے ہو میر ترا کیونکے گذارا
تا زانو ترے گل ہے تری تا بہ کمر آب

(۱۱۱۰)

پڑا ہے فرق خورد و خواب میں اب
رہا ہے کیا دل بےتاب میں اب

جنوں میں اب کے نے دامن ہے نے جیب
کمی آئی بہت اسباب میں اب

ہوا ہے خواب ملنا اس سے شب کا
کبھو آتا ہے وہ مہ خواب میں اب

گدائی لی ہے میں نے اس کے در کی
کہے کیا دیکھوں میرے باب میں اب

گلے لگنے بن اس کے اتنا روئے
کہ ہم ہیں گے گلے تک آب میں اب

کہاں بل کھائے بال اس کے کہاں یہ
عبث سنبل ہے پیچ وتاب میں اب

بلا چرچا ہے میرے عشق کا میر
یہی ہے ذکر شیخ و شاب میں اب

ردیف ت

(۱۱۱۱)

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

بے سبب آتا نہیں اب دم بہ دم عاشق کو غش
درد کھینچا ہے نہایت رنج اٹھایا ہے بہت

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار
دلبران شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت

وا نہیں ہوتا کسو سے دل گرفتہ عشق کا
ظاہرا غمگیں اسے رہنا خوش آیا ہے بہت

میؔر گم گشتہ کا ملنا اتفاقی امر ہے
جب کبھو پایا ہے خواہش مند پایا ہے بہت

(۱۱۱۲)

عجب نہیں ہے نہ جانے جو میؔر چاہ کی ریت
سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت

مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

غم زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگاں
قمارخانۂ آفاق میں ہے ہار ہی جیت

ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے
ہمارے عندیے میں تو ہے وہ خبیث پلیت

کسو کے بستر و سنجاب و قصر سے کیا کام
ہماری گور کے بھی ڈھیر میں مکاں ہے مبیت

ہوئے ہیں سوکھ کے عاشق طنبورے کے سے تار
رقیب دیکھو تو گاتے ہیں بیٹھے اور ہی گیت

شفق سے ہیں در و دیوار زرد شام و سحر
ہوا ہے لکھنؤ اس رہگذر میں پیلی بھیت

کہا تھا ہم نے بہت بولنا نہیں ہے خوب
ہمارے یار کو سو اب ہمیں سے بات نہ چیت

ملے تھے میؔر سے ہم کل کنار دریا پر
فتیلہ مو وہ جگر سوختہ ہے جیسے اتیت

(۱۱۱۳)

جب سے چلی چمن میں ترے رنگ پاں کی بات
سنتا نہیں ہے کوئی کلی کے دہاں کی بات

یاں شہر حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں
کیا جانیے کہ مہر و وفا ہے کہاں کی بات

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں سے کہیں آسماں کی بات

ایسا خدا ہی جانے کہ ہو عرش یا نہ ہو
دل بولنے کی جا نہیں کیا اس مکاں کی بات

کیا لطف جو سنو اسے کہتے پھرا کرو
یوں چاہیے کہ بھول وہیں ہو جہاں کی بات

لے شام سے جہاں میں ہے تا صبح ایک شور
اپنی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتی یاں کی بات

اوباش کس کو پوچھتے ہیں التفات سے — سیدھی کبھو سنی نہیں اس بدزباں کی بات
ہر حرف میں ہے ایک کجی ہر سخن میں پیچ — پنہاں رہے ہے کب کسو کی ٹیڑھی بانکی بات
کہنے سے کچھ کہا ہی کیا زیرلب مجھے
کیا پوچھتے ہو میرؔ مرے مہرباں کی بات

(۱۱۱۴)

مانند مرغ دوست نہ کہہ بار بار دوست — ٹک سوچ بھی ہزار ہیں دشمن ہزار دوست
کھڑکے ہے پات بھی تو لگا بیٹھتا ہے چوٹ — رم خوردہ وہ غزال بہت ہے شکار دوست
سب کو ہے رشک مجھ میں جو تجھ میں ہے اختلاط — دشمن ہوئے ہیں دوستی سے تیری یار دوست
مجھ سے ہزار ان نے بنا کر دیے بگاڑ — مت جان سادگی سے کہ ہے روزگار دوست
یہ تو کچھ آگے دشمن جانی سے بھی چلا — میں جانتا تھا ہوگا دل بےقرار دوست
بیگانگی خلق جہاں جائے خوف ہے — سو دشمنوں میں کیا ہے جو نکلے بھی چار دوست
مجھ بےنوا کی یاد رہے میرؔ یہ صدا
اس میکدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

(۱۱۱۵)

سیر کی ہم نے اٹھ کے تا صورت — ویسی دیکھی نہ ایک جا صورت
منھ لگاتا تو درکنار ان نے — نہ کہا ہے یہ آشنا صورت
منھ دکھاتی ہے آرسی ہر صبح — تو بھی اپنی تو ٹک دکھا صورت
خوب ہے چہرۂ پری لیکن — آگے اس کے ہے کیا بلا صورت
کب تلک کوئی جیسے صورت باز — ق — آوے پیاری بنا بنا صورت
ایک دن تو یہ کہہ کہ ملنے کی — تو بھی ٹھہرا کے کوئی لا صورت
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے منھ زرد
ہوگئی میرؔ تیری کیا صورت

(۱۱۱۶)

وصل دلبر نہ ٹک ہوا قسمت — مر چلے ہجر میں ہی یا قسمت
ایک بوسے پہ بھی نہ صلح ہوئی — ہم نے دیکھی بہت لڑا قسمت
شیخ جنت تجھے مجھے دیدار — واں بھی ہر اک کی ہے جدا قسمت
پھول جن ہاتھوں سے سبھوں کو دیے — زخم تیغ ان سے اپنی تھا قسمت
کیا ازل میں ملا نہ لوگوں کو
تھی ہماری بھی میرؔ کیا قسمت

(۱۱۱۷)

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت　　دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
جب نہ تب جاگہ سے تم جایا کیے　　ہم تو اپنی اور سے آئے بہت
دیر سے سوے حرم آیا نہ ٹک　　ہم مزاج اپنا ادھر لائے بہت
پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت
گر بکا اس شور سے شب کو ہے تو　　روویں گے سونے کو ہمسائے بہت
وہ جو نکلا صبح جیسے آفتاب　　رشک سے گل پھول مرجھائے بہت
میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

(۱۱۱۸)

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت　　کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت
کعبۂ مقصود کو پہنچے نہ ہائے　　سعی کی اے شیخ ہم نے بھی بہت
سب ترے محو دعاے جان ہیں　　آرزو اپنی بھی ہے تو جی بہت
رک رہا ہے دیر سے تڑپا نہیں　　عشق نے کیوں دل کو مہلت دی بہت
کیوں نہ ہوں دوری میں ہم نزدیک مرگ　　دل کو اس کے ساتھ الفت تھی بہت
وہ نہ چاہے جب تئیں ہوتا ہے کیا　　جہد کی ملنے میں اپنی سی بہت
کب سنا حرف شگون وصل یار　　یوں تو فال گوش ہم نے لی بہت
تھا قوی آخر ملے ہم خاک میں　　آسماں سے یوں رہی کشتی بہت
آج درہم کرتے تھے کچھ گفتگو
میرؔ نے شاید کہ دارو پی بہت

(۱۱۱۹)

خدا جانے ہووے گی کیا نہایت　　اجل تو ہے دل کے مرض کی بدایت
سخن غم سے آغشتہ خوں ہے ولیکن　　نہیں لب مرے آشناے شکایت
نہیں یہ گنہگار ملنے کے قابل　　کرم کریے تو مہربانی عنایت
گیا آسماں پر جو نالہ تو کیا ہے　　نہیں یار کے دل میں کرتا سرایت
ہمیں عشق میں میرؔ چپ لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

ردیف ٹ

(۱۱۲۰)

کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ — دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ
ہم عاشقوں کو مرتے کیا دیر کچھ لگے ہے — چٹ جن نے دل پہ کھائی وہ ہوگیا ہے چٹ پٹ
دل ہے جدھر کو ادھر کچھ آگ سی لگی تھی — اس پہلو ہم جو لیٹے جل جل گئی ہے کروٹ
کلیوں کو تونے چٹ چٹ اے باغباں جو توڑا — بلبل کے دل جگر کو ظالم لگی ہے کیا چٹ
جی ہی ہٹے نہ میرا تو اس کو کیا کروں میں — ہر چند بیٹھتا ہوں مجلس میں اس سے ہٹ ہٹ
دیتی ہے طول ناکس کیا نالہ و فغاں کو — دل کے الجھنے سے ہیں یہ عاشقوں کی پھپٹ
مردے نہ تھے ہم ایسے دریا پہ جب تھا تکیہ — اس گھاٹ گاہ و بیگہ رہنے لگا تھا جمگھٹ
رک رک کے دل ہمارا بیتاب کیوں نہ ہووے — کثرت سے درد وغم کی رہتا ہے اس پہ جھرمٹ
شب میر سے ملے ہم اک وہم رہ گیا ہے
اس کے خیال مو میں اب تو گیا بہت لٹ

ردیف ث

(۱۱۲۱)

تری جستجو یار کی ہے عبث — یہ کوشش گنہگار کی ہے عبث
تو پیدا ہے لیکن ہویدا نہیں — یہ تصدیع ہموار کی ہے عبث
نہ ہاتھ آئی اے میر کچھ وجہ سے
گرہ میں نے دستار کی ہے عبث

ردیف چ

(۱۱۲۲)

حال کہنے کی کسے تاب اس آزار کے بیچ — حال رہتا ہی نہیں عشق کے بیمار کے بیچ
آرزومند ہے خورشید میسر ہے کہاں — کہ ٹک ٹھہرے ترے سایۂ دیوار کے بیچ
کیا کہیں ہم کہ گلے ڈالے پھریں مستی میں — دانے سبحہ کے پرو رشتۂ زنار کے بیچ
رشک خوبی کا اسی کے جگرمہ میں ہے داغ — یہ جو اک خال پڑا ہے ترے رخسار کے بیچ
مل گیا پھولوں میں اس رنگ سے کرتے ہوئے سیر — کہ تامل کیے پایا اسے گلزار کے بیچ

قدر گو تم نہ کرو میری متاعِ دل کی — جنس لگ جاوے گی یہ بھی کسو سرکار کے بیچ

گردسرِفتہ ہیں اے میرؔ ہم اس کشتے کے
رہ گیا یار کی جو ایک ہی تلوار کے بیچ

(۱۱۲۳)

کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ — اس کی سی بو نہ آئی گل و یاسمن کے بیچ
کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانی یار کا — اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیچ
اس بحر میں رہا مجھے چکر بھنور کے طور — سرگشتگی میں عمر گئی سب وطن کے بیچ
گر دل جلا بھنا یہی ہم ساتھ لے گئے — تو آگ لگ اٹھے گی ہمارے کفن کے بیچ
تنگی جامہ ظلم ہے اے باعث حیات — پاتے ہیں لطف جان کا ہم تیرے تن کے بیچ
نازک بہت ہے تو کہیں افسردگی نہ آئے — چسپانی لباس سے پیارے بدن کے بیچ

ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے جن نے میرؔ
برہم کیا جہاں مژہ برہم زدن کے بیچ

(۱۱۲۴)

جانا نہ دل کو تھا تری زلف رسا کے بیچ — دانستہ جا پڑے ہے کوئی بھی بلا کے بیچ
فرہاد و قیس جس سے مجھے چاہو پوچھ لو — مشہور ہے فقیر بھی اہل وفا کے بیچ
آخر تو میں نے طول دیا بحث عشق کو — کوتاہی تم بھی مت کرو جور و جفا کے بیچ
آئی جو لب پہ آہ تو میں اٹھ کھڑا ہوا — بیٹھا گیا نہ مجھ سے تو ایسی ہوا کے بیچ
اقبال دیکھ اس ستم و ظلم و جور پر — دیکھوں ہوں جس کو ہے وہ اسی کی دعا کے بیچ
دل اس چمن میں بہتوں سے میرا لگا ولے — بوے وفا نہ پائی کسو آشنا کے بیچ

جوش و خروش میرؔ کے جاتے رہے نہ سب
ہوتا ہے شور چاہنے کی ابتدا کے بیچ

ردیف ح

(۱۱۲۵)

یاد آگیا تو بہنے لگیں آنکھیں جو کی طرح — کچھ آگئی تھی سرو چمن میں کسو کی طرح
چسپاں قبا وہ شوخ سدا غصے ہی رہا — چینِ جبیں ہے اس کی اٹھائی اتو کی طرح
گالی لڑائی آگے تو تم جانتے نہ تھے — اب یہ نکالی تم نے نئی گفتگو کی طرح

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

سرسبز ہم ہوئے نہ تھے جو زرد ہو چلے
اس کشت میں پڑی یہ ہمارے نمو کی طرح

وے دن کہاں کہ مست سرانداز خم میں تھے
سر اب تو جھوجھرا ہے شکستہ سبو کی طرح

تسکین دل کی کب ہوئی سیرچمن کیے
گو پھول دل میں آگئے کچھ اس کے رو کی طرح

آخر کو اس کی راہ میں ہم آپ گم ہوئے
مدت میں پائی یار کی یہ جستجو کی طرح

کیا لوگ یوں ہی آتش‌سوزاں میں جا پڑے
کچھ ہوگی جلتی آگ میں اس تندخو کی طرح

ڈرتا ہوں چاک دل کو مرے پلکوں سے سیے
نازک نظر پڑی ہے بہت اس رفو کی طرح

دھوتے ہیں اشک خونی سے دست و دہن کو میر
نماز کیا ہے جو یہ ہے وضو کی طرح

ردیف د

(۱۱۲۶)

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند
بہت تڑپا کیا جوں مرغ پربند[1]

گرفت دل سے ناچاری ہے یعنی
رہا ہوں بیٹھ میں بھی کر کے گھر بند

پھنسا دل زلف و کاکل میں نہ پوچھو
پڑا ہے تاگہ آکر بند پر بند

سب اس کی چشم پرنیرنگ کے محو
مگر کی ان نے عالم کی نظر بند

چمن میں کیونکے ہم پربستہ جاویں
بلند ازبس کہ ہے دیوار و در بند

بہت پیکان تیر یار ٹوٹے
تمام آہن ہے اب میرا جگر بند

ہوئیں رونے کی مانع میری پلکیں
بندھا خاشاک سے سیلاب پر بند

کہا کیا جائے ان ہونٹوں کے آگے
ہماری لب گزی ہے یہ شکربند

کھلے بندوں نہ آیا یاں وہ اوباش
پھرا مونڈھے پہ ڈالے بیشتر بند

یہی اوقات ہے گی دید کی یاں
رکھ اپنی چشم کو شام و سحر بند

نچا رہتا تھا چہرہ جس سے سو اب
گریباں میں ہے وہ دست ہنر بند

فن اشعار میں ہوں پہلواں میر
مجھے ہے یاد اس کشتی کا ہر بند

(۱۱۲۷)

ہماری بات کو اے شمع بزم کریو یاد
زبان سرخ سرسبز دیتی ہے برباد

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا اچھا یاد
کشش نہ دام کی دیکھی نہ کوشش صیاد

(۱) یہ مطلع اگلے شعر سے مربوط ہے۔ مصحح

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جاے نالہ و فریاد

ہزار فاختہ گردن میں طوق پہنے پھرے
اسے خیال نہیں کچھ وہ سرو ہے آزاد

جہاں میں اتنے ہی آشوب کیا رہیں گے بس
ابھی پڑے گا مرے خون بےگنہ سے زیاد

چمن میں اٹھتے ہیں سناہٹے سے اے بلبل
جگرخراش یہ نالے ہیں تیرے منھ سے زیاد

ثبات قصر و در و بام و خشت و گل کتنا
عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے وا نہ ہوئے
ہمارے ساتھ یہی غم یہی دل ناشاد

ہمیں تو مرنے کا طور اس کے خوش بہت آیا
طواف کریے جو ہو نخل ماتم فرہاد

نظر نہ کرنی طرف صید کے دم بسمل
یہ ظلم تازہ ہوا اس کشندے سے ایجاد

چلے نہ تیغ اگر ہم نگاہ عجز کریں
ہماری اور نہ دیکھے خدا کرے جلاد

کب ان نے دل میں کر انصاف ہم پہ لطف کیا
وہی ہے خشم وہی یاں سے جا وہی بیداد

تمام ریجھ پچھاڑ ہیں اب تو پھر پس مرگ
کہا کسھوں نے تو کیا عزاسۂ استاد

اگرچہ گنج بھی ہے پر خرابیاں ہیں بہت
نہ پھر خرابے میں اے میر خانماں برباد

(۱۱۲۸)

عشق لوہو پی گیا سب تن میں ہے سو درد درد
پھول میری خاک سے نکلیں گے بھی تو زرد زرد

کب مری شب کو سحر ہے ایک بدحالی کے بیچ
جانتا ہوں صبح ہے ہوتا ہوں جب میں سرد سرد

کارواں در کارواں یاں سے چلے جاتے ہیں لوگ
ہر طرف اس خاکداں میں دیکھتے ہیں گرد گرد

مرد و زن سب ہیں نہ پیر دیر و دخت تاک سے
یہ غلط‌فہمی ہے ہر زن زن ہے یا ہر مرد مرد

دفتر اعمال میرا بھول جاویں میر کاش
ہے قیامت اس جریدے کو جو دیکھیں فرد فرد

(۱۱۲۹)

بہت ہے تن درد پرورد زرد
اٹھے گی مری خاک سے گرد زرد

وہ بیمار گو تو نہ جانے مجھے
مرا نامہ لکھنے کو ہو فرد زرد

گذرتی ہے کیا میر دل پر ترے
تو ہوتا ہے ہر لحظہ کچھ زرد زرد

ردیف ر

(۱۱۳۰)

گرمی سے گفتگو کی کرلے قیاس جاں پر　　شعلہ ہے شمع ساں یاں ہر یک سخن زباں پر
دیکھ اس کے خط کی خوبی لگ جاتی ہے چپ ایسی　　گویا کہ مہر کی ہے ان نے مرے دہاں پر
ہوں خاک مجھ کو ان سے نسبت حساب کیا ہے　　میں گنتی میں نہیں ہوں وے ہفتم آسماں پر
گھر باغ میں بنایا پر ہم نے یہ نہ جانا　　بجلی سے بھی پڑے گا پھول آکے آشیاں پر
روتے ہیں دوست اکثر سن سرگذشت عاشق　　تو بھی تو گوش وا کر ٹک میری داستاں پر
کیا بات میں تب اس کی جاوے کسو سے بولا　　ہونے لگے ہوں خوں جب ہونٹوں کے رنگ پاں پر
تڑپے ہے دل گھڑی بھر تو پہروں غش رہے ہے　　کیا جانوں آفت آئی کیا طاقت و تواں پر
سودا بنے جو اس سے تو میر منفعت ہے
اپنی نظر نہیں ہے پھر جان کے زیاں پر

(۱۱۳۱)

چیں مارا دل غموں نے کوٹ کر　　کیا اجاڑا اس نگر کو لوٹ کر
ابر سے آشوب ایسا کب اٹھا　　خوب روئے دیدۂ تر پھوٹ کر
کیوں گریباں کو پھروں پھاڑے نہ میر
دامن اس کا تو گیا ہے چھوٹ کر

(۱۱۳۲)

اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر　　دم کھینچ تہ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کر
وہ آئینہ رو باغ کے پھولوں میں جو دیکھا　　ہم رہ گئے حیران اسی منھ پہ نظر کر
ہے بےخبری مجھ کو ترے دیکھے سے ساقی　　ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر
جس جاے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے　　آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
فرہاد سے پتھر پہ ہوئیں صنعتیں کیا کیا　　دل جا کے جگرکاوی میں کچھ تو بھی ہنر کر
پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے وہ احوال　　رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر
معشوق کا کیا وصل ورے ایسا دھرا ہے　　تاشمع پتنگا بھی جو پہنچے ہے تو مر کر
یک شب طرف اس چہرۂ تاباں سے ہوا تھا　　پھر چاند نظر ہی نہ چڑھا جی سے اتر کر
کب اور کیا ہٹا عوض ریختے کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

(۱۱۳۳)

جب ہم کلام ہم سے ہوتا ہے پان کھا کر
کس رنگ سے کرے ہے باتیں چبا چبا کر

تھی جملہ تن لطافت عالم میں جاں کے ہم تو
مٹی میں اٹ گئے ہیں اس خاکداں میں آ کر

سعی و طلب بہت کی مطلب کے تیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھا کر

غیرت یہ تھی کہ آیا اس سے جو میں خفا ہو
مرتے موا پہ ہرگز اودھر پھرا نہ جا کر

قدرت خدا کی سب میں خلع العذار آؤ
بیٹھو جو مجھ کنے تو پردے میں منھ چھپا کر

ارمان ہے جنھوں کو وے اب کریں محبت
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

میں میر ترک لے کر دنیا سے ہاتھ اٹھایا
درویش تو بھی تو ہے حق میں مرے دعا کر

(۱۱۳۴)

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفاے تن پر
مو جی گئے تھے صدقے اس شوخ کے بدن پر

نام خدا نکالے کیا پاؤں رفتہ رفتہ
تلواریں چلتیاں ہیں اس کے تو اب چلن پر

تو بھی تو ایک دن چل گلشن میں ساتھ میرے
کرتی ہے کیا تبختر بلبل گل چمن پر

دل جو بجا نہیں ہے وحشی سا میں پھروں ہوں
تم جائیو نہ ہرگز میرے دوانے پن پر

درکار عاشقوں کو کیا ہے جواب نامہ
یک نام یار بس ہے لکھنا مرے کفن پر

تب ہی بھلے تھے جب تک حرف آشنا نہ تھے تم
لینے لگے لڑائی اب تو سخن سخن پر

گرد رخ اس کے پیدا خط کا غبار یوں ہے
گرد اک تنک سی بیٹھے جس رنگ یاسمن پر

کس طرح میر جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک بھی داغ مے تھے سب ان کے پیرہن پر

(۱۱۳۵)

سحر گوش گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بند مرغ چمن سے ملا کر(۱)

لگا کہنے فرصت ہے یاں یک تبسم
سو وہ بھی گریباں میں منھ کو چھپا کر

تناسب پہ اعضا کے اتنا تبختر
بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر

قیامت رہا اضطراب اس کے غم میں
جگر پھر گیا رات ہونٹوں پہ آ کر

اسی آرزو میں گئے ہم جہاں سے
نہ پوچھا کبھو لطف سے ٹک بلا کر

کھنچی تیغ اس کی تو یاں نیم جاں تھے
خجالت سے ہم رہ گئے سر جھکا کر

مبارک تمھیں میر ہو عشق کرنا
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

---

(۱) یہ مطلع اگلے شعر سے مربوط ہے۔ مصحح

(۱۱۳۶)

صاف غلطاں خوں میں ہے نخچیر یار
لے گیا رنگ اس کے دل سے تیر یار

کوتہی کی میرے طول عمر نے
جور میں تو کچھ نہ تھی تقصیر یار

آ کڑوں کے پاؤں میں بیڑی ہوئی
ہاتھ میں سونے کی وہ زنجیر یار

ہے کشیدہ جیسے تیغ آفتاب
میاں میں رہتی نہیں شمشیر یار

میر ہم تو ناز ہی کھینچا کیے
کیونکے کوئی کھینچے ہے تصویر یار

(۱۱۳۷)

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور

چلتا ہے کام مرگ کا خوب اس کے دور میں
ہوتی ہے گرد شہر کے روز اک مزار اور

بندے کو ان فقیروں میں گنیے نہ شہر کے
صاحب نے میرے مجھ کو دیا اعتبار اور

دل کو تو لاگ ہی ہے نکوں راہ کب تلک
اس پر ہے یک عذاب شدید انتظار اور

بسمل پسند کر کے تڑپنا نہ دیکھنا
ہے میرے صیدپیشہ کا طور شکار اور

میں اس کی گرد رہ کا رہا منتظر بہت
سو آنکھیں دونوں لائیں مری اک غبار اور

درد سر اب جو عشق کا ہے گور تک ہے ساتھ
کچھ یہ نشہ ہی اور ہے اس کا خمار اور

کاہے کو اس قرار سے تھا اضطراب قلب
ہوتا ہے ہاتھ رکھنے سے دل بےقرار اور

کس کو فقیری میں سر و دل حرف کا ہے میر
کرتے ہیں اس دماغ پہ ہم انکسار اور

(۱۱۳۸)

دعویٰ ہے یوں ہی اس کا ترے حسن گوش پر
یاں کون تھوکے ہے صدف ہرزہ کوش پر

شاید کسو میں اس میں بہت ہوگیا ہے بعد
تم بھی تو گوش رکھو جرس کے خروش پر

جیب و کنار سے تو بڑھا پانی دیکھیے
چشمہ ہماری چشم کا رہتا ہے جوش پر

اک شور ہے جو عالم کون و فساد میں
ہنگامہ ہے اسی کے یہ لعل خموش پر

ہے بار دوش جس کے لیے زندگی سو وہ
رکھ ہاتھ راہ تک نہ چلا میرے دوش پر

جو ہے سو مست بادۂ وہم و خیال ہے
کس کو ہے یاں نگاہ کسو دردنوش پر

مرغ چمن نے کیا حق صحبت ادا کیا
لالا کے گل بکھیرے مرے قبرپوش پر

جب تک بہار رہتی ہے رہتا ہے مست تو
عاشق ہیں میر ہم تو تری عقل و ہوش پر

(۱۱۳۹)

کیا جانیں گے کہ ہم بھی عاشق ہوئے کسو پر
غصے سے تیغ اکثر اپنے رہی گلو پر

ہر کوئی چاہتا ہے سرمہ کرے نظر کا
ہونے لگے ہیں اب تو خون اس کی خاک کو پر

کر باغباں حیا ٹک گل کو نہ ہاتھ میں مل
دیتی ہے جان بلبل پھولوں کے رنگ و بو پر

حسرت سے دیکھتے ہیں پرواز ہم صفیراں
شائستہ بھی ہمارے ایسے ہی تھے کبھو پر

حرف و سخن کرے ہے کس لطف سے برابر
سلک گہر بھی صدقے کی اس کی گفتگو پر

گو شوق سے ہو دل خوں مجھ کو ادب وہی ہے
میں رو کبھو نہ رکھا گستاخ اس کے رو پر

تن راکھ سے ملا سب آنکھیں ویسی سی جلتی
ٹھہری نظر نہ جوگی میرؔ اس فتیلہ مو پر

ردیف ز

(۱۱۴۰)

ہے تند و تیز اس کی نگاہ اس طرف ہنوز
مارا ہے بے گناہ و گناہ اس طرف ہنوز

سر کاٹ کر ہم اس کے قدم کے تلے رکھا
ٹیڑھی ہے اس کی طرف کلاہ اس طرف ہنوز

مدت سے مثل شب ہے مرا تیرہ روزگار
آتا نہیں وہ غیرت ماہ اس طرف ہنوز

پتھرا گئیں ہیں آنکھیں مری نقش پا کے طور
پڑتی نہیں ہے یار کی راہ اس طرف ہنوز

جس کی جہت سے مرنے کے نزدیک پہنچے ہم
پھرتا نہیں وہ آن کے واہ اس طرف ہنوز

آنکھیں ہماری مند چلیں ہیں جس بغیر یاں
وہ دیکھتا بھی ٹک نہیں آہ اس طرف ہنوز

برسوں سے میرؔ ماتم مجنوں ہے دشت میں
روتا ہے آ کے ابر سیاہ اس طرف ہنوز

ردیف س

(۱۱۴۱)

گلا مت توڑ اپنا اے جرس بس
نہیں اس راہ میں فریادرس بس

کبھو دل کی نہ کہنے پائے اس سے
جہاں بولے لگا کہنے کہ بس بس

گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو
ہمیں داغ دل و کنج قفس بس

نہ ترساؤ یکایک مار ڈالو
کرو گے کب تلک ہم پر ترس بس

بہت کم دیتے تھے بادل دکھائی
رہے ہم ہی تو روتے اس برس بس

کسو محبوب کی ہو گور پر گل   ہماری خاک کو ہے خار و خس بس
چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میر
بہت نکلی ہماری بھی ہوس بس

(۱۱۴۲)

عشق میں غم نہ چشم تر ہے بس   نہ یہی خوں دل و جگر ہے بس
رہ گئے منھ نہوں سے نوچ کے ہم   گر ہوس ہے اسی قدر ہے بس
آپ سے جا کے پھر نہ آئے ہم   بس ہمیں تو یہی سفر ہے بس
چاہ میں ہم نہیں زیادہ طلب   کبھو پوچھو جو تم خبر ہے بس
چشم پوشی نہ کر فقیر ہے میر
مہر کی اس کو اک نظر ہے بس

(۱۱۴۳)

امیروں تک رسائی ہوچکی بس   مری بخت آزمائی ہوچکی بس
بہار اب کے بھی جو گذری قفس میں   تو پھر اپنی رہائی ہوچکی بس
کہاں تک اس سے قصہ قضیہ ہر شب   بہت باہم لڑائی ہوچکی بس
نہ آیا وہ مرے جاتے جہاں سے   یہیں تک آشنائی ہوچکی بس
لگا ہے حوصلہ بھی کرنے تنگی   غموں کی اب سمائی ہوچکی بس
برابر خاک کے تو کر دکھایا   فلک بس بے ادائی ہوچکی بس
دنی کے پاس کچھ رہتی ہے دولت   ہمارے ہاتھ آئی ہوچکی بس
دکھا اس بت کو پھر بھی یا خدایا   تری قدرت نمائی ہوچکی بس
شرر کی سی ہے چشمک فرصت عمر   جہاں دی تک دکھائی ہوچکی بس
گلے میں گیروی کفنی ہے اب میر
تمھاری میرزائی ہوچکی بس

ردیف ش

(۱۱۴۴)

اس کے در پر شب نہ کر اے دل خروش   کہتے ہیں دیوار بھی رکھے ہے گوش
پاؤں پڑتا ہے کہیں آنکھیں کہیں   اس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش

کتنے یہ فتنے ہیں موجب شور کے   قد و خد و گیسو و لعل خموش
مر گیا اس ماہ بن میں کیا عجب   چاندنی سے ہو جو میرا قبرپوش
صافی سے چادر اپنی میں نے کی   اور کیا کرتے ہیں مفلس دردنوش
دوستوں کا درد دل ٹک گوش کر   گر نصیب دشمناں ہے دردگوش
جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میرؔ
ایک لوطی ہے وہ ظالم سرفروش

(۱۱۴۵)

طرح خوش ناز خوش اس کی ادا خوش   خوشا ہم جو نہ رکھے ہم کو ناخوش
نہیں ناساز فقر اپنا کسو کا   خرابے کی ہمارے ہے ہوا خوش
بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہوں   نہ راضی خلق مجھ سے نے خدا خوش
کلی رکتی ہے گل ہے دل پریشاں   کسو کی اس چمن میں گذرے کیا خوش
جہاں تنگ کڑھنے ہی کی جا تھی   کوئی دن میں تکلف سے رہا خوش
رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں   مری اس باغ میں گذری سدا خوش
گیا اس شہر ہی سے میرؔ آخر
تمھاری طرز بد سے کچھ نہ تھا خوش

(۱۱۴۶)

فکر میں مرگ کے ہوں سر درپیش   ہے عجب طور کا سفر درپیش
کس کی آنکھیں پھرے ہیں آنکھوں میں   دم بہ دم ہے مری نظر درپیش
مستی بھی اہل ہوش کی ہے جنھیں   آوے ہے عالم دگر درپیش
کیا کروں نقل راہ ہستی میں   مرحلے آئے کس قدر درپیش
کیا پتنگے کو شمع روئے میرؔ
اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

(۱۱۴۷)

ہوں تو دریا پہ کیا ترک خروش   دل کے دل ہی میں کھپائے اپنے جوش
مست رہتے ہیں ہم اپنے حال میں   عرض کریے حال پر یہ کس کے گوش
عاقبت تجھ کو لباس راہ راہ   لے گیا ہے راہ سے اے تنگ پوش
تو نہ آگے میرے جوں سوسن زباں   ہوسکے تو گل کے رنگوں رہیے گوش

میرؔ کو طفلان تہ بازار میں
دیکھو شاید ہو وہیں وہ دل فروش

ردیف ص

(۱۱۴۸)

ہے دل بے تاب کا بھی ویسا رقص
رقص بسمل تم سنو ہو جیسا رقص

ردیف ض

(۱۱۴۹)

آج رکھ آیا کمر میں پیش قبض
سو ہی کھینچی مجھ پہ گھر میں پیش قبض

ردیف ط

(۱۱۵۰)

شاید اس سادہ نے رکھا ہے خط — کہ ہمیں متصل لکھا ہے خط
شوق سے بات بڑھ گئی تھی بہت — دفتر اس کو لکھیں ہیں کیا ہے خط
نامہ کب یار نے پڑھا سارا — نہ کہا یہ بھی آشنا ہے خط
ساتھ ہم بھی گئے ہیں دور تلک — جب ادھر کے تئیں چلا ہے خط
کچھ خلل راہ میں ہوا اے میر
نامہ بر کب سے لے گیا ہے خط

(۱۱۵۱)

ہم نہ سمجھے رابطہ ان نوخطوں سے تھا غلط — ہوتے ہیں برخودغلط یہ ہوگیا یہ کیا غلط
کہتے ہو کیا کیا لکھا ہے خط میں مجھ کو میر نے
کب کہا کن نے یہ سب جھوٹ افترا بے جا غلط

ردیف ظ

(۱۱۵۲)

جو وہ ہے تو ہے زندگانی سے حظ — مزہ عمر کا ہے جوانی سے حظ

نہیں وہ تو سب کچھ یہ بے لطف ہے   نہ کھانے میں لذت نہ پانی سے حظ
کہا درد دل رات کیا میر نے
اٹھایا بہت اس کہانی سے حظ

ردیف ع

(۱۱۵۳)

آگے جب اس آتشیں رخسار کے آتی ہے شمع
پانی پانی شرم مفرط سے ہوئی جاتی ہے شمع

(۱۱۵۴)

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع   خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع
وجد میں رکھتا ہے اہل فہم کو   میرے شعر و شاعری کا استماع
نیم بسمل چھوڑ دینا رحم کر   اس شکار افگن کا ہے گا اختراع
کچھ ضرر عائد ہوا میری ہی اور   ورنہ اس سے سب کو پہنچا انتفاع
یار دشمن ہوگیا اس کے سبب   ہے متاع دوستی بھی کیا متاع
دل جگر خوں ہو کے رخصت ہوگئے   حسرت آلودہ ہے کیا اشک وداع
میر درد دل نہ کہہ ظالم بس اب
ہوگیا ہے سامعوں کو تو صداع

ردیف غ

(۱۱۵۵)

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ   سوز دل سے داغ ہے بالائے داغ
دل جلا آنکھیں جلیں جی جل گیا   عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ
دل جگر جل کر ہوئے ہیں دونوں ایک   درمیاں آیا ہے جب سے پائے داغ
منفعل ہیں لالہ و شمع و چراغ   ہم نے بھی کیا عاشقی میں کھائے داغ
وہ نہیں اب میر جو چھاتی جلے
کھا گیا سارے جگر کو ہائے داغ

(۱۱۵۶)

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ   تھا میر بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ

باتیں کرے برشتگی دل کی پر کہاں   کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ
دو حرف زیرلب کہے پھر ہوگیا خموش   یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ
کر فکر اپنی طاقت فکری جو ہو ضعیف   اب شعر و شاعری کی طرف کب لگا دماغ
آتش زبانی شمع نمط میر کی بہت
اب چاہیے معاف رکھیں جل گیا دماغ

ردیف ف

(۱۱۵۷)

کیا پیام و سلام ہے موقوف   رسم ظاہر تمام ہے موقوف
حیرت حسن یار سے چپ ہیں   سب سے حرف و کلام ہے موقوف
روز وعدہ ہے ملنے کا لیکن   صبح موقوف شام ہے موقوف
وہ نہیں ہے کہ داد لے چھوڑیں   اب ترحم پہ کام ہے موقوف
پیش مژگاں دھرے رہے خنجر   آگے زلفوں کے دام ہے موقوف
کہہ کے صاحب کبھو بلاتے تھے   سو وقار غلام ہے موقوف
اقتدا میر ہم سے کس کی ہوئی
اپنے ہاں اب امام ہے موقوف

ردیف ق

(۱۱۵۸)

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق   حق شناسوں کے ہاں خدا ہے عشق
دل لگا ہو تو جی جہاں سے اٹھا   موت کا نام پیار کا ہے عشق
اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل   عشق کے درد کی دوا ہے عشق
کیا ڈبایا محیط میں غم کے   ہم نے جانا تھا آشنا ہے عشق
عشق سے جا نہیں کوئی خالی   دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق
کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا   پردے میں زور آزما ہے عشق
عشق ہے عشق کرنے والوں کو   کیسا کیسا بہم کیا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا   آرزو عشق مدعا ہے عشق
میر مرنا پڑے ہے خوباں پر
عشق مت کر کہ بدبلا ہے عشق

(۱۱۵۹)

گر بادیے میں مجھ کو صبا لے کے جائے شوق — مجنوں کو میری اور سے کہیو دعائے شوق
وصل و جدائی سے ہے مبرا وہ کام جاں — معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق
ہر چار اور اڑتی پھرے ہے ہماری خاک — سر سے گئی نہ جی بھی گئے پر ہوائے شوق
دیر و حرم میں ہم کو پھراتا ہے دیر تک — پھر بھی ہمارے ساتھ وہی ہے ادائے شوق
افسوس ایسے کوچے سے تم آشنا نہیں — کیا دردناک نے بھی کوئی ہے نوائے شوق
درد اور آہ و نالہ کرے ہے دم سحر — یک مشت پر ہے مرغ گلستاں پہ ہائے شوق
کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہم کو میر
مرنا ہی اہل درد کا ہے انتہائے شوق

ردیف ک

(۱۱۶۰)

ہر چند صرف غم ہیں لے دل جگر سے جاں تک — لیکن کبھو شکایت آئی نہیں زباں تک
کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہے — شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک
دو چار دن جو ہوں تو رک رک کے کوئی کاٹے — ناچار صبر کرنا عاشق سے ہو کہاں تک
ان جلتی ہڈیوں کو شاید ہما نہ کھاوے — تب عشق کی ہمارے پہنچی ہے استخواں تک
روئے جہاں جہاں ہم جوں ابر میر اس بن
اب آب ہے سراسر جاوے نظر جہاں تک

ردیف گ

(۱۱۶۱)

قتل گہ میں دست بوس اس کا کریں فی الفور لوگ — ہم کھڑے تلواریں کھاویں نقش ماریں اور لوگ
کج روی ہم عاشقوں سے اس کی بس اب جا چکی — ایک تو ناساز پھر اس سے ملے بے طور لوگ
زخم تیغ یار غائر ہو کے پہنچا دل تلک — حیف میرے حال پر کرتے نہیں ٹک غور لوگ
جا کے دنیا سے تجھے یاد آؤں گا میں بھی بہت — بعد میرے کب اٹھاویں گے ترے یہ جور لوگ
رسم و عادت ہے کہ ہر یک وقت کا ہتا ہے ذکر
میر بارے یاد کر روویں گے کیا یہ دور لوگ

(۱۱۶۲)

چاک دل ہے انار کے سے رنگ
چشم پرخوں نگار کے سے رنگ

کام میں ہے ہوائے گل کی موج
تیغ خوں ریز یار کے سے رنگ

تاب ہی میں رہے ہے اس کی زلف
افعی پیچ دار کے سے رنگ

کیا جو افسردگی کے ساتھ کھلا
دل گل بے بہار کے سے رنگ

برق ابر بہار نے بھی لیے
اب دل بے قرار کے سے رنگ

کنج نخچیرگہ میں ہیں ماموں
ہم بھی لاغر شکار کے سے رنگ

عمر کا بھی سرنگ جاتا ہے
ابلق روزگار کے سے رنگ

برگ گل میں نہ دل کشی ہوگی
کف پائے نگار کے سے رنگ

اس بیاباں میں میرؔ محو ہوئے
ناتواں اک غبار کے سے رنگ

ردیف ل

(۱۱۶۳)

اب کے ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل
پر اس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل

بلبل کو ناز کیوں نہ خیابان گل پہ ہو
کیا جانے جن نے چھاتی پہ بھر کر نہ کھائے گل

کب تک حنائی پاؤں بن اس کے یہ بے کلی
لگ جائے تک چمن میں کہیں آنکھ پائے گل

ناچار ہو چمن میں نہ رہیے کہوں ہوں جب
بلبل کہے ہے اور کوئی دن برائے گل

چلیے بغل میں لے کے گلابی کسو طرف
دامان دل کو کھینچے ہے ساقی ہوائے گل

پگڑی میں پھول رکھتے ہیں رعنا جوان شہر
داغ جنوں ہی سر پہ رہا یاں بجائے گل

بلبل کو کیا سنے کوئی اڑ جاتے ہیں حواس
جب دردمند کہتی ہے دم بھر کے ہائے گل

سویا نہ وہ بدن کی نزاکت سے ساری رات
بستر پہ اس کے خواب کے کن نے بچھائے گل

مصروف یار چاہیے مرغ چمن سا ہو
دل نذر و دیدہ پیش کش و جاں فدائے گل

ہم طرح آشیاں کی نہ گلشن میں ڈالتے
معلوم ہوتی آگے جو ہم کو وفائے گل

چسپاں لباس ہوتے ہیں لیکن نہ اس قدر
ہے چاک رشک جامہ سے اس کے قبائے گل

کیا سمجھے لطف چہروں کے رنگ و بہار کا
بلبل نے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے گل

تھا وصف ان لبوں کا زبان قلم پہ میرؔ
یا منھ میں عندلیب کے تھے برگ ہائے گل

(۱۱۶۴)

نہ تنگ واشد ہوئی جب سے لگا دل / الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
نہ اس سے یاں تئیں آیا گیا حیف / رہے ہم جب تلک اس میں رہا دل
اٹھایا داغ لالہ نے چمن سے / کروں کیا دیکھتے ہی جل گیا دل
نہیں کم رایت اقبال شہ سے / علم اپنا یہ دنیا سے اٹھا دل
ہمارا خاص مشرب عشق اس میں / پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
ہمارے منھ پہ طفل اشک دوڑا / کیا ہے اس بھی لڑکے نے بڑا دل
سبھوں سے میر بیگانے سے رہتے
جو ہوتا اس سے کچھ بھی آشنا دل

(۱۱۶۵)

نہ خوشہ یاں نہ دانہ یاں جلانا گھاس کیا حاصل / ترا اے برق خاطف اس طرف گرنا ہے لاحاصل
سکندر ہو کے مالک سات اقلیموں کا آخر کو / گیا دست تہی لے یاں سے یہ کچھ کر گیا حاصل
بلا قحط مروت ہے کہ ہے محصول غلے پر / کہیں سے چار دانے لاؤ لیویں جابجا حاصل
نہ کھینچیں کیونکے نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعین کے / خودی سے کوئی نکلے تو اسے ہووے خدا حاصل
عبارت خوب لکھی شاعری انشاطرازی کی / و لے مطلب ہے گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل
بہت مصروف کشت و کار تھے مزرع میں دنیا کے / اٹھا حسرت سے ہاتھ آخر ہمیں یہ کچھ ہوا حاصل
پھرا مت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سنے کوئی تو کچھ کہیے بھی اس کہنے کا کیا حاصل

ردیف م

(۱۱۶۶)

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم / پر تنگ آگئے ہیں تمھارے ستم سے ہم
اپنے خیال ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر / پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم
زانو پہ سر ہے قامت خم گشتہ کے سبب / پیری میں اپنی آن لگے ہیں قدم سے ہم
جوں چکمہ میر حاج کا ہے خوار جانماز / بت خانے میں جو آئے ہیں چل کر حرم سے ہم
روتے بھی ان نے دیکھ کے ہم کو کیا نہ رحم / اک چشم داشت رکھتے تھے مژگان نم سے ہم
بدعہدیاں ہی کرتے گئے اس کو سال و ماہ / اب کب تسلی ہوتے ہیں قول و قسم سے ہم

زنار سا بندھا ہے گلے اپنے اب تو کفر   بدنام ہیں جہان میں عشق صنم سے ہم
لوگوں کے وصف کرنے سے بالیدگی ہوئی   جوں شیشہ پھیل پھوٹ پڑے ان کے دم سے ہم
طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم

(۱۱۶۷)

سرزیر پر ہیں دیر سے اے ہم صفیر ہم   واقف نہیں ہوائے چمن سے اسیر ہم
کیا ظلم تھے لباس میں اس تنگ پوش کے   دل تنگی سے نکل گئے ہو کر فقیر ہم
دیکھ اس کو راہ جاتے تو بے حال ہوگئے
ب دیکھیے بحال کب آتے ہیں میرؔ ہم

(۱۱۶۸)

جو رہے یوں ہی غم کے مارے ہم   تو بھی آج کل سدھارے ہم
مرتے رہتے تھے اس پہ یوں پر اب   جا لگے گور کے کنارے ہم
دن گذرتا ہے دم شماری میں   شب کو رہتے ہیں گنتے تارے ہم
بے مروت سے اپنی وحشت دور   انس رکھتے ہیں تم سے پیارے ہم
زندگی بار دوش آج ہے یاں   دیکھیں گے کل جو ہوں گے بارے ہم
جا چکی بازی یعنی مرتے ہیں   جیتے تم یہ قمار ہارے ہم
میرؔ آؤگے آپ میں بھی کبھو
سخت مشتاق ہیں تمھارے ہم

(۱۱۶۹)

گئے عشق کی راہ سر کر قدم   بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم
عجب راہ پرخوف و مشکل گذر   اٹھایا گیا ہم سے مر مر قدم
بہت مستی عشق پالغز تھی   خدا جانے پڑتا تھا کیدھر قدم
ہوا ہوگا خالی بدن جاں سے جب   چلے ہوں گے یہ راہ جو بھر قدم
وہ عیار یوں چشم تر سے گیا   کہ ہرگز نہ اس کا ہوا تر قدم
جگر کو ہے ان سر سے گذروں کے عشق   گئے جو ہمارے قدم بہ قدم
جو کچھ آوے سالک کے آگے ہے خیر   رکھا ہم نے اب گھر سے باہر قدم
ہمیں سرکشی سربلندی سے کیا   رہے ضعف میں ہم تو سر در قدم
کہیں کیا کف پا میں میرؔ آبلے
چلیں ہم سروں پر مگر دھر قدم

(۱۱۷۰)

میر آج وہ بدمست ہے ہشیار رہو تم
ہے بے خبری اس کو خبردار رہو تم

جی جائے کسی کا کہ رہے تم کو قسم ہے
مقدور تلک درپئے آزار رہو تم

وہ محو جمال اپنی ہی پروا نہیں اس کو
خواہاں رہو تم اب کہ طلب گار رہو تم

اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل
آئینہ نمط صورت دیوار رہو تم

یک بار ہوا دل کی تسلی کا وہ باعث
یہ کیا کہ اسی طور پہ ہر بار رہو تم

ہو لطف اسی کا تو کوئی کام کو پہنچے
تسبیح گلے ڈال کے زنار رہو تم

کیا میر بری چال سے جینے کی چلے ہے
بہتر ہے کہ اپنے تئیں اب مار رہو تم

(۱۱۷۱)

آ تک شتاب جاتے ہیں ورنہ جہاں سے ہم
کچھ ہو رہے ہیں غم میں ترے نیم جاں سے ہم

ہر بات کے جواب میں گالی کہاں تلک
اب جاں بہ لب ہوئے ہیں تمھاری زباں سے ہم

وعدہ کرو تو سوچ لو مدت کو دل میں بھی
یہ حال ہے تو دیر رہیں گے کہاں سے ہم

الجھاؤ دل کا جس سے ہے جھنجھلا کے اس بغیر
جھگڑا کیا کریں ہیں زمین آسماں سے ہم

لاویں ہماری خاک پر اس کینہ ور کو بھی
یہ کہہ مریں گے اپنے ہر اک مہرباں سے ہم

درباں سنگدل نے خبر واں تلک نہ کی
سر مار مار صبح کی اس آستاں سے ہم

جب اس کی تیغ رکھنے لگا اپنے پاس میر
امید قطع کی تھی تبھی اس جواں سے ہم

(۱۱۷۲)

بیماری دلی سے زار و نزار ہیں ہم
اک مشت استخواں ہیں پر اپنے بار ہیں ہم

مارا تڑپتے چھوڑا فتراک سے نہ باندھا
بے چشم و رو کسو کے شاید شکار ہیں ہم

ہر دم جبیں خراشی ہر آن سینہ کاوی
حیران عشق تو ہیں پر گرم کار ہیں ہم

حور و قصور و غلماں نہر و نعیم وجنت
یہ کلہم جہنم مشتاق یار ہیں ہم

بے حد و حصر گردش اپنی ہے عاشقی میں
رسوائے شہر و دیہ و دشت و دیار ہیں ہم

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشم تر سے
دیوار و در سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم

روتے ہیں یوں کہ جیسے شدت سے ابر برسے
کیا جانیے کہ کیسے دل کے بخار ہیں ہم

اب تو گلے بندھا ہے زنجیر و طوق ہونا
عشق و جنوں کے اپنے ناموس دار ہیں ہم

لیتا ہے میر عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا یار کی گلی میں بے اعتبار ہیں ہم

(۱۱۷۳)

ہر ہر سخن پہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم	ان بدمزاجیوں کو چھوڑوگے بھی کبھو تم
یاں آپھی آپ آکر گم آپ میں ہوئے ہو	پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جستجو تم
چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں	خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم
حیرت زدہ کسو کی یہ آنکھ سی لگے ہے	مت بیٹھو آرسی کے ہر لحظہ روبرو تم
تھے تم بھبھوکے سے ز اب جلا ہی دوہو	سوزندہ آگ کی کیا سیکھے ہو ساری خو تم
نسبت تو ہم دگر ہے گو دور کی ہو نسبت	ہم ہیں نوائے بلبل ہو گل کے رنگ و بو تم
دیکھ اشک سرخ بولا یہ رنگ اور لائے
ہیں میر منھ پہ آنسو یا روتے ہو لہو تم

ردیف ن

(۱۱۷۴)

ٹھنڈی سانسیں بھریں ہیں جلتے ہیں کیا تاب میں ہیں	دل کے پہلو سے ہم آتش میں ہیں او آب میں ہیں
ساتھ اپنے نہیں اسباب مساعد مطلق	ہم بھی کہنے کے تئیں عالم اسباب میں ہیں
غفلت دل سے ستم گذریں ہیں سو مت پوچھو	قافلے چلنے کو تیار ہیں ہم خواب میں ہیں
عشق کے ہیں گے جو سرگشتہ پڑے ہیں ڈوبے	کشتیاں نکلیں سو کیا آن کے گرداب میں ہیں
دور کیا اس سے جو بیٹھے ہے غبار اپنا دور	پاس اس طور کے بھی عشق کے آداب میں ہیں
ہے فروغ مہ تاباں سے فراغ کلی	دل جلے پرتو رخ سے ترے مہتاب میں ہیں
ہم بھی اس شہر میں ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب
میر گھر بار جنھوں کے رہ سیلاب میں ہیں

(۱۱۷۵)

کبھے تو ہم نشیں رنگ تصرف کچھ دکھاؤں میں	الگ بیٹھا حنا بندوں کو آنکھوں میں رچاؤں میں
نہیں ہوں بے ادب اتنا کہ گل سے منھ لگاؤں میں	جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے گر چمن کی اور جاؤں میں
کیا ہے اضطراب دل نے کیا مجھ کو سبک آخر	کہاں تک یار کے کوچے سے جا جا کر پھر آؤں میں
وفا صد کارواں رکھتا ہوں لیکن شہر خوبی میں	خریداری نہیں مطلق کہاں جا کر بکاؤں میں

مجھے سر در گریباں رہنے دو میں بے توقع ہوں — کسو پتھر سے پٹکوں ہوں ابھی سر جو اٹھاؤں میں
بلا حسرت ہے یارب کام دل کیونکر کروں حاصل — مگر لب ہائے شیریں پر کسو کے زہر کھاؤں میں
نہ روؤں حال پر کیونکر بلا ناآشنا ہے وہ — کہیں آنکھ اس کی ملتی ہے جو آنکھیں ٹک ملاؤں میں
نہ اے رشک بہار آنکھیں اٹھاوے پشت پا سے تو — ہتھیلی پر اگر سرسوں ترے آگے جماؤں میں
کہوں کیا صحبت اس سے ہر گھڑی بگڑی ہی جاتی ہے — جو ٹک راہ سخن نکلے تو سو باتیں بناؤں میں
نگاہ حسرت بت دیر سے جانے کی مانع ہے — مزاج اپنا بہت چاہا کہ سوے کعبہ لاؤں میں
اسیر زلف کو اس بت کے کیا قید مسلمانی — تمنا ہے گلا زنار سے اپنا بندھاؤں میں

کہوں ہوں میر سے دل وے کہیں تا جی لگے تیرا
جو ہو نقصان جاں اس کا تو کیونکر پھر مناؤں میں

(۱۱۷۶)

رو چکا خون جگر سب اب جگر میں خوں کہاں — غم سے پانی ہوکے کب کا بہ گیا میں ہوں کہاں
[illegible] و دامن جیب وآغوش اپنے اس لائق نہ تھے — پھول میں اس باغ خوبی سے جو لوں تو لوں کہاں
عاشق و معشوق یاں آخر فسانے ہوگئے — جاے گریہ ہے جہاں لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں
آگ بھڑکی تیرہ عالم ہوگیا جادو سے پر — اس کی چشم پرفسوں کے سامنے افسوں کہاں
سیر کی رنگیں بیاض باغ کی ہم نے بہت — سرو کا مصرع کہاں وہ قامت موزوں کہاں
کوچہ ہر یک جاے دلکش عالم خاکی میں ہے — پر کہیں لگتا نہیں جی ہائے میں دل دوں کہاں
ایک دم سے قیس کے جنگل بھرا رہتا تھا کیا — اب گئے پر اس کے ویسی رونق ہاموں کہاں
ناصح مشفق تو کہتا تھا کہ اس سے مت ملے — پر سمجھتا ہے ہمارا یہ دل محزوں کہاں
باؤ کے گھوڑے پہ تھے اس باغ کے ساکن سوار — اب کہاں فرہاد و شیریں خسرو گلگوں کہاں
کھا گیا اندوہ مجھ کو دوستان رفتہ کا — ڈھونڈتا ہے جی بہت پر اب انھیں پاؤں کہاں

تھا وہ فتنہ ملنے کی گوں کب کسی درویش کے
کیا کہیں ہم میر صاحب سے ہوئے مفتوں کہاں

(۱۱۷۷)

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں — سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں
ہر شب ہوں سرگشتہ و نالاں اس بن کوچہ و برزن میں — یاس نہیں ہے اب بھی دیکھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہم سے چھین لیا — ہم درویش طلب میں اس کی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
بے خود اس کی زلف و رخ کے کاہے کو آپ میں پھر آئے — ہم کہتے ہیں تسلی دل کو سانجھ سویرے پھرتے ہیں

نقش کسو کا درون سینہ گرم طلب ہیں ویسے رنگ — جیسی خیالی پاس لیے تصویر چتیرے پھرتے ہیں
برسے اگر شمشیر سروں پر منہ موڑیں زنہار نہیں — سیدھے جانے والے ادھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

پائے نگار آلودہ کہیں سانجھ کو میر نے دیکھے تھے
صبح تک اب بھی آنکھوں میں اس کی پاؤں تیرے پھرتے ہیں

(۱۱۷۸)

جمع ہوتے نہیں حواس کہیں — جائیں یاں سے جو ہم اداس کہیں
دل کی دو اشک سے نہ نکلی بھڑاس — ادھوں بجھتی نہیں ہے پیاس کہیں
بادِ خوشبو ہے آئی ہے واں سے — کوئی چھپتی ہے گل کی باس کہیں
اس جنوں میں کہیں ہے سر پر خاک — ٹکڑے ہو کر گرا لباس کہیں
گرد سر یار کے پھریں پہروں — ہم جو ہوں اس کے آس پاس کہیں
سب جگہ لوگ حق و ناحق پر — نہ ملا حیف حق شناس کہیں
ہر طرف ہیں امیدوار یار — اس سے کوئی نہیں نراس کہیں
عشق کا محو دشت شیریں ہوں — جان کا بھی نہیں ہراس کہیں

عرش تک تو خیال پہنچے میر
وہم پھر ہے کہیں قیاس کہیں

(۱۱۷۹)

جائیں تو جائیں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں — یار بن لگتا نہیں جی کاشکے ہم مر رہیں
دل جو اکتاتا ہے یارب رہ نہیں سکتے کہیں — کیا کریں جاویں کہاں گھر میں رہیں باہر رہیں
وہ نہیں جو تیغ سے اس کی گلا کٹوائیے — تنگ آئے ہیں بہت اب آپھی جو ہو کر رہیں
بے دماغی بےقراری بےکسی بے طاقتی — کیا جیے وہ جس کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں
مضطرب ہو ایک دو دم تو تدارک بھی ہو کچھ — متصل تڑپے ہے کب تک ہاتھ لے دل پر رہیں

زندگی دوبھر ہوئی ہے میر آخر تا کجا
دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں

(۱۱۸۰)

کہاں کے لوگ ہیں خوباں محبت ان کو نہیں — مریں بھی ہم تو نہ دیکھیں مروت ان کو نہیں
خراب و خوار ہے سلطاں شکستہ حال امیر — کسو فقیر سے شاید کہ صحبت ان کو نہیں
ہمارے دیدہ و دل سے ہی ہم پہ کام ہے تنگ — کہ رونے کڑھنے سے یک لحظہ فرصت ان کو نہیں

پری و سرو کو دعویٰ ہے اس رخ و قد سے
شکایت اس سے نہیں آدمیت ان کو نہیں

چلا ہے تیغ بکف یار غیر کی جانب
ہوئے ہیں میر تماشائی غیرت ان کو نہیں

(۱۱۸۱)

ظلم و ستم کیا جور و جفا کیا جو کچھ کہیے اٹھاتا ہوں
خفت کھینچ کے جاتا ہوں رہتا نہیں دل پھر آتا ہوں

گھر سے اٹھ کر لڑکوں میں بیٹھا بیت پڑھی دو باتیں کیں
کس کس طور سے اپنے دل کو اس بن میں بہلاتا ہوں

ہائے سبک ہونا یہ میرا فرط شوق سے مجلس میں
وہ تو نہیں سنتا دل دے کر میں ہی باتیں بناتا ہوں

قتل میں میرے یہ صحبت ہے غم غصے سے محبت کے
لوہو اپنا پیتا ہوں تلواریں اس کی کھاتا ہوں

آنے کی میری فرصت کتنی دو دم دو پل ایک گھڑی
رنجش کیوں کا ہے کو خشونت غصہ کیا ہے جاتا ہوں

سرمارول ہوں ایدھر اودھر دور تلک جاتا ہوں نکل
پاس نہیں پاتا جو اس کو کیا کیا میں گھبراتا ہوں

پھاڑ کے خط کو گلے میں ڈالا شہر میں سب تشہیر کیا
سامنے ہوں قاصد کے کیونکر اس سے میں شرماتا ہوں

پہلے فریب لطف سے اس کے کچھ نہ ہوا معلوم مجھے
اب جو چاہ نے بدلیں طرحیں کڑھتا ہوں پچھتاتا ہوں

مجرم اس خاطر ہوتا ہوں میں بعضی بعضی شوخی کر
عذر گناہ میں جا کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتا ہوں

دیکھے ان پلکوں کے اکثر میر ہوں بے خود تنگ آیا
آپ کو پاتا ہوں تو چھری اس وقت نہیں میں پاتا ہوں

(۱۱۸۲)

کبھو ملے ہے سو وہ یوں کہ پھر ملا نہ کریں
کرے ہے آپھی شکایت کہ ہم گلہ نہ کریں

ہوئی یہ چاہ میں مشکل کہ جی گیا ہوتا
نہ رہتے جیتے اگر ہم مساہلہ نہ کریں

ہمارے حرف پریشاں ہی لطف رکھتے ہیں
جنوں ہے بحث جو وحشت میں عاقلانہ کریں

صفائے دل جو ہوئی تک تو دیکھیں ہیں کیا کیا
ہم ایسے آئینے کو اپنے کیوں جلا نہ کریں

وبال میں نہ گرفتار ہوں کہیں مہ و مہر
خدا کرے ترے رخ سے مقابلہ نہ کریں

دل اب تو ہم سے ہے بدباز اگر رہے جیتے
کسو سے ہم بھی ولے پھر معاملہ نہ کریں

سخن کے ملک کا میں مستقل امیر ہوں میر
ہزار مدعی بھی مجھ کو دہ دلا نہ کریں

(۱۱۸۳)

شعر کچھ میں نے کہے بالوں کی اس کے یاد میں
سو غزل پڑھتے پھرے ہیں لوگ فیض آباد میں

سرخ آنکھیں خشم سے کیں ان نے مجھ پر صبح کو
دیکھی یہ تاثیر شب کی خوں چکاں فریاد میں

یہ تصرف عشق کا ہے سب وگرنہ ظرف کیا
ایک عالم غم سمایا خاطر ناشاد میں

عشق کی دیوانگی لائی ہمیں جنگل کی اور
ورنہ ہم پھرتے بگولے سے نہ خاک و باد میں

دیر لگتا ہے گلے تلوار پر وہ رکھ کے ہاتھ
خوبیاں بھی تو بہت ہیں اس ستم ایجاد میں

یہ بنا رہتی سی آتی ہے نظر کچھ یاں مجھے
اچھی ہے تعمیر دل کی اس خراب آباد میں

میر ہم جبہہ خراشوں سے کسو کا ذکر کیا
وے ہنر ہم میں ہیں جو تھے تیشۂ فرہاد میں

(۱۱۸۴)

درویشوں سے تو ان نے ضدیں نکالیاں ہیں
ایدھر سے ہیں دعائیں اودھر سے گالیاں ہیں

جبہے سے سینہ تک ہیں کیا کیا خراش ناخن
گویا کہ ہم نے منھ پر تلواریں کھالیاں ہیں

جب لگ گئے جھمکنے رخسار یار دونوں
تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں ہیں ہونٹوں کی لالیاں ہیں

درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں
دن اشک ریزیاں ہیں شب زار نالیاں ہیں

حیزوں نے ریختے کو دوں ریختی بنایا
جوں ان دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

اجماع بوالہوس کو رکھ رکھ لیا ہے آگے
مت جان ایسی بھیڑیں جی دینے والیاں ہیں

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

وہ دزد دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو
پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرا لیاں ہیں

اس آفتاب بن یاں اندھیر ہورہا ہے
دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں

چلتے ہیں یہ تو ٹھوکر لگتی ہے میر دل کو
چالیں ہی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

(۱۱۸۵)

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں

شمع ہی سر نہ دے گئی برباد
کشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں

ہم کو مجنوں کو عشق میں مت بوجھ
ننگ اس خانداں کے ہم بھی ہیں

جس چمن زار کا ہے تو گل تر
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں

نہیں مجنوں سے دل قوی لیکن
یار اس ناتواں کے ہم بھی ہیں

بوسہ مت دے کسو کے در پہ نسیم
خاک اس آستاں کے ہم بھی ہیں

گو شب اس در سے دور پہروں پھریں
پاس تو پاسباں کے ہم بھی ہیں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
مر گئے مر گئے نہیں تو نہیں　　خاک سے منہ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں
اپنا شیوہ نہیں کجی یوں تو　　یار جی ٹیڑھے بانکے ہم بھی ہیں
اس سرے کی ہے پارسائی میر
معتقد اس جواں کے ہم بھی ہیں

(۱۱۸۶)

نئی گردش ہے اس کی ہر زماں میں　　خلل سا ہے دماغ آسماں میں
ہوا تن ضعف سے ایسا کہے تو　　کہ اب جی ہی نہیں اس ناتواں میں
کہا میں درد دل یا آگ اگلی　　پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں
متاع حسن یوسف سی کہاں اب　　تجسس کرتے ہیں ہر کارواں میں
بلائے جاں ہے وہ لڑکا پری زاد　　اسی کا شور ہے پیر و جواں میں
بہت ناآشنا تھے لوگ یاں کے　　چلے ہم چار دن رہ کر جہاں میں
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میر
ملا دے چیں کر بجلی فغاں میں

(۱۱۸۷)

تیغ کی نوبت کب پہنچے ہے اپنے جی کی غارت میں　　عاشق زار کو مار رکھے ہے ایک ابرو کی اشارت میں
گذرے گر دل میں ہوکر تو ایک نگاہ ضروری ہے　　کچھ کچھ تیرے غم نے لکھا ہے آکر واں کی عمارت میں
سوکھ کے میں تو عشق کے غم میں خس کی مثال حقیر ہوا　　وہ تقصیر نہیں کرتا ہے اب تک میری حقارت میں
ایک بگولا ساتھ مجھے بھی تربت قیس پہ لے آیا　　کتنے غزال نظر واں آئے تھے مشغول زیارت میں
دل کا آگ اک دم میں دے دی اشک ہوئے چنگاری سے　　کیا ہی شریر ہے شوخی برق ملائی ان نے شرارت میں
شیخ جو تھا دیدار بتاں کا منکر ایسا تھا معذور　　دل کو بصیرت تھی نہ اس کے بے نوری تھی بصارت میں
خط و کتابت ایک طرف ہے دفتر لکھ لکھ بھیجے میر
کہیے کچھ جو صریر قلم کی کوتاہی ہو سفارت میں

(۱۱۸۸)

تری پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں　　یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں
رہے پھرتے دریا میں گرداب سے　　وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں
کہاں سے کہ مجنوں بھی ہم سا ہی تھا　　غلط کے شوائب نظر میں بھی ہیں

نہ بھولو نزاکت پلک ہی نہیں   چھپے خنجر اس کی کمر میں بھی ہیں
جھمک تیغ رخ کی سی اس کے کہاں   صفا و ضیا تو گہر میں بھی ہیں
دل و دلی دونوں اگر ہیں خراب   پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہیں
چلو میر کے تو تجسس کے بعد
کہ دے وحشی تو اپنے گھر میں بھی ہیں

(۱۱۸۹)

نہ کر شوق کشتوں سے جانے کی باتیں   نہیں آتیں کیا تجھ کو آنے کی باتیں
سماجت جو کی بوس لب پر تو بولا   نہیں خوب یہ مار کھانے کی باتیں
زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں   یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
نظر جب کرو زیر لب کچھ کہے ہے   کہو یار کے آستانے کی باتیں
سہی جائے گالی اگر دوستی ہو   بری بھی بھلی ہیں لگانے کی باتیں
ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے   چلی جاتی ہیں یہ سیانے کی باتیں
بگڑ بھی چکے یار سے ہم تو یارو   کرو کچھ اب اس سے بنانے کی باتیں
کیا سیر کل میں نے دیوان مجنوں   خوش آئیں بہت اس دوانے کی باتیں
بہت ہرزہ گوئی کی یاں میر صاحب
کرو واں کے کچھ منھ دکھانے کی باتیں

(۱۱۹۰)

کیا کروں سودائی اس کی زلف کی تدبیر میں   خلل ممدود چمن میں ہوں مگر زنجیر میں
گل تو مجھ حیران کی خاطر بہت کرتا ہے لیک   وا نہیں ہوتا برنگ غنچۂ تصویر میں
روبرو اس کے گئے خاموش ہوجاتا ہوں کچھ   کس سے اپنے چپکے رہنے کی کروں تقریر میں
تن بدن میں دل کی گرمی نے لگا رکھی ہے آگ   عشق کی تو ہے جوانی ہوگیا گو پیر میں
ہو اگر خونریز کا اپنے سبب تو کچھ کہو   وہ ستمگر ہے مقرر اور بےتقصیر میں
بے دماغی شور شب سے یار کو دونی ہوئی   دیکھی بس اس بے سرایت نالے کی تاثیر میں
کچھ نہیں پوچھا ہے مجھ سے جز حدیث روے یار
ہاتھ بلبل کے لگا ہوں باغ میں جب میر میں

(۱۱۹۱)

کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
ہم کنج قفس میں ہیں دل سینوں میں جلتے ہیں

اب ایک سی بیہوشی رہتی نہیں ہے ہم کو
کچھ دل بھی سنبھلتے ہیں پر دیر سنبھلتے ہیں

وہ تو نہیں اک چھینٹا رونے کا ہوا گاہے
اب دیدۂ تر اکثر دریا سے ابلتے ہیں

ان پاؤں کو آنکھوں سے ہم ملتے رہے جیسا
افسوس سے ہاتھوں کو اب ویسا ہی ملتے ہیں

کیا کہیے کہ اعضا سب پانی ہوئے ہیں اپنے
ہم آتش ہجراں میں یوں ہی پڑے گلتے ہیں

کرتے ہیں صفت جب ہم لعل لب جاناں کی
تب کوئی ہمیں دیکھے کیا لعل اگلتے ہیں

گل پھول سے بھی اپنے دل تو نہیں لگتے ٹک
جی لوگوں کے بے جاناں کس طور بہلتے ہیں

ہیں نرم صنم گو نہ کہنے کے تئیں ورنہ
پتھر ہیں انھوں کے دل کاہے کو پگھلتے ہیں

اے گرم سفر یاراں جو ہے سو سر رہ ہے
جو رہ سکو رہ جاؤ اب میر بھی چلتے ہیں

(۱۱۹۲)

دل عجب جنس گراں قدر ہے بازار نہیں
وے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں

کچھ تمھیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

ایک دو بات کبھو ہم سے کہو یا نہ کہو
قدر کیا اپنی ہمیں اس لیے تکرار نہیں

ناز و انداز و ادا عشوہ و اغماض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں

صورت آئینے میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے
بدزبانی تجھے اس منھ پہ سزاوار نہیں

دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

اس کے کاکل کی پہیلی کہو تم بوجھے میر
کیا ہے زنجیر نہیں دام نہیں مار نہیں

(۱۱۹۳)

چمکنا برق کا کرتا ہے کار تیغ ہجراں میں
برسنا مینھ کا داخل ہے اس بن تیر باراں میں

بھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں

کبھی شام و سحر رویا تھا مجنوں عشق لیلیٰ میں
ہنوز آشوب دونوں وقت رہتا ہے بیاباں میں

خیال یار میں آگے ہے یک مہ پارہ یاں ہر دم
اگر ہجراں میں زندانی ہوں پر ہوں یوسفستاں میں

رکھا عرصہ جنوں پر تنگ مشتاقوں کی دوری سے
کسے مارا ہے اس گھتیے نے سنمکھ ہو کے میداں میں

جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

جو دیکھو تو نہیں یہ حال اپنا حسن سے خالی — دمک الماس کی سی ہے ہماری چشم حیراں میں
خرابی آگئی دینوں میں ملت گئی اسے دیکھے — ملے سے اس کے رخنے پڑ گئے لوگوں کے ایماں میں
نکل آتا ہے گھر سے ہر گھڑی ننگے بدن باہر — برا یہ آپڑا ہے عیب اس آسائش جاں میں
ستم کے تیر اس کے میرے سینے میں بہت ٹوٹے — کیا جاتا ہے مشکل فرق اب دل اور پیکاں میں

ہوا ابر میں کیا میر ہنستا باغ میں وہ تھا
گری پڑتی ہے بجلی آج کچھ صحن گلستاں میں

(۱۱۹۴)

تھا شوق مجھے طالب دیدار ہوا میں — سو آئینہ سا صورت دیوار ہوا میں
جب دور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز — کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں
اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں — پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں
کب ناز سے شمشیر ستم ان نے نہ کھینچی — کب ذوق سے مرنے کو نہ تیار ہوا میں
بازار وفا میں سر سودا تھا سبھوں کو — پر بیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں
ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آواز — تھی رنگی سی مجھ کو گرفتار ہوا میں
کیا چیتنے کا فائدہ جو شیب میں چیتا — سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں
تم اپنی کہو عشق میں کیا پوچھو ہو میری — عزت گئی رسوائی ہوئی خوار ہوا میں
اس نرگس مستانہ کو دیکھے ہوئے برسوں — افراط سے اندوہ کی بیمار ہوا میں

رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میر
اس جان کے دشمن سے بھلا یار ہوا میں

(۱۱۹۵)

جلا ازبس تمھارے طور سے اے جامہ زیباں ہوں — بھروسا کیا ہے میرا میں چراغ زیر داماں ہوں
سر حرف و سخن کس کو خیال زلف میں اس کے — تنک میں جو بکھر جاتا ہوں میں خاطر پریشاں ہوں
کہن سالی میں شاہد بازیاں کاہے کو زیبا تھیں — دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں
کبھو خورشید و مہ کو دیکھ رہتا ہوں کبھو گل کو — مرے انداز سے ظاہر ہے میں اس رو کا حیراں ہوں
کسو کی یاد رو میں اشک آنکھوں سے نہیں تھمتے — برنگ ابر قبلہ آج میں شدت سے گریاں ہوں
بکا جب تک نہیں کرتا ہوں تب تک خیر ہے ورنہ — بلا ہوں فتنہ ہوں آشوب ہوں آفت ہوں طوفاں ہوں

بحال سگ پھرا کب تک کروں یوں اس کے کوچے میں
خجالت کھینچتا ہوں میر آخر میں بھی انساں ہوں

(۱۱۹۶)

عشق وہ خانماں خراب ہے میاں　　جس سے دل آگ و چشم آب ہے میاں
تن میں جب تک ہے جاں تکلف ہے　　ہم میں اس میں ابھی حجاب ہے میاں
گو نہیں میں کسو شمار میں یاں　　عاقبت ایک دن حساب ہے میاں
کو دماغ و جگر کہاں وہ قلب　　یاں عجب ایک انقلاب ہے میاں
زلف بل کھا رہی ہے گو اس کی　　دل کو اپنے تو پیچ و تاب ہے میاں
لطف و مہر و وفا وہ کیا جانے　　ناز ہے خشم ہے عتاب ہے میاں
لوہو اپنا پیوں ہوں چپکا ہوں　　کس کو اس بن سر شراب ہے میاں
چشم وا یاں کی چشم بسمل ہے　　جاگنا یہ نہیں ہے خواب ہے میاں
منھ سے کچھ بولتا نہیں قاصد　　شاید اودھر سے اب جواب ہے میاں
دل ہی اپنا نہیں فقط بے چین　　جی کو بھی زور اضطراب ہے میاں
چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میر کا کتاب ہے میاں

(۱۱۹۷)

گرفتہ دل ہوں سر ارتباط مجھ کو نہیں　　کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجھ کو نہیں
جہاں ہو تیغ بکف کوئی سادہ جا لگنا　　اب اپنی جان کا کچھ احتیاط مجھ کو نہیں
کرے گا کون قیامت کو ریسماں بازی　　دل و دماغ گذار صراط مجھ کو نہیں
جسے ہو مرگ سا پیش استحالہ کیوں نہ کڑھے　　اس اپنے جینے سے کچھ انبساط مجھ کو نہیں
ہوا ہوں فرط اذیت سے میں تو سن اے میر
تمیز رنج و خیال نشاط مجھ کو نہیں

(۱۱۹۸)

جوش غم اٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہے میاں　　خاک سی منھ پر مرے اس وقت اڑ جاتی ہے میاں
پڑ گئے سوراخ دل کے غم میں سینے کوٹتے　　سل تو پتھر کی نہیں آخر مری چھاتی ہے میاں
میں حیا والا ہوا رسوائے عالم عشق میں　　آنکھ میری اس سبب لوگوں سے شرماتی ہے میاں
رشک اس کے چہرۂ پرنور کا ہے جاں گداز　　شمع مجلس میں کھڑی اپنے تئیں کھاتی ہے میاں
آگ غیرت سے قفس کو دوں ہوں چاروں اور سے　　ایک دو گلبرگ جب باد سحر لاتی ہے میاں
ہے حزیں نالیدن اس کا نغمۂ طنبور سا　　خوش نوا مرغ گلستاں رند باغاتی ہے میاں

کیا کہوں منھ تک جگر آتا ہے جب رکتا ہے دل　　جان میری تن میں کیسی کیسی گھبراتی ہے میاں
اس کے ابروے کشیدہ خم ہی رہتے ہیں سدا　　یہ کجی اس تیغ کی تو جوہر ذاتی ہے میاں
گات اس اوباش کی لیں کیونکے بر میں میر ہم
ایک جھرمٹ شال کا اک شال کی گاتی ہے میاں

(۱۱۹۹)

چنگاریاں گرے ہیں جب پلکیں بلتیاں ہیں　　رونے سے تب تو میری کچھ آنکھیں جلتیاں ہیں
آنکھیں ملا کے اس سے تک دیکھو حال دل کا　　وے انکھڑیاں جیوں کو اپنے تو ملتیاں ہیں
ہم تو بھی فصل گل میں چل تک تو پاس بیٹھیں　　سر جوڑ جوڑ کیسی کلیاں نکلتیاں ہیں
مذکور دخت رز کا کیا شیخ رہگذر میں　　اس سے ابھی ہماری باتیں ہی چلتیاں ہیں
دیکھیں تو میر کیا ہو بے طاقتی سے حالت
اب دیر دیر جانیں اپنی سنبھلتیاں ہیں

(۱۲۰۰)

بہار آئی کھلے گل پھول شاید باغ و صحرا میں　　جھلک سی مارتی ہے کچھ سیاہی داغ سودا میں
نفاق مرداں عاجز سے ہے زعم تکبر پر　　کہوں کیا اتفاق ایسا بھی ہوجاتا ہے دنیا میں
نموداری ہماری بے کلی سے ایک چشمک ہے　　ٹھہرنا برق سا اپنا ہے ہوچکنا اسی جا میں
سخن دس پانچ یاں ہیں جمع کس حسن لطافت سے　　تفاوت ہے مرے مجموعہ و عقد ثریا میں
کنواں دیکھا نہ کوئی غار میں نے شوق کے مارے　　بعینہ راہ اندھا سا چلا اس کی تمنا میں
بہت تھا شور وحشت سر میں میرے سوچ نے تیری　　لکھی تصویر تو زنجیر پہلے کھینچ لی پا میں
جدائی کے تعب کھینچے نہیں ہیں میر راضی ہوں
جلادیں آگ میں یا مجھ کو پھینکیں قعر دریا میں

(۱۲۰۱)

شہروں ملکوں میں جو یہ میر کہاتا ہے میاں　　دیدنی ہے پہ بہت کم نظر آتا ہے میاں
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصور بے مثل　　ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں
قسمت اس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی　　دے ہے مے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں
ہوکے عاشق ترے جان و دل و دیں کھو بیٹھے　　جیسا کرتا ہے کوئی ویسا ہی پاتا ہے میاں
حسن یک چیز ہے ہم ہوویں کہ تو ہو ناصح　　ایسی شے سے کوئی بھی ہاتھ اٹھاتا ہے میاں
جھمکو اس حادثے کا کوہ گراں سنگ کو بھی　　جوں پر کاہ اڑائے لیے جاتا ہے میاں
کیا پری خواں ہے جو راتوں کو جگاوے ہے میر
شام سے دل جگر و جان جلاتا ہے میاں

(۱۲۰۲)

جائے ہے جی نجات کے غم میں   ایسی جنت گئی جہنم میں
نزع میں میرے ایک دم ٹھہرو   دم ابھی ہیں ہزار اک دم میں
نعل ہم چھاتیوں پہ جڑ کے پھرے   اپنے خوں گشتہ دل کے ماتم میں
ہے بہت جیب چاکی ہی جوں صبح   کیا کیا جائے فرصت کم میں
پر کے تھی بے کلی قفس میں بہت   دیکھیے اب کے گل کے موسم میں
آپ میں ہم نہیں تو کیا ہے عجب   دور اس سے رہا ہے کیا ہم میں
بے خودی پر نہ میرؔ کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

(۱۲۰۳)

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں   دل کلیجا نکال لیتے ہیں
کیا نظرگاہ ہے کہ شرم سے گل   سر گریباں میں ڈال لیتے ہیں
دیکھ اسے ہو ملک سے بھی لغزش   ہم تو دل کو سنبھال لیتے ہیں
کھول کر بال سادہ رو لڑکے   خلق کا کیوں وبال لیتے ہیں
تیغ کھینچے ہیں جب یہ خوش ظاہر   ماہ و خور منہ پہ ڈھال لیتے ہیں
دلبراں نقد دل کو عاشق کے   جان کر اپنا مال لیتے ہیں
ہیں گدا میرؔ بھی ولے دو جہاں
کرکے اک ہی سوال لیتے ہیں

(۱۲۰۴)

دور اس سے جی چکے ہیں ہم اس روزگار میں   دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں
داغوں سے بھر گیا ہے مرا سینۂ فگار   گل پھول زور زور کھلے اس بہار میں
کیا اعتبار طائر دل کی تڑپ کا اب   مذبوحی سی ہے کچھ حرکت اس شکار میں
بوسہ لبوں کا مانگتے ہی تم بگڑ گئے   بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص پیار میں
دل پھر کے ہم سے خانۂ زنجیر کے قریب   ٹک پہنچتا ہی ہے شکن زلف یار میں
اس بحر حسن پاس نہ خنجر تھا کل نہ تیغ   میں جان دی ہے حسرت بوس و کنار میں
چلتا ہے ٹک تو دیکھ کے چل پاؤں ہر نفس   آنکھیں ہی بچھ گئی ہیں ترے رہگذار میں
کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے   سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں
تڑپے ہے متصل وہ کہاں ایسے روز و شب
ہے فرق میرؔ برق و دل بے قرار میں

(۱۲۰۵)

کیسی وفا و الفت کھاتے عبث ہو قسمیں — مدت ہوئی اٹھا دیں تم نے یہ ساری رسمیں
ساون تو اب کے ایسا برسا نہیں جو کہیے — روتا رہا ہوں میں ہی دن رات اس برس میں
گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے — جیسے اسیر تازہ بیتاب ہو قفس میں
جانکاہ ایسے نالے لوہے سے تو نہ ہوویں — بیتاب دل کسو کا رکھا ہے کیا جرس میں
اب لاغری سے دیں ہیں ساری رگیں دکھائی — پر عشق بھر رہا ہے ایک ایک میری نس میں
اے ابر ہم بھی برسوں روتے پھرا کیے ہیں — دریا بندھے پڑے ہیں وادی کے خار و خس میں
کیا میرؔ بس کرے ہے اب زاری آہ شب کی
دل آگیا ہے اس کا ظالم کسو کے بس میں

(۱۲۰۶)

روتے ہیں نالکش ہیں یا رات دن جلے ہیں — ہجراں میں اس کے ہم کو بہتیرے مشغلے ہیں
جوں دود عمر گذری سب پیچ و تاب ہی میں — اتنا ستا نہ ظالم ہم بھی جلے بلے ہیں
مرنا ہے خاک ہونا ہو خاک اڑتے پھرنا — اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں
کس دن چمن میں یارب ہوگی صبا گل افشاں — کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں
جب یاد آگئے ہیں پاے حنائی اس کے — افسوس سے تب اپنے ہم ہاتھ ہی ملے ہیں
تھا جو مزاج اپنا سو تو کہاں رہا ہے — پر نسبت اگلی تو بھی ہم ان دنوں بھلے ہیں
کچھ وہ جو کھنچ رہا ہے ہم کانپتے ہیں ڈر سے — یاں جوں کمان گھر میں ہر وقت زلزلے ہیں
اک شور ہی رہا ہے دیوان پن میں اپنے — زنجیر سے ہلے ہیں گر کچھ بھی ہم ہلے ہیں
پست و بلند دیکھیں کیا میرؔ پیش آئے
اس دشت سے ہم اب تو سیلاب سے چلے ہیں

(۱۲۰۷)

شرر سے اشک ہیں اب چشم تر میں — لگی ہے آگ اک میرے جگر میں
نگین عاشق و معشوق کے رنگ — جدا رہتے ہیں ہم دے ایک گھر میں
بلا ہنگامہ تھا کل اس کے در پر — قیامت گم ہوئی اس شور و شر میں
بگولے کی روش وحشت زدہ ہم — رہے برچیدہ دامن اس سفر میں
سماں یاں سانجھ کا سا ہو نہ جاتا — اثر ہوتا اگر آہ سحر میں
لچکنے ہی نے ہم کو مار رکھا — کٹاری تو نہ تھی اس کی کمر میں
رہا تھا دیکھ اودھر میرؔ چلتے
عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

(۱۲۰۸)

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں — لگ اٹھتی آگ سب بڑ سا میں

نہ اٹکا ہائے تک یوسف کا مالک — وگرنہ مصر سب ملتا بہا میں

قصور اپنے ہی طول عمر کا تھا — نہ کی تقصیر ان نے تو جفا میں

سخن مشتاق ہیں بندے کے سب لوگ — سر و دل کس کو ہے عشق خدا میں

کفن کیا عشق میں میں نے ہی پہنا — کھنچے لوہو میں بہتیروں کے جامیں

پیام اس گل کو اس کے ہاتھ دیتے — سبک پائی نہ ہوتی گر صبا میں

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا — ہم اپنے محو ہیں ذوق فنا میں

ہمیں فرہاد و مجنوں جس سے چاہو — تم آکر پوچھ لو شہر وفا میں

سراپا ہی ادا و ناز ہے یار — قیامت آتی ہے اس کی ادا میں

بلا زلف سیاہ اس کی ہے پرپیچ — وطن دل نے کیا ہے کس بلا میں

ضعیف و زار تنگی سے ہیں ہرچند
ولیکن میرؔ اڑتے ہیں ہوا میں

(۱۲۰۹)

نچیں جیسے عاشق اگر دست پائیں — خدا کہ نہ دے ان کو جو سر کھجائیں

جھمکنے لگا خوں تو جائے سرشک — ابھی دیکھیں آنکھیں ہمیں کیا دکھائیں

رہیں کس کو سانسے کہ اب ضعف سے — مرا جی ہی کرنے لگا سائیں سائیں

خدا ساز تھا آزر بت تراش — ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

چلا یار کی اور جاتا ہے جی — جو ہو اختیاری تو اودھر نہ جائیں

جگر سوز ہیں اس کے لعل خموش — طلب کریے بوسہ تو باتیں بنائیں

ہمیں بے نیازی نے بھلا دیا — کہاں اتنی طاقت کہ منت اٹھائیں

کبھی دیکھے وہ بید مجنوں کہ ہم — فراموش کار اپنے کو تا دکھائیں

کبھی میرؔ عشق مجازی ہے بد
حقیقت ہو معلوم گر دل لگائیں

(۱۲۱۰)

اب کے ماہ رمضاں دیکھا تھا پیمانے میں — بارے سب روزے تو گذرے مجھے میخانے میں

جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی سدھ جائے — بے خودی آئی اچانک ترے آجانے میں

وہ تو بالیں تئیں آیا تھا ہماری لیکن
سدھ بھی کچھ ہم کو نہ تھی جانے کے گھبرانے میں

آج سنتے ہیں کہ فردا وہ قدآرا ہوگا
دیر کچھ اتنی قیامت کے نہیں آنے میں

حق جو چاہے تو بندھی مٹھی چلا جاؤں میر
مصلحت دیکھی نہ میں ہاتھ کے پھیلانے میں

(۱۲۱۱)

میں نالہ کش تھا صبح کو یادِ حبیب میں
سوراخ پڑ گئے جگر عندلیب میں

سر مارتے ہیں سنگ سے فرہاد کے سے رنگ
دیکھیں تو ہم بھی کیا ہے ہمارے نصیب میں

جانے کو سوے دوست مسافر ہوئے ہیں ہم
ڈر ہر قدم ہے عشق کی راہ غریب میں

کیا رفتگاں کے ہاتھ سے ہو کتنے ان کے پاؤں
اکثر جنھوں کا ہاتھ ہے دست طبیب میں

دل خستہ چشم بستہ و رو زرد تس پہ گرد
حیرت ہے ہم کو میر کے حال عجیب میں

(۱۲۱۲)

افسوں ہی کے تو دل شدہ ہم روسیاہ ہیں
ہو تخت کچھ دماغ تو ہم پادشاہ ہیں

یاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال
ہم دل کباب پردے میں سرگرم راہ ہیں

کہنا نہ کچھ کبھو کھڑے حسرت سے دیکھنا
ہم کشتنی ہیں واقعی گر بے گناہ ہیں

گہ مہرباں ہوں دور سے گہ آنکھیں پھیر لیں
معشوق آفتاب ہیں عشاق ماہ ہیں

آنکھیں ہماری پاؤں تلے کیوں نہ وہ ملے
ہم بھی تو میر کشتۂ طرز نگاہ ہیں

(۱۲۱۳)

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

کہنے لگا کہ لب سے ترے لعل خوب ہے
اس رنگ ڈھنگ سے تو ہمارا سخن نہیں

پہنچا نہ ہوگا منزل مقصود کے تئیں
خاک رہ اس کی جس کا عبیر کفن نہیں

ہم کو خرام ناز سے مت خاک میں ملا
دل سے ہے جن کو راہ یہ ان کا چلن نہیں

گل کام آوے ہے ترے منھ کے نثار کے
صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

کل جا کے ہم نے میر کے ہاں یہ سنا جواب
مدت ہوئی کہ یاں تو وہ غربت وطن نہیں

(۱۲۱۴)

ہجر تاچند ہم اب وصل طلب کرتے ہیں
لگ گیا ڈھب تو اسی شوخ سے ڈھب کرتے ہیں

روز اک ظلم نیا کرتے ہیں یہ دلبر اور
روز کہتے ہیں ستم ترک ہم اب کرتے ہیں

لاگ ہے جی کے تئیں اپنے اسی یار سے ایک
اور سب یاروں کا ہم لوگ تو سب کرتے ہیں

تم کبھو میرؔ کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمھیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

ہوں جو بے حال اس اعجوبۂ عالم کے لیے
حال سن سن کے مرا لوگ عجب کرتے ہیں

میرؔ سے بحث یہ تھی کچھ جو نہ تھے حرف شناس
اب سخن کرتے ہیں کوئی تو غضب کرتے ہیں

(۱۲۱۵)

مدت ہوئی کہ کوئی نہ آیا ادھر سے یاں
جاتی رہے گی جان اسی رہگذر سے یاں

وہ آپ چل کے آوے تو شاید کہ جی رہے
ہوتی نہیں تسلی دل اب خبر سے یاں

پوچھے کوئی تو سینہ خراشی دکھایئے
سو تو نہیں ہے حرف و حکایت ہنر سے یاں

آگے تو اشک پانی سے آجاتے تھے کبھو
اب آگ ہی نکلنے لگی ہے جگر سے یاں

ٹپکا کریں ہیں پلکوں سے بے فاصلہ سرشک
برسات کی ہوا ہے سدا چشم تر سے یاں

اے بت گرسنہ چشم ہیں مردم نہ ان سے مل
دیکھیں ہیں ہم نے پھوٹتے پتھر نظر سے یاں

راہ و روش کا ہووے ٹھکانہ تو کچھ کہیں
کیا جانے میرؔ آگئے تھے کل کدھر سے یاں

(۱۲۱۶)

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے وہ تو کچھ کہوں
بیٹھا خموش سامنے ہوں ہوں کروں ہوں میں

اس بن نظر زمین سے سی دی ہے تو کبھے
کاہے کو چشم جانب گردوں کروں ہوں میں

اٹھتا ہے بے دماغ ہی ہرچند رات کو
افسانہ کہتے سینکڑوں افسوں کروں ہوں میں

کب بے دماغی شہر سے دیتی ہے اٹھنے میرؔ
یوں تو خیال وادی مجنوں کروں ہوں میں

(۱۲۱۷)

تاچند وہ ستم کرے ہم درگذر کریں
اب جی میں ہے کہ شہر سے اس کے سفر کریں

بے رو سے ایسی بات کے کرنے کا لطف کیا — وہ منھ کو پھیر پھیر لے ہم حرف سر کریں
کب تک ہم انتظار میں ہر لحظہ بےقرار — گھر سے نکل نکل کے گلی میں نظر کریں
فرہاد و قیس کوہکن و دشت گرد تھے — منھ نوچیں چھاتی کوٹیں یہی ہم ہنر کریں
سختی مسلم اس سے جدا رہنے میں ولے — سر سنگ سے نہ ماریں تو کیوں کر بسر کریں
وہ تو نہیں کہ دیکھیں اس آئینہ رو کو صبح — ہم کس امید پر شب غم کو سحر کریں

لاویں کہاں سے خون دل اتنا کہ میر ہم
جس وقت بات کرنے لگیں چشم تر کریں

(۱۲۱۸)

تکیے میں اپنے دل کا ہم غم کیا کریں ہیں — درویش کتنے ماتم باہم کیا کریں ہیں
جب نام دل کا کوئی لے بیٹھتا ہے ناگہ — منھ دیکھ ہم دگر کا ماتم کیا کریں ہیں
مستوں کی بات کیا ہے جو کوئی اس پہ جاوے — ہم گفتگو نشے میں درہم کیا کریں ہیں
حکم فسانہ سازی پیدا کریں ہیں شب کو — افسوں ہم اس کے اوپر جو دم کیا کریں ہیں

کچھ چال میر جی کی آتی نہیں سمجھ میں
ہم بھی سلوک ان سے اب کم کیا کریں ہیں

ردیف و

(۱۲۱۹)

قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو — جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو
جان سلامت لےکر جاوے کعبہ میں تو سلام کریں — ایک جراحت ان ہاتھوں کا صید حرم کو کھانے دو
اس کی گلی کی خاک سبھوں کے دامن دل کو کھینچے ہے — ایک اگر جی لے بھی گیا تو آتے ہیں مر جانے دو
کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی مروت ہے — برسوں سے پھرتے ہیں جدا ہم آنکھ سے آنکھ ملانے دو
کیاکیا اپنے لوہوپئیں گے دم میں مریں گے دم میں جئیں گے — دل جو بغل میں رہ نہیں سکتا اس کو کسو سے بکانے دو
اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو — دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو
عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجاویں — پاؤں تو ہم پھیلاویں گے پر فرصت ہم کو پانے دو
کیا جاتا ہے اس میں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں — دل جو سمجھتا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو
ضعف بہت ہے میر تمھیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ — صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

(۱۲۲۰)

گردش میں وے مست آنکھیں ہیں جیسے بھرے پیمانے دو
دانت سنا ہے جھمکیں ہیں اس کے موتی کے سے دانے دو

خوب نہیں اے شمع کی غیرت ساتھ رہیں بیگانے دو
کب فرمان پہ تیرے ہوئے یہ بازو کے پروانے دو

ایسے بہانہ طلب سے ہم بھی روز گذاری کرتے ہیں
کب وعدے کی شب آئی جو ان نے کیے نہ بہانے دو

تیر ستم اس دشمن جاں کا تا دو کماں پر ہو نہ کہیں
دل سے اور جگر سے اپنے ہم نے رکھیں ہیں نشانے دو

کس کو دماغ رہا ہے یاں اب ضدیں اس کی اٹھانے کا
چار پہر جب منت کریے تب وہ باتیں مانے دو

غم کھاویں یا غصہ کھاویں یوں اوقات گذرتی ہے
قسمت میں کیا خستہ دلوں کی یہ ہی لکھے تھے کھانے دو

خال سیاہ و خط سیاہ ایمان و دل کے رہزن تھے
اک مدت میں ہم نے بارے چوٹھے یہ پہچانے دو

عشق کی صنعت مت پوچھو جوں نیچے بھووں کے چشم بتاں
دیکھیں جہاں محرابیں ان نے طرح کیے میخانے دو

رونے سے تو پھوٹیں آنکھیں دل کو غموں نے خراب کیا
دیکھنے قابل اس کے ہوئے ہیں اب تو یہ ویرانے دو

دشت و کوہ میں میر پھرو تم لیکن ایک ادب کے ساتھ
کوہکن و مجنوں بھی تھے اس ناحیے میں دیوانے دو

(۱۲۲۱)

دوست رکھتا ہوں بہت اپنے دل بیمار کو
خوں کیا ہے مدتوں اس میں غم بسیار کو

جز عزیز از جاں نہیں یوسف کو لکھتا یہ کبھو
کیا غرور میرزائی ہے ہمارے یار کو

جب کبھو ادھر سے نکلے ہے تو اک حسرت کے ساتھ
دیکھے ہے خورشید اس کے سایۂ دیوار کو

بوجھ تو اچھا تھا پر آخر گرو رکھتے ہوئے
وجہ جام مے نہ پایا خرقہ و دستار کو

خوں چکاں شکوے ہیں دل سے تا زباں میری و لے
سی لیا ہے تو کبھو میں نے لب اظہار کو

تصفیے سے دل میں میرے منھ نظر آتا ہے لیک
کیا کروں آئینہ ساں میں حسرت دیدار کو

عاشقی وہ روگ ہے جس میں کہ ہو جاتی ہے یاس
اچھے ہوتے کم سنا ہے میر اس آزار کو

(۱۲۲۲)

تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
یہ کیا روش ہے آؤ چلے تک ادھر کبھو

دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک اب تو تر کبھو

جی جانے ہے جو اپنے پہ ہوتی ہے مار مار
جاتے ہیں اس گلی میں کہاں ہم مگر کبھو

آنکھیں سفید ہو چلی ہیں راہ دیکھتے
یارب انھوں کا ہوگا ادھر بھی گذر کبھو

مدت ہوئی ہے نامہ کبوتر کو لے گئے
آجاتی ہے کچھ اڑتی سی ہم تک خبر کبھو

ہم جستجو میں ان کی کیے دست و پا بھی گم
افسوس ہے کہ آئے نہ وہ راہ پر کبھو

غم کو تمھارے دل کے نہایت نہیں ہے میرؔ
اس قصے کو کروگے بھی تم مختصر کبھو

(۱۲۲۳)

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کردی ہے خبر تم کو خبردار رہو

آپ تو ایسے بنے اب کہ جلے جی سب کا
ہم کو کہتے ہیں کہ تم جی کے تئیں مار رہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو

گرچہ وہ گوہر تر ہاتھ نہیں لگتا لیک
دم میں دم جب تئیں ہے اس کے طلبگار رہو

سارے بازار جہاں کا ہے یہی مول اے میرؔ
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو

(۱۲۲۴)

کرتا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو
بے وقر جانتے ہیں دل بے گداز کو

ہجراں کی سرگذشت مری گفتنی نہیں
کیا کہیے تم سے قصۂ دور و دراز کو

جوں شمع سر کٹے ہے بیاں حال کا کیے
لاتا زباں پہ خوب نہیں دل کے راز کو

حیران ہو رہوگے جو ہم ہو چکے کبھی
دیکھا نہیں ہے مرتے کسو عشق باز کو

جانکاہ و دل خراش ہیں سارے ترے سلوک
دل ہم تو دیتے کاش کسو دل نواز کو

صوفی کی پارسائی کی ہے خانقہ میں دھوم
لے چلیے گا کبھو ادھر اس مست ناز کو

ہے دور ادب سے تم کھڑے میں پاکشیدہ ہوں
مت آئیو جنازے کی میرے نماز کو

(۱۲۲۵)

سر کاٹ کے ڈلوا دیے انداز تو دیکھو
پامال ہے سب خلق جہاں ناز تو دیکھو

کچھ سوجھ نہیں پڑتی تمھیں بے خبری سے
ٹک ہوش کی آنکھوں کو کرو باز تو دیکھو

اس بت سے نہیں جب تئیں صحبت تو نہیں ہے
یہ ڈول جو ہوتا ہے خدا ساز تو دیکھو

شب آنکھ مری لگنے نہیں دیتی ہے بلبل
اس مرغ کی بیتابی آواز تو دیکھو

دل ایک تڑپنے میں پرے عرش کے پایا
اس طائر بے بال کی پرواز تو دیکھو

کی زلف و خط و خال نے ایک اور قیامت
تصویر سے چہرے پہ یہ پرداز تو دیکھو

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی
اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

(۱۲۲۶)

آرسی اس کے سامنے دھرلو
کب ہے ویسی مواجہہ کرلو
اس کی تیغ ستم بلند ہوئی
جی ہے مرنے کو تو چلو مرلو
درپئے خوں ہیں میرے خورد و کلاں
یہ وبال اپنے کوئی سر پر لو
کچھ طرح ہو کہ بے طرح ہو حال
عمر کے دن کسو طرح بھرلو
کیا بلاخیز جا ہے کوچۂ عشق
تم بھی یاں میرؔ مول اک گھر لو

(۱۲۲۷)

کھینچا رنج و تعب کا دوستاں عادت کرو
تب کسی ناآشنائے مہر سے الفت کرو
روٹھ کر ملتا نہیں وہ شوخ یوں کیوں نہ کوئی
عذر چاہو دیر تک مدت تلک منت کرو
کب تک اے صورت گراں حیراں پھروں بے روے یار
نقش اس کا کھینچ رکھنے کی کوئی صورت کرو
انس اگر ان نوخطان شہر سے منظور ہے
اپنی پرچھائیں سے بھی جوں خامہ تم وحشت کرو
کچھ نہ پوچھو صحبت دریوزہ کی کم فرصتی
جوں ہی جا بیٹھے لگا کہنے انھیں رخصت کرو
عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرو
پہلے دیوانے ہوئے پھر میرؔ آخر ہوگئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

(۱۲۲۸)

بہرفردوس ہو آدم کو الم کاہے کو
وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو
کہتے ہیں آوے گا ایدھر وہ قیامت رفتار
چلتے پھرتے رہیں گے تب تئیں ہم کاہے کو
یہ بھی اک ڈھب ہے نہ ایذا نہ کسو کو راحت
رحم موقوف کیا ہے تو ستم کاہے کو
نرگس ان آنکھوں کو جو لکھ گئے نابینا تھے
اپنے نزدیک ہیں وے دست قلم کاہے کو
اس کی تلوار سے گر جان کو رکھتے نہ عزیز
مرتے اس خواری سے تو صید حرم کاہے کو
چشم پوشی کا مری جان تمھیں لپکا ہے
کھاتے ہو دیدہ درائی سے قسم کاہے کو
میری آنکھوں پہ رکھو پاؤں جو آؤ لیکن
رکھتے ہو ایسی جگہ تم تو قدم کاہے کو
دل کو کہتے ہیں کہ اس گنج رواں کا گھر ہے
اس خرابے میں کرے ہے وہ کرم کاہے کو
شور نے نام خدا ان کے بلا سر کھینچا
میرؔ سا ہے کوئی عالم میں علم کاہے کو

(۱۲۲۹)

غریب شہر خوباں ہوں مرا کچھ حال مت پوچھو
ہوا جی زلف و کاکل کے لیے جنجال مت پوچھو

دل صد پارہ کو پیوند کرتا ہوں جدائی میں
کرے ہے کہنہ نسخہ وصل جوں وصال مت پوچھو

جگر جل کر ہوا ہے کوئلہ بیتاب تو بھی ہوں
طپش سے دل کی میرے سر پہ ہے دھمال مت پوچھو

تعجب ہے کہ دل اس گنج سرگشتہ میں رہتا ہے
خرابے جس سے یہ پاتے ہیں مالامال مت پوچھو

لگا جی اس کی زلفوں سے بہت ہم میرؔ پچھتائے
ہوا ہے مدعی ایک ایک اپنا بال مت پوچھو

(۱۲۳۰)

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

عشق پیچے کی طرح حسن گرفتاری ہے
لطف کیا سرو کی مانند گر آزاد رہو

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو

وہ گراں خواب جو ہے ناز کا اپنے سو ہے
داد بے داد رہو شب کو کہ فریاد رہو

میرؔ ہم مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

(۱۲۳۱)

زلفوں کو میں چھوا سو غصے ہوئے کھڑے ہو
یہ بات ایسی کیا ہے جس پر الجھ پڑے ہو

منھ پھیر پھیر لو ہو ہر بات میں ادھر سے
یاں کس ستم زدہ سے آزردہ ہو لڑے ہو

نری مخالفوں سے سختی موافقوں سے
واں موم سے بنے ہو یاں لوہے سے کڑے ہو

مل جاؤ مغبچوں سے تو داڑھی ہو تبرک
ہر چند شیخ صاحب تم بوڑھے ہو بڑے ہو

ہوتے ہیں خاک رہ بھی لیکن نہ میرؔ ایسے
رستے میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

(۱۲۳۲)

زخموں پہ اپنے لون چھڑکتے رہا کرو
دل کو مزے سے بھی تو تنک آشنا کرو

کیا آنکھ بند کرکے مراقب ہوئے ہو تم
جاتے ہیں کیسے کیسے سمیں چشم وا کرو

موقوف ہرزہ گردی نہیں کچھ قلندری
زنجیر سر اتار کے زنجیر پا کرو

ہر چند اس متاع کی اب قدر کچھ نہیں
پر جس کسو کے ساتھ رہو تم وفا کرو

تدبیر کو مزاج محبت میں دخل کیا   جانکاہ اس مرض کی نہ کوئی دوا کرو
طفلی سے تم نے لطف و غضب مختلط کیے   ٹک مہر کو جدا کرو غصہ جدا کرو
بیٹھے ہو میر ہو کے درکعبہ پہ فقیر
اس روسیہ کے باب میں بھی کچھ دعا کرو

(۱۲۴۳)

سر پہ عاشق کے نہ یہ روز سیہ لایا کرو   جی الجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرو
تاب مہ کی تاب کب ہے نازکی سے یار کو   چاندنی میں آفتابی کا مگر سایہ کرو
گرچہ شان کفر ارفع ہے دلے اے راہباں   ایک دو ہم سوں کو بھی زنار بندھوایا کرو
شوق سے دیدار کے بھی آنکھوں میں کھنچ آیا جی   اس سمیں میں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرو
کوہکن کی ہے قدم گاہ آخر اے اہل وفاق   طوف کرنے بےستوں کا بھی کبھی جایا کرو
فرق یار و غیر میں بھی اے بتاں کچھ چاہیے   اتنی ہٹ دھرمی بھی کیا انصاف فرمایا کرو
کب میسر اس کے منھ کا دیکھنا آتا ہے میر
پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

(۱۲۴۴)

کہتا ہے کون میر کہ بےاختیار رو   ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو
پایا گیا وہ گوہر نایاب سہل کب   نکلا ہے اس کو ڈھونڈنے تو پہلے جان کھو
کام اس کے لب سے ہے مجھے بنت العنب سے کیا   ہے آب زندگی بھی تو لے جائے مردہ شو
سنتے نہیں کہے جو نہ کہیے تو دم رکے   کچھ پوچھیے نہ قصہ ہمارا ہے گومگو
مشعر ہے بےدماغی پہ مطلق نہ بولنا   ہم دیں تمھیں دعا ہمیں تم گالیاں تو دو
کرنا جگر ضرور ہے دل دادگاں کو بھی   وہ بولتا نہیں تو تم آپھی سے چھیڑ لو
اے غافلان دہر یہ کچھ راہ کی ہے بات   چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہوسو
گردش میں جو کوئی ہو رکھے اس سے کیا امید   دن رات آپھی چرخ میں ہے آسمان تو
جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دابو ہو اس کے میر
کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

(۱۲۴۵)

رکھو مت سر چڑھائے دلبروں کے گوندھے بالوں کو   کھلانا کھولنا مشکل بہت ہے ایسے کالوں کو
اڑایا غم نے ان کے سوکھے پتوں کی روش ہم کو   الٰہی سبز رکھیو باغ خوبی کے نہالوں کو

جہاں دیکھو کہا کرتے ہیں اس کے عشق کے غم میں
نہ ہم دوچار بیٹھے دل شکستے اپنے حالوں کو

نہ چشم کم سے مجھ درویش کی آوارگی دیکھو
تبرک کرتے ہیں کانٹے مرے پاؤں کے چھالوں کو

کرے ہے جس پہ بلبل غش سو یہ اس جنس کی قیمت
نہیں افسوس آنکھیں بے حقیقت پھول والوں کو

دل عاشق کو رو کیا جانوں خوباں کیوں نہیں دیتے
بہت آئینے سے تو ربط ہے صاحب جمالوں کو

یہی کچھ وہم سی ہے سہل کب آئے قیاسوں میں
تفکر اس کمر کا کھا گیا نازک خیالوں کو

نہ ایسی طرز دیدن ہے نہ ہرنوں کی یہ چتون ہے
کبھو جنگل میں لے چلیے گا ان شہری غزالوں کو

کوئی بھی اس طرح سے اپنے جی پر کھیل جاتا ہے
مگر بازیچہ سمجھے میر عشق خوردسالوں کو

(۱۲۳۶)

رہتا ہے پیش دیدۂ تر آہ کا سجاؤ
جیسے مصاحب ابر کی ہوتی ہے کوئی باؤ

برسے گی برف عرصۂ محشر میں دشت دشت
گر میری سرد آہوں کا واں ہوگیا جماؤ

حاصل کوئی امید ہوئی ہو تو میں کہوں
خوں ہی ہوا کیے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ

آنکھوں کے آگے رونے سے میرے محیط ہے
ابروں سے جا کہے کوئی پانی پیو تو آؤ

رہتی تھی اشک خونیں میں ڈوبی سب آستیں
اس چشم بحرخوں کے کبھو دیکھے ہیں چڑھاؤ

اظہار درد اگرچہ بہت بے نمک ہے پر
ٹک بیٹھو تو دکھاویں تمھیں چھاتیوں کے گھاؤ

آ عاشقوں کی آنکھوں میں ٹک اے بہ دل قریب
ان منظروں سے بھی ہے بہت دور تک دکھاؤ

صحبت جو اس سے رہتی ہے کیا نقل کریے ہائے
جب آگئے ہیں ہم تو کہا ان نے یاں سے جاؤ

صد چاک اپنے دل سے تو بگڑا ہی کی وہ زلف
افسوس کیا ہے شانے نے جو اس سے ہے بناؤ

اس ہی زمیں میں میر غزل اور ایک کہہ
گو خوش نہ آوے سامعوں کو بات کا بڑھاؤ

(۱۲۳۷)

سب کھا گئے جگر تری پلکوں کے کاوکاو
ہم سینہ خستہ لوگوں سے بس آنکھ مت لگاؤ

آنکھوں کا جھڑ برسنے سے ہتھیا کے کم نہیں
پل مارتے ہے پیش نظر ہاتھی کا ڈباؤ

کشتی چشم ڈوبی رہی بحر اشک میں
آئی نہ پار ہوتی نظر عاشقوں کی ناؤ

سینے کے اپنے زخم سے خاطر ہو جمع کیا
دل ہی کی اور پاتے ہیں سب لوہو کا بہاؤ

بیتابی دل افعی خامہ نے کیا لکھی
کاغذ کو شکل مار سراسر ہے پیچ تاؤ

ہرچند جائیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے
تم کو ہمارے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ

سر نیچے ہو تو پاؤں ترا داہیں ہم کبھی
دبتا وہی ہے جس کے تئیں کچھ بھی ہو دباؤ

چاک قفس سے آنکھیں لگیں کب تلک رہیں
اک برگ گل نسیم ہماری طرف بھی لاؤ

غیرت کا عشق کی ہے طریقہ ہی کچھ جدا
اس کی گلی کی خضر کو بھی راہ مت بتاؤ

ظاہر ہیں دیکھنے سے گنہ کیونکہ تیرے سب
چھپتے ہیں میر کوئی دلوں کے کہیں لگاؤ

(۱۲۳۸)

گر قصد ترک سر ہے کہو شرم مت کرو
کہتے ہیں اپنی ٹوپی سے بھی مشورت کرو

اچھی ہے اس کی تیغ تو باندھو گلے سے میر
مرتا ہوں میں تو آگے مرے مت صفت کرو

(۱۲۳۹)

دل کہے میں ہوں تو کاہے کو کوئی بیتاب ہو
آنکھ کا لگنا نہ ہو تو اشک کیوں خوناب ہو

وہ نہیں چھڑکاؤ سا میں اشک ریزی سے کروں
اب جو رونے بیٹھ جاؤں جھیل ہو تالاب ہو

جلد کھینچے تیغ بیتابی کریں جو ہم تو پھر
مارنا مشکل ہمارا تم کو جوں سیماب ہو

شہر میں زیر درختاں کیا رہوں میں برگ بند
ہو نہ صحرا نے مری گنجائش اسباب ہو

بے تصرف عشق کے ہوتا ہے ایسا حال کب
دل ہمارا خون ہو سب چشم یکسر آب ہو

لطف سے اے ابر رحمت ایک دو بارش ادھر
کشت زرد ناامیداں بھی تو ٹک سیراب ہو

بخت خفتہ سوویں پر ٹک چونکتے سوویں کہ میر
ایک شب ہم دل زدوں سے وہ پری ہم خواب ہو

(۱۲۴۰)

آج ہمارا جی بے کل ہے تم بھی غفلت مت کریو
دل نہ رہے جو ہاتھ رکھے تو ساجت ات گت مت کریو

ڈھیری رہے اک خاک کی تو کیا ایسے خاک برابر کی
مجھ کو زمیں میں گاڑوگے تو نشان تربت مت کریو

ایسی جان کہاں ہے ہم میں رنج نہ دینا ہاتھوں کو
ایک ہی وار میں ہو چکیے گا دوسری ضربت مت کریو

ہم کو تو مارا عشق نے آخر پر یہ وصیت یاد رہے
دیر جہاں میں تم جو ہو تو کسو سے الفت مت کریو

میری طرف کی یارو اس سے بات کوئی کہتے ہو کہو
مانے نہ مانے وہ جانے پھر تم بھی منت مت کریو

کہیے سو کیا اب چپکے دیکھو گو میں اس میں مر جاؤں
تم کو قسم ہے حرف وسخن کی مجھ سے مروت مت کریو

ہوش نہیں اپنا تو ہمیں ٹک میر آئے ہیں پرسش کو
جانے سے آگے ان کو ہمارے پیارے رخصت مت کریو

ردیف ہ

(۱۴۴۱)

میں کیا کہوں جگر میں لہو میرے کم ہے کچھ　　کچھ تو الم ہے دل کی جگہ اور غم ہے کچھ
پوشیدہ تو نہیں ہے کہ ہم ناتواں نہیں　　کپڑوں میں یوں ہی تم کو ہمارا بھرم ہے کچھ
کیا اپنے دل دھڑکنے سے ہوں میں ہی دم بخود　　جو دیکھتا ہے میرے تئیں سو وہم ہے کچھ
جب سے کھلی ہے نرگس مست اس کی ظلم ہے　　کیا آج کل سے یار کو میل ستم ہے کچھ
بلبل میں گل میں کیا خنگی آگئی ہے میر
آمد شد نسیم سحر دم بہ دم ہے کچھ

(۱۴۴۲)

کہتے تو ہیں کہ ہم کو اس کی طلب نہیں کچھ　　پر جی اسی کو اپنا ڈھونڈے ہے ڈھب نہیں کچھ
اخلاص و ربط اس سے ہوتا تو شور اٹھاتے　　لب تشنہ اپنے تب ہیں دلبر سے جب نہیں کچھ
یاں اعتبار کریے جو کچھ وہی ہے ظاہر　　یہ کائنات اپنی آنکھوں میں سب نہیں کچھ
رکھ منھ کو گل کے منھ پر کیا غنچہ ہو کے سوئے　　ہے شوخ چشم شبنم اس کو ادب نہیں کچھ
دل خوں نہ ہووے کیونکر یکسر ورائے الفت　　یا سابقے بہت تھے یا اس سے اب نہیں کچھ
یہ حال بےسبب تو ہوتا نہیں ہے لیکن　　رونے کا لحظہ لحظہ ظاہر سبب نہیں کچھ
کر عشق میر اس کا مارے کہیں نہ جاویں
جلدی مزاج میں ہے اس سے عجب نہیں کچھ

(۱۴۴۳)

رستے سے چاک دل کے ہو آگاہ　　یار تک پھر تو کس قدر ہے راہ
رہتی ہے خلق آہ شب سے تنگ　　دے نہیں سنتے میری بات اللہ
آنکھ اس منھ پہ کس طرح کھولوں　　جوں پلک جل رہی ہے میری نگاہ
خط مرا دیکھ دیکھ کہنے لگا　　ہائے کیا کیا لکھے ہے نامہ سیاہ
ہیں مسلمان ان بتوں سے ہمیں　　عشق ہے لا الہ الا اللہ
پلکیں اس طور روتے روتے گئیں　　مژہ ہوتا ہے جس طرح لب چاہ
میر کعبے سے قصد دیر کیا
جاؤ پیارے بھلا خدا ہمراہ

(۱۲۴۴)

ہے تمنائے وصال اس کی مری جان کے ساتھ
جان ہی جائے گی آخر کو اس ارمان کے ساتھ

کیا فقط توڑ کے چھاتی ہی گیا تیر اس کا
لے گیا صاف مرے دل کو بھی پیکان کے ساتھ

دین و دل ہی کے رہا میرے وہ کافر درپے
خصمی قاطبہ اس کو ہے مسلمان کے ساتھ

بحر پر نہر پہ برسے ہے برابر ہی ابر
پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ

سطر زلف آئی ہے اس روئے خطط پہ نظر
یہ عبارت نئی لاحق ہوئی قرآن کے ساتھ

تیر اس کا جو گذر دل سے چلا جی بھی چلا
رسم تعظیم سے ہو لیتے ہیں مہمان کے ساتھ

میں تو لڑکا نہیں جو بالے بتاؤ مجھ کو
یہ فریبندگی کریے کسو نادان کے ساتھ

خون مسلم کو تو واجب یہ بتاں جانے ہیں
ہو جے کافر کہ اماں یاں نہیں ایمان کے ساتھ

آدمیت سے تمھیں میرؔ ہو کیونکر بہرہ
تم نے صحبت نہیں رکھی کسو انسان کے ساتھ

(۱۲۴۵)

جانے دے مت اس قدر اب زلف و خط و خال دیکھ
حال کچھ بھی تجھ میں ہے اے میرؔ اپنا حال دیکھ

کیا مری طول پریشانی کی حیرت ہم نفس
آنکھیں تو دی ہیں خدا نے اس کے لمبے بال دیکھ

دامن صحرا میں کیا وسعت ہے جو دل میں نہیں
موند کر آنکھیں گریباں میں بھی ٹک سر ڈال دیکھ

چشم و دل کا اس سے لگ جانا تو تھا جس تس طرح
جی بھی ان بالوں میں الجھا اور یہ جنجال دیکھ

گرچہ اس مہ کی جدائی میں مجھے برسوں ہوئے
لیکن اے اختر شناس اب کا ہے کیسا سال دیکھ

کب نظر میری پڑے گی اس کے روئے خوب پر
ہم نشیں ٹک تو بھی مصحف کھول کر تو فال دیکھ

ٹھوکریں دل کو لگے ہیں جب چلے ہے راہ تو
یہ خرام ناز ہے ظالم ٹک اپنی چال دیکھ

(۱۲۴۶)

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

واقف ہو شان بندگی سے قید قبلہ کیا
سر ہر کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ

مو تن پہ ہم نہ سوختہ جانوں کے ہیں نمود
ہے سوزش دروں سے بروں دود ہر جگہ

دلی کے لکھنؤ کے خوش اندام خوب لیک
راہ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا
آب رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ

شہرہ رکھے ہے تیری خریت جہاں میں شیخ
مجلس ہو یا کہ دشت اچھل کود ہر جگہ

سودائے عاشقی میں تو جی کا زیاں ہے
پھرتے ہیں میرؔ ڈھونڈتے ہی سود ہر جگہ

(۱۴۴۷)

وے دن اب سالتے ہیں جن میں پھرے یار کے ساتھ
لطف سے حرف و سخن تھے نگہ اک پیار کے ساتھ

رو بہ پس یار کے کوچے سے جو خورشید گیا
عشق تھا اس کے مگر سایۂ دیوار کے ساتھ

دستے نرگس کے رکھیں گور پہ میری وارث
تا یہ جانیں کہ گیا میں غم دیدار کے ساتھ

واں کھنچی میان سے یاں سر کو جھکایا میں نے
گردن اپنی ہے بندھی یار کی تلوار کے ساتھ

عشق کے زار سے بولا نہ خشونت سے کرو
لطف سے بات کوئی کرتے ہیں بیمار کے ساتھ

تہمت عشق سے آبادی بھی وادی ہے ہمیں
کون صحبت رکھے ہے خوں کے سزاوار کے ساتھ

اب خوشامد انھیں کی آٹھ پہر کرتے ہیں
گفتگو میرؔ کو جن لوگوں سے تھی عار کے ساتھ

(۱۴۴۸)

نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ
مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ

نہ اٹھ کر در یار سے جاسکے
یہ کم لطف ہے ناتوانی کے ساتھ

فرو درد آنسو پیے کچھ ہوا
دوا جیسے پیتے ہیں پانی کے ساتھ

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

شتابی گئی اس روش فصل گل
کہ جوں نکلی ہو جوانی کے ساتھ

بکھیرے ہے جوں لخت دل آہ صبح
ہوا کب ہے اس گل‌فشانی کے ساتھ

جلا جی بہت قصۂ میرؔ سن
بلا سوز تھا اس کہانی کے ساتھ

(۱۴۴۹)

کب تک رہیں گے یارب ہر دم ہم آبدیدہ
ضائع ہے جیب و دامن جوں جنس آب دیدہ

اس حور سے شبوں کا ملنا گیا سو چپ ہوں
جاتا نہیں کہا کچھ جوں گنگ خواب دیدہ

راز محبت اپنا رسوا نہ اس قدر ہو
گر ہو نہ اشک افشاں خانہ خراب دیدہ

جب دیکھو لگ رہا ہے در کی طرف اسی کے
ہے جیسے کچھ ویسے ذلت کا باب دیدہ

دوزخ میں میرؔ ہوں میں یاربہشت رو بن
جاں ہے ستم رسیدہ دل ہے عذاب دیدہ

(۱۴۵۰)

ادھر مت کر نگاہ تیز جا بیٹھ
نہ تیر روے ترکش یوں چلا بیٹھ

اثر ہوتا تو کب کا ہو بھی چکتا
دعاے صبح سے اب ہاتھ اٹھا بیٹھ

پھرے گا ہم سے کب تک دور ظالم
کبھو تو گھر سے اٹھ کر پاس آ بیٹھ

نہ کر دیوار کا مجلس میں تکیہ
ہمارے مونڈھے سے مونڈھا لگا بیٹھ

بہت پھرتے ہیں ٹیڑھے ٹیڑھے دشمن
انھیں دو سیدھیاں تو بھی سنا بیٹھ

تلاش اپنی نہ کم تھی جو وہ ملتا
بہت میں دیکھ کر آخر رہا بیٹھ

مخالف سے نہ مل بیٹھا کر اتنا
کہیں لے میرؔ صاحب کو جدا بیٹھ

(۱۴۵۱)

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیے دیکھ تو شرمائے وہ

کس طرح تڑپے ہے کیا کیا جی گھٹا جاتا ہے ہائے
ساتھ اس کے دل لگا ہو جس کسو کا وائے وہ

کیا سلوک اس بے وفا کے نقل کریے ہم نشیں
منتیں کریے تو یاں تک گھر سے چل کر آئے وہ

لطف سے لبریز ہے اس کام جاں کا سب بدن
مختلط ہوجائے ہم سے جو کبھو تو ہائے وہ

بے خودی ہے جی چلا جاتا ہے ہوں صاحب فراش
بے خبر اے کاش بالیں پر مری آجائے وہ

ہم نہیں ملتے وگرنہ یار ہے تا قتل ساتھ
لوہو پی جاوے ہمارا ہم کو اب جو پائے وہ

میرؔ کو واشد نہیں ہے مقصد اس کا اور ہے
عشق سے لڑکوں کے دل کو کب تلک بہلائے وہ

ردیف ی

(۱۴۵۲)

تدبیر غم دل کی بستی میں نہ ٹھہرائی
جنگل میں نکل آئے کچھ واں بھی نہ بن آئی

خواہش ہو جسے دل کی دل دوں اسے اور سر بھی
میں نے تو اسی دل سے تصدیع بہت پائی

بے پردہ نہ ہونا تھا اسرار محبت کو
عاشق کشی ہے جب سے ہے عشق کی رسوائی

گھر دل کا بہت چھوٹا پر جاے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

گھر بار لٹایا جب تب وہ سہی قد آیا
مفلوک ہوئے اب ہم کر خرچ یہ بالائی

خوبی سے ندان اس کی سب صورتیں یاں بگڑیں
وہ زلف بنی دیکھی سب بن گئے سودائی

کیا عبدہ برآئی ہو اس گل کی دورنگی سے
ہر لحظہ ہے خودرائی ہر آن ہے رعنائی

عاشق کی جسے ہووے کچھ قدر نہیں پیدا
جیتا نہ رہا اب تک مجنوں ہی کو موت آئی

آزار بہت کھینچے اب میر توکل ہے
کھینچی نہ گئی ہم سے ہر ایک کی مرزائی

(۱۲۵۳)

شور کیا جو اس کی گلی میں رات کو ہیں سب جان گئے
آہ و فغاں کے طور سے میرے لوگ مجھے پہچان گئے

عہد میں اس کی یاری کے خوں دل میں ہوئے ہیں کیا کیا چاؤ
خاک میں آخر ساتھ ہی میرے سب میرے ارمان گئے

موت جو آئے سر پر انساں دست و پا گم کرتا ہے
دیکھتے ہی شمشیر بکف کچھ آج اسے اوسان گئے

مہلت عمر دو روزہ کتنی کریے فضولی کاہے پر
آئے جو ہیں دنیا میں ہم تو جیسے کہیں مہمان گئے

ہاتھ لگا وہ گوہر مقصد جیسا ہے معلوم ہمیں
محو طلب ہو اہل طلب سب خاک بھی یاں کی چھان گئے

کیسے سلوک انھوں کے کیا کیا چھیڑ تجاہل کی ہے نئی
نکلے تھے اس رستے سو وے جان کے بھی انجان گئے

میر نظر کی دل کی طرف کی عرش کی جانب فکر بہت
تھی جو طلب مطلوب کی ہم کو کیدھر کیدھر دھیان گئے

(۱۲۵۴)

سوز دروں سے آگ لگی ہے سارے بدن میں تب سی ہے
طاقت دل کی تمام ہوئی ہے جی کی چال کڈھب سی ہے

سینے کے زخم نمایاں رہتے چاک کیے سو پردۂ در
مدت سے یہ رخنے پڑے تھے چھاتی چھنی میں اب سی ہے

پرسش حال کبھو کرتے ہیں ناز و چشم اشارت سے
ان کی عنایت حال پہ میرے کیا پوچھو ہو غضب سی ہے

گود میں میری رکھ دیتا ہے پاؤں حنائی دینے کو
یوں پامال جو میں ہوتا ہوں مجھ کو بھی تو دب سی ہے

لطف کہاں وہ بات کیے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سرخ کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعل لب سی ہے

خانہ خراب ہو خواہش دل کا آہ نہایت اس کو نہیں
جان لبوں پر آئی ہے پر تو بھی گرم طلب سی ہے

تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انھوں سے عجب سی ہے

(۱۲۵۵)

کیسے نحس دنوں میں یارب میں نے اس سے محبت کی
دھوم رہی ہے سر پر میرے رنج و عتاب و کلفت کی

میں تو سرو و شاخ گل کی قطع ہی کا دیوانہ تھا
یار نے قد قامت دکھلاکر سر پر میرے قیامت کی

قسمت میں جو کچھ کہ بدا ہو دیتے ہیں وہ ہی انساں کو
غم غصہ ہی ہم کو ملا ہے خوبی اپنی قسمت کی

خلوت یار ہے عالم عالم ایک نہیں ہے ہم کو بار
در پر جاکر پھر آتے ہیں خوب ہماری عزت کی

اک گردن سے سوحق باندھے کیا کیا کریے ہوں جو ادا مدت اس پر ایک نفس جوں صبح ہماری فرصت کی
شیوہ اس کا قہر و غضب ہے ناز و خشم و ستم دے سب کوئی نگاہ لطف اگر کی ان نے ہم سے مروت کی
بے پروائی درویشی کی تھوڑی تھوڑی تب آئی جب کہ فقیری کے اوپر میں خرچ بڑی سی دولت کی
ناز و خشم کا رتبہ کیسا ہٹ کس اعلیٰ درجے میں بات ہماری ایک نہ مانی برسوں ہم نے منت کی
دکھن پورب پچھم سے لوگ آکر مجھ کو دیکھیں ہیں حیف کہ پروا تم کو نہیں ہے مطلق میری صحبت کی
دوستی یاری الفت باہم عہد میں اس کے رسم نہیں یہ جانے ہیں مہر و وفا اک بات ہے گویا مدت کی
آب حسرت آنکھوں میں اس کی نومیدانہ پھرتا تھا
میر نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

(۱۲۵۶)

کیسے ناز و تبختر سے ہم اپنے یار کو دیکھا ہے نوگل جیسے جلوہ کرے اس رشک بہار کو دیکھا ہے
چال زمانے کی ہے نظر میں شام و سحر کس کو ہے قیام نووارد ہم یاں کے ہیں پر لیل و نہار کو دیکھا ہے
ایک نہ آیا دید میں اپنی دلکش دلچسپ اس کے رنگ ان آنکھوں سے اس گلشن میں یوں تو ہزار کو دیکھا ہے
قدر کفر اسلام سے زائد جانی سبحہ فروشی سے بکتے کہیں بازار میں تو نے گہ زنار کو دیکھا ہے
قلب و دماغ جگر کے گئے ضعف ہے جی کی غارت میں کیا جانے یہ قلقچی ان نے کس سردار کو دیکھا ہے
باؤ سے بھی گر پتا کھڑکے چوٹ چلے ہے ظالم کی ہم نے دام گہوں میں اس کے ذوق شکار کو دیکھا ہے
جمع کرو دل میر سے تم بھی بیتابی تھی دل کو بہت
اچھے کچھ آثار نہ تھے میں اس بیمار کو دیکھا ہے

(۱۲۵۷)

ناز و ادا کے ساتھ وہ دلبر شکیل ہے تصویر چیں کی روبرو اس کے ذلیل ہے
ہم خاک منھ کو مل کے نہ جوں آرسی پھرے یاں پاس قرط آب اگر ہے سبیل ہے
جنگل میں خضرؑ و کعبہ کا ہونا مری طرح دونوں کی نارسائی کے اوپر دلیل ہے
آگے جنوں سے چھاؤں میں تھے سرو و گل کی ہم سر پر ہمارے سایہ فگن اب کریل ہے
کچھ چیز و مال ہو تو خریدار ہو کوئی دنیا کی قدر کیا کہ متاع قلیل ہے
کیا روؤں اشک آتے ہیں آنکھوں سے سیل سیل پل مارنے میں پیش نظر ایک جھیل ہے
آتے نہیں نظر میں مری ہاتھی کے سوار کانوں میں جو فسانۂ اصحاب فیل ہے
ہو صبر اس جو یوسف ثانی کے بے جمال تو مصحف مجید میں صبر جمیل ہے
شکر و گلہ سے عشق کے لبریز ہے جہاں کریے جہاں نگاہ یہی قال و قیل ہے

ہم دیر سے ہیں منتظر قدکشی یار — کچھ شامت عمل سے قیامت میں ڈھیل ہے

جب دیکھتے ہیں میر تمھیں بے دماغ ہو
کاہے کو ناز عشق میں صاحب دخیل ہے

(۱۲۵۸)

برسوں گذرے ہیں ملے کب تئیں یوں پیار رہے — دور سے دیکھ لیا اس کو تو جی مار رہے
وہ مودت کہ جو قلبی ہو اسے سو معلوم — چار دن کہنے کو اس شوخ سے ہم یار رہے
مرگ کے حال جدائی میں جئیں یوں کب تک — جان بیتاب رہے دل کو اک آزار رہے
وجہ یہ تھی کہ ترے ساتھ لڑی آنکھ اس کی — ہم جو صورت سے تھے آئینے کی بیزار رہے

دین و دنیا کا زیاں کار کہو ہم کو میر
دو جہاں داو نخستیں ہی میں ہم ہار رہے

(۱۲۵۹)

اب تک تو نبھی اچھی اب دیکھیے پیری ہے — سب لوگوں میں ہیں لاگیں یاں محض فقیری ہے
کیا دھیر بندھے اس کی جو عشق کا رسوا ہو — نکلے تو کہیں لڑکے دھیری ہے بے دھیری ہے
خوں عشق کی گرمی سے سوکھا جگر و دل میں — اک بوند تھی لوہو کی اب چھاتی جو چیری ہے
ہم طائر نوپر ہیں وے جن کو بہاراں میں — گل گشت گلستاں کا ہے شوق و اسیری ہے
اس دلبر بدظن سے خوش گذرے ہے عاشق کی — نے رحم ہے خاطر میں نے عذر پذیری ہے
ہم مرثیہ دل ہی کا اکثر کہا کرتے ہیں — اب کریے تخلص تو شائستہ ضمیری ہے

کیا اہل دول سے ہے اے میر مجھے نسبت
یاں عجز و فقیری ہے واں ناز امیری ہے

(۱۲۶۰)

سوز دروں نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے — ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے
اب نیند کیونکے آوے گرمی نے عاشقی کی — دل ہے جدھر وہ پہلو سارا جلا دیا ہے
حرف غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے — جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے
کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم کو بغیر اس کے — کیا روگ دوستی نے جی کو لگا دیا ہے
اچرج ہے یہ کہ ہے وہ میرا چراغ تربت — کتنوں کا ورنہ خوں کر ان نے دبا دیا ہے
آنکھوں کی کچھ حیا تھی سو موند لیں ادھر سے — پردہ جو رہ گیا تھا وہ بھی اٹھا دیا ہے
ہم دل زدہ رہے ہیں انواع تلخ سنتے — ان شکریں لبوں نے ہم کو رجھا دیا ہے

جب طول میں دیا ہے نامے کو شوق کے تب / جوں کاغذ ہوائی ان نے اڑا دیا ہے
مرنے ہی کا مہیا اپنے رہا کیا ہوں / واں تیغ اٹھائی ان نے یاں سر جھکا دیا ہے
کیا بےنمک ہوا ہے پروانہ راکھ جل کر / رہ رہ کے ہم جلے تو ہم کو مزہ دیا ہے
تھے جوں چراغ مفلس مضطر نہ ترک تھا جب / بارے فقیری نے تو آرام سا دیا ہے
شہروں کے تنگ کوچے کاہے کو گوں ہیں اپنی / ہم وحشیوں کے قابل رہنے کے بادیہ ہے
نادردمند بلبل نالاں ہے بےتہی سے / دل ہم کو بھی خدا نے دردآشنا دیا ہے
کیا نامہ بر ہمارا ہے صاف بےمروت / خط نانوشتہ ہم کو اودھر سے لا دیا ہے

عالم شکار ہے وہ اس سن میں میرؔ اس کو
ڈھب جان مارنے کا کن نے بتا دیا ہے

(۱۲۶۱)

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے / نکہت گل سے آشنا نہ ہوئے
سر کسو سے فرو نہیں آتا / حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے
خوار و زار و ذلیل و بےرویت / عاشق اس کے ہوئے سو کیا نہ ہوئے
کیسا کیسا قفس سے سر مارا / موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

میں نہ گردن کٹائی جب تک میرؔ
عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے

(۱۲۶۲)

دیکھیے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے / دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جان چراغ مضطر ہے
خاطر اپنی اتنی پریشاں آنکھیں پھریں ہیں اس بن حیراں / تم نے کہا دل چاہے تو بیٹھو دل کیا جانے کیدھر ہے
تاب وتواں کا حال وہی ہے آج تلک ہم جیتے ہیں / تم پوچھو تو اور کہیں کیا نسبت کل کی بہتر ہے
اس بے مہر صنم کی خاطر سختی سی سختی کھینچی ہم / جی پگھلے کیا اس کا ہم پر تم کہاں وہ پتھر ہے
سر نہ بڑے کے چڑھیے اس میں ہرگز زیاں ہے سر ہی کا / سمجھے نہ سمجھے کوئی اسے یہ پہاڑ کی آخر ٹکر ہے

جب سے ملا اس آئینہ رو سے خوش کی ان نے نمد پوشی
پانی بھی دے ہے پھینک شبوں کو میرؔ فقیر قلندر ہے

(۱۲۶۳)

آشوب چشم چشمہ زا اب کوہ و صحرا پر بھی ہے / طوفاں سا شہروں میں ہے اک شور دریا پر بھی ہے
گو چشم بندی شیخ کی ہو آخرت کے واسطے / لیکن نظر اگلی نمط پردے میں دنیا پر بھی ہے

نے دست مزد بندگی نے قدر سرافگندگی   جو مکرمت ہم پر ہوئی اب جلف و ادنیٰ پر بھی ہے
تنگ آن کر گم ہو گئے مقصود جو مقصود تھا   ہم خرج رہ کیونکر نہ ہوں پیدا ہی پیدا پر بھی ہے
ہیں خوبیاں ہی خوبیاں وحشی طبیعت میر میں
پر انس کم ہم سے دلیل اب کے یہ سودا پر بھی ہے

(۱۲۶۴)

آنکھوں سے راہ عشق کی ہم جوں نگہ گئے   آخر کو روتے روتے پریشاں ہو بہ گئے
اس عرصے سے گیا ہو کہیں کوئی تو کہیں   چل پھر کے لوگ یاں کے یہیں سارے رہ گئے
کیا کیا ہوئے ہیں اہل زماں ڈھیر خاک کے   کیا کیا مکان دیکھتے ناگاہ ڈھہ گئے
ان دلبروں سے کیا کہیں مظلوم عشق ہم   ناچار ظلم و جور و ستم ان کے سہ گئے
تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلے پھٹے جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

(۱۲۶۵)

میر کیوں رہتے ہیں اکثر ان منے   کر نہیں بنتی کسو سے جو بنے
خون ہو کر بہ گیا مدت ہوئی   دل جو ڈھونڈو ہو سو کیسا کس کنے
ہے توکل جب سے ہم درویش ہیں   کر ہی چکتے ہیں جو کچھ دل میں ٹھنے
عالم خاکی بھی بسمل گاہ ہے   ہو رہے ہیں ڈھیر یاں سو سو جنے
اس شکارافگن کے ہم بھی صید ہیں
خاک و خوں میں لوٹتے چھاتی چھنے

(۱۲۶۶)

ہم پہ رہتے ہو کیا کر کستے   اچھے ہوتے نہیں جگر خستے
ہنستے کھینچا نہ کیجے تلوار   ہم نہ مر جائیں ہنستے ہی ہنستے
شوق لکھنے قلم جو ہاتھ آئی   لکھے کاغذ کے دستے کے دستے
میر قابل ہیں تنگ پوش اب کے   کہنیاں پھٹتے چولیاں چستے
رنگ لیتی ہے سب ہوا اس کا   اس سے باغ و بہار ہیں رستے
اک نگہ کر کے ان نے مول لیا   بک گئے آہ ہم بھی کیا سستے
میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا نہیں تھے کل بستے

(۱۲۶۷)

سب شرم جبین یار سے پانی ہے — ہرچند کہ گل شگفتہ پیشانی ہے
سمجھے نہ کہ بازیچۂ اطفال ہوئے — لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے
جوں آئینہ سامنے کھڑا ہوں یعنی — خوبی سے ترے چہرے کی حیرانی ہے
خط لکھتے جو خوں فشاں تھے ہم ان نے کہا — کاغذ جو لکھے ہے اب سو افشانی ہے
دوزخ میں ہوں جلتی جو رہے ہے چھاتی — دل سوختگی عذاب روحانی ہے
منت کی بہت تو ان نے دو حرف کہے — سو برسوں میں اک بات مری مانی ہے

کل سیل سا جوشاں جو ادھر آیا میر
سب بولے کہ یہ فقیر سیلانی ہے

(۱۲۶۸)

جی کے لگنے کی میر کچھ کہہ بھی — ہے وہی بات جس میں ہو تہ بھی
حسن اے رشک مہ نہیں رہتا — چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی
شور شیریں تو ہے جہاں میں ولے — ہے حلاوت زمانے کی وہ بھی
اس کے پنجے سے دل نکل نہ سکا — زور بیٹھی ہی یار کی گہ بھی
اس زمیں گرد میرے مہ سا نہیں — آسماں پر اگرچہ ہے مہ بھی
کیا کہوں اس کی زلف بن رو رو — میں پراگندہ دل گیا بہ بھی

مضطرب ہو جو ہمرہی کی میر
پھر کے بولا کہ بس کہیں رہ بھی

(۱۲۶۹)

کہیں آگ آہ سوزندہ نہ چھاتی میں لگا دیوے — خبر ہوتے ہی ہوتے دل جگر دونوں جلا دیوے
بہت روئے ہمارے دیدۂ تر اب نہیں کھلتے — متاع آب دیدہ ہے کوئی اس کو ہوا دیوے
تمھارے پاؤں گھر جانے کو عاشق کے نہیں اٹھتے — تم آؤ تو تمھیں آنکھوں پہ سر پر اپنے جا دیوے
دلیل گم رہی ہے خضر جو ملتا ہے جنگل میں — پھرے ہے آپھی بھولا کیا ہمیں رستہ بتا دیوے
گئے ہی جی کے فیصل ہو نیاز و ناز کا جھگڑا — کہیں وہ تیغ کھینچے بھی کہ بندہ سر جھکا دیوے
لڑائی ہی رہی روزوں میں باہم بے دماغی سے — گلے سے اس کے ہم کو عید اب شاید ملا دیوے

ہوا میں میر جو اس بت سے سائل بوسۂ لب کا
لگا کہنے ظرافت سے کہ شہ صاحب خدا دیوے

(۱۲۷۰)

تیر جوڑے وہ ماہ آتا ہے   ہم کو یہ تیر ماہ جاتا ہے
گل کو سر پر رکھیں سبھی لیکن   اب دماغ اپنا کب اٹھاتا ہے
اپنا اپنا ہے ذائقہ ہم کو   بوسۂ کنج لب ہی بھاتا ہے
آتش عشق جس کے دل کو لگے   شمع ساں آپ ہی کو کھاتا ہے
دیکھنا ہے تو ہے بہم پر وہ   ہم سے آنکھوں کو کب ملاتا ہے
میری تو ہے پلک سے چھوٹی نگاہ   اور وہ اس پہ منھ چھپاتا ہے
میرؔ صنائع ہے ملو اس سے
دیکھو تو باتیں کیا بناتا ہے

(۱۲۷۱)

شائستۂ غم و ستم یار ہم ہوئے   عاشق کہاں ہوئے کہ گنہگار ہم ہوئے
کی عرض جو متاع امانت ازل کے بیچ   سب اور لے سکے نہ خریدار ہم ہوئے
جی کھنچ گیا اسیر قفس کی فغاں کی اور   تھی چوٹ اپنے دل کو گرفتار ہم ہوئے
پامال یوں کیا کہ برابر ہیں خاک کے   کیا ظلم ہوگیا جو طلبگار ہم ہوئے
ہوتا نہیں ہے بے خبری کا مآل خوب   افسوس ہے کہ دیر خبردار ہم ہوئے
وصل اس طبیب زادے کا جی چاہتا رہا   آخر اس آرزو ہی میں بیمار ہم ہوئے
پھل ہے یہ میرؔ عشق کا اس نوبہار کے
آخر جو کشت و خوں کے سزاوار ہم ہوئے

(۱۲۷۲)

کہی میں ان لبوں کی جاں فزائی   یہ بات اک بے خودی میں منھ پر آئی
تعارف کیا رہا اہل چمن سے   ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی
کہاں کا بے ستوں فرہاد کیسا   یہ سب تھی عشق کی زورآزمائی
جفا اٹھتی وفا جو عمر کرتی   سو کی اس رفتنی نے بے وفائی
کہیں سو کیا کہیں سر پر ہمارے   قیامت شامت اعمال لائی
گیا اس ترک کی آمد کو سن جی   تھی ہم سے نہ اک دم بھی اوائی
موافق ٹک ہو تو تو پھر جہاں میں   مثل ہو میری تیری آشنائی
بغیر از چہرۂ مہتابی یار   ہمارے منھ پہ چھوٹے ہے ہوائی

گئی ٹکڑے ہو دل کی آرسی تو ہوئی صدچند اس کی خودنمائی
فراق یار کو آساں نہ سمجھو کہ جان و تن کی مشکل ہے جدائی
پھر آنا کعبے سے اپنا نہ ہوگا اب اس کے گھر کی ہم نے راہ پائی
ہوئے ہیں درد دل سے میر کے تنگ
پھر اس جوگی نے یاں دھونی لگائی

(۱۲۷۳)

ہوں خاک پا جو اس کی ہر کوئی سر چڑھاوے منھ پھیرے وہ تو ہم کو پھر کون منھ لگاوے
ان دو ہی صورتوں میں شکل اب نباہ کی ہے یا صبر ہم کو آوے یا رحم اس کو آوے
اس مہ بغیر عالم آنکھوں میں سب سیہ ہے دیکھیں تو عشق کیا کیا ہم کو کہیں دکھاوے
کچھ زخم کھل چلے ہیں کچھ داغ کھل رہے ہیں اب کے بہار دیکھیں کیا کیا شگوفے لاوے
جوں لیلیٰ اور مجنوں تا نقش کچھ رہے یاں اس کی مری بھی صورت یک جا کوئی بناوے
یہ طرح دار لڑکے دیں بیٹھنے تب اس کو جب جی سے اپنے کوئی ہر طرح دل اٹھاوے
ہم جس زمیں پہ آئے واں آسماں یہی تھا یارب جو کوئی جاوے تو کس طرف کو جاوے
شب سنتے حال میرا لیتا ہے موند آنکھیں مچلے سے میں کہوں کیا سوتا ہو تو جگاوے
طاعت کا محوتب ہے جب ڈھب نہیں بتوں سے
چھوڑے نماز واجب گر میر وقت پاوے

(۱۲۷۴)

بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے مرا دامن بنے تو باندھ دو گل کے گریباں سے
نہ تک واشد ہوئی دل کو نہ جی کی لاگ کچھ پائی رہے دس دن جو اپنی عمر کے یاں ہم سو مہماں سے
غم ہجراں نے شاید آگ دی اس ماہ بن دل کو شرارے تب تو نکلے ہیں ہماری چشم گریاں سے
سبب آشفتہ طبعی کا ہماری رہتے ہیں دونوں نہ دل جمعی ہے اس کے خط سے نے زلف پریشاں سے
ادھر زنجیر کے غل ہیں ادھر ہنگامے لڑکوں کے جنوں اس دشت میں ہم نے کیا ہے کیسے ساماں سے
محبت میں کسو کی رنج و محنت سے گئے دونوں رہی شرمندگی ہی عمر بھر مجھ کو دل و جاں سے
خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے
کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے

(۱۲۷۵)

برسوں تک جی کو مار مار رہے رات دن ہم امیدوار رہے

موسم گل تلک رہے گا کون　　چبھتے ہی دل کو خار خار رہے
وصل یا ہجر کچھ ٹھہر جاوے　　دل کو اپنے اگر قرار رہے
خوش نوا کیسے کیسے طائر قدس　　اس جفا پیشہ کے شکار رہے
اس کی آنکھوں کی مستی سے عاشق　　چاہیے یوں کہ ہوشیار رہے
دل لگے پر رہا نہیں جاتا　　رہیے اپنا جو اختیار رہے
کم ہے کیا لذت ہم آغوشی
سب مزے میر درکنار رہے

(۱۲۷۶)

یوں جنوں کرتے جو ہم یاں سے گئے　　تو میاں مجنوں بیاباں سے گئے
مر گئے دم کب تلک رکتے رہیں　　بارے جی کے ساتھ سب سانسے گئے
کیا بدن دیکھا چسی چولی سے ہائے　　مارے حسرت کے ہی ہم جاں سے گئے
جانب مسجد تھی وہ کافر نگاہ　　شیخ صاحب دین و ایماں سے گئے
بیچ میں آئے کسو کی زلف کے
میر اس رستے پریشاں سے گئے

(۱۲۷۷)

اے نوخط ایک دن ہے جھگڑا ہمارے تیرے　　سبزی بہت لگی ہے منھ سے پیارے تیرے
حیران حال عاشق ہوگی اجل پہنچ کر　　کیا حال یاں رہا ہے ظلموں کے مارے تیرے
ہر بار دیکھے ہے تو ایدھر ہی آہ شب نے　　کچھ تو اثر کیا ہے جی میں بھی بارے تیرے
باغ و بہار و نکہت گل پھول سب ہی تو ہے　　یاروں کی ہیں نظر میں یہ رنگ سارے تیرے
الماس میر تجھ کو کیا عشق نے دیا ہے
لخت جگر گرے ہیں جوں لعل پارے تیرے

(۱۲۷۸)

دو دیدۂ تر اپنے جو یار کو ہیں تکتے　　اک ایک کو نہیں پھر غیرت سے دیکھ سکتے
حرکت دلوں کی اپنے مذبوحی سی رہے ہے　　اب وہ نہیں کہ دھڑ دھڑ رہتے ہیں دل دھڑکتے
پلکوں کی اس کی جنبش جاتی نہیں نظر سے　　کانٹے سے اپنے دل میں رہتے ہیں کچھ کھٹکتے
ہوتا تھا گاہ گاہے محسوس درد آگے　　اب دل جگر ہمارے پھوڑے سے ہیں لپکتے
پڑتی ہیں ایدھر اودھر دے سرخ آنکھیں ایسی　　دو ترک مست جیسے ہوں راہ میں بھٹکتے
شعلوں کے ڈانک گویا لعلوں تلے دھرے ہیں　　چہروں کے رنگ ہم نے دیکھے ہیں کیا جھمکتے

یاں بات راہ کی تو سنتا نہیں ہے کوئی   جاتے ہیں ہم جرس سے اس قافلے میں بکتے
جاگہ سے لے گئے ہیں نازاں جب آگئے ہیں   نوبادگان خوبی جوں شاخ گل لچکتے
اس حسن سے کہاں ہے غلطانی موتیوں کی
جس خوبصورتی سے میر اشک ہیں ڈھلکتے

(۱۲۷۹)

غم مرگ سے دل جگر ریش ہے   عجب مرحلہ ہم کو درپیش ہے
بلا ہے اسے شوق تیر و کماں   یہیں سے ہے پیدا ستم کیش ہے
دلا اس کے ظاہر پہ مت جائیو   وہ خوش رو تو ہے پر بد اندیش ہے
بہت خوب ہے لعل نوشین یار   ولیکن خط پشت لب نیش ہے
ہمیں کیا جو ہے میر بیہوش سا
خدا جانے یہ کیا ہی درویش ہے

(۱۲۸۰)

گوش ہر یک کا اسی کی اور ہے   کیا قیامت کا قیامت شور ہے
پوچھنا اس ناتواں کا خوب تھا   پر نہ پوچھا ان نے وہ بھی زور ہے
صندل درد سر مہر و وفا   عاقبت دیکھا تو خاک گور ہے
رشتۂ الفت تو نازک ہے بہت   کیا سمجھ کر علق اس پر ڈور ہے
ناکسی سے میر اس کوچے کے بیچ
اس طرح نکلے ہے جیسے چور ہے

(۱۲۸۱)

شب اگر دل خواہ اپنے بےقراری کیجیے   لے زمیں سے تا فلک فریاد و زاری کیجیے
ایک دن ہو تو کریں احوال گیری دل کی آہ   مر گئے ہم کب تلک تیمارداری کیجیے
نوچیے ناخن سے منھ یا چاک کریے سب جگر   جی میں ہے آگے ترے کچھ دستکاری کیجیے
جائیے اس شہر ہی سے اب گریباں پھاڑ کر   کیجیے کیا غم سے یوں ماتم گذاری کیجیے
یوں بنے کب تک کہ بےلعل لب اس کے ہر گھڑی   چشمہ چشمہ خون دل آنکھوں سے جاری کیجیے
کنج لب اس شوخ کا بھی رکھنے کی جاے ہے   صرف کچھ عمر تو اس جاے ساری کیجیے
کوہ غم سر پر اٹھا لیجے نہ کہیے منھ سے کچھ   عشق میں جوں کوہکن کچھ بردباری کیجیے
گرچہ جی کب چاہتا ہے آپ کا آنے کو یاں   پر کبھو تو آیئے خاطر ہماری کیجیے
آشنا ہو اس سے ہم مر مر گئے آئندہ میر
جیتے رہیے تو کسو سے اب نہ یاری کیجیے

(۱۲۸۲)

صدگونہ عاشقی میں ہم نے جفا سہی ہے
پر یہ کہا نہ ظالم اس کی نہیں سہی ہے

کرتی پھری ہے رسوا سارے چمن میں مجھ کو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے

ہے صبح کا سا عرصہ پیری کا اس میں کیا ہو
باقی ہے وقت کتنا فرصت کہاں رہی ہے

درویش جب ہوئے ہم تب ہے ہمیں برابر
کشکول بازگوں ہے یا افسرشہی ہے

جیتے رہے بہت ہم جو یہ ستم اٹھائے
عمر دراز کی سب تقصیر و کوتہی ہے

رونے میں متصل ہے ہونٹوں پہ آہ میری
جاتا نہیں ہے سمجھا یہ باؤ کیا بہی ہے

آزار عاشقی میں کاہے کی پھر توقع
ہوجائے یاس جس سے سو رنج یہ وہی ہے

روتا ہمیں نظر کر رہنا کیے کنارہ
چڑھنا ہمارے منھ پہ دریا کی بے تہی ہے

چلاہٹ اس طرح کی جز میر کس سے ہووے
باور نہ ہو تو دیکھو یہ ہو نہ ہو وہی ہے

(۱۲۸۳)

کل جوش غم میں آنسو ٹپکے نہ چشم تر سے
افسوس ہے کہ آکر یوں مینھ ٹک نہ برسے

کیا ہے نمود مردم جو کہیے دیکھیو تم
مژگاں بہم زدن میں جاتی رہی نظر سے

ہم سا شکستہ خاطر اس بستی میں نہ ہوگا
برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے

معلوم اگلی سی تو جرأت الم کشی میں
کیا کام نکلے گا اب ٹکڑے ہوئے جگر سے

آئینہ دار اسی کے پاتے ہیں شش جہت کو
دیکھیں تو منھ دکھاوے وہ کام جاں کدھر سے

مت رنج کھینچ مل کر ہشیار مرداں سے
اس کی خبر ملے گی اک آدھ بے خبر سے

جب گوش زد ہو اس کے تب بے دماغ ہو وہ
بس ہوچکی توقع اب نالۂ سحر سے

اے رشک مہ کبھو تو آ چاند سا نکل کر
منھ دیکھنے کو تیرا تا چند کوئی ترسے

چاہت بری بلا ہے کل میر نالہ کش بھی
ہمراہ نے سواراں دوڑے پھرے نفر سے

(۱۲۸۴)

برق و شرار و شعلہ و پروانہ سب ہیں یے
جوں ہم جلا کریں ہیں بھلا جلتے کب ہیں یے

لے موے سر سے ناخن پا تک بھری ہے آگ
جلتے ہیں دردمند پہ جلتے کڈھب ہیں یے

ہوتا ہے دل کا حال عجب غم سے اس گھڑی
کہتا ہے جب وہ طنز سے ہم کو عجب ہیں یے

آتی ہے گرم بادصبا اس کی اور سے
اپنے جگر کے جلنے کے بارے سبب ہیں یے

غربت پہ مہرباں ہوئے میری سو یہ کہا — ان کو غریب کوئی نہ سمجھے غضب ہیں یے
فرہاد و قیس کے گئے کہتے ہیں اب یہ لوگ — ق — رکھے خدا سلامت انھوں کو کہ اب ہیں یے
سید ہیں میر صاحب و درویش و دردمند
سر رکھیے ان کے پاؤں پہ جائے ادب ہیں یے

(۱۲۸۵)

خوش طرح مکاں دل کے ڈھانے میں شتابی کی — اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی
سکے ہے دل ایدھر کو بہتا ہے جگر اودھر — چھاتی ہوئی ہے میری دکان کبابی کی
وہ نرگس مستانہ باتیں کرے ہے درہم — تم دیکھو نہ کچھ بولو کیا بات شرابی کی
بے سدھ ہوئے ہم آئی اک بو جو گلستاں سے — پرزور تھی مے کتنی غنچوں کی گلابی کی
رونے سے دل شب کے تر میر کے کپڑے ہیں
پر قدر نہیں اس کو اس جامۂ آبی کی

(۱۲۸۶)

کوئی ساحر اس کو کچھ جادو کرے — وہ جو بے رو اس طرف ٹک رو کرے
دور سے ٹک ملتفت ہوتے رہو — جب تلک دوری سے کوئی خو کرے
دم میں ہو آئینۂ عالم سیاہ — ایک اگر عاشق قلندر ہو کرے
کس سے تیری چاہیے دادِ ستم — کاش انصاف اپنے دل میں تو کرے
غنچہ پیشانی چمن میں میں رہا — بے دماغ عشق گل کیا بو کرے
لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق — پانی کردے چشم دل لوہو کرے
اب جنوں میں میر موے دشت جائے
کار وحشت کے تئیں یک سو کرے

(۱۲۸۷)

حدیث زلف دراز اس کے منھ کی بات بڑی — کبھو کے دن ہیں بڑے یاں کبھو کی رات بڑی
کبھو جو گالی ہمیں دیتے ہو کرو موقوف — تمھاری بس ہیں یہی ہم پر التفات بڑی
دخیل ذات نہیں عشق میں کہ میر کو دیکھ
ذلیل کیسے ہیں ان کی ہے گو کہ ذات بڑی

(۱۲۸۸)

ہے تماشا حسن و خط حیرت بھی ہے — یعنی خط تو خوب ہے صورت بھی ہے

تا دم آخر نہیں بولے ہیں ہم　　کچھ کہیں گے بارے اب رخصت بھی ہے
ہے وہ فتنہ ہم حریف و ہم ظریف　　مار ہے گالی ہے پھر منت بھی ہے
تیغ نے اس کی ہمیں قسمت کیا　　خوش نصیبی ہے تو پر قسمت بھی ہے
وا نسیم صبح سے ہوتا ہے گل　　تجھ کو اے مرغ چمن غیرت بھی ہے
جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط　　اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے
دور سے باتیں کرے ہے یوں ہی یار
میر صاحب سے انھیں صحبت بھی ہے

(۱۲۸۹)

چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے　　فقیروں کی اللہ اللہ ہے
نہ افسر ہے نے درد سر نے کلہ　　کہ یاں جیسا سر ویسا سرواہ ہے
جہاں لگ چلے گل سے ہم داغ ہیں　　اگرچہ صبا بھی ہواخواہ ہے
غم عشق ہے ناگہانی بلا　　جہاں دل لگا کڑھنا جانکاہ ہے
چراغان گل سے ہے کیا روشنی　　گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے
محبت ہے دریا میں جا ڈوبنا　　کنوئیں میں بھی گرنا یہی چاہ ہے
کلی سا ہے کہتے ہیں منھ یار کا　　نہیں معتبر کچھ یہ افواہ ہے
نہ کی کوتہی بت پرستی میں کچھ　　خدا اس عقیدے سے آگاہ ہے
گیا میر کے جی کی سن کر وہ شوخ
لگا کہنے سب کو یہی راہ ہے

(۱۲۹۰)

یار کا جور و ستم کام ہی کر جاتا ہے　　کتنا جی عاشق بیتاب کا مرجاتا ہے
جیسے گرداب ہے گردش مری ہر چار طرف　　شوق کیا جانے لیے مجھ کو کدھر جاتا ہے
جوشش اشک میں ٹک ٹھہرے رہو پیش نظر　　اب کوئی پل میں یہ سیلاب اتر جاتا ہے
زرد رخسار پہ کیوں اشک نہ آوے گل رنگ　　آگے سے آنکھوں کے وہ باغ نظر جاتا ہے
زہ گریباں کی ہے خوناب سے تر ہوتی نہیں　　سارا زنجیرۂ دامن بھی تو بھر جاتا ہے
واعظ شہر تنک آب ہے مانند حباب　　ٹک ہوا لگتی ہے اس کو تو ابھر جاتا ہے
کیا لکھوں بخت کی برگشتگی نالوں سے مرے　　نامہ بر مجھ سے کبوتر بھی چپر جاتا ہے
آن اس دلبر شیریں کی چھری شہد کی ہے　　عاشق اک آن ہی میں جی سے گذر جاتا ہے
ہر سحر پیچھے اس اوباش کے خورشید اے میر
ڈھال تلوار لیے جیسے نفر جاتا ہے

(۱۲۹۱)

ٹھوکر لگا کے چلنا اس رشک ماہ کو بھی
یہ چوٹ ہی رہی ہے اس روسیاہ کو بھی

اس شاہ حسن کی کچھ مژگاں پھری ہوئی ہیں
غمزے نے ورغلایا شاید سپاہ کو بھی

کی عمر صرف ساری پر گم ہے مطلب اپنا
منزل نہ پہنچے ہم تو طے کرکے راہ کو بھی

سر پھوڑنا ہمارا اس لڑکے پر نہ دیکھو
ٹک دیکھو اس شکست طرف کلاہ کو بھی

کرتی نہیں خلش ہی مژگان یار دل میں
کاوش رہی ہے جی سے اس کی نگاہ کو بھی

خوں ریزی کے تو لاگو ہوتے نہیں یکایک
پہلے تو پوچھتے ہیں ظالم گناہ کو بھی

جوں خاک سے ہے یکساں میرا نہال قامت
پامال یوں نہ ہوتے دیکھا گیاہ کو بھی

ہر لحظہ پھیر لینا آنکھوں کا ہم سے کیا ہے
منظور رکھیے کچھ تو بارے نباہ کو بھی

خواہش بہت جو ہو تو کاہش ہے جان و دل کی
کچھ کم کر ان دنوں میں اے میر چاہ کو بھی

(۱۲۹۲)

سنا جاتا ہے اے گھتیے ترے مجلس نشینوں سے
کہ تو دارو پیے ہے رات کو مل کر کمینوں سے

گئی گرم اختلاطی کب کی ان سحر آفرینوں سے
لگے رہتے ہیں داغ ہجر ہی اب اپنے سینوں سے

گلے لگ کر نہ یک شب کاش وہ مہ سوگیا ہوتا
مری چھاتی جلا کرتی ہے اب کتنے مہینوں سے

خدا جانے ہے اپنا تو جگر کانپا ہی کرتا ہے
چڑھی تیوری سے محبوبوں کی اور ابرو کی چینوں سے

بہت کوتاہ دامن خرقے شیخوں کے پھٹے پائے
کہیں نکلے تھے گورے ہاتھ اس کے آستینوں سے

رہے محو خیال اس کے تو یک وقت سے ہاتھ آئے
نزاکت اس کمر کی پوچھی ہم باریک بینوں سے

برنگ برگ گل ساتھ ایک شادابی کے ہوتا ہے
عرق چیں بھیگتا ہے دلبروں کے جب پسینوں سے

بہت میں لخت دل رویا مجھے اک خلق نے جانا
ہوا ہے پہن میرا نام ان رنگیں نگینوں سے

غزل ہی کی ردیف و قافیہ کا رفتہ رہنا ہے
نکلنا میر اب مشکل ہے میرا ان زمینوں سے

(۱۲۹۳)

بیتابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے
اب دیکھوں مجھے کس کا گرفتار کرے ہے

کچھ میں بھی عجب جنس ہوں بازار جہاں میں
سو ناز مجھے لیتے خریدار کرے ہے

ہے اشک سے بلبل کے بھرا چھتروں میں پانی
گل باغ سے کیا رخت سفر بار کرے ہے

اس چاہ نے دل ہی کی تو بیمار کیے ہیں
یہ دوستی ہی ہے جو گرفتار کرے ہے

آگے تو جو کچھ ہم نے کہا مان لیا اب ایک ایک سخن پر بھی وہ تکرار کرے ہے
زنہار نہ جا پرورش دور زماں پر مرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرے ہے
کیا عشق میں ہم اس کے ہوئے خاک برابر کب اپنے تئیں یوں کوئی ہموار کرے ہے
تصویر سے دروازے پہ ہم اس کے کھڑے ہیں انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے
کیوں کر نہ ہو تم میرؔ کے آزار کے درپے
یہ جرم ہے اس کا کہ تمھیں پیار کرے ہے

(۱۲۹۴)

دشمنوں کے روبرو دشنام ہے یہ بھی کوئی لطف بے ہنگام ہے
محو زلف یار ہے عالم تمام حسن کا بھی شہرہ جوش شام ہے
عشق کی ہے راہ کیا مشکل گذر سر کا جانا جس میں ہر اک گام ہے
گر کہا ناکام ملنے کو کبھی تو یہ کہتا ہے کہ مجھ کو کام ہے
روز و شب پھرتا ہوں اس کوچے کے گرد کیا کہوں کیا گردش ایام ہے
چین دن کو ہے نہ شب کو خواب تک اس کی دوری میں کسے آرام ہے
بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو
میرؔ ان لوگوں میں کس کا نام ہے

(۱۲۹۵)

دل عجب نسخۂ تصوف ہے ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے
آپ ہی صرف عشق ہوجانا یہ بھی درویش کا تصرف ہے
منھ ادھر کر کے وہ نہیں سوتا خواب میں آوے تو تلطف ہے
یاں تو تکلیف سی کھنچی تکلیف واں وہی اب تلک تکلف ہے
چھیڑ اس شوخ نے رکھی ہم سے عہد پر عہد ہے تخلف ہے
مرگ کیا منزل مراد ہے میرؔ
یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

(۱۲۹۶)

تسکین دردمندوں کو یارب شتاب دے دل کو ہمارے چین دے آنکھوں کو خواب دے
اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے
گل ہے بہار تب ہے جب آنکھوں میں ہو نشہ جاتی ہے فصل گل کہیں ساقی شراب دے

وہ تیغ میری تشنۂ خوں ہوگئی ہے کند ... کر رحم مجھ پہ کاشکے یار اس کو آب دے
دو چار الم جو ہوویں تو ہیں بابت بتاں ... کیا درد بے شمار کا کوئی حساب دے
تار نگہ کا سوت نہیں بندھتا ضعف سے ... بیجان ہے یہ رشتہ دلا اس کو تاب دے
مژگان تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

(۱۲۹۷)

نہ جرأت ہے نہ جذبہ ہے نہ یاری بخت بد سے ہے ... یہی بے طاقتی خوں گشتہ دل کو میرے کد سے ہے
جہاں شطرنج بازندہ فلک ہم تم ہیں سب مہرے ... بسان شاطرنو ذوق اسے مہروں کی زد سے ہے
سخن کرنے میں نستعلیق گوئی ہی نہیں کرتا ... پڑھیں ہیں شعر کوئی ہم سو وہ بھی شد و مد سے ہے
ہوا سرسبز آگے یار کے سرو گلستاں کب ... کہ نسبت دور کی طوبیٰ کو اس کے نخل قد سے ہے
لکھا کب تک کریں اس سرزمیں سے آپھی اب جاویں
ہمیں ملنے کا شوق اس کے زیاد اے میر حد سے ہے

(۱۲۹۸)

کٹ کر گریں گے راہ میں مشتاق علف سے ... منھ پھیر اگر ہوگئی اس تیغ بکف سے
جاتا ہے کوئی دشت عرب کو جو بگولا ... کہہ دوں ہوں دعا مجنوں کو میں اپنی طرف سے
دریا تھا مگر آگ کا دریاے غم عشق ... سب آبلے ہیں میرے درونے میں صدف سے
دل اور جگر یہ تو جلے آتش غم میں ... جی کیونکے بچاؤں کہو اس آگ کی تف سے
شب اس کے سگ کو نے ہمیں پاس بٹھایا ... ہم اپنے تئیں دور نہ کیوں کھینچیں شرف سے
چھاتی میں بھری آگ ہے کیا جس سے شب و روز ... چنگاریاں گرتی ہیں مری پلکوں کی صف سے
اے میر گدائی کروں دروازے کی اس کے
مانگوں ہوں یہی آٹھ پہر شاہ نجف سے

(۱۲۹۹)

کہو کچھ میر کی وحشت سے ان گلیوں میں آنے کی ... خبر کیوں پوچھتے ہیں مجھ سے لڑکے اس دوانے کی
جہاں سے دل کو دیکھو منھ نظر جوں کان طلق آوے ... نہ کی کچھ قدر اس نے حیف اس آئینہ خانے کی
ہمیں لیتے ہو آنکھیں موند کر لو تم کہ جنس اپنی ... وفا و مہر ہے سو وہ نہیں بابت دکھانے کی
کہو ہو زیرلب کیا دیکھ کر ہم ناتوانوں کو ... ہماری جان میں طاقت نہیں باتیں اٹھانے کی
برنگ طائر نوپر ہوئے آوارہ ہم اٹھ کر ... کہ پھر پائی نہ ہم نے راہ اپنے آشیانے کی

عجب چوپڑ بچھی ہے ہر زماں اڑتا ہے رنگ اپنا   سمجھ میں چال کچھ آتی نہیں اپنے زمانے کی
اگر طالع کرے یاری تو مریے کربلا جا کر   عبیر اپنے کفن کی خاک ہو اس آستانے کی

غزل اک اور بھی اس گل زمیں میں قصد ہے کہیے
ہوئی ہے اب تو خو آخر ہمیں باتیں بنانے کی

(۱۳۰۰)

عزیز و کون سی صورت ہے ظاہر اس کے آنے کی   قسم کھائی ہو جس نے خواب میں بھی منھ دکھانے کی
تنک ان پلکوں کو ہے ٹھوکر سے فتنے کے جگانے کی   طرح آتی ہے اس، قد کو قیامت سر پہ لانے کی
کسو سے آنکھ کے ملتے ہی اپنی جان دے بیٹھے   نئی یہ رسم ہم جاتے ہیں چھوڑے دل لگانے کی
جہاں ہم آئے چہرے پر بکھیرے بال جا سوئے   ادا کرتے ہو تم کیا خوب ہم سے منھ چھپانے کی
مسیں بھیگی ہیں اس کے سبزۂ خط کی بدایت سے   مسیح و خضرؑ کو پہنچی بشارت زہر کھانے کی
جہاں اس کے لیے غربال کر نومید ہو بیٹھے   یہی اجرت ملی ہے کیا ہماری خاک چھانے کی
کہوں کیا ایک بوسہ لب کا دے کر خوب رگڑایا   رکھی برسوں تلک منت کبھو کی بات مانے کی
بگولا کوئی اٹھتا ہے کہ آندھی کوئی آتی ہے   نشان یادگاری ہے ہماری خاک اڑانے کی
کرے ہے داغ اس کا عید کو سب سے گلے ملنا   اکت لی ہے نئی یہ میری چھاتی کے جلانے کی

لڑا کر آنکھیں اس اوباش سے اک پل میں مر گذرا
حکایت بوالعجب ہے میرؔ جی کے مارے جانے کی

(۱۳۰۱)

کریہہ الشکل ہیئت آن کر ایسی نہیں دیکھی   کہ صورت آسماں کی دیکھ کر میں نے زمیں دیکھی
کبھو دیکھوگے تم جو وہ طرح دار اس طرف آیا   طرح ترکیب ایسی ہم نے اب تک تو نہیں دیکھی
مہ یک ہفتہ دلکش اس قدر کاہے کو ہوتا ہے   کروں ہوں شکر کے سجدے کہ میں نے وہ جبیں دیکھی
کہاں وہ طرز کیں اس کی کہاں چیں جبیں اس کی   لگا کر بارہا اس شوخ سے تصویر چیں دیکھی
گریباں پھاڑ ڈالیں دیکھ کر دامن کشاں اس کو   پھٹے خرقے بہت جو چاک کی وہ آستیں دیکھی
ترے بیمار کی بالیں پہ جا کر ہم بہت روئے   بلا حسرت کے ساتھ اس کی نگاہ واپسیں دیکھی

نظر اس کی حیا سے میرؔ پشت پا پر اکثر ہے
کنھوں نے کاہے کو اس کی سی چشم شرگیں دیکھی

(۱۳۰۲)

دن فصل گل کے اب کے بھی جاتے ہیں باؤ سے   دل داغ ہو رہا ہے چمن کے سبھاؤ سے

پہنچی نہ باس گل کی ہمارے مشام میں
یاں کھل رہے ہیں دیدۂ خوں بار گھاؤ سے

نامہ مرے عمل کا بھی اے کاش ساتھ جائے
جب آسمان لپٹیں گے کاغذ کے تاؤ سے

وارفتگان عشق بھی کیا طرفہ لوگ ہیں
دل کے گئے پہ دیتے ہیں جی کیسے چاؤ سے

کہتے تو کہیے بات کوئی دل کی میر سے
پر جی بہت ڈرے ہے انھوں کے چواؤ سے

(۱۳۰۳)

کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے
جھمک کوئی رہ جائے کوئی جی سے گذر جائے

تاچند یہ خمیازہ کشی تنگ ہوں یارب
آغوش مری ایک شب اس شوخ سے بھر جائے

بے طاقتی دل سے مری جان ہے لب پر
تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے

پڑتے نگہ یار مرا حال ہے ویسا
بجلی کے تڑپنے سے کوئی جیسے کہ ڈر جائے

اس آئینہ رو شوخ مفتن سے کہیں کیا
عاشق کو برا کہہ کے منھ ہی منھ میں مکر جائے

ناکس کی تلافی ستم کون کرے ہے
ڈرتا ہوں کہ وہ اور بھی آزردہ نہ کر جائے

جاتا ہے جدھر منزل مقصود نہیں وہ
آوارہ جو ہو عشق کا بے چارہ کدھر جائے

رونے میں مرے سر نہ چڑھو صبر کرو تک
یہ سیل جو اک زور سے آتا ہے اتر جائے

کیا ذکر مرا میں تو کہیں اس سے ملوں ہوں
ان خانہ خرابوں کی کہو جن کے وہ گھر جائے

اس زلف کا ہر بال رگ جان ہے اپنی
یاں جی ہی بکھرتا ہے صبا وہ جو بکھر جائے

گردش میں جو وے آنکھ نشے کی بھری دیکھیں
ہشیار سروں کے تئیں سدھ اپنی بسر جائے

آنکھیں ہی لگی جاتی ہیں اس جاذبہ کو میر
آتی ہے بہت دیر جو اس منھ پہ نظر جائے

(۱۳۰۴)

بتوں کے جرم الفت پر ہمیں زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے

کھڑا ہوتا نہیں وہ رہزن دل پاس عاشق کے
موافق رسم کے اک دور کی صاحب سلامت ہے

جھکی ہے شاخ پرگل ناز سے کیا صحن گلشن میں
نہال قد کی اس کے مدعی تھی سو ندامت ہے

نکلتا ہے سحر خورشید ہر روز اس کے گھر پر سے
مقابل ہوگیا اس سے تو اس سادہ کی شامت ہے

پیے دارو پڑے پھرتے تھے کل تک میر کوچوں میں
انھیں کو مسجد جامع کی دیکھی آج امامت ہے

(۱۳۰۵)

خدا کرے مرے دل کو تنک اک قرار آوے　　کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے
کمانیں اس کی بھووں کی چڑھی ہی رہتی ہیں　　نہ جب تلک سرِ تیرِ ستم شکار آوے
ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دوبھر ہے　　خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے
اٹھی بھی گرد رہ اس کی کہیں تو لطف ہے کیا　　جب انتظار میں آنکھوں ہی پر غبار آوے
ہر ایک شے کا ہے موسم نہ جانے تھا منصور　　کہ نخل دار میں حلق بریدہ بار آوے
تمھارے جوروں سے اب حال جائے عبرت ہے　　کسو سے کہیے تو اس کو نہ اعتبار آوے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

(۱۳۰۶)

نکلے ہے جی کا رستہ آواز کی رکن سے　　آزردہ ہو نہ بلبل جاتے ہیں ہم چمن سے
جی غش کرے ہے اب تو رفتار دیکھ اس کی　　دیکھیں نبھے ہے اپنی کس طور اس چلن سے
گر اس کی اور کوئی گرمی سے دیکھتا ہے　　اک آگ لگ اٹھے ہے اپنے تو تن بدن سے
رنگیں خرامی کیا کیا لیتی ہے کھینچ دل کو　　کیا نقش پا کو اس کے نسبت گل وسمن سے
دن رات گاہ و بے گہ جب دیکھو ہیں سفر میں　　ہم کس گھڑی وداعی یارب ہوئے وطن سے
دل سوختہ ہوں مجھ کو تکلیف حرف مت کر　　اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

دل کا اسیر ہونا جی میر جانتا ہے
کیا پیچ پاچ دیکھے اس زلف پرشکن سے

(۱۳۰۷)

کعبے کے در پہ تھے ہم یا دیر میں در آئے　　آوارگی تو دیکھو کیدھر سے کیدھر آئے
دیوانگی ہے میری اب کے کوئی تماشا　　رہتے ہیں گھیرے مجھ کو کیا اپنے کیا پرائے
پاک اب ہوئی ہے کشتی ہم کو جو عشق سے تھی　　عہدے سے اس بلا کے کب ناتواں بر آئے
وسعت بیاں کروں کیا دامان چشم تر کی　　رونے سے میرے کیا کیا ابر سیہ تر آئے

آ ہم نشیں بنے تو آج ان کنے بھی چلیے
کہتے ہیں میر صاحب مدت میں کل گھر آئے

(۱۳۰۸)

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے　　ایکوں کو جا نہیں ہے دنیا عجب جگہ ہے

اس کے بدن میں ہر جا دلکش ہے یوں ولیکن   یا سطحِ رخ جگہ ہے یا کنجِ لب جگہ ہے
پست و بلندیاں ہیں ارض و سما سے ظاہر   دیکھا جہاں کو ہم نے کتنی کڈھب جگہ ہے
دروازے سے لگے ہم تصویر سے کھڑے ہیں   وارفتگاں کو اس کی مجلس میں کب جگہ ہے
بارے ادھر کیا ہے منھ ان نے میر اپنا
ہو حرف زن سخن کی تیرے بھی اب جگہ ہے

(۱۳۰۹)

دل کی بیماری سے طاقت طاق ہے   زندگانی اب تو کرنا شاق ہے
دم شماری سی ہے رنجِ قلب سے   اب حساب زندگی بیباق ہے
اپنی عزلت رکھتی ہے عالم ہی اور   یہ سیہ رو شہرۂ آفاق ہے
فرطِ خجلت سے گرا جاتا ہے سرو   قد دلکش اس کا بالا چاق ہے
دل زدہ کو اس کے دیکھا نزع میں   تھا نمودار آنکھ سے مشتاق ہے
رنگ میں اس کے جھمک ہے برق کی   سطح کیا رخسار کا براق ہے
گو خط اس کے پشت لب کا زہر ہو   بوسۂ کنجِ دہن تریاق ہے
خشک کر دیتی ہے گرمی عشق کی   بیدِ صحرائی سا مجنوں قاق ہے
مت پڑا رہ دیر کے ٹکڑوں پہ میر
اٹھ کے کعبے چل۔ خدا رزاق ہے

(۱۳۱۰)

بات کیا آدمی کی بن آئی   آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اس کے واسطے ہے مدام   ہوگیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی   اس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
کیسے کیسے کیے تردد جب   رنگ رنگ اس کو چیز پہنچائی
اس کو ترجیح سب کے اوپر دی   لطفِ حق نے کی عزت افزائی
حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ   خودسری خودستائی خودرائی
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا   یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی
سو تو اس کی طبیعت سرکش   سر نہ لائی فرو کہ تک لائی
میر ناچیز مشتِ خاک اللہ
ان نے یہ کبریا کہاں پائی

(۱۳۱۱)

دست بستہ کام ناخن کر گئے ‌ سب خراشوں ہی سے جبہے بھر گئے
بت کدے سے تو چلے کعبے ولے ‌ دس قدم ہم دل کو کر پتھر گئے
کیا جو اڑتی سی سنی آئے ہیں گل ‌ ہم اسیروں کے تو بال و پر گئے
مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں ‌ لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے
تھے لب جو پر جو گرم دید یار ‌ سبزے کے سے رنگ مژگاں تر گئے
خانوادے ہوگئے کیا کیا خراب ‌ خانہ ساز دین کیسے مر گئے
دست افشاں پاےکوباں شوق میں
صومعے سے میرؔ بھی باہر گئے

دیوان چہارم

دیوان چہارم

ردیف الف

(۱۳۱۲)

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا — سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا
میں نے نکل جنوں سے مشق قلندری کی — زنجیر سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو پا کا
یارب ہماری جانب یہ سنگ کیوں ہے عائد — جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا
کیا فقر میں گذر ہو چشم طمع سیے بن — ہے راہ تنگ ایسی جیسے سوئی کا ناکا
ابر اور جوش گل ہے چل خانقہ سے صوفی — ہے لطف میکدے میں دہ چند اس ہوا کا
ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں — مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کاکا
آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو — جنگل میں چل بنے تو پھولا ہے زور ڈھاکا
یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم — یا عالم آئینہ ہے اس یار خودنما کا
کیا میں ہی جاں بہ لب ہوں بیماری دلی سے — مارا ہوا ہے عالم اس درد بے دوا کا
زلف سیاہ اس کی رہتی ہے چت چڑھی ہی — میں مبتلا ہوا ہوں اے وائے کس بلا کا

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مریں گے
آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا

(۱۳۱۳)

واجب کا ہو نہ ممکن مصدر صفت ثنا کا — قدرت سے اس کی لب پر نام آوے ہے خدا کا
سب روم روم تن میں زردیِ غم بھری ہے — خاک جسد ہے میری کس کان زر کا خاکا
بند اس قبا کا کھولیں کیا ناخن فقیراں — وابستہ ہے یہ عقدہ شاید کسو دعا کا
ناسازی طبیعت کیا ہے جواں ہوئے پر — اوباش وہ ستمگر لڑکا ہی تھا لڑاکا
گل پھول فصل گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ — میں دل زدہ ہوں اب کے رنگینی ہوا کا
عاشق کی چشم تر میں گو دبتے آویں لیکن — پاؤں کا دلبروں کے چھپتا نہیں چھپاکا

زوریں کش اس جواں کی کس سے کماں کھنچے ہے
تھا یکہ و جنازہ میر ان نے جس کو تاکا

(۱۳۱۴)

قصہ کہیں تو کیا کہیں ملنے کی رات کا — پہروں چواؤ ان نے رکھا بات بات کا
جرأت سے گرچہ زرد ہوں پر مانتا ہے کون — منھ لال جب تلک نہ کروں پانچ سات کا

کیونکر بسر کرے غم و غصہ میں ہجر کے　　خوگر جو ہو کسو کے کوئی التفات کا
جاگہ سے لے گیا ہمیں اس کا خرام ناز　　ٹھہراؤ ہو سکا نہ قرار و ثبات کا
ڈرتا ہوں مالکان جزا چھاتی دیکھ کر　　کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اس کے ہاتھ کا
واعظ کہے سو سچ ہے ولے مے فروش سے　　ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوٰت کا
بھونکا کریں رقیب پڑے کوے یار میں　　کس کے تئیں دماغ عفف ہے سگات کا
ان ہونٹوں کا حریف ہو ظلمات میں گیا　　پردے میں رو سیاہ ہے آب‌حیات کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے　　کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا
گر یار میر اہل ہے تو کام سہل ہے
اندیشہ تجھ کو یوں ہی ہے اپنی نجات کا

(۱۳۱۵)

تجاہل تغافل تساہل کیا　　ہوا کام مشکل توکل کیا
نہیں تاب لاتا دل زار اب　　بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمین غزل ملک سی ہوگئی　　یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
جنوں تھا نہ مجھ کو نہ چپ رہ سکا　　کہ زنجیر ٹوٹی تو میں غل کیا
نہ سوز دروں فصل گل میں چھپا　　سر و سینہ سے داغ نے گل کیا
ہمیں شوق نے صاحبو کھو دیا　　غلاموں سے اس کے توسل کیا
حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی
شب و روز ہم نے تامل کیا

(۱۳۱۶)

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا　　جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں　　دیکھ رہتا ہوں دیر منھ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا　　میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا
ہم تو ناکام ہی چلے یاں سے　　تم کو ہوگا وصول مطلب کا
درس کہیے جنوں کا تو مجنوں　　اپنے آگے ہے طفل مکتب کا
لعل کی بات کون سنتا ہے　　شور ہے زور یار کے لب کا
زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

(۱۳۱۷)

میں جو نظر سے اس کی گیا تو وہ سرگرم کار اپنا
کہنے لگا چپکا سا ہوکر ہائے دریغ شکار اپنا

کیا یاری کر دور پھرا وہ کیا کیا ان نے فریب کیے
جس کے لیے آوارہ ہوئے ہم چھوٹا شہر و دیار اپنا

ہاتھ گلے میں ان نے نہ ڈالا میں یہ گلا جا کاٹوں گا
تم غصے سے دیکھیو ہوں گا آپھی گلے کا ہار اپنا

چھاتی پہ سانپ سا پھر جاتا ہے یاد میں اس کے بالوں کی
جی میں لہر آوے ہے لیکن رہتا ہوں من مار اپنا

بات کہی تلوار نکالی آنکھ لڑائی جی مارے
کیونکے جتاوے اس سے کوئی ربط محبت پیار اپنا

ہم نے یار وفاداری میں کوتاہی تقصیر نہ کی
کیا روویں چاہت کے اثر کو وہ نہ ہوا ٹک یار اپنا

رحم کیا کر لطف کیا کر پوچھ لیا کر آخر ہے
میر اپنا غم خوار اپنا پھر زار اپنا بیمار اپنا

(۱۳۱۸)

اے کاش مرے سر پر اک بار وہ آجاتا
ٹھہراؤ سا ہو جاتا یوں جی نہ چلا جاتا

تب تک ہی تحمل ہے جب تک نہیں آتا وہ
اس رستے نکلتا تو ہم سے نہ رہا جاتا

اک آگ لگا دی ہے چھاتی میں جدائی نے
وہ مہ گلے لگتا تو یوں دل نہ جلا جاتا

یا لاگ کی وے باتیں یا ایسی ہے بیزاری
وہ جو نہ لگا لیتا تو میں نہ لگا جاتا

کیا نور کا بکّا ہے چہرہ کہ شب مہ میں
منھ کھولے جو سو رہتا تو ماہ چھپا جاتا

اس شوق نے دل کے بھی کیا بات بڑھائی تھی
رقعہ اسے لکھتے تو طومار لکھا جاتا

یہ ہمدمی کا دعویٰ اس کے لب خنداں سے
بس کچھ نہ چلا ورنہ پستے کو چبا جاتا

اب تو نہ رہا وہ بھی طاقت گئی سب دل کی
جو حال کبھو اپنا میں تم کو سنا جاتا

وسواس نہ کرتا تھا مر جانے سے ہجراں میں
تھا میر تو ایسا بھی دل جی سے اٹھا جاتا

(۱۳۱۹)

مستانہ اگرچہ میں طاعت کو لگا جاتا
پر بعد نماز اٹھ کر میخانہ چلا جاتا

بازار میں ہو جاتا اس مہ کا تماشا تھا
یوسف بھی جو واں ہوتا تو اس پہ بکا جاتا

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
جی مفت مرا جاتا اس شوخ کا کیا جاتا

شب آہ شرر افشاں ہونٹوں سے پھری میرے
سر کھینچتا یہ شعلہ تو مجھ کو جلا جاتا

کیا شوق کی باتوں کی تحریر ہوئی مشکل
تھے جمع قلم کاغذ پر کچھ نہ لکھا جاتا

آنکھیں مری کھلتیں تو اس چہرے ہی پر پڑتیں
کیا ہوتا یکایک وہ سر پر مرے آجاتا

سبزے کا ہوا روکش خط رخ جاناں کے
جو ہاتھ مرے چڑھتا تو پان کو کھا جاتا

ہے شوق سیہ رو سے بدنامی و رسوائی   کیوں کام بگڑ جاتا جو صبر کیا جاتا
تھا میر بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

(۱۳۲۰)

یہ دل نے کیا کیا کہ اسیر بلا کیا   اس زلف پرشکن نے مجھے مبتلا کیا
گو بےکسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا   میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا
آیا نہ اس طرف سے جواب ایک حرف کا   ہر روز خط شوق ادھر سے چلا کیا
ڈرتا ہی میں رہا کہ پلک کوئی گڑ نہ جائے   آنکھوں سے اس کے رات جو تلوے ملا کیا
بدحال ٹھنڈی سانسیں بھرا کب تلک کرے
سرگرم مرگ میر ہوا تو بھلا کیا

(۱۳۲۱)

در پر سے ترے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا   یاں پھر اگر آؤں گا سید نہ کہاؤں گا
یہ نذر بدی ہے میں کعبے سے جو اٹھنا ہو   بت خانے میں جاؤں گا زنار بندھاؤں گا
آزار بہت کھینچے یہ عہد کیا ہے اب   آئندہ کسو سے میں دل کو نہ لگاؤں گا
سرگرم طلب ہوکر کھویا سا گیا آپھی   کیا جانیے پاؤں گا یا اس کو نہ پاؤں گا
گو میر ہوں چپکا سا پر طرفہ ہنرور ہوں
بگڑے گا نہ ٹک وہ تو سو باتیں سناؤں گا

(۱۳۲۲)

دیوانگی میں مجنوں میرے حضور کیا تھا   لڑکا سا ان دنوں تھا اس کو شعور کیا تھا
گردن کشی سے اپنی مارے گئے ہم آخر   عاشق اگر ہوئے تھے ناز و غرور کیا تھا
غم قرب و بعد کا تھا جب تک نہ ہم نے جانا   اب مرتبہ جو سمجھے وہ اتنا دور کیا تھا
اے وائے یہ نہ سمجھے مارے پڑیں گے اس میں   اظہار عشق کرنا ہم کو ضرور کیا تھا
مرتا تھا جس کی خاطر اس کی طرف نہ دیکھا
میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

(۱۳۲۳)

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھایا گیا   جی کو مہماں سنتے تھے مہمان سا آیا گیا

عشق سے ہو حال جی میں کچھ تو کہیے دیکھیو
ایک دن باتیں ہی کرتے کرتے سنایا گیا

جستجو میں یہ تعب کھینچے کہ آخر ہو گئے
ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ تو پایا گیا

اک نگہ کرنے میں غارت کردیا اے وائے ہم
دل جو ساری عمر کا اپنا تھا سرمایہ گیا

کیا تعجب ہے جو کوئی دل زدہ ناکہ مرے
اضطراب عشق میں جی تن سے گھبرایا گیا

ماہ کہتے تو کہا اس روے خوش کا ہے حریف
شہر میں پھر ہم سے اپنا منھ نہ دکھلایا گیا

جیسے پرچھائیں دکھائی دے کے ہوجاتی ہے محو
میر بھی اس کام جاں کا دوہیں تھا سایہ گیا

(۱۳۲۴)

ہم مست عشق جس کے تھے وہ روٹھ کر گیا
دیکھ اس کو بے دماغ نشہ سب اتر گیا

جاں بخشی اس کے ہونٹوں کی سن آب زندگی
ایسا چھپا کہیں کہ کہا جائے مر گیا

کہتے ہیں میر کعبے گیا ترک عشق کر
راہ دل شکستہ کدھر وہ کدھر گیا

(۱۳۲۵)

شاید جگر حرارت عشق سے جل گیا
کل درد دل کہا سو مرا منھ ابل گیا

بے یار حیف باغ میں دل تنگ بہل گیا
دے گل کو آگ چار طرف میں نہ جل گیا

اس آہوے رمیدہ کی شوخی کہیں سو کیا
دکھلائی دے گیا تو چھلاوا سا چھل گیا

دن رات خوں کیا ہی کیے ہم جگر کو پھر
گر پھول گل سے کوئی گھڑی جی بہل گیا

تیور بدلنے سے تو نہیں اس کے بے حواس
اندیشہ یہ ہے طور ہی اس کا بدل گیا

ہرچند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
ایک آدھ حرف پیار کا منھ سے نکل گیا

کرتے ہیں نذر ہم کہ نہ الفت کریں کہیں
گر دل ضعیف اب کے ہمارا سنبھل گیا

چلنے لگے تھے راہ طلب پر ہزار شکر
پہلے قدم ہی پاؤں ہمارا بچل گیا

میں وہ دلا تو آگے ہی تھا فرط شوق سے
طور اس کا دیکھ اور بھی کچھ دل دہل گیا

سر اب لگے جھکانے بہت خاک کی طرف
شاید کہ میر جی کا دماغی خلل گیا

(۱۳۲۶)

عشق رسوائی طلب نے مجھ کو سرگرداں کیا
کیا خرابی سر پہ لایا صومعہ ویراں کیا

ہم سے تو جز مرگ کچھ تدبیر بن آتی نہیں
تم کہو کیا تم نے درد عشق کا درماں کیا

داخل دیوانگی ہی تھی ہماری عاشقی　　یعنی اس سودے میں ہم نے جان کا نقصاں کیا
شکر کیا اس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو　　ایسی اک ناچیز مشت خاک کو انساں کیا
تیغ سی بھوویں جھکائیں برچھیاں سی وے مژہ　　خون کا مجھ بے سر و پا کے بلا ساماں کیا
ایک ہی انداز نے اس کافر بے مہر کے　　ساکنان کعبہ کو بے دین و بے ایماں کیا

لکھنؤ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

(۱۳۲۷)

دل سنبھالے کہیں میں کل جو چلا جاتا تھا　　ضعف اتنا تھا کہے بات ڈھلا جاتا تھا
بے دماغی کا سماں دیکھنے کی کس کو تاب　　آنکھیں ملتا تھا جو وہ جی ہی ملا جاتا تھا
سوزش دل کے سبب مرگ نہ تھی عاشق کی　　اپنی غیرت میں وہ کچھ آپھی جلا جاتا تھا
ہلہلاوے ہے حقیری سے مجھے اب وہ بھی　　جس شکستے سے نہ جاگہ سے ہلا جاتا تھا

میر کو واقعہ کیا جانیے کیا تھا درپیش
کہ طرف دشت کے جوں سیل چلا جاتا تھا

(۱۳۲۸)

ترک لباس سے میرے اسے کیا وہ رفتہ رعنائی کا　　جامے کا دامن پاؤں میں الجھا ہاتھ آنچل اکلائی کا
پاس سے اٹھ چلتا ہے وہ تو آپ میں میں رہتا ہی نہیں　　لے جاتا ہے جا سے مجھ کو جانا اس ہرجائی کا
حال نہ میرا دیکھے ہے نہ کہے سے تامل ہے اس کو　　محو ہے خودآرائی کا یا بےخود ہے خودرائی کا
ظاہر میں خورشید ہوا وہ نور میں اپنے پنہاں ہے　　خالی نہیں ہے حسن سے چھپنا ایسے بھی پیدائی کا
یاد میں اس کی قامت کی میں لوہو رو رو سوکھ گیا　　آخر یہ خمیازہ کھینچا اس خرچ بالائی کا
بعد مرگ چراغ نہ لاوے گور پہ وہ عاشق کی آہ　　جیتے جی بھی داغ ہی تھا میں اس کی بے پروائی کا

چشم وفا اخوان زماں سے سادہ ہو سو رکھے میر
قصہ ہے مشہور زمانہ پہلے دونوں بھائی کا

(۱۳۲۹)

پھرے ہے وحشی سا گم گشتہ عشق کا تیرا　　سبھوں سے پاتے ہیں بیگانہ آشنا تیرا
دریغ و درد تجھے کیوں ہے یاں تو جی ہی گئے　　ہوا ہے ایک نگہ میں زیان کیا تیرا
جہاں بھرا ہے ترے شور حسن و خوبی سے　　لبوں پہ لوگوں کے ہے ذکر جابجا تیرا
نگاہ ایک ادھر ایک تیغ تیز کی اور　　ہمارا خون ہی کرنا ہے مدعا تیرا

نظر کسھوں نے نہ کی حال میر پر افسوس
غریب شہروفا تھا وہ خاک پا تیرا

(۱۳۳۰)

صورت شیریں کے آگے کام اپنا کر گیا عشق میں کس حسن سے فرہاد ظالم مر گیا
خانہ آبادی ہمیں بھی دل کی یوں ہے آرزو جیسے جلوے سے ترے گھر آرسی کا بھر گیا
میر سختی کش تھا غافل پر خدا نے خیر کی
حادثے کا کیسا اس کے سر پہ سے پتھر گیا

(۱۳۳۱)

کیا عشق سو پھر مجھے غم رہا مژہ نم رہیں حال درہم رہا
ضعیف و قوی دونوں رہتے نہیں نہ یاں زال ٹھہرا نہ رستم رہا
سحر جلوہ کیوں کر کرے کل ہوکیا یہ اندیشہ ہر رات ہر دم رہا
ہوا غم مجھے خوں جگر میں نہیں اگر آنسو آتے کوئی تھم رہا
رہی آتی آندھی سی سینے میں میر
بہت دل تڑپنے کا اودھم رہا

(۱۳۳۲)

مکے گیا مدینے گیا کربلا گیا جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا
دیکھا ہو کچھ اس آمدوشد میں تو میں کہوں خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا
کپڑے گلے کے میرے نہ ہوں آبدیدہ کیوں مانند ابر دیدۂ تر اب تو چھا گیا
جاں سوز آہ و نالہ سمجھتا نہیں ہوں میں یک شعلہ میرے دل سے اٹھا تھا جلا گیا
وہ مجھ سے بھاگتا ہی پھرا کبر و ناز سے جوں جوں نیاز کرکے میں اس سے لگا گیا
جور سپہر دوں سے برا حال تھا بہت میں شرم ناکسی سے زمیں میں سما گیا
دیکھا جو راہ جاتے تبختر کے ساتھ اسے پھر مجھ شکستہ پا سے نہ اک دم رہا گیا
بیٹھا تو بوریے کے تئیں سر پہ رکھ کے میر
صف کس ادب سے ہم فقرا کی اٹھا گیا

(۱۳۳۳)

عشق کی ہے بیماری ہم کو دل اپنا سب درد ہوا رنگ بدن میت کے رنگوں جیتے جی ہی پہ زرد ہوا
تب بھی نہ سر کھینچا تھا ہم نے آخر مرکر خاک ہوئے
اب جو غبار ضعیف اٹھا تھا پامالی میں گرد ہوا

(۱۳۳۴)

عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا   آخر اب دوری میں جی جاتا رہا
مہر و مہ گل پھول سب تھے پر ہمیں   چہرئی چہرہ ہی وہ بھاتا رہا
دل ہوا کب عشق کی رہ کا دلیل   میں تو خود گم ہی اسے پاتا رہا
منھ دکھاتا برسوں وہ خوش رو نہیں   چاہ کا یوں کب تلک ناتا رہا
کچھ نہ میں سمجھا جنون و عشق میں   دیر ناصح مجھ کو سمجھاتا رہا
داغ تھا جو سر پہ میرے شمع ساں   پاؤں تک مجھ کو وہی کھاتا رہا
کیسے کیسے رک گئے ہیں میرؔ ہم
مدتوں منھ تک جگر آتا رہا

(۱۳۳۵)

اوصاف مو کے شعر سے الجھاؤ پڑ گیا   دانتوں کو سلک در جو کہا میں سو لڑ گیا
جیتے جی یہ ملا نہ رہا سو رہا غریب   جو دل شکستہ ساتھ سے اس کے بچھڑ گیا
کیا اس کے دل جلے کی تمامی میں دیر ہو   جیسے چراغ صبح شتابی نبڑ گیا
فرہاد پہلوان محبت پہاڑ تھا   بےطاقتی جو دل نے بہت کی پچھڑ گیا
گل رنگ رنگ شاخ سے نکلا بہار میں   آنکھیں سی کھل گئی ہیں جو مرجھا کے جھڑ گیا
یاں حادثے کی باؤ سے ہر اک شجر حجر   کیسا ہی پائدار تھا آخر اکھڑ گیا
شرماوے سرو ہووے اگر آدمی روش
وصف اس کے قد کا میرؔ سے سن کر اکڑ گیا

(۱۳۳۶)

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا   کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا
کون لیتا تھا نام مجنوں کا   جب کہ عہد جنوں ہمارا تھا
کوہ فرہاد سے کہیں آگے   سر مرا اور سنگ خارا تھا
ہم تو تھے محو دوستی اس کے   گوکہ دشمن جہان سارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی   جب تلک لطف کچھ تمھارا تھا
آستاں کی کسو کے خاک ہوا   آسماں کا بھی کیا ستارہ تھا
پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا   یاں کبھو اس کا یوں گذارا تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف   گشت تھا دید تھا نظارہ تھا

اس کی ابرو جو تک جھکی ایدھر   قتل کا تیغ سے اشارہ تھا

عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر
آگے ہی جی انھوں نے ہارا تھا

(۱۳۳۷)

خوب کیا جو اہل کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا   ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا
روند کے جور سے ان نے ہم کو پاؤں حنائی اپنے کیے   خون ہمارا بسکہ گہ میں کن رنگوں پامال کیا
نکلے ہے گر گھاس جلی بھی خاک سے الفت کشتوں کی   یہ بالیدہ سپہر پھرے ہے گویا ان نے نہال کیا
دل جو ہمارا خون ہوا تھا رنج و الم میں گذری ہمیں   یعنی ماتم اس رفتہ کا ہم نے ماہ و سال کیا

میر سدا بے حال رہو ہو مہر و وفا سب کرتے ہیں
تم نے عشق کیا سو صاحب کیا یہ اپنا حال کیا

(۱۳۳۸)

ہم کوے مغاں میں تھے ماہ رمضاں آیا   صد شکر کہ مستی میں جانا نہ کہاں آیا
گو قدر محبت میں تھی سہل مری لیکن   سستا جو بکا میں تو مجھ کو بھی گراں آیا
رسم اٹھ گئی دنیا سے اک بار مروت کی   کیا لوگ زمیں پر ہیں کیسا یہ سماں آیا
یہ نفع ہوا نقصاں چاہت میں کیا جی کا   کی ایک نگہ ان نے سو جی کا زیاں آیا
بلبل بھی تو نالاں تھی پر سارے گلستاں میں   اک آگ پھنکی میں جب سرگرم فغاں آیا
طائر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں   گل آئے جہاں وہ بھی جوں آب رواں آیا

خلوت ہی رہا کی ہے مجلس میں تو یوں اس کی
ہوتا ہے جہاں یک جا میں میر جہاں آیا

(۱۳۳۹)

خوں نہ ہوا دل چاہیے جیسا گو اب کام سے جاوے گا   کام اپنے وہ کیا آیا جو کام ہمارے آوے گا
آنکھیں لگی رہتی ہیں اکثر چاک قفس سے اسیروں کی   جھونکا باد بہاری کا گل برگ کوئی یاں لاوے گا
فتنے کتنے جمع ہوئے ہیں زلف و خال و خد و قد   کوئی نہ کوئی عہد میں میرے سر ان میں سے اٹھاوے گا
عشق میں تیرے کیا کیا سن کر یار گئی کر جاتے ہیں   یعنی غم کھاتے ہیں بہت ہم غم بھی ہم کو کھاوے گا
ایک نگہ کی امید بھی اس کی چشم شوخ سے ہم کو نہیں   ایدھر اودھر دیکھے گا پر ہم سے آنکھ چھپاوے گا
اب تو جوانی کا یہ نشہ ہی بے خود تجھ کو رکھے گا   ہوش گیا پھر آوے گا تو دیر تلک پچھتاوے گا

دیر سے اس اندیشے نے ناکام رکھا ہے میر ہمیں
پاؤں چھوئیں گے اس کے ہم تو وہ بھی ہاتھ لگاوے

(۱۳۴۰)

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا   کہاں تلک گل نہ ہووے غنچہ رہا مندے منھ سو تنگ آیا
چلے ہیں موڈھے پھٹی ہے کہنی چسی ہے چولی پھنسی ہے مہری   قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بتنگ آیا
وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے شورش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں پہ میرؔ ہم کو نہ ڈھنگ آیا

(۱۳۴۱)

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا   چہرے سے خوناب ملوں گا پھولوں سے گل کھاؤں گا
عہد کیے جاؤں ہوں اب کے آخر مجھ کو غیرت ہے   تو بھی منانے آوے گا تو ساتھ نہ تیرے جاؤں گا
گرچہ نصیحت سب ضائع ہے لیکن خاطر ناصح کی   دل دیوانہ کیا سمجھے گا اور بھی میں سمجھاؤں گا
جھک کے سلام کسو کو کرنا سجدہ ہی ہو جاتا ہے   سر جاوے گو اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا
سر ہی سے سر واہ یہ سب ہے ہجر کی اس کے کلفت میں   سر کو کاٹ کے ہاتھ پہ رکھے آپھی ملنے جاؤں گا
خاک ملا منھ خون آنکھوں میں چاک گریباں تا دامن   صورت حال اب اپنی اس کے خاطر خواہ بناؤں گا
دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیق شفیق پھر ایسے میرؔ کہاں میں پاؤں گا

(۱۳۴۲)

اگرچہ جہاں میں نے سب چھان مارا   ولے اس کی نایابی نے جان مارا
قیامت کو جرمانہ شاعری پر   مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا
رہائی ہے اس صید افگن سے مشکل   گیا سانجھ تو صبح پھر آن مارا
لگا آتشیں نالہ شب اپنے دل کو   اس انداز سے جیسے اک بان مارا
قیامت کا عرصہ ہے اے میرؔ درہم
مرے شور و زاری نے میدان مارا

(۱۳۴۳)

جگر خوں کیا چشم نم کر گیا   گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا
ان آنکھوں کو نرگس لکھا تھا کہیں   مرے ہاتھ دونوں قلم کر گیا
شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند   تن زار میرا بھسم کر گیا
مرے مزرع زرد پر شکر ہے   کل اک ابر آیا کرم کر گیا

نہ اک بار وعدہ وفا کرسکا — بہت بار قول و قسم کر گیا
فقیری میں تھا شیب بارگراں — قد راست کو اپنے خم کر گیا
بکاے شب و روز اب چھوڑ میرؔ
نواح آنکھوں کا تو ورم کر گیا

(۱۳۴۴)

یاری کیے کسو کا کاہے کو کام نکلا — ناکام عشق تب تو عاشق کا نام نکلا
ہنگامے سے جہاں میں ہم نے جنوں کیا ہے — ہم جس طرف سے نکلے ساتھ ازدحام نکلا
پامالی کے خطر سے نکلا نہ کبک اودھر — جیدھر سے ناز کرتا وہ خوش خرام نکلا
جنگ زمانہ میں تو مبحث ہے عشق ہی کا — بےجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا
جانا تھا تجھ کو ہم نے تو پختہ مغز ہوگا
دیکھا تو میرؔ تیرا سودا بھی خام نکلا

(۱۳۴۵)

نے ہم سے کچھ نہ اس ستم ایجاد سے ہوا — ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا
شیریں کا حسن ایسا تھا جو خستہ جان دیں — جو کچھ ہوا سو خواہش فرہاد سے ہوا
خوش زمزمہ طیور ہی ہوتے ہیں میرؔ اسیر
ہم پر ستم یہ صبح کی فریاد سے ہوا

(۱۳۴۶)

زار کیا بیمار کیا اس دل نے کیا آزار کیا — داغ سے تن گلزار کیا سب آنکھوں کو خونبار کیا
جرم ہے ہم الفت کشتوں کا لگ پڑنے سے شوخ ہوا — اب کہتے ہیں دل میں اپنے ہم نے اسے کیوں پیار کیا
چاہا ہم نے کیا کیا تھا پر اپنا چاہا کچھ نہ ہوا — عزت کھوئی ذلت کھینچی عشق نے خوار و زار کیا
پیش گئی کب پیش زمانہ طبع خشن ہر ناکس کی — اک گردش میں سپہر نے جیسے سطح زمیں ہموار کیا
سادگی میری آہ نہ جانا جی ہی اس میں جاتا ہے
عشق کا اس پرکار کے میں نے لوگوں میں اقرار کیا

(۱۳۴۷)

سینے کا سوز بہت بھڑکا جلا تن مارا — جامہ زیبوں نے غضب آگ پہ دامن مارا
صورت اس کی مری کھینچی تھی گلے لگتے ہوئے — سو جفاکار نے نقاش کو گردن مارا
دل ہی میں خون ہوئی وصل کی خواہش اے میرؔ
ہم نے آزادگی ہجر سے کیا من مارا

(۱۳۴۸)

پیری میں بے دنداں ہو بیٹھے پر افسوس یہ ہم کو رہا
دانت تمھارے منہ میں کے ہیں اس مغرور نے یوں نہ کہا

کیا روداد کہیں ہم اپنے گریۂ زار محبت کی
رونا سا کوئی روئے ہیں آنکھوں سے اک رود بہا

صبر مرا سا بے جری پر ہو نہ سکے گا انساں سے
جور و جفا و ستم جو گذرے سب کچھ میں نے میرؔ سہا

(۱۳۴۹)

چاہت کا اظہار کیا سو اپنا کام خراب ہوا
اس پردے کے اٹھ جانے سے اس کو ہم سے حجاب ہوا

ساری ساری راتیں جاگے عجز و نیاز و زاری کی
تب جاکر ملنے کا اس کے صبح کے ہوتے جواب ہوا

کیا کہیے مہتاب میں شب کی وہ بھی ٹک آ بیٹھا تھا
تاب رخ اس مہ نے دیکھی سو درجے بیتاب ہوا

شمع جو آگے شام کو آئی رشک سے جل کر خاک ہوئی
صبح گل تر سامنے ہوکر جوش شرم سے آب ہوا

مرتے نہ تھے ہم عشق کے رفتہ بے کفنی سے یعنی میرؔ
دیر میسر اس عالم میں مرنے کا اسباب ہوا

(۱۳۵۰)

تھا محبت سے کبھو ہم میں کبھو یہ غم میں تھا
دل کا ہنگامہ قیامت خاک کے عالم میں تھا

کیا ہوا پہلو سے دل کیا جانو کیا جانوں ہوں میں
ایک قطرہ خوں جھمکتا صبح چشم نم میں تھا

میرؔ گذرے دونوں یاں عید و محرم ایک سے
یعنی دس دن جینے کے میں اپنے ہی ماتم میں تھا

(۱۳۵۱)

وفاداری نے جی مارا ہمارا
اسی میں ہوگا کچھ وارا ہمارا

چڑھی تیوری کبھو اس کی نہ اتری
غضب ہے قہر ہے پیارا ہمارا

رہا افسوس آنکھیں تر ہوئیں تو
کہ آنسو تھا جگر پارہ ہمارا

گلہ لب تک نہ آیا میرؔ ہرگز
کھپا جی ہی میں غم سارا ہمارا

ردیف ب

(۱۳۵۲)

ہوا جو دل خوں خرابی آئی ہر ایک اعضا میں ہے فتور اب
حواس گم ہیں دماغ کم ہے رہا سہا بھی گیا شعور اب

مریں گے غائب ہزار یوں تو نظر میں ہرگز نہ لاوے گا تو
کریں گے ضائع ہم آپ ہی کو بتنگ ہوکر ترے حضور اب

وجوب و امکاں میں کیا ہے نسبت کہ میر بندے کا پیش صاحب
نہیں ہے ہونا ضرور کچھ تو مجھے بھی ہونا ہے کیا ضرور اب

(۱۳۵۳)

کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب — آنسو آتے ہیں اب شتاب شتاب
ملیں وے پلکیں اور کیے رخنے — حال دل ہوگیا خراب شتاب
یوں صبا بھی سبک نہیں جاتی — جوں گیا موسم شباب شتاب
پیر ہوکر ہوا ہوں یوں غافل — جیسے لڑکوں کو آوے خواب شتاب
مرتے ہیں ہو جواب نامہ وہی — آوے خط کا اگر جواب شتاب
مہربانی تو دیر میں ہے کبھو — ہے دل آزاری و عتاب شتاب

یاں قدم چاہیے رکھیں گن کر
میر لے ہے کوئی حساب شتاب

(۱۳۵۴)

بیکار بھی درکار ہیں سرکار میں صاحب — آتے ہیں کھنچے ہم کبھو بیگار میں صاحب
محروم نہ رہ جائیں کہیں بعد فنا بھی — شبہ ہے ہمیں یار کے دیدار میں صاحب
لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمھارے — معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب
رہتا تھا سر زلف بھی زیر کلہ آگے — سو بال گھڑیں نکلے ہیں دستار میں صاحب
ہے چار طرف شور مری بے خبری کا — کیا کیا خبریں آتی ہیں اخبار میں صاحب
گو فہم نہ ہو کفر کی اسلام کی نسبت — رشتہ ہے عجب سبحہ و زنار میں صاحب
یا گفتگو کا میری نہ کرتے تھے کبھو ذکر — یا ہر سخن اب آوے ہے تکرار میں صاحب
طالع سے زلیخا نے لیا مصر میں یوسف — کب ایسا غلام آوے ہے بازار میں صاحب

رکھتی ہے لکھا ساتھ مٹا دینے کا میرے　　جوہر نہیں ہے آپ کی تلوار میں صاحب

یہ عرض مری یاد رہے بندگی میں میر
جی بچتے نہیں عشق کے اظہار میں صاحب

(۱۳۵۵)

۱۰۱۶۵ دردِ سر کا پہر پہر ہے اب　　زندگانی ہی دردِ سر ہے اب
وہ دماغِ ضعیف بھی نہ رہا　　بے دماغی ہی بیشتر ہے اب
کیا ہمیں ہم تو ہو چلے ٹھنڈے　　گرم گو یار کی خبر ہے اب
کیا کہیں حالِ خاطرِ آشفتہ　　دل خدا جانیے کدھر ہے اب

عزلتی میر جوں صبا اس بن
خاک برسر ہے دربدر ہے اب

(۱۳۵۶)

۱۰۱۷۰ جوش رونے کا مجھے آیا ہے اب　　دیدۂ تر ابر سا چھایا ہے اب
ٹیڑھے بانکے سیدھے سب ہوجائیں گے　　اس کے بالوں نے بھی بل کھایا ہے اب
ہوں بخود تو کوئی پہنچے مجھ تک　　بے خودی نے دور پہنچایا ہے اب
کاش کے ہوجائے سینہ چاک چاک　　رکتے رکتے جی بھی گھبرایا ہے اب
راہ پر وہ کیونکے آوے مست ناز　　دشمنوں نے اس کو بہکایا ہے اب
۱۰۱۷۵ کیا جئیں گے داغ ہوکر خوں ہوا　　زندگی کا دل جو سرمایہ ہے اب

میر شاید کعبے ہی میں رہ پڑے
دیر سے تو یاں خدا لایا ہے اب

(۱۳۵۷)

کیا کریں تدبیر دل مقدور سے باہر ہے اب　　ناامید اس زندگانی کرنے سے اکثر ہے اب
جن دنوں ہم کافروں سے ربط تھا وے ہوچکے　　وہ بتِ بے مہر اپنی اور سے پتھر ہے اب
دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک　　میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب
۱۰۱۸۰ وہ طبیعت ہی نہیں ہے میری اے مشفق طبیب　　کر دوا جو طبع میں آوے تری بہتر ہے اب
بے خود اس مست ادا و ناز بن رہتے ہیں ہم　　عالم اپنا دیکھیے تو عالمِ دیگر ہے اب
وہ سپاہی پیشہ لوگوں ہی میں رہتا ہے گھرا　　گرد پیش اس دشمنِ احباب کے لشکر ہے اب

گفتگو انسان سے محشر میں ہے یعنی کہ میر
سارا ہنگامہ قیامت کا مرے سر پر ہے اب

(۱۳۵۸)

خلاف وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب   ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب
خیال رکھیے نہ سرکشی کا سنو ہو صاحب کہ پیری آئی   خمیدہ قامت بہت ہوا ہے جھکائے سر ہی رہا کرو اب
کہاں ہے طاقت جو میرؔ کا دل سب ان بلاؤں کی تاب لاوے
کرشمے غمزے کو ناز سے تک ہماری خاطر جدا کرو اب

(۱۳۵۹)

یار میرا بہت ہے یار فریب   مکر ہے عہد سب قرار فریب
راہ رکھتے ہیں اس کے دام سے صید   ہے بلا کوئی وہ شکار فریب
عہدے سے نکلیں کس طرح عاشق   ایک ادا اس کی ہے ہزار فریب
التفات زمانہ پر مت جا
میرؔ دیتا ہے روزگار فریب

(۱۳۶۰)

کوئی اپنا نہ یار ہے نہ حبیب   اس ستمگر کے ہم ہیں شہر غریب
سر رگڑتے اس آستاں پر میرؔ
یاری کرتے اگر ہمارے نصیب

ردیف ت

(۱۳۶۱)

جب سے آنکھیں لگی ہیں ہماری نیند نہیں آتی ہے رات   تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات
سخت ہیں کیا ایام جدائی دشواری سے کٹتے ہیں   دن دیواروں سے سر ماروں ہوں پتھر ہے چھاتی ہے رات
جوں توں ہجر کے غم میں اس کے شام و سحر ہم کرتے ہیں   ورنہ کسے دن خوش آتا ہے کس کے تئیں بھاتی ہے رات
رات کو جس میں چین سے سوویں سو تو اس کی جدائی میں   شمع نمط جلتے رہتے ہیں اور ہمیں کھاتی ہے رات
روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میرؔ
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات

(۱۳۶۲)

دیر کب رہنا ملے ہے یاں نہیں مہلت بہت   دے کسے فرصت سپہر دوں ہے کم فرصت بہت
کم نہیں دیوانہ ہونا بھی ہمارا دفعتہ   ڈریے ہوجاوے خرد ور کی جو پلٹے مت بہت

گریہ و زاری سے روز و شب کی شکوے کچھ نہیں
مجھ کو رونا یہ ہے جی کو اس سے ہے الفت بہت

کیا وداع اس یار کے کوچے سے ہم مشکل ہوئے
زار باراں لوگ روتے تھے دم رخصت بہت

بعد مرگ آنکھیں کھلی رہنے سے یہ جانا گیا
دیکھنے کی اس کے میرے جی میں تھی حسرت بہت

سن کے ضائع روزگاری اس کی جی لایا نہ تاب
آپ کو کر بیٹھے ضائع ہم کو تھی غیرت بہت

آنکھیں جاتی ہیں مندی ضعف دلی سے دم بہ دم
ان دنوں ان کو بھی ایدھر ہی سے ہے غفلت بہت

دل گئے پر آج کل سے چپ نہیں مجھ کو لگی
گذری اس بھی بات کو اے ہم نفس مدت بہت

دل میں جا کرتا ہے طور میر شاید دوستاں
ان نے صاحب دل کسو سے رکھی ہے صحبت بہت

(۱۳۶۳)

چشم رہنے لگی پرآب بہت
شاید آوے گا خون ناب بہت

دیر و کعبے میں اس کے خواہش مند
ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان
کم رہا موسم شباب بہت

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمھیں ثواب بہت

کہیے بے پردہ کیونکے عاشق ہیں
ہم کو لوگوں سے ہے حجاب بہت

میر بےخود ہیں اس جناب سے اب
چاہیے سب کو اجتناب بہت

(۱۳۶۴)

دل نے کام کیے ہیں ضائع دلبر ہے دل خواہ بہت
قدر بہت ہی کم ہے دل کی پر دل میں ہے چاہ بہت

راہ کی بات سنی بھی ہے تو جانا حرف غریب اس کو
خوبی پر اپنی حسن پر اپنے پھرتا ہے گمراہ بہت

حیرانی ہے کیونکر ہووے نسبت اپنی اس سے درست
بندہ تو ہے عاجز عاجز اس کو غرور اللہ بہت

شوق کا خط طومار ہوا تھا ہاتھ میں لے کر کھولا جب
کہنے لگا کیا کرنے لکھے ہے اب تو نامہ سیاہ بہت

سب کہتے ہیں روے توجہ ایدھر کرنے کہتا تھا
شاید یوں بھی ظاہر ہووے ہے تو سہی افواہ بہت

اب تو پیر ہی حضرت ہوکر ایک کنارے بیٹھے ہیں
جب تھی جوانی تب تو ہم بھی جاتے تھے درگاہ بہت

کیا گذری ہے جی پہ تمھارے ہم سے تو کچھ میر کہو
آنے لگی ہے درد و الم سے صاحب لب پر آہ بہت

(۱۳۶۵)

کرتا ہے گرچہ یاروں سے وہ ٹیڑھی بانکی بات
پر کیا ہی دل کو لگتی ہے اس بد زباں کی بات

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی — پہنچی ہے اس سرے تئیں طبع رواں کی بات
اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں — تم کس سمیں کی کہتے ہو ہے یہ کہاں کی بات
مرغ اسیر کہتے تھے کس حسرتوں سے ہائے — ہم بھی کبھی سنیں گے گلوں کے دہاں کی بات
شب باش ان نے کہتے ہیں آنے کہا ہے میر
دن اچھے ہوں تو یہ بھی ہو اس مہرباں کی بات

ردیف ث

٦٦)

نہیں گر چوٹ دل پر گریہ و زاری کا کیا باعث — رکن کا ہے کو چشم تر کی خونباری کا کیا باعث
ہوئے تختے چمن کے چھاتیاں اے عشق داغوں سے — بہار آنے سے آگے ایسی گل کاری کا کیا باعث
تماشا ہے کہ اکثر نرگسی زن رہتے ہو ہم پر
ہمیں سے پوچھو تو پھر میر بیماری کا کیا باعث

(۱۳۶۷)

عہد اس کا غلط قرار عبث — دل ہمارا ہے بے قرار عبث
ہم گلا کاٹتے ہی تھے اپنا — تو گلے کا ہوا ہے ہار عبث
لوہو رونے نے سب نچوڑ لیا — اب ہے خون روزگار عبث
آہ وہ کس قدر ہے مستغنی — لوگ اس کے ہوئے شکار عبث
ہم تو آگے ہی مر رہے ہیں میر
تیغ کھینچے پھرے ہے یار عبث

ردیف ج

(۱۳۶۸)

حال برا ہے تم کو ہم سے اتنی غفلت کیا ہے آج — کوئی گھڑی تو پاس رہو یاں پہروں فرصت کیا ہے آج
سامنے ہے وہ آئینہ پر آنکھ نہیں کھل سکتی ہے — دل تنگی سے رکے ہے دم کیا کہیے صورت کیا ہے آج
فرق و تیغ بجے رہتے ہیں جب سے دل کی لاگ لگی — اس ظالم بے رحم کی میری ایسی صحبت کیا ہے آج
شیشہ صراحی ساغر و مینا سب کل تک بھی حاضر تھے — کوے بادہ فروشاں میں یہ میری حرمت کیا ہے آج
میر کھڑے اک ساعت ہی میں غش تم کرنے لگتے ہو
تاب نہیں کیا ضعف ہے دل میں جی بے طاقت کیا ہے آج

(۱۳۶۹)

ہم تو لب خوش رنگ کو اس کے مانا لعل احمر آج
اور غرور سے ان نے ہم کو جانا کنکر پتھر آج

عشق کے جو سرگشتہ ہوئے ہم رفتہ رفتہ دوار ہوا
پاؤں میں چکر ہوتا ہے یاں سر کو بھی ہے چکر آج

عرش پہ دھونی لگانے کو تھے دود دل سے کب تک ہم
خاک پہ یاں کی درویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج

جینے سے ہم غم کشتوں کے خاطر تم بھی جمع کرو
کل تک کام نہیں کھینچے گا غش آتا ہے اکثر آج

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قریہ و قصبہ دیہہ و دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج

خط سے آگے مہر و وفا کا دعویٰ سب کچھ صادق تھا
جلدۂ مصحف گو پہنے وہ کون کرے ہے باور آج

دیدہ و دل بھی اس کی جانب میل کلی رکھتے ہیں
عشق میں ہم بےکس ہیں واقع یا نہیں ہے یاور آج

عشق کیا ہو ہم نے کہیں تو عشق ہمارا جی مارے
یوں ہی نکورو دلبر اپنا ہم سے ہوا ہے بدبر آج

رحم کی جا گہ کی ہے پیدا شاید اس کے دل میں بھی
دیکھ رہا ہے منھ کو ہمارے حال ہمارا سن کر آج

کل کہتے ہیں قیامت ہوگی کل کی کل ہی لیں گے دیکھ
یاں تو قیامت عشق میں اس کے ہے گی اپنے سر پر آج

کرتی ہے بودہ زلف معنبر آئے ہو بےخود سے کچھ
بارے مزاج شریف تمھارا میرؔ گیا ہے کیدھر آج

ردیف چ

(۱۳۷۰)

آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ
اب کیسے لوگ آئے زمیں آسماں کے بیچ

میں بے دماغ عشق اٹھا سو چلا گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ

تحریک چلنے کی ہے جو دیکھو نگاہ کر
ہیئت کو اپنی موجوں میں آب رواں کے بیچ

کیا میل ہو ہما کی پس از مرگ میری اور
ہے جائے گیر عشق کی تب استخواں کے بیچ

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

طالع سے بن گئی کہ ہم اس مہ کنے گئے
بگڑی تھی رات اس کے سگ و پاسباں کے بیچ

اتنی جبین رگڑی کہ سنگ آئینہ ہوا
آنے لگا ہے منھ نظر اس آستاں کے بیچ

خوگر ہوئے ہیں عشق کی گرمی سے خار و خس
بجلی پڑی رہی ہے مرے آشیاں کے بیچ

اس روے برفروختہ سے جی ڈرے ہے میر
یہ آگ جا لگے گی کسو دودماں کے بیچ

(۱۳۷۱)

صورت پھرے نہ یار کی کیوں چشم تر کے بیچ
تاثیر ہے گی اہل وفا کے ہنر کے بیچ

خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار
ہے چوب خشک بو جو نہ ہووے اگر کے بیچ

اس کے سمند ناز کا پامال تو رہوں
اے کاش میری گور کریں رہگذر کے بیچ

منھ اس کا دیکھ رہیے کہ رفتار ناز کو
سرتا قدم ہے لطف ہی اس خوش پسر کے بیچ

ہر دانۂ سرشک میں تار نگاہ ہے
اس رشتے کی روش کہ جو ہووے گہر کے بیچ

کیا دل کو خوں کیا کہ تڑپنے لگا جگر
یکتاے روزگار ہیں ہم اس ہنر کے بیچ

ایسا ہوا ہے قیمہ کہ اب ہے حساب پاک
کیسے جو کچھ بھی باقی ہو اپنے جگر کے بیچ

ہے اپنے خانوادے میں اپنا ہی شور میر
بلبل بھی اک ہی بولتا ہوتا ہے گھر کے بیچ

(۱۳۷۲)

رنج کیا کیا ہم نے کھینچے دوستی یاری کے بیچ
کیا ہوئی تقصیر اس کی نازبرداری کے بیچ

دوش و آغوش و گریباں دامن گلچیں ہوئے
گل فشانی کر رہی ہے چشم خونباری کے بیچ

ایک کو اندیشۂ کار ایک کو ہے فکر یار
لگ رہے ہیں لوگ سب چلنے کی تیاری کے بیچ

منتظر تو رہتے رہتے پھر گئیں آنکھیں ندان
وہ نہ آیا دیکھنے ہم کو تو بیماری کے بیچ

جان کو قید عناصر سے نہیں ہے وارہی
تنگ آئے ہیں بہت اس چار دیواری کے بیچ

روتے ہی گذری ہمیں تو شب نشینی باغ کی
اوس سی پڑتی رہی ہے رات ہر کیاری کے بیچ

یاد پڑتا ہے جوانی تھی کہ آئی رنگی
ہوگیا ہوں میں تو مست عشق ہشیاری کے بیچ

ایک ہوویں جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میر کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

(۱۳۷۳)

گل منعکس ہوئے ہیں بہت آب جو کے بیچ
جاے شراب پانی بھریں گے سبو کے بیچ

ستھراؤ کردیا ہے تمناے وصل نے
کیا کیا عزیز مر گئے اس آرزو کے بیچ

بحث آپڑے جو لب سے تمھارے تو چپ رہو
کچھ بولنا نہیں تمھیں اس گفتگو کے بیچ

ہم ہیں قلندر آکر اگر دل سے دم بھریں
عالم کا آئینہ ہے یہ ایک ہو کے بیچ

گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تیں
ہے فرق میر پھول کی اور اس کی بو کے بیچ

ردیف ح

(۱۳۷۴)

کیا ہم بیاں کسو سے کریں اپنے ہاں کی طرح
کی عشق نے خرابی سے اس خانداں کی طرح

جوں سبزہ چل چمن میں لب جو پہ سیر کر
عمر عزیز جاتی ہے آب رواں کی طرح

جو سقف بے عمد ہو نہیں اس کا اعتماد
کس خانماں خراب نے کی آسماں کی طرح

اثبات بے ثباتی ہوا ہوتا آگے تو
کیوں اس چمن میں ڈالتے ہم آشیاں کی طرح

اب کہتے ہیں بلا ہے ستم کش یہ پیرگی
قد جو ہوا خمیدہ ہمارا کماں کی طرح

نقصان جاں صریح تھا سودے میں عشق کے
ہم جان کر نکالی ہے جی کے زیاں کی طرح

دل کو جو خوب دیکھا تو ہو کا مکان ہے
ہے اس مکاں میں ساری وہی لامکاں کی طرح

کل دیکھ آفتاب کو رویا ہوں دیر تک
غصے میں ایسی ہی تھی مرے مہرباں کی طرح

جاوے گا اپنی بھول طرح داری میر وہ
کچھ اور ہوگئی جو کسو ناتواں کی طرح

(۱۳۷۵)

مر گیا فرہاد جیسے مرتے ہارے اس طرح
سر کوئی پتھر سے مارے بھی تو مارے اس طرح

ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا آپ کو میں نے اسے
یعنی جی مارا کرو آئندہ پیارے اس طرح

مست و بےخود ہرطرف پہروں پھرا کرتے ہو تم
حیف ہے آتے نہیں ٹک گھر ہمارے اس طرح

عشق کی کیسے طرح کیا وامق و فرہاد و قیس
بےکسانہ مر گئے وے لوگ سارے اس طرح

جو عرق تحریک میں اس رشک مہ کے منھ پہ ہے
میر کب ہووے ہیں گرم جلوہ تارے اس طرح

(۱۳۷۶)

پہنچے ہے ہم کو عشق میں آزار ہر طرح
ہوتے ہیں ہم ستم زدہ بیمار ہر طرح

ترکیب و طرح ناز و ادا سب سے دل لگی
اس طرح دار کے ہیں گرفتار ہر طرح

یوسف کی اس نظیر سے دل کو نہ جمع رکھ
ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح

جس طرح میں دکھائی دیا اس سے لگ پڑے
ہم کشت و خوں کے ہیں گے سزاوار ہر طرح

چھپ لک کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

ردیف خ

(۱۳۷۷)

ہے میرے جو سرشک دمادم کا رنگ سرخ
ریزش سے اس کی تختہ ہے سینے کا سنگ سرخ

ردیف د

(۱۳۷۸)

زردی عشق سے ہے تن زار بدنمود
اب میں ہوں جیسے دیر کا بیمار بدنمود

بے برگی بے نوائی سے ہیں عشق میں نزار
پائیز دیدہ جیسے ہوں اشجار بدنمود

ہرچند خوب تجھ کو بنایا خدا نے لیک
اے ناز پیشہ کبر ہے بسیار بدنمود

ہیں خوشنما جو سہل مریں ہم ولے ترا
خونریزی میں ہماری ہے اصرار بدنمود

پوشیدہ رکھنا عشق کا اچھا تھا حیف میر
سمجھا نہ میں کہ اس کا ہے اظہار بدنمود

(۱۳۷۹)

کب سے ہے باغ کے پس دیوار باش و بود
مشکل کریں ہیں جیسے گرفتار باش و بود

دنیا میں اپنے رہنے کا کیا طور ہم کہیں
زنداں میں جوں کریں ہیں گنہگار باش و بود

بے یار کس کا جینے کو جی چاہتا ہے میر
کرتے ہیں ہم ستم زدہ ناچار باش و بود

(۱۳۸۰)

جاوے جدائی کا یہ آزار گاہ باشد
اچھا بھی ہووے دل کا بیمار گاہ باشد

امیدوار اس کے ملنے کے جیسے ہیں ہم
آ نکلے ناز کرتا یاں یار گاہ باشد

گو قدر دل کی کم ہے پر چیز کام کی ہے
لے تو رکھیں تمھیں ہو درکار گاہ باشد

کہتا ہوں سو کرے ہے لیکن رہوں ہوں ڈرتا
آوے کسو سخن پر تکرار گاہ باشد

کہتے تو ہیں گئے سو کب آئے کیا کریں تب
جو خواب مرگ سے ہوں بیدار گاہ باشد

غصے سے اپنے ابرو جو خم کرے ہے ہر دم
وہ اک لگا بھی بیٹھے تلوار گاہ باشد

غیرت سے عشق کی ڈر کیا شیخ کبر دینی
تسبیح کا ہو رشتہ زنار گاہ باشد

وحشت پہ میری مت جا غیرت بہت ہے مجھ کو — ہو بیٹھوں مرنے کو بھی تیار گاہ باشد
ہے ضبط عشق مشکل ہوتا نہیں کسو سے
در میر بھی ہو اس کا اظہار گاہ باشد

(۱۳۸۱)

تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد — ہاتھ لگتے دل کے ہوجاتا ہوں کچھ میں زرد زرد
اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ کرنا بھی گیا
کوئی دم ہونٹوں تک آجاتا ہے گاہے سرد سرد

(۱۳۸۲)

اس کی دوری میں کڑھا کرتے ہیں ہم حد سے زیاد — جی گیا آخر رہا دل کو جو غم حد سے زیاد
چھاتی پھٹ جاتی جو یوں رک کر نہ کرتا ترک چشم — گذرے اس کے عشق میں جی پر ستم حد سے زیاد
خوف کر عاشق کے سر کٹنے کی قطعی ہے دلیل — ہو جہاں شمشیر ابرو اس کی خم حد سے زیاد
کچھ بھی نزدیک اس کے ٹھہرا ہو تو دیکھے بھر نظر — قدر ہے عاشق کی ان آنکھوں میں کم حد سے زیاد
پاس اس کے دم بخود پہروں تھے سو طاقت کہاں
بات کہتے میر اب کرتے ہیں دم حد سے زیاد

(۱۳۸۳)

شعر دیواں کے میرے کر کر یاد — مجنوں کہنے لگا کہ ہاں استاد
خود کو عشق بتاں میں بھول نہ جا — متوکل ہو کر خدا کو یاد
سب طرف کرتے ہیں نکویاں کی — کس سے جا کر کوئی کرے فریاد
وحشی اب گردباد سے ہم ہیں — عمر افسوس کیا گئی برباد
چار دیواری عناصر میر
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

ردیف ذ

(۱۳۸۴)

درویشی کی جو سوختگی ہے سو ہے لذیذ
نان و نمک ہے داغ کا بھی ایک شے لذیذ

ردیف ر

(۱۳۸۵)

مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر   مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر
دل رکھ قوی فلک کی زبردستی پر نہ جا   گر کشتی لگ گئی ہے تو تو بھی تلاش کر
ہے کیا تو جیسے غنچہ بندھی مٹھی جا چلا   مت گل کے رنگ منہ کو کھلا راز فاش کر
یوں ہی ہے سینہ کوبی اگر چاہے دل کی داد   پیشانی کو سلیقے سے دکھلا خراش کر
پھرتا ہے کیا تو میرؔ گلستاں میں غم زدہ
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

(۱۳۸۶)

مرتے ہیں ہم تو آدم خاکی کی شان پر   اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر
چرکہ تھا دل میں لالہ رخوں کے خیال سے   کیا کیا بہاریں دیکھی گئیں اس مکان پر
عرصہ ہے تنگ صدر نشینوں پہ شکر ہے   بیٹھے اگر تو جا کے کسو آستان پر
آفات میں ہے مرغ چمن گل کے شوق سے   جوکھوں ہزار رنگ کی رہتی ہے جان پر
اس کام جاں کے جلووں کا میں ہی نہیں ہلاک   آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر
جاتے تو ہیں پہ خواہش دل موت ہے نری   پھر بھی ہمیں نظر نہیں جی کے زیان پر
تقدیس دل تو دیکھ ہوئی جس کو اس سے راہ   سر دیں ہیں لوگ اس کے قدم کے نشان پر
انداز و ناز اپنے اس اوباش کے ہیں قہر   سو سو جوان مرتے ہیں ایک ایک آن پر
شوخی تو دیکھو آپھی کہا آؤ بیٹھو میرؔ
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

(۱۳۸۷)

کیا صبر ہم نے جو اس کے ستم پر   ستم سا ستم ہوگیا اس میں ہم پر
لکھا جو گیا اس کو کیا نقل کریے   سخن خونچکاں تھے زبان قلم پر
جھکے ٹک جدھر جھک گئے لوگ اودھر   رہی درمیاں تیغ ابرو کے خم پر
سخن زن ہوں ہر چند وے مست آنکھیں   نہیں اعتماد ان کے قول و قسم پر
جگر ہے سزا میرؔ اس رنج کش کو
گیا وہ قدم جو ہمارے قدم پر

(۱۳۸۸)

تجھ کو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر
چشم سیاہ ملاکر یوں ہی مجھ کو خانہ سیاہ نہ کر
عشق ومحبت یاری میں اک لطف رکھے ہے کرنا ضبط
چھاتی پہ جو ہو کوہ الم کا تو بھی نالہ وآہ نہ کر
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر
گھاس ہے میخانے کی بہتر ان شیخوں کے مصلے سے
پاؤں نہ رکھ سجادے پہ ان کے اس جادے سے راہ نہ کر
میر نہ ہم کہتے تھے تجھ سے حال نہیں کچھ رہنے کا
چاہ بلاے جان و دل ہے آ جانے دے چاہ نہ کر

(۱۳۸۹)

کل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا بے کل ہوکر
آج لہو آنکھوں میں آیا درد و غم سے رو رو کر
ایک سجود خلوص دل سے آہ کیا نہ جوانی میں
سر مارے ہیں محرابوں میں یوں ہی وقت کو اب کھوکر
جیب دریدہ خاک ملوں کے حال سے کیا آگاہی تمھیں
راہ چلو ہو نازکناں دامن کو لگا کر تم ٹھوکر
ایک تو ہم تو ہوتے نہیں ہیں سر بھتیرا مار چکے
اب بہتر ہے تیغ ستم کی جلد لگا کر تو دوکر
جی ہی ملا جاتا ہے اپنا میر ساں یہ دیکھے سے
آنکھیں ملتے اٹھتے ہیں بستر سے دلبر جب سو کر

(۱۳۹۰)

یہ لطف اور پوچھا مجھ سے خطاب کر کر
کاے میر کچھ کہیں ہم تجھ کو عتاب کر کر
چھاتی جلی ہے کیسی اڑتی جو یہ سنی ہے
واں مرغ نامہ بر کا کھایا کباب کر کر
خوں ریزی سے کچھ آگے تشہیر کر لیا تھا
اس دل زدے کو ان نے مارا خراب کر کر
گنتی میں تو نہ تھا میں پر کل خجل ہوا وہ
کچھ دوستی کا میری دل میں حساب کر کر
روپوش ہی رہا وہ مرنے تک اپنے لیکن
منھ پر نہ رکھا اس کے کچھ میں حجاب کر کر
مستی و بےخودی میں آسودگی بہت تھی
پایا نہ چین میں نے ترک شراب کر کر
کیا جانیے کہ دل پر گذرے ہے میر کیا کیا
کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پرآب کر کر

(۱۳۹۱)

جدائی تا جدائی فرق ہے ملتے بھی ہیں آکر
فراق ایسا نہیں ہوتا کہ پھر آتے نہیں جاکر
اگرچہ چپ لگی ہے عاشقی کی مجھ کو حیرت سے
کبھو احوال پرسی تو کرو دل ہاتھ میں لاکر

جو جانوں تجھ میں بلبل تہ نہیں تو کیوں زباں دیتا   زباں کر بند سارے باغ میں مجھ کو نہ رسوا کر
فلک نے باغ سے جوں غنچۂ نرگس نکالا ہے   کہیں کیا جانوں کیا دیکھوں گا چشم بستہ کو وا کر

سبد پھولوں بھرے بازار میں آئے ہیں موسم میں
نکل کر گوشۂ مسجد سے تو بھی میر سودا کر

(۱۳۹۲)

اس رفتہ پاس اس کو لائے تھے لوگ جا کر   پر حیف میں نہ دیکھا بالیں سے سر اٹھا کر
سن سن کے درد دل کو بولا کہ جاتے ہیں ہم   تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر
آگے زمیں کی تہ میں ہم سے بہت تھے تو بھی   سر پر زمین اٹھالی ہم بےتہوں نے آ کر
میرے ہی خوں میں ان نے تیغہ نہیں سلایا   سویا ہے اژدہا یہ بہتیرے مجھ سے کھا کر
دل ہاتھ آگیا تھا لطف قضا سے میرے   افسوس کھو چلا ہوں ایسے گہر کو پا کر
جو وجہ کوئی ہو تو کہنے میں بھی کچھ آوے   باتیں کرو ہو بگڑی منھ کو بنا بنا کر

اب تو پھرو ہو بےغم تب میر جانیں گے ہم
اچھے رہوگے جب تم دل کو کہیں لگا کر

(۱۳۹۳)

بزم میں منھ ادھر کریں کیوں کر   اور نیچی نظر کریں کیوں کر(۱)
یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے   سر جھکائے گذر کریں کیوں کر
رازپوشی عشق ہے منظور   آنکھیں رو رو کے تر کریں کیوں کر
مست و بےخود ہم اس کے در پہ گئے   لوگ اس کو خبر کریں کیوں کر
سو رہا بال منھ پہ کھول کے وہ   ہم شب اپنی سحر کریں کیوں کر
مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ   ان کو زیر و زبر کریں کیوں کر

دل نہیں دردمند اپنا میر
آہ و نالے اثر کریں کیوں کر

ردیف ز

(۱۳۹۴)

ہے زیرخاک لاشۂ عاشق طپاں ہنوز   پیدا ہے عشق کشتے کا اس کے نشاں ہنوز
گردش سے اس کی خاک برابر ہوئی ہے خلق   استادہ روے خاک پہ ہے آسماں ہنوز

(۱) یہ مطلع اگلے شعر سے مربوط ہے۔ مصحح

اس تک پہنچنے کا تو نہیں حال کچھ ولے   جاتے ہیں گرتے پڑتے بھی ہم ناتواں ہنوز
پروانہ جل کے خاک ہوا پھر اڑا کیا   اے شمع تیری رہتی نہیں ہے زباں ہنوز
چندیں ہزار جانیں گئیں اس کی راہ میں   ایک آدھ تو بھی مر رہے ہیں نیم جاں ہنوز
مدت ہوئی کہ خوار ہو گلیوں میں مر گئے   قصہ ہمارے عشق کا ہے داستاں ہنوز
لخت جگر کے غم میں کہ تھا لعل پارہ میر
رخسار زرد پر ہے مرے خوں رواں ہنوز

(۱۳۹۵)

دیوانگی کی ہے وہی زور آوری ہنوز   ہر دم نئی ہے میری گریباں دری ہنوز
سر سے گیا ہے سایۂ لطف اس کا دیر سے   آنکھوں ہی میں پھرے ہے مری وہ پری ہنوز
شوخی سے زارگریہ کی خوں چشم میں نہیں   ویسی ہی ہے مژہ کی بعینہ تری ہنوز
کب سے نگاہ گاڑے ہے یاں روز آفتاب   ہم دیکھے ہیں جہاں کے تئیں سرسری ہنوز
مبہوت ہوگیا ہے جہاں اک نظر کیے   جاتی نہیں ان آنکھوں سے جادوگری ہنوز
ابر کرم نے سعی بہت کی پہ کیا حصول   ہوتی نہیں ہماری زراعت ہری ہنوز
مدت سے میر بے دل و دیں دلبروں میں ہے
کرتا نہیں ہے اس کی کوئی دلبری ہنوز

(۱۳۹۶)

گرچہ آتے ہیں گل ہزار ہنوز   نہ گیا دل سے روے یار ہنوز
بے قراری میں ساری عمر گئی   دل کو آتا نہیں قرار ہنوز
خاک مجنوں جہاں ہے صحرا میں   واں سے اٹھتا ہے اک غبار ہنوز
کب سے ہے وہ خلاف وعدہ ولے   دل کو اس کا ہے اعتبار ہنوز
قیس و فرہاد پر نہیں موقوف   عشق لاتا ہے مرد کار ہنوز
برسوں گذرے ہیں اس سے ملتے ولے   صحبت اس سے نہیں برآر ہنوز
عشق کرتے ہوئے تھے بے خود میر
اپنا ان کو ہے انتظار ہنوز

(۱۳۹۷)

وہ مخطط ہے محو ناز ہنوز   کچھ پذیرا نہیں نیاز ہنوز
کیا ہوا خوں ہوا کہ داغ ہوا   دل ہمارا نہیں گداز ہنوز

سادگی دیکھ اس جفاجو سے — ہم نہیں کرتے احتراز ہنوز
ایک دن وا ہوئی تھی اس منھ پر — آرسی کی ہے چشم باز ہنوز
معتبر کیا ہے میر کی طاعت
رہن بادہ ہے جانماز ہنوز

(۱۳۹۸)

خاک ہوکر اڑیں ہیں یار ہنوز — دل کا بیٹھا نہیں غبار ہنوز
نہ جگر میں ہے خوں نہ دل میں خوں — درپے خوں ہے روزگار ہنوز
دست بر دل ہوں مدتوں سے میر
دل ہے دنیا ہی بےقرار ہنوز

(۱۳۹۹)

دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز
ٹھہری ہے جان سی بھی شے کیا چیز

ردیف س

(۱۴۰۰)

مدت ہجر میں کیا کریے بیاں یار کے پاس — حال پرسی بھی نہ کی آن کے بیمار کے پاس
حق یہ ہے خواہش دل ہے مری تو آجاتا — جب کہ خوں ریزی کو بٹھلائیں مجھے دار کے پاس
در امیری کا کھلا منھ پہ ہمارے کیا تنگ — مر ہی رہیے گا قفس کے در و دیوار کے پاس
آنا اس کا تو دم قتل ضروری ہے ولے — کون آتا ہے کسو خوں کے سزاوار کے پاس
پایئے یار اکیلا تو غم دل کہیے — سو تو بیٹھا ہی اسے پاتے ہیں دوچار کے پاس
منھ پہ ناخن کے خراشوں سے لگا دل بہنے — چشمے نکلے ہیں نئے چشم جگر بار کے پاس
میں تو تلوار تلے اس کے لیے بیٹھا میر
وہ کھڑا بھی نہ ہوا آکے گنہگار کے پاس

(۱۴۰۱)

کل ہاتھ جا رہا تھا دل بےقرار پاس — گویا کہ جا رہا کسو سوزندہ نار پاس
کس جد و کد سے حیف ہے مجھ کو کیا شکار — ٹھہرا نہ پھر وہ صیدفگن اس شکار پاس

اس گل بغیر پہروں ہیں بلبل سے نالہ کش
کرتے ہیں اپنی اور سے تو ہم ہزار پاس

خوشحال وے جو حال کہیں دلبروں سے دیر
رویا نہ میں تو ایک گھڑی اپنے یار پاس

دوری میں جس کی مر گئے رک رک کے میر ہم
نکلا نہ وہ سو ہو کے ہمارے مزار پاس

(۱۴۰۲)

اب نہیں ہوتی چشم تر افسوس
بہ گیا خون ہو جگر افسوس

دیدنی ہے یہ خستہ حالی لیک
ایدھر اس کی نہیں نظر افسوس

عیب ہی عیب میرے ظاہر ہیں
مجھ کو آیا نہ کچھ ہنر افسوس

میر ابتر بہت ہے دل کا حال
یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس

ردیف ش

(۱۴۰۳)

نکلے پردے سے روے یار اے کاش
منھ کرے ٹک ادھر بہار اے کاش

کچھ وسیلہ نہیں جو اس سے ملوں
شعر ہو یار کا شعار اے کاش

کہیں اس بحرِ حسن سے بھر جائے
موج ساں میری بھی کنار اے کاش

برق ساں ہو چکوں تڑپ کر میں
یوں ہی آوے مجھے قرار اے کاش

اعتمادی نہیں ہے یاری غیر
یار سے ہم سے ہووے پیار اے کاش

آوے سررشتۂ جنوں کچھ ہاتھ
ہو گریبان تار تار اے کاش

میر جنگل تمام بس جاوے
بن پڑے ہم سے روزگار اے کاش

(۱۴۰۴)

اس کا خیال آوے ہے عیار کی روش
کچھ اس کی ہم نے پائی نہ رفتار کی روش

کیا چال ہے گی زہر بھری روزگار کی
سب اس گزندے کی ہے سیہ مار کی روش

وہ رفت و خیز گرم تو مدت سے ہو چکی
رہتے ہیں اب گرے پڑے بیمار کی روش

جاتے ہیں رنگ و بوے گل و آب جو چلے
آئی نہ خوش ہمیں تو یہ گلزار کی روش

مائل ہوا ہے سرو گلستاں کا دل بہت
کچھ آگئی تھی اس میں قد یار کی روش

زنداں میں جہاں کے بہت ہیں خراب حال
کرتے ہیں ہم معاش گنہگار کی روش

یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں میرؔ
اظہار بھی کریں ہیں تو اظہار کی روش

(۱۴۰۵)

رہتے ہیں بہت دل کے ہم آزار سے ناخوش
بستر پہ گرے رہتے ہیں بیمار سے ناخوش

جانا جو مقرر ہے مرا دار فنا سے
اس بستی کے میں ہوں در و دیوار سے ناخوش

ہمواری سے ہیں نرم و خشن ایک سے دونوں
خوش ہیں نہ گل تر سے نہ ہم خار سے ناخوش

سررشتۂ دل بند نہیں زلف و کمر میں
کیا جانیے ہم کس لیے ہیں یار سے ناخوش

ہے عشق میں صحبت مری خوباں کی عجب کچھ
اقرار سے بیزار ہیں انکار سے ناخوش

خوش رہتے ہیں احباب بہم ربط کیے سے
رہتے ہو تمھیں ایک مرے پیار سے ناخوش

اک بات کا بھی لوگوں میں ملپٹ اسے کرنا
ہم ہیں گے بہت میرؔ کے بستار سے ناخوش

ردیف ص

(۱۴۰۶)

طائر دل کی طپش سینے میں جانو تم بسمل کا قص
ان ہی رنگوں ہوتا ہے اس صید طرفہ دل کا رقص

ردیف ض

(۱۴۰۷)

کیا کہوں کیسا ہے دلبر خودغرض
خودنما خودرائے و خودسر خودغرض

ردیف ط

(۱۴۰۸)

دل لگی کے تئیں جگر ہے شرط
بےخبر مت رہو خبر ہے شرط

عشق کے دو گواہ لا یعنی
زردی رنگ و چشم تر ہے شرط

(۱۴۰۹)

دل کا لگانا جی کھونا ہے اس کو جگر ہے پیارے شرط
سو تو بہا تھا خوں ہو آگے پہلے داؤ ہی ہارے شرط

ردیف ظ

(۱۴۱۰)

عشق ہمارا جی مارے ہے ہم ناداں ہیں کیا محظوظ — ایسی شے کا زیاں کھینچے تو دانا ہووے نامحظوظ
پانی منہ میں بھر آتا تھا اس کے عقیق لب دیکھے
اب ہے تشنہ کام جدائی میر وگرنہ تھا محظوظ

ردیف ع

(۱۴۱۱)

ایک ہی گل کا صرف کیا ہے میں نے سراپا جیسے شمع
ٹکڑوں تک وہ داغ گیا ہے سب مجھ کو کھا جیسے شمع

ردیف غ

(۱۴۱۲)

ہمارے آگے چمن سے گئی بہار دریغ
دریغ و درد و صد افسوس صد ہزار دریغ

(۱۴۱۳)

دل جگر دونوں پر جلائے داغ — عشق نے کیا ہمیں دکھائے داغ
دل جلے ہم نہیں رہے بیکار — زخم کاری اٹھائے کھائے داغ
جل گئے دیکھ گرمی اغیار — آئے اس کوچے سے تو آئے داغ
احتیاطاً صراحی مے سے — ہم نے سجادے کے دھلائے داغ
دیکھیے دامن کے نیچے کے سے دیے
میر نے گر تلے چھپائے داغ

ردیف ف

(۱۴۱۴)

آج ہمارا سر پھرتا ہے باتیں جتنی سب موقوف
حرف و سخن جو با یک دیگر رہتے تھے سو اب موقوف

کس کو دماغ رہا ہے یاں آٹھ پہر کی منت کا
ربط اخلاص سے دن گذرے ہے خلطہ ان سے سب موقوف

اس کی گلی میں آمد و شد کی گھات ہی میں ہم رہتے تھے
اب جو شکستہ پا ہو بیٹھے ڈھب کرنے کے ڈھب موقوف

وہ جو مانع ہو تو کیا ہے شوق کمال کو پہنچا ہے
وقفہ ہوگا تب ملنے میں ہم بھی کریں گے جب موقوف

حلقے پڑے ہیں چشم تر میں سوکھے ایسے تم نہ رہے
رونا کڑھنا عشق میں اس کے میرؔ کروگے کب موقوف

(۱۴۱۵)

میں آگے نہ تھا دیدۂ پرآب سے واقف
پلکیں نہ ہوئی تھیں مری خوناب سے واقف

پتھر تو بہت لڑکوں کے کھائے ہیں ولیکن
ہم اب بھی جنوں کے نہیں آداب سے واقف

ہم تنگ خلائق یہ عجب ہے کہ نہیں ہیں
اس عالم اسباب میں اسباب سے واقف

شب آنکھیں کھلی رہتی ہیں ہم منتظروں کی
جوں دیدۂ انجم نہیں ہیں خواب سے واقف

بل کھائے انھیں بالوں کو ہم جانیں ہیں یا میرؔ
ہیں پیچ و غم و رنج و تب و تاب سے واقف

(۱۴۱۶)

نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف
نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف

چھپاتے ہیں منھ اپنا کامل سے سب
نہیں کوئی کرتا ہنر کی طرف

بڑی دھوم سے ابر آئے گئے
نہ کوئی ہوا چشم تر کی طرف

اندھادھند روتے ہیں آنکھوں سے خون
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

رہا بے خبر گرچہ ہجراں میں میرؔ
رہے گوش اس کی خبر کی طرف

ردیف ق

(۱۴۱۷)

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِّ الٰہی کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

عشق کی شان ارفع اکثر ہے لیکن شانیں عجائب ہیں
گہ ساری ہے دماغ و دل میں گاہے سب سے جدا ہے عشق

کام ہے مشکل الفت کرنا اس گلشن کے نہالوں سے
بوکش ہوکر سیب ذقن کا غش نہ کرے تو سزا ہے عشق

الفت سے پرہیز کیا کر کلفت اس میں قیامت ہے
یعنی درد و رنج و تعب ہے آفت جان بلا ہے عشق

میر خلاف مزاج محبت موجب تلخی کشیدن ہے
یار موافق مل جاوے تو لطف ہے چاہ مزہ ہے عشق

(۱۴۱۸)

دل کا مطالعہ کر اے آگہ حقائق
ہیں فن عشق کے بھی مشکل بہت دقائق

چھاتی جلوں کے آگے کھنچتا ہے بیشتر دل
ایک آشنا ہے مجھ سے اس باغ میں شقائق

ہے راستی کہ انساں مشتق ہے انس ہی سے
بیاری دوستی کی ہے دشمن خلائق

جی سارے تن کا کھنچ کر آنکھوں میں آ رہا ہے
کس مرتبے میں ہم بھی ہیں دیکھنے کے شائق

کل میر جی نے ضائع اپنے تئیں کیا ہے
یہ کام تھا نہ ان کی شائستگی کے لائق

(۱۴۱۹)

نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرار عشق
اور آسماں غبار سر رہ گذار عشق

مقبول شہر ہی نہیں مجنوں ضعیف و زار
ہے وحشیان دشت میں بھی اعتبار عشق

گھر کیسے کیسے ویں کے بزرگوں کے ہیں خراب
القصہ ہے خرابۂ کہنہ دیار عشق

گو ضبط کرتے ہوویں جراحت جگر کے زخم
روتا نہیں ہے کھول کے دل رازدار عشق

مارا پڑے ہے انس ہی کرنے میں ورنہ میر
ہے دورگرد وادی وحشت شکار عشق

ردیف ک

(۱۴۲۰)

وحشت ہے ہمیں بھی وہی گھر بار سے اب تک
سر مارے ہیں اپنے در و دیوار سے اب تک

مرتے ہی سنا ان کو جنھیں دل لگی کچھ تھی
اچھا بھی ہوا کوئی اس آزار سے اب تک

جب سے لگی ہیں آنکھیں کھلی راہ تکے ہیں
سوئے نہیں ساتھ اس کے کبھو پیار سے اب تک

آیا تھا کبھو یار سو مامول ہم اس کے
بستر پہ گڑے رہتے ہیں بیمار سے اب تک

بدعہدیوں میں وقت وفات آن بھی پہنچا
وعدہ نہ ہوا ایک وفا یار سے اب تک

ہے قہر و غضب دیکھ طرف کشتے کے ظالم   کرتا ہے اشارت بھی تو تلوار سے اب تک

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

(۱۴۲۱)

رہا پھول سا یار نزہت سے اب تک   نہ ایسا کھلا گل نزاکت سے اب تک
لبالب ہے وہ حسن معنی سے سارا   نہ دیکھا کوئی ایسی صورت سے اب تک
سلیمان سکندر کہ شاہان دیگر   نہ رونق گئی کس کی دولت سے اب تک
کرم کیا صفت ہے نہ ہوں گو کریماں   سخن کرتے ہیں ان کی ہمت سے اب تک
سبب مرگ فرہاد کا ہوگیا تھا   نگوں ہے سرتیشہ خجلت سے اب تک
ہلا تو بھی لب کو کہ عیسیٰؑ کے دم کی   چلی جائے ہے بات مدت سے اب تک
عقیق لب اس کے کبھو دیکھے تھے میں   بھرا ہے دہن آب حسرت سے اب تک
گئی عمر ساری مجھے عجز کرتے   نہ مانی کوئی ان نے منت سے اب تک

نہ ہو گو جنوں میرجی کو پر ان کی
طبیعت ہے آشفتہ وحشت سے اب تک

ردیف گ

(۱۴۲۲)

اس رنگ سے جو زرد زبوں زار ہیں ہم لوگ   دل کے مرض عشق سے بیمار ہیں ہم لوگ
کیا اپنے تئیں پستی بلندی سے جہاں کی   اب خاک برابر ہوئے ہموار ہیں ہم لوگ
مقصود تو حاصل ہے طلب شرط پڑی ہے   وہ مطلب عمدہ ہے طلبگار ہیں ہم لوگ
خوں ریز ہی لڑکوں سے لڑا رہتے ہیں آنکھیں   گر قتل کریں ہم کو سزاوار ہیں ہم لوگ
دل پھنس رہے ہیں دام میں زلفوں کے کسو کی   تنگ اپنے جیوں سے ہیں گرفتار ہیں ہم لوگ
بازار کی بھی جنس پہ جی دیتے ہیں عاشق   سر بیچتے پھرتے ہیں خریدار ہیں ہم لوگ
ان پریوں سے لڑکوں ہی کے جھپٹے میں دل آئے   بے ہوش و خرد جیسے پریدار ہیں ہم لوگ
در پر کسو کے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہیں   حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ
جاتے ہیں چلے قافلہ در قافلہ اس راہ   چلنے میں تردد نہیں تیار ہیں ہم لوگ
مارے ہی پڑیں کچھ کہیں عشاق تو شاید   حیرت سے ہیں چپ تس پہ گنہگار ہیں ہم لوگ

گو نیچی نظر میر کی ہو آنکھیں تو ٹک دیکھ
کیا دل زدگاں سادہ میں پرکار ہیں ہم لوگ

(۱۴۲۳)

کیا چلے جاتے ہیں جہان سے لوگ
گھر آئے تھے مہمان سے لوگ

قہر ہے بات بات پر گالی
جاں بہ لب ہیں تری زبان سے لوگ

شہر میں گھر خراب ہے اپنا
آتے ہیں یاں اب اس نشان سے لوگ

ایک گردش میں ہیں برابر خاک
کیا جھگڑتے ہیں آسمان سے لوگ

درد دل ان نے کب سنا میرا
لگے رہتے ہیں اس کے کان سے لوگ

باؤ سے بھی لچک لہکید ہے انھیں
ہیں سبھی سبزے دھان پان سے لوگ

شوق میں تیر سے چلے اودھر
ہم خمیدہ قداں کمان سے لوگ

آدمی اب نہیں جہاں میں میر
اٹھ گئے اس بھی کاروان سے لوگ

ردیف ل

(۱۴۲۴)

بلبل نے کل کہا کہ بہت ہم نے کھائے گل
لیکن ہزار حیف نہ ٹھہری ہوائے گل

رعنا جوان شہر کے رہتے ہیں گل بسر
سر پر ہمارے داغ جنوں کے ہیں جائے گل

دل لوٹنے پہ مرغ چمن کے نہ کی نظر
بے درد گل فروش سبد بھر کے لائے گل

حیف آفتاب میں پس دیوار باغ ہیں
جوں سایہ وا کشیدہ ہوئے ہم نہ پائے گل

بوئے گل و نوائے خوش عندلیب میر
آئی چلی گئی یہی کچھ تھی وفائے گل

(۱۴۲۵)

عشق کی چوٹیں پے در پے جو اٹھائی گئیں گھائل ہے دل
یوں بے دم ہے اب پہلو میں جوں صید بسمل ہے دل

خون ہوا ہے چاک ہوا ہے جلتے جلتے داغ ہوا
خواہش اس کو کیا ہے ہارے کس کے لیے بیدل ہے دل

عشق کی بجلی آکے گری سو داغ ہوا ہے سرتا سر
کیا روئے جوں ابر کوئی اس مزرع کا حاصل ہے دل

یوں تو گرہ سینے میں ہمارے درد و غم کی ہوکے رہا
کس سے ظاہر کرتے جاکر کام بہت مشکل ہے دل

آنکھوں کی دیکھا دیکھی ہرگز دل کو اس سے نہ لگنا تھا
جیسی سزا پہنچاوے کوئی اب اس کے قابل ہے دل

عمر انساں راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے ولے
دل کے تئیں پہنچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل

شہد لب سے اس کے چپکا جی کا صرفہ کچھ نہ کیا
میر جو دیکھا اپنے حق میں کیا زہر قاتل ہے دل

(۱۴۲۶)

غم مضموں نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد کیا حاصل
ہوئے نصید زبوں ہم منتظر ہی خاک جی دے کر سواری سے کسو کی گو اٹھی اب گرد کیا حاصل
بلا ہے سوزسینہ میر لوں ہوجائے گی جل کر
اگر دل سے اٹھی تیرے یہ آہ سرد کیا حاصل

(۱۴۲۷)

دل تو گداز سب ہے کس کو کوئی کہے دل نزدیک ہے کہ کہیے اب ہائے ہائے اے دل
اس عشق میں نکالے میں نے بھی نام کیا کیا خانہ خراب و رسوا بے دین اور بے دل
جوں ابر رویئے کیا دل برق سا ہے بےکل رکھے ہی رہیے اکثر ہاتھ اس پہ جو رہے دل
دل گو کہ داغ و خوں ہے رہتی ہے لاگ تجھ سے انصاف کر کہ جا کر دکھلاویں پھر کسے دل
دل کے ثبات سے ہم نومید ہو رہے ہیں اب وہ سماں ہے خوں ہو رخسار پر بہے دل
عاشق کہاں ہوئے ہم پانچوں حواس کھوئے اس مخمصے میں ازبس حیراں ہے کیا کرے دل
جاتا ہے کیا کھنچا کچھ دیکھ اس کو ناز کرتا آتا نہیں ہمیں خوش انداز بے تہ دل
ہم دردمند اپنا سوز دروں ہے بےحد یارب ہمارے اوپر کس مرتبے جلے دل
اے میر اسے ہے نسبت کن حلقہ حلقہ مو سے
بیتاب کچھ ہے گاہے پرپیچ ہے گہے دل

(۱۴۲۸)

حال تو حال زار ہے تا حال دل وہی بےقرار ہے تا حال
بڑھتی ہے حال کی خرابی روز گرچہ کچھ روزگار ہے تا حال
خستہ جانی نے تنگ خلق کیا پر اسے اُس سے عار ہے تا حال
حال فکر سخن میں کچھ نہ رہا شعر میرا شعار ہے تا حال
حال مستی جوانی تھی سو گئی میر اس کا خمار ہے تا حال
آنکھیں بدحالی سے ٹھہرتیں نہیں شوق دیدار یار ہے تا حال
غم سے حالانکہ خون دل سوکھا
چشم تر اشکبار ہے تا حال

(۱۴۲۹)

کھنچتا ہے اس طرف ہی کو بے اختیار دل — دیوانہ دل بلا زدہ دل بے قرار دل
سمجھا بھی تو کہ دل کسے کہتے ہیں دل ہے کیا — آتا ہے جو زباں پہ تری بار بار دل
آزردہ خاطری کا ہماری نہ کر عجب — اک عمر ہم رہا کیے ہیں مار مار دل
واشد فسردگی سے تری اس چمن میں ہے — دل جو کھلا تو جیسے گل بے بہار دل

میر اس کے اشتیاق ہم آغوشی میں نہ پوچھ
جاتا ہے اب تو جی ہی رہا درکنار دل

(۱۴۳۰)

مت کرو شور و فغاں سے طائرِ آزار دل — اب دماغ اڑتا ہے باتوں میں کہ ہوں بیمار دل

رنج و غم بھی کھینچنے کے دن تو یارو ہو چکے
اب نہیں جاتی اٹھائی کلفت بسیار دل

ردیف م

(۱۴۳۱)

شور سے طائر گلزار کے بیزار ہیں ہم
دل اٹھاتا نہیں اپنا کہ گرفتار ہیں ہم

(۱۴۳۲)

بن میں چمن میں جی نہیں لگتا یارو کیدھر جاویں ہم — راہ خرابے سے نکلی نہ گھر کی بستی میں کیوں کر جاویں ہم
کیسی کیسی خرابی کھینچی دشت و در میں سر مارا — خانہ خراب کہاں تک پھریے ایسا ہو گھر جاویں ہم
عشق میں گام اول اپنے جی سے گذرنا پیش آیا — اس میداں میں رکھ کے قدم کیا مرنے سے ڈر جاویں ہم
خواہ نماز خضوع سے ہووے خواہ نیاز اک سوے دل — وقت رہا ہے بہت کم اب تو بارے کچھ کر جاویں ہم

کب تک میر فراق میں اس کے لوہو پی پی جیتے رہیں
بس چلتا نہیں آہ اپنا کچھ ورنہ ابھی مر جاویں ہم

(۱۴۳۳)

شاید ہم سے ضد رکھتے ہو آتے نہیں ٹک ایدھر تم — سب سے گلی کوچوں میں ملو ہو پھرتے رہو ہو گھر گھر تم
کیا رکھیں یہ تم سے توقع خاک سے آکے اٹھاؤ گے — راہ میں دیکھو افتادہ تو اور لگاؤ ٹھوکر تم

اس سے زیادہ ہوتا نہ ہوگا دنیا میں بھی نچلاپن
سون کے بیٹھے رہتے ہو حال ہمارا سن کر تم

لطف و مہر و خشم و غضب ہم ہر صورت میں راضی ہیں
حق میں ہمارے کر گذرو بھی جو کچھ جانو بہتر تم

رنگ ہمارا جیسا اب ہے کاہے کو آگے ایسا تھا
پاؤں میں مہندی اپنے لگا کر آفت لائے سر پر تم

لوگ صنم کہتے تھے تم کو ان سمجھے تھے ہم محظوظ
سختی سی سختی کھینچی گئی یعنی نکلے پتھر تم

چپکے سے کچھ آجاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گذرتی کیا ہے دل پر کڑھا کرو ہو اکثر تم

(۱۴۳۴)

پوشاک تنگ پہنے بارے کہاں چلے تم
ہے آج عید صاحب میرے لگے گلے تم

اس نازکی سے گذرے کس کے خیال میں شب
مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے دلے تم

کیا ظلم ہے کہ کھینچے شمشیر وہ کھڑے ہے
آزردہ ہوں گا پھر میں جاگہ سے جو ہلے تم

کم پائی اس قدر ہے منزل ہے دور اتنی
طے کس طرح کروگے یارو یہ مرحلے تم

اکثر نڈھال ہیں ہم پر یوں نہیں وہ کہتا
کیا ہے کہ جاتے ہوگے کچھ اتنے ہی ڈھلے تم

یہ جانتے نہ تھے ہم ایسے برے ہوئے ہو
ہونٹوں پہ جان آئی تم بن گئے بھلے تم

قربانی اس کی ٹھہری پر یہ طرح نہ چھوڑی
تکتے ہو میر اودھر تلوار کے تلے تم

(۱۴۳۵)

یارب اس محبوب کو پھر اک نظر دیکھیں گے ہم
اپنی آنکھوں سے اسے یاں جلوہ گر دیکھیں گے ہم

میں کہا دیکھو ادھر ٹک تم تو میں بھی جان دوں
ہنس کے بولے یہ تری باتیں ہیں پر دیکھیں گے ہم

پاس ظاہر سے اسے تو دیکھنا دشوار ہے
جائیں گے مجلس میں تو ایدھر ادھر دیکھیں گے ہم

یوں نہ دیں گے دل کسو سیمیں بدن زر دوست کو
ابتدائے عشق میں اپنا بھی گھر دیکھیں گے ہم

کام کہتے ہیں سماجت سے کبھو لیتے ہیں لوگ
ایک دن اس کے کنے جا کر بپھر دیکھیں گے ہم

راہ تکتے تکتے اپنی آنکھیں بھی پتھرا چلیں
یہ نہ جانا تھا کہ سختی اس قدر دیکھیں گے ہم

شورش دیوانگی اس کی نہیں جائے گی لیک
ایک دو دن میر کو زنجیر کر دیکھیں گے ہم

(۱۴۳۶)

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے رہ کے جدا نہ ستاؤ تم
پاؤں کا رکھنا گرچہ ادھر کو عار سے ہے پر آؤ تم

جس کے تئیں پروا ہو کسو کی آنا جانا اس کا ہے
نیک ہو یا بد حال ہمارا تم کو کیا ہے جاؤ تم

چپ ہیں کچھ جو نہیں کہتے ہم کار عشق کے حیراں ہیں
سوچو حال ہمارا ٹک تو بات کی تہ کو پاؤ تم

میر کو وحشت ہے گی قیامت واہی تباہی بکتے ہیں
حرف و حکایت کیا مجنوں کی دل میں کچھ مت لاؤ تم

(۱۴۳۷)

ظلم ہوئے ہیں کیا کیا ہم پر صبر کیا ہے کیا کیا ہم
آن لگے ہیں گور کنارے اس کی گلی میں جا جا ہم

ہاہا ہی کر ٹالے گا اس کا غرور دو چنداں ہے
گھگھیانے کا اب کیا حاصل یوں ہی کرے ہیں ہاہا ہم

اب حیرت ہے کس کس جاگہ پنبہ و مرہم رکھنے کی
قد تو کیا ہے سرو چراغاں داغ بدن پر کھا کھا ہم

سیر خیال جنوں کا کریے صرف کریں تا ہم پر سب
پتھر آپ گلی کوچوں میں ڈھیر کیے ہیں لالا ہم

میر فقیر ہوئے تو اک دن کیا کہتے ہیں بیٹے سے
عمر رہی ہے تھوڑی اسے اب کیوں کر کاٹیں بابا ہم

(۱۴۳۸)

ایک آدھ دن سنوگے ستا کے رہ گئے ہم
کانپا کرے ہے جی سو ٹھہرا کے رہ گئے ہم

واشد ہوئی سو اپنی پژمردگی سے بدتر
موسم گئے کے گل سے مرجھا کے رہ گئے ہم

پرواغ دل کو لے کر آخر کیا کنارہ
اس باغ سے گلی میں جا جا کے رہ گئے ہم

سوز دروں نے ہم کو پردے میں مار رکھا
جوں شمع آپ ہی کو کھا کھا کے رہ گئے ہم

حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے
کہہ سکتے کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے ہم

اے وائے دل گئے پر جی بھی گیا ہمارا
یعنی کہ میر برسوں پچھتا کے رہ گئے ہم

(۱۴۳۹)

حال زخم جگر سے ہے درہم
کاش رہتے کسو طرف مرہم

دلبروں کو جو بر میں کھینچا تنگ
اس ادا سے بہت ہوئے برہم

آپ کو اب کہیں نہیں پاتے
بے خودی سے گئے ہیں کیدھر ہم

دیر و کعبہ گئے ہیں ہم اکثر
یعنی ڈھونڈا ہے اس کو گھر گھر ہم

کہہ سکے کون ہم کو ناہموار
اب تو ہیں خاک سے برابر ہم

کوفت سی کوفت اپنے دل پر ہے
چھاتی کوٹا کیے ہیں اکثر ہم

ابر کرتا ہے اب کمی سی میر
دیکھیں ہیں سوے دیدۂ تر ہم

(۱۴۴۰)

تجا ہے حیرت عشق سے گفتگو کو ہم
خموش دیکھتے رہتے ہیں اس کے رو کو ہم

اگرچہ وصل ہے پر ہیں طلب میں سرگرداں
پہ وہم کار ہی جاتے ہیں جستجو کو ہم

اب اپنی جان سے ہیں تنگ دم رکا ہے بہت
ملا ہی دیں گے تری تیغ سے گلو کو ہم

جلا کے خاک کرے وہ کہ رہ کے داغ کرے
لگا دیں آگ سے کیا اپنی گرم خو کو ہم

مرید پیر خرابات یوں نہ ہوتے میر
سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم

(۱۴۴۱)

عشق بتوں سے اب نہ کریں گے عہد کیا ہے خدا سے ہم
آجاویں جو یہ ہرجائی تو بھی نہ جاویں جا سے ہم

گریۂ خونیں تک بھی رہے تو خاک سی منہ پر اڑتی ہے
شام و سحر رہتے ہیں یعنی اپنے لہو کے پیاسے ہم

اس کی نہ پوچھو دوری میں ان نے پرسش حال ہماری نہ کی
ہم کو دیکھو مارے گئے ہیں آکر پاس وفا سے ہم

چپکے کیا انواع اذیت عشق میں کھینچی جاتی ہے
دل تو بھرا ہے اپنا تو بھی کچھ نہیں کہتے حیا سے ہم

کیا کیا عجز کریں ہیں لیکن پیش نہیں کچھ جاتا میر
سر رگڑے ہیں آنکھیں ملیں ہیں اس کے حنائی پا سے ہم

(۱۴۴۲)

چاہیے یوں تھا بگڑی صحبت آپھی آکے بناتے تم
رحلت کرنے سے آگے مجھ کو دیکھتے آتے جاتے تم

چلتے کہا تھا جاؤ سفر کر آؤگے تو ملیے گا
وعدۂ وصل نہ ہوتا تو پھر کس کو جیتا پاتے تم

کیا دن تھے وے دیکھتے تم کو نیچی نظر میں کر لیتا
شرما شرما لوگوں سے جب آنکھیں مجھ کو دکھاتے تم

بستر پر میں مردہ سا تھا جان سی مجھ میں آجاتی
کیا ہوتا جو رنجہ قدم کر میرے سرہانے آتے تم

دل کے اوپر ہاتھ رکھے ہی شام و سحریاں گذرے ہے
حال یہ تھا تو دل عاشق کا ہاتھ میں تک تو لاتے تم

خاک ہے اصل طینت آدم چاہیے اس کو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اٹھاتے تم

چہرہ زرد بجا ہے سارا عشق میں غم کا مارا ہوں
رنگ یہ دیکھا ہوتا تو دل میر کہیں نہ لگاتے تم

(۱۴۴۳)

صبر بہت تھا ایک سمیں میں جا سے اپنی نہ جاتے ہم
کس کس ناز سے وے آتے پر آنکھ نہ ان سے ملاتے ہم

کعبے سے کر نذر اٹھے سو خرج راہ انے وائے ہوئے
ورنہ صنم خانے میں جا زنار گلے سے بندھاتے ہم

ہاتھی مست بھی آوے چلا تو اس سے منہ کو پھیر نہ لیں
پھرتے ہیں سرمست محبت مے ناخوردہ ماتے ہم

ہائے جوانی وہ نہ گلے لگتا تو خشم عشق سے
نعل جڑی جاتی چھاتی پر گل ہاتھوں پر کھاتے ہم

عشق تو کارِ خوب ہے لیکن میرؔ کھنچے ہے رنج بہت
کاش کے عالم ہستی میں بے عشق و محبت آتے ہم

ردیف ن

(۱۴۴۴)

ضعف دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں
اتنا ہے کہ طپش سے دل کی سر پر وہ دھمال نہیں

گاہے گاہے اس میں ہم نے منھ اس مہ کا دیکھا تھا
جیسا سال کہ پر کا گذرا ویسا بھی یہ سال نہیں

بالوں میں اس کے دل الجھا تھا خوب ہوا جو تمام ہوا
یعنی گیا جب پیچ سے جی ہی تب پھر کچھ جنجال نہیں

ایسی متاع قلیل کے اوپر چشم نہ کھولیں اہل نظر
آنکھ میں آوے جو کچھ ہووے دنیا اتنی مال نہیں

سرو چماں کو میر کیا تھا کبک خراماں دیکھ لیا
اس کا سا انداز نہ پایا اس کی سی یہ چال نہیں

دل تو ان میں پھنس جاتا ہے جی ڈوبے ہے دیکھ ادھر
چاہ زنخ گو چاہ نہیں ہے بال اس کے گو جال نہیں

کب تک دل کے ٹکڑے جوڑوں میرؔ جگر کے لختوں سے
کب نہیں ہے پارہ دوزی میں کوئی وصال نہیں

(۱۴۴۵)

ہے وضع کشیدہ کا جو شور اس کے جہاں میں
نکلی ہے مگر تازہ کوئی شاخ کماں میں

ہر طور میں ہم حرف و سخن لاگ سے دل کی
کیا کیا کہیں ہیں مرغ چمن اپنی زباں میں

کیا باؤ نے بھی دست تطاول کو دیا طول
پھیلے پڑے ہیں پھول ہی سب اب کے خزاں میں

خوش رنگ ہے کس مرتبہ انہار کا پانی
خوناب مری چشم کا ہے آب رواں میں

روؤ مرے احوال پہ جوں ابر بہت میر
بے طاقتی بجلی کی سی ہے آہ و فغاں میں

(۱۴۴۶)

دل کے گئے بے دل کہلائے آگے دیکھیے کیا کیا ہوں
محزوں ہوویں مفتوں ہوویں مجنوں ہوویں رسوا ہوں

عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گم ہوویں یا پیدا ہوں

خار و خس الجھے ہیں آپھی بحث انھوں سے کیا رکھیں
موج زن اپنی طبع رواں سے جب ہم جیسے دریا ہوں

ہم بھی گئے جاگہ سے اپنی شوق میں اس ہرجائی کے
عشق کا جذبہ کام کرے تو پھر ہم دونوں یک جا ہوں

کوئی طرف یاں ایسی نہیں جو خالی ہووے اس سے میرؔ
یہ طرفہ ہے شور جرس سے چار طرف ہم تنہا ہوں

(۱۴۴۷)

کچھ قدر عافیت کی معلوم کی نہ گھر میں
اب ہجر یار میں ہیں کیا دل زدہ سفر میں

ہر لحظہ بے قراری ہر لمحہ آہ و زاری
ہر دم ہے اشکباری نومیدی ہے نظر میں

روتے ہی رہنا اکثر نہ چاہتا ہے سو تو
تاب اب نہیں ہے دل میں نے خون ہے جگر میں

یہ بخت دیکھ گاہے آتا ہے آنکھوں میں بھی
پر نقش اس کے پا کا بیٹھا نہ چشم تر میں

کیا راہ چلنے سے ہے اے میرؔ دل مکدر
تو ہی نہیں مسافر ہے عمر بھی گذر میں

(۱۴۴۸)

خوبی رو و چشم سے آنکھیں اٹک گئیں
پلکوں کی صف کو دیکھ کے بھیڑیں سرک گئیں

چلتے سمندناز کی شوخی کو اس کے دیکھ
گھوڑوں کی باگیں دست سپہ سے اچک گئیں

ترچھی نگاہیں پلکیں پھریں اس کی پھرپھریں
سو فوجیں جو دو رستہ کھڑی تھیں بہک گئیں

بجلی سا مرکب اس کا کڑک کر چمک گیا
لوگوں کے سینے پھٹ گئے جانیں دھڑک گئیں

محبوب کا وصال نہ ہم کو ہوا نصیب
دل سے ہزار خواہشیں سر کو پٹک گئیں

موقوف طور نور کا جھمکا ترا نہیں
چمکا جہاں تو برق سا آنکھیں جھپک گئیں

وحشت سے بھر رہی تھی بزن گہ جہان کی
جانیں بسان طائر بسمل پھڑک گئیں

گرد رہ اس کی دیکھتے اپنے اٹھی نہ حیف
اب منتظر ہو آنکھیں مندیں یعنی تھک گئیں

بھردی تھی چشم ساقی میں یارب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے چھک گئیں

کیا میرؔ اس کی نوک پلک سے سخن کرے
سرتیز چھریاں گڑتی جگر دل تلک گئیں

(۱۴۴۹)

ہم سے اسے نفاق ہوا ہے وفاق میں
کم اتفاق پڑتے ہیں یہ اتفاق میں

شاید کہ جان و تن کی جدائی بھی ہے قریب
جی کو ہے اضطراب بہت اب فراق میں

عازم پہنچنے کے تھے دل و عرش تک ولے
آیا قصور اپنے ہی کچھ اشتیاق میں

احراق اپنے قلب کا رونے سے کب گیا
پانی کی چار بوندیں ہیں کیا احتراق میں

تحصیل علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

دم ناک میں بقول زناں عاشقوں کے ہیں
ہلتا بلا ہے موتی کا اس کے بلاق میں

اک نور گرم جلوہ فلک پر ہے ہر سحر
کوئی تو ماہ پارہ ہے میرؔ اس رواق میں

(۱۴۵۰)

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولیں ہیں   یاد میں اس خود رو گلِ تر کی کیسے کیسے بولیں ہیں
باغ میں جو ہم دیوانے سے جا نکلیں ہیں نالہ کناں   غنچے ہو ہو مرغِ چمن کے ساتھ ہمارے ہولیں ہیں
یار ہمارا آساں کیا کچھ سینہ کشادہ ہم سے ملا   خون کریں ہیں جب دل کو وے بندِ قبا کے کھولیں ہیں
مینھ جو برسے ہے شدت سے دیکھ اندھیری کیا ہے یہ   یعنی تنگ جو ہم آتے ہیں دل کو کھول کے رو لیں ہیں
وہ دھوبی کا کم ملتا ہے میل دل ادھر ہے بہت   کوئی کہے اس سے ملتے میں تجھ کو کیا ہم دھو لیں ہیں
سرو تو ہے سنجیدہ لیکن پیش مصرع قد یار   ناموزوں ہی نکلے ہے جب دل میں اپنے تولیں ہیں
مرگ کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میرؔ سمجھتے ہو
ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سو لیں ہیں

(۱۴۵۱)

غزل میرؔ کی کب پڑھائی نہیں   کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
زباں سے ہماری ہے صیاد خوش   ہمیں اب امید رہائی نہیں
کتابت گئی کب کہ اس شوخ نے   بنا اس کی گڈی اڑائی نہیں
نسیم آئی میرے قفس میں عبث   گلستاں سے دو پھول لائی نہیں
مری دل لگی اس کے رو سے ہی ہے   گلِ تر سے کچھ آشنائی نہیں
نوشتے کی خوبی لکھی کب گئی   کتابت بھی ایک اب تک آئی نہیں
گلہ ہجر کا سن کے کہنے لگا   ق   ہمارے تمھارے جدائی نہیں
جدا رہتے برسوں ہوئے کیونکے یہ   کنایہ نہیں بے ادائی نہیں
سیہ طالعی میری ظاہر ہے اب
نہیں شب کہ اس سے لڑائی نہیں

(۱۴۵۲)

دل کی لاگ بری ہے ہوتی چنگے بھلے مر جاتے ہیں   آپ میں ہم سے بے خود و رفتہ پھر پھر بھی کیا آتے ہیں
رنگ نہ بدلے چہرہ کیونکر آنکھیں بیٹھی جائیں نہ کیوں   کیسے کیسے غم کھاتے ہیں کیا کیا رنج اٹھاتے ہیں
جی ہی جائے ہے میرؔ جو اپنا دیر کی جانب کیا کریے
یوں تو مزاج طرف کعبے کے بہتیرا ہم لاتے ہیں

(۱۴۵۳)

دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ پڑیاں مار رکھا سو ان نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں
ایک نگہ میں مر جاتا ہے عاشق کوچک دل اس کا زہر بھری کیا کام آتی ہیں گو وے آنکھیں ہوں بڑیاں
عقدے داغ دل کے شاید دست قدرت کھولے گا ناخن سے تدبیر کے میری کھلتی نہیں یہ گل جھڑیاں
نحس تھے کیا وے وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا سال پہر ہے اب تو ہم کو ماہ برابر ہیں گھڑیاں

میر بلاے جان رہے ہیں دونوں فراق و وصل اس کے
ہجر کی راتیں وہ بھاری تھیں ملنے کے دن کی یہ کڑیاں

(۱۴۵۴)

بھلا ہوا کہ دل مضطرب میں تاب نہیں بہت ہی حال برا ہے اب اضطراب نہیں
جگر کا لوہو جو پانی ہو بہ نکلتا تھا سو ہو چکا کہ مری چشم اب پرآب نہیں
دیار حسن میں دل کی نہیں خریداری وفا متاع ہے اچھی پہ یاں کے باب نہیں
حساب پاک ہو روز شمار میں تو عجب گناہ اتنے ہیں میرے کہ کچھ حساب نہیں
گذر ہے عشق کی بے طاقتی سے مشکل آہ دلوں کو چین نہیں ہے شبوں کو خواب نہیں
جہاں کے باغ کا یہ عیش ہے کہ گل کے رنگ ہمارے جام میں لوہو ہے سب شراب نہیں

تلاش میر کی اب میکدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

(۱۴۵۵)

ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں بیٹھنے پاتے نہیں ہم کہ اٹھا دیتے ہیں
ان طیوروں سے ہوں میں بھی اگر آتی ہے صبا باغ کے چار طرف آگ لگا دیتے ہیں
گرچہ ملتے ہیں خنک غیرت مہ یہ لڑکے دل جگر دونوں کو یک لخت جلا دیتے ہیں
دیر رہتا ہے ہما لاش پہ غم کشتوں کی استخواں ان کے جلے کچھ تو مزہ دیتے ہیں
اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں ہر طرف سینکڑوں درویش دعا دیتے ہیں
دل جگر ہوگئے بیتاب غم عشق جہاں جی بھی ہم شوق کے ماروں کے دغا دیتے ہیں
کیونکے اس راہ میں پا رکھیے کہ صاحب نظراں یاں سے لے واں تئیں آنکھیں ہی بچھا دیتے ہیں
ملتے ہی آنکھ ملی اس کی تو پر ہم بے تہ خاک میں آپ کو فی الفور ملا دیتے ہیں

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

(۱۴۵۶)

جی مارا بیتابی دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
رنگ طپیدن کی شوخی سے منھ پر میرے رنگ نہیں

وہ جو خرام ناز کرے ہے ٹھوکر دل کو لگتی ہے
چوٹ کے اوپر چوٹ پڑے ہے دل ہے میرا سنگ نہیں

ہم بھی عالم فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں اتنے دل کے تنگ نہیں

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہو گے کیا میرے طور شتابی ہو
بیٹھا ہوں کھڑے پاؤں میں کچھ چلنے میں تو درنگ نہیں

شعر میر بھی پڑھتا ہے تو اور کسو کا لے کر نام
کیوں کر کہیے اس ناداں کو نام سے میرے ننگ نہیں

(۱۴۵۷)

وہ نہیں اب کہ فریبوں سے لگا لیتے ہیں
ہم جو دیکھیں ہیں تو وے آنکھ چھپا لیتے ہیں

کچھ تفاوت نہیں ہستی و عدم میں ہم بھی
اٹھ کے اب قافلۂ رفتہ کو جا لیتے ہیں

نازکی ہائے رے طالع کی نکوئی سے کبھو
پھول سا ہاتھوں میں ہم اس کو اٹھا لیتے ہیں

صحبت آخر کو بگڑتی ہے سخن سازی سے
کیا درانداز بھی اک بات بنا لیتے ہیں

ہم فقیروں کو کچھ آزار تمھیں دیتے ہو
یوں تو اس فرقے سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

چاک سینے کے ہمارے نہیں سینے اچھے
انھیں رخنوں سے دل و جان ہوا لیتے ہیں

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

(۱۴۵۸)

تھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں
کہو تم سو دل کا مداوا کریں

گلستاں میں ہم غنچہ ہیں دیر سے
کہاں ہم کو پروا کہ پروا کریں

نہیں چاہتا جی کچھ اب سیر ہیں
ہوس دل کو ہو تو تمنا کریں

بخود جستجو میں نہ اس کی رہے
ہم آپھی ہیں گم کس کو پیدا کریں

غضب ہے یہ انداز رفتار عشق
چلے جائیں جی ہم تماشا کریں

بلا شور ہے سر میں ہم کب تلک
قیامت کا ہنگامہ برپا کریں

کہیں دل کی مرغان گلشن سے کیا
یہ بے حوصلہ ہم کو رسوا کریں

کھپا عشق کا جوش دل میں بھلا
کہ بدنام ہوویں جو سودا کریں

برے حال اس کی گلی میں ہیں میر
جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

(۱۴۵۹)

ہجر میں روتا ہوں ہر شب میں تو اس صورت سے یاں　　دے اندھیری مینھ برسے جوں کبھو شدت سے یاں
کس قدر بیگانہ خو ہیں مردمان شہر حسن　　بات کرنا رسم و عادت ہی نہیں الفت سے یاں
اٹھ گئے ہیں جب سے ہم سونا پڑا ہے باغ سب　　شور ہنگام سحر کا مہر ہے مدت سے یاں
سر کوئی پھوڑے محبت میں تو بارے اس طرح　　مر گیا ہے عشق میں فرہاد جس قدرت سے یاں
دلکشی اس بزم کی ظاہر ہے تم دیکھو تو ہو　　لوگ جی دیتے چلے جاتے ہیں کس حسرت سے یاں
صورتوں سے خاکداں یہ عالم تصویر ہے　　بولیں کیا اہل نظر خاموش ہیں حیرت سے یاں
فہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں　　اس پہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یاں
پنج روزہ عمر کریے عاشقی یا زاہدی　　کام کچھ چلتا نہیں اس تھوڑی سی مہلت سے یاں

کیا سر جنگ و جدل ہو بے دماغ عشق کو
صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

(۱۴۶۰)

داغ فراق سے کیا پوچھو ہو آگ لگائی سینے میں　　چھاتی سے وہ مہ نہ لگا ٹک آ کر اس بھی مہینے میں
چاک ہوا دل ٹکڑے جگر ہے لوہو روئے آنکھوں سے　　عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں
گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے　　رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں
اس صورت کا ناز نہ تھا کچھ دب چلتا تھا ہم سے بھی　　جب تک دیکھا ان نے نہ تھا منھ خوب اپنا آئینے میں
لوگوں میں اسلام کے ہو نہ شہرت اس رسوائی کی　　شیخ کو پھیرا گدھے چڑھا کر کے اور مدینے میں
دل نہ ٹٹولیں کاشکے اس کا سردی مہر تو ظاہر ہے　　پاویں اس کو گرم مبادا یار ہمارے کینے میں

میر نے کیا کیا ضبط کیا ہے شوق میں اشک خونیں کو
کہیے جو تقصیر ہوئی ہو اپنا لوہو پینے میں

(۱۴۶۱)

اب ہوسناک ہی مردم ہیں ترے یاروں میں　　ہم جو عاشق ہیں سو ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں
کوچۂ یار تو ہے غیرت فردوس ولے　　آدمی ایک نہیں اس کے ہواداروں میں
ہو کے بدحال محبت میں کھنچے آخرکار　　لوگ اچھے تھے بہت یار کے بیماروں میں
جی گیا ایک دم سرد ہی کے ساتھ اپنا　　ہم جو خوش زمزمہ تھے اس کے گرفتاروں میں

اب در باز بیاباں میں قدم رکھیے میر
کب تلک تنگ رہیں شہر کی دیواروں میں

(۱۴۶۲)

عالم علم میں ایک تھے ہم وے حیف ہے ان کو گیان نہیں
اب کہتے ہیں خلطہ کیسا جان نہیں پہچان نہیں

کس امید پہ ساکن ہووے کوئی غریب شہر اس کا
لطف نہیں اکرام نہیں انعام نہیں احسان نہیں

ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تن نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

کیا باتوں سے تسلی ہو دل مشکل عشقی میری سب
یار سے کہنے کہتے ہیں پر کہنا کچھ آسان نہیں

شام و سحر ہم سرزدہ دامن سر بگریباں رہتے ہیں
ہم کو خیال ادھر ہی کا ہے ان کو ادھر کا دھیان نہیں

جان کے میں تو آپ بنا ہوں ان لڑکوں میں دیوانہ
عقل سے بھی بہرہ ہے مجھ کو اتنا میں نادان نہیں

پاؤں کو دامن محشر میں ناچاری سے ہم کھینچیں گے
لائق اپنی وحشت کے اس عرصے کا میدان نہیں

چاہت میں اس مایۂ جاں کی مرنے کے شائستہ ہوئے
جا بھی چکی ہے دل کی ہوس اب جینے کا ارمان نہیں

شور نہیں یاں سنتا کوئی میرؔ قفس کے اسیروں کا
گوش نہیں دیوار چمن کے گل کے شاید کان نہیں

(۱۴۶۳)

یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رسوا ہو کر مارے جاویں اس کو بھی بدنام کریں

جن کو خدا دیتا ہے سب کچھ وے ہی سب کچھ دیتے ہیں
ٹوپی لنگوٹی پاس اپنے ہم اس پر کیا انعام کریں

منھ کھولے تو روز ہے روشن زلف بکھیرے رات ہے پھر
ان طوروں سے عاشق کیوں کر صبح کو اپنی شام کریں

خط و کتابت حرف و حکایت صفحہ ورق میں آجاوے
دستے کے دستے کاغذ ہو جو دل کا حال ارقام کریں

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

دل آسودہ ہو تو رہے ٹک در پر ہم سو بار گئے
وہ سو بھی کہہ بھیجے ہے باہر جاویں اب آرام کریں

میل گدائی طبع کو اپنی کچھ بھی نہیں ہے ورنہ میرؔ
دو عالم کو مانگ کے لاویں ہم جو تنک ابرام کریں

(۱۴۶۴)

پھرا میں صورت احوال ہر یک کو دکھاتا یاں
مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

محبت دشمن جاں ہے جو میں معلوم یہ کرتا
تو کاہے کو کسو سے میرؔ اپنا دل لگاتا یاں

(۱۴۶۵)

کس سے مشابہ کہیے اس کو ماہ میں ویسا نور نہیں / کیوں کر کہیے بہشتی رو ہے اس خوبی سے حور نہیں
شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں / کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں
ہم دیکھیں تو دیکھیں اسے پھر پردہ بہتر ہے یعنی / اور کریں نظارہ اس کا ہم کو یہ منظور نہیں
عزت اپنی تہی دستی میں رکھ لی خدا نے ہزاروں شکر / قدر ہے دست قدرت سے یاں حیف ہمیں مقدور نہیں
راہ دور عدم سے آئے بستی جان کے دنیا میں / سویاں گھر اوجڑ ہیں سارے اک منزل معمور نہیں
عشق و جنوں سے اگرچہ تن پر ضعف و نحافت ہے لیکن / وحشت گو ہو عرصۂ محشر مجنوں سے رنجور نہیں
ہجراں میں بھی برسوں ہم نے میرؔ کیا ہے پاس وفا
اب جو کبھو ٹک پاس بلا لے ہم کو وہ تو دور نہیں

(۱۴۶۶)

کیا کیا جھمک گئے ہیں رخسار یار دونوں / رہ رہ گئے مہ و خور آئینہ دار دونوں
تصویر قیس و لیلیٰ ٹک ہاتھ لے کے دیکھو / کیسے ہیں عاشقی کے حیران کار دونوں
دست جنوں نے اب کے کپڑوں کی دھجیاں کیں / دامان و جیب میرے ہیں تار تار دونوں
پر سال کی سی بارش برسوں میں پھر ہوئی تھی / ابر اور دیدۂ تر روتے ہیں زار دونوں
دن ہیں بڑے کبھو کے راتیں بڑی کبھو کی / رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں
دل اور برق ابر و فصل گل ایک سے ہیں / یعنی کہ بےکلی سے ہیں بےقرار دونوں
خوش رنگ اشک خونیں گرتے رہے برابر / باغ و بہار ہیں اب جیب و کنار دونوں
اس شاخ گل سے قد کی کیا چوٹ لگ گئی ہے / جو دل جگر ہوئے ہیں خون ایک بار دونوں
چلتے جو اس کو دیکھا جی اپنے کھنچ گئے ہیں
ہم اور میرؔ یاں ہیں بےاختیار دونوں

ردیف و

(۱۴۶۷)

دیتی ہے طول بلبل کیا شورش فغاں کو / اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداع جاں کو
میں تو نہیں پر اب تک مستانہ غنچے ہوکر / کہتے ہیں مرغ گلشن سے میری داستاں کو
نالاں تو ہیں مجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے / گو طائر گلستاں سیکھے مری زباں کو
کیا جانیے کہ کیا کچھ پردے سے ہووے ظاہر / رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

اس چشم سرخ پر ہے وہ ابروے کشیدہ / جوں ترک مست رکھ لے سر کے تلے کماں کو
میری نگاہ میں تو معدوم سب ہیں وے ہی / موجود بھی نہ جانا اس راہ سے جہاں کو
بعد از نماز تھے کل میخانے کے در اوپر
کیا جانے میر واں سے پھر اٹھ گئے کہاں کو

(۱۴۶۸)

نہیں ہے تاب تنک تم بھی مت عتاب کرو / نہ گرم ہو کے بہت آگ ہو کے آب کرو
تمھارے عکس سے بھی عکس مجھ کو رشک سے ہے / نہ دیکھو آئینہ منھ سے مرے حجاب کرو
خراب عشق تو سرگشتہ ہوں ہی میں تم بھی / پھرا پھرا کے مجھے گلیوں میں خراب کرو
کہا تھا تم نے کہ ہر حرف پر ہے بوسۂ لب / جو باتیں کی ہیں تو اب قرض کا حساب کرو
ہوا ہے اہل مساجد پہ کام ازبس تنگ ق / نہ شب کو جاگتے رہنے کا اضطراب کرو
خدا کریم ہے اس کے کرم سے رکھ کر چشم / دراز کھینچو کسو میکدے میں خواب کرو
جہاں میں دیر نہیں لگتی آنکھیں مندتے میر
تمھیں تو چاہیے ہر کام میں شتاب کرو

(۱۴۶۹)

وہ گل سا رو سراہوں یا پیچ دار مو کو / نرمی بھی کاش دیتا خالق تنک اس کی خو کو
ان گیسوؤں کے حلقے ہیں چشم شوق عاشق / وے آنکھیں دیکھتی ہیں حسرت سے اس کے رو کو
دم کی کشش سے کوشش معلوم تو ہے لیکن / پاتے نہیں ہم اس کی کچھ طرز جستجو کو
آلودہ خون دل سے صد حرف منھ پر آئے / مرغ چمن نہ سمجھا انداز گفتگو کو
دل میر دلبروں سے چاہا کرے ہے کیا کیا
کچھ انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو

(۱۴۷۰)

عجب گر تیری صورت کا نہ کوئی یار عاشق ہو / جو صحن خانہ میں تو ہو در و دیوار عاشق ہو
تجھے اک بار اگر دیکھے کوئی بے جا ہو دل اس کا / خرام ناز پر تیرے لٹا گھر بار عاشق ہو
تری چھاتی سے لگنا ہار کا اچھا نہیں لگتا / مباد اس وجہ سے گل رو گلے کا ہار عاشق ہو
ہوا ہے مخترع بے رحم خوں ریزی بھی کرنے میں / نہ مارے جان سے جب تک نہ منت دار عاشق ہو
سزا ہے عشق میں زرد و زبون و زار ہی ہونا / نہ عاشق کہیے ان رنگوں نہ جو بیمار عاشق ہو
پڑے سایہ کسو کا تیرے بستر پر تو تو چونکے / وہی لے کام تجھ سے جو کوئی پرکار عاشق ہو

نہیں بازار گرمی ایک دو خواہندہ پر اس کی
اگر وہ رشکِ یوسف آوے تو بازار عاشق ہو

غریبوں کی تو پگڑی جائے تک لے ہے اتروا تو
تجھے اے سیم بر لے بر میں جو زردار عاشق ہو

لگو ہو زار باراں رونے چلتے بات چاہت کی
کہیں ان روزوں تم بھی میرؔ صاحب زار عاشق ہو

(۱۴۷۱)

تو وہ نہیں کسو کا نہ دل سے یار ہو
یا تجھ کو دل شکستوں سے اخلاص پیار ہو

کیا فکر میں ہو اپنی طرحداری ہی کی تم
ہم دردمند لوگوں کے بیمار دار ہو

مصروف احتیاط رہا کرتے رات دن
دینے میں دل کے اپنا جو کچھ اختیار ہو

دل میں کدر سے آندھی سی اٹھنے لگی ہے اب
نکلے گلے کی راہ تو رفع غبار ہو

کھا زہر مر رہیں کہیں کیا زندگی ہے یہ
زلفیں تنک چھوئیں تو ہمیں مار مار ہو

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسو کی تیغ کسو کے شکار ہو

منھ سے لگی گلابی ہوا کچھ شگفتہ تو
تھوڑی شراب اور بھی پی جو بہار ہو

بہتی ہے تیز جدول تیغ جفائے یار
یعنی کہ اک ہی وار لگے کام پار ہو

چھڑیوں سے کر قرار مدار اس کو لائیے
جو میرؔ پھر لڑا نہ کریں بے قرار ہو

(۱۴۷۲)

دل اس کے مو سے لگ کے پریشاں ہوا نہ تو
اس رو کا مثل آئینہ حیراں ہوا نہ تو

صد رنگ بحث رہتی ہے یاں ذی شعور سے
اے وائے عقلمند کہ ناداں ہوا نہ تو

نزدیک حق کے دین تو اسلام بن ہے کفر
اے برہمن دریغ مسلماں ہوا نہ تو

کتنے دنوں کہا تھا دلا ضبط نالہ کر
پھر شب کو ناشکیبی سے نالاں ہوا نہ تو

ہوتا ہے میرؔ روے سخن آدمی کی اور
افسوس اے ستم زدہ انساں ہوا نہ تو

(۱۴۷۳)

کیا کروں میں صبرکم کو اور رنج بیش کو
زہر دیویں کاشکے احباب اس درویش کو

کھول آنکھیں صبح سے آگے کہ شیر اللہ کے
دیکھتے رہتے ہیں غافل وقت گرگ و میش کو

عشق کے بیتاب کے آزار میں مت کر شتاب
جان دیتے دیر لگتی ہی نہیں دل ریش کو

دشمن اپنا میں تو فکر دوستی ہی میں رہا
اب رکھوں کیوں کر سلامت جان عشق اندیش کو

مختلط ترسا بچوں سے شیرہ خانے میں رہا
کن نے دیکھا مسجدوں میں میرؔ کافرکیش کو

(۱۴۷۴)

ناز کی کوئی یہ بھی ٹھسک ہے جی کاہے کو کڑھاتے ہو   آتے ہو تمکین سے ایسے جیسے کہیں کو جاتے ہو
غیر کی ہمراہی کی عزت جی مارے ہے عاشق کا   پاس کبھو جو آتے ہو تو ساتھ اک تحفہ لاتے ہو
مست نہیں پر بال ہیں بکھرے پیچ گلے میں پگڑی کے   ساختہ ایسے بگڑے رہو ہو تم جیسے مدھ ماتے ہو
پردہ ہم سے کر لیتے ہو جب آتے ہو مجلس میں   آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم ہی سے شرماتے ہو
سوچ نہیں یہ فقیر ہے اپنا جیب دریدہ دیوانہ   ٹھوکر لگتے دامن کو کس ناز سے تم یاں آتے ہو
رفتۂ عشق کسو کا یارو راہ چلے ہے کس کے کہے   کون رہا ہے آپ میں یاں تم کس کے تئیں سمجھاتے ہو
صبر بلا پر کرتے صاحب بیتابی کا حاصل کیا
کوئی مقلب قلبوں کا ہے میرؔ عبث گھبراتے ہو

(۱۴۷۵)

آج ہمارا سر دکھتا ہے صندل کا بھی نام نہ لو   رنگ اس کا کہیں یاد نہ دے زنہار اس سے کچھ کام نہ لو
یاد آئے وہ کیا تڑپے ہے کیا بیتابی کرتا ہے   کوئی تسلی پھر ہوتا ہے جب تک دل کو تھام نہ لو
میرؔ کہاں تک بےخوابی وہ میں ہوں تک جو سلاتا ہوں
بس جو تمھارا کچھ بھی چلے تو ایک گھڑی آرام نہ لو

(۱۴۷۶)

کام کیے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو   مار رکھا بیتابی دل نے ہم سب غم کے ماروں کو
جی تو جلا احباب کا مجھ پر عشق میں اس شعلے کے پر   رو ہی نہیں ہے بات کا ہرگز اپنے جانب داروں کو
آؤ نہیں دربستہ یعنی منھ پر اس مہ پارے کے   صبح تلک دیکھا کرتے ہیں محو چشمک تاروں کو
گردش چشم سیہ کاسے سے جمع نہ رکھو خاطر تم   بھوکا پیاسا مار رکھا ہے تم سے ان نے ہزاروں کو
کوہکن و مجنوں و وامق میرؔ آئے تھے صحبت میں
منھ نہ لگایا ہم میں کسھوں نے ایسے ہرزہ کاروں کو

(۱۴۷۷)

جی رکا رکنے سے پرے کچھ تو   آسماں آ گیا ورے کچھ تو
جو نہ ہووے نماز کریے نیاز   آدمی چاہیے کرے کچھ تو

طالع و جذب و زاری و زر و زور عشق میں چاہیے ارے کچھ تو
جینا کیا ہے جہان فانی کا مرتے جاتے ہیں کچھ مرے کچھ تو
سہمے سہمے نظر پڑیں ہیں میر
اس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

(۱۴۷۸)

رفتن رنگین گل رویاں سے کیا ٹھہراؤ ہو ساتھ ان کے چل تماشا کر لے جس کو چاؤ ہو
قد جو خم پیری سے ہو تو سر کا دھنا ہیچ ہے ہو چکا ہونا جو کچھ تھا اب عبث پچھتاؤ ہو
خون کے سیلاب میں ڈوبے ہوؤں کا کیا شمار تک بہے وہ جدول شمشیر تو ستھراؤ ہو
تھی وفا و مہر تو بابت دیار عشق کی دیکھیں شہر حسن میں اس جنس کا کیا بھاؤ ہو
گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعل تر
دیدۂ خوں بار یوں ہیں جیسے منھ پر گھاؤ ہو

(۱۴۷۹)

جی کی لاگ بلا ہے کوئی دل جینے سے اٹھا بیٹھو ہو کے فقیر گلی میں کسو کی رنج اٹھاؤ جا بیٹھو
کیا دیکھو ہو آگا پیچھا عشق اگر فی الواقع ہے ایک دم اس بے چشم و رو کی تیغ تلے بھی جا بیٹھو
ایک سماں تھا وصل کا اس کے سیج پہ سوئے پھولوں کی اب ہے زمان فراق بچھونے خار و خسک کے بچھا بیٹھو
کام کی صورت اپنے پیارے کیا بگڑی ہے کیا کہیے آؤ کبھو مدت میں یاں تو اچھے منھ کو بنا بیٹھو
ٹیڑھی چال سے اس کی خائف چپکے کڑھے کیا پھرتے ہو سیدھی سیدھی دوچار اس کو جرأت کر کے سنا بیٹھو
ٹیڑھی بھویں دشمن پہ کرو ہو عشق و ہوس میں تمیز کرو یعنی تیغ ستم ایک اس کو چلتے پھرتے لگا بیٹھو
نکلا خط پشت لب اس کا خضر و مسیحا مرنے لگے
سوچتے کیا ہو میر عبث اب زہر منگا کر کھا بیٹھو

(۱۴۸۰)

صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ
برسے ہے غربت سی غربت گور کے اوپر عاشق کی ابر نمط جو آؤ ادھر تو دیکھ کے تم بھی رو جاؤ
میر جہاں ہے مقامرخانہ پیدا یاں کا نہ پیدا ہے
آؤ یہاں تو داؤ نختیں اپنے تئیں بھی کھو جاؤ

ردیف ھ

(۱۴۸۱)

یار صد حیف کہ بیگانہ رہا اپنے ساتھ　　آشنایانہ نہ کی کوئی ادا اپنے ساتھ
اتحاد اتنا ہے اس سے کہ ہمیشہ ہے وصال　　اپنے مطلوب کو ہے ربط سدا اپنے ساتھ
عہد یہ تھا کہ نہ بے وصل بدن سے جاوے　　سو جدا ہوتا ہے کی جی نے دغا اپنے ساتھ
رنج نے رنج بہت کھینچے پہنچ کر ہم تک　　اک بلا میں ہے گرفتار بلا اپنے ساتھ
دس گنا دکھنے لگا زخم رکھے مرہم کے　　درد کا کام رہی کرتی دوا اپنے ساتھ
وارد شہر ہیں یا دشت میں ہم شوق طلب
ہر زماں پھرتا ہے اے میرؔ لگا اپنے ساتھ

(۱۴۸۲)

گرمی سے عاشقی کی آخر کو ہو رہا کچھ　　پانی ہوا ہے کچھ تو میرا جگر جلا کچھ
آزردہ دل ہزاروں مرتے ہی ہم سنے ہیں　　بیماری دلی کی شاید نہیں دوا کچھ
وارفتہ ہے گلستاں اس روے چمپئی کا　　ہے فصل گل پہ گل کا اب وہ نہیں مزہ کچھ
وہ آرسی کے آگے پہروں ہے بے تکلف　　منھ سے ہمارے اس کو آتی نہیں حیا کچھ
دل ہی کے غم میں گذرے دس دن جو عمر کے تھے　　اچرج ہے اس نگر سے جاتا نہیں رہا کچھ
منھ کر بھی میری جانب سوتا نہیں کبھو وہ　　کیا جانوں اس کے جی میں ہے اس طرف سے کیا کچھ
دل لے فقیر کا بھی ہاتھوں میں دل دہی کر　　آجائے ہے جہاں میں آگے لیا دیا کچھ
یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیوں کر　　ان کی زباں میں کچھ ہے دل میں ہے کچھ دعا کچھ
ساری وہی حقیقت ملحوظ سب میں رکھیے　　کیجیے نمود ہووے جو اس کے ماسوا کچھ
حرف و سخن کی اس سے اپنی مجال کیا ہے　　ان نے کہا ہے کیا کیا میں نے اگر کہا کچھ
کب تک یہ بدشرابی پیری تو میرؔ آئی
جانے کے ہو مہیا اب کر چلو بھلا کچھ

(۱۴۸۳)

حیرت طلب کو کام نہیں ہے کسو کے ساتھ　　جان عزیز ابھی ہے مری آبرو کے ساتھ
یک رنگ آشنا ہیں خرابات ہی کے لوگ　　سرمیکشوں کے پھوٹتے دیکھے سبو کے ساتھ
قمری کا لوہو پانی ہوا ایک عشق میں　　آتا ہے اس کا خون جگر آب جو کے ساتھ

خالی نہیں ہے خواہش دل سے کوئی بشر　　جاتے ہیں سب جہان سے یک آرزو کے ساتھ
دم میں ہے دم جہاں تئیں گرم تلاش ہوں　　سو پیچ و تاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

کیا اضطراب عشق سے میں حرف زن ہوں میر
منھ تک جگر تو آنے لگا گفتگو کے ساتھ

(۱۴۸۴)

سر تو بہت بکھیرا پر فائدہ کیا نہ　　الجھاؤ تھا جو اس کی زلفوں سے سو گیا نہ
دے زلفیں عقدہ عقدہ ہیں آفت زمانہ　　عقدہ ہمارے دل کا ان سے بھی کچھ کھلا نہ
غنچے کے دل کی کچھ تھی واشد بہار آئی　　افسوس ہے کہ موسم گل کا بہت رہا نہ
مرنا ہمارا اس سے کہہ دیکھیں یار جاکر　　حال اس کا یہ خبر بھی درہم کرے ہے یا نہ
کن رس بھی حیف اس کو تھا نہ کہا تو کیا کیا　　قطعہ لطیفہ بذلہ شعر و غزل ترانہ
بیمارعشق بےکس جیتا رہے گا کیوں کر　　احوال گیر کم ہو پہنچے بہم دوا نہ
یوں درمیاں چمن کے لے تو گئے تھے ہم کو　　پر فرط بے خودی سے ہم تھے نہ درمیانہ
چھو سکتے بھی نہیں ہیں ہم لپٹے بال اس کے　　ہیں شانہ گیر سے جو یہ لڑکے نرم شانہ
وحشت چمن میں ہم کو کل صبح بیشتر تھی　　بے اس کے پھول گل سے جی ایک دم لگا نہ
صحبت برآر اپنی لوگوں سے کیونکے ہووے　　معقول گو ہم اتنے وے ایسے ہرزہ چانہ
رگڑے گئے ہیں جیسے ازبسکہ راستوں کے　　آئینہ ہو رہا ہے وہ سنگ آستانہ

ہے عینہ ابلنا سیلاب رود کا سا
اے میر چشم تر ہے یا کوئی رودخانہ

(۱۴۸۵)

غم فوت سے بندے آزاد رہ
خدا ہے تو کیا غم ہے دل شاد رہ

(۱۴۸۶)

چاہ میں دل پر ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے کیا کیا کچھ　　درد و الم ہے کلفت و غم ہے رنج و بلا ہے کیا کیا کچھ
عاشق کے مر جانے کے اسباب بہت رسوائی میں　　دل بھی لگا ہے شرم و حیا ہے مہر و وفا ہے کیا کیا کچھ
عشق نے دے کر آگ یکا یک شہر تن کو پھونک دیا　　دل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ
دل لینے کو فریفتہ کے بہتیرا کچھ ہے یار کنے　　غمزہ عشوہ چشمک چتون ناز و ادا ہے کیا کیا کچھ
کیا کیا دیدہ درائی سی تم کرتے رہے اس عالم میں　　تم سے آگے سنو ہو صاحب نہیں ہوا ہے کیا کیا کچھ

حسرت وصل اندوہ جدائی خواہش کاوش ذوق و شوق　　یوں تو چلا ہوں اکیلا لیکن ساتھ چلا ہے کیا کیا کچھ

کیا کہیے جب میں نے کہا ہے میر ہے مغرور اس پر تو
اپنی زباں مت کھول تو ان نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

ردیف ی

(۱۴۸۷)

میں تو تنک صبری سے اپنی رہ نہیں سکتا اک دم بھی　　ناز و غرور بہت ہے اس کا لطف نہیں ہے کم کم بھی
جامۂ احرام آخر تہ کر دل کی اور توجہ کی　　در پہ حرم کے اس لیے تھے ہم کوئی ملے گا محرم بھی
دیکھ ہوا کو طائر گلشن کس حسرت سے کہتے تھے　　گل ہی چلے جاتے نہیں یاں سے چلنے کو بیٹھے ہیں ہم بھی
کیا کیا میں بیتاب رہا ہوں رنج و الم سے محبت کے　　ہے عالم کچھ اور ہی میرے دل کے مرض کا عالم بھی
پنبہ و داغ کیا ہے کیا کیا اچھے ہونے والے نہ تھے　　زخموں پر چھاتی کے میری رکھ دیکھو نہ مرہم بھی
گرم ہوا ہے ہوگا جوہر سیر چمن کی کر لیجے　　پھول بکھرتے جاتے ہیں کچھ آخر ہے اب موسم بھی

نعل جڑے سینے کو کوٹا چہرے نچے پر خاک ملی
میر کیا ہے میں نے نہایت دل جانے کا ماتم بھی

(۱۴۸۸)

نقد دل غفلت سے کھویا راہ کھوئی کر گئے　　کارواں جاتا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
کیا کہیں ان نے جو پھیرا اپنے در پر سے ہمیں　　مر گئے غیرت سے ہم بھی پر نہ اس کے گھر گئے

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر
آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

(۱۴۸۹)

اے کاش کوئی جاکر کہہ آوے یار سے بھی　　یاں کام جا چکا ہے اب اختیار سے بھی
تاچند بے دماغی کب تک سخن خشن ہو　　کوئی تو بات کریے اخلاص پیار سے بھی
یک معنی شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں　　الوان گل ہیں ہر سو اب کے بہار سے بھی
کیا جیب و آستیں ہی سیلاب خیز ہے یاں　　دریا بہا کریں ہیں میرے کنار سے بھی
باغ وفا سے ہم نے پایا سو پھل یہ پایا　　سینے میں چاک تر ہے دل اب انار سے بھی
راہ اس کی برسوں دیکھی آنکھیں غبار لائیں　　نکلا نہ کام اپنا اس انتظار سے بھی

جان و جہاں سے گزرا میں میر جن کی خاطر
بچ کر نکلتے ہیں وے میرے مزار سے بھی

(۱۴۹۰)

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا ان نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے

دور اس سے تو اپنے بہائیں آگ لگی ہے گلستاں میں
آنکھیں نہیں پڑتی ہیں گل پر سینکتے ہیں انگاروں سے

شور کیا جو میں نے شبانگہ بیتابی سے دل کی بہت
کہنے لگا جی تنگ آیا ان مہر و وفا کے ماروں سے

وہ جو ماہ زمیں گرد اپنا دوپہری ہے ان روزوں
شوق میں ہر شب حرف و سخن ہے ہم کو فلک کے تاروں سے

حرف شنو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ درائے قافلہ ساں
راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے

خستہ ہو اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک تمھیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

داغ جگرداری ہیں اپنے کشتے ثبات دل کے ہیں
ہم نہ گئے جاگہ سے ہرگز قیمہ ہوئے تلواروں سے

حرف کی پہچان اس کو نہ تھی تو سادہ ہی کچھ اچھا تھا
بات اگر مانے ہے کوئی سو سو اب تکراروں سے

کوہکن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سر ماریں
شوق نہیں ملنے کا ہم کو میر ایسے آواروں سے

(۱۴۹۱)

زورکش ہیں گے عشق کے ہم بھی
ہم نے کھینچی کمان رستم بھی

ہے بلا دھوم دل تڑپنے کی
ایسا ہوتا نہیں ہے اودھم بھی

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا
خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

حیف دل جاتے پڑ گئی جی کی
ورنہ غم کرتے لیتے ماتم بھی

حرم کعبہ کا نہ پایا بھید
نہ ملا واں کا ایک محرم بھی

خشک نے سا تھا شیخ حیف موا
یوں تو یار اس کو دیتے تھے دم بھی

کھپ ہی جاتا ہے آدمی اے میر
آفت جاں ہے عشق کا غم بھی

(۱۴۹۲)

لطف ہے کیا انواع ستم جو اس کے کوئی بیان کرے
گوش زد اک دن ہو دیں کہیں تو بے لطفی سے زبان کرے

ہم تو چاہ کر اس پتھر کو سخت ندامت کھینچی ہے
چاہ کرے اب وہ کوئی جو چاہت کا ارمان کرے

سودے میں دل کے نفع جو چاہے خام طمع سودائی ہے
وارا سارا عشق میں کیسا جی کا بھی نقصان کرے

حشر کے ہنگامے میں چاہیں داد عشق تو حسن نہیں
کاشکے یاں وہ ظالم اپنے دل ہی میں دیوان کرے

آتش خو مغرور سے ویسے عہدہ برآ کیا عاشق ہو
دل کو جلاوے منت رکھے جی مارے احسان کرے

یمن عشق غم افزا سے کام نہایت مشکل ہے
اب بھی نہیں نومیدی دل کو شاید عشق آسان کرے

کہنے میں یہ بات آتی نہیں ہو سیر خدا کی قدرت کی
موند کر آنکھیں میرؔ اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے

(۱۴۹۳)

بے دل ہوئے بے دیں ہوئے بے وقر ہم ات گت ہوئے   بے کس ہوئے بے بس ہوئے بے کل ہوئے بے گت ہوئے
ہم عشق میں کیا کیا ہوئے اب آخر آخر ہو چکے   بے ست ہوئے بے ہت ہوئے بے خود ہوئے میت ہوئے
الفت جو کی کہتا ہے جی حالت نہیں عزت نہیں   ہم بابت ذلت ہوئے شائستۂ کلفت ہوئے
گر کوہ غم ایسا گراں ہم سے اٹھے پس دوستاں   سوکھے سے ہم دینت ہوئے تنکے سے ہم پربت ہوئے
کیا رویئے قیدی ہیں اب رویت بھی بن گل کچھ نہیں   بے پر ہوئے بے گھر ہوئے بے زر ہوئے بے پت ہوئے
آنکھیں بھر آئیں جی رندھا کہیے سو کیا چپکے سے تھے   جی چاہتا مطلق نہ تھا ناچار ہم رخصت ہوئے

یا مست درگاہوں میں شب کرتے تھے شاہد بازیاں
تسبیح لے کر ہاتھ میں یا میرؔ اب حضرت ہوئے

(۱۴۹۴)

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے   روش آب رواں پھیلے پھرا کرتے تھے
غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو   تھوڑی آزردگی میں ترک وفا کرتے تھے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع   لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
جب تلک شرم رہی مانع شوخی اس کی   تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ   دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
آتش عشق جہاں سوز کی لپٹیں تھیں قہر   دل جگر جان درونے میں جلا کرتے تھے
اب تو بیتابی دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا   آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے

اٹھ گئے پر مرے تکیے کو کہیں گے یاں میرؔ
درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

(۱۴۹۵)

حال نہیں ہے دل میں مطلق شور و فغاں رسوائی ہے   یار گیا مجلس سے دیکھیں کس کس کی اب آئی ہے
آنکھیں مل کر کھولیں ان نے عالم میں آشوب اٹھا   بال کھلے دکھلائی دیا سو ہر کوئی سودائی ہے
ڈول بیاں کیا کوئی کرے اس وعدہ خلاف کی دیہی کا   ڈھال کے سانچے میں صانع نے وہ ترکیب بنائی ہے
نسبت کیا ان لوگوں سے ہم کو شہری ہیں دیوانے ہم   ہے فرہاد اک آدم کوہی مجنوں اک صحرائی ہے
ہے پتھر سا چھاتی میں میری کثرت غم کی حیرت سے   کیا کہیے پہلو سے دل کے سخت اذیت پائی ہے

باغ میں جا کر ہم جور ہے سو اور دماغ آشفتہ ہوا — کیا کیا سر پہ ہمارے آ کر بلبل شب چلائی ہے
کیسا کیسا عجز ہے اپنا کیسے خاک میں ملتے ہیں — کیا کیا ناز و غرور اس کو ہے کیا کیا بے پروائی ہے
قصہ ہم غربت زدگاں کا کہنے کے شائستہ نہیں — بے صبری کم پائی ہے پھر دور اس سے تنہائی ہے

چشمک چتون نیچی نگاہیں چاہ کی تیری مشعر ہیں
میر عبث مکرے ہے ہم سے آنکھ کہیں تو لگائی ہے

(۱۴۹۶)

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی — کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی
کیا ابر رحمت اب کے برستا ہے لطف سے — طاعت گزیں جو ہو سو گنہگار ہو کوئی
کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل دماغ بن — پوچھے جو اس قشون میں سردار ہو کوئی
ہم عاشقان زرد و زبون و نزار سے — مت کر ادائیں ایسی کہ بیزار ہو کوئی
چپکے ہیں ہم تو حیرت حالات عشق سے — کریے بیاں جو واقف اسرار ہو کوئی
یکساں ہوئے ہیں خاک سے پامال ہو کے ہم — کیا اور اس کی راہ میں ہموار ہو کوئی
وہ رہ سکے ہے دل زدہ کچھ منتظر کھڑا — حیرت سے اس کے در پہ جو دیوار ہو کوئی
اک نسخۂ عجیب ہے لڑکا طبیب کا — کچھ غم نہیں ہے اس کو جو بیمار ہو کوئی

کیا اضطراب دل سے کہے میر سر عشق
یہ حال سمجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی

(۱۴۹۷)

ان حنائی دست و پا سے دل لگی سی ہے ابھی — میں نے ناخن بندی اپنی عشق میں کی ہے ابھی
ہاتھ دل پر زور سے اپنے نہ رکھا چاہیے — چاک کی چھاتی مری جراح نے سی ہے ابھی
ایک دم دکھلائی دیتا بھی تو مرتے آ کہیں — شوق سے آنکھوں میں کوئی دم مرا جی ہے ابھی
دیکھیں اک دو دم میں کیونکر تیغ اس کی ہو بلند — کوئی خوں ریز ان نے اپنی میان سے لی ہے ابھی
کس طرح ہوں معتقد ہم اتقاے شیخ کے — صبح کو رسم صبوحی سے تو مے پی ہے ابھی
آگے کب کب اٹھتے تھے سناہٹے سے باغ میں — طرز میرے نالے کی بلبل نے سیکھی ہے ابھی

زیر دیوار اس کے کس امید پر تو میر ہے
ایک دو نے جان اس دروازے پر دی ہے ابھی

(۱۴۹۸)

دیر سے ہم کو بھول گئے ہو یاد کرو تو بہتر ہے — غم حرماں کا کب تک کھینچیں شاد کرو تو بہتر ہے

پہنچا ہوں میں دوری سے مرنے کے نزدیک آخر تو
قیدحیات سے بندے کو آزاد کرو تو بہتر ہے

جو کریے کا حق میں میرے خوبی ہے میری اس ہی میں
داد کرو تو بہتر ہے بیداد کرو تو بہتر ہے

زخم دامن دار جگر سے جامہ گذاری ہو نہ گئی
ظلم نمایاں اب کوئی جو ایجاد کرو تو بہتر ہے

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر کھپے
لوہو منھ سے مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے

(۱۴۹۹)

مل اہل بصیرت سے کچھ وے ہی دکھا دیں گے
لے خاک کی کوئی چٹکی اکسیر بنا دیں گے

پانی کی سی بوندیں تھیں سب اشک نہ میں جانا
کپڑوں پہ گریں گے تو وے آگ جلا دیں گے

سرگشتہ سا پھرتا ہے کہتے ہیں بیاباں میں
گر خضر ملے گا تو ہم راہ بتا دیں گے

اے کاش قیامت میں دیویں اسے عاشق کو
گر حسن عمل کی واں لوگوں کو جزا دیں گے

حاصل کڑی ہونے کا ابرو کی کماں اس کی
دیکھیں گے چڑھی جس دم ہم سر کو نوا دیں گے

ایدھر نہیں آتا وہ آوے تو تصدق کر
جی جامہ اٹھا دیں گے گھر بار لٹا دیں گے

معشوقوں کی گرمی بھی اے میر قیامت ہے
چھاتی میں گلے لگ کر تک آگ لگا دیں گے

(۱۵۰۰)

جنگل میں چشم کس سے بستی کی رہبری کی
صاحب ہی نے ہمارے یہ بندہ پروری کی

شب سن کے شور میرا کچھ کی نہ بے دماغی
اس کی گلی کے سگ نے کیا آدمی گری کی

کرتے نہیں ہیں دل خوں اس رنگ سے کسو کا
ہم دل شدوں کی ان نے کیا خوب دلبری کی

اللہ رے کیا نمک ہے آدم کے حسن میں بھی
اچھی لگی نہ ہم کو خوش صورتی پری کی

ہے اپنی مہرورزی جانکاہ و دل گدازاں
اس رنج میں نہیں ہے امید بہتری کی

رفتار ناز کا ہے پامال ایک عالم
اس خودنما نے کیسی خودرائی خودسری کی

اے کاش اب نہ چھوڑے صیاد قیدیوں کو
جی ہی سے مارتی ہے آزادی بے پری کی

اس رشک مہ سے ہر شب ہے غیر سے لڑائی
بخت سیہ نے بارے ان روزوں یاوری کی

کھٹ پٹریاں ہی کی ہیں صراف کے نے ہم سے
پیسے دے بیروئی کی پھر لے گئے کھری کی

گذرے بسان صرصر عالم سے بے تامل
افسوس میر تم نے کیا میر سرسری کی

(۱۵۰۱)

اکثر کی بے دماغی ہر دم کی سرگرانی
اب کب گئی اٹھائی ہے زور ناتوانی

تم دل کو دیتے ہو تو بے دل سمجھ کے ہو جو
ہم نے تو قدر دل کی افسوس کچھ نہ جانی

عہد شباب کی تو فرصت تھی ایک چشمک
مژگاں بہم زدن میں جاتی رہی جوانی

حسرت سے دیکھ رہیو اے نامہ بر منھ اس کا
بس اور کچھ نہ کہیو ہرگز مری زبانی

اس غیرت قمر کی خجلت سے تاب رخ کی
آئینہ تو سراسر ہوتا ہے پانی پانی

مرزائی فقر میں بھی دل سے گئی نہ میرے
چہرے کے رنگ اپنے چادر کی زعفرانی

یوں میؔر تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے
اب رات کم ہے سو بس ہو چکی کہانی

(۱۵۰۲)

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک بہم غم دل کہا کریں گے
طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کریں گے

قرار دل سے گیا ہے اب کے کہ رک کے گھر میں نہ مریے گا یوں
بہار آئی جو اپنے جیتے تو سیر کرنے چلا کریں گے

ہلاک ہونا مقرری ہے مرض سے دل کے پہ تم کہو ہو
مزاج صاحب اگر ادھر ہے تو ہم بھی اپنی دوا کریں گے

برا ہے دل کا ہمارے لگنا لگانا غصے سے عاشقی کے
کجی جبیں سے گلی میں اس کی خراب و خستہ پھرا کریں گے

وصال خوباں نہ کر تمنا کہ زہر شیریں لبی ہے ان کی
خراب و رسوا جدا کریں گے ہلاک مل کر جدا کریں گے

اگر وہ رشک بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غم دل ان پر لکھا کریں گے

غم محبت میں میؔر ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک اب وفا کریں گے

(۱۵۰۳)

سنو سرگذشت اب ہماری زبانی
سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی

بہت نذریں مانیں کہ مانے گا کہنا
ولیکن مری بات ہرگز نہ مانی

بہت مو پریشاں کھچے اس کے غم میں
خدا جانے ہے بید کس کی نشانی

گیا بھول جی شیب میں جو ہمارا
بہت یاد آئی گئی وہ جوانی

توقع نہیں یاں تک آنے کی ان سے
اگر لطف مجھ پر کریں مہربانی

گری ضبط گریہ سے دل کی عمارت
ہوئی چشم تر اس خرابی کی بانی

ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو
محبت ہے کوئی بلا آسمانی

گرامی گہر میؔر جی تھا ہمارا
ولے عشق میں قدر ہم نے نہ جانی

(۱۵۰۴)

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اٹھانا کار کارگذاراں ہے

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاس عزت داراں ہے

(۱۵۰۵)

ہم اس مرتبہ پھر بھی لشکر گئے
تعب ایسی گذری کہ مر مر گئے

نظر اک سپاہی پسر سے لڑی
قریب اس کے تلوار کر کر گئے

بہم مہر ورزی کے سرگرم تھے
خدا جانے وہ لوگ کیدھر گئے

لہو میری آنکھوں میں آتا نہیں
جگر کے مگر زخم سب بھر گئے

رباط کہن میں نہیں میرؔ جی
ہوا جو لگی وے بھی باہر گئے

(۱۵۰۶)

کب وعدے کی رات وہ آئی جو آپس میں نہ لڑائی ہوئی
آخر اس اوباش نے مارا رہتی نہیں ہے آئی ہوئی

چاہ میں اس بے الفت کی گھبراہٹ دل ہی کو تو نہیں
سارے حواسوں میں ہے تشتت جان بھی ہے گھبرائی ہوئی

گرچہ نظر ہے پشت پا پر لیکن قہر قیامت ہے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اس کی شرمائی ہوئی

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی

دود دل سوزان محبت محو جو ہو تو عرش پہ ہو
یعنی دور بجھے گی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

چتون کے انداز سے ظالم ترک مروت پیدا ہے
اہل نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی

میرؔ کا حال نہ پوچھو کچھ تم کہنہ رباط سے پیری میں
رقص کناں بازار تک آئے عالم میں رسوائی ہوئی

(۱۵۰۷)

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

کیا سمجھے اس کے رتبۂ عالی کو اہل خاک
پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے

مرتا تھا میں تو باز رکھا مرنے سے مجھے
یہ کہہ کے کوئی ایسا کرے ہے ارے ارے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

(۱۵۰۸)

ہماری تیری مودت ہے دوست داری ہے
ہزار سابقوں سے سابق ایک یاری ہے

گئی وہ نوبت مجنوں کہ نام باجے تھا
ہمارا شور جنوں اب ہے اپنی باری ہے

کریں تو جاکے گدایانہ کس طرف آواز
اگر صدا کوئی پہچانے شرمساری ہے

مسافران رہ عشق ہیں شکیب سے چپ
وگرنہ حال ہمارا تو اضطراری ہے

خرابی حال کی دل خواہ جو تمھارے تھی
سو خطرے میں نہیں خاطر ہمیں تمھاری ہے

ہمیں ہی عشق میں جینے کا کچھ خیال نہیں
وگرنہ سب کے تئیں جان اپنی پیاری ہے

نگاہ غور سے کر میر سارے عالم میں
کہ ہووے عین حقیقت وہی تو ساری ہے

(۱۵۰۹)

نہ خاطر پر الم تیرے نہ دل پر کچھ ستم تیرے
محل رحم ہوویں کس طرح مظلوم ہم تیرے

جو ٹک بھی سایہ گستر ہوگا تو اس خشک مزرع پر
بہت ہم ہوں گے احساں مند اے ابر کرم تیرے

انھیں کی طبع جان میر مائل ہوگی سنبل کی
نہیں دیکھے جنھوں نے گیسوے پر پیچ وخم تیرے

(۱۵۱۰)

عشق میں کھوئے جاؤ گے تو بات کی تہ بھی پاؤ گے
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤ گے

صبر کہاں بیتابی دل سے چین کہاں بےخوابی سے
سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے

شوق کمال کو پہنچا تو ہیں خط وکتابت حرف وسخن
قاصد کے محتاج نہ ہوگے آپھی دوڑے جاؤ گے

صنعت گریاں صاحب بندہ دل کے لگے کب پیش گئیں
ایک نہیں وہ سننے کا تم باتیں بہت بناؤ گے

چاہ کیے درویش ہوئے تو آب وخورش کی فکر نہیں
لوہو پیوگے اپنا ہر دم غم غصہ ہی کھاؤ گے

رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمھیں خوش آوے گا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے

رہتے ہیں مبہوت الفت ہیں گم گشتہ کلفت میں
بھولے بھولے آپھی پھروگے کس کو راہ بتاؤ گے

اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے آویں گے
دل کے لگے حیران ہوں صاحب کس ڈھب دل کے بجھاؤ گے

چاہت میرؔ بھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
تم جو ابھی بیتاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤ گے

(۱۵۱۱)

اب کے سفر کو ہم سے وہ مہ جدا گیا ہے   رخصت میں لگ گلے سے چھاتی جلا گیا ہے
فرہاد و قیس گذرے اب شور ہے ہمارا   ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے
ضعف دماغ سے میں بھر کر نظر نہ دیکھا   کیا دیر میں پلک سے میری اٹھا گیا ہے
بے جا ہوئے بہت دل رفتار دیکھ اس کی   عزلت گزینوں سے بھی کم ہی رہا گیا ہے
رسوا خراب و غم کش دل باختہ محبت   عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے
اے میرؔ شعر کہنا کیا ہے کمال انساں   ق   یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے
شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

(۱۵۱۲)

کہو سو کریے فراق اس کا تو جی کو میرے کھپا گیا ہے   دروں میں آگ اک لگا گیا ہے بروں کو یکسر جلا گیا ہے
اگرچہ مارا بگڑ کے مجھ کو ولیک لطف و کرم سے پھر بھی   نشان میرے مزار کا وہ سرہ اپنی بنا گیا ہے
خرام شوخی کے ہمرہ اس کے ہزار جانیں چلی گئی ہیں
رکھا ہے رہ میں قدم جو ان نے تو میرؔ کس سے رہا گیا ہے

(۱۵۱۳)

صبر کر رہ جو وہ عتاب کرے   ورنہ کیا جانے کیا خطاب کرے
عشق میں دل بہت ہے بے آرام   چین دیوے تو کوئی خواب کرے
وقت یاں کم ہے چاہیے آدم   کرنا جو کچھ ہو سو شتاب کرے
پھاڑ کر خط کو ان نے پھینک دیا   نامہ بر اس کا کیا جواب کرے
ہے برافروختہ جو خشم سے وہ   آتش شعلہ زن کو آب کرے
ہے تو یک قطرہ خوں ہی لیکن   قہر ہے دل جو اضطراب کرے
میرؔ اٹھ بت کدے سے کعبے گیا
کیا کرے جو خدا خراب کرے

(۱۵۱۴)

افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے
قصہ ہمارا اس کا یارو شنیدنی ہے

اپنا تو دست کوتہ زہ تک بھی تک نہ پہنچا
نقاش سے کہیں وہ دامن کشیدنی ہے

پروانہ مر مٹا ہے جل کر نہ کچھ کہا تو
اے شمع یہ زباں تو ظالم بریدنی ہے

حسرت سے عاشقی کی پیری میں کیا کہیں ہم
دنداں نہیں ہیں منھ میں وہ لب گزیدنی ہے

ہے راست میر صاحب کس کس کا حیف کریے
سر ہے فگندنی ہے قد ہے خمیدنی ہے

(۱۵۱۵)

حال رہا ہو ہم میں کچھ تو حال کسو سے کہا جاوے
آن رہے ہیں آج دموں پر کل تک کیونکے رہا جاوے

اس کی گلی وہ ظلم کدہ ہے آ نکلے جو کوئی وہاں
گرد رہ عشق آلودہ تو لوہو میں اپنے نہا جاوے

آنکھوں کی خونابہ فشانی دیکھیں میر کہاں تک یہ
زرد ہمارے رخساروں پر ہر دم خون بہا جاوے

(۱۵۱۶)

عشق چھپا کر پچھتائے ہم سوکھ گئے رنجور ہوئے
یعنی آنسو پی پی گئے سو زخم جگر ناسور ہوئے

ہم جو گئے سرمست محبت اس اوباش کے کوچے میں
کھائیں کڑی تلواریں اس کی زخمی نشے میں چور ہوئے

کوئی نہ ہم کو جانے تھا ہم ایسے تھے گمنام آگے
یمن عشق سے رسوا ہو کر شہروں میں مشہور ہوئے

کیا باطل ناچیز یہ لونڈے قدر پر اپنی نازاں ہیں
قدرت حق کے کھیل تو دیکھو عاشق بے مقدور ہوئے

سر عاشق کا کاٹ کے ان کو سرگریباں رہنا تھا
سو تو پگڑی پھیر رکھی ہے اور بھی وے مغرور ہوئے

زرد و زبون و زار ہوئے ہیں لطف ہے کیا اس جینے کا
مردے سے بھی برسوں کے ہم ہجراں میں بے نور ہوئے

پاس ہی رہتا اکثر اس کے میر سبب تھا جینے کا
پہنچ گئے مرنے کے نزدیک اس سے جو ٹک دور ہوئے

(۱۵۱۷)

جو بحث جی سے وفا میں ہے سو تو حاضر ہے
پہ فرط شوق سے مجھ کو ملال خاطر ہے

وصال ہووے تو قدرت نما ہے قدرت کا
نہ ہم کو قدر نہ قدرت خدا ہی قادر ہے

مسافرانہ ملے تو کہا شرارت سے
غریب کہتے ہیں لوگ ان کو یہ بھی نادر ہے

کسو سیاق سے تحریر طول شوق نہ ہو
زبان خامۂ لستان اس میں قاصر ہے

بہم رکھا کرو شطرنج ہی کی بازی کاش
نہ تیر بار ہے خاطر کا یار شاطر ہے

(۱۵۱۸)

ہوتی نہیں تسلی دل گلستاں سے بھی — تسکیں نہیں ہے جان کو آب رواں سے بھی
تا یہ گرفتہ وا ہو کہاں لے کے جائیے — آئے ہیں اس کی غنچگی میں تنگ جاں سے بھی(۱)
آگے تھی شوخی ہم سے کنایوں میں چپ تھے ہم — مشکل ہے اب برا لگے کہنے زباں سے بھی
ہر چند دست پیچ جواناں ہوں میں ولے — اک اعتقاد رکھتا ہوں پیرمغاں سے بھی
جھنجھلاہٹ اور غصے میں ہجران یار کے — جھگڑا ہمیں رہے ہے زمیں آسماں سے بھی
دنیا سے درگذر کہ گذرگہ عجب ہے یہ — ق — درپیش یعنی میر ہے جانا جہاں سے بھی
لشکر میں ہے مہیب اسی بات کے لیے
کہتے ہیں لوگ کوچ ہے کل صبح یاں سے بھی

(۱۵۱۹)

عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے — اشک کی سرخی زردی چہرہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے
روز وداع لگا چھاتی سے وہ جو خوش پرکار گیا — دل تڑپے ہے جان کھپے ہے سینہ سارا جلتا ہے
گور بغیر آرام کہ اس کو دنیا میں پھر کوئی نہیں — عشق کا مارا آوارہ جو گھر سے اپنے نکلتا ہے
ضعف دماغی جس کو ہووے عشق کے رنج و محنت سے — جی بھی سنبھلتا ہے اس کا پر بعد از دیر سنبھلتا ہے
شور جرس شب گیر کا غافل تیاری کا منبہ ہے — یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے قافلہ صبح کو چلتا ہے
بال نہیں عاشق کے بدن پر ہر بن مو سے نکلا دود — جل کر اس کو جلاتے کیا ہو آپھی جلتا بلتا ہے
میر ستم کشتہ کی ساجت ہے مشہور زمانے کی
جان دیے بن آگے سے اس کے کب وہ ظالم ٹلتا ہے

(۱۵۲۰)

جب سے ستارہ صبح کا نکلا تب سے آنسو جھمکا ہے — دل تڑپا جو اس مہ رو بن سر کو ہمارے دھمکا ہے
آمد و رفت دم کے اوپر ہم نے بنائے زیست رکھی — دم سو ہوا ہے آوے نہ آوے کس کو بھروسا دم کا ہے
گر صوفی چل میخانے میں لطف نہیں اب مسجد میں — ابر ہے باراں باؤ ہے ترک رنگ بدن میں جھمکا ہے
کیا امید رہائی رکھے ہم سا رفتہ وارفتہ — دل اپنا تو زنجیری اس زلف خم در خم کا ہے
دل کی نہیں بیماری ایسی جس میں ہو امید بہی
کیا سنبھلے گا میر ستم کش وہ تو مارا غم کا ہے

---

(۱) یہ شعر مطلعے سے مربوط ہے۔ مصحح

(۱۵۲۱)

خواہش دل کی کس سے کہیے محرم تو ناپیدا ہے
چپ ہیں کچھ کہہ سکتے نہیں پر جی میں ہمارے کیا کیا ہے

ہیں متوقع پرسش اس کے ہم جو گرے ہیں بستر پر
رہنا اس بدحالی ہی سے اپنے حق میں اچھا ہے

میرؔ جی کی بیماری دل کو کب سے ہم سب سنتے ہیں
پوچھے کوئی مزاج کو اس کے ان روزوں میں کیسا ہے

(۱۵۲۲)

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
سہل نہیں ہے جی کا ڈھہنا کیسی خانہ خرابی ہے

آگے ایسا نکھرا نکھرا کاہے کو میں پھرتا تھا
جب سے آنکھ لگی اس مہ سے رنگ مرا مہتابی ہے

کس سے سبب میں پوچھوں یارب اپنی سوزش سینے کا
چھاتی جو جلتی رہتی ہے ات گت آگ مگر یاں دابی ہے

رنج و محن نے عشق کے مجھ کو راحت سے مایوس کیا
دل کے تئیں بیتابی ہے میری آنکھوں کو بے خوابی ہے

ابر کوئی رویا ہے شاید برسوں وادی لیلیٰ میں
میر کیا وہ قطعہ زمیں کا اب تک بھی سیرابی ہے

شہر حسن عجب بستی ہے ڈھونڈے پیدا مہر نہیں
ہے تو متاع گراں قیمت پھر اس کی بلا نایابی ہے

در بدر و رسوا و عاشق شاعر شاغل کاہل میرؔ
گہ کعبے میں دیر میں گاہے کیا کافر ہر بابی ہے

(۱۵۲۳)

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے

اس کی نگاہ تیز ہے میرے دوش و بر پر ان روزوں
یعنی دل پہلو میں میرے تیر ستم کا نشانہ ہے

دل جو رہے تو پاؤں کو بھی دامن میں ہم کھینچ رکھیں
صبح سے لے کر سانجھ تلک اودھر ہی جانا آنا ہے

سرخ کبھو آنسو ہیں ہوتے زرد کبھو ہے منھ میرا
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانہ ہے

اس نومیدی بے غایت پر کس مقدار کڑھا کریے
دو دم جیتے رہنا ہے تو قیامت تک مر جانا ہے

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

فائدہ ہوگا کیا مترتب ناصح ہرزہ درائی سے
کس کی نصیحت کون سنے ہے عاشق تو دیوانہ ہے

تیغ تلے ہی اس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
سر تو آخرکار ہمیں بھی خاک کی اور جھکانا ہے

آنکھوں کی یہ مردم داری دل کو کسو دلبر سے ہے
طرز نگہ طراری ساری میرؔ تمھیں پہچانا ہے

(۱۵۲۴)

کلید ہیچ اگر رقعہ یار کا آوے　　تو دل کہ قفل سا بستہ ہے کیسا کھل جاوے
ہماری جان لبوں پر سے سوے گوش گئی　　کہ اس کے آنے کی سن گن کچھ اب بھی یاں پاوے

بہار لوٹے ہیں میر اب کے طائر آزاد
نسیم کیا ہے وہ گل برگ اگر ادھر لاوے

(۱۵۲۵)

میں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی　　درویشی و کم پائی بے صبری و تنہائی
اس رفتہ کی جاں بخشی تک آتے ہوئی اس کے　　رکھتے ہی قدم مجھ میں پھر جان گئی آئی
تھا صبر و سکوں جب تک رہتا تھا مجھے غش سا　　بیتابی دل سر پر ایک اور بلا لائی
اس میری جراحت پر کل داور محشر بھی　　ڈرتا ہوں کہے رنجھا کیا تیغ ستم کھائی

اے میر کسے دیں ہیں جب تک نہ نصیبہ ہو
کر شکر ملی ہے جو اس در کی جبیں سائی

(۱۵۲۶)

کیا کیا ہم نے رنج اٹھائے کیا کیا ہم بھی شکیبا تھے　　وہ دن جوں توں جیتے رہے سو مرنے ہی کے مہیا تھے
عشق کیا سو باتیں بنائیں یعنی شعر شعار ہوا　　بیتیں جو وے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں رسوا تھے
کیا پگڑی کو پھیر کے رکھتے کیا سر نیچے نہ ہوتا تھا　　لطف نہیں اب کیا کہیے کچھ آگے ہم بھی کیا کیا تھے
اب کے وصال قرار دیا ہے ہجر ہی کی سی حالت ہے　　ایک کہیں میں دل بے جا تھا تو بھی ہم وے یک جا تھے

کیا تھا جو پاس اپنے اے میر کبھو وے آجاتے
عاشق تھے درویش تھے آخر یکس بھی تھے تنہا تھے

(۱۵۲۷)

رنج کی اس کے جو خبر گذرے　　رفتہ وارفتہ اس کا مر گذرے
ایک پل بھی نہ اس سے آنسو پنچھے　　روتے مجھ کو پہر پہر گذرے
جوے خوں آنکھوں سے بہی شاید　　خون سے میرے بھی وے درگذرے
راہ جاناں سے ہے گذر مشکل　　جان ہی سے کوئی مگر گذرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق　　کچھ نہ کچھ چاہیے کہ کر گذرے
غنچہ ہو شرم سے ان آنکھوں کی　　گل نرگس اگر نظر گذرے

سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر
کیا کوئی اس کی راہ پر گذرے

(۱۵۲۸)

جب سے آنکھیں کھلی ہیں اپنی درد و رنج و غم دیکھے   ان ہی دیدۂ نم دیدوں سے کیا کیا ہم نے ستم دیکھے
سر جانے کی اور اپنے زنہار نگاہ نہ کی ہم نے   اٹھ کے اندھا دھند آئے چلے ہی اس ظالم کے قدم دیکھے
عالم ہیئت مجموعی سے ایک عجیب مرقع ہے   ہر صفحے میں ورق میں اس کے دیکھے تو عالم دیکھے
زخم نہ ہوویں کیونکر غائر چھاتی میں دل خستوں کی   تیر نگاہ یار جگر پر لگتے ہوئے پیہم دیکھے
یار کے در پر ذکر ہے کیا ہنگامۂ روز محشر کا
اس کوچے میں قیامت سے تو میر بہت اودھم دیکھے

(۱۵۲۹)

خواہش دل سے جی کی تاب گئی   آنکھیں اس سے لگیں سو خواب گئی
پھول سے بھی تھی خوب دختر تاک   مغبچوں میں رہی خراب گئی
گر کر اس کی گلی کی خاک میں مفت   اشک کی موتی کی سی آب گئی
بوے گل یا نواے بلبل تھی   عمر افسوس کیا شتاب گئی
نمک حسن سبز سے اے میر
ساری کیفیت شراب گئی

(۱۵۳۰)

یارب اس کا ستم سہا بھی جائے   پنجہ خورشید کا گہا بھی جائے
دیکھ رہیے خرام ناز اس کا   پر کسو پا سے گر رہا بھی جائے
درد دل طول سے کہے عاشق   روبرو اس کے جو کہا بھی جائے
حیرت گل سے آب جو ٹھٹھکا   بہے بہتیرا ہی بہا بھی جائے
کیا کوئی اس گلی میں آوے میر
آوے تو لوہو میں نہا بھی جائے

(۱۵۳۱)

اب ترک کر لباس توکل ہی کر رہے   جب سے کلاہ سر پہ رکھی در بہ در رہے
اس دشت سے غبار ہمارا نہ ٹک اٹھا   ہم خانماں خراب نہ جانا کدھر رہے

آنے سے اس طرف کے ترے میں نے غش کیا
شکوہ بھی اس سے کیجیے جس کو خبر رہے

دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

جب تک ہو خون دل میں جگر میں مژہ ہوں نم
نہ کچھ بھی جو نہ ہووے تو کیا چشم تر رہے

رہنا گلی میں اس کی نہ جیتے جی ہوسکا
ناچار ہوکے واں جو گئے اب سو مر رہے

عاشق خراب حال ترے ہیں گرے پڑے
جوں لشکر شکستہ پریشاں اتر رہے

عیب آدمی کا ہے جو رہے اس دیار میں
مطلق جہاں نہ میر رواج ہنر رہے

(۱۵۴۲)

پھر اب چلو چمن میں کھلے غنچے رک گئے
شاخوں سمیت پھول نہالوں کے جھک گئے

چندیں ہزار دیدۂ گل رہ گئے کھلے
افسوس ہے چمن کی طرف تم نہ تک گئے

بھڑکی تھی جب کہ آتش گل پھول پڑ گیا
بال و پر طیور چمن میر پھک گئے

(۱۵۴۳)

آج ہمیں بیتابی سی ہے صبر کی دل سے رخصت تھی
چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی

کس محنت سے محبت کی تھی کس خواری سے یاری کی
رنج ہی ساری عمر اٹھایا کلفت تھی یا الفت تھی

بدنامی کیا عشق کی کہیے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی دنیا دنیا تہمت تھی

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کس کو طاقت تھی

عہد ہمارا تیرا ہے یہ جس میں گم ہے مہر و وفا
اگلے زمانے میں تو یہی لوگوں کی رسم و عادت تھی

خالی ہاتھ سیہ رو ایسے کاہے کو تھے گریہ کناں
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

جو اٹھتا ہے یاں سے بگولا ہم سا ہے آوارہ کوئی
اس وادی میں میر مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

دیوانِ پنجم

دیوان پنجم

ردیف الف

(۱۵۳۴)

دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مستجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا
اودھر نہیں گذار گمان و خیال کا

حیرت سے عارفوں کو نہیں راہ معرفت
حال اور کچھ ہے یاں انھوں کے حال و قال کا

ہے قسمت زمین و فلک سے غرض نمود
جلوہ وگرنہ سب میں ہے اس کے جمال کا

مرنے کا بھی خیال رہے میرؔ اگر تجھے
ہے اشتیاق جان جہاں کے وصال کا

(۱۵۳۵)

ہے حرف خامہ دل زدہ حسن قبول کا
یعنی خیال سر میں ہے نعت رسولؐ کا

رہ پیروی میں اس کی کہ گام نخست میں
ظاہر اثر ہے مقصد دل کے وصول کا

وہ مقتدائے خلق جہاں اب نہیں ہوا
پہلے ہی تھا امام نفوس و عقول کا

سرمہ کیا ہے وضع پئے چشم اہل قدس
احمدؐ کے رہگذار کی خاک اور دھول کا

ہے متحد نبیؐ و علیؓ و وصی کی ذات
یاں حرف معتبر نہیں ہر بوالفضول کا

دھو منھ ہزار پانی سے سو بار پڑھ درود
تب نام لے تو اس چمنستاں کے پھول کا

حاصل ہے میرؔ دوستی اہل بیت اگر
تو غم ہے کیا نجات کے اپنی حصول کا

(۱۵۳۶)

عشق تو بن رسوائی عالم باعث ہے رسوائی کا
میل دلی اس خودسر سے ہے جو پایہ ہے خدائی کا

ہے جو سیاہی جرم قمر میں اس کے سوا کچھ اور نہیں
داغ ہے مہ کا آئینہ اس سطح رخ کی صفائی کا

نزع میں میری حاضر تھا پر آنکھ نہ ایدھر اس کی پڑی
داغ چلا ہوں اس سے جہاں میں یار کی بے پروائی کا

کوشش میں سر مارا لیکن در پہ کسی کے جا نہ سکا
تن پہ زبان شکر ہے ہر مو اپنی شکستہ پائی کا

رنگ سراپا اس کا ہوا لے آگے دل خوں کرتی رہی
اب ہے جگر یک لخت افسردہ اس کے رنگ حنائی کا

آنا سن ناداری سے ہم نے جی دینا ٹھہرایا ہے
کیا کہیے اندیشہ بڑا تھا اس کی منھ دکھلائی کا

کوفت میں ہے ہر عضو اس کا جوں عضو از جا رفتہ میرؔ
جو کشتہ ہے ظلم رسیدہ اس کے درد جدائی کا

(۱۵۳۷)

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

صورت گر کی پریشانی نے طول نہایت کھینچا ہے
ہم نے کیوں بستار کیا تھا اس کے لمبے بالوں کا

بہت کیا تو پتھر میں سوراخ کیے ہیں درفشوں نے
چھید جگر میں کر دینا یہ کام ہے محزوں نالوں کا

سرولب جو لالہ و گل نسرین و سمن ہیں شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

غنچہ ہوا ہے خار بیاباں بعد زیارت کرنے کے
پانی تبرک کرتے ہیں سب پاؤں کے میرے چھالوں کا

پہلے تدارک کچھ ہوتا تو نفع بھی ہوتا سو تو میر
کام ہے آخر عشق میں اس کے بیماروں بدحالوں کا

(۱۵۳۸)

اگر ہنستا اسے سیر چمن میں اب کے پاؤں گا
تو بلبل آشیاں تیرا ہی میں پھولوں سے چھاؤں گا(۱)

مجھے گل اس کے آگے خوش نہیں آتا کچھ اس پر بھی
جو تو آزردہ ہوتی ہے گلستاں میں نہ آؤں گا

بشارت اے صبا دیجو اسیران قفس کو بھی
تسلی کو تمھاری سر پہ رکھ دو پھول لاؤں گا

دماغ نازبرداری نہیں ہے کم دماغی سے
کہاں تک ہر گھڑی کے روٹھے کو پہروں مناؤں گا

خشونت بدسلوکی خشمگینی کس لیے اتنی
نہ منھ کو پھیریے پھر یاں نہ آؤں گا جو جاؤں گا

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤں گا

بلائیں زیر سر ہوں کاش افتادہ رہوں یوں ہی
اٹھا سر خاک سے تو میر ہنگامے اٹھاؤں گا

(۱۵۳۹)

رسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا
کیا خاک میں ملا ہے افسوس فن ہمارا

دل خون ہوگیا تھا غم لکھتے سو رہے ہے
شنگرف کے قلم سا پرخوں دہن ہمارا

ظل ریاض میں شب مہتاب کے نہیں گل
انگاروں سے بھرا ہے اس بن چمن ہمارا

میدان عشق میں تو قیمہ بدن ہوا ہے
تہ کرکے خاک ہی میں رکھ دیں کفن ہمارا

میر اس کی آنکھیں دیکھیں ہم نے سفر کو جاتے
عین بلا ہوا ہے سو اب وطن ہمارا

(۱۵۴۰)

منھ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا
ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا

---

(۱) یہ مطلع اگلے شعر سے مربوط ہے۔ مصحح

جو دلبر ہے ایسا تو دل جا چکا ہے　　کسو روز آنکھوں میں گھر کر رہے گا
ہر اک کام موقوف ہے وقت پر ہی　　دل خوں شدہ بھی جگر کر رہے گا
نہ ہوں گو خبر مرداں حال بد سے　　مرا نالہ سب کو خبر کر رہے گا
فن شعر میں میرؔ صناع ہے وہ
دل اس کا کوئی تو ہنر کر رہے گا

(۱۵۴۱)

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رہے ہم عالم مستی میں اکثر　　رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
بہت ہی دور ہم سے بھاگتے ہو　　کرو ہو پاس کچھ تو کم ہمارا
بکھر جاتے ہیں کچھ گیسو تمھارے　　ہوا ہے کامِ دل برہم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

(۱۵۴۲)

کیا پوچھو ہو کیا کہیے میاں دل نے بھی کیا کام کیا　　عشق کیا ناکام رہا آخر کو کام تمام کیا
عجز کیا سو اس مفسد نے قدر ہماری یہ کچھ کی　　تیوری چڑھائی غصہ کیا جب ہم نے جھک کے سلام کیا
کہنے کی بھی لکھنے کی بھی ہم تو قسم کھا بیٹھے تھے　　آخر دل کی بیتابی سے خط بھیجا پیغام کیا
عشق کی تہمت جب نہ ہوئی تھی کاہے کو شہرت ایسی تھی　　شہر میں اب رسوا ہیں یعنی بدنامی سے کام کیا
ریگستاں میں جاکے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی　　رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا
خط و کتابت لکھنا اس کو ترک کیا تھا اس ہی لیے　　حرف و سخن سے ٹپکا لوہو اب جو کچھ ارقام کیا
تلخ اس کا تو شہد و شکر ہے ذوق میں ہم ناکاموں کے　　لوگوں میں لیکن پوچ کہا یہ لطف بے ہنگام کیا
جیسے کوئی جہاں سے جاوے رخصت اس حسرت سے ہوئے　　اس کوچے سے نکل کر ہم نے روبہ قفا ہر گام کیا
میرؔ جو ان نے منھ کو ادھر کر ہم سے کوئی بات کہی
لطف کیا احسان کیا انعام کیا اکرام کیا

(۱۵۴۳)

عشق ہو حیوان کا یا انس ہو انسان کا　　لاگ جی کی جس سے ہو دشمن ہے اپنی جان کا
عاشق و معشوق کی میں طرفہ صحبت میر کی　　ایک جی مارے ہے مرہون ایک ہے احسان کا
میں خرد گم عشق میں اس لڑکے کے آخر ہوا　　یہ ثمر لایا نہ دیکھا چاہنا نادان کا

مرنا اس کے عشق میں خالی نہیں ہے حسن سے　　رشک کے قابل ہے جو کشتہ ہے اس میدان کا
گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے　　ہل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا
ہر ورق ہر صفحے میں اک شعرِ شور انگیز ہے　　عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا
کیا ملاوے آنکھ نرگس اس کی چشمِ سرخ سے　　زرد اس غم دیدہ کو آزار ہے یرقان کا
بات کرتے جائے ہے منھ تک مخاطب کے جھلک　　اس کا لعلِ لب نہیں محتاج رنگ پان کا
کیا کہوں سارا زمانہ کشتہ و مردہ ہے میر
اس کے اک انداز کا اک ناز کا اک آن کا

(۱۵۴۴)

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گئی آرام گیا　　جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا　　دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو رووے ہجراں میں بے کل اس کا　　خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا
آیا یاں سے جانا ہی تو جی کا چھپانا کیا حاصل　　آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے　　اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا
گالی جھڑکی خشم و خشونت یہ تو سردست اکثر ہیں　　لطف گیا احسان گیا انعام گیا اکرام گیا
لکھنا کہنا ترک ہوا تھا آپس میں تو مدت سے　　اب جو قرار کیا ہے دل سے خط بھی گیا پیغام گیا
نالۂ میر سواد میں ہم تک دوشیں شب سے نہیں آیا
شاید شہر سے اس ظالم کے عاشق وہ بدنام گیا

(۱۵۴۵)

طوف مشہد کو کل جو جاؤں گا　　تیغ قاتل کو سر چڑھاؤں گا
وصل میں رنگ اڑ گیا میرا　　کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا
چھانتا ہوں کسی گلی کی خاک　　دل کو اپنے کبھو تو پاؤں گا
اس کے در پر گئے ہیں تاب و تواں　　گھر تلک اپنے کیوں کے جاؤں گا
لوٹتا ہے بہار منھ کی خط
میر میں اس پہ زہر کھاؤں گا

(۱۵۴۶)

ہر جا پھرا غبار ہمارا اڑا ہوا　　تیری گلی میں لائی صبا تو بجا ہوا
آہ سحر نے دل کی نہ کھولی گرہ کبھی　　آخر نسیم سے بھی یہ غنچہ نہ وا ہوا
وے میر اثر جو شورش دل میں تھے ہیں کہاں
نالے کیے جرس نے بہت سے تو کیا ہوا

(۱۵۴۷)

پہلو سے اٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا
جز درد اب نہیں ہے پہلونشیں ہمارا

ہوں کیوں نہ سبز اپنے حرف غزل کہ ہے یہ
دے زرع سیرحاصل قطعہ زمیں ہمارا

کیسا کیا جگر خوں آزار کیسے کھینچے
آساں نہیں ہوا دل اندوہگیں ہمارا

حرف و سخن تھے اپنے یا داستاں جہاں میں
مذکور بھی نہیں ہے یا اب کہیں ہمارا

کیا رائیگاں بتوں کو دے کر ہوئے ہیں کافر
ارث پدر جو اب تھا یہ کہنہ دیں ہمارا

لخت جگر بھی اپنا یاقوت ناب سا ہے
قطرہ سرشک کا ہے دُرّثمیں ہمارا

کیا خاک میں ملایا ہم کو بہر دوں نے
ڈھونڈا نشان تربت پاتے نہیں ہمارا

حالت ہے نزع کی یاں آؤ کہ جاتے ہیں ہم
آنکھوں میں منتظر ہے دم واپسیں ہمارا

اک عمر مہر ورزی جن کے سبب سے کی تھی
پاتے ہیں میرؔ ان کو سرگرم کیں ہمارا

(۱۵۴۸)

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اودھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ ان ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

ہم نہیں لکھتے اس لیے اس کو شوخ بہت ہے وہ لڑکا
خط کا کاغذ بادی کرے گا باؤ کا رخ بتلاوے گا

رنج بہت کھینچے تھے ہم نے طاقت جی کی تمام ہوئی
اپنے کیے پر یاد رہے یہ وہ بھی بہت پچھتاوے گا

اندھے سے ہم چاہ میں اس کی گو اے ناصح پھرتے ہیں
سوجھتا بھی کچھ کر آئیں گے کیا تو ہم کو بھاوے گا

عاشق ہووے وہ بھی یارب تا کچھ اس سے کہا جاوے
یعنی حال سنے گا دل سے دل جو کسی سے لگاوے گا

عاشق کی دلجوئی کی بھی راہ و رسم سے واقف رہ
ہو جو ایسا گم شدہ اپنا اس کو نہ تو پھر پاوے گا

آنکھیں موندے یہ دلبر جو سوتے رہیں تو بہتر ہے
چشمک کرنا ایک انھوں کا سو سو فتنے جگاوے گا

کیا صورت ہے کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منھ دیکھو جو کوئی کلال بناوے گا

ہنوز بے ڈھب آنکھیں پھریں ہیں پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
عشق ابھی کیا جانیے ہم کو کیا کیا میرؔ دکھاوے گا

(۱۵۴۹)

شیخ حرم سے لڑکے چلا ہوں اب کعبے میں نہ آؤں گا
تا بت خانہ ہر قدم اوپر سجدہ کرتا جاؤں گا

بہر پرستش پیش صنم ہاتھوں سے قسیس رہباں کے
رشتہ سبحہ تڑاؤں گا زنار گلے سے بندھاؤں گا

رود دیر کے پانی سے یا آب چاہ سے اس جا کے
واسطے طاعت کفر کے میں دونوں وقت نہاؤں گا

طائف رستہ کعبے کا جو کوئی مجھ سے پوچھے گا
جانب دیر اشارت کر میں راہ ادھر کی بھلاؤں گا

بے دیں اب جو ہوا سو ہوا ہوں طوف حرم سے کیا مجھ کو   غیر از سوے صنم خانہ میں رو نہ ادھر کو لاؤں گا

آگے مسافر میر عرب میں اور عجم میں کہتے ہیں
اب شہروں میں ہندستاں کے کافر میر کہاؤں گا

(۱۵۵۰)

کیسی سعی حوادث نے کی آخرکار ہلاک کیا   کیا کیا چرخ نے چکر مارے پیس کے مجھ کو خاک کیا
ایسا پلید آلودۂ دنیا خلق نہ آگے ہوا ہوگا   شیخ شہر موا کہتے ہیں شہر خدا نے پاک کیا
قدرت حق میں کیا قدرت جو کل کسو کی فضولی کرے   اس کو کیا پرکالۂ آتش مجھ کو خس و خاشاک کیا
آہ سے تھے رخنے چھاتی میں پھیلنا ان کا یہ سہل نہ تھا   دو دو ہاتھ تڑپ کر دل نے سینۂ عاشق چاک کیا

خوگر ہونا حزن و بکا سے میر ہمارا یوں ہی نہیں
برسوں روتے کڑھتے رہے ہم تب دل کو غمناک کیا

(۱۵۵۱)

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا   درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا
چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے   مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا

جست و جو بھی اس کی کریے جس کا نشاں کچھ پیدا ہو
پانا اس کا میر ہے مشکل جی تو یوں ہی کھووے گا

(۱۵۵۲)

ناگاہ جس کو عشق کا آزار ہوگیا   سہل آگے اس کے مردن دشوار ہوگیا
ہے حسن کیا متاع کہ جس کو نظر پڑی   وہ جان بیچ کر بھی خریدار ہوگیا
برسوں تئیں جہان میں کیوں کر رہا ہے خضر   میں چار دن میں جینے سے بیزار ہوگیا
ہم بستری بن اس کی میں صاحب فراش ہوں   ہجراں میں کڑھتے کڑھتے ہی بیمار ہوگیا
ہم دام تھے سو چھوٹ گئے سب دام کے اٹھے   تھی دل کو میرے چوٹ گرفتار ہوگیا
اس کی نگاہ مست کا کھایا ہی تھا فریب   پر شیخ طرز دیکھ کے ہشیار ہوگیا

کیا متقی تھا میر پر آئین عشق میں
مجرم سا کشت و خوں کا سزاوار ہوگیا

(۱۵۵۳)

پھرتے پھرتے اس کے لیے میں آخر دشت نورد ہوا   دیکھ آنکھیں وہ سہہ گیں میں پھر دنبالہ گرد ہوا

جیتے جی میت کے رنگوں لوگ مجھے اب پاتے ہیں　　جوش بہار عشق میں یعنی سرتا پا میں زرد ہوا
گرم مزاج رہا نہیں اپنا دیسے اس کے ہجراں میں　　ہوتے ہوتے افسردہ دیکھوگے اک دن سرد ہوا
میرؔ نہ اپنے درد دل کو مجھ سے کہا کر روز و شب
صبح جو گوش دل سے سنا تھا دل میں میرے درد ہوا

(۱۵۵۴)

عشق صمد میں جان چلی وہ چاہت کا ارمان گیا　　تازہ کیا پیمان صنم سے دین گیا ایمان گیا
میں جو گدایانہ چلایا در پر اس کے نصف شب　　گوش زد آگے تھے نالے سو شور مرا پہچان گیا
آگے عالم عین تھا اس کا　عین عالم ہے وہ　　اس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں میرا سب گیان گیا
مطلب کا سررشتہ گم ہے کوشش کی کوتاہی نہیں　　جو طالب اس راہ سے آیا خاک بھی یاں کی چھان گیا
خاک سے آدم کر دکھلایا یہ منت کیا تھوڑی ہے　　اب سر خاک بھی ہو جاوے تو سر سے کیا احسان گیا
ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے　　رفتہ رفتہ ہندستاں سے شعر مرا ایران گیا
کیونکے جہت ہو دل کو اس سے میرؔ مقام حیرت ہے
چاروں اور نہیں ہے کوئی یاں واں یوں ہی دھیان گیا

(۱۵۵۵)

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا　　مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا
دیدۂ تر کو سمجھ کر اپنا ہم نے کیا کیا حفاظت کی　　آہ نہ جانا روتے روتے یہ چشمہ دریا ہوگا
کیا جانیں آشفتہ دلاں کچھ ان سے ہم کو بحث نہیں　　وہ جانے گا حال ہمارا جس کا دل بیجا ہوگا
پاؤں حنائی اس کے لے آنکھوں پر اپنی ہم نے رکھے　　یہ دیکھا نہ رنگ کفک پر ہنگامہ کیا برپا ہوگا
جاگہ سے بے تہ جاتے ہیں دعوے دے ہی کرتے ہیں　　ان کو غرور و ناز نہ ہوگا جن کو کچھ آتا ہوگا
روبہ بہی اب لاہی چکے ہیں ہم سے قطع امید کرو　　روگ لگا ہے عشق کا جس کو وہ اب کیا اچھا ہوگا
دل کی لاگ کہیں جو ہو تو میرؔ چھپائے اس کو رکھ
یعنی عشق ہوا ظاہر تو لوگوں میں رسوا ہوگا

(۱۵۵۶)

جاذبہ میرا تھا کامل سو بندے کے وہ گھر آیا　　شکر خدا کا کریے کہاں تک عہد فراق بسر آیا
بجلی سا وہ چمک گیا آنکھوں سے پھوئیں پڑنے لگیں　　ابر نمط خفگی سے اس بن جی بھی رندھا دل بھر آیا
گل تھے سو سو رنگ پر ایسا شور طیور بلند نہ تھا　　اس کے رنگ چمن میں کوئی شاید پھول نظر آیا
سیل بلا جوشاں تھا لیکن پانی پانی شرم سے تھا　　ساحل دریا خشک لبی دیکھے سے میری تر آیا

کیا ہی خوش پرکار ہے دلبر نوچہ کشتی گیر اپنا — کوئی زبردست اس سے لڑ کر عہدے سے کب بر آیا
صنعت گریاں بہتیری کیں لیک دریغ ہزار دریغ — جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہنر آیا
میر پریشاں خاطر آ کر رات رہا بت خانے میں
راہ رہی کعبے کی اودھر یہ سودائی کدھر آیا

(۱۵۵۷)

اب یاں سے ہم اٹھ جائیں گے خلق خدا ملک خدا — ہرگز نہ ایدھر آئیں گے خلق خدا ملک خدا
مطلب اگر یاں گم ہوا اندیشے کی جا کہ نہیں — جا کر کہیں کچھ پائیں گے خلق خدا ملک خدا
دل میں نہ جانے یہ کوئی ہم کھانے کو دیں ہیں انھیں — جو ہے مقدر کھائیں گے خلق خدا ملک خدا
گو لکھنؤ ویراں ہوا ہم اور آبادی میں جا — مقسوم اپنا لائیں گے خلق خدا ملک خدا
اب دی پری گذری گئی ہم آجکل بے خانماں — کیا غیر ازیں ٹھہرائیں گے خلق خدا ملک خدا
اس بستی سے اٹھ جائیں گے درویشوں کی کیا مشورت — وے بھی یہی فرمائیں گے خلق خدا ملک خدا
تو میر ہووے گا جہاں امر قضا کے تابعاں
روزی تجھے پہنچائیں گے خلق خدا ملک خدا

(۱۵۵۸)

اس کی سی جو چلے ہے راہ تو کیا — آسماں پر گیا ہے ماہ تو کیا
لڑ کے ملنا ہے آپ سے بےلطف — یار ہووے نہ عذرخواہ تو کیا
کب رخ بدر روشن ایسا ہے — ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا
بےخرد خانقہ میں ہیں گو مست — وہ کرے مست یک نگاہ تو کیا
اس کے پرپیچ گیسو کے آگے — ہووے کالا کوئی سیاہ تو کیا
حسن والے ہیں کج روش سارے — ہوئے دو چار روبراہ تو کیا
دل رہے وصل جو مدام رہے — مل گئے اس سے گاہ گاہ تو کیا
ایک اللہ کا بہت ہے نام — جمع باطل ہوں سو الٰہ تو کیا
میر کیا ہے فقیر مستغنی
آوے اس پاس بادشاہ تو کیا

(۱۵۵۹)

بات کہتے جی کا جانا ہوگیا — مرنا عاشق کا بہانہ ہوگیا
جاے بودن تو نہ تھی دنیاے دوں — اتفاقاً اپنا آنا ہوگیا

ماہ اس کو کہہ کے سارے شہر میں   مجھ کو مشکل منھ دکھانا ہوگیا
کر رکھا تعویذ طفلی میں جسے   اب سو وہ لڑکا سیانا ہوگیا
اس بلا سے آہ میں غافل رہا   یک بہ یک دل کا لگانا ہوگیا
کنج لب سے یار کے اٹھا نہ تک   الغرض دل کا ٹھکانا ہوگیا
رفتہ رفتہ اس پری کے عشق میں
میر سا دانا دوانہ ہوگیا

(۱۵۶۰)

عشق بلا پرشور و شر نے جب میدان میں خم مارا   پاک ہوئی کشتی عالم کی آگے کن نے دم مارا
بود نبود کی اپنی حقیقت لکھنے کے شائستہ نہ تھی   باطل صفحۂ ہستی پر میں خط کھینچا قلم مارا
غیر کے میرے مرجانے میں تفاوت ارض و سما کا ہے   مارا ان نے دونوں کو لیکن مجھ کو کر کے ستم مارا
ان بالوں سے طلسم جہاں کا در بستہ تھا گویا سب   زلفوں کو درہم ان نے کیا سو عالم کو برہم مارا
دور اس قبلہ رو سے مجھ کو جلد رقیب نے مار رکھا   قہر کیا اس کتے نے کیا دوڑ کے صید حرم مارا
کاٹ کے سر عاجز کا ان نے اور بھی پگڑی پھیر رکھی   فخر کی کون سی جاگہ تھی یاں ایسا کیا رستم مارا
جس مضمار میں رستم کی بھی راہ نہ نکلی میر کبھو
اس میداں کی خاک پہ ہم نے جرأت کر کے قدم مارا

(۱۵۶۱)

چاہ میں جور ہم پہ کم نہ ہوا   عاشقی کی تو کچھ ستم نہ ہوا
فائدہ کیا نماز مسجد کا   قد ہی محراب سا جو خم نہ ہوا
یار ہمراہ نعش جس دم تھا   وائے مردے میں میرے دم نہ ہوا
نہ گیا اس طرف کا خط لکھتا   ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا
بے دلی میں ہے میر خوش اس سے
دل کے جانے کا حیف غم نہ ہوا

(۱۵۶۲)

کل تلک داغوں سے خوں کے دامن زیں پاک تھا   آج تو کشتہ کوئی کیا زینت فتراک تھا
کیا جنوں کو روؤں تربتی سے اس کی گل نمط   لے گریباں سے زہ دامن تک اک ہی چاک تھا
رو جو آئی رونے کی مژگاں نہ ٹھہری ایک پل   راہ میں اس رود کی گویا خس و خاشاک تھا
اک ہی شمع شعلہ خو کے لائحے میں جل بجھا   جب تلک پہنچے کوئی پروانہ عاشق خاک تھا

بادشاہ وقت تھا میں تخت تھا میرا دماغ   جی کے چاروں اور اک جوش گل تریاک تھا
ڈھال تلوار اس جواں کے ساتھ اب رہتی نہیں   وہ جفا آئیں شلائیں لڑکا ہی بیباک تھا
تنگ پوشی تنگ درزی اس کی جی میں کھب گئی   کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا
بات ہے جی مارنا بازیچہ قتل عام ہے   اب تو ہے صدچند اگر وہ چند وہ سفاک تھا
غنچۂ دل وا ہوا نہ باغوں باغوں میں پھرا   اب بھی ہے ویسا ہی جیسا پیشتر غمناک تھا
درک کیا اس درس گہ میں میر عقل و فہم کو
کس کے تیں ان صورتوں میں معنی کا ادراک تھا

(۱۵۶۳)

جدا اس سیم تن سے کیسا سونا   کہ مٹی کوڑے کا اب ہے بچھونا
بہت کی جستجو اس کی نہ پایا   ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا
جگر کے زخم شاید ہیں نمک بند
مزہ کچھ آنسوؤں کا ہے سلونا

(۱۵۶۴)

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا   اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا
کہتے ہیں ادھر منھ کر وہ رات کو سوتا ہے   اے آہ سحرگاہی تک تو بھی اثر کرنا
دیواروں سے سر مارا تب رات سحر کی ہے
اے صاحب تسکیں دل اب میری خبر کرنا

(۱۵۶۵)

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا   سینہ کوبی سخت ماتم کب سے تھا
اس کی مقتولی کا ہم کو رشک ہے   وہ قدم جو کشتہ آگے سب سے تھا
کون مل سکتا ہے اس اوباش سے   اختلاط اس سے ہمیں اک ڈھب سے تھا
گرم ملنے والے دیکھے یار کے   ایک ٹھنڈا ہوگیا اک تب سے تھا
چپ سی مجھ کو لگ گئی تھی تب سے میر
شور ان شیریں لبوں کا جب سے تھا

(۱۵۶۶)

عشق کیے پچھتائے ہم تو دل نہ کسو سے لگانا تھا   جیدھر ہو وہ مہ نکلا اس راہ نہ ہم کو جانا تھا

غیریت کی اس کی شکایت یار عبث اب کرتے ہیں　　طور اس شوخ ستم پیشہ کا طفلی سے بیگانہ تھا
بزم عیش کی شب کا یاں دن ہوتے ہی یہ رنگ ہوا　　شمع کی جاگہ دود تنک تھا خاکستر پروانہ تھا
دخل مروت عشق میں تھا تو دروازے سے تھوڑی دور　　ہمرہ نعش عاشق کے اس ظالم کو بھی آنا تھا
طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا یہ میرؔ عجب دیوانہ تھا

(۱۵۶۷)

ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھل گیا　　لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مل گیا
دل جمع تھا جو غنچہ کے رنگوں خزاں میں تھا　　اے کیا کہوں بہار گل زخم کھل گیا
بے دل ہوئے پہ کرتے تدارک جو رہتا ہوش　　ہم آپ ہی میں آئے نہیں جب سے دل گیا
دیکھا نہیں پہاڑ گراں سنگ یا سبک　　زوروں چڑھا تھا عشق میں فرہاد پل گیا
شبنم کی سی نمود سے تھا میں عرق عرق　　یعنی کہ ہستی ننگ عدم تھی خجل گیا
غم کھینچتے ہلا نہیں جاگہ سے کیا کروں　　دل جا لگے ہے دم بہ دم اودھر ہی ہل گیا
صورت نہ دیکھی ویسی کشادہ جبیں کہیں
میں میرؔ اس تلاش میں چین و چگل گیا

(۱۵۶۸)

ایک نہ خواہش بر آئی تا جی کا غبار نکل جاتا　　کاشکے آہو چشم اپنا آنکھوں کو پاؤں سے مل جاتا
آتش دل کی لپٹوں کا ہے یارو کچھ عالم ہی جدا　　لائحہ کوئی کھینچتا سر تو سارا عالم جل جاتا
نعرہ کرنا عاشق کا ہے ساتھ اک ہیبت کے یعنی　　سن آواز اس شیرنر کی سیل بلا سے دہل جاتا
اہل زمیں تو کیا ہیں ان کا سہل تھا راہ سے لے جانا　　چرخ پہ ہٹا وہ جو چھلاوا خیل ملک کو چھل جاتا
کشتی زبردستوں کی اس سے پاک ہوئی تو کیا ہے عجب　　رستم سامنے ہوجاتا تو راہ بچا کر ٹل جاتا
غم سے ہوگر زرد سراسر صورت ساری خزاں کی سی　　آن نکلتے سوے چمن تو رنگ ہوا کا بدل جاتا
ڈھلتے ڈھلتے ضعف سے آئے میرؔ سوان نے منھ پھیرا
یاقوتی سے بوسۂ لب کی جی شاید کہ سنبھل جاتا

(۱۵۶۹)

کیا کیا عشق میں رنج اٹھائے دل اپنا سب خون ہوا　　کیسے رکتے تھے خفگی سے آخرکار جنون ہوا
تڑپا ہے پہلو میں اب جب طاقت جی میں کچھ نہ رہی　　جسم غم فرسودہ ہمارا زرد و زار و زبون ہوا
جنگل میں میں رونے چلا تھا دل جو بھرا تھا میرؔ بہت
آیا سیل آگے سے چلا کیا بخت سے مجھ کو شگون ہوا

(۱۵۷۰)

آیا سو آب تیغ ہی مجھ کو چٹا گیا
تھا وہ برندہ زخموں پہ میں زخم کھا گیا

کیا شہر خوش عمارت دل سے ہے گفتگو
لشکر نے غم کے آن کے مارا چلا گیا

موقوف یار غیر جلانا مرا نہیں
جو کوئی اس کے کان لگا کچھ لگا گیا

تنہائی بیکسی مری یک دست تھی کہ میں
جیسے جرس کا نالہ جرس سے جدا گیا

کیا تم سے اپنے دل کی پریشانی میں کہوں
دریاے گریہ جوش زناں تھا بہا گیا

روزانہ اب تو اپنے تئیں سوجھتا نہیں
آخر کو رونا راتوں کا ہی دن دکھا گیا

سرنگی بدی مری نوشتی ہے میر
قاصد جو لے کے نامہ گیا سو بھلا گیا

(۱۵۷۱)

کچھ اندیشہ ہم کو نہیں ہے اپنے حال درہم کا
آٹھ پہر رہتا ہے رونا اس کی دوری کے غم کا

روتے کڑھتے خاک میں ملتے جیتے رہے ہم دنیا میں
دس دن اپنی عمر کے گویا عشرہ تھا یہ محرم کا

کشتی ہماری عشق میں کیا تھی ہاتھ ملاتے پاک ہوئی
پاے ثبات نہ ٹھہرا دم بھر اس میدان میں رستم کا

عالم نیستی کیا عالم تھا غم دنیا و دیں کا نہ تھا
ہوش آیا ہے جب سے سر میں شوق رہا اس عالم کا

یاں واجب ہے ہم کو تم کو دم لیویں تو شمردہ لیں
دینا ہوگا حساب کسو کو یک دم ہی میں دم دم کا

چھاتی کوٹی منھ نوچا سر دے دے مارا پتھر پر
دل کے خوں ہونے میں ہمارا یہی طریق ہے ماتم کا

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میر نہیں کوئی
دھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اس کے اودھم کا

(۱۵۷۲)

گلچیں نہیں جو کوئی بھی اس تازہ چمن کا
کیوں رنگ پھرا سا ہے ترے سیب ذقن کا

غربت ہے دل آویز بہت شہر کی اس کے
آیا نہ کبھو ہم کو خیال اپنے وطن کا

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

کب مشت نمک سے ہوئی تسکین جراحت
لب چش ہے نمک سار مرے زخم کہن کا

جو چاک گریبان کہ دامن کی ہو زہ تک
قربان کیا میر اسے چاک کفن کا

(۱۵۷۳)

یہ تو جدائی جوں توں کٹی ہے ملیے گا تو کہیے گا
پاس ہمارا گو نہ کرو تم پاس ہی اب سے رہیے گا

ردیف ب

(۱۵۷۴)

کب سے صحبت بگڑ رہی ہے کیونکر کوئی بناوے اب
ناز و نیاز کا جھگڑا ایسا کس کے کہنے لے جاوے اب

سوچتے آتے ہیں جی میں پگڑی پر گل رکھے سے
کس کو دماغ رہا ہے اس کے جو حرف سخن اٹھاوے اب

تیغ بلند ہوئی ہے اس کی قسمت ہوں گے زخم رسا
مرد اگر ہے صید حرم تو کوئی جراحت کھاوے اب

داغ سرو سینے کے میرے حسرت آگیں چشم ہوئے
دیکھیں کیا کیا عشق ستم کش ہم لوگوں کو دکھاوے اب

دم دو دم گھبراہٹ ہو تو ہو سکتا ہے تدارک بھی
جی کی چال سے پیدا ہے سو کوئی گھڑی میں جاوے اب

دل کے داغ بھی گل ہیں لیکن دل کی تسلی ہوتی نہیں
کاشکے دو گلبرگ ادھر سے باد اڑا کر لاوے اب

اس کے کفک کی پامالی میں دل جو گیا تھا شاید میرؔ
یار ادھر ہو مائل تک تو وہ رفتہ ہاتھ آوے اب

(۱۵۷۵)

دل خوں ہوا تھا یکسر پانی ہوا جگر سب
خوں بستہ رہتیاں تھیں پلکیں سو اب ہیں تر سب

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے
اوجڑ دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیادے سوار ہم کو آئے نظر نفر سب

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میرؔ اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

(۱۵۷۶)

عشق و جنوں کی کیا اب تدبیر ہے مناسب
زنجیر ہے مناسب شمشیر ہے مناسب

دوری شعلہ خویاں آخر جلا رکھے گی
صحبت جو ایسی ہووے درگیر ہے مناسب

جلدی نہ قتل میں کر پچھتاوے گا بہت تو
خوں ریزی میں ہماری تاخیر ہے مناسب

رسوائے شہر ہونا عزت ہے عاشقی میں
احوال کی ہمارے تشہیر ہے مناسب

دل کی خرابی کے تو درپے ہے اے صنم کیوں
اس خانۂ خدا کی تعمیر ہے مناسب

شب اس کو میں نے دیکھا سوتے بغل میں اپنی
اس خواب کی نہ کرنی تعبیر ہے مناسب

رحم آشنا کسو کو اس بستی میں نہ پایا
اسلامیوں کی یاں کے تکفیر ہے مناسب

ہے سرگذشت اپنی نوشتنی ہی بہتر
گذری سو گذری کیا اب تحریر ہے مناسب

دنیا میں کوئی پھر پھر آیا نہیں ہے صاحب
اک بار تم کو مرنا اے میرؔ ہے مناسب

(۱۵۷۷)

تاب عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت ہے اب — یعنی سفر ہے دور کا آگے اور اپنی رخصت ہے اب
وصل میں کیا کیا صحبتیں رنگیں کس کس عیش میں دن گذرے — تنہا بیٹھ رہے ہیں یک سو ہجر میں یہ صحبت ہے اب
جب سے بنائے صبح ہستی دو دم پر یاں ٹھہرائی — کیا کیا کریے اس مہلت میں کچھ بھی ہمیں فرصت ہے اب
چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زرخواہاں ہیں — چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے اب

پاؤں پہ سر رکھنے کی مجھ کو رخصت دی تھی میرؔ ان نے
کیا پوچھو ہو سر پر میرے منت سی منت ہے اب

(۱۵۷۸)

سارے جتنے نظر آتے ہیں دیکھو تو عیار ہیں سب — زرد و زار و زبوں جو ہم ہیں چاہت کے بیمار ہیں سب
سیل سے ہلکے عاشق ہوں تو جوش و خروش بھریں آویں — تہ پائی نہیں جاتی ان کی دریا سے تہ دار ہیں سب
ایک پریشاں طرفہ جماعت دیکھی چاہنے والوں کی — جینے کے خواہاں نہیں ہیں مرنے کو تیار ہیں سب
کیا کیا خواہش بے کس بے بس مشتاق اس سے رکھتے ہیں — لیکن دیکھ کے رہ جاتے ہیں چپکے سے ناچار ہیں سب

عشق جنھوں کا پیشہ ہووے سینکڑوں ہوں تو ایک ہی ہیں
کوہکن و مجنوں و وامق میرؔ ہمارے یار ہیں سب

(۱۵۷۹)

کاوش سے ان پلکوں کی رہتی ہے خلش سی جگر میں اب — سیدھی نظر جو اس کی نہیں ہے یاس ہے اپنی نظر میں اب
موسم گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے — دل کھنچتا ہے جانب صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب
نقش نہیں پانی میں ابھرتا یہ تو کوئی اچنبھا ہے — صورت خوب اس کی ہے پھرتی اکثر چشم تر میں اب
ایک جگہ پر جیسے بھنور ہیں لیکن چکر رہتا ہے — یعنی وطن دریا ہے اس میں چار طرف ہیں سفر میں اب

حسرت نے ملنے کی آیا میرؔ تمھارا خون پیا
تیغ و تبر اس ترک بچے ظالم کی نہیں ہے کمر میں اب

(۱۵۸۰)

باہم ہوئی ہے ترک ملاقات کیا سبب — اب کم بہت ہے ہم پہ عنایات کیا سبب
ہم تو تمھارے حسن کی حیرت سے ہیں خموش — تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب
ہم تیرہ روز آپ سے تم بن سحر گئے — آئے نہ تم ہمارے کنے رات کیا سبب
اس کی نگاہ مست تو اودھر نہیں پڑی — مسجد جو ہوگئی ہے خرابات کیا سبب

تھا مرتبہ ہمیشہ سگ یار کا بلند
ہے میرؔ سے سلوک مساوات کیا سبب

(۱۵۸۱)

دل کے گئے بیکس کہلائے ایسا کہاں ہمدم ہے اب — کون ایسے محروم غمیں کا ہم راز و محرم ہے اب
سینہ زنی سے غم زدگی ہے سر دھنا ہے رونا ہے — دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب
سن کر حال کسو کے دل کا رونا ہی مجھ کو آتا تھا — یعنی کبھو جو کڑھتا تھا میں وہ رونا ہر دم ہے اب
زردی چہرہ تن کی نزاری بیماری پھر چاہت ہے — دل میں غم ہے مژگاں نم ہیں حال بہت درہم ہے اب
دیکھیں دن کٹتے ہیں کیونکر راتیں کیونکے گذرتی ہیں — بیتابی ہے زیادہ زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب
عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے — خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب

ملنے والو پھر ملیے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میرؔ فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

ردیف ت

(۱۵۸۲)

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت — انچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت
کافر مسلم دونوں ہوئے پر نسبت اس سے کچھ نہ ہوئی — بہت لیے تسبیح پھرے ہم پہنا ہے زنار بہت
ہجر نے جی ہی مارا ہمارا کیا کہیے کیا مشکل ہے — اس سے جدا رہنا ہتا ہے جس سے ہمیں ہے پیار بہت
منہ کی زردی تن کی نزاری چشم تر پر چھائی ہے — عشق میں اس کے یعنی ہم نے کھینچے ہیں آزار بہت
کہہ کے تغافل ان نے کیا تھا لیکن تقصیر اپنی ہے — کام کھنچا جو تیغ تک اس کی ہم نے کیا اصرار بہت
حرف وسخن اب تنگ ہوا ہے ان لوگوں کا ساتھ اپنے — منہ کرنے سے جن کی طرف آتی تھی ہم کو عار بہت

رات سے شہرت اس بستی میں میرؔ کے اٹھ جانے کی ہے
جنگل میں جو جلد بسا جا شاید تھا بیمار بہت

(۱۵۸۳)

باد صبا نے اہل چمن میں اس چہرے کی چلائی بات — اس لب و لہجے پر بلبل کو اس کے آگے نہ آئی بات
دور تلک قاصد کے پیچھے کچھ کہتا میں جاتا تھا — شوق ستم کش ظالم نے کیا رفتہ رفتہ بڑھائی بات
آگ ہوا آتے ہی میرے لال آنکھیں کر گھور رہا — کیا جانوں سرگوشی میں کیا غیر نے اس سے لگائی بات
لعل کو نسبت ان ہونٹوں سے دینا سب کا تصنع تھا — کچھ بن آئی جب نہ کسو سے تب یہ ایک بنائی بات

غیر سے کچھ کچھ کہتا تھا سو سامنے سے میرؔ آیا میں
پھیر لیا منہ میری طرف سے یعنی مجھ سے چھپائی بات

(۱۵۸۴)

زرد ہیں چہرے سوکھ گئے ہیں یعنی ہیں بیمار بہت
عشق کی گرمی دل کو پہنچی کہتے ہی آزار بہت

نالہ و زاری سے عاشق کی کیا ابر بہاری طرف ہوگا
دل ہے نالاں حد سے زیادہ آنکھیں ہیں خونبار بہت

برسوں ہوئے اب ہم لوگوں سے آنکھ انھوں کی نہیں ملتی
برسوں تک آپس میں رہا ہے اپنے جنھوں کے پیار بہت

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے
یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

سو غیروں میں ہو عاشق تو ایک اسی سے شرماویں
اس مستی میں آنکھیں اس کی رہتی ہیں ہشیار بہت

کم ہے ہمیں امید بہی سے اتنی نزاری پر اس کی
پچھلے دنوں دیکھا تھا ہم نے عاشق تھے بیمار بہت

میر نہ ایسا ہووے کہیں پردے ہی پر وہ مار مرے
ڈر لگتا ہے اس سے ہم کو ہے وہ ظاہردار بہت

(۱۵۸۵)

چپکے کڑھا ٹکڑے ہوتا ہوں ساری ہے الفت کی بات
تیغ نے اس کی کیا ہے قسمت یہ بھی ہے قسمت کی بات

جان مسافر ہو جائے گی لب پر ہے موقوف آہ
سب کچھ کہیو جاتے ہوئے تم مت کہیو رخصت کی بات

کہہ کے فسانہ عشق و وفا کا لوگ محبت کرتے تھے
اب وہ ناز کہانی ان کی گویا ہے مدت کی بات

درد و غم کی گرفتاری سے مہلت ہو تو کچھ کہیے
حرف زدن اشعار شعاری یہ سب ہے فرصت کی بات

کس کو دماغ جواب رہا ہے ضعف سے اب خاموش رہے
پہروں بکنا نصیحت گر سے میر یہ ہے طاقت کی بات

(۱۵۸۶)

چشم رہتی ہے اب پرآب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے
تاب دل کم ہے پیچ و تاب بہت

دیر افسوس کرتے رہیے گا
عمر جاتی رہی شتاب بہت

مہر و لطف و کرم عنایت کم
ناز و خشم و جفا عتاب بہت

بے تفاوت ہے فرق آپس میں
وے مقدس ہیں میں خراب بہت

پشت پا پر ہے چشم شوخ اس کی
ہائے رے ہم سے ہے حجاب بہت

دختر رز سے رہتے ہیں محشور
شیخ صاحب ہیں کس کباب بہت

آویں محشر میں کیوں نہ پاے حساب
ہم بھی کرتے ہیں حساب بہت

واں تک اپنی دعا پہنچتی نہیں
عالی رتبہ ہے وہ جناب بہت

گل کے دیکھے کا غش گیا ہی نہ میر
منھ پہ چھڑکا مرے گلاب بہت

(۱۵۸۷)

اچنتی سی لگی اپنے تو وہ تلوار یا قسمت
ہوئے جس کے لگے کارآمدہ بیکار یا قسمت

ہوئے جب سو جواں یک جا توقع سی ہوئی ہم کو
نگہ تیز ان نے سو ایدھر نہ کی دو بار یا قسمت

پڑا سایہ نہ اس کی تیغ خوں آلودہ کا سر پر
کہے ہیں یوں تو قسمت ان نے کیا کیا وار یا قسمت

رہا تھا زیر دیوار اس کی میں برسات میں جاکر
گری اس مینھ میں سر پر وہی دیوار یا قسمت

موئے ہم تشنہ لب دیدار کے حالانکہ گریاں تھے
نصیب اپنے کہ سوکھی چشم دریابار یا قسمت

درمسجد پہ ہوکر بےنوا بیٹھے ہیں یا بادی
ہمیں تھے ورنہ میخانے میں تکیہ دار یا قسمت

نصیبوں میں ہے جن کے عشق وہ بھی میر جیتے ہیں
جیے ہیں ہم بھی جو مرنے کو تھے تیار یا قسمت

ردیف ث

(۱۵۸۸)

دل کو اس بے مہر سے ہم نے لگایا ہے عبث
مہر کی رکھ کر توقع جی کھپایا ہے عبث

دیکھ کر اس کو کھڑے سو جی سے ہم عاشق ہوئے
بیٹھے بیٹھے ناگہاں یہ رنج اٹھایا ہے عبث

اپنی تو بگڑی ہی کوئی کام کی صورت نہیں
ان نے بےلطفی سے منھ اچھا بنایا ہے عبث

جی کے جاتے وہ جو نوخط آتا تو بابت بھی تھی
لطف کر مردے پہ عاشق کے اب آیا ہے عبث

تب تو خانہ باغ سے اپنے نہ پوچھی بات بھی
کیا جو تربت پر مری اب پھول لایا ہے عبث

رات دن سنتا ہے نالے یوں نہیں کہتا کبھو
میر دل آزردہ کو کن نے ستایا ہے عبث

ردیف ج

(۱۵۸۹)

کس تازہ مقتل پہ کشندے تیرا ہوا ہے گذارا آج
زہ دامن کی بھری ہے لہو سے کس کو تو نے مارا آج

کل تک ہم نے تم کو رکھا تھا سو پردے میں کلی کے رنگ
صبح شگفتہ گل جو ہوئے تم سب نے کیا نظارہ آج

کوئی نہیں شاہان سلف میں خالی پڑے ہیں دونوں عراق
یعنی خود گم اسکندر ہے ناپیدا ہے دارا آج

چشم مشتاق اس لب و رخ سے لحظہ لحظہ اٹھی نہیں
کیا ہی لگے ہے اچھا اس کا مکھڑا پیارا پیارا آج

اب جو نسیم معطر آئی شاید بال کھلے اس کے
شہر کی ساری گلیاں ہوگئیں گویا عنبر سارا آج

کل ہی جوش و خروش ہمارے دریا کے سے تلاطم تھے
دیکھ ترے آشوب زماں کے کر بیٹھے ہیں کنارہ آج

چشم چرائی دور سے کر وا مجھ کو لگا یہ کہہ کے گیا — صید کریں گے کل ہم آکر ڈال چلے ہیں چارا آج
کل ہی زیاں جیوں کے کیے ہیں عشق میں کیا کیا لوگوں نے — سادگی میری چاہ میں دیکھو میں ڈھونڈوں ہوں چارہ آج
میر ہوئے ہو بےخود کب کے آپ میں بھی تو ٹک آؤ
ہے دروازے پر انبوہ اک رفتۂ شوق تمھارا آج

(۱۵۹۰)

شہر سے یار سوار ہوا جو سواد میں خوب غبار ہے آج — وحشی و طیر اس کے سر تیزی ہی میں شکار ہے آج
برافروختہ رخ ہے اس کا کس خوبی سے مستی میں — پی کے شراب شگفتہ ہوا ہے اس نوگل پہ بہار ہے آج
اس کا بحر حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے — شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج
آنکھیں اس کی لال ہوئیں ہیں اور چلے جاتے ہیں سر — رات کو دارو پی سویا تھا اس کا صبح خمار ہے آج
گھر آئے ہو فقیروں کے تو آؤ بیٹھو لطف کرو — کیا ہے جان بن اپنے کنے سو ان قدموں پہ نثار ہے آج
کیا پوچھو ہو سانجھ تلک پہلو میں کیا کیا تڑپا ہے — کل کی نسبت دل کو ہمارے بارے کچھ تو قرار ہے آج
مت چوکو اس جنس گراں کو دل کی وہیں لے جاؤ تم — ہندستان میں ہندو بچوں کی بہت بڑی سرکار ہے آج
خوب جو آنکھیں کھول کے دیکھا شاخ گل سا نظر آیا — ان رنگوں پھولوں میں ملا کچھ محو جلوۂ یار ہے آج
جذب عشق جدھر چاہے لے جائے ہے محمل لیلیٰ کا — یعنی ہاتھ میں مجنوں کے ناقے کی اس کے مہار ہے آج
رات کا پہنا ہار جو اب تک دن کو اتارا ان نے نہیں
شاید میر جمال گل بھی اس کے گلے کا ہار ہے آج

(۱۵۹۱)

رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج — لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج
سر بہ فلک ہونے کو ہے کس کی خاک
گرد یک اٹھتی ہے بیاباں سے آج

(۱۵۹۲)

کہوں سو کیا کہوں نے صبر نے قرار ہے آج — جو اس چمن میں یہ اک طرفہ انتشار ہے آج
سر اپنا عشق میں ہم نے بھی یوں تو پھوڑا تھا — پر اس کو کیا کریں اوروں کا اعتبار ہے آج
گیا ہے جانب وادی سوار ہوکر یار — غبار گرد پھرے ہے بہت شکار ہے آج
جہاں کے لوگوں میں جس کی تھی کل تئیں عزت — اسی عزیز کو دیکھا ذلیل و خوار ہے آج
سحر سواد میں چل زور پھولی ہے سرسوں — ہوا ہے عشق سے کل زرد کیا بہار ہے آج
سواری اس کی ہے سرگرم گشت دشت مگر — کہ خیرہ تیرہ نمودار یک غبار ہے آج

سپہر چھڑیوں میں کل تک پھرے تھا ساتھ اپنے
عجب ہے سب کا اسی سفلے پر مدار ہے آج

بخار دل کا نکالا تھا درد دل کہہ کر
سو درد سر ہے بدن گرم ہے بخار ہے آج

کسو کے آنے سے کیا اب کہ غش ہے کل دن سے
ہمیں تو اپنا ہی اے میر انتظار ہے آج

ردیف چ

(۱۵۹۳)

آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان کے بیچ
کیا عاشق ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جہان کے بیچ

پایہ اس کی شہادت کا ہے عرش عظیم سے بالاتر
جو مظلوم عشق موا ہے بڑھ کر تک میدان کے بیچ

یوں ہی نظر چڑھ رہتی نہیں کچھ حسرت میں تو چشم سفید
دیکھی ہے ہیرے کی دمک میں اس چشم حیران کے بیچ

وہ پرکالہ آتش کا ہے صبح تلک بھڑکا بھی نہ تھا
کیا جانوں کیا پھونک دیا لوگوں نے اس کے کان کے بیچ

وعدے کرو ہو برسوں کے تم دم کا بھروسا ہم کو نہیں
کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے یاں اک پل میں اک آن کے بیچ

تتبعیت سے جو فارسی کی میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

بندے خدائے پاک کے ہم جو میر نہیں تو زیر فلک
پھر یہ تقدس آیا کہاں سے مشت خاک انسان کے بیچ

(۱۵۹۴)

فصل گل میں اسیر ہوئے تھے من ہی کی رہی من کے بیچ
اب یہ ستم تازہ ہے ہم پر قید کیا ہے چمن کے بیچ

یہ الجھاؤ سلجھتا ہم کو دے ہے دکھائی مشکل سا
یعنی دل اٹکا ہے جا کر ان بالوں کے شکن کے بیچ

وہ کرتا ہے جب زباں درازی حیرت سے ہم چپکے ہیں
کچھ بولا نہیں جاتا یعنی اس کے حرف و سخن کے بیچ

دشت بلا میں جاکر مریے اپنے نصیب جو سیدھے ہوں
واں کی خاک عنبر کی جاگہ رکھ دیں لوگ کفن کے بیچ

کبک کی جان مسافر ہووے دیکھے خرام ناز اس کا
نام نہیں لیتا ہے کوئی اس کا میرے وطن کے بیچ

کیا شیریں ہے حرف و حکایت حسرت ہم کو آتی ہے
ہائے زبان اپنی بھی ہووے یک دم اس کے دہن کے بیچ

غم و اندوہ عشق سے ہر لحظہ نکلتی رہتی ہے
جان غلط کر میر آئی ہے گویا تیرے بدن کے بیچ

(۱۵۹۵)

اس کے رنگ کھلا ہے شاید کوئی پھول بہار کے بیچ
شور پڑا ہے قیامت کا سا چار طرف گلزار کے بیچ

رحم کرے وہ ذرا ذرا تو دیکھنے آوے دم بھر یاں
اب تو دم بھی باقی نہیں ہے اس کے کسو بیمار کے بیچ

چین نہ دے گا خاک کے نیچے ہرگز عشق کے ماروں کو   دل تو ساتھ اے کاش نہ گاڑیں ان لوگوں کے مزار کے بیچ
چشم شوخ سے اس کی یارو کیا نسبت ہے غزالوں کو   دیکھتے ہیں ہم بڑا تفاوت شہری اور گنوار کے بیچ
کون شکار رم خوردہ سے جاکے کہے ٹک پھر کر دیکھ   کوئی سوار ہے تیرے پیچھے گرد و خاک و غبار کے بیچ
رونے سے جو رود بہا تو اس کا کیا ہے یارو عجب   جذب ہوئے ہیں کیا کیا دریا اپنے جیب و کنار کے بیچ

چشمک غمزہ عشوہ کرشمہ آن انداز و ناز و ادا
حسن سوائے حسن ظاہر میرؔ بہت ہیں یار کے بیچ

(۱۵۹۶)

اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ   زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ

بہ بھی گیا میں اندر ہی اندر گداز ہو
دھوکا ہے جوں حباب مرے پیرہن کے بیچ

ردیف ح

(۱۵۹۷)

گھر سے لیے نکلتا ہے تلوار بے طرح   اب ان نے بج بنائی ہے خونخوار بے طرح
جی بچنے کی طرح نظر آتی نہیں کوئی   کرتا ہے میرے خون پہ اصرار بے طرح
چہرہ تو ان نے اپنا بنایا ہے خوب لیک   بگڑا پھرے ہے اب وہ طرحدار بے طرح
کس طرح جائے پکڑی زباں اس کی خشم میں   کہتا ہے بیٹھا متصل اب یار بے طرح

لوہو میں ڈوبے دیکھیو دامان و جیب میرؔ
بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

(۱۵۹۸)

وہ نوبادۂ گلشن خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح   شاخ گل سا جائے ہے لہکا ان نے نئی یہ ڈالی طرح
موندھے چلے ہیں چولی چسی ہے مہری پھنسی ہے بند کسے   اس اوباش نے پہناوے کی اپنے تازہ نکالی طرح

جبہہ نوچا منھ نوچا سب سینہ نوچا ناخن سے
میرؔ نے کی ہے غم غصے میں اپنی یہ بدحالی طرح

ردیف خ

(۱۵۹۹)

جھمک سے اس کے بدن میں ہر ایک جا ہے شوخ   برنگ برق سراپا وہ خودنما ہے شوخ

کسو کی آنکھ تو دیکھے کوئی بلا ہے شوخ — پڑے ہے سینکڑوں جا راہ چلنے میں اس کی

نظر پڑی نہیں کیا اس کی شوخ چشمی میر
حضور یار کے چشم غزال کیا ہے شوخ

(۱۶۰۰)

گلبن چمن کے اس کو جو دیکھتے ہیں گستاخ
کیا تازہ کوئی ان کی نکلی بہار میں شاخ

ردیف د

(۱۶۰۱)

اس سے نہ الفت ہو مجھ کو تو ہووے نہ میرا چہرہ زرد — ہاتھ نہ رکھوں کیوں دل پر میں رنج و بلا ہے قیامت درد
ملنے میں خنکی ہی کرتا وہ کاشکے پہلے چاہ کے دن — گرمی نہ ہوتی آپس میں تو کھنچتی نہ ہر دم آہ سرد

برسوں میں اقلیم جنوں سے دو دیوانے نکلے تھے
میر آوارۂ شہر ہوا ہے قیس ہوا ہے بیاباں گرد

(۱۶۰۲)

کہتے ہو تم کہ یکسر مجھ میں وفا ہے شاید — متروک رسم جور و ظلم و جفا ہے شاید
کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بےنیازی — قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہے شاید
یاں کچھ نہیں ہے باقی اس کے حساب لیکن — مجھ میں شمار دم سے اب کچھ رہا ہے شاید
قید فراق سے تو چھوٹیں جو مر رہیں ہم — اس درد بے دوا کی مرنا دوا ہے شاید

یہ عشق ہے یقینی حال ایسا کم سنا ہے
اے میر دل کسو سے تیرا لگا ہے شاید

(۱۶۰۳)

رکھتا ہے دل کنار میں صدپارہ دردمند — ہر پارہ اس کا پاتے ہیں آوارہ دردمند
تسکین اپنے دل کی جو پاتا نہیں کہیں — جز صبر اور کیا کرے بےچارہ دردمند
اسلامی کفری کوئی ہو ہے شرط درد عشق — دونوں طریق میں نہیں ناکارہ دردمند
قائل ہوئی ہیں سیر کے چشمان خوں فشاں — دیکھیں ہیں آنکھوں لوہو کا فوارہ دردمند
کیا کام اس کو یاں کے نشیب و فراز سے — رکھتا ہے پاؤں دیکھ کے ہموارہ دردمند
اس کارواں سرائے کے ہیں لوگ رفتنی — حسرت سے ان کا کرتے ہیں نظارہ دردمند

سو بار حوصلے سے اگر رنج کش ہو میر
پھر فرط غم سے مر رہے یک بارہ دردمند

(۱۶۰۴)

ہے عشق کا فسانہ میرا نہ یاں زباں زد
ہر شہر میں ہوئی ہے یہ داستاں زباں زد

حسرت سے حسن گل کی چپکا ہوا ہوں ورنہ
طیران باغ میں ہوں میں خوش زباں زباں زد

مذکور عاشقی کا ہر چار سو ہے باہم
یعنی نہیں کہانی میری کہاں زباں زد

فرہاد و قیس و وامق ہر یک سے پوچھ لو تم
شہروں میں عشق کے ہوں میں ناتواں زباں زد

کیا جانے میر کس کے غم سے ہے چپ وگرنہ
حرف و سخن میں کیا ہی ہے یہ جواں زباں زد

(۱۶۰۵)

کیا کہیے ہوئے مملکت ہستی میں وارد
بے یار و دیار اب تو ہیں اس بستی میں وارد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

(۱۶۰۶)

کچھ تدبیر بتاؤ ہم کو دل اپنا ہے دردآلود
خاک اڑاتے کہاں تک پھریے چہرہ سب ہے گردآلود

ردیف ر

(۱۶۰۷)

اپنے موئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
کیا کیا سینہ زنی رہتی ہے درد و غم کے فسانوں پر

میں تو کیا کیا حرف سخن تھے میرے جہاں سے جاتے رہے
باتیں دردآگیں ہیں اب تک کیسی کیسی زبانوں پر

تو بھی رباط کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابر سیہ قبلے سے آ کر جھوم پڑا میخانوں پر

آمد و رفت نسیم سے ظاہر رنجش بلبل ہے لیکن
باؤ بھی اب تک بہی نہیں گلہائے چمن کے کانوں پر

جیغہ جیغہ اس کی سی ابرو دلکش نکلی نہ کوئی یاں
زور کیے لوگوں نے اگرچہ نقش و نگار کمانوں پر

جان تو یاں ہے گرم رفتن لیت و لعل واں ویسی ہے
کیا کیا مجھ کو جنوں آتا ہے اس لڑکے کے بہانوں پر

بعد مرے سجدے کو میرے ہاتھوں ہاتھ ملک لیں گے
سو سو بار لیا ہے میں نے نام اس کا ان دانوں پر

دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب کچھ ہے معلوم ہمیں
میر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر

راہ چلو تم اپنی اپنی میرے طریق سے کیا تم کو
آنکھوں سے پردہ میں نے کیا ہے واں پاؤں کے نشانوں پر

عشق عجائب زورآور ہے کشتی سب کی پاک ہوئی
ذکر میر ہے کیا پیری میں حرف و سخن ہے جوانوں پر

(١٦٠٨)

کئی داغ ایسے جلائے جگر پر — کہ دے نرگسی زن تھے گلہائے تر پر
گیا میری وادی سے سیلاب بچ کر — نظر یاں جو کی عشق کے شیرنر پر
سر رہ سے اس کے موئے ہی اٹھیں گے — یہ جی جا رہا ہے اسی رہگذر پر
سر اس آستاں پر رگڑتے گئے ہیں — ہوئے خون یاروں کے اس خاک در پر
ہم آتا اسے سن کے جیتوں میں آئے — بنا زندگانی کی ہے اب خبر پر
اسے لطف اس کا ہی لاوے تو لاوے — نہیں وصل موقوف کچھ زور و زر پر
سرکتے نہیں شوق کشتوں کے سر بن — قیامت سا ہنگامہ ہے اس کے در پر
اتر جو گیا دل سے روکش ہو اس کا — چڑھا پھر نہ خورشید میری نظر پر
بھری تھی مگر آگ دل میں دروں میں — ق — ہوئے اشک سوزش سے اس کی شرر پر
گیا پی جو ان آنسوؤں کے تئیں میں — سراسر ہیں اب داغ سطح جگر پر
سرعجز ہر شام تھا خاک پر ہی — ق — تہ دل تھی کیسی ہی آہ سحر پر
پلک اٹھے آثار اچھے نہ دیکھے — پڑی آنکھ ہرگز نہ روئے اثر پر
طرف شاخ گل کی لچک کے نہ دیکھا — نظر میرؔ کی تھی کسو کی کمر پر

غزل در غزل صاحبو یہ بھی دیکھو
نہیں عیب کرتا نظر اک ہنر پر

(١٦٠٩)

بھروسا اسیری میں تھا بال و پر پر — سو پر وا ہوئے نہ قفس کے بھی در پر
سواران شائستہ کشتے ہیں تیرے — نہ تیغ ستم کر علم ہر نفر پر
کھلا پیش دنداں نہ اس کا گرچہ — کنھوں نے بھی تھوکا نہ سلک گہر پر
جلے کیوں نہ چھاتی کہ اپنی نظر ہے — کسو شوخ پرکار رعنا پسر پر
نہ محشر میں چونکا مرا خون خفتہ — وہی تھا یہ خوابیدہ اس شور و شر پر
کئی زخم کھا کر تڑپتا رہا دل — تسلی تھی موقوف زخم دگر پر
سنا تھا اسے پاس لیکن نہ پایا — چلے دور تک ہم گئے اس خبر پر
سر شب کہے تھا بہانہ طلب وہ — ق — گھڑی ایک رات آئی ہوگی پہر پر
کوئی پاس بیٹھا رہے کب تلک یوں — کہو ہوگی رخصت گئے اب سحر پر

جہاں میں نہ کی میرؔ اقامت کی نیت
کہ مشعر تھا آنا مرا یاں سفر پر

(۱۶۱۰)

عشق خدائی خراب ہے ایسا جس سے گئے ہیں گھر کے گھر
کعبہ و دیر کے ایوانوں کے گرے پڑے ہیں در کے در

حج سے جو کوئی آدمی ہو تو سارا عالم حج ہی کرے
مکے سے آئے شیخ جی لیکن وے تو وہی ہیں خر کے خر

رنج و تعب میں مرتے دیکھے ہم نے ممسک دولت مند
جی کے جی بھی عبث جاتے ہیں ان لوگوں کے زر کے زر

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
لتھوں پہ لتھیں گرتی رہیں گی کٹتے رہیں گے سر کے سر

سخت مصیبت عشق میں یہ ہے جانیں چلی جاتی ہیں لیک
ہاتھ سروں پر ماریں گے تو بند رہیں گے گھر کے گھر

کب سے گرمی عشق نے میرے چشمۂ چشم کو خشک کیا
کپڑے گلے سب تن کے لیکن وے ہیں اب تک تر کے تر

نکلے اب کے قفس میں شاید کوئی کلی تو نکلے میر
سارے طیر شگفتہ چمن کے ٹوٹے گئے وے پر کے پر

(۱۶۱۱)

بات کہو کیا چپکے چپکے بیٹھ رہو ہو یاں آکر
ایسے گونگے بیٹھو ہو تم تو بیٹھیے اپنے گھر جا کر

دل کا راز کیا میں ظاہر بلبل سے گلزار میں لیک
اس بے تہ نے صحن چمن میں جان دی چلا چلا کر

جیسا پیچ و تاب پر اپنے بالیدہ تھا ویسا ہی
مار سیہ کو رشک سے مارا ان بالوں نے بل کھا کر

ڈھونڈتے تا اطفال پھریں نہ ان کے جنوں کی ضیافت میں
بھر رکھی ہیں شہر کی گلیاں پتھر ہم نے لا لا کر

ہاہا ہی نے شوخ کی میرے تنگ کیا خوش رویاں کو
سرخ و زرد ہوئے خجلت سے چھوٹے ہاہاہا کر

چاہ کا جو اظہار کیا تو فرط شرم سے جان گئی
عشق شہرت دوست نے آخر مارا مجھ کو رسوا کر

میر یہ کیا روتا ہے جس سے آنکھوں پر رومال رکھا
دامن کے ہر پاٹ کو اپنے گریۂ زار سے دریا کر

(۱۶۱۲)

ٹیڑھی نگاہیں کیا کرتے ہو دم بھر کے یاں آنے پر
ایدھر دیکھو ہم نے نہیں کی خم ابرو مر جانے پر

زور ہوا ہے چل صوفی تک تو بھی رباط کہنہ سے
ابر قبلہ بڑھتا بڑھتا آیا ہے میخانے پر

گل کھائے بے تہ بلبل نے شور قیامت کا سا کیا
دیکھ چمن میں اس بن میرے چپکے جی بہلانے پر

سر نیچے کر لیتا تھا تلوار چلاتے ہم پر وے
ریجھ گئے خوں ریزی میں اپنی اس کے پھر شرمانے پر

گالی مار کے غم پر میں نے صبر کیا خاموش رہا
رحم نہ آیا تک ظالم کو اس میرے غم کھانے پر

نادیدہ ہیں نام خدا کے ایسے جیسے قحط زدہ
دوڑتی ہیں کیا آنکھیں اپنی سبحے کے دانے دانے پر

حال پریشاں سن مجنوں کا کیا جلتا ہے جی اپنا
عاشق ہم بھی میر رہے ہیں اس ڈھب کے دیوانے پر

(۱۶۱۳)

روزوں میں رہ سکیں گے ہم بے شراب کیونکر
گذرے گا اتقا میں عہد شباب کیونکر

تھوڑے سے پانی میں بھی چل نکلے ہے اچھرتا
بے تہ ہے سر نہ کھینچے اک دم حباب کیونکر

چشمے بھرے اب تک ہیں یادگار اس کے
وہ سوکھ سب گئی ہے چشم پرآب کیونکر

دل کی طرف کا پہلو سب متصل جلے ہے
مخمل ہو فرش کیوں نہ آوے گی خواب کیونکر

اول سحور کھانا آخر صبوحی کرنا
آوے نہ اس عمل سے شرم و حجاب کیونکر

اجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کہوں ہوں
اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر

جرم و ذنوب تو ہیں بے حد و حصر یارب
روزحساب لیں گے مجھ سے حساب کیونکر

پیش از سحر اٹھے ہے آج اس کے منھ کا پردہ
نکلے گا اس طرف سے اب آفتاب کیونکر

خط میر آوے جاوے جو نکلے راہ ادھر کی
نبھتا نہیں ہے قاصد لاوے جواب کیونکر

(۱۶۱۴)

تڑپے ہے غم زدہ دل لاوے گا تاب کیونکر
خوں بستہ ہیں گی آنکھیں آوے گی خواب کیونکر

پر ناتواں ہوں مجھ پر بھاری ہے جی ہی اپنا
مجھ سے اٹھیں گے اس کے ناز و عتاب کیونکر

اس بحر میں ہے فنا شکل حباب ہر دم
ابھرا رہے ہمیشہ نقش پرآب کیونکر

پانی کے دھوکے پیاسے کیا کیا عزیز مارے
سر پر نہ خاک ڈالے اپنے سراب کیونکر

آب رواں نہ تھا کچھ وہ لطف زندگانی
جاتی رہی جوانی اپنی شتاب کیونکر

سینے میں میرے کب سے اک سینک ہی رہے ہے
قلب و کبد نہ ہوویں دونوں کباب کیونکر

شلاق خواری کی تھی خجلت جو کچھ نہ بولا
منھ کیا ہے نامہ بر کا نکلے جواب کیونکر

سوز دل و جگر سے جلتا ہے تن بدن سب
میں کیا کوئی ہو کھینچے ایسے عذاب کیونکر

چہرہ کتابی اس کا مجموعہ میر کا ہے
اک حرف اس دہن کا ہٹا کتاب کیونکر

(۱۶۱۵)

لاوے جھمکتے رخ کی آئینہ تاب کیونکر
ہو چہرہ اس کے لب سے یاقوت ناب کیونکر

ہے شعر و شاعری کو کب سے شعار اپنا
حرف و سخن سے کریے اب اجتناب کیونکر

جوں ابر اگر نہ روویں وادی و کوہ پر ہم
تو شہروں شہروں آوے نہروں میں آب کیونکر

اب بھی نہیں ہے ہم کو اے عشق ناامیدی
دیکھیں خراب ہووے حال خراب کیونکر

اڑ اڑ کے جا لگے ہے وہ تیر مار کاکل　　کھاتا رہے نہ افعی پھر پیچ تاب کیونکر
چشمے محیط سے، جو ہووے نہ چشم تر کے　　تو میر ہو ہوا پر پھیلے سحاب کیونکر
اب تو طپش نے دل کی اودھم مچا رکھا ہے　　تسکین پاوے دیکھوں یہ اضطراب کیونکر
رو چاہیے ہے اس کے در پر بھی بیٹھنے کو
ہم تو ذلیل اس کے ہوں میر باب کیونکر

(۱۶۱۶)

سنا تم نے جو گذرا سانحہ ہجراں میں یاروں پر　　قیامت غم سے ہر ساعت رہی الفت کے ماروں پر
کیا ہے عشق عالم کش نے کیا ستھراؤ لوگوں کا　　نکل چل شہر سے باہر نظر کر تک مزاروں پر
تڑپ کر گرم تک جوں برق ٹھنڈے ہوتے جاتے ہیں　　بساں ابر رحمت رو بہت ہم بےقراروں پر
بڑی دولت ہے درویشی جو ہمرہ ہو قناعت کے　　کہ عرصہ تنگ ہے حرص و ہوا سے تاجداروں پر
سیاحت خوب مجھ کو یاد ہے پر کی بھی وحشت کی　　پر اپنا پاؤں پھیلے دشت کے سرتیز خاروں پر
گئے فرہاد و مجنوں ہو کوئی تو بات بھی پوچھیں　　یکایک کیا بلا آئی ہمارے غم گساروں پر
گئی اس ناتوان عشق کے آگے سے پیری ٹل
سبک روحی مری اے میر بھاری ہے ہزاروں پر

(۱۶۱۷)

اک آدھ دن نکل مت اے ابر ادھر سے ہوکر　　بیٹھا ہوں میں ابھی تک سارا جہاں ڈبو کر
اب کل نہیں ہے تجھ کو بےقتل غم کشوں کے　　کہتے تو تھے کہ ظالم خوں ریزی سے نہ خو کر
کہتے ہیں راہ پائی زاہد نے اس گلی کی　　روتا کہیں نہ آوے ایمان و دیں کو کھو کر
ہے نظم کا سلیقہ ہرچند سب کو لیکن　　جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پرو کر
کیا خوب زندگی کی دنیا میں شیخ جی نے　　تعبیر کرتے ہیں سب اب ان کو مردہ شو کر
گو تیرے ہونٹ ظالم آب حیات ہوں اب　　کیا ہم کو جی کی بیٹھے ہم جی سے ہاتھ دھو کر
کس کس ادا سے فتنے کرتے ہیں قصد ادھر کا　　جب بے دماغ سے تم اٹھ بیٹھتے ہو سو کر
ٹکڑے جگر کے میرے مت چشم کم سے دیکھو　　کاڑھے ہیں یہ جواہر دریا کو میں بلو کر
احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

(۱۶۱۸)

عشق ہمارا خون کرے ہے جی نہیں رہتا یار بغیر　　وہ گھر سے نہیں اپنے نکلتا دم بھر بھی تلوار بغیر

جان عزیز کی جاں بھی گئے پر آنکھیں کھلی رہ جائیں گی   یعنی کشتۂ حیرت تھا میں آئینہ سا دیدار بغیر
گوندھے گئے سو تازہ رہے جو سبد میں تھے سوملالت سے   سوکھ کے کانٹا پھول ہوئے وے اس کے گلے کے ہار بغیر
پھولوں کا موسم کا شکے ہو پردے سے ہوا کے چشمک زن   گل کھائے ہیں ہزار خزاں میں مرغ چمن نے بہار بغیر
وحشی وطیر سے دشت بھرے تھے صیادی تھی یار کی جب
خالی پڑے ہیں دام کہیں میر اس کے ذوق شکار بغیر

(۱۶۱۹)

خندہ بجاے گریہ و اندوہ و آہ کر   ماتم کدے کو دہر کے تو عیش گاہ کر
کیا دیکھتا ہے ہر گھڑی اپنی ہی سج کو شوخ   آنکھوں میں جان آئی ہے ایدھر نگاہ کر
رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہد شیخ   اے بیوقوف جاے عبادت گناہ کر
چھوڑ اب طریق جور کو اے بے وفا سمجھ   نبھتی نہیں یہ چال کسو دل میں راہ کر
چسپیدگی داغ سے مت منھ کو اپنے موڑ   اے زخم کہنہ دل سے ہمارے نباہ کر
جیتے جی میرے لینے نہ پاوے طپش بھی دم   اتنی تو سعی تو بھی جگر خوانخواہ کر(۱)
اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر
یک نعرہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

(۱۶۲۰)

شوریدہ سر رکھا ہے جب سے اس آستاں پر   میرا دماغ تب سے ہے ہفتم آسماں پر
گھائل گرا رہا ہے فتراک سے بندھا ہے   کیا کیا ستم ہوئے ہیں اس صید ناتواں پر
لطف بدن کو اس کے ہرگز پہنچ سکے نہ   جا پڑتی تھی ہمیشہ اپنی نگاہ جاں پر
خاشاک و خار و خس کو کر ایک جا جلایا   کیا چشم شور برق خاطف تھی آشیاں پر
وہ باغباں پسر کچھ گل گل شگفتہ ہے اب   یہ اور گل کھلا ہے اک پھولوں کی دکاں پر
پرکالے آگ کے تھے کیا نالہ ہاے بلبل   شبنم سے آبلے ہیں گل برگ سی زباں پر
دل کیا مکاں پھر اس کا کیا صحن میر لیکن
غالب ہے سعی میں تو میدان لامکاں پر

(۱۶۲۱)

آیا نہ پھر ادھر وہ مست شراب ہوکر   کیا پھول مرگئے ہیں اس بن خراب ہوکر
صید زبوں میں میرے یک قطرہ خوں نہ نکلا   خنجر تلے بہا میں خجلت سے آب ہوکر

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

وعدہ وصال کا ہے کہتے ہیں حشر کے دن   جانا ہوا ولیکن واں سے شتاب ہوکر
دارو پیے نہ ساتھ آ غیروں کے بیشتر یاں   غیرت سے رہ گئے ہیں عاشق کباب ہوکر
یک قطرہ آب اس بن میں نے اگر پیا ہے
نکلا ہے میر پانی وہ خون ناب ہوکر

(۱۶۲۲)

ابر سیہ قبلے سے اٹھ کر آیا ہے میخانے پر   بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے کچھ شیشے پر پیمانے پر
رنگ ہوا سے ٹپکنے لگا ہے سبزے میں کوئی پھول کھلا   یعنی چشمک گل کرتا ہے فصل بہار کے آنے پر
شور جنوں ہے جوانوں کے سر میں پاؤں میں زنجیریں ہیں   سنگ زناں لڑکے پھرتے ہیں ہر ہر سو دیوانے پر
بیتابانہ شمع پر آیا گرد پھرا پھر جل ہی گیا   اپنا جی بھی حد سے زیادہ رات جلا پروانے پر
قدر جان جو کچھ ہووے تو صرفہ بھی ہم میر کریں
منھ موڑیں کیا آنے سے اس کے اپنی جان کے جانے پر

(۱۶۲۳)

سعی سے اس کی ہوا مائل گریباں چاک پر   آفریں کر اے جنوں میرے کف چالاک پر
کیوں نہ ہوں طرفہ گلیں خوش طرح بعضی اے کلال   خاک کن کن صورتوں کی صرف کی ہے خاک پر
گل ہوئی کوچے میں اس کے آنے سے بھی اب رہا   ابر تو کاہے کو رویا تھا ہماری خاک پر(۱)
ہم کو مٹی کر دیا پامالی گردوں نے میر
وہ نہ آیا ناز کرتا ٹک ہماری خاک پر

ردیف ز

(۱۶۲۴)

اس بستر افسردہ کے گل خوشبو ہیں مرجھائے ہنوز   اس نکہت سے موسم گل میں پھول نہیں یاں آئے ہنوز
اس زلف و کاکل کو گوندھے دیر ہوئی مشاطہ کو   سانپ سے لہراتے ہیں بال اس کے بل کھائے ہنوز
آنکھ لگے اک مدت گذری پائے عشق جو بیچ میں ہے   ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمائے ہنوز
تہ داری کیا کہیے اپنی سختی سے اس کی جیتے موئے   حرف و سخن کچھ لیکن ہرگز منھ پہ نہیں ہم لائے ہنوز
ایسی معیشت کر لوگوں سے جیسی غم کش میر نے کی
برسوں ہوئے ہیں اٹھ گئے ان کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

---

(۱) نسخۂ محمود آباد

(۱۶۲۵)

کب سے گیا ہے آیا نہیں نامہ بر ہنوز
راہی بھی کچھ سنا نہیں جاتے خبر ہنوز

خون جگر کو سوکھے ہوئے برسوں ہوگئے
رہتی ہیں میری آنکھیں شب و روز تر ہنوز

ہرچند آسماں پہ ہماری دعا گئی
اس مہ کے دل میں کرتی نہیں کچھ اثر ہنوز

مدت سے لگ رہی ہیں مری آنکھیں اس کی اور
وہ دیکھتا نہیں ہے غلط کر ادھر ہنوز

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

تیشے سے کوہکن کے دل کوہ جل گیا
نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز

جل جل کے ہوگیا ہے کبد تو کباب میر
جوں غنچہ ناشگفتہ ہے داغ جگر ہنوز

(۱۶۲۶)

کب سے آنے کہتے ہیں تشریف نہیں لاتے ہیں ہنوز
آنکھیں مندیں اب جا چکے ہم وے دیکھو تو آتے ہیں ہنوز

کہتا ہے برسوں سے ہمیں تم دور ہو یاں سے دفع بھی ہو
شوق و سماجت سیر کرو ہم پاس اس کے جاتے ہیں ہنوز

راتوں پاس گلے لگ سوئے ننگے ہوکر ہے یہ عجب
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہوئے
جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

گل صد رنگ چمن میں آئے بادخزاں سے بکھر بھی گئے
عشق و جنوں کی بہار کے عاشق میر جی گل کھاتے ہیں ہنوز

(۱۶۲۷)

کب سے قیدی ہیں پہ ہے نالش بسیار ہنوز
دل بہاران چمن کا ہے گرفتار ہنوز

وہ مہ چاردہ اس شہر سے کب کا نکلا
ہر گلی جھانکتے پھرتے ہیں طلبگار ہنوز

بالا بالا ہی بہت عشق میں مارے گئے یار
وہ تہ دل سے کسو کا نہ ہوا یار ہنوز

سال میں ابر بہاری کہیں آ کر برسا
لوہو برسا رہے ہیں دیدۂ خونبار ہنوز

اب کے بالیدن گلہا تھا بہت دیکھو نہ میر
ہمسر لالہ ہے خار سر دیوار ہنوز

(۱۶۲۸)

سرکش ہے تندخو ہے عجب ہے زباں دراز
آتش کا ایسا لائحہ کب ہے زباں دراز

پروانہ تیری چرب لساں سے ہوا ہلاک
ہے شمع تو تو کوئی غضب ہے زباں دراز

ردیف س

(۱۶۲۹)

یار ہم سے جدا ہوا افسوس   نہ جدا ہو کے پھر ملا افسوس
جب تلک آن کر رہے مجھ پاس   مجھ میں تب تک نہ کچھ رہا افسوس
دل میں حسرت گرہ ہے رخصت کی   چلتے ان نے نہ کچھ کہا افسوس
کیا تدارک ہے عشق میں دل کا   میں بلا میں ہوں مبتلا افسوس
سب سے بیگانگی کی جس کے لیے   وہ نہیں ہم سے آشنا افسوس
رات دن ہاتھ ملتے رہتے ہیں   دل کے جانے کا ہے بڑا افسوس
باچھیں پھٹ پھٹ گئیں ہیں گھگھیاتے   بے اثر ہوگئی دعا افسوس
مجھ کو کرنا تھا احتراز اس سے   ہائے افسوس کیا کیا افسوس
نوش دارو ہے نیش دارو میر
متاثر نہیں دوا افسوس

(۱۶۳۰)

کوئی دن کریے معیشت جا کسو کامل کے پاس   ناقصوں میں رہیے کیا رہیے تو صاحب دل کے پاس
بوے خوں بھک بھک دماغوں میں چلی آتی ہے کچھ   نکلی ہے ہوکر صبا شاید کسو گھائل کے پاس
شور و ہنگامہ بہت دعویٰ ضروری ہے بہت   کاشکے مجھ کو بلادیں حشر میں قاتل کے پاس
گرد سے ہے ناقۂ سلمیٰ کو مشکل رہروی   خاک کس کی ہے کہ مشتاق آتی ہے محمل کے پاس
تل سے تیرے منھ کے دل تھا داغ اے برنائے چرب   خال یہ اک اور نکلا ظالم اگلے تل کے پاس
دل گداز عشق سے سب آب ہوکر بہ گیا   مرگئے پر گور میری کریے تو بے دل کے پاس
ملیے کیونکر نہ کف افسوس جی جاتا ہے میر
ڈوبتی ہے کشتی ورطے سے نکل ساحل کے پاس

(۱۶۳۱)

صد پارہ گلا تیرا ہے کر ضبط نفس بس   سنتا نہیں اس قافلے میں کوئی جرس بس
دنیا طلبی نفس نہ کر شومی سے جوں سگ   تھک کر کہیں ٹک بیٹھ رہ اے ہرزہ مرس بس

خنداں نہ مرے قتل میں رکھ تیغ کو پھر سان   جوں گل یہ ہنسی کیا ہے اسیروں پہ نہ ہنس بس
اس زار نے ہاتھ ان کا جو کھینچا لگے کہنے   غش کرنے نہ لگ جاؤں کہیں چھوڑیے بس بس
کیا میر اسیروں کو در باغ جو وا ہو
ہے رنگ ہوا دیکھنے کو چاک قفس بس

(۱۶۳۲)

آنکھ کھلتے گئی بہار افسوس   گل کو دیکھا بھی نہ ہزار افسوس
جس کی خاطر ہوئے کنارہ گزیں   نہ ہوئے اس سے ہم کنار افسوس
نہ معرف نہ آشنا کوئی   ہم ہیں بے یار و بے دیار افسوس
بے قراری نے یوں ہی جی مارا   اس سے نے عہد نے قرار افسوس
خوں ہوئی دل ہی میں امید وصال   مر رہے جی کو مار مار افسوس
چارۂ اشتیاق کچھ نہ ہوا   وہ نہ ہم سے ہوا دوچار افسوس
اک ہی گردش میں اس کی آنکھوں کی   پھر گیا ہم سے روزگار افسوس
گور اپنی رہی گذرگہ میں   نہ ہوا یار کا گذار افسوس
منتظر ہی ہم اس کے میر گئے
یاں تک آیا کبھو نہ یار افسوس

(۱۶۳۳)

کیا کیا تم نے ہم سے کہا تھا کچھ نہ کیا افسوس افسوس   کیا کیا کڑھایا جی سے مارا لوہو پیا افسوس افسوس
نور چراغ جان میں تھا کچھ یوں ہی نہ آیا لیکن وہ   گل ہو ہی گیا آخر کو یہ بجھتا سا دیا افسوس افسوس
رخصت میں پابوس کی سب کے جی جاتا تھا سوال نے   ہاتھ میں عاشق وارفتہ کا دل نہ لیا افسوس افسوس
میر کی آنکھیں مندنے پر وہ دیکھنے آیا تھا ظالم
اور بھی یہ بیمار محبت تک نہ جیا افسوس افسوس

ردیف ش

(۱۶۳۴)

رکھتے رہے بتوں سے مہر و وفا کی خواہش   اس آرزو نے مارا یہ بھی خدا کی خواہش
بیماری دلی پر میں صبر کر رہا ہوں   جی کو نہیں ہے میرے مطلق دوا کی خواہش
شب وصل کی میسر آئی نہ ایک دن بھی   دل کو یہی ہمارے اکثر رہا کی خواہش

چاہت بہت کسو کی اے ہمنشیں بری ہے　　سو جان کی ہے کاہش اک اس ادا کی خواہش
مشتاق عاشق کا عاقل کوئی نہ ہوگا　　ابلہ کسو کو ہوگی اس بدبلا کی خواہش
عجز و انابت اپنی یوں ہی تھی صبح گہ کی　　درویشوں سے کریں گے اب ہم دعا کی خواہش
حیران کار الفت اے میر چپ ہوں میں تو
پوچھا کرو ہو ہردم کیا بےنوا کی خواہش

(۱۶۳۵)

رنج و غم آئے بیشتر درپیش　　راہ رفتن ہے اب مگر درپیش
مرگ فرہاد سے ہوا بدنام　　ہے خجالت سے تیشہ سردرپیش
یار آنکھوں تلے ہی پھرتا ہے　　میری مدت سے ہے نظر درپیش
خانہ روشن پتنگوں نے نہ کیا　　ہے چراغوں کو بھی سحر درپیش
غم سے نزدیک مرنے کے پہنچے
دور کا میر ہے سفر درپیش

(۱۶۳۶)

کرکریں ہیں لجوں لطموں کے دڑبڑے سب کے گوش　　بیکراں دریاے غم کے ہیں بلا جوش و خروش
صومعے کو اس ہواے ابر میں دیتے ہیں آگ　　میکدے سے باہر آتے ہی نہیں ذی عقل و ہوش
تنگ چولی سوجگہ سے کسمساتے ہی چلی　　تنگ درزی سے کبھی ملتا نہیں وہ تنگ پوش
وائے رے پروانہ کیسا چپکے جل کر رہ گیا　　گری پہنچے کیا اچھلتا ہے سپند ہرزہ کوش
کیسا خودگم سر بکھیرے میر ہے بازار میں
ایسا اب پیدا نہیں ہنگامہ آرا دل فروش

(۱۶۳۷)

ادھر آتا بھی وہ سوار اے کاش　　اس کا ہو جاتا دل شکار اے کاش
زیر دیوار خانہ باغ اس کے　　ہم کو جا ملتی خانہ دار اے کاش
کب تلک بےقرار رہیے گا　　کچھ تو ملنے کا ہو قرار اے کاش
راہ تکتے تو پھٹ گئیں آنکھیں　　اس کا کرتے نہ انتظار اے کاش
اس کی پامالی سرفرازی ہے　　راہ میں ہو مری مزار اے کاش
پھول گل کچھ نہ تھے کھلی جب چشم　　اور بھی رہتی اک بہار اے کاش

اب وہی میرؔ جی کھپاتا ہے
ہم کو ہٹا نہ اس سے پیار اے کاش

(۱۶۳۸)

غصے میں ناخنوں نے مرے کی ہے کیا تلاش
تلوار کا سا گھاؤ ہے جبہے کا ہر خراش

صحبت میں اس کی کیونکے رہے مرد آدمی
وہ شوخ و شنگ و بے تہ و اوباش و بدمعاش

بے رحم تجھ کو ایک نظر کرنی تھی ادھر
کشتے کے تیرے ٹکڑے ہوئے لے گئے بھی لاش

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بودو باش

عمر عزیز یاس ہی میں جاتی ہے چلی
امیدوار اس کے نہ ہم ہوتے میرؔ کاش

ردیف ص

(۱۶۳۹)

شاعری شیوہ ہے شعار اخلاص
دین و مذہب مرا ہے پیار اخلاص

اب کہاں وہ مؤدت قلبی
ہووے ظاہر میں یوں ہزار اخلاص

سورۃ اخلاص کی پڑھی برسوں
میرؔ رکھتا نہیں ہے یار اخلاص

ردیف ض

(۱۶۴۰)

عالم علم سے اس عالم میں ہر لحظہ طاری ہے فیض
ہے معلوم کہ عالم عالم پھر یاں وہ جاری ہے فیض

سنگ و شجر ہیں پانی پون ہیں غنچہ و گل ہیں بار و بر
عالم ہژدہ ہزار جو ہیں یہ سب میں وہ ساری ہے فیض

ردیف ط

(۱۶۴۱)

جس کو ہوا ہے اس صنم بے وفا سے ربط
اس کو خدا ہی ہووے تو ہو کچھ خدا سے ربط

گل ہو کے برگ برگ ہوئے پھر ہوا ہوئے
رکھتے ہیں اس چمن کے جو غنچے صبا سے ربط

زنہار پشت پا سے نہیں اٹھتی اس کی آنکھ
اس چشم شرگیں کو بہت ہے حیا سے ربط

شاید اسی کے ہاتھ میں دامن ہو یار کا
ہو جس ستم رسیدہ کو دست دعا سے ربط

کرتی ہے آدمی کو دنی صحبت فقیر
اچھا نہیں ہے میرؔ سے بے تہ گدا سے ربط

(۱۶۴۲)

عشق کو جرأت و جگر ہے شرط
زردی رنگ و چشم تر ہے شرط

بے خبر حال سے نہ رہ میرے
میں کہے رکھتا ہوں خبر ہے شرط

حج کو جاوے تو شیخ کو لے جا
کعبے جانے کو یہ بھی خر ہے شرط

پیسوں پر ریجھتے ہیں یہ لڑکے
عشق سیمیں تناں کو زر ہے شرط

خام رہتا ہے آدمی گھر میں
پختہ کاری کے تیں سفر ہے شرط

خبث یاروں کا کر فسانوں میں
عیب کرنے کو بھی ہنر ہے شرط

لعل پارے ہیں میرؔ لخت جگر
دیکھ کر خون رو نظر ہے شرط

(۱۶۴۳)

رکھتا ہے میرے دل سے تمھارا غم اختلاط
ہر لحہ لحظہ آن و زماں ہر دم اختلاط

ہم وے ملے ہی رہتے ہیں مردم کی شکل کیا
ان صورتوں میں ہوتا نہیں باہم اختلاط

شیریں لباں جہاں کے نہیں چھوٹ جانتے
ہوں گو کہ میرؔ صاحب و قبلہ کم اختلاط

ردیف ظ

(۱۶۴۴)

لطف جوانی کے ساتھ گئے پیری نے کیا ہے کیا محظوظ
کیونکے جئیں یارب حیرت ہے بے مزہ ایسے نامحظوظ

رونے کڑھنے کو عیش کہو ہو ہم تو تمھارے دعا گو ہیں
یوں ہی ہمیشہ عشق میں اس کے رکھے ایسا خدا محظوظ

زردی منھ کی اشک کی سرخی دونوں اب تو رنگ پہ ہیں
شاید میرؔ بہت رہتے ہو اس سے ہو کے جدا محظوظ

ردیف ع

(۱۶۴۵)

لیے داغ سر پر جو آئی تھی شمع
سحر تک سب ان نے ہی کھائی تھی شمع

پتنگے کے حق میں تو بہتر ہوئی
اگر موم کی بھی بنائی تھی شمع

نہ اس مہ سے روشن تھی شب بزم میں
نکالا تھا اس کو چھپائی تھی شمع

وہی ساتھ تھا میرے شب گیر میں
کہ تاب اس کے رخ کی نہ لائی تھی شمع

پتنگ اور وہ کیوں نہ باہم جلیں
کہیں سے مگر اک لگ آئی تھی شمع

فروغ اس کے چہرے کا تھا پردہ در
ہوا کیا جو ہم نے بجھائی تھی شمع

تف دل سے میر اک کف خاک ہے
مری خاک پر کیوں جلائی تھی شمع

(۱۶۴۶)

کیا جھمکا فانوس میں اپنا دکھلاتی ہے دور سے شمع
وہ منھ تک اودھر نہیں کرتا داغ ہے اس کے غرور سے شمع

وہ بیٹھا ہے جیسے نکلے چودھویں رات کا چاند کہیں
روشن ہے کیا ہوگی طرف اس طرح رخ پر نور سے شمع

آگے اس کے فروغ نہ تھا جلتی تھی بجھی سی مجلس میں
تب تو لوگ اٹھا لیتے تھے شتابی اس کے حضور سے شمع

جلنے کو آتی ہیں جو ستیاں میر سنبھل کر جلتی ہیں
کیا بے صرفہ رات جلی بے بہرہ اپنے شعور سے شمع

(۱۶۴۷)

آتی ہے مجلس میں تو فانوس میں آتی ہے شمع
وہ سراپا دیکھ کر پردے میں جل جاتی ہے شمع

ردیف غ

(۱۶۴۸)

غم کھنچا رائگاں دریغ دریغ
ہم ہوئے خستہ جاں دریغ دریغ

عشق میں جی بھی ہم گنوا بیٹھے
ہو گیا کیا زیاں دریغ دریغ

سب سے کی دشمنی جنھوں کے لیے
وے ہیں نامہرباں دریغ دریغ

قطع امید ہے قریب اس سے
تیغ ہے درمیاں دریغ دریغ

دل گئے پر نہ درد نے تسبیح
کہتے ہیں ہر زماں دریغ دریغ

اٹھنے دیتا نہیں شکستہ دل
ڈھہ گیا کیا مکاں دریغ دریغ

تب کھلی آنکھ میر اپنی جب
جاچکا کارواں دریغ دریغ

(۱۶۴۹)

ہم کو شہر سے اس مہ کے ہے عزم راہ دروغ دروغ
یہ حرکت تو ہم نہ کریں گے خانہ سیاہ دروغ دروغ

الفت کلفت کون کہے ہے چاہ گناہ لکھا کن نے
بے دردی سے وے رکھتے ہیں یہی گناہ دروغ دروغ

شیخ کو وہ تو جھوٹ کہے ہے جھوٹ کو کیوں کر جھوٹ کہیں
اہل درد جو کوئی ہو تو کہیے آہ دروغ دروغ

عشق کے مارے غمزدگاں سے اُنس کرے بہتان و کذب
اس بے مہر کی ہم لوگوں سے الفت چاہ دروغ دروغ

کس دلبر کو شوق سے دیکھا میر غلط ہے تہمت ہے
منھ پہ کسو کے پڑی نہیں ہے گاہ نگاہ دروغ دروغ

(۱۶۵۰)

کیا کہیے میاں اب کے جنوں میں سینہ اپنا یکسر داغ
ہاتھ گلوں سے گلدستے ہیں شمع نمط ہے سر پر داغ

داغ جلائے فلک نے بدن پر سرو چراغاں ہم کو کیا
کہاں کہاں اب مرہم رکھیں جسم ہوا ہے سراسر داغ

صحبت درگیر آگے اس کے پہر گھڑی ساعت نہ ہوئی
جب آئے ہیں گھر سے اس کے تب آئے ہیں اکثر داغ

غیر کو دیکھ کے اس مجلس میں غیرت عشق سے آگ لگی
اچھلے کودے سپند نمط ہم ہوگئے آخر جل کر داغ

جلتی چھاتی پہ سنگ زنی کی سختی ایام سے میر
گرمی سے میری آتش دل کی سارے ہوئے وے پتھر داغ

ردیف ف

(۱۶۵۱)

دیکھ نہ ہردم اے عاشق قاتل کی تیغ جفا کی طرف
کوئی نظر کر عبرت آگیں اس کے ناز و ادا کی طرف

چار طرف سے نزول حوادث جاؤں کدھر تنگ آیا ہوں
غالب ہے کیا عہد میں میرے اے دل رنج و عنا کی طرف

آوے زمانہ جب ایسا تو ترک عشق بتاں کا کر
چاہیے بندہ قصد کرے جانے کا اپنے خدا کی طرف

قحط مروت اب جو ہوا ہے کس کو دماغ بادہ کشی
ابر آیا مینہ بھی ہوا کرتا نہیں کوئی ہوا کی طرف

ظلم و ستم سے جور و جفا سے کیا کیا عاشق مارے گئے
شہر حسن کے لوگوں میں کرتا نہیں کوئی وفا کی طرف

شام و سحر ہے عکس سے اپنے حرف و سخن اس گل رو کو
پشت پا سے نگاہ اٹھالی چھوڑی ان نے حیا کی طرف

ہاتھ کسی کا دیکھتے رہیے گا ہے ہم سے ہو نہ سکا
اپنی نظر اے میر رہی ہے اکثر دست دعا کی طرف

(۱۶۵۲)

عشق سے ہم کو نگاہ نہیں کچھ ہائے زیان جاں کی طرف
ورنہ سبھی دیکھا کرتے ہیں اپنے سود و زیاں کی طرف

ازبس مکروہات سے یاں کا مزبلہ زار لبالب ہے
یاں سے گئے پھیر کے منھ دیکھا نہ کنھوں نے جہاں کی طرف

صورت کی شیرینی ایسی تلخی زباں کی ایسی کچھ
منھ دیکھے اس کا جو کوئی پھر دیکھے ہے زباں کی طرف

وہ محبوب تو راہ گیا ہے اپنی لیکن دیر تلک
آنکھیں اہل نظر کی رہیں گی اس کے قدم کے نشاں کی طرف

کس سے کہوں جو میر طرف کر اس سے داد دلا دیوے
چھوٹے بڑے ہر ایک نے لی ہے اس اوباش جواں کی طرف

(۱۶۵۳)

کیا نیچی آنکھوں دیکھو ہو تلوار کی طرف
دیکھو تنکھیوں ہی سے گنہگار کی طرف

آوارگی کے محو ہیں ہم خانماں خراب
مطلق نہیں نظر ہمیں گھر بار کی طرف

مانا ہے قبلہ کعبہ خدا فرط شوق سے
جاتے ہیں سر رگڑتے ہوئے یار کی طرف

شاید متاع حسن کھلی ہے کسو کی آج
ہنگامہ حشر کا سا ہے بازار کی طرف

عاشق کی اور نازکناں جاوے ہے کبھو
جیسے طبیب جاوے ہے بیمار کی طرف

ہرگز طرف نہ ہوسکے رخسار یار کے
پھیکی ہے اس کے سامنے گلزار کی طرف

کچھ گل صبا کا لاگو نہیں اس چمن میں میر
کرتے ہیں سب ہی اپنے طرفدار کی طرف

(۱۶۵۴)

نظر کیوں گئی رو و مو کی طرف
کھنچا جائے ہے دل کسو کی طرف

نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی
جو دیکھو مری گفتگو کی طرف

اگر آرسی میں صفائی ہے لیک
نہیں کرتی منھ اس کے رو کی طرف

چڑھے نہ کہیں کود یہ مغز میں
نہ کر شانہ تو گل کی بو کی طرف

اسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

(۱۶۵۵)

ہنستے ہی ہنستے مار رکھا تھے جو ہم ظریف
ہے یار بھی ہمارا قیامت ستم ظریف

(۱۶۵۶)

بہار و باغ و گل و لالہ دلربا بن حیف
بھرے ہیں پھولوں سے جیب و کنار لیکن حیف

(۱۶۵۷)

اے تجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف
گل سے چمن بھرے ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

ردیف ق

(۱۶۵۸)

مہر قیامت چاہت آفت فتنہ فساد بلا ہے عشق
عشق اللہ صیاد انھیں کہیو جن لوگوں نے کیا ہے عشق

عشق سے نظم کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

عشق ہے باطن اس ظاہر کا ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالم بالا ایدھر کو دنیا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ہر لجہ ہے طوفاں زا
سرتا سر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

(۱۶۵۹)

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جناب عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

ظاہر و باطن اول و آخر پائیں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت معنی و صورت سب کچھ آپھی ہوا ہے عشق

ایک طرف جبریل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں ایک طرف پیدا ہے عشق

خاک و باد و آب و آتش سب ہے موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشق بتاں ہے کیا کہیے اب کیا ہے عشق

میر کہیں ہنگامہ آرا میں تو نہیں ہوں چاہت کا
صبر نہ مجھ سے کیا جاوے تو معاف رکھو کہ نیا ہے عشق

(۱۶۶۰)

بیتاب ہے دل غم سے نپٹ زار ہے عاشق
کیا جا کے دو چار اس سے ہو ناچار ہے عاشق

وہ دیکھنے کو جاوے تو بہتر ہے وگرنہ
بدحال و ستم دیدہ و بیمار ہے عاشق

رہتا ہے کھڑا دھوپ میں دو دو پہر آ کے
بے جرم سدا اس کا گنہگار ہے عاشق

اٹھتا نہیں تلوار کے سائے کے تلے سے
یعنی ہمہ دم مرنے کو تیار ہے عاشق

چسپاں ہوئے ہیں میر خریدار سے تنہا
کیا جنس ہے معشوق کہ بازار ہے عاشق

ردیف ک

(۱۶۶۱)

اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

آواز کے ہماری تم حزن پر نہ جاؤ
یہ نالۂ حزیں تو جاتے ہیں آسماں تک

رونا جہاں جہاں تو عین آرزو ہے لیکن
روتا ہوں رویا جادے میرے کنے جہاں تک

اکثر صداع مجھ کو رہتا ہے عاشقی میں
تصدیع درد و غم سے کھینچے کوئی کہاں تک

آوارہ ہی ہوئے ہم سر مار مار یعنی
نوپر نکل گئے ہیں اپنے سب آشیاں تک

اے وائے بے نصیبی سر سے گذرے لیکن
پیشانی تک نہ پہنچی اس خاک آستاں تک

نفع کثیر اٹھایا کر عشق کی تجارت
راضی ہیں میرؔ اب تو ہم جان کے زیاں تک

(۱۶۶۲)

دل کی تڑپ نے ہلاک کیا ہے دھڑکے نے اس کے اڑائی خاک
خشک ہوا خون اشک کے بدلے ریگ رواں سی آئی خاک

صورت کے ہم آئینے کے سے ظاہر فقر نہیں کرتے
ہوتے ساتے روتے پاتے ان نے منھ کو لگائی خاک

پیچ و تاب سے خاک بھی میری جیسے بگولا پھرنے لگی
سر میں ہوا ہی اس کے بہتی تب تو ہوئی ہے ہوائی خاک

اور غبار کسو کے دل کا کس انداز سے نکلے آہ
روے فلک پر بدلی سی تو ساری ہماری چھائی خاک

نعمت رنگارنگ حق سے بہرہ بخت سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

اپنے تئیں گم جیسا کیا تھا یاں سر کھینچ کے لوگوں نے
عالم خاک میں ویسی ہی اب ڈھونڈی ان کی نہ پائی خاک

انس نہیں انسان سے اچھا عشق و جنوں اک آفت ہے
فرق ہوئے کیا چھوڑے ہے آدم میں اس کی جدائی خاک

ہو کے فقیر گلی میں اس کی چین بہت سا پایا ہم
لے کے سرہانے پتھر رکھا جاے فرش بچھائی خاک

قلب گداز ہیں جن کے دے بھی مٹی سونا کرتے ہیں
میرؔ اکسیر بنائی انھوں نے جن کی جہاں سے اٹھائی خاک

(۱۶۶۳)

کیا ہم میں رہا گردش افلاک سے اب تک
پھرتے ہیں کمھاروں کے پڑے چاک سے اب تک

تھے نوخطوں کی خاک سے اجزا جو برابر
ہو سبزہ نکلتے ہیں تہ خاک سے اب تک

تا مدنظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ
جنگل بھرے ہیں سب گل تریاک سے اب تک

دشمن ہوئی ہے جس کے لیے ساری خدائی
مربوط ہیں ہم اس بت بیباک سے اب تک

ہر چند کہ دامن تئیں ہے چاک گریباں — ہم ہیں متوقع کف چالاک سے اب تک
گو خاک سی اڑتی ہے مرے منہ پہ جنوں میں — ٹپکے ہے لہو دیدۂ نمناک سے اب تک
وے کپڑے تو بدلے ہوئے میر اس کو کئی دن
تن پر ہے شکن تنگی پوشاک سے اب تک

(۱۶۶۴)

شاد افعیوں کا دل غمناک — دشت وشت اب کے ہے کل تریاک
تین دن گور میں بھی بھاری ہیں — یعنی آسودگی نہیں تہ خاک
ہاتھ پہنچا نہ اس کے دامن تک — میں گریباں کروں نہ کیوں کر چاک
تیز جاتا ہوں میں تو جوں سیلاب — میرے مانع ہو کیا خس و خاشاک
عشق سے ہاتھ کیا ملاوے کوئی — یاں زبردستوں کی ہے کشتی پاک
بندگی کیشوں پر ستم مت کر — ڈر خدا سے تو اے بت بیباک
عشق مرد آزما نے آخرکار
کیے فرہاد و قیس میر ہلاک

(۱۶۶۵)

اے عشق کیا جو مجھ سا ہوا ناتواں ہلاک — کر ہاتھ تک ملا کے کوئی پہلواں ہلاک
میں چل بسا تو شہر ہی ویران سب ہوا — اس نیم جاں کے بدلے ہوا یک جہاں ہلاک
مقصود گم ہے پھرتا جو رہتا ہے رات دن — ہلکان ہو کے ہوگا کبھو آسماں ہلاک
اس ظلم کیش کی ہے طرب گاہ ہر کہیں — عاشق خدا ہی جانے ہوا ہے کہاں ہلاک
جی میر نے دیا نہ ہوا لیک وصل یار
افسوس ہے کہ مفت ہوا یہ جواں ہلاک

ردیف گ

(۱۶۶۶)

راہ کی بات کہیں ہم کس سے بے تہ یاں اکثر ہیں لوگ — سرگرم بے راہ روی ہیں خود گم بے رہبر ہیں لوگ
بدتر آپ سے پاؤں کسو کو تو میں اس کا عیب کہوں — خوب تامل کرتا ہوں تو سب مجھ سے بہتر ہیں لوگ
دیوانے ہیں شہر وفا کی راہ و رسم کے ہم تو میر
دل کے کہے جی دینے والے قاطبۂ گھر گھر ہیں لوگ

(۱۶۶۷)

رہتے ہیں اس سے لاگ پہ ہم بے قرار الگ	کرتے ہیں دوڑ نت ہی تماشاے یار الگ
تھا گرد بوے گل سے بھی دامن ہوا کا پاک	کیا اب کے اس چمن سے گئی ہے بہار الگ
پاس اس کا بعد مرگ ہے آداب عشق سے	بیٹھا ہے میری خاک سے اٹھ کر غبار الگ
ناگاہ اس نگاہ سے میں بھی ہوا نہاں	جاتا ہے جوں نکل کے کسو کا شکار الگ
خونباری سے نہیں پڑی لوہو کی چھینٹ بھی	اب تک تو بارے اپنے ہیں جیب و کنار الگ
تا جانیں لوگ کشتۂ ہجراں ہیں یہ غریب	کریو تمام گوروں سے میری مزار الگ

بچتے نہیں ہیں بوزدگی سے گلوں کی میر
گو طائران خستہ جگر ہوں ہزار الگ

(۱۶۶۸)

وہ نہیں ملتا ایک کسو سے مرتے ہیں اودھر جاجا لوگ	یعنی ضائع اپنے تئیں کرتے ہیں اس بن کیا کیا لوگ
جیسے غم ہجراں میں اس کے عاشق جی کھو بیٹھے ہیں	برسوں مارے چرخ فلک تو ایسے ہوویں پیدا لوگ
زلف وخال وخط سے اس کے جہاں تہاں اب بحث ہے	عقل ہوئی ہے گم خلقت کی یا کہتے ہیں سودا لوگ
چار قدم چلنے میں اس کے دیکھتے جاتے ہیں جو کفک	فتنے سر کھینچا ہی کریں ہیں ایک قیامت برپا لوگ

دنیا جاے نہیں رہنے کی میر غرور نہیں اچھا
جو جاگہ سے جاتے ہیں اپنی وے کہتے ہیں بے جا لوگ

ردیف ل

(۱۶۶۹)

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل	چشم بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل
اوج وموج کا آشوب اس کے لے کے زمیں سے فلک تک ہے	صورت میں تو قطرۂ خوں ہے معنی میں دریا ہے دل
جیسے صحرا کو کشادہ دامن ہم تم سنتے آتے ہیں	بند کر آنکھیں ٹک دیکھو تو ویسا ہی صحرا ہے دل
کوہکن ومجنوں وامق تم جس سے پوچھو بتا دیوے	عشق وجنوں کے شہروں میں ہر چار طرف رسوا ہے دل
ہائے غیوری دل کی اپنے داغ کیا ہے خودسر نے	جی ہی جس کے لیے جاتا ہے اس سے بے پروا ہے دل
مت پوچھو کیوں زیست کرو ہو مردے سے افسردہ تم	ہجر میں اس کے ہم لوگوں نے برسوں تک مارا ہے دل

میر پریشاں دل کے غم میں کیا کیا خاطرداری کی
خاک میں ملتے کیوں نہ پھریں اب خون ہو بہ بھی گیا ہے دل

(۱۶۷۰)

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل   دل جو کھلا فسردہ تو جوں بے بہار گل
بستر سے اس کے پھول تر و تازہ رکھ کے دور   سوکھے ہے دیر رہ کے تو ہوتا ہے خار گل
دیکھا کبھو نہ ہم نے سنا ہے گلندہ میرؔ
داغ جنوں ہے سر پہ ہمیشہ بہار گل

(۱۶۷۱)

صد ہزار افسوس آکر خالی پائی جاے گل   ہے خزاں میں دل سے لب تک ہائے گل اے وائے گل
بے نصیبی سے ہوئے ہم موسم گل میں اسیر   تھے نہ پیشانی میں اپنے سجدہ ہاے پاے گل
دعوی حسن سراپا تھا پہ نازاں تجھ کو دیکھ   شاخیں پر گل جھک گئیں یعنی بہت شرمائے گل
کیا گل مہتاب و شبو کیا سمن کیا نسترن   اس حدیقے میں نہ نقش پا سے اس کے پائے گل
جیتے جی تو داغ ہی رکھا موئے پر کیا حصول   گور پر دلسوزی سے جوں شمع سر رکھ لائے گل
بے دلی بلبل نہ کر تاثیر میں گو تو ہے داغ   خوش زبان عشق کی جب ہم نے بھر کے کھائے گل
اس چمن میں جلوہ گر جس حسن سے خوباں ہیں میرؔ
موسم گل میں کہیں اس خوبی سے کب آئے گل

(۱۶۷۲)

رنگا رنگ چمن میں اب کے موسم گل میں آئے گل   ہم تو اس بن داغ ہی تھے سو اوبھی جل کر کھائے گل
ہار گلے کے ہوکر جیسے یاد رکھا تب عرصے میں   طرفہ تو یہ ہے اب منت سے گور پہ میری لائے گل
آئے شب گل میرؔ ہمیں کیا صبح بہار سے کیا حاصل
داغ جنوں ہے سر پہ ہمارے شمع کے گلوں چھائے گل

(۱۶۷۳)

ہر لحظہ ہے کدورت خاطر سے بار دل   آندھی سی آوے نکلے کبھو جو غبار دل
تر بندی خشک بندی نمک بندی ہوچکی   بے ڈول پھیلتا سا چلا ہے فگار دل
جوں رنگ لائے سیب ذقن باغ حسن میں   ووں ہیں ریاض عشق میں صد چاک انار دل
باہر ہیں حد و حصر سے کھینچے جو غم الم   کیا ہوسکے حساب غم بے شمار دل
لاکھوں جتن کیے نہ نبھی دل سے یار کے   اس کا جفا شعار وفا ہے شعار دل
اس کی گلی میں صبح دلوں کا شکار تھا   نکلا ہزار ناز سے بہر شکار دل

کیا میر پھر ثبات سے رو سوے دل کریں
ایسے نہیں گئے ہیں سکون و قرار دل

(۱۶۷۴)

رکھتا نہیں ہے مطلق تاب عتاب اب دل — جاتا ہے کچھ ڈھہا ہی خانہ خراب اب دل
درد فراق دلبر دے ہے فشار بے ڈھب — ہوجائے جلگی خوں شاید شتاب اب دل
بے پردہ اس کی آنکھیں شوخی جو کرتیاں ہیں — کرتا ہے یہ بھی ترک شرم و حجاب اب دل
آتش جو عشق کی سب چھائی ہے تن بدن پر — پہلو میں رہ گیا ہے ہوکر کباب اب دل
غم سے گداز پاکر اس بن جو بہ نہ نکلا
شرمندگی سے ہوگا اے میر آب اب دل

(۱۶۷۵)

مدت سے اب وہی ہے مرا ہم کنار دل — آزردہ دل ستم زدہ و بے قرار دل
جو کیسے ہے فسردہ و مردہ ضعیف و زار — ناچار دیر ہم رہے ہیں مار مار دل
دو چار دل سے راضی نہیں ہوتے دلبراں — شاید تسلی ان کی ہو جو لیں ہزار دل
خود گم ہے ناشکیب و مکدر ہے مضطرب — کب تک رکھوں گا ہاتھ تلے یہ غبار دل
ہے میر عشق حسن کے بھی جاذبے کے تیں
کھنچتا ہے سوے یار ہی بے اختیار دل

ردیف م

(۱۶۷۶)

عشق ہمارے درپئے جاں ہے آئے گھر سے نکل کر ہم — سر پر دیکھا یہی فلک ہے جاویں کیدھر چل کر ہم
بل کھائے ان بالوں سے کب عہدہ برآ ہوتے ہیں ہزار — تکلے کا سا بل نکلا ہے ٹک جو جلے تھے بل کر ہم
مت پوچھو کچھ پچھتاتے ہیں کیا کہیے گھبراتے ہیں — جی تو لیا ہے پاس بغل میں دل بیٹھے ہیں ڈل کر ہم
بے تگ و دو کیا سیری ہو دیدار کے ہم سے تشنوں کو — پانی بھی پی سکتے نہیں ٹک اپنی جگہ سے ہل کر ہم
عشق جو ہوتا واقع میں تو سیدھے جاتے تیغ تلے — راہ ہوس کی پھرلی ہم نے یعنی چلے ہیں ٹل کر ہم
ہائے جوانی شورکناں پابوس کو اس کے پھرتے تھے — اب چپ بیٹھ رہے ہیں یکسو ہاتھ بہت سے مل کر ہم
آگے تو کچھ اس سے آہیں گرم شعلہ فشانی تھیں
اب تو ہوئے ہیں میر اک ڈھیری خاکستر کی جل کر ہم

(۱۶۷۷)

ڈول لگائے بہتیرے پر ڈھب پہ کبھو نہیں آتے تم
آنا یک سو کب دیکھو ہو ایدھر آتے جاتے تم

ہر صورت کو دیکھ رہو ہو ہر کوچے کو جھانکو ہو
آگے عشق کیا ہتا تو پھرتے جی نہ کھپاتے تم

چاہت آفت الفت کلفت مہر و وفا و رنج وبلا
عشق ہی کے سب نام ہیں یہ دل کاش کہیں نہ لگاتے تم

شائق ہو مرغانِ قفس کے آئے گھر صیادوں کے
پھول اک دو تسکین کو ان کی کاش چمن سے لاتے تم

دونوں طرف سے کشش رہتی تھی نیا نیا تھا عشق اپنا
دھوپ میں آتے داغ ہوئے تو گرمی سے گل کھاتے تم

کیدھر اب وہ یک رنگی جو دیکھ نہ سکتے دل تنگی
رکتے پاتے ٹک جو ہمیں تو دیر تلک گھبراتے تم

کیا کیا شکلیں محبوبوں کی پردۂ غیب سے نکلی ہیں
منصف ہو ٹک اے نقاشاں ایسے چہرے بناتے تم

شاید شب مستی میں تمھاری گرم ہوئی تھیں آنکھیں کہیں
پیش از صبح جو آئے ہو تو آئے راتے ماتے تم

کب تک یہ دزدیدہ نگاہیں عمداً آنکھیں جھکا لینا
دلبر ہوتے فی الواقع تو آنکھیں یوں نہ چھپاتے تم

بعد نماز دعائیں کیں سو میرؔ فقیر ہوئے تم تو
ایسی مناجاتوں سے آگے کاشکے ہاتھ اٹھاتے تم

(۱۶۷۸)

چاہ چھپی بے پردہ ہوئی اب یارب کیدھر جاویں ہم
کاش اجل بے وقت ہی پہنچے ایک طرف مرجاویں ہم

اس کی نگہ کی اچپلیوں سے غش کرتے ہیں جگرداراں
کیا ٹھہرے گا دل اپنا جو بجلی سے ڈر جاویں ہم

صبر وقرار جو ٹک ہووے تو بہتر ہیں بے طاقت بھی
ہاتھ رکھے دل ہی پر کب تک اودھر اکثر جاویں ہم

خاک برابر عاشق ہیں اس کوچے میں ناچاری سے
گھر ہوں خانہ خرابوں کے تو اپنے بھی گھر جاویں ہم

میر اپنی سب عمر گئی ہے سب کی برائی ہی کرتے
سر پر آیا جانے کا موسم اب تو بھلا کر جاویں ہم

(۱۶۷۹)

ہم تو یہی کہتے تھے ہمیشہ دل کو کہیں نہ لگاؤ تم
کیا کہیے نہ ہماری سنی اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم

جھوٹ کہا کیا ہم نے اس میں طور جو اس سے ظاہر ہے
ہاتھ چلے تو عاشق زار کو خاک و خوں میں لٹاؤ تم

صبر کرو بیتاب رہو خاموش پھرو یا شور کرو
کس کو یاں پروا ہے کسو کی ٹھہرو آؤ جاؤ تم

ناز غرور تبختر سارا پھولوں پر ہے چمن کا سو
کیا مرزائی لالہ وگل کی کچھ خاطر میں نہ لاؤ تم

وائے کہ اس ہجراں کشتے نے باغ سے جاتے ٹک نہ سنا
گل نے کہا جو خوبی سے اپنی کچھ تو ہمیں فرماؤ تم

دست و پا بہتیرے مارے سرؔ بھی پھوڑے حیرت ہے
کیا کریے جو بے دست و پا ہم سوں کے ہاتھ آؤ تم

غم میں تمھاری صورت خوش کے سینکڑوں شکلیں گو بگڑیں
بیٹھے ناز و غرور سے بکھرے بال اپنے نہ بناؤ تم

در پہ حرم کے کشود نہیں تو دیر میں جا کر کافر ہو
قشقہ کھینچو تھی پڑھو زنار گلے سے بندھاؤ تم

بود نبود ثبات رکھے تو یہ بھی اک بابت ہے میرؔ
اس صفحے میں حرف غلط ہیں کاشکے ہم کو مٹاؤ تم

(۱۶۸۰)

کیا کریں بیکس ہیں ہم بے بس ہیں ہم بے گھر ہیں ہم
کیوں کر اڑ کر پہنچیں اس تک طائر بے پر ہیں ہم

سر نہ بالیں سے اٹھاویں کاشکے بیمار عشق
ہوگا یک ہنگامہ برپا فتنہ زیر سر ہیں ہم

سو طرف لے جاتی ہے ہم کو پریشاں خاطری
یاں کسے ڈھونڈو ہو تم کیا جانیے کیدھر ہیں ہم

گر نہ روئیں کیا کریں ہر چار سو ہے بیکسی
بیدل و بے طاقت و بے دین و بے دلبر ہیں ہم

وہ جو رشک مہ کبھی اس راہ سے نکلا نہ میرؔ
ہم نہ رکھتے تھے ستارہ یعنی بداختر ہیں ہم

(۱۶۸۱)

کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم

شکیبائی کہاں جو اب رہے جاتی ہوئی عزت
کدھر وہ ناز جس سے سرفرو ہرگز نہ لاتے تم

یہ حسن خلق تم میں عشق سے پیدا ہوا ورنہ
گھڑی کے روٹھے کو دو دو پہر تک کب مناتے تم

نظر وزدیدہ کرتے ہو جھکی رکھتے ہو پلکوں کو
لگی ہوتیں نہ آنکھیں تو نہ آنکھوں کو چھپاتے تم

یہ ساری خوبیاں دل لگنے کی ہیں مت برا مانو
کسو کا بار منت بے علاقہ کب اٹھاتے تم

پھرا کرتے تھے جب مغرور اپنے حسن پر آگے
کسو سے دل لگا جو پوچھتے ہو آتے جاتے تم

جو ہوتے میرؔ سو سر کے نہ کرتے اک سخن ان سے
بہت تو پان کھاتے ہونٹ غصے سے چباتے تم

(۱۶۸۲)

اس کی گلی میں غش جو کیا آسکے نہ ہم
پھر ہو چکے وہیں کہیں گھر جاسکے نہ ہم

سوئے تو غنچہ ہو کسو گلخن کے آس پاس
اس تنگنا میں پاؤں بھی پھیلا سکے نہ ہم

حالانکہ ظاہر اس کے نشاں شش جہت تھے میرؔ
خود گم رہے جو پھرتے بہت پا سکے نہ ہم

(۱۶۸۳)

ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم (۱)

سو نہ سنی تم نے تو ہماری آنکھیں لگو ہیں لگ پڑیاں
رو رو کر سر دھنتے ہو اب بیٹھے رنج اٹھاؤ تم

---

(۱) مطلع کے ساتھ دوسرا شعر مربوط ہے۔ مصحح

صبر کہاں جو تسکیں ہووے بیتابی سے چین کہاں   ایک گھڑی میں سو سو باری اودھر ایدھر جاؤ تم
خواہش دل ہے چاہ کسو کی یہی سبب ہے کاہش کا   ناحق ناحق کیوں کہتے ہو حق کی طرف دل لاؤ تم
ہر کوچے میں کھڑے رہ رہ کر ایدھر اودھر دیکھو ہو   ہائے خیال یہ کیا ہے تم کو جانے بھی دو اب آؤ تم
فاش نہ کریے راز محبت جانیں اس میں جاتی ہیں   درد دل آنکھوں سے ہر یک کے تا مقدور چھپاؤ تم
قدر و قیمت اس سے زیادہ میر تمھاری کیا ہوگی
جس کے خواہاں دونوں جہاں ہیں اس کے ہاتھ بکاؤ تم

(۱۶۸۴)

تظلم کہ کھینچے الم پر الم   ترحم کہ مت کر ستم پر ستم
علم بازی آہ جانکاہ ہے   رہے ٹوٹتے ہی علم پر علم
جو سو سر کے ہو آؤ مانوں نہ میں   عبث کھاتے ہو تم قسم پر قسم
کئی بار آنا ادھر لطف سے   عطا پر عطا ہے کرم پر کرم
خطرناک تھی وادی عشق میر
گئے اس پہ بھی ہم قدم پر قدم

ردیف ن

(۱۶۸۵)

تاروں کی جیسے دیکھیں ہیں آنکھیں لڑانیاں   اس بے نشاں کی ایسی ہیں چندیں نشانیاں
پیری ہے اب تو کہیے سو کیا کہیے ہم نشیں   کس رنج و غم میں گذریں ہیں اپنی جوانیاں
ظلم و ستم سے خون کیا پھر ڈبا دیا   برباد کیا گئیں ہیں مری جاں فشانیاں
میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں   خوش آگئیں ہیں اس کی مجھے بد زبانیاں
سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو   دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
باتیں کڈھب رقیب کی ساری ہوئیں قبول   مجھ کو جو ان سے عشق تھا میری نہ مانیاں
مجلس میں تو خفیف ہوئے اس کے واسطے   پھر اور ہم سے اٹھتیں نہیں سرگرانیاں
عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم   عالم تو کاروان ہے ہم کاروانیاں
سررفتہ کن نہ میر کا گر قصد خواب ہے
نیندیں اچٹتیاں ہیں سنے یہ کہانیاں

(۱۶۸۶)

رساتے ہو آتے ہو اہل ہوس میں   مزہ رس میں ہے لوگے کیا تم کرس میں

درا میں کہاں شور ایسا دھرا تھا — کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
ہمیں عشق میں بیکسی بے بسی ہے — نہ دشمن بھی ہو دوستی کے تو بس میں
نہ رہ مطمئن تسمہ باز فلک سے — دغا ہے یہ بہتوں کے کھینچے ہے تسمیں
بہت روئے پردے میں جب دیدۂ تر — ہوئی اچھی برسات تب اس برس میں
تن زرد و لاغر میں ظاہر رگیں ہیں — بھرا ہے مگر عشق اک ایک نس میں
محبت وفا مہر کرتے تھے باہم — اٹھا دی ہیں وے تم نے اب ساری رسمیں
تمھیں ربط لوگوں سے ہر قسم کے ہے — نہ کھایا کرو جھوٹی جھوٹی تو قسمیں

ہوا ہی کو دیکھیں ہیں اے میر اسیراں
لگادیں مگر آنکھیں چاک قفس میں

(۱۶۸۷)

غم ہجراں میں گھبرا کر اٹھا میں — طرف گلزار کی آیا چلا میں
شگفتہ خاطری اس بن کہاں تھی — چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب — ہوا تھا کس گھڑی ان سے جدا میں
تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ — ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں
کیا صبر آخر آزار دلی پر — بہت کرتا رہا دارو دوا میں
نہ عنقا کا کہیں نام و نشاں تھا — ہوا تھا شہرہ جب نام خدا میں

ہوا تھا میر مشکل عشق میں کام
کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

(۱۶۸۸)

فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں — رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دل شب میں
حسرت کی جگہ ہے نہ کہ سبزان گل اندام — جاتے ہیں چلے آگے سے آتے نہیں ڈھب میں
افتادگی پر بھی نہ چھوا دامن انھوں کا — کوتاہی نہ کی دلبروں کے ہم نے ادب میں
کر خوف فلک محتسب کی جو سرخ ہیں آنکھیں — جلتے ہیں تر و خشک بھی مسکیں کے غضب میں

پایا نہ کنھوں نے اسے کوشش کی بہت میر
سب سالک و مجذوب گئے اس کی طلب میں

(۱۶۸۹)

کس کو دل سا مکان دیتے ہیں — اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں

کیونکے خوش‌خواں نہ ہوویں اہل چمن — ہم انھوں کو زبان دیتے ہیں
نوخطاں پھیر لیں ہیں منھ یعنی — ملتے رخصت کے پان دیتے ہیں
جان کیا گوہر گرامی ہے — بدلے اس کے جہان دیتے ہیں
ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو — یہ کبھو انگ دان دیتے ہیں
یہ عجب گم ہوئے ہیں جس کے لیے — نہیں اس کا نشان دیتے ہیں

گل خوباں میں میرؔ مہر نہیں
ہم کو غیروں میں سان دیتے ہیں

(۱۶۹۰)

پلکیں پھری ہیں کھنچی بھویں ہیں ترچھی تیکھی نگاہیں ہیں — اس اوباش کی دیکھو شوخی سادگی سے ہم چاہیں ہیں
کیا پہناوا خوش آتا ہے لڑکے چسپاں پوشوں کا — مونڈھے چسپے ہیں چولی پھنسی ہے ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں
ضبط گریہ دل سے ہو تو کوزے میں دریا کرتا ہے — حوصلہ داری جن کی ہو ایسی عشق میں ان کو سراہیں ہیں
جب سے جدا میں ان سے ہوا ہوں حال عجب ہے روز و شب — چشم تر سے ٹپکے ہیں آنسو خشک لبوں پر آہیں ہیں
دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے رہ جاتے ہیں چپکے سے — چھاتی سراہے ان لوگوں کی جو چاہت کو نباہیں ہیں
دل الجھے ان بالوں میں تو آخر سودا ہوتا ہے — کوچے کو زنجیر کے یعنی زلفوں سے دو راہیں ہیں

یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میرؔ نہ اپنے دل سے گیا
سوتے سے اٹھ کر آنکھیں ملے ہیں لے انگڑائی جماہیں ہیں

(۱۶۹۱)

صبر کیا ہے برسوں ہم نے رات سے بے طاقت سے ہیں — اور گذارا کب تک ہوگا کچھ اب ہم رخصت سے ہیں
رسم لطف نہیں ہے مطلق شہر خوش محبوباں میں — دیکھے کم جو کرتے کسو پر ہم عاشق مدت سے ہیں
عشق کے دین اور مذہب میں مرجانا واجب آیا ہے — کوہکن و مجنون موئے اب ہم بھی اسی ملت سے ہیں
ملنا نفروں سے ان کا چھوٹا آ کر میری صحبت میں — پھر تنفر بھی یہ بے تہ مجھ سے کی صحبت سے ہیں

فرصت ان کو کم ہے اگرچہ پر ملتے ہیں قابو پر
برسوں میرؔ سے مل دیکھا ہے کچھ وے کم فرصت سے ہیں

(۱۶۹۲)

ہر چند میرے حق میں کب اس کا ستم نہیں — پر اس ستم سے بامزہ لطف و کرم نہیں
درویش جو ہوئے تو گیا اعتبار سب — اب قابل اعتماد کے قول و قسم نہیں
حیرت میں سکتے سے بھی مرا حال ہے پرے — آئینہ رکھ کے سامنے دیکھا تو دم نہیں
مستغنی کس قدر ہیں فقیروں کے حال سے — یاں بار غم سے خم ہوئے واں بھویں خم نہیں
شاید جگر کا کام تمامی کو کھنچ گیا — یا لوہو روتے رہتے تھے یا چشم نم نہیں

غم اس کا کچھ نہیں ہمیں گو لوگ کچھ کہیں
ق
یہ التفات ان نے جو کی ہے سو کم نہیں

کہنے لگا کہ میرؔ تمھیں بیچوں گا کہیں
تم دیکھیو نہ کہیو غلام اس کے ہم نہیں

(۱۶۹۳)

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغ آخر شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں

رنگ ثبات چمن کا اڑایا باد تند خزاں نے سب
برگ و بار و نورس گل کے غنچے جھڑتے جاتے ہیں

طینت میں ہے نیاز جنھوں کی مسجود ان کی سب ہے زمیں
خاک جو یہ پامال ہے اس سے سر کو رگڑتے جاتے ہیں

راہ عجب پیش آئی ہم کو یاں سے تنہا جانے کی
یار و ہمدم ہمراہی ہر گام بچھڑتے جاتے ہیں

ضعف دماغ سے افتاں خیزاں چلتے ہیں ہم راہ ہوں
دیکھیں کیا پیش آوے اب تو گرتے پڑتے جاتے ہیں

قد کو اپنے حشر خرام کے ایک نہیں لگ سکتا ہے
سرو روان باغ جہاں ہر چند اکڑتے جاتے ہیں

میرؔ بلا ناساز طبیعت لڑکے ہیں خوش ظاہر بھی
ساتھ ہمارے راہ میں ہیں پھر ہم سے لڑتے جاتے ہیں

(۱۶۹۴)

عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
دل کو خیال صبر نہیں آنکھوں کو میل خواب نہیں

کوئی سبب ایسا ہو یارب جس سے عزت رہ جاوے
عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں

قحط نہیں ہے دل کا اب من مارے تم کیوں پھرتے ہو
لینے والا چاہیے اس کا ایسا تو کمیاب نہیں

خط کا جواب نہ لکھنے کی کچھ وجہ نہ ظاہر ہم پہ ہوئی
دیر تلک قاصد سے پوچھا منھ میں اس کے جواب نہیں

رونا روز شمار کا مجھ کو آٹھ پہر اب رہتا ہے
یعنی میرے گناہوں کو کچھ حصر و حد وحساب نہیں

رنگ شکستہ دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ مستی میں
حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

ٹھہریں میرؔ کسو جاگہ ہم دل کو قرار جو ٹک آوے
ہو کے فقیر اس در پر بیٹھیں اس کے بھی ہم باب نہیں

(۱۶۹۵)

آنکھیں سفید دل بھی جلا انتظار میں
کیا کچھ نہ ہم بھی دیکھ چکے ہجر یار میں

دنیا میں ایک دو نہیں کرتا کوئی مقام
جو ہے رواروی ہی میں ہے اس دیار میں

دیکھی تھیں ایک روز تری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں ہی لیتے ہیں اب تک خمار میں

اخگر تھا دل نہ تھا مرا جس سے تہ زمیں
لگ لگ اٹھی ہے آگ کفن کو مزار میں

بے دم ہیں دام گاہ میں اک دم تو چل کے دیکھ
سنتے ہیں دم نہیں کسی تیرے شکار میں

محمل کے تیرے گرد ہیں محمل کئی ہزار
ناقہ ہے ایک لیلیٰ کا سو کس قطار میں

شور اب چمن میں میری غزل خوانی کا ہے میرؔ
اک عندلیب کیا ہے کہوں میں ہزار میں

(۱۶۹۶)[1]

طلب ہے کام دل کی اس کے بالوں کی اسیری میں
گدائی رات کو کرتا ہوں خجلت سے فقیری میں

نگہ عزلت میں اس ابرو کماں کی تھی ادھر یعنی
لگا تیر اس کا چھاتی میں ہماری گوشہ گیری میں

نظیر اس کی نظر آئی نہ سیاحان عالم کو
سیاحت دور تک کی ایک ہے وہ بے نظیری میں

حزیں آواز ہے مرغ چمن کی کیا جنوں آور
نہیں خوش زمزمہ ویسا ہماری ہم صفیری میں

جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میرؔ غم کھینچا
ہوئے اطفال تہ بازار گاہک جی کے پیری میں

(۱۶۹۷)

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی کہیے تو جی ماریں ہیں
رک کر پھوٹ بہیں جو آنکھیں رود کی سی دو دھاریں ہیں

حرف شناس نہ تھے جب تم تو بے پرسش تھا بوسۂ لب
ایک اک بات کی مشتاقوں سے سو سو اب تکراریں ہیں

عشق کے دیوانے کی سلاسل ہلتی ہے تو ذریں ہیں ہم
بگڑے پیل مست کی سی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں

وے بھوویں جیدھر ہوں خمیدہ اودھر کا ہے خدا حافظ
یعنی جوہردار جھکی خوں ریز کی دو تلواریں ہیں

دے وے جن لوگوں کو پھرتے آنکھوں ہم نے دیکھا تھا
حد نظر تک آج انھوں کی گرد شہر مزاریں ہیں

پیچ و تاب میں بل کھا کھا کر کوئی مرے یاں ان کو کیا
واں وے لیے مشاطہ کو یکسو بال ہی اپنے سنواریں ہیں

بڑے بڑے تھے گھر جن کے یاں آثار ان کے ہیں یہ اب
میرؔ شکستہ دروازے ہیں گری پڑی دیواریں ہیں

(۱۶۹۸)

حسن کیا جنس ہے جی اس پہ لگا بیٹھے ہیں
عزلتی شہر کے بازار میں آ بیٹھے ہیں

ہم وے ہر چند کہ ہم خانہ ہیں دونوں لیکن
روش عاشق و معشوق جدا بیٹھے ہیں

ان ستم کشتوں کو ہے عشق کہ اٹھ کر یک بار
تیغ خوں خوار تلے یار کی جا بیٹھے ہیں

کیونکے یاں اس کا خیال آوے کہ آگے ہی ہم
دل سا گھر آتشیں آہوں سے جلا بیٹھے ہیں

پیش رو دست دعا ہے وہی شے خواہش ہے
اور سب چیز سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں

ساری رات آنکھوں کے آگے ہی مری رہتا ہے
گو کہ وے چاند سے مکھڑے کو چھپا بیٹھے ہیں

باغ میں آئے ہیں پر اس گل تر بن یک سو
غنچہ پیشانی و دل تنگ و خفا بیٹھے ہیں

کیا کہوں آئے کھڑے گھر سے تو اک شوخی سے
پاؤں کے نیچے مرے ہاتھ دبا بیٹھے ہیں

(۱) یہ غزل بہ ادنیٰ تغیر دیوان ششم میں بھی موجود تھی لہٰذا وہاں سے ہٹا دی گئی ہے۔ یہاں دیوان ششم کا ہی متن برقرار رکھا گیا ہے۔ مصحح

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ / میرؔ غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں

(۱۶۹۹)

منھ کیے اودھر زرد ہوئے جاتے ہیں ڈر سے سبک ساراں / کیوں کے ہیں گے اس رستے میں ہم سے آہ گراں باراں

جی تو پھٹا دیکھ آئینہ ہر لوح مزار کا جامہ نما / پھاڑ گریباں تنگ دلی سے ترک لباس کیا یاراں

کی ہے عمارت دل کی جنھوں نے ان کی بنا کچھ رکھی رہی / اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معماراں

میخانے میں اس عالم کے لغزش پر مستوں کی نہ جا / سکر میں اکثر دیکھے ہم نے بڑے بڑے یاں ہشیاراں

کیا ستھراؤ شفاخانے میں عشق کے جاکر دیکھے ہیں / ایدھر اودھر سینکڑوں ہی بر پشت بام تھے بیماراں

بعد صبوحی گھگھیاتے باچھیں پھٹ بھی گئیں / یارب ہوگی قبول کبھو بھی دعاے صبح گنہگاراں

عشق میں ہم سے تم سے کہیں تو کھپ جاویں غم کس کو ہے / مارے گئے ہیں اس میداں میں کیا دل والے جگر داراں

(۱۷۰۰)

حاکم شہر حسن کے ظالم کیونکے ستم ایجاد نہیں / خون کسو کا کوئی کرے واں داد نہیں فریاد نہیں

یاری ہماری یک باری خاطر سے فراموش ان نے کی / ذکر ہمارا اس سے کیا سو کہنے لگا کچھ یاد نہیں

کیا کیا مردم خوش ظاہر ہیں عالم حسن میں نام خدا / عالم عشق خرابہ ہے واں کوئی گھر آباد نہیں

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے / کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں

لڑتا کاوا کی سے فلک کا پیش پا افتادہ ہے / میرؔ طلسم غبار جو یہ ہے کچھ اس کی بنیاد نہیں

(۱۷۰۱)

تدبیر کوئی بتاوے جو آپ کو سنبھالیں / جینے کی اپنے ہم بھی کوئی طرح نکالیں

قالب میں جی نہیں ہے اس بن ہمارے گویا / حیران کار یارب ہم کیسا ڈول ڈالیں

محشر میں داد خوباں چاہیں تو کس سے چاہیں / واں لگ چلے ملک تو اس کو بھی یہ لگالیں

طالع نہ ذائقے کے اپنے کھلے کہ ہم بھی / ان شکریں لبوں کے ہونٹوں کا کچھ مزہ لیں

خوش چشم خوبرویاں دیدہ وراں ہیں کتنے / دزدیدہ دیکھنے میں دل دیکھتے چرا لیں

عشق و جنوں سے جی تو تنگ آگیا ہے کاش اب / دست تلطف اپنے سر سے مرے اٹھا لیں

خونریزی سے ہماری اچھا ہے ہاتھ اٹھانا / یوں چاہیے کہ دلبر درویش سے دعا لیں

چلتے ہیں ناز سے جب ٹھوکر لگے ہے دل کو / آتیں نہیں سمجھ میں ان دلبروں کی چالیں

منت ہزار کریے مانے منے نہ ہرگز
میر ایسے غصہ ور کو ہم کس طرح منا لیں

(۱۷۰۲)

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
فاقہ مستی مدام کرتا ہوں
کوئی ناکام یوں رہے کب تک
میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں
یا تو لیتا ہوں داد دل یا اب
کام اپنا تمام کرتا ہوں

(۱۷۰۳)

ملنے کے دن جب یاد آتے ہیں سدھ بدھ بھولے جاتے ہیں
بے خود ہوجاتے ہیں ہم تو دیر بخود پھر آتے ہیں

ردیف و

(۱۷۰۴)

دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو
ان بکھرے ہوئے بالوں سے خاطر ہے پریشاں
وے جمع ہوئے پر ہیں بلا شانہ جہاں ہو
رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جاکے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو
کچھ حال کہیں اپنا نہیں بے خودی تجھ کو
غش آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو
کیوں جلتا ہے ہر جمع میں مانند دیے کے
اس بزم میں جا شمع سا پروانہ جہاں ہو
ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

(۱۷۰۵)

اپنے حسن رفتنی پر آج مت مغرور ہو
پاس تو ہے جس کے وے ہی کل کہیں گے دور ہو
دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں تک ورنہ ہم
پاؤں اس کے آنکھوں پر رکھ لیویں جو منظور ہو
شہر دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
اس کو ویرانہ نہ کہیے جو کبھو معمور ہو
ہم بغل اس سنگ دل سے کاشکے اس دم ہوں جب
شیشۂ مے پاس ہووے اور وہ مخمور ہو
عشق دلکش ذبح ہے پر کھیل قدرت کا ہے میر
صرف کریے اس میں اپنا جس قدر مقدور ہو

(۱۷۰۶)

عاشق ہو تو اپنے تئیں دیوانہ سب میں جاتے رہو — چکر مارو جیسے بگولا خاک اڑاتے آتے رہو
دلی جس کو لوگ کہیں ہیں جان سے اس کو خصومت ہے — ہو جاوے جو تم کو کسی سے تا مقدور چھپاتے رہو
دل لگنے کی چوٹ بری ہے اس صدمے سے خدا حافظ — بارے سعی و کشش کوشش سے جی کو اپنے بچاتے رہو
آئی بہار جنوں ہو مبارک عشق اللہ ہمارے لیے — نعل جڑے سینوں پہ پھرو تم داغ سروں پہ جلاتے رہو
شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں — بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو
ابر سیہ قبلے سے آیا تم بھی شیخو پاس کرو — تخفیفے تک لٹ پٹے باندھو ساختہ ہی مدھ ماتے رہو

کیا جانے وہ مائل ہووے کب ملنے کا تم سے میر
قبلہ و کعبہ اس کی جانب اکثر آتے جاتے رہو

(۱۷۰۷)

کیا فرض ہستی کی رخصت ہے مجھ کو — کہیں اپنے رونے سے فرصت ہے مجھ کو
پھروں ہوں ترے عشق میں کوچہ کوچہ — مگر کوچہ گردی سے الفت ہے مجھ کو
کہاں زندگی مدت العمر ظالم — ترے عشق میں دم غنیمت ہے مجھ کو
نہ کر شور ناصح بہت ناتواں ہوں — کہاں بات اٹھانے کی طاقت ہے مجھ کو
ہیں اسباب مرنے کے سب تیرے غم میں — جیا اب تلک کیونکے حیرت ہے مجھ کو
دل اتنا ہے آشفتہ خورشیدرو کا — کہ اپنے بھی سائے سے وحشت ہے مجھ کو

کڑھوں ہوں گا من مانتا میر صاحب
غم یار میں کیا فراغت ہے مجھ کو

(۱۷۰۸)

کیا غیرت سے دل پر تنگ رنج و غم نے دنیا کو — بس اب تو کھل گئیں ہیں آنکھیں دیکھا ہم نے دنیا کو
رہا ہے ایک عالم اور دنیاداروں میں اس کا — کیا ہے بے وفا معلوم سب عالم نے دنیا کو
ہمیشہ رونا کڑھنا سینہ کوبی ہر زماں کرنا — عزاخانہ کیا دل کے مرے ماتم نے دنیا کو
سنا میں نے کہ آخر ہاتھ اٹھایا اس نے دنیا سے — اگر پایا بھی محنت کر کسو ہمدم نے دنیا کو

زمیں سے آسماں تک میر ہے شور جنوں میرا
تہ و بالا کیا دونوں میں اس اودھم نے دنیا کو

(۱۷۰۹)

کیا کچھ ہم سے ضد ہے تم کو بات ہماری اڑا دو ہو — لگ پڑتے ہیں ہم تم سے تو تم اوروں کو لگا دو ہو

کیا روویں قدر و قیمت کو یہیں سے ہے معلوم ہمیں
کام ہمارا پاس تمھارے جو آتا ہے بہا دو ہو

اتنی تو جا خالی رہی ہے بزمِ خوش میں تمھارے سوا
جن کو کہیں جا گہ نہیں ملتی پہلو میں ان کو جا دو ہو

زنگ تو جاوے دل سے ہمارے غیر سیہ رو بد گو کے
کھینچ کے تو ایک ایسی لگاؤ تیغ ستم کی تا دو ہو

صحبت گرم ہماری تمھاری شمع پتنگے کی سی ہے
یعنی ہو دل سوز جو کوئی اس کو تم تو جلا دو ہو

رنگ صحبت کس کو دکھاویں خوبی اپنی قسمت کی
ساغر مے دشمن کو دو ہو ہم کو زہر منگا دو ہو

بند نہیں جو کرتے ہو تم سینے کے سوراخوں کو
جی کی رکن میں ان رخنوں سے شاید دل کو ہوا دو ہو

آنکھ جھپک جاتی نہیں تنہا آگے چہرۂ روشن کے
ماہ بھی بیٹھا جاتا ہے جب منھ سے نقاب اٹھا دو ہو

غیرے غیریت ہے آساں لیکن تہ کچھ ہم کو نہیں
بات بتاویں کیا ہم تم کو تم ہم کو تو بنا دو ہو

میر حقارت سے ہم اپنی چپ رہ جاتے ہیں جان جلے
طول ہمارے گھٹنے کو دے کر جیسے چراغ بڑھا دو ہو

(۱۷۱۰)

کہتے نہ تھے ہم تم سے دل ہاتھ سے مت دیجو
مت کھائیو غم اپنا اپنا نہ لہو پیجو

ان پلکوں کی کاوش سے زخمی ہے جگر سارا
لے تار نگاہوں کے نازک سا رفو کیجو

کیا جان لیے جس کے جاناں سے چھپاتا منھ
جینا تو کوئی دن ہے تم میر بہت جیجو

دل خستہ شکستہ دل دل بستہ گرفتہ دل
ہو ان میں کوئی اس کا دل ہاتھ میں ٹک لیجو

اس راہ سے کرتا ہے دل کب ہوا گاہے
میرے پھٹے سینے کو زنہار نہ تم سیجو

(۱۷۱۱)

بات کہوں کیا چپکے چپکے دیکھو ہو آئینے کو
دیکھتے ہو تو دیکھو ہمارے جلتے توے سے سینے کو

کیا جانو تم قدر ہماری مہر و وفا کی لڑکے ہو
لوہو اپنا دیں ہیں تمھارے گرتے دیکھ پسینے کو

پھیر ایام نحس کا مجھ کو بہت کڈھب آتا ہے نظر
تم بھی غنیمت جانو میاں دس دن کے میرے جینے کو

وہ جو غیرت مہ ملتا ہے غیر سے ہم ہیں غیرت کش
سال ہمارے جی کا ہوگا ظاہر کوئی مہینے کو

لخت دل آنکھوں سے گرا سو ٹکڑا لعل کا تھا گویا
نصب کروں گا میر جگر پر خوش رنگ ایسے نگینے کو

(۱۷۱۲)

صوفیاں خم وا ہوئے ہیں ہائے آنکھیں وا کرو
ابر آیا زور غیرت تم بھی ٹک پیدا کرو

مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
پائے کوباں دست افشاں آن کر سودا کرو

ہر جگہ دلکش ہے اس کی برگ گل سے جسم میں
ایک جا تو جی لگاؤ دل کے تیں بے جا کرو

بے تکلف ہے تعین اس قصب پوشی کی قید
خرقۂ صد چاک پہنو آپ کو رسوا کرو

گرچہ ہم پر بستہ طائر ہیں پر اے گل ہاے تر
کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پروا کرو

(۱۷۱۳)

موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرو
یعنی سایۂ سرو و گل میں اب مجھ کو زنجیر کرو

پیش سعایت کیا جائے ہے حق ہے میری طرف سو ہے
میں تو چپ بیٹھا ہوں یکسو کر کوئی تقریر کرو

کان لگا رہتا ہے غیر اس شوخ ، ابرو کے بہت
اس تو گناہ عظیم پہ یارو ناک میں اس کی تیر کرو

پھیر دیے ہیں دل لوگوں کے مالک نے کچھ میری طرف
تم بھی تنک اے آہ و نالہ قلبوں میں تاثیر کرو

آگے ہی آزردہ ہیں ہم دل ہیں شکستہ ہمارے سب
حرف رنجش بیچ میں لاکر اور نہ اب دلگیر کرو

کیا ہو محو عمارت منعم اے معمار خرابی ہے
بن آوے تو گھر ویراں درویشوں کے تعمیر کرو

عاشق ہو ترسا بچگاں پر تا کیفیت حاصل ہو
اور کشود کار جو چاہو پیر مغاں کو پیر کرو

شعر کیے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحب دل
روویں کڑھیں جو یاد کریں اب ایسا تم کچھ میرؔ کرو

(۱۷۱۴)

کیونکر مجھ کو نامہ نمط ہر حرف پہ پیچ و تاب نہ ہو
سو ہو قاصد جان سے جاویں یک کو ادھر سے جواب نہ ہو

گل کو دیکھ کے گلشن کے دروازے ہی سے پھر آیا
کیا مل بیٹھیے اس سے بھلا جو صحبت ہی کا باب نہ ہو

مستی خرابی سر پر لائی کعبے سے اٹھ دیر گیا
جس کو خدا نے خراب کیا ہو پھر وہ کیونکے خراب نہ ہو

خلع بدن کرنے سے عاشق خوش رہتے ہیں اس خاطر
جان و جاناں ایک ہیں یعنی بیچ میں تن جو حساب نہ ہو

خشم و خطاب جبیں پر چیں تو حسن ہے گل رخساروں کا
وہ محبوب خنک ہوتا ہے جس میں ناز و عتاب نہ ہو

میں نے جو کچھ کہا کیا ہے حد و حساب سے افزوں ہے
روز شمار میں یارب میرے کہے کیے کا حساب نہ ہو

صبر بلا ہاے عشقی پر حوصلے والے کرتے ہیں
رحمت ہے اس خستہ جگر کو دل جس کا بیتاب نہ ہو

جس شب گل دیکھا ہے ہم نے صبح کو اس کا منھ دیکھا
خواب ہمارا ہوا ہے لوگوں کا سا خواب نہ ہو

نہریں چمن کی بھر رکھی ہیں گویا بادۂ لعلیں سے
بے عکس گل و لالہ الٰہی ان جویوں میں آب نہ ہو

اس دن میں تو مستانہ ہوتا ہوں کوئی کوچہ گدا
جس دن کاسۂ چوبیں میں میرے یک جرعگی شراب نہ ہو

تہ داری کچھ دیدۂ تر کی میرؔ نہیں کم دریا سے
جوشاں شور کناں آجاوے یہ شعلہ سیلاب نہ ہو

(۱۷۱۵)

تم کو ہم سے لاگ لگی ہے روتے ہیں تو ہنستے ہو
ہم نے کمر کو کھول رکھا ہے اپنی کمر تم کستے ہو

درج گوہر مال نہیں کچھ دیں در بستہ مصر اگر
تو بھی ایسی قیمت پر تم آگے ہمارے سستے ہو

رستے راہ میں دیکھ لیا ہے بستی میں سے نکلے تمھیں
کیا جانیں ہم روز و شب تم کیدھر رہتے بستے ہو

ابر کرم کی راہ تکو اب رحمت حق پہ نظر رکھو
گو کہ تم اے مستاں مجرم اس غم سے دل خستے ہو

پیری میں بھی جواں رکھا ہے دختر تاک کی صحبت نے
یعنی پی پی مئے انگوری میر ہوئے کٹ مستے ہو

(۱۷۱۶)

راہیں رکے پر اس سے ملاقات ہو تو ہو
خاموش ان لبوں سے کوئی بات ہو تو ہو

رنج و عنا کہ دشمن جان عزیز ہیں
ان سے بچاؤ اس کی عنایات ہو تو ہو

نومید وصل دل نہیں شب ہاے ہجر میں
ان راتوں ہی میں ملنے کی بھی بات ہو تو ہو

امید ہے کہ اس سے قیامت کو پھر ملوں
حسن عمل کی واں بھی مکافات ہو تو ہو

تخفیفے شملے پیرہن و کنگھی اور کلاہ
شیخوں کی گاہ ان میں کرامات ہو تو ہو

ساقی کو چشم مست سے اودھر ہی دیکھنا
مسجد ہو یا کہ کعبہ خرابات ہو تو ہو

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذات مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو

(۱۷۱۷)

مژہ وا کرو تمھیں خوش ہے کیا کبھو حال پر بھی نظر کرو
یہی حال ہمیشہ رہا کیا تو مآل پر بھی نظر کرو

کہیں دل بھی ان کے اٹکتے ہیں جنھیں شوق مہ ہے کمال کچھ
ہوئے ہو جو رفتہ خرام کے تو جمال پر بھی نظر کرو

نہ بنے جو دلبر سادہ تو نہ بھلا لگے مری آنکھوں میر
نہیں سادگی ہی میں لطف کچھ خط و خال پر بھی نظر کرو

ردیف ہ

(۱۷۱۸)

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جان عزیز گئی ہوتی کاش اب کے سال بہار کے ساتھ

کس آوارۂ عشق و جنوں کی اک مٹھی اب خاک اڑی
اڑتی پھرے ہے پس محمل جو راہ کے گرد و غبار کے ساتھ

وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اس سے
چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ

جی مارے شب مہ میں ہمارے قہر کیا مشاطہ نے
بل کھائے بالوں کو دے بل اس کے گلے کے ہار کے ساتھ

کیا دن تھے جو ہم کو تنہا کہیں کہیں مل جاتا تھا　　اب تو لگے ہی رہتے ہیں اغیار ہمارے یار کے ساتھ
ہم ہیں مریض عشق و جنوں سختی سے دل کو مت توڑو　　نرم کرے ہیں حرف و حکایت اہل خرد بیمار کے ساتھ
دیدۂ تر سے چشمۂ جوشاں ہیں جو قریب اپنے واقع　　تو ہی رود چلے جاتے ہیں لگ کر جیب و کنار کے ساتھ
دیر سے ہیں بیمار محبت ہم سے قطع امید کرو　　جانیں ہی جاتی دیکھی ہیں ہم نے آخر اس آزار کے ساتھ
رونے سے سب سر بر آئے خاک ہمارے سر پر میر
مدت میں ہم تک لگ بیٹھے تھے اس کی دیوار کے ساتھ

(۱۷۱۹)

اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ　　آب اس کے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ
آنکھیں ملا کبھو تو کب تک کیا کروں میں　　دنبالہ گردی تیری اے آہوے رمیدہ
پانی بھر آیا منہ میں دیکھے جنھوں کے یارب　　وے کس مزے کے ہوں گے لب ہاے ناگزیدہ
سائے کو اس پری کے لگتا نہ تھا چمن میں　　مغرور کاہے پر ہے شمشاد قد کشیدہ
آنکھیں ہی بچھ رہی ہیں اہل نظر کی یکسر　　چلتے ہوئے زمیں پر رکھ پاؤں دیدہ دیدہ
چل سیر کرنے تو بھی تا صبح آنکھیں کھولیں　　منہ پر ترے چمن میں گل ہاے نو دمیدہ
محراب میں رہو نہ سجدہ کیا کرو نہ　　بے وقت کیا ہے طاعت قد اب ہوا خمیدہ
پروانہ گرد پھر کر جل بھی بجھا ولیکن　　خاموش رات کو تھی شمع زباں بریدہ
دیکھا مجھے شب گل بلبل نے جو چمن میں　　بولا کی میرے منہ پر کیا کیا دہن دریدہ
قلب و کبد تو دونوں تیروں سے چھن رہے ہیں　　وہ اس ستم کشی پر ہم سے رہے کبیدہ
اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

(۱۷۲۰)

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ　　لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ
مستی میں شیخ شہر سے صحبت عجب رہی　　سر پھوڑتے رہا کیے اکثر سبو کے ساتھ
تھا عکس اس کی قامت دلکش کا باغ میں　　آنکھیں چلی گئیں ہیں لگی آب جو کے ساتھ
نازاں ہو اس کے سامنے کیا گل کھلا ہوا　　رکھتا ہے لطف ناز بھی روے نکو کے ساتھ
ہم زرد کاہ خشک سے نکلے ہیں خاک سے　　بالیدگی نہ خلق ہوئی اس نمو کے ساتھ
گردن بلند کرتے ہی ضربت اٹھا گئے　　خنجر رکھے ہے اس کا علاقہ گلو کے ساتھ
ہنگامے جیسے رہتے ہیں اس کوچے میں سدا　　ظاہر ہے حشر ہوگی نہ ایسے غلو کے ساتھ
مجروح اپنی چھاتی کو بخیہ کیا بہت
سینہ گتھا ہے میر ہمارا رفو کے ساتھ

(۱۷۲۱)

جان چلی جاتی ہے ہماری اس کی اور نظر کے ساتھ — یعنی چشم شوق لگی رہتی ہے شگاف در کے ساتھ
شاہد عادل عشق کے دونوں پاس ہی حاضر ہیں یعنی — پہروں پہروں خشک لبی رہتی ہے چشم تر کے ساتھ
آنا اس کا ظاہر ہے پر مژدہ لایا یاں نہ کرو — جی ہی نکل جاوے گا اپنا یوں ہی ذوق خبر کے ساتھ
کیا رو ماہ و خور کو لیکن جھمکا اس کا دکھا دوں ہوں — روز و شب کچھ ضد سی ہوئی ہے مجھ کو شمس و قمر کے ساتھ
سینہ خالی آج پڑا ہے میرؔ طرف سے پہلو کے
دل بھی شاید نکل گیا ہے روتے خون جگر کے ساتھ

(۱۷۲۲)

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ — یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ
اب وہ نہیں کرم کہ بھرن پڑنے لگ گئی — جوں ابر آگے لوگوں کے دامن پسار دیکھ
آنکھوں کو تیری عین کیا سب نے دیدنی — تو سب سے ٹک تو پھیر لے آنکھوں کو یار دیکھ
محتاج گل نہیں ہے گریبان غم کشاں — گلزار اشک خونیں سے جیب و کنار دیکھ
آنکھیں ادھر سے موند لیں ہیں اب تو شرط ہے — پھر دیکھیو نہ میری طرف ایک بار دیکھ
خالی پڑا ہے خانۂ دولت وزیر کا — باور نہیں تو آصف آصف پکار دیکھ
خواہش نہ ہووے دل کی جو حاصل تو موت ہے
احوال میرؔ دیکھ نہیں جی تو مار دیکھ

(۱۷۲۳)

بندہ ہے یا خدا نہیں اس دلربا کے ساتھ — دیر و حرم میں ہو کہیں ہو ہے خدا کے ساتھ
ملتا رہا کشادہ جبیں خوب و زشت سے — کیا آئینہ کرے ہے بسر یاں حیا کے ساتھ
گو دست لطف سر سے اٹھا لے کوئی شفیق — دل کا لگاؤ اپنا ہے دست دعا کے ساتھ
تدبیر دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ — ہے درد عاشقی کو خصومت دوا کے ساتھ
کی کشتی اس کی پاک زبردست عشق نے — جن نے ملائے ہاتھ ٹک ایک اس بلا کے ساتھ
اوباش لڑکوں سے تو بہت کر چکے معاش — اب عمر کاٹیے گا کسو میرزا کے ساتھ
کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میرؔ
آتا ہے برگ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

(۱۷۲۴)

عز و وقار کیا ہے کسو خودنما کے ہاتھ — ہے آبرو فقیر کی شاہ ولا کے ہاتھ

بٹھلا دیا فلک نے ہمیں نقش پا کے رنگ
اٹھنا ہمارا خاک سے ہے اب خدا کے ہاتھ
آنکھوں میں آشنا تھا مگر دیکھا تھا کہیں
نوگل کل ایک دیکھا ہے میں نے صبا کے ہاتھ
دیکھ اس کو مجھ کو یاروں نے حیران ہو کہا
کس ڈھب سے لگ گیا ہے یہ گوہر گدا کے ہاتھ
دل کی گرہ نہ ناخن تدبیر سے کھلی
عقدہ کھلے گا میر یہ مشکل کشا کے ہاتھ

ردیف ی

(۱۷۲۵)

رات کو تھا کعبے میں میں بھی شیخ حرم سے لڑائی ہوئی
سخت کدورت بیچ میں آئی صبح تلک نہ صفائی ہوئی
تہمت رکھ مستی کی مجھ پر شیخ شہر کنے لایا
وہ بھی بگڑا حد سے زیادہ سن کر بات بنائی ہوئی
شیشہ ان نے گلے میں ڈلوا شہر میں سب تشہیر کیا
ہائے سیہ رو عاشق کی عالم میں کیا رسوائی ہوئی
کیسی کیسی شکلیں سامنے آویں مژگاں وا اودھر نہ کروں
حور و پری پر آنکھ نہیں پڑتی ہے کسو سے لگائی ہوئی
حوصلہ داری کیا ہے اتنی قدرت کچھ ہے خدا ہی کی
عالم عالم جہاں جہاں جو غم کی ہم میں سمائی ہوئی
دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہ جاویں نہ کیوں
منھ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی
دل میں درد جگر میں طپیدن سر میں شور آشفتہ دماغ
کیا کیا رنج اٹھائے گئے ہیں جب سے ان سے جدائی ہوئی
ہفتم چرخ سے اودھر ہوکر عرش کو پہنچی میری دعا
اور رسائی کیا ہوتی ہے گو کہ کہیں نہ رسائی ہوئی
دود دل سوزان محبت محو جو ہو تو عرش پہ ہو
دور بجھے گی یعنی جاکر عشق کی آگ لگائی ہوئی
یہ یہ بلائیں سر پر ہیں تو آج موئے کل دوسرا دن
یاری ہوئی بیماری ہوئی درویشی ہوئی تنہائی ہوئی
اتنی لگو ہیں چشم کسو کی قہر قیامت آفت ہے
تم نے دیکھی نہیں ہے صاحب آنکھ کوئی شرمائی ہوئی
جب موسم تھا وا ہونے کا تب تو شگفتہ ٹک نہ ہوا
اب جو بہت افسوہ ہوا ہے دل ہے کلی مرجھائی ہوئی
اس کی طرف جو لی ہم نے ہے اپنی طرف سے پھرا عالم
یعنی دوستی سے اس بت کی دشمن ساری خدائی ہوئی
ہم قیدی بھی موسم گل کے کب سے توقع رکھتے تھے
دیر بہار آئی اب کے پر اسیروں کی نہ رہائی ہوئی
کہنا جو کچھ جس سے ہوگا سامنے میر کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منھ پہ میرے آئی ہوئی

(۱۷۲۶)

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
یہ راہ و روش سرو گلستاں میں نہ ہوگی
اس قامت دلچسپ کا انداز دگر ہے
یہ بادیۂ عشق ہے البتہ ادھر سے
بچ کر نکل اے سیل کہ یاں شیر کا ڈر ہے

وہ ناوک دلدوز ہے لاگو مرے جی کا
تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے

کیا پھیل پڑی مدت ہجراں کو نہ پوچھو
مہ سال ہوا ہم کو گھڑی ایک پہر ہے

کیا جان کہ جس کے لیے منھ موڑیے تم سے
تم آؤ چلے داعیہ کچھ تم کو اگر ہے

تجھ سا تو سوار ایک بھی محبوب نہ نکلا
جس دلبر خودکام کو دیکھا سو نفر ہے

شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو تو اب تو
دم کش ہو ٹک اے مرغ چمن وقت سحر ہے

سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکی
کیا ساتھ نزاکت کے رگ گل سی کمر ہے

کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا
اے آہ سحرگاہ اگر تجھ میں اثر ہے

پیغام بھی کیا کریے کہ اوباش ہے ظالم
ہر حرف میاں دار پہ شمشیر و سپر ہے

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلک گہر ہے

(۱۷۲۷)

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے
گھر ہے کسو گوشے میں تو مکڑی کا سا گھر ہے

میلان نہ آئینے کا اس کو ہے نہ گل کا
کیا جانیے اب روے دل یار کدھر ہے

اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
روشن ہے ترے چہرے سے تو گرم سفر ہے

اس عاشق دیوانہ کی مت پوچھ معیشت
دنداں بجگر دست بدل داغ بسر ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

ڈر جان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
ہم خانہ خرابوں کو تو یاں گھر ہے نہ در ہے

کیا پرسش احوال کیا کرتے ہو اکثر
ظاہر ہے کہ بیمار اجل روز بتر ہے

رہتی ہیں الم ناک ہی وے آنکھیں جو اچھی
بدچشم کسو شخص کی شاید کہ نظر ہے

دیدار کے مشتاق ہیں سب جس کے اب اس کی
کچھ شورش ہنگامۂ محشر میں خبر ہے

سب چاہتے ہیں رشد مرا یوں تو پر اے میر
شاید یہی اک عیب ہے مانع کہ ہنر ہے

(۱۷۲۸)

کیا کہیے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے
چھانہہ میں جاکے ببولوں کی ہم عشق و جنوں کو رو آئے

دل کی تلاش میں اٹھ کے گئے تھے شاید یاں پیدا ہوسو
جان کا اپنی گرامی گوہر اس کی گلی میں کھو آئے

آہوے عرفاں صید انھوں کا گر نہ ہوا نقصان کیا
اس عالم سے اس عالم میں کسب کمال کو جو آئے

کچھ کہنے کا مقام نہ تھا وہ وا ہوتا تو کہتے کچھ
آنا نہ آنا یکساں تھا واں ہوتے ادھر ہم گو آئے

سب کہتے تھے چین کرے گا کچھ بھی نہ دیکھا جز سختی
پتھر رکھ کے سرہانے ہم تک اس کی گلی میں سو آئے

کیا ہی دامن گیر تھی یارب خاک بسمل گاہ وفا
اس ظالم کی تیغ تلے سے ایک گیا تو دو آئے

سر دینا ٹھہرا کر ہم نے پاؤں کو باہر رکھا تھا
ہر سو ہو دشوار ہے پھرنا میرؔ ادھر اب تو آئے

(۱۷۲۹)

جوں ابر بے کسانہ روتے اٹھے ہیں گھر سے
برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے

جمہور راہ اس کی دیکھا کرے ہے اکثر
محفوظ رکھ الٰہی اس کو نظرگذر سے

وحش اور طیر آنکھیں ہر سو لگا رہے ہیں
گرد رہ اس کی دیکھیں اٹھ چلتی ہے کدھر سے

شاید کہ وصل اس کا ہووے تو جی بھی ٹھہرے
ہوتی نہیں ہے اب تو تسکین دل خبر سے

مدت سے چشم بستہ بیٹھا رہا ہوں لیکن
وہ روے خوب ہرگز جاتا نہیں نظر سے

گو ہاتھ وہ نہ آوے دل غم سے خون کرنا
ہے لاگ میرے جی کو اس شوخ کی کمر سے

یہ گل نیا کھلا ہے لے بال تو قفس میں
کوئی کلی نہ نکلے مرغ چمن کے پر سے

دیکھو نہ چشم کم سے یہ آنکھ ڈبڈبائی
سیراب ابر ہوتے دیکھے ہیں چشم تر سے

گلشن سے لے قفس تک آواز ایک سی ہے
کیا طائر گلستاں ہیں نالہ کش اثر سے

ہر اک خراش ناخن جبہے سے صدر تک ہے
رجھواڑ ہو تو پوچھے کوئی ہمیں ہنر سے

یہ عاشقی ہے کیسی ایسے جیوگے کب تک
ترک وفا کرو ہو مرنے کے میرؔ ڈر سے

(۱۷۳۰)

بسکہ ہے گردون دوں پرور دنی
ہووے پیوند زمیں یہ رفتنی

بزم میں سے اب تو چل اے رشک صبح
شمع کے منھ پر پھری ہے مردنی

میں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

مجھ سا محنت کش محبت میں نہیں
ہر زماں کرتا رہا ہوں جاں کنی

کچھ گدا شاعر نہیں ہوں میرؔ میں
تھا مرا سرمشق دیوان غنی

(۱۷۳۱)

بسان برق وہ جھمکے دکھاوے
ولے دل شرط ہے جو تاب لاوے

اڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے
مبادا مجھ کو بھی گڈا بناوے

صبا سے میں جو ٹک چل کر گیا واں
ہوا کھاوے کہا آنے نہ پاوے

نزاکت سے بہت ہے کم دماغی
رکھے پگڑی پہ گل تیوری چڑھاوے

بزن گاہ اس کشندے کی گلی ہے
وہی جاوے جو لوہو میں نہاوے

نہ پوچھو فرش رہ کیا ہووے اس کا
جو اہل دل ہو تو آنکھیں بچھاوے

بلا مغرور ہے وہ آتشیں خو
بہت منت کرو تو جی جلاوے

پڑا تڑپا کیا میں دور پہروں
عجب کیا ہے جو پاس اپنے بلاوے

بتان دیر سے ایسی نہیں لاگ
خدا ہی ہو تو کعبے میرؔ جاوے

(۱۷۳۲)

کیا خط لکھوں میں رونے سے فرصت نہیں رہی
لکھتا ہوں تو پھرے ہے کتابت بہی بہی

میدان غم میں قتل ہوئی آرزوے وصل
تھی اپنے خاندان تمنا میں اک یہی

اپنا لکھا ہے یاد مجھے میری بات بھول
قاصد نے جا کے یار سے کچھ اور ہی کہی

شب شور کرنے میں جو ساجت کی تنگ ہو
کہنے لگا کہ مارو اسے یہ تو ہے وہی

مت بے نمک حرام تو داغوں سے ساز کر
اے زخم کہنہ میرؔ کی خاطر ہی یوں سہی

(۱۷۳۳)

نہ بک شیخ اتنا بھی واہی تباہی
کہاں رحمت حق کہاں بے گناہی

ملوں کیونکے ہم رنگ ہو تجھ سے اے گل
ترا رنگ شعلہ مرا رنگ کاہی

مجھے میرؔ تا گور کاندھا دیا تھا
تمناے دل نے تو یاں تک نباہی

(۱۷۳۴)

اودھر مطرب کا عودی رنگ کب طناز آتا ہے
عجب ہیں لوگ جو کہتے ہیں وہ ناساز آتا ہے

خبر ہے شرط اتنا مت برس اے ابر بارندہ
ہمیں بھی آج رونا درد دل پرداز آتا ہے

اٹھے ہے گرد معشوقانہ اس تربت سے عاشق کی
کبھو تک جس کے اوپر وہ سراپا ناز آتا ہے

عجب رنگ حنا طائر ہے دست آموز خوباں کا
اڑے ہے تو بھی ہاتھوں ہی میں کر پرواز آتا ہے

وہی نازاں خراماں کبک سا آیا مری جانب
کوئی مغرور وہ شوخی سے اپنی باز آتا ہے

رہائی اپنی ہے دشوار کب صیاد چھوڑے ہے　　اسیر دام ہو طائر جو خوش آواز آتا ہے
اگر مسجد سے آؤں میر تو بھی لوگ کہتے ہیں
کہ میخانے سے پھر دیکھو وہ شاہد باز آتا ہے

(۱۷۳۵)

اس کے رنگ چمن میں شاید اور کھلا ہے پھول کوئی　　شور طیور اٹھتا ہے ایسا جیسے اٹھے ہے بول کوئی
یوں پھرتا ہوں دشت و در میں دور اس سے میں سرگشتہ　　غم کا مارا آوارہ جوں راہ گیا ہو بھول کوئی
ایک کہیں سر کھینچے ہے ایسا جس کی کریں سب پابوسی　　ہو ہر اک کو قبول دلہا یہ نہ کرے گا قبول کوئی
کس امید کا تجھ کو اے دل چاہ میں اس کی حصول ہوا　　شوخ و شلائیں خوشرویاں سے رہتا ہے ماسول کوئی
لمبے اس کے بالوں کا میں وصف لکھا ہے دور تلک　　حرف مار تو طولانی تھا پھر بھی دے ہے طول کوئی
مستی حسن پرستی رندی یہی عمل ہے مدت سے　　پیر کبیر ہوئے تو کیا ہے چھوٹے ہے معمول کوئی
حرف و حکایت شکر و شکایت تھی اک وضع و وتیرہ پر
میر کو جا کر دیکھا ہم نے ہے مرد معقول کوئی

(۱۷۳۶)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک　　اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے
آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں　　کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں　　جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں　　ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے
کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ　　طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنے اساری جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں　　اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے
عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ جی اٹھتا ہے دیکھے اسے　　یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارہ جانے ہے
کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا　　جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے
رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی　　ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارہ جانے ہے
تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دمدار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

(۱۷۳۷)

جب جل گئے تب ان نے کینے کی ادا کی ہے　　چال ایسی چلا جس پر تلوار چلا کی ہے

خلقت مگر الفت سے ہے شورش سینہ کی
چسپاں مری چھاتی سے دن رات رہا کی ہے

ہم لوگوں کے لوہو میں ڈوبی ہی رہی اکثر
اس تیغ کی جدول بھی کیا تیز بہا کی ہے

عشاق موئے پر بھی ہجراں میں معذب ہیں
مدفن میں مرے ہر دم اک آگ لگا کی ہے

صد رنگ بہاراں میں اب کے جو کھلے ہیں گل
یہ لطف نہ ہو ایسی رنگینی ہوا کی ہے

مرنے کو رہے حاضر سو مارے گئے آخر
گو ان نے جفا کی ہے ہم نے تو وفا کی ہے

مایوس ہی رہتے ہیں بیمار محبت کے
اس درد کی مدت تک ہم نے بھی دوا کی ہے

آنا ادھر اس بت کا کیا میری کشش سے ہے
ہو موم جو پتھر تو تائید خدا کی ہے

دامانِ دراز اس کا جو صبح نہیں کھینچا
اے میر یہ کوتاہی شب دست دعا کی ہے

(۱۷۳۸)

ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی

شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے
مری سرگذشت اب ہوئی ہے کہانی

ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اس کی
کھنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی

ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے
یہی ہم سے ہے جب نہ تب اینچا تانی

بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی

(۱۷۳۹)

بے اس کے تیرے حق میں کوئی کیا دعا کرے
عاشق کہیں شتاب تو ہووے خدا کرے

اے سردمہر کوئی مرے رہ تو گرم ناز
پرسش کسو کے حال کی تیری بلا کرے

دامن بہت وسیع ہے آنکھوں کا اے سحاب
لازم ہے تجھ کو ان ہی کا پانی بھرا کرے

آکر بکھیرے پھول مری مشت خاک پر
مرغ چمن اگر حق صحبت ادا کرے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میر عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

(۱۷۴۰)

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

ہم تو عشق میں ناکس ٹھہرے کوئی نہ ادھر دیکھے گا
آنکھ اٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اس کی مروت ہے

ہائے غیوری جس کے دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا
دیکھیے اس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے

کوئی دم رونق مجلس کی اور بھی ہے اس دم کے ساتھ
یعنی چراغ صبح سے ہیں ہم دم اپنا بھی غنیمت ہے

خط آئے ظاہر ہے ہم پر بگڑی بھی اچھی صورت تھی
بارے کبھو ناکام ہی ہو یا کام کی بھی کچھ صورت ہے

ایک ورق پر تصویریں میں دیکھی ہیں لیلی و مجنوں کی
ایسی صورت حال کی اپنی ان دونوں کو حیرت ہے

خاک سے آدم کرکے اٹھایا جس کو دست قدرت نے
قدر نہیں کچھ اس بندے کی یہ بھی خدا کی قدرت ہے

صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا
آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جاتے یاں سے جسے دیکھو
وہ غم دیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

جب کچھ اپنے کنے رکھتے تھے تب بھی صرف تھا لڑکوں کا
اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر انھیں کی دولت ہے

(۱۷۴۱)

عشق کیا سو جان جلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی
کوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی

اب تو بڈھال پڑے رہتے ہیں ضعف ہی اکثر رہتا ہے
آئے گئے اس کے کوچے میں جب تک جی میں طاقت تھی

آب حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

آنسو ہوکر خون جگر کا بیتابانہ آیا تھا
شاید رات شکیبائی کی جلد بہت کچھ رخصت تھی

جب سے عشق کیا ہے میں نے سر پر میرے قیامت ہے
ساعت دل لگنے کی شاید نحس ترین ساعت تھی

(۱۷۴۲)

یاری کرے جو چاہے کسو سے غم ہی غم یاری میں ہے
بے موقع یاں آہ و فغاں ہے بے اثری زاری میں ہے

ہاتھ لیے آئینہ تجھ کو حیرت ہے رعنائی کی
ہے بھی زمانہ ہی ایسا ہر کوئی گرفتاری میں ہے

باغ میں شب جو روتا پھرتا ہوں اس بن میں سو صبح تلک
دانۂ اشک روش شبنم کے گل پر ہر کیاری میں ہے

صورتیں بگڑیں کتنی کیوں نہ اس کو توجہ کب ہے وہ
سامنے رکھے آئینہ مصروف طرحداری میں ہے

میر کوئی اس صورت میں امید بہی کی کیا رکھے
ایک جراحت سینے کے میرے ہر زخم کاری میں ہے

(۱۷۴۳)

دل بھی بھرا رہتا ہے میرا جی بھی رندھا کچھ جاتا ہے
کیا جانوں میں روؤں گا کیسا دریا چڑھتا آتا ہے

سچ ہے وہ جو کہا کرتا ہے کون ہے تو کیا سمجھے ہمیں
بیگانے تو ہیں ہی ہم وے ناؤں کا چاہ کا ناتا ہے

تو بلبل آزردہ نہ ہو گل پھول سے باغ بہاراں میں
رنج کش الفت ہے عاشق جی اپنا بہلاتا ہے

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے

عاشق اپنا جان لیا ہے ان نے شاید میرؔ ہمیں
دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

(۱۷۴۴)

اس مغرور کو کیا ہوتا ہے حال شکستہ دکھائے سے — جس کو شبہ ہووے نہ ہرگز جی کے ہمارے جائے سے
کیسا کیسا ہو کے جدا پہلو سے اس بن تڑپا ہے — کیا پوچھو ہو آئی قیامت سر پر دل کے لگائے سے
یمن تجرد سے میں اپنے روز جہاں سے گذرتا ہوں — وحشت ہے خورشید نمط اپنے بھی مجھ کو سائے سے
ہر کوے و ہر برزن میں یا پہر پہر وہ جویاں تھا — یا اب تنگ اسے آتا ہے پاس ہمارے آئے سے
ایک جراحت کیا تسکیں دے موت کے بھوکے صید کے تیں — شاید دل ہو تسلی اس کا زخم وگر کے کھائے سے
رنج و عنا پر درد و بلا پر صبر کیے ہم بیٹھے ہیں — کلفت الفت جاتی رہی کیا جور و ستم کے اٹھائے سے
اول تو آتے ہی نہیں ہو اور کبھو جو آتے ہو — نیچی آنکھیں کیے پھرتے ہو مجلس میں شرمائے سے

جھگڑا ناز و نیاز کا سن کر بے مزہ ہم سے تم تو ہوئے
میرؔ سخن کو طول نہ دو بس بات بڑھے ہے بڑھائے سے

(۱۷۴۵)

گردش دنوں کی کم نہ ہوئی کچھ کڑے ہوئے — روزے رکھے غریبوں نے تو دن بڑے ہوئے
نرمی سے کوے یار میں جاوے تو جا نسیم — ایسا نہ ہو کہ اکڑیں کہیں دل گڑے ہوئے
آہن دلوں نے مارا ہے جی غم میں ان کے ہم — پھرتے ہیں نعل سینوں پر اپنے جڑے ہوئے
آئے ہو بعد صلح کبھو ناز سے تو یاں — منھ پھیر ادھر سے بیٹھے ہو جیسے لڑے ہوئے
بیمار امیدوار سے بستر پہ اپنے ہم — دروازے ہی کی اور تکیں ہیں پڑے ہوئے
بار اس کی بزم میں نہیں ناچار در پہ ہم — رہتے ہیں جیسے صورت دیوار اڑے ہوئے

ہم زیر تیغ بیٹھے تھے پر وقت قتل میرؔ
وے ٹک ہمارے پاس نہ آکر کھڑے ہوئے

(۱۷۴۶)

عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے — ابر بہاری وادی سے اٹھ کر آبادی پر آیا ہے
سن کر میرے شور شب کو جھنجھلا کر وہ کہنے لگا — نالے اس کے فلک تک پہنچے کن نے اس کو ستایا ہے
دکھن اتر پورب پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ — اودھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے
بے چشم و رو ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ — کام کی صورت بگڑی ہماری منھ کیوں تم نے بنایا ہے
ظلم و ستم سب کل ہیں اس کے ہم سے اٹھتے ہیں کہ نہیں — لوگ جو پرسش حال کریں ہیں جی تو انھوں نے کھایا ہے

ہو کے فقیر تو واں بیٹھے ہیں رہتے ہیں اشراف جہاں
ہم نے توکل بحت کیا ہے نام خدا سرمایہ ہے

برسوں ہم درویش رہے ہیں پردے میں دنیاداری کے
ناموس اس کی کیونکے رہے یہ پردہ جن نے اٹھایا ہے

ڈھونڈ نکالا تھا جو اسے سو آپ کو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہم نے ویسا ہی پھل پایا ہے

میر غریب سے کیا ہو معارض گوشے میں اس وادی کے
ایک دیا سا بجھتا ان نے داغ جگر پہ جلایا ہے

(۱۷۴۷)

دل کی لاگ بری ہوتی ہے رہ نہ سکے تک جائے بھی
آئے بیٹھے اٹھ بھی گئے بیتاب ہوئے پھر آئے بھی

آنکھ نہ ٹک میلی ہوئی اپنی مطلق دل بے جا نہ ہوا
دل کی مصیبت کیسی کیسی کیا کیا رنج اٹھائے بھی

ٹھنڈے ہوتے نہ دیکھے ہرگز ویسے ہی جلتے رہتے ہیں
تلوے حنائی اس کے ہم نے آنکھوں سے سہلائے بھی

رنگ نہیں ہے منہ پہ کسی کے بادخزاں سے گلستاں میں
برگ و بار گرے بکھرے ہیں گل غنچے مرجھائے بھی

نفع کبھو دیکھا نہیں ہم نے ایسے خرج اٹھانے پر
دل کے گداز سے لوہو روئے داغ جگر پہ جلائے بھی

عشق میں اس کے جان مری مشتاق پھرے گی بھٹکی ہوئی
شوق اگر ہے ایسا ہی تو چین کہاں مرجائے بھی

تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گئی کچھ میر نہ اپنی سوانگ بہت سے لائے بھی

(۱۷۴۸)

کوئی نام اس کا نہ لو جبر ہے
کہ بیتاب دل کی بنا صبر ہے

نہ سوز جگر خاک میں بھی گڑا
موئے پر پرآتش مری قبر ہے

گلستاں کے ہیں دونوں پلے بھرے
بہار اس طرف اس طرف ابر ہے

جو درویش پہنے ہے ببری لباس
تو پھر عینۂ شیر ہے ببر ہے

در کعبہ پر کفر بکتا ہے میر
مسلماں نہیں وہ کہن گبر ہے

(۱۷۴۹)

ظلم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اٹھے ہیں درد کھنچے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب تک آہ سرد کھنچے

جیتے جی میت کے رنگوں عشق میں اس کے ہو بیٹھا
بعد مرے نقاش سے شاید صورت میری زرد کھنچے

خاک ہوئی تھی کشتی اپنی جوں کی توں اپنی طبیعت میں
میر عجب کیا ہے اس کا تا گردوں جو یہ گرد کھنچے

(۱۷۵۰)

عشق اگر ہے مرد میداں مرد کوئی عرصے میں لائے   یکسر ان نامردوں کو جو ایک ہی تک تک پا میں اٹھائے
کار عدالت شہر کا ہم کو اک دن دو دن ہووے تو پھر   چاروں اور منادی کریے کوئی کسی سے دل نہ لگائے
پر کے اسیر دام ہوئے تھے نکلے ٹوٹی شکن کی راہ   اب کے دیکھیں موسم گل کا کیسے کیسے شگوفے لائے
بھوکے مرتے مرتے منہ میں تلخی صفرا پھیل گئی   بے ذوقی میں ذوق کہاں جو کھانا پینا مجھ کو بھائے
گھر سے نکل کر کڑھے کڑھے پھر جاتا ہوں میں یعنی میرؔ
عشق و جنوں کا آوارہ حیران پریشاں کیدھر جائے

(۱۷۵۱)

ہم پہ خشم و خطاب ہے سو ہے   وہ ہی ناز و عتاب ہے سو ہے
گرچہ گھبرا کے لب پہ آئی ولے   جان کو اضطراب ہے سو ہے
بس گئی جاں خراب مدت کی   حال اپنا خراب ہے سو ہے
خشکی لب کی ہے تری کیسی   چشم لیکن پرآب ہے سو ہے
خاک جل کر بدن ہوا ہے سب   دل جلا سا کباب ہے سو ہے
کر گئے کاروانیاں شب گیر   وہ گراں مجھ کو خواب ہے سو ہے
یاں تو رسوا ہیں کیسا پردۂ شرم   اس کو ہم سے حجاب ہے سو ہے
دشمن جاں تو ہے دلوں میں بہم   دوستی کا حساب ہے سو ہے
زلفیں اس کی ہوا کریں برہم   ہم کو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے
خاک میں مل کے پست ہیں ہم تو   ان کی عالی جناب ہے سو ہے
شہر میں در بدر پھرے ہے عزیز
میرؔ ذلت کا باب ہے سو ہے

(۱۷۵۲)

چلتے ہوئے تسلی کو کچھ یار کہہ گئے   اس قافلے میں ہم بھی تھے افسوس رہ گئے
کیا کیا مکان شاہ نشیں تھے وزیر کے   وہ اٹھ گیا تو یہ بھی گرے بیٹھے ڈھہ گئے
اس کج روش سے ملنا خرابات میں نہ تھا   بے طور ہم بھی جا کے ملے بے جگہ گئے
وے زور ور جواں جنھیں کہیے پہاڑ تھے   جب آئی موج حادثہ تنکے سے بہ گئے
وہ یار تو نہ تھا تہ دل سے کسو کا میرؔ
ناچار اس کے جور و ستم ہم بھی سہ گئے

(۱۷۵۳)

ہائے جوانی وصل میں اس کے کیا کیا لذت پاتے تھے — بوسۂ کنج لب سے پھر بھی ذائقے اپنے بناتے تھے
کیا کیا تم نے فریب کیے ہیں سادگی میں دل لینے کو — ٹیڑھی کر کے کلاہ آتے تھے بے ناخوردہ ماتے تھے
ہائے جدائی ایک ہی جاگہ مار کے ہم کو توڑ رکھا — وے دن یاد آتے ہیں اب جب ان کے آتے جاتے تھے
غیروں کی تم سنتے رہے سو غیرت سے ہم سہتے رہے — وے تو تم کو لگا جاتے تھے تم آ ہم کو جلاتے تھے
رنج و الم غم عشق ہی کے اعجاز سے کھنچتے تھے ورنہ — حوصلہ کتنا اپنا جس میں یہ آزار سماتے تھے
وے دن کیسے سالتے ہیں جو آ کر سوتے پاتے کبھو — آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اس کو جگاتے تھے

چاہت روگ برا ہے جی کا میرؔ اس سے پرہیز بھلا
اگلے لوگ سنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے

(۱۷۵۴)

بات ہماری یاد رہے جی بھولا بھولا جاتا ہے — وحشت پر جب آتا ہے تو جیسے بگولا جاتا ہے
تھوڑے سے پانی میں میں نے سرکشی کی ہے جیسے حباب — کہتے ہیں بے تہ مجھ کو کیا ابھرا پھولا جاتا ہے

گام کی صورت کیا ہے اس کی راہ چلے ہے میرؔ اگر
دیکھنے والے کہتے ہیں یہ کوئی ہیولا جاتا ہے

(۱۷۵۵)

اس تک کوشش سے بھی نہ پہنچے جان سے آخر سارے گئے — عاشق اس کی قامت کے بالا بالا مارے گئے
اس کے روے خوے کردہ پہ نقاب لیے وہ صورت ہے — جیسے یکایک سطح ہوا پر بدلی آئی تارے گئے
ایسے قماری سے دل کو لگا کر جیتے رہنا ہو نہ سکا — رفتۂ شاہد بازی اس کے جی بھی اپنا ہارے گئے
چارہ گر اس شہر کے ہوں تو فکر کریں آبادی کا — یارب بستے تھے جو یاں وے لوگ کہاں بیچارے گئے

مشکل میرؔ نظر آتا تھا اٹھنا بار امانت کا
آئے ہم تو سہولت سے وہ بوجھ اٹھا کر بارے گئے

(۱۷۵۶)

عیدیں آئیں بارہا لیکن نہ وے آ کر ملے — رہتے ہیں ان کے گلے لگنے کے برسوں سے گلے
اس زمانے کی تری سے لہر بہر اگلی کہاں — بے تہی کرنے لگے دریا دلوں کے حوصلے
غنچگی میں دیکھے ہیں صد رنگ جور آسماں — اب جو گل سا بکھرا ہوں دیکھوں کہ کیسا گل کھلے
سارے عالم کے حواس خمسہ میں ہے انتشار — ایک ہم تم ہی نہیں معلوم ہوتے وہ دلے

میرؔ طے ہوگا بیابان محبت کس طرح
راہ ہے پرخار میرے پاؤں میں ہیں آبلے

(۱۷۵۷)

کبھی سعی و کشش کوشش سے کعبے گئے بت خانے سے　　اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا شرمندہ ہوئے ہم ہبانے سے
دامن پر فانوس کے تھا کچھ یوں ہی نشاں خاکستر کا　　شوق کی میں جو نہایت پوچھی جان جلے پروانے سے
نکلے سامنے آتے تھے تو کیا کیا زجر اٹھاتے تھے　　ننگ لگا ہے لگنے انھیں اب بات ہماری ماننے سے
پاس غیرت تم کو نہیں کچھ دریا پرسن غیر کو تم　　گھر سے اٹھ کے چلے جاتے ہو نہانے سکھی بہانے سے
تم نے کہا مر رہ بھی جاکر بندہ جاکر مر ہی رہا　　کس دن میں نے عدول کیا ہے صاحب کے فرمانے سے
سوکھ کے ہوں لکڑی سے کیوں نہ زرد و زبوں ہم عاشق زار　　کچھ نہیں رہتا انساں میں ہر لحظہ غم کے کھانے سے
جب دیکھو تب تربت عاشق جھکڑ سے ہے تزلزل میں　　عشق ہے باد صرصر کو یاں ان کی خاک اڑانے سے
برسوں میں پہچان ہوئی تھی سو تم صورت بھول گئے　　یہ بھی شرارت یاد رہے گی ہم کو نہ جانا جانے سے
سنی سنائی بات سے واں کی کب چیتے ہیں ہم غافل　　دونوں کان بھرے ہیں اپنے بے تہ یاں کے فسانے سے

میر کی تیری کیا سلجھے گی حرف و سخن میں گنجلک ہے
کوئی بھی عاقل الجھ پڑے ہے ناصح ایسے دوانے سے

(۱۷۵۸)

گئے روزے اب دید وادید ہے　　گلے سے ہمارے لگو عید ہے
گریزاں ہوں سائے سے خورشید ساں　　جہاں جب سے ہے مجھ کو تجرید ہے
تصرف میں جب ڈال دیتے ہیں بات　　خدا رس کہیں ہیں یہ توحید ہے
جو آویں بتاں جذب سے یاں تو یہ　　خدا کی طرف ہی کی تائید ہے

لپیٹا ہے میں بوریائے نماز
یہی میر جانے کی تمہید ہے

(۱۷۵۹)

ہجر میں خوں ہوا تھا سب غم سے　　دل نے پہلو تہی کیا ہم سے
عالم حسن ہے عجب عالم　　چاہیے عشق اس بھی عالم سے
طرح چھریوں کی پلکوں سے ڈالی　　نکلی تلوار ابرو کے خم سے
نسبت ان بالوں کی درست ہوئی　　دیر میں میرے حال درہم سے

درپئے خون میر کے نہ رہو
ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

(۱۷۶۰)

اٹھکھیلیوں سے چلتے طفلی میں جان مارے
نام خدا ہوا ہے اب وہ جوان بارے

اپنی نیاز تم سے اب تک بتاں وہی ہے
تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمھارے

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کرکے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے

کل میں جو سیر میں تھا کیا پھول پھول بیٹھی
بلبل لیے ہے گویا گلزار سب اجارے

کرتا ہے ابر نیساں پر در دہن صدف کا
منھ جو کوئی پسارے ایسے کنے پسارے

اے کاش غور سے وہ دیکھے کبھو ٹک آکر
سینے کے زخم اب تو غائر ہوئے ہیں سارے

چپکا چلا گیا میں آزردہ دل چمن سے
کس کو دماغ اتنا بلبل کو جو پکارے

میدان عشق میں سے چڑھ گھوڑے کون نکلا
مارے گئے سپاہی جتنے ہوئے اتارے

جو مر رہے ہیں اس پر ان کا نہیں ٹھکانا
کیا جانیے کہاں وے پھرتے ہیں مارے مارے

کیا برچھیاں چلائیں آہوں نے نیم شب کی
رخنے ہیں آسماں میں سارے نہیں ستارے

ہوتی ہے صبح جو یاں ہے شام سے بھی بدتر
کیا کہیے میر خوبی ایام کی ہمارے

(۱۷۶۱)

کیا کہیے ویسی صورت گاہے نظر نہ آئی
ایسے گئے کہ ان کی پھر کچھ خبر نہ آئی

روٹھے جو تھے سو ہم سے روٹھے ہوئے ودائی
کیا روئیے ہمیں تو منت بھی کر نہ آئی

طالع کا مکث دیکھو آئی صبا جو واں سے
چاروں طرف پھرا کی لیکن ادھر نہ آئی

جی میں جو کچھ کسو کے آوے سو باندھ جاوے
اپنے خیال میں تو اس کی کمر نہ آئی

کیا رات دن کٹے ہیں ہجراں کی بے خودی میں
سدھ اپنی میر اس بن دو دو پہر نہ آئی

(۱۷۶۲)

داد فریاد جابجا کریے
شاید اس کے بھی دل میں جا کریے

اب سلگنے لگی ہے چھاتی بھی
یعنی مدت پڑے جلا کریے

چشم و دل جان مائل خوباں
بدی یاروں کی کیا کیا کریے

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت
گالیاں کھایئے دعا کریے

کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو
کیونکر اظہار مدعا کریے

اتفاق ان کا مارے ڈالے ہے
ناز و انداز کو جدا کریے

عید ہی کاشکے رہے ہر روز   صبح اس کے گلے لگا کریے
راہ تکنے کو بھی نہایت ہے   منتظر کب تلک رہا کریے
ہستی موہوم و یک سر و گردن   سینکڑوں کیونکے حق ادا کریے
وہ نہیں سرگذشت سنتا میرؔ   ق   یوں کہانی سی کیا کہا کریے
مترتب ہو نفع جو کچھ بھی   دل کی بیماری کی دوا کریے
سو تو ہر روز ہے بتر احوال
متحیر ہیں آہ کیا کریے

(۱۷۶۳)

دو چار روز آگے چھاتی گئی تھی کوئی   ہجراں کا غم تھا تہ میں سختی سے جان ٹوٹی
کلیاں جھڑی ہیں کچی بکھرے ہیں پھول سارے   پائیز نے چمن میں کیا کیا بہار لوٹی
سیر چمن میں کچھ تو جی سے ہوس نکلتی
موسم میں گل کے بلبل افسوس ہے نہ چھوٹی

(۱۷۶۴)

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے   ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے
دل میں گرہ ہوس رہی پرواز باغ کی   موسم گلوں کا جب تئیں تھا ہم اسیر تھے
برنائی ہی میں تم سے شرارت نہیں ہوئی   لڑکے سے بھی تھے تم تو قیامت شریر تھے
آرائش بدن نہ ہوئی فقر میں بھی کم   جاگہ اتو کی جاے پہ نقش حصیر تھے
آنکھوں میں ہم کسو کی نہ آئے جہان میں
از بس کہ میرؔ عشق سے خشک و حقیر تھے

(۱۷۶۵)

جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزاری ہے   جی چکا وہ کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے
کارواں گاہ جہاں میں نہیں رہتا کوئی   جس کے ہاں دیکھتے ہیں چلنے کی تیاری ہے
چیز و ناچیز کا آگاہ کو رہتا ہے لحاظ   سارے عالم میں حقیقت تو وہی ساری ہے
آئینہ روبرو رکھنے کو بھی اب جاے نہیں   صورتوں سے اسے ہم لوگوں کی بیزاری ہے
مر گئے عشق میں نازک بدنوں کے آخر   جان کا دینا محبت کی گنہگاری ہے
پلکیں وے اس کی پھری جی میں کھبی جاتی ہیں   آنکھ وہ دیکھے کوئی شوخی میں کیا پیاری ہے
بے قراری میں نہ دلبر سے اٹھا ہرگز ہاتھ   عشق کرنے کے تئیں شرط جگرداری ہے

وائے وہ طائر بے بال ہوس ناک جسے — شوق گل گشت گلستاں میں گرفتاری ہے
جرم بے جرم کھنچی رہتی ہے جس کی شمشیر — اس ستم گار جفاجو سے ہمیں یاری ہے
آنکھ مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اس کی — یہ بھی اس سادہ و پرکار کی ہشیاری ہے
واں سے جز ناز و تبختر نہیں کچھ یاں سے میر
عجز ہے دوستی ہے عشق ہے غم خواری ہے

(۱۷۶۶)

درد و غم سے دل کبھو فرصت نہ پائے — یہ صعوبت کب تلک کوئی اٹھائے
طفل تہ بازار کا عاشق ہوں میں — دل فروشی کوئی مجھ سے سیکھ جائے
زار رونا چشم کا کب دیکھتے — دیکھیں ہیں لیکن خدا جو کچھ دکھائے
کب تلک چاک قفس سے جھانکیے — برگ گل یاں بھی صبا کوئی تو لائے
کب سے ہم کو ہے تلاش دست غیب — تا کمر پیچ اس کا اپنے ہاتھ آئے
اس کی اپنی بنتی ہی ہرگز نہیں — بگڑی صحبت ایسی کیا کوئی بنائے
جو لکھی قسمت میں ذلت ہو سو ہو — خط پیشانی کوئی کیونکر مٹائے
داغ ہے مرغ چمن پائیز سے — دل نہ ہو جلتا جو اس کا گل نہ کھائے
زخم سینہ میرا اس کے ہاتھ کا — ہو کوئی رجھواڑ تو اس کو رجھائے
میر اکثر عمر کے افسوس میں
زیر لب بالائے لب ہے ہائے وائے

(۱۷۶۷)

نوشتہ نامہ آیا یہ کچھ ہمیں لکھا ہے — اس سادہ رو کے جی میں کیا چاہیے کہ کیا ہے
کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا — ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے
دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسو کا — یہ تو سرائے فانی اک کارواں سرا ہے
بندے کا دل بجا ہے جاتا ہوں شاد ہر جا — جب سے سنا ہے میں نے کیا غم ہے جو خدا ہے
پائے ثبات کس کا ٹھہرا ہے اس کے دیکھے — ہے ناز اک قیامت انداز اک بلا ہے
ہرجا بدن میں اس کے افراط سے ہے دلکش — میں کیا دل ملک بھی اٹکے اگر بجا ہے
مرنا تو ایک دم ہے عاشق مرے ہے ہر دم — وہ جانتا ہے جس کو پاس دل وفا ہے
خط اس کو لکھ کے غم سے بے خود ہوا ہوں یعنی — قاصد کے بدلے یاں سے جی ہی مرا چلا ہے
شوخی سے اس کی درہم برہم جہاں ہے سارا — ہنگامۂ قیامت اس کی کوئی ادا ہے

عمر عزیز گذری سب سے برائی کرتے — اب کر چلو بھلا کچھ شاید یہی بھلا ہے

جو ہے سو میرؔ اس کو میرا خدا کہے ہے
کیا خاص نسبت اس سے ہر فرد کو جدا ہے

(۱۷۶۸)

دل پہلو میں ناتواں بہت ہے — بیمار مرا گراں بہت ہے
ہر آن شکیب میں کمی ہے — بیتابی زماں زماں بہت ہے
مقصود کو دیکھیں پہنچے کب تک — گردش میں تو آسماں بہت ہے
جی کو نہیں لاگ لامکاں سے — ہم کو کوئی دل مکاں بہت ہے
گو خاک سے گور ہووے یکساں — گم کشتے کا یہ نشاں بہت ہے
جاں بخشی غیر ہی کیا کر — مجھ کو یہی نیم جاں بہت ہے

اکثر پوچھے ہے جیتے ہیں میرؔ
اب تو کچھ مہرباں بہت ہے

(۱۷۶۹)

صاحب ہو تم ہمارے بندے ہیں ہم تمھارے — موقوف رحم پر ہیں دشوار کام سارے
ہو ملتفت کہ ہم بھی جیتوں میں آویں چندے — یہ عشق بے محابا تا چند جان مارے
آشوب بحر ہستی کیا جانیے ہے کب سے — موج و حباب اٹھ کر لگ جاتے ہیں کنارے
کوئی تو تھا طرف پر آواز دی نہ ہم کو — ہم بے قرار ہوکر چاروں طرف پکارے
بے طاقتی سے کیونکر سر مارتے رہیں نہ — صبر و قرار دونوں یک بارگی سدھارے
کوئی تو ماہ پارہ اس بھی رواق میں ہے — چشمک کریں ہیں ہر شب اس کی طرف ستارے

دنیا میں میرؔ آکر کھولا ہے بار ہم نے
اس رہگذر میں دیکھیں کیا پیش آوے بارے

(۱۷۷۰)

عشق ہمارا در پئے جاں ہے کیسی خصومت کرتا ہے — چین نہیں دیتا ہے ظالم جب تک عاشق مرتا ہے
شاید لمبے بال اس مہ کے بکھر گئے تھے باؤ چلے — دل تو پریشاں تھا ہی میرا رات سے جی بھی بکھرتا ہے
صورت اس کی دیدۂ تر میں پھرتی ہے ہر روز و شب — ہے نہ اچنبھا یہ بھی کہیں پانی میں نقش ابھرتا ہے
کیا دشوار گذر ہے طریق عشق مسافر کش یارو — جی سے اپنے گذر جاتا ہے جو اس راہ گذرتا ہے
حال کسو بے تہ کا یاں مانا ہے حباب دریا سے — تک جو ہوا دنیا کی لگی تو یہ کم ظرف ابھرتا ہے

یاد خدا کو کرکے کبھو ٹک پاس ہمارے ہوجاوے   صد سالہ غم دیکھے اس خوش چشم و رو کے بسرتا ہے
دامن دیدۂ تر کی وسعت دیکھے ہی بن آوے گی   ابر سیاہ و سفید جو ہو سو پانی ان کا بھرتا ہے
دل کی آگ نہیں چھپتی ہے کوئی چھپاوے بہتیرا   زردی عشق سے بے الفت یہ رنگ کسو کا نکھرتا ہے
کھینچ کے تیغہ اپنا ہر دم کیا لوگوں کو ڈراتے ہو
میؔر جگر دار آدمی ہے وہ کب مرنے سے ڈرتا ہے

(۱۷۷۱)

نالہ جب گرم کار ہوتا ہے   دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
مار رہتا ہے اس کو آخرکار   عشق کو جس سے پیار ہوتا ہے
سب مزے درکنار عالم کے   یار جب ہم‌کنار ہوتا ہے
دام کہ کا ہے اس کے عالم اور   ایک عالم شکار ہوتا ہے
بے قراری ہو کیوں نہ چاہت میں   ہم دگر کچھ قرار ہوتا ہے
جبر ہے قہر ہے قیامت ہے   دل جو بے اختیار ہوتا ہے
راہ تکتے ہی بیٹھیں ہیں آنکھیں   اس کا جب انتظار ہوتا ہے
شاخ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں   جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے
کس کو پوچھے ہے کوئی دنیا میں   دیر یاں اعتبار ہوتا ہے
آہ کس جاے بار کھولا میؔر
یاں تو جینا بھی بار ہوتا ہے

(۱۷۷۲)

سخت بے رحم آہ قاتل ہے   میری خوں ریزی ہی کا مائل ہے
دور مجنوں کا ہوگیا آخر   یاں جنوں کا ابھی اوائل ہے
نکلے اس راہ کس طرح وہ ماہ   نہ تو طالع نہ جذب کامل ہے
مثل صورت ہیں جلوہ کے حیراں   ہائے کیا شکل کیا شمائل ہے
ہاتھ رکھ لیوے تو کہے کہ بس اب   کیا جیے گا بہت یہ گھائل ہے
حق میں اس بت کے بد کہیں کیونکر   وہ ہمارا خداے باطل ہے
سچ ہے راحت تو بعد مرنے کے   پر بڑا واقعہ یہ ہائل ہے
تیغ اگر درمیاں رہے تو رہے   یار میرا جوان جاہل ہے
رو نہیں چشم تر سے اب رکھیے   سیل اسی در کا کب سے سائل ہے

حال ہم ڈوبتوں کا کیا جانے   جس کو دریا پہ سیر ساحل ہے
میر کب تک بحال مرگ جئیں
کچھ بھی اس زندگی کا حاصل ہے

(۱۷۷۳)

بے کسانِ عشق تھے ہم غم میں کھپ سارے گئے   بازخواہ خوں نہ تھا مارے گئے مارے گئے
بار کل تک ناتوانوں کو نہ تھا اس بزم میں   گرتے پڑتے ہم بھی عاجز آج واں بارے گئے
چھاتی میری سرد آہوں سے ہوئی تھی سب کرخت   استخواں اب اس کے اشک گرم سے دھارے گئے
بخت جاگے ہی نہ ٹک جو ہو خبر گھر میں اسے   صبح تک ہم رات دیواروں سے سر مارے گئے
میر قیس و کوہکن ناچار گذرے جان سے
دو جہاں حسرت لیے ہمراہ بیچارے گئے

(۱۷۷۴)

بے یار ہوں بیکس ہوں آگاہ نہیں کوئی   بے غم کرو خوں ریزی خوں خواہ نہیں کوئی
کیا تنگ مخوف ہے اس نیستی کا رستہ   تنہا پڑا ہے جانا ہمراہ نہیں کوئی
موہوم ہے ہستی تو کیا معتبری اس کی   ہے گاہ اگر کوئی تو گاہ نہیں کوئی
فرہاد کو مجنوں کو موت آگئی ہے آگے   کس سے کہیں درد دل اب آہ نہیں کوئی
میر اتنی ساجت جو بندوں سے تو کرتا ہے
دنیا میں مگر تیرا اللہ نہیں کوئی

(۱۷۷۵)

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے   دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
آندھی آئی ہوگیا عالم سیاہ   شور نالوں کا بلائے دہر ہے
دل جو لگتا ہے تڑپنے ہر زماں   اک قیامت ہے غضب ہے قہر ہے
بہ نہیں ہوتا ہے زخم اس کا لگا   آب تیغ یار یکسر زہر ہے
یاد زلف یار جی مارے ہے میر
سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے

(۱۷۷۶)

عشق بلاانگیز مفتن یہ تو کوئی قیامت ہے   جس سے پیار رکھے ہے کچھ یہ اس کے سر پر شامت ہے

موسم گل میں توبہ کی تھی واعظ کے میں کہنے سے
اب جو رنگ بہار کے دیکھے شرمندہ ہیں ندامت ہے

شیخ کی ادنیٰ حرکت بھی میں خرق عادت جانوں ہوں
مسجد سے میخانے آیا یہ بھی اس کی کرامت ہے

ایک طرف میں عشق کیا تھا رسوائی یہ کہاں سے ہوئی
اب جو گھر سے نکل آتا ہوں چاروں طرف سے ملامت ہے

تو ہی کر انصاف صبا ٹک باغوں باغوں پھرے ہے تو
روے گل اس کا سا رو ہے سرو کا ایسا قامت ہے

صبح کو خورشید اس کے گھر پر طالع ہوکر آتا ہے
دیکھ لیا جوان نے کبھو تو اس سادہ کی شامت ہے

چھوڑو اس اوباش کا ملنا ورنہ سر کٹواؤ گے
چاہ رہوگے بہتیروں کو سر جو میر سلامت ہے

(۱۷۷۷)

اے پریشاں ربط دیکھیں کب تلک یہ دور ہے
ہر گلی کوچے میں تیرا اک دعا گو اور ہے

بال بل کھائے ہوئے پیچوں سے پگڑی کے گھتے
طرز کیں چتون کی پائی سر میں شور جور ہے

ہم سے یہ انداز اوباشانہ کرنا کیا ضرور
آنکھ ٹیڑھی خم ہے ابرو طور کچھ بے طور ہے

طبع درہم وضع برہم زخم غائر چشم تر
حال بد میں بیکسوں کے کچھ تمھیں بھی غور ہے

کیا شکایت کریے اس خورشید چہرہ یار کی
مہر وہ برسوں نہیں کرتا ستم فی الفور ہے

وصل کی دولت گئی ہوں تنگ فقر ہجر میں
یا الٰہی فضل کر یہ حور بعد الکور ہے

اس کے دیوانے کے سر پر داغ سودا ہے جو میر
وہ مخبط عاشقوں کا اس سبب سرور ہے

(۱۷۷۸)

گردن کش زمانہ تو تیرا اسیر ہے
سلطان عصر تیری گلی کا فقیر ہے

چشمک کرے ہے میری طرف کو نگاہ کر
وہ طفل شوخ چشم قیامت شریر ہے

تنکا سا ہو رہا ہے تن آگے ہی سوکھ کر
اب تنگ کیا فقیر جو سب میں حقیر ہے

جھڑ باندھ دے ہے رونے جو لگتا ہوں صبح کو
ہے چشم تر کہ غیرت ابر مطیر ہے

اک دو اجل رسیدہ جو صید آئے کب کھنچا
پرپیچ جال گیسوؤں کا جرگہ گیر ہے

جوں جوں بڑھاپا آتا ہے جاتے ہیں اینٹھتے
کس مٹی کا نہ جانیے اپنا خمیر ہے

اس خوبصورتی سے نہ صورت نظر پڑی
سورت تلک تو سیر کی وہ بےنظیر ہے

پر جوہر اس کی تیغ ہے نامہ براے قتل
پیغام مرگ عاشقوں کو اس کا تیر ہے

پوچھو اسی سے مضطرب الحال دل کی کچھ
وہ آفتاب چہرۂ روشن ضمیر ہے

جوں طفل شوخ و شنگ و جوان بلند طبع
شائستۂ فلک ہے اگر چرخ پیر ہے

فریاد شب کی سن کے کہا بے دماغ ہو
دیکھو تو اس بلا کو یہ شاید کہ میر ہے

(۱۷۷۹)

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے　　عشق ہے فقر ہے جدائی ہے
دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے　　ہم بھی چلنے کو ہیں کہ آئی ہے
استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں　　عشق نے آگ یہ لگائی ہے
دل کو کھینچے ہے چشمک انجم　　آنکھ ہم نے کہاں لڑائی ہے
اس صنائع کا اس بدائع کا　　کچھ تعجب نہیں خدائی ہے
نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا　　کیونکے کہیے کہ واں رسائی ہے
ہے تصنع کہ اس کے لب ہیں لعل　　سب نے اک بات یہ بنائی ہے
کیا کہوں خشم عشق سے جو مجھے　ق　کبھو جھنجھلاہٹ آہ آئی ہے
ایسا چہرے پہ ہے نہوں کا خراش　　جیسے تلوار منہ پہ کھائی ہے
میں نہ آتا تھا باغ میں اس بن　　مجھ کو بلبل پکار لائی ہے
آئی اس جنگ جو کی گر شب وصل　　شام سے صبح تک لڑائی ہے
اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں　　گاہ و بےگہ غزل سرائی ہے

توڑ کر آئینہ نہ جانا یہ
کہ ہمیں صورت آشنائی ہے

(۱۷۸۰)

گل قفس تک نسیم لائی ہے　　بو گہ پھر کر بہار آئی ہے
عشق دریا ہے ایک لنگروار　　تہ کسو نے بھی اس کی پائی ہے
وہ نہ شرماوے کب تلک آخر　　دوستی یاری آشنائی ہے
وے نہیں تو انھوں کا بھائی اور　　عشق کرنے کی کیا منائی ہے
بے ستوں کوہکن نے کیا توڑا　　عشق کی زور آزمائی ہے
بھیڑیں ٹلتی ہیں اس کے ابرو ہلے　　چلی تلوار تو صفائی ہے
لڑکا عطار کا ہے کیا معجون　　ہم کو ترکیب اس کی بھائی ہے
کج روی یار کی نہیں جاتی　　یہی بے طور بے ادائی ہے
آنے کہتا ہے پھر نہیں آتا　　یہی بدعہدی بے وفائی ہے
ٹک چلو نیکی اب تو بس تس سے　　شاید اس ہی میں کچھ بھلائی ہے

برسوں میں میر سے ملے تو کہا
اس سے پوچھو کہ یہ کجائی ہے

(۱۷۸۱)

یارب کوئی دیوانہ بے ڈھنگ سا آجاوے   اغلال و سلاسل تک اپنی بھی ہلا جاوے
خاموش رہیں کب تک زندان جہاں میں ہم   ہنگامہ قیامت کا شورش سے اٹھا جاوے
کب عشق کی وادی ہے سر کھینچنے کی جاگہ   ہو سیل بھلا سا تو منھ موڑ چلا جاوے
عاشق میں ہے اور اس میں نسبت سگ و آہو کی   جوں جوں ہو رمیدہ وہ توں توں یہ لگا جاوے
افسوس کی جاگہ ہے یاں باز پسیں دم میں   ہو روبرو آئینہ وہ منھ کو چھپا جاوے
ان نوخطوں سے میری قسمت میں تو تھی خواری   کس طرح لکھا میرا کوئی آکے مٹا جاوے
دیکھ اس کو ٹھہر رہنا ثابت قدموں سے ہو   اس راہ سے آوے تو ہم سے نہ رہا جاوے
کیسے جہاں کرتا ہو تاثیر سخن کچھ بھی   وہ بات نہیں سنتا کیا اس سے کہا جاوے
یہ رنگ رہے دیکھیں تاچند کہ وہ گھر سے   کھاتا ہوا پان آکر باتوں کو چبا جاوے
ہم دیر کے جنگل میں بھولے پھرے ہیں کب کے   کعبے کا ہمیں رستہ خضر آکے بتا جاوے
ہاتھوں گئی خوباں کے کچھ شے نہیں پھر ملتی   کیونکر کوئی اب ان سے دل میرا دلا جاوے
یہ ذہن و ذکا اس کا تائید ادھر کی ہے   ٹک ہونٹ ہلے تو وہ تہ بات کی پا جاوے
یوں خط کی سیاہی ہے گرد اس رخ روشن کے   ہر چار طرف گاہے جوں بدر گھرا جاوے
کیا اس کی گلی میں ہے عاشق کسو کی رویت   آلودۂ خاک آوے لوہو میں نہا جاوے

ہے حوصلہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا
کس سے یہ ستم ورنہ اے میر سہا جاوے

(۱۷۸۲)

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے   خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا درد لذت سے خالی   جسے ذوق ہے وہ مزہ جانتا ہے
ہمیشہ دل اپنا جو بے جا ہے اس بن   مرے قتل کو وہ بجا جانتا ہے
گہے زیر برقع گہے گیسوؤں میں   غرض خوب وہ منھ چھپا جانتا ہے
مجھے جانے ہے آپ سا ہی فریبی   دعا کو بھی میری دغا جانتا ہے
جفا اس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ   جنھیں یار اہل وفا جانتا ہے
لگا نے ہے جھمکے دکھاکر اسی کو   جسے مغ بچہ پارسا جانتا ہے
اسے جب نہ تب ہم نے بگڑا ہی پایا   یہی اچھے منھ کو بنا جانتا ہے
بلا شور انگیز ہے چال اس کی   اسی طرز کو خوش نما جانتا ہے
نہ گرمی جلاتی تھی ایسی نہ سردی   مجھے یار جیسا جلا جانتا ہے

یہی ہے سزا چاہنے کی ہمارے ہمیں کشتہ خوں کے سزا جانتا ہے
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی تجھی تو جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
پری اس کے سائے کو بھی لگ سکے نہ وہ اس جنس کو کیا بلا جانتا ہے
جہاں میرؔ عاشق ہوا خوار ہی تھا
یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

(۱۷۸۴)

یہی عشق ہے جی کھپا جانتا ہے کہ جاناں سے بھی جی ملا جانتا ہے
بدی میں بھی کچھ خوبی ہووے گی تب تو برا کرنے کو وہ بھلا جانتا ہے
مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے کسو اور ہی کا کہا جانتا ہے
زمانے کے اکثر ستم گار دیکھے وہی خوب طرز جفا جانتا ہے
نہیں جانتا حرف خط کیا ہیں لکھے لکھے کو ہمارے مٹا جانتا ہے
نہ جانے جو بیگانہ تو بات پوچھے سو مغرور کب آشنا جانتا ہے
نہیں اتحاد تن و جاں سے واقف
ہمیں یار سے جو جدا جانتا ہے

دیوان ششم

دیوان ششم

ردیف الف

(۱۷۸۴)

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا   نظر میں اس کی میں تو بھی نہ آیا
زمانے میں مرے شور جنوں نے   قیامت کا سا ہنگامہ اٹھایا
بلا تھی کوفت کچھ سوز جگر سے   ہمیں تو کوٹ کوٹ ان نے جلایا
تمامی عمر جس کی جستجو کی   اسے پاس اپنے اک دم بھی نہ پایا
نہ تھی بیگانگی معلوم اس کی   نہ سمجھے ہم اسی سے دل لگایا
قریب دیر خضر آیا تھا لیکن   ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا
حق صحبت نہ طیروں کو رہا یاد   کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا
غرور حسن اس کا دس گنا ہے   ہمارا عشق اسے کن نے جتایا
عجب نقشہ ہے نقاش ازل نے   کوئی ایسا نہ چہرہ پھر بنایا

علاقہ میر تھا خنجر سے اس کے
ندان اپنا گلا ہم نے کٹایا

(۱۷۸۵)

اپنے ہوتے تو با عتاب رہا   بے دماغی سے با خطاب رہا
ہو کے بے پردہ ملتفت بھی ہوا   ناکسی سے ہمیں حجاب رہا
نہ اٹھا لطف کچھ جوانی کا   کم بہت موسم شباب رہا
کارواں ہائے صبح ہوتے گیا   میں ستم دیدہ محو خواب رہا
ہجر میں جی ڈھہا گرے ہی رہے   ضعف سے حال دل خراب رہا
گھر سے آئے گلی میں سو باری   یار بن دیر اضطراب رہا
ہم سے سلجھے نہ اس کے الجھے بال   جان کو اپنی پیچ و تاب رہا
پردے میں کام یاں ہوا آخر   واں سدا چہرے پر نقاب رہا
سوزش سینہ اپنے ساتھ گئی   خاک میں بھی ہمیں عذاب رہا

حیف ہے میر کی جناب سے میاں
ہم کو ان سمجھے اجتناب رہا

(۱۷۸۶)

بے طاقتی نے دل کی گرفتار کردیا   اندوہ و درد عشق نے بیمار کردیا

دروازے پر کھڑا ہوں کئی دن سے یار کے　　حیرت نے حسن کی مجھے دیوار کردیا
سائے کو اس کے دیکھ کے وحشت بلا ہوئی　　دیوانہ مجھ کو جیسے پریدار کردیا
نسبت ہوئی گناہوں کی از بس مری طرف　　بے جرم ان نے مجھ کو گنہگار کردیا
دن رات اس کو ڈھونڈھے ہے دل شوق نے مجھے　　نایاب کس گہر کا طلبگار کردیا
دور اس سے زار زار جو روتا رہا ہوں میں　　لوگوں کو میری زاری نے بیزار کردیا
خوبی سے بخت بد کی اسے عشق سے مرے　　یاروں نے رفتہ رفتہ خبردار کردیا
جس کے لگائی جی میں نہ اس کے ہوس رہی　　یعنی کہ ایک وار ہی میں پار کردیا
پہلو میں دل نے لوٹ کے آتش سے شوق کی　　پایان کار آنکھوں کو خونبار کردیا

کیا جانوں عشق جان سے کیا چاہتا ہے میر
خوں ریزی کا مجھے تو سزاوار کردیا

(۱۷۸۷)

موئے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا　　نہ جانا ان نے تو یوں بھی کہ کیا تھا
معالج کی نہیں تقصیر ہرگز　　مرض ہی عاشقی کا لا دوا تھا
نہ خود سر کیونکے ہوں ہم یار اپنا　　خودآرا خودپسند و خودستا تھا
رکھا تھا منہ کبھو اس کنج لب پر　　ہمارے ذوق میں اب تک مزہ تھا
نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے　　نہ جانا تجھ سے یہ کن نے کہا تھا
پریشاں کر گئی فریاد بلبل　　کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا
ملے برسوں وہی بیگانگی تھی　　ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد　　ہمارا طور عشق ان سے جدا تھا
بدن میں صبح سے تھی سنسناہٹ　　انھیں سناہٹوں میں جی جلا تھا
صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم　　کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا
بدن میں اس کے ہے ہرجائے دلکش　　جہاں اٹکا کسو کا دل بجا تھا
کوئی عنقا سے پوچھے نام تیرا　　کہاں تھا جب کہ میں رسوا ہوا تھا

چڑھی تیوری چمن میں میر آیا
کلک خسپ آج شاید کچھ خفا تھا

(۱۷۸۸)

سوز دروں سے مجھ پہ ستم برملا ہوا　　ٹکڑا جگر کا آنکھوں سے نکلا جلا ہوا

بدحال ہوکے چاہ میں مرنے کا لطف کیا　　دل لگتے جو موا کوئی عاشق بھلا ہوا
نکلا گیا نہ دام سے پرپیچ زلف کے　　اے وائے یہ بلا زدہ دل مبتلا ہوا
کیا اور لکھیے کیسی خجالت مجھے ہوئی　　سر کو جھکائے آیا جو قاصد چلا ہوا
رہتا نہیں تڑپنے سے ٹک ہاتھ کے تلے
کیا جانوں میر دل کو مرے کیا بلا ہوا

(۱۷۸۹)

جمع اس کے نکلے عالم ہوگیا　　جب تلک ہم جائیں اودھم ہوگیا
گو پریشاں ہوگئے گیسوے یار　　حال ہی اپنا تو درہم ہوگیا
کیا کہوں کیا طرح بدلی یار نے　　چاؤ تھا دل میں سو اب غم ہوگیا
کیا لکھوں مشکل ہوئی تحریر حال　　خط کا کاغذ رونے سے نم ہوگیا
دم دیے بہتیرے یاروں نے ولے　　خشک نے سا شیخ بے دم ہوگیا
کیوں نہ درہم برہم اپنا ہو مزاج　　بات کہتے یار برہم ہوگیا
باغ جیسے راغ وحشت گاہ ہے　　یاں سے شاید گل کا موسم ہوگیا
کیا نماز اے میر اس اوقات کی
جب کہ قد محراب سا خم ہوگیا

(۱۷۹۰)

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا　　سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا
گلشن کے طائروں نے کیا بے مروتی کی　　یک برگ گل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا
بے پیچ اس کا غصہ یارو بلاے جاں ہے　　ہرگز منا نہ ہم سے بہتیرا ہی منایا
قد بلند اگرچہ بے لطف بھی نہیں ہے　　سرو چمن میں لیکن انداز وہ نہ پایا
انگڑاتے خوبرو یاں حسرت سے پیش و پس ہیں　　اینڈا پھرے ہے ہرسو جب اس پری کا سایا
نقشہ عجب ہے اس کا نقاش نے ازل کے　　مطبوع ایسا چہرہ کوئی نہ پھر بنایا
شب کو نشے میں باہم تھی گفتگوے درہم　　اس مست نے جھنکایا یعنی بہت چھکایا
دل بستگی میں کھلتا اس کا نہ اس سے دیکھا　　بخت نگوں کو ہم نے سو بار آزمایا
عاشق جہاں ہوا ہے بے ڈھنگیاں ہی کی ہیں
اس میر بے خرد نے کب ڈھب سے دل لگایا

(۱۷۹۱)

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا　　پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

سعی و تلاش بہت سی رہے گی اس انداز کے کہنے کی / صحبت میں علما فضلا کی جاکر پڑھیے گنیے گا
دل کی تسلی جب کہ نہ ہوگی گفت و شنود سے لوگوں کی / آگ پھنکے گی غم کی بدن میں اس میں جلیے بھنیے گا

گرم اشعار میؔر درونہ داغوں سے یہ بھر دیں گے
زرد رو شہر میں پھریے گا گلیوں میں نے گل چنیے گا

(۱۷۹۲)

تھا اندوہ گرہ مدت سے دل میں خوں ہو درد ہوا / چاہ نے بدلے رنگ کئی اب جسم سراسر زرد ہوا
وعدہ خلافی اس ظالم کی کھا گئی میری جان غمیں / گرمی کرے وہ مجھ سے جب تک تب تک میں ہی سرد ہوا

گرد و غبار و دشت و وادی گریے سے میرے یک سو ہیں
رونے کے آگے ان کے تو دریا بھی میؔر اب گرد ہوا

(۱۷۹۳)

میں رنج عشق کھینچے بہت ناتواں ہوا / مرنا تمام ہو نہ سکا نیم جاں ہوا
بستر سے اپنے اٹھ نہ سکا شب ہزار حیف / بیمار عشق چار ہی دن میں گراں ہوا
شاید کہ دل تڑپنے سے زخم دروں پھٹا / خوناب میری آنکھوں سے منھ پر رواں ہوا
غیر از خدا کی ذات مرے گھر میں کچھ نہیں / یعنی کہ اب مکان مرا لامکاں ہوا
مستوں میں اس کی کیسی تعین سے ہے نشست / شیشہ ہوا نہ کیف کا پیر مغاں ہوا
سائے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر / صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
ہم نے نہ دیکھا اس کو سو نقصان جاں کیا / ان نے جو اک نگاہ کی اس کا زیاں ہوا
ٹک رکھ لے ہاتھ تن میں نہیں اور جائے زخم / بس میرے دل کا یار جی اب امتحاں ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آکے پھر گئے / میں بے دیار و بیدل و بے خانماں ہوا
گردش نے آسماں کی عجائب کیا سلوک / پیر کبیر جب میں ہوا وہ جواں ہوا
مرغ چمن کی نالہ کشی کچھ خنک سی تھی / میں آگ دی چمن کو جو گرم فغاں ہوا
دو پھول لاکے پھینک دیے میری گور پر / یوں خاک میں ملا کے مجھے مہرباں ہوا
سر کھینچا دود دل نے جہاں تیرہ ہوگیا / دم بھر میں صبح زیر فلک کیا سماں ہوا

کہتے ہیں میؔر سے کہیں اوباش لڑ گئے
ہنگامہ ان سے ایسا الٰہی کہاں ہوا

(۱۷۹۴)

جس رفتنی کو عشق کا آزار ہوگیا / دوچار دن میں برسوں کا بیمار ہوگیا

نسبت بہت گناہوں کی میری طرف ہوئی
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہوگیا

حیرت زدہ میں عشق کے کاموں کا یار کے
سو روزنے پہ کھڑے کھڑے دیوار ہوگیا

پھیلے شگاف سینے کے اطراف درد سے
کوچہ ہر ایک زخم کا بازار ہوگیا

بازار میں جہان کے ہے حسن کیا متاع
سو جی سے جس نے دیکھا خریدار ہوگیا

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا نداں
جس بے وفا سے اپنے تئیں پیار ہوگیا

عاشق کو اس کی تیغ سے ہے لاگ کھینچتے ہی
یہ کشتنی بھی مرنے کو تیار ہوگیا

مرتے موا رہا نہ ہوا تنگ ہی رہا
پھندے میں عشق کے جو گرفتار ہوگیا

کیا جرم تھا کسو پہ نہ معلوم کچھ ہوا
جو میرؔ کشت و خوں کا سزاوار ہوگیا

(۱۷۹۵)

دشمن ہو جی کا گاہک ہوتا ہے جس کو چاہا
کی دوستی کہ یارو اک روگ میں بساہا

جی ہے جہاں قیامت درد و الم رہا واں
بیمار عاشقی میں شب صبح تک کراہا

تازہ جھمک تھی شب کو تاروں میں آسماں کے
اس آسیا کو شاید پھر کر کنھوں نے راہا

خمیازہ کش ہوں اس کی مدت سے اس ادا کا
لگ کر گلے سے میرے انگڑائی لے جماہا

جانا کہ منھ کھلا ہے آتش کدے کا شاید
سینے کے زخم سے جو سرکا ہے ٹک بھی پھاہا

آنکھیں مری لگو ہیں بے جا نہیں لگیں ہیں
دیکھا ہے جن نے اس کو اس نے مجھے سراہا

میں راہ عشق میں تو آگے ہی دو دلا تھا
پر پیچ پیش آیا ان زلفوں کا دوراہا

کرنا وفا نہیں ہے آسان عاشقی میں
پتھر کیا جگر کو تب چاہ کو نباہا

کہتے تو تھے نہ دیکھو اس سے لگے نہ جاؤ
سمجھے نہ دیدہ و دل اب کیا کہوں الٰہا

یا مرتضیٰ علیؑ ہے تیرا گدائے در یہ
کر حال میرؔ پر بھی ٹک التفات شاہا

(۱۷۹۶)

بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا
میں بے دماغ باغ سے اٹھ کر چلا گیا

لوگوں نے پائی راکھ کی ڈھیری مری جگہ
اک شعلہ میرے دل سے اٹھا تھا چلا گیا

چہرے پہ بال بکھرے رہے سب شب وصال
یعنی کہ بے مروتی سے منھ چھپا گیا

چلنا ہوا تو قافلۂ روزگار سے
میں جوں صدا جرس کی اکیلا جدا گیا

کیا بات رہ گئی ہے مرے اشتیاق سے
رقعے کے لکھتے لکھتے ترسل لکھا گیا

سب زخم صدر ان نے نمک بند خود کیے
صحبت جو بگڑی اپنے میں سارا مزہ گیا

سارے حواس میرے پریشاں ہیں عشق میں — اس راہ میں یہ قافلہ سارا لٹا گیا
بادل گرج گرج کے سناتا ہے یعنی یاں — نوبت سے اپنی ہر کوئی نوبت بجا گیا
وے محو ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف — میں منتظر تو جی سے گیا ان کا کیا گیا
دل دے کے جان میؔر نے پایان کار دی
یہ سادہ لوح طرح نئی دل لگا گیا

(۱۷۹۷)

میں ہوں خاک افتادہ جس آزار کا — عشق بھی اس کا ہے نام اک پیار کا
بیچتا سرکیوں نہ گلیوں میں پھروں — میں ہوں خواہاں لطف تہ بازار کا
خون کرکے تنک نہ دل ان نے لیا — کشتہ و مردہ ہوں اس اصرار کا
گھر سے وہ معمار کا جو اٹھ گیا — حال ابتر ہوگیا گھر بار کا
نقل اس کی بے وفائی کی ہے اصل — کب وفاداری ہے شیوہ یار کا
سر جو دے دے مارتے گھر میں پھرے — رنگ دیگر ہے در و دیوار کا
اک گدائے در ہے سیلاب بہار — غم کشوں کے دیدۂ خونبار کا
دلبراں دل جنس ہے گنجائشی — اس میں کچھ نقصاں نہیں سرکار کا
عشق کا مارا ہے کیا پنپے گا میؔر
حال ہے بدحال اس بیمار کا

(۱۷۹۸)

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا — تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا
غم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو — ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہوگا
جو افراط الفت ہے ایسا تو عاشق — کوئی دن میں برسوں کا بیمار ہوگا
اچٹتی ملاقات کب تک رہے گی — کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہوگا
تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا — کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہوگا
لگا کرنے ہجران سختی سی سختی — خدا جانے کیا آخر کار ہوگا
یہی ہوگا کیا ہوگا میؔر ہی نہ ہوں گے
جو تو ہوگا بے یار و غم خوار ہوگا

(۱۷۹۹)

دیر بدعہد وہ جو یار آیا — دور سے دیکھتے ہی پیار آیا

بیقراری نے مار رکھا ہمیں
اب تو اس کے تئیں قرار آیا

گرد رہ اس کی اب اٹھو نہ اٹھو
میری آنکھوں ہی پر غبار آیا

اک خزاں میں نہ طیر بھی بولا
میں چمن میں بہت پکار آیا

ہار کر میں تو کاٹتا تھا گلا
وہ قماری گلے کا ہار آیا

طائر عمر کو نظر میں رکھ
غیب سے ہاتھ یہ شکار آیا

موسم آیا تو نخل دار میں میر
سر منصور ہی کا بار آیا

(۱۸۰۰)

زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا
ہزار مرتبہ منھ تک مرے جگر آیا

رہیں جو منتظر آنکھیں غبار لائیں ولے
وہ انتظارکشوں کو نہ ٹک نظر آیا

ہزار طرح سے آوے گھڑی جدائی میں
ملاپ جس سے ہو ایسا نہ یک ہنر آیا

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا
کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

یہ لہر آئی گئی روز کالے پانی تک
محیط اس مرے رونے کو دیکھ تر آیا

نثار کیا کریں ہم خانماں خراب اس پر
کہ گھر لٹا چکے جب یار اپنے گھر آیا

نہ روؤں کیونکے علی الاتصال اس بن میں
کہ جی کے رندھنے سے جوں ابر دل بھی بھر آیا

جوان مارے ہیں بے ڈھنگی ہی سے ان نے بہت
ستم کی مشق کی پر خون اسے نہ کر آیا

لچک کمر کی جو یاد آئی اس کی بہ آوے
کہ پانی میر کے اشکوں کا تا کمر آیا

(۱۸۰۱)

ہو کوئی اس بے وفا دلدار سے کیا آشنا
آشنا رہ برسوں جو اک دم میں ہو ناآشنا

قدر جانو کچھ ہماری ورنہ پچھتاؤ گے تم
پھر نہیں ملنے کا تم کو کوئی ہم سا آشنا

باغ کو بے لالہ و گل دیکھ کہتے تھے طیور
جھڑ گئے پت جھڑ میں اب کے ہائے کیا کیا آشنا

اب تو تو لڑکا نہیں عشق و ہوس میں کر تمیز
آشنا سے فرق ہوتا ہے بہت نا آشنا

ملتے ملتے منھ چھپانا بھی لطیفہ ہے نیا
آشنائی یا نہ کریے ہوجیے یا آشنا

تھا جنوں کا لطف مجنوں سے سو دنیا سے گیا
مغفرت ہو اس کو وحشی ہم سے بھی تھا آشنا

اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مت مفت کھو دیکھو ہمیں
پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

کیسا ہی پانی ہو اس کو پیری میں جاتا ہے پیر
تھا جوانی میں مگر تو میر دانا آشنا

(۱۸۰۲)

گئے تھے سیر چمن کو اٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا
تلاش جوش بہار میں کی نگار گلشن میں تھا نہ اپنا

ملا تو تھا وہ بخواہش دل مزہ بھی پاتے ملے سے لیکن
پھریں جو مستی میں اس کی آنکھیں سو ہوش ہم کو رہا نہ اپنا

جہاں کا دریاے بیکراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے انھوں نے لب تر کیا نہ اپنا

نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
دلوں میں کیا کیا ہمارے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا

کہے بھی کوئی تو اس سے جس میں سخن کسو کا اثر کرے کچھ
بکا کیے ہم ہمیشہ مانا کسو دن ان نے کہا نہ اپنا

نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
جو روویں کس کس کو روویں اب ہم وفا میں کیا کیا گیا نہ اپنا

جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کرسکے میرؔ کچھ توقف
بنا تھی ناپائدار اس کی اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

(۱۸۰۳)

پڑا تھا شور جیسا ہر طرف اس لاابالی کا
رہا ویسا ہی ہنگامہ مری بھی زار نالی کا

رہے بدحال صوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنی سے سنا مصرع جو میرے شعر حالی کا

نظر بھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
سماں اب یاد ہوگا کب تمھیں وہ خورد سالی کا

چمک یاقوت کی چلتی ہے اتنی دور کاہے کو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا

پھرے بستی میں رویت کچھ نہیں افلاس سے اپنی
الٰہی ہووے منھ کالا شتاب اس دست خالی کا

دماغ اپنا تو اپنی فکر ہی میں ہوچکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا

ذلیل و خوار ہیں ہم آگے خوباں کے ہمیشہ سے
پر یکھا کچھ نہیں ہے ہم کو ان کی جھڑکی گالی کا

ذرو چڑکو جو چسپاں اختلاطی تم سے ہو مجھ کو
تشتت کیا ہے میری دور کی اس دیکھا بھالی کا

نہ پہنچی جو دعاے میرؔ واں تک تو عجب کیا ہے
علوے مرتبہ ہے بسکہ اس درگاہ عالی کا

(۱۸۰۴)

دل جو ناگاہ بے قرار ہوا
اس سے کیا جانوں کیا قرار ہوا

شب کا پہنا جو دن تلک ہے گر / ہار اس کے گلے کا ہار ہوا
گرد سر اس کے جو پھرا میں بہت / رفتہ رفتہ مجھے دوار ہوا
بستر خواب سے جو اس کے اٹھا / گل تر سوکھ سوکھ خار ہوا
مجھ سے لینے لگے ہیں عبرت لوگ / عاشقی میں یہ اعتبار ہوا
روز و شب روتے کڑھتے گذرے ہے / اب بھی اپنا روزگار ہوا
روؤں کیا اپنی سادگی کو میر
میں نے جانا کہ مجھ سے یار ہوا

(۱۸۰۵)

جس ستم دیدہ کو اس عشق کا آزار ہوا / اک دو دن ہی میں وہ زار و زبوں خوار ہوا
روز بازار میں عالم کے عجب شے ہے حسن / بک گیا آپ ہی جو اس کا خریدار ہوا
دھوپ میں آگے کھڑا اس کے جلا کرتا ہوں / چاہ کر اس کے تئیں میں تو گنہگار ہوا
ہوش کچھ جن کے سروں میں تھا شتابی چیتے / حیف صد حیف کہ میں دیر خبردار ہوا
ہو بخود تو کسو کو ڈھونڈ نکالے کوئی / وہی خود گم ہوا جو اس کا طلبگار ہوا
مرغ دل کی ہے رہائی سے مرا دل اب جمع / پرشکن بالوں میں وہ اس کے گرفتار ہوا
پیار کی دیکھی جو چتون کسو کی میں جانا / کہ یہ اب سادہ و پرکار مرا یار ہوا
تکیہ اس پر جو کیا تھا سو گرا بستر پر / یعنی میں شوق کے افراط سے بیمار ہوا
کیونکے سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میر
اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار ہوا

(۱۸۰۶)

آج اس خوش پرکار جواں مطلوب حسین نے لطف کیا
پیر فقیر اس بے دنداں کو ان نے دنداں مزد دیا
آنسو کی بوند آنکھوں سے دونوں اب تو نکلتی ایک نہیں
دل کے طپیدن روز و شب نے خوب جگر کا لوہو پیا
مرتے جیسے صبر کیا تھا ویسی ہی بے صبری کی
ہائے دریغ افسوس کوئی دن اور نہ یہ بیمار جیا
ہاتھ رکھے رہتا ہوں دل پر برسوں گذرے ہجراں میں
ایک دن ان نے گلے سے مل کر ہاتھ میں میرا دل نہ لیا

(۱۸۰۷)

اب یار دوپہر کو کھڑا تک جو یاں رہا   حیرت سے آفتاب جہاں کا تہاں رہا
جو قافلے گئے تھے انھوں کی اٹھی بھی گرد   کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا
سوکھی پڑی ہیں آنکھیں مری دیر سے جو اب   سیلاب ان ہی رخنوں سے مدت رواں رہا
اعضا گداز عشق سے ایک ایک بہ گئے   اب کیا رہا ہے مجھ میں جو میں نیم جاں رہا
منعم کا گھر تمادی ایام میں بنا   سو آپ ایک رات ہی واں میہماں رہا
اس کے فریب لطف پہ مت جا کہ ہمنشیں   وہ دیر میرے حال پہ بھی مہرباں رہا
اب در پہ اس کے گھر کے گرا ہوں وگر نہ میں   مدت خرابہ گرد ہی بے خانماں رہا
ہے جان تو جہان ہے مشہور ہے مثل   کیا ہے گئے پہ جان کے گو پھر جہاں رہا

ترک شراب خانہ ہے پیری میں ورنہ میر
ترسا بچوں ہی میں رہا جب تک جواں رہا

(۱۸۰۸)

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا   بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رورو لوگ بیٹھے   رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک   کدھر جاتا ہے قد خم ہمارا
زمین و آسماں زیر و زبر ہے   نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا

کسو کے بال درہم دیکھتے میر
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

ردیف ب

(۱۸۰۹)

ہے عشق میں جو حال بتر تو ہے کیا عجب   مر جائے کوئی خستہ جگر تو ہے کیا عجب
لے جا کے نامے کتنے کبوتر ہوئے ہیں ذبح   اڑتی سی ہم کو آوے خبر تو ہے کیا عجب
شبہاے تار و تیرہ زمانے میں دن ہوئیں   شب ہجر کی بھی ہووے سحر تو ہے کیا عجب
جیسے ہے رخنہ رخنہ یہ چرخ اثیر سب   اس آہ کا ہو اس میں اثر تو ہے کیا عجب
جاتی ہے چشم شوخ کسی کی ہزار جا   آوے ادھر بھی اس کی نظر تو ہے کیا عجب
لغزش ملک سے ہووے ٹک اس کمر کی دیکھ   عاشق سے جو بندھے نہ کمر تو ہے کیا عجب

ترک وطن کیا ہے عزیزوں نے چاہ میں | کر جائے کوئی رفتہ سفر تو ہے کیا عجب
برسوں سے ہاتھ مارتے ہیں سر پہ اس بغیر | ہووے بھی ہم سے دست بسر تو ہے کیا عجب
معلوم سودمندی عشاق عشق میں | پہنچے ہے اس سے ہم کو ضرر تو ہے کیا عجب
گھر بار میں لٹا کے گیا گھر سے بھی نکل | اب آوے وہ کبھو مرے گھر تو ہے کیا عجب

ملتی نہیں ہے آنکھ اس آئینہ رو کی میرؔ
وہ دل جو لے کے جاوے مکر تو ہے کیا عجب

(۱۸۱۰)

آیا ہے شیب سر پہ گیا ہے شباب اب | کرنا جو کچھ ہو تم کو سو کرلو شتاب اب
بگڑا بنا ہوں عشق سے سو بار عاقبت | پایا قرار یہ کہ رہوں میں خراب اب
خوں ریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب | تو تو ہوا ہے تجھ کو بہت سا ثواب اب
بھڑکی دروں میں آتش سوزندہ عشق کی | دل رہ گیا ہے پہلو میں ہوکر کباب اب
ہوں اس بہشتی رو سے جدا میں جحیم میں | رہتا ہے میری خاک کو ہر دم عذاب اب
قاصد جو آیا چپ ہے نشاں خط کا کچھ نہیں | دیکھیں جو لاوے باد کوئی کیا جواب اب
کیا رنج و غم کو آگے ترے میں کروں شمار | یاں خود حسابی میری تو ہے بے حساب اب
جھپکی ہیں آنکھیں اور جھکی آتی ہیں بہت | نزدیک شاید آیا ہے ہنگام خواب اب
آرام کریے میری کہانی بھی ہوچکی | کرنے لگو گے ورنہ عتاب و خطاب اب

جانا سبھوں نے یہ کہ تو معشوق میرؔ ہے
خلع العذار سے نہ گیا ہے حجاب اب

(۱۸۱۱)

منھ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب | کھاوے گا آفتابہ کوئی خودسر آفتاب
سرصدقے تیرے ہونے کی خاطر بہت ہے گرم | مارا کرے ہے شام و سحر چکر آفتاب
ہر خانہ کیوں نہ صبح جہاں میں ہو پر فروغ | پھرتا ہے جھانکتا اسی کو گھر گھر آفتاب
تجرید کا فراغ ہے یک دولت عظیم | بھاگے ہے اپنے سائے سے بھی خوشتر آفتاب
نازک مزاج ہے تو کہیں گھر سے مت نکل | ہوتا ہے دوپہر کے تئیں سر پر آفتاب
پیدا ہے روز مشرق نو کی نمود سی | آئے ہے کوے یار سے بچ بچ کر آفتاب
ہو پست اس کے نور کا زیر زمیں گیا | ہر چند سب ستاروں سے تھا برتر آفتاب
اس رخ کی روشنی میں نہ معلوم کچھ ہوا | مہ گم کدھر ہوا ہے گیا کیدھر آفتاب

کس زورکش کی قوس قزح ہے کمان پاک جس کی اٹھا سکا نہ کبھو سپر آفتاب

روشن ہے یہ کہ خوف ہے اس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا جو تھرتھر آفتاب

(۱۸۱۲)

آئینہ سا جو کوئی یاں آشنا صورت ہے اب بے مروت اس زمانے میں ہمہ حیرت ہے اب
کیا کوئی یاری کسو سے کرکے ہووے شاد کام دوستی ہے دشمنی الفت نہیں کلفت ہے اب
چاہتا ہے درد دل کرنا کسو سے دل دماغ سو دماغ اپنا ضعیف اور قلب بے طاقت ہے اب
کیونکے دنیا دنیا رسوائی مری موقوف ہو عالم عالم مجھ پہ اس کے عشق کی تہمت ہے اب

اشک نومیدا نہ پھرتے ہیں مری آنکھوں کے بیچ
میر یہ دے ہے دکھائی جان کی رخصت ہے اب

(۱۸۱۳)

مارے ہی ڈالے ہے جس کا زندگی میں اضطراب ساتھ میرے دل گڑا تو آچکا مرنے کا خواب
تک ٹھہرتا بھی تو کہتے تھا کسو بجلی کی تاب یا کہ نکہت گل کی تھا آیا گیا عہد شباب
کی نماز صبح کو کھوکر نماز اشراق کی ہوگیا مجھ پر ستم اچٹا نہ تک مستی میں خواب
دیکھنا منھ یار کا اس وجہ سے ہوتا نہیں یا الٰہی دے زمانے سے اٹھا رسم نقاب
ضعف ہے اس کے مرض اور اس کے غم سے الغرض دل بدن میں آدمی کے ایک ہے خانہ خراب
یار میں ہم میں پڑا پردہ جو ہے ہستی ہے یہ بیچ سے اٹھ جائے تو ہووے ابھی رفع حجاب
صورت دیوار سے مدت کھڑے در پر رہے پر کبھو صحبت میں اس کی ہم ہوئے نہ باریاب
مے سے توبہ کرتے ہی معقول اگر ہم جانتے ہم پہ شیخ شہر برسوں سے کرے ہے احتساب

جمع تھے خوباں بہت لیکن پسند اس کو کیا
کیا غلط میں نے کیا اے میر وقت انتخاب

(۱۸۱۴)

اس مغل زا سے نہ تھی ہر بات کی تکرار خوب بدزبانی بھی کی ان نے تو کہا بسیار خوب
لگ نہیں پڑتے ہیں لے کر ہاتھ میں شمشیر تیز بے کسوں کے قتل میں اتنا نہیں اصرار خوب
آخر ان خوباں نے عاشق جان کر مارا مجھے چاہ کا اپنی نہ کرنا ان سے تھا اظہار خوب
آج کل سے مجھ کو بیتابی و بدحالی ہے کیا مجھ مریض عشق کے کب سے نہ تھے آثار خوب
کیا کریں اس کی کہیے جنت دربستہ دی ورنہ مفلس غم زدوں کے کچھ نہ تھے کردار خوب

مخترع جور و ستم میں بھی ہوا وہ نوجواں — ظلم تب کرتا ہے جب ہو کوئی منت دار خوب
دہر میں پستی بلندی برسوں تک دیکھی ہے میں — جب لٹا پامالی سے میں تب ہوا ہموار خوب
کیا کسو سے آشنائی کی رکھے کوئی امید — کم پہنچتا ہے بہم دنیا میں یارو یار خوب

کہتے تھے انھی کے سے اے میر مت کھا پیچ و تاب
آخر اس کوچے میں جا کھائی نہ تو نے مار خوب

ردیف ت

(۱۸۱۵)

جو کوئی اس بے وفا سے دل لگاتا ہے بہت — وہ ستمگر اس ستم کش کو ستاتا ہے بہت
اس کے سونے سے بدن سے کس قدر چسپاں ہے ہائے — جامہ کبریتی کسو کا جی جلاتا ہے بہت
کیا پس از چندے مری آوارگی منظور ہے — مو پریشاں اب جو شب مجھ پاس آتا ہے بہت
جاہ میں بھی بیشتر جانے سے کم ہوتا ہے وقر — اس لیے جاتا ہوں تب جب وہ بلاتا ہے بہت
گرچہ کم جاتا ہوں پر دل پر نہیں کچھ اختیار — وہ کجی سے سیدھیاں مجھ کو سناتا ہے بہت
بھول جاوے گا سخن پردازی اس کے سامنے — شاعری سے جو کوئی باتیں بناتا ہے بہت
بامزہ معشوق کیا کم ہیں پر اس کو کیا کروں — ناز و انداز اس ہی کا جو مجھ کو بھاتا ہے بہت
وہ نہیں ہجراں میں اس بن خواب خوش آوے مجھے — اب خیال اس کی طرف ہر لحظہ جاتا ہے بہت

کیا کروں کہنے لگا ایدھر نہ آنے پائے وہ
بد کہیں ہنگامہ آرا میر آتا ہے بہت

(۱۸۱۶)

منھ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت — ہم سے کرتا ہے اب حجاب بہت
چشمک گل کا لطف بھی نہ اٹھا — کم رہا موسم شباب بہت
دیر بھی کچھ لگی نہ مرتے ہمیں — عمر جاتی رہی شتاب بہت
ڈھونڈتے اس کو کوچے کوچے پھرے — دل نے ہم کو کیا خراب بہت
چلنا اپنا قریب ہے شاید — جاں کرے ہے اب اضطراب بہت
توبہ مے سے بہار میں نہ کروں — گو کرے شیخ احتساب بہت
اس غصیلے سے کیا کسو کی نبھے — مہربانی ہے کم عتاب بہت
کشتن مردماں اگر ہے ثواب — تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

دیر تک کعبے میں تھے شب بے ہوش
پی گئے میرؔ جی شراب بہت

(۱۸۱۷)

کیا کہیں ہے حال دل درہم بہت — کڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت
رہتا ہے ہجراں میں غم غصے سے کام — اور وے بھی سن کے ہیں برہم بہت
اضطراب اس کا نہیں ہوتا ہے کم — ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت
اس گلی سے جی اچٹتا تک نہیں — دل جگر کرتے ہیں پتھر ہم بہت
میرؔ کی بدحالی شب مذکور تھی
کڑھ گئے یہ حال سن کر ہم بہت

(۱۸۱۸)

باہر چلنے میں آبادی سے کر نہ تغافل یار بہت — دشتی وحش وطیر آئے ہیں ہونے تیرے شکار بہت
دعوئی عاشق بیچارے کا کون سنے گا محشر میں — خیل ملائک واں بھی ہوں گے اس کے خاطر دار بہت
خشکی لب کی زردی رخ کی نمنا کی دو آنکھوں کی — جو دیکھے ہے کہے ہے ان نے کھینچا ہے آزار بہت
جسم کی حالت جی کی طاقت نبض سے کر معلوم طبیب — کہنے لگا جانبر کیا ہوگا یہ تو ہے بیمار بہت
چار طرف ابرو کے اشارے اس ظالم کے زمانے میں — ٹھہرے کیا عاشق بیکس یاں چلتی ہے تلوار بہت
پیش گئی نہ کچھ چاہت میں کافر و مسلم دونوں کی — سینکڑوں سبحے پھینکے گئے اور ٹوٹے ہیں زنار بہت
جی کے لگاؤ کہے سے ہم نے جی ہی جاتے دیکھے ہیں — اس پہ نہ جانا آہ برا ہے الفت کا آزار بہت
کس کو دماغ سیر چمن ہے کیا ہجراں میں واشد ہو — کم گلزار میں اس بن جاکر آتا ہوں بیزار بہت
میرؔ دعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مدت سے
اب جو کبھو دیکھوں اس کو تو مجھ کو نہ آوے پیار بہت

ردیف چ

(۱۸۱۹)

لطف جیسے ہیں اس کی چاہ کے بیچ — رنج ویسے ہی ہیں نباہ کے بیچ
ذوق صید اس کو تھا تو خیل ملک — دھوم رکھتے تھے دام گاہ کے بیچ
کب مزہ ہے نماز صبح میں وہ — جو صبوحی کے ہے گناہ کے بیچ
اس غصیلے کی سرخ آنکھیں دیکھ — اٹھے آشوب خانقاہ کے بیچ
جان و دل دونوں کر گئے تھے غش — دیکھ اس رشک مہ کو راہ کے بیچ

اس کی چشم سیہ ہے وہ جس نے   کتنے جی مارے اک نگاہ کے بیچ
سانجھ ہی رہتی پھر اگر ہوتا   کچھ اثر نالۂ پگاہ کے بیچ
کیا رہیں جور سے بتوں کے ہم   رکھ لے اپنی خدا پناہ کے بیچ
منھ کی دو جھائیوں سے مت شرما   جھائیں ہوتی ہے روے ماہ کے بیچ
میر بیمار ہے کہ فرق نہیں
متصل اس کے آہ آہ کے بیچ

(۱۸۲۰)

وامق و فرہاد و مجنوں کون ہے یاروں کے بیچ   جو کہوں میں کوئی ہے میرے بھی غمخواروں کے بیچ
جمع خوباں میں مرا محبوب اس مانند ہے   جوں مہ تابندہ آتا ہے کبھو تاروں کے بیچ
جو جفا عاشق پہ ہے سو اور لوگوں پر نہیں   اس سے پیدا ہے کہ میں ہی ہوں گنہگاروں کے بیچ
مر گئے بہتیرے صاحب دل ہوس کس کو ہوئی   ایسے مرنے جینے کی ان عشق کے ماروں کے بیچ
رونا کڑھنا عشق میں دیکھا مرا جن نے کہا   کیا جیے گا یہ ستم دیدہ ان آزاروں کے بیچ
منتظر برسوں رہے افسوس آخر مر گئے   دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے بیماروں کے بیچ
خاک تربت کیوں نہ اپنی دلبرانہ اٹھ چلے   ہم بھی تھے اس نازنیں کے ناز برداروں کے بیچ
صاف میداں لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے   تنگ ہوں معمورۂ دنیا کی دیواروں کے بیچ
باغ میں تھے شب گل مہتاب میرے آس پاس
یار بن یعنی رہا میں میر انگاروں کے بیچ

(۱۸۲۱)

دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ   کاش یہ آفت نہ ہوتی قالب آدم کے بیچ
چھاتی کٹتی سنگ ہی سے دل کے جانے میں نہیں   نعل سینوں پر جڑے جاتے ہیں اس ماتم کے بیچ
نقشہ اس کا مردم دیدہ میں میرے نقش ہے   یعنی صورت اس ہی کی پھرتی ہے چشم نم کے بیچ
شاد وے جو اب جواں تازہ ہوئے ہیں شہر میں   دل زدہ ہم شیب میں رہتے ہیں اپنے غم کے بیچ
دل نہ ایسا کر کہ پشت چشم وہ نازک کرے   سو بلائیں ہیں یہاں ان ابروؤں کے خم کے بیچ
حد سے افزوں اس گلی میں شور ہے عشاق کا   کون سنتا ہے کسو کی بات اس اودھم کے بیچ
رونق آبادی ملک سخن ہے اس تلک
ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اک دم کے بیچ

ردیف ر

(۱۸۲۲)

دل گئے آفت آئی جانوں پر   یہ فسانہ رہا زبانوں پر

عشق میں ہوش و صبر سنتے تھے — رکھ گئے ہاتھ سو تو کانوں پر
گرچہ انسان ہیں زمیں ولے — ہیں دماغ ان کے آسمانوں پر
شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے — ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند — میر رہتی ہے ان مکانوں پر
جب سے بازار میں ہے تجھ سی متاع — بھیڑ ہی رہتی ہے دکانوں پر
لوگ سر دیتے جاتے ہیں کب سے — یار کے پاؤں کے نشانوں پر
کجی اوباش کی ہے وہ دربند — ڈالے پھرتا ہے بند شانوں پر
کوئی بولا نہ قتل میں میرے — مہر کی تھی مگر دہانوں پر
یاد میں اس کے ساق سیمیں کی — دے دے ماروں ہوں ہاتھ رانوں پر
تھے زمانے میں خرچی جن کی روپے — ٹھانسا کرتے ہیں ان کو آنوں پر
غم و غصہ ہے حصے میں میرے — اب معیشت ہے ان ہی کھانوں پر

قصے دنیا میں میرؔ بہت سنے
نہ رکھو گوش ان فسانوں پر

(۱۸۲۴)

آئے ہو گھر سے اٹھ کر میرے مکاں کے اوپر — کی تم نے مہربانی بے خانماں کے اوپر
پھولوں سے اٹھ نگاہیں ٹکڑے پہ اس کے ٹھہریں — وہ گل فروش کا جو آیا دکاں کے اوپر
برسات اب کے گذری خوف و خطر میں ساری — چشمک زناں رہی ہے برق آشیاں کے اوپر
رخسار سا کسو کے کاہے کو ہے فروزاں — ہر چند ماہ تاباں ہے آسماں کے اوپر
بے سدھ پڑا رہوں ہوں بستر پہ رات دن میں — کیا آفت آگئی ہے اس نیم جاں کے اوپر
عشق و ہوس میں کچھ تو آخر تمیز ہوگی — آئی طبیعت اس کی گر امتحاں کے اوپر
الفت کی کلفتوں میں معلوم ہے ہوئی وہ — تھا اعتماد کلی تاب و تواں کے اوپر
محو دعا تھا اکثر غیرت سے لیک گاہے — آیا نہ نام اس کا میری زباں کے اوپر
وہ جان و دل کی خواہش آیا نہیں جہاں میں — آئی ہے اک قیامت اہل جہاں کے اوپر
کیا لوگ ہیں محباں سودائے عاشقی میں — اغماض کرتے ہیں سب جی کے زیاں کے اوپر
حیرت سے اس کے رو کی چپ لگ گئی ہے ایسی — گویا کہ مہر کی ہے میرے دہاں کے اوپر

جو راہ دوستی میں اے میرؔ مر گئے ہیں
سر دیں گے لوگ ان کے پا کے نشاں کے اوپر

(۱۸۲۴)

آیا جو اپنے گھر سے وہ شوخ پان کھا کر
کی بات ان نے کوئی سو کیا چبا چبا کر

شاید کہ منھ پھرا ہے بندوں سے کچھ خدا کا
نکلے ہے کام اپنا کوئی خدا خدا کر

کان اس طرف نہ رکھے اس حرف ناشنو نے
کہتے رہے بہت ہم اس کو سنا سنا کر

کہتے تھے ہم کسو کو دیکھا کرو نہ اتنا
دل خوں کیا نہ اپنا آنکھیں لڑا لڑا کر

آگے ہی مر رہے ہیں ہم عشق میں بتاں کے
تلوار کھینچتے ہو ہم کو دکھا دکھا کر

وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقت رفتن
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اٹھا اٹھا کر

جلتے تھے ہولے ہولے ہم یوں تو عاشقی میں
پر ان نے جی ہی مارا آخر جلا جلا کر

سوتے نہ لگ چل اس سے اے باد تو نے ظالم
بہتیروں کو سلایا اس کو جگا جگا کر

مدت ہوئی ہمیں ہے واں سے جواب مطلق
دفتر کیے روانہ لکھ لکھ لکھا لکھا کر

کیا دور میر منزل مقصود کی ہے اپنے
اب تھک گئے ہیں اودھر قاصد چلا چلا کر

(۱۸۲۵)

آیا ہے ابر قبلہ چلا خانقاہ پر
صوفی ہوا کو دیکھ کے کاش آوے راہ پر

وہ آنکھ اٹھا کے شرم سے کب دیکھے ہے ولے
ہوتے ہیں خون نیچی بھی اس کی نگاہ پر

بالفرض چاہتا ہے گنہ لیک میری جاں
واجب ہے خون کرنا کہاں اس گناہ پر

کیا بحث میرے فقر سے میں ہوں فقیر محض
ہے اس گلی میں حرف و سخن عزشاہ پر

تہ سے سخن کے لوگ نہ تھے آشنا عبث
جاگہ سے تم گئے انھوں کی واہ واہ پر

ڈر چشم شور چرخ سے گل پھول یک طرف
آنکھ اس دنی کی دوڑے ہے اک برگ کاہ پر

دیکھی ہے جن نے یار کے رخسار کی جھمک
اس کی نظر گئی نہ شب مہ میں ماہ پر

ہم جاں بہ لب پتنگوں کی سدھ لیجیو شتاب
موقوف اپنا جانا ہے اب ایک آہ پر

کہتے تو ہیں کہ ہم بھی تمھیں چاہتے ہیں میر
پر اعتماد کس کو ہے خوباں کی چاہ پر

(۱۸۲۶)

میلان دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر
دیتا ہے جان عالم اس کی جفا کے اوپر

کشتہ ہوں اس حیا کا کٹوائے بہتوں کے سر
پر آنکھیں اس کی ونھیں تھیں پشت پا کے اوپر

مہندی لگا کے ہرگز گھر سے تو مت نکلیو
ہوتے ہیں خون تیرے رنگ حنا کے اوپر

ہوں کو بہ کو صبا سا پر کچھ نہیں ہے حاصل　　　شاید برات اپنی لکھی ہوا کے اوپر

بندوں سے کام تیرا اے میر کچھ نہ نکلا
موقوف مطلب اپنا اب رکھ خدا پہ کر

(۱۸۲۷)

زانو پہ سر ہے اکثر مت فکر اس قدر کر　　　دل کوئی لے گیا ہے تو میر ٹک جگر کر
خورشید و ماہ دونوں آخر نہ دل سے نکلے　　　آنکھوں میں پھر نہ آئے جی سے مرے اتر کر
یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا　　　ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر
اے ہمنشیں غشی ہے میں ہوش میں نہیں ہوں　　　مجھ کو مری زبانی سو بار اب خبر کر
کیا حال زار عاشق کریے بیاں نہ پوچھو　　　کرتا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر
دیتے نہیں ہیں سونے ٹک آہ و نالے اس کے　　　یارب شب جدائی عاشق کی بھی سحر کر
اتنا ہی منھ چھپایا شوخ اس کے محرموں نے　　　جو بجھ گئی ہیں زلفیں اس چہرے پر بکھر کر
کیا پھیر پھیر گردن باتیں کرے ہے سب میں　　　جاتے ہیں غش کیے ہم مشتاق منھ ادھر کر
بن دیکھے تیرے میں تو بیمار ہوگیا ہوں　　　حال تبہ میں میرے تو بھی تو ٹک نظر کر
رخنے کیے جو تو نے پتھر کی سل میں تو کیا　　　اے آہ اس صنم کے دل میں بھی ٹک اثر کر

مارے سے غل کیے سے جاتا نہیں ہے ہرگز
نکلے گا اس گلی سے شاید کہ میر مرکر

(۱۸۲۸)

باندھے کمر سحرگہ آیا ہے میرے کیں پر　　　جو حادثہ فلک سے نازل ہوا زمیں پر
اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی　　　ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر
کنج قفس میں جوں توں کاٹیں گے ہم اسیراں　　　سیر چمن کے شایاں اپنے رہے نہیں پر
جوں آب گیری کردہ شمشیر کی جراحت　　　ہے ہر خراش ناخن رخسارہ و جبیں پر
آخر کو ہے خدا بھی تو اے میاں جہاں میں　　　بندے کے کام کچھ کیا موقوف ہیں تمھیں پر
غصے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے　　　تلواریں کھنچتیاں تھیں اس کی جبیں کی چیں پر

تھے چشم خوں فشاں پر شاید کہ دست و دامن
ہیں میر داغ خوں کے پیراہن آستیں پر

(۱۸۲۹)

گل کیا جسے کہیں کہ گلے کا تو ہار کر　　　ہم پھینک دیں اسے ترے منھ پر نثار کر

آغوشیں جیسے موجیں الٰہی کشادہ ہیں — دریائے حسن اس کا کہیں ہم کنار کر
یاں چلتے دیر کچھ نہیں لگتی ہے میری جاں — رخت سفر کو اپنے شتابی سے بار کر
مختار رونے ہنسنے میں تجھ کو اگر کریں — تو اختیار گریۂ بے اختیار کر
مشق ستم ہوئی ہے بہت صاف یار کی — پشتے لگائے ان نے جوانوں کو مار کر
صیادی میں علوئے تقدس تو اس کا دیکھ — روح القدس کو مار رکھا ہے شکار کر
بہنے لگی ہے تیغ کی جدول تو تیری تیز — دشمن کا کام وار میں پہلے ہی پار کر
میں بیقرار خاک میں کب تک ملا کروں — کچھ ملنے کا نہ ملنے کا تو بھی قرار کر

میں رفتہ میرؔ مجلس تصویر کا گیا
تو بیٹھا میرا حشر تک اب انتظار کر

ردیف ک

(١٨٣٠)(١)

جب کہتے تھے تب تم نے تو گوش ہوش نہ کھولے ٹک — چپکے چپکے کسو کو چاہا پوچھا بھی تو نہ بولے ٹک
اب جو چھاتی جلی فی الواقع لطف نہیں ہے شکایت کا — صبر کرو کیا ہوتا ہے یوں پھوڑے دل کے پھپھولے ٹک
نالہ کشی میں مرغ چمن بکتا ہے پر ہم تب جانیں — نعرہ زناں جب صبح سے آکے ساتھ ہمارے بولے ٹک
اس کی قامت موزوں سے کیا کوئی سرو برابر ہو — ناموزوں ہی نکلے گا سنجیدہ کوئی جو بولے ٹک
آنکھیں جو کھولیں سوتے سے تو حال ہی کہتے مجھ کو کہا — ساری رات کہانی کہی ہے تو بھی اٹھ کر سولے ٹک
مشکل ہے دلداری عاشق وہ برسوں بیتاب رہے — بے طاقت اس دل کو میرے ہاتھ میں اپنے تولے ٹک
آنکھیں کھولیں حال کے کہتے دیر ہوئی ہے بس یعنی — ساری رات کہانی کہی ہے میرؔ اب چل کر سولے ٹک

ایسے درد دل کرنے کو میرؔ کہاں سے جگر آوے
گرم سخن لوگوں میں ہو کوئی بات کرے تو رولے ٹک

(١٨٣١)

رہے ہے غش و درد دو دو پہر تک — سر زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد گم — خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک
زمیں گرد اس مہ کے میرے ہیں عاشق — ستارے فلک کے رہے ہیں ادھر تک
قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت — پہنچنا ہے مشکل ہمیں اس کے گھر تک

(١) اس غزل کے تین شعر (پہلا، دوسرا اور ساتواں) دیوان پنجم میں بھی چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شامل تھے۔ لہٰذا وہاں سے نکال دیے گئے۔ مصحح

کہاں تک اسے سر سے مارا کروں میں　　نہ پہنچا مرا ہاتھ اس کی کمر تک
بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی　　نہ آئی اسیران بے بال و پر تک

بہت میر برہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

(۱۸۳۲)

وہ تو نہیں کہ اودھم رہتا تھا آشیاں تک　　آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے آسماں تک
لبریز جلوہ اس کا سارا جہاں ہے یعنی　　ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک
ہجراں کی سختیوں سے پتھر دل و جگر ہیں　　صبر اس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک
سودائے عاشقی میں نقصاں ہے جی کا لیکن　　ہم راضی ہو رہے ہیں اپنے زیان جاں تک
وا ماندہ نقش پا سے یک دشت ہم ہیں بیکس　　دشوار ہے پہنچنا اب اپنا کارواں تک
جی مارتے ہیں دلبر عاشق کا اس خطر سے　　حرف وفا نہ آیا اپنی کبھو زباں تک
دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوے گلشن　　پہنچے مبادا میری خاشاک آشیاں تک
دیواروں سے بھی مارا پتھروں سے پھوڑ ڈالا　　پہنچا نہ سر ہمارا حیف اس کے آستاں تک
یہ تنگی و نزاکت اس رنگ سے کہاں ہے　　گل برگ و غنچے پہنچیں کب ان لب و دہاں تک

ان جلتی ہڈیوں پر ہرگز ہما نہ بیٹھے
پہنچی ہے عشق کی تب اے میر استخواں تک

(۱۸۳۳)

اس کی رہے گی گرمی بازار کب تلک　　وہ بیچتا رہے گا خریدار کب تلک
عہد و وعید حشر قیامت ہے دیکھیے　　جیتے رہیں گے طالب دیدار کب تلک
دل کا جگر کا لوہو تو غم نے سکھا دیا　　آنکھیں رہیں گی دیکھیے خونبار کب تلک
نسبت بہت گناہوں کی کرتا ہے اس طرف　　بے جرم ہم رہیں گے گنہگار کب تلک
اس کی نگاہ مست ہے اکثر سوے رباط　　صوفی رہیں گے حال سے ہشیار کب تلک
دیوار و در بڑے تھے جہاں واں نشاں نہیں　　یاں خانوادوں کے رہیں آثار کب تلک
مہمان کوئی دن کا ہے وارفتہ عشق کا　　ظاہر ہے حال سے کہ یہ بیمار کب تلک
ترسا کے مارنے میں عذاب شدید ہے　　اک کھینچ کر نہ ماروگے تلوار کب تلک

صیاد اسیر کرکے جسے اٹھ گیا ہو میر
وہ دام کی شکن میں گرفتار کب تلک

ردیف ل

(۱۸۳۴)

چپ رہ اب نالوں سے اے بلبل نہ کر آزار دل   کم دماغی ہے بہت مجھ کو کہ ہوں بیمار دل
ابتدائے خبط میں ہوتا تدارک کچھ تو تھا   اب کوئی سنبھلنے ہے مجھ سے وحشت بسیار دل
یک توجہ میں رہے ہے سیر اس کی عرش پر   عقل میں آتے نہیں ہیں طرفہ طرفہ کار دل
باغ سے لے دشت تک رکھتے ہیں اک شور عجب   ہم اسیران قفس کے نالہ ہائے زار دل
اس سبک روحی پہ جوں باد سحر در در پھرے   زندگی اب یار بن اپنی ہوئی ہے بار دل

تنگی و وسعت سے اس کی اے عبارت ساز فہم
میرؔ کچھ سمجھے گئے نہ معنی اسرار دل

(۱۸۳۵)

زنہار گلستاں میں نہ کر منھ کو سوے گل   چڑھ جائے مغز میں نہ کہیں گرد بوے گل
موسم گئے نشاں بھی کہیں پتے کا نہ تھا   کی شوق کشتگاں نے عبث جستجوے گل
تڑپے خزاں میں اتنے کہ مرمر گئے طیور   جاوے گی ساتھ جی کے مگر آرزوے گل
آئے نظر بہار میں پائیز میں گئے   ہے بے وفائی کرنے کی ہر سال خوے گل

مدت ہوئی کہ دیکھا تھا سیر چمن میں میرؔ
پھرتا ہے اب تلک مری آنکھوں میں روے گل

(۱۸۳۶)

طریق عشق میں ہے رہنما دل   پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل
قیامت تھا مروت آشنا دل   موئے پر بھی مرا اس میں رہا دل
رکا اتنا خفا اتنا ہوا تھا   کہ آخر خون ہو ہوکر بہا دل
جسے مارا اسے پھر کر نہ دیکھا   ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل
نہ تھی سہل استقامت اس کی لیکن   خرام ناز دلبر لے گیا دل
بدن میں اس کے تھی ہرجاے دلکش   بجا بےجا ہوا ہے جا بجا دل
گئے وحشت سے باغ و راغ میں تھے   کہیں ٹھہرا نہ دنیا سے اٹھا دل
اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھی   رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل
ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا   گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دل

خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ   بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل
نہ پوچھا ان سے جس بن خوں ہوا سب   نہ سمجھا اس کے کینے کی ادا دل
ہوا پژمردہ و بے صبر و بے تاب   کرے گا اس طرح کب تک وفا دل
ہوئی پروا نہ واں دلبر کو یاں میر
اٹھا کر ہو چکا جور و جفا دل

ردیف م

(۱۸۳۷)

کھا گئی یاں کی فکر سو موہوم   واں گئے کیا ہو کچھ نہیں معلوم
وصل کیونکر ہو اس خوش اختر کا   جذب ناقص ہے اور طالع شوم
نہ ہوئے تھے ابھی جواں افسوس   صبر مغفور و طاقت مرحوم
جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے   دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
بھیگی اس کی مسوں کی خوبی سے   بے حواسی ہے ہم کو جوں مسموم
ہے عبث یہ تردد و تشویش   پہنچے ہے وقت پر جو ہے مقسوم
ہاتھ سے وے گئے جو سیمیں ساق   ہم رہے سر بہ زانوے مغموم
صاحب اپنا ہے بندہ پرور میر
ہم جہاں سے نہ جائیں گے محروم

(۱۸۳۸)

عشق کیا ہے اس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم   جھانکتے اس کو ساتھ صبا کے صبح پھریں ہیں گھر گھر ہم
روز و شب کو اپنے یارب کیونکے کریں گے روز و شب   ہاتھ رکھے رہتے ہیں دل پر بیتابی میں اکثر ہم
پوچھتے راہ شکستہ دل کی جا نکلے تھے کعبے میں   سوچ وہاں تو گذرا جی میں آئے کدھر سے کیدھر ہم
شام سے کرتا منزل آکر گھر کو ہمارے صدر نشیں   رکھتے ستارہ اس مہ وش کی چاہ میں گر بد اختر ہم
برسوں خس و خاشاک پہ سوئے مدت گلخن تابی کی   بخت نہ جاگے جو اس سے ہوں ایک بھی شب ہم بستر ہم
روز بتر ہے حالت عشقی جیسے ہوں بیمار اجل   ہے نہ دوا نے کوئی معالج کیونکر ہوں گے بہتر ہم
اس کی جناب سے رحمت ہو تو جی بچتا ہے دنیا میں   اس جانب سے تو بیٹھے ہیں مرنا کرکے مقرر ہم
اب تو ہماری طرف سے اتنا دل کو پتھر مت کریو   سختی سے ایام کی اب تک جیتے رہے ہیں مر مر ہم
آہ معیشت روز و شب کی ساتھ اندوہ کے ٹھہری ہے   روتے کڑھتے رہا کرتے ہیں غم سے ہوئے ہیں خوگر ہم
شعلہ ایک اٹھا تھا دل سے آہ عالم سوز کا میر
ڈھیری ہوئی ہے خاکستر کی جیسی شب میں جل کر ہم

(۱۸۳۹)

گذشتے ہو رہے ہجر میں بیمار ہوئے ہم
بستر پہ گرے رہتے ہیں ناچار ہوئے ہم

بہلانے کو دل باغ میں آئے تھے سو بلبل
چلانے لگی ایسے کہ بیزار ہوئے ہم

جلتے ہیں کڑے دھوپ میں جب جاتے ہیں اودھر
عاشق نہ ہوئے اس کے گنہگار ہوئے ہم

اک عمر دعا کرتے رہے یار کو دن رات
دشنام کے اب اس کے سزاوار ہوئے ہم

ہم دام بہت وحشی طبیعت تھے اٹھے سب
تھی چوٹ جو دل پر سو گرفتار ہوئے ہم

چھپتے ہوئے لوگوں کی بھلی یا بری گذری
افسوس بہت دیر خبردار ہوئے ہم

کیا کیا متمول گئے بک دیکھتے جس پر
بیعانگی میں اس کے خریدار ہوئے ہم

کچھ پاس نہیں یاری کا ان خوش پسروں کو
اس دشمن جانہا سے عبث یار ہوئے ہم

گھٹ گھٹ کے جہاں میں رہے جب میر سے مرتے
تب یاں کے کچھ اک واقف اسرار ہوئے ہم

(۱۸۴۰)

وے ہم ہیں جن کو کہیے آزار دیدہ مردم
الفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم

بے حال اپنا درہم تس پر ہے عشق کا غم
رہتے ہیں دم بخود ہم آفت رسیدہ مردم

وہ دیکھے ہم کو آکر جن نے نہ دیکھے ہوویں
آزردہ دل شکستہ خاطر کبیدہ مردم

جو ہے سو لوہو مائل بے طور اور جاہل
اہل جہاں ہیں سارے صحبت نہ دیدہ مردم

جاتے ہیں اس کی جانب مانند تیر سیدھے
مثل کمان حلقہ قامت خمیدہ مردم

اوباش بھی ہمارا کتنا ہے ٹیڑھا بانکا
دیکھ اس کو ہوگئے ہیں کیا کیا کشیدہ مردم

مت خاک عاشقاں پر پھر آب زندگی سا
جاگیں کہیں نہ سوتے یہ آرمیدہ مردم

لے لے کے منہ میں تنکا ملتے ہیں عاجزانہ
مغرور سے ہمارے برخویش چیدہ مردم

تھے دست بستہ حاضر خدمت میں میر گویا
سیمیں تنوں کے عاشق ہیں زرخریدہ مردم

(۱۸۴۱)

کیا زمانہ تھا کہ تھے دلدار کے یاروں میں ہم
شہرۂ عالم تھے اس کے ناز برداروں میں ہم

اجڑی اجڑی بستی میں دنیا کی جی لگتا نہیں
تنگ آئے ہیں بہت ان چار دیواروں میں ہم

جو یہی ہے غم الم رنج و قلق ہجراں کا تو
زندگی سے بے توقع ہیں ان آزاروں میں ہم

شاید آوے حال پرسی کرنے اس امید پر
کب سے ہیں دارالشفا میں اس کے بیماروں میں ہم

دھوپ میں جلتے ہیں پہروں آگے اس کے میر جی
رفتگی سے دل کی ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں ہم

ردیف ن

(۱۸۴۲)

سر سے ایسی لگی ہے اب کہ جلے جاتے ہیں
متصل شمع سے روتے ہیں گلے جاتے ہیں
اس گلستاں میں نمود اپنی ہے جوں آب رواں
دم بہ دم مرتبے سے اپنے چلے جاتے ہیں
تن بدن ہجر میں کیا کہیے کہ کیسا سوکھا
ہلکی بھی باؤ میں تنکے سے ہلے جاتے ہیں
رہتے دکھلائی نہیں دیتے بلاکش اس کے
جی کھپے جاتے ہیں دل اپنے دلے جاتے ہیں
پھر بخود آئے نہ بدحالی میں بیخود جو ہوئے
آپ سے جاتے ہیں ہم بھی تو بھلے جاتے ہیں
خاک پا اس کی ہے شاید کسو کا سرمۂ چشم
خاک میں اہل نظر اس سے رلے جاتے ہیں
گرم ہیں اس کی طرف جانے کو ہم لیکن میر
ہر قدم ضعف محبت سے ڈھلے جاتے ہیں

(۱۸۴۳)

ایسے دیکھے ہیں اندھے لوگ کہیں
پھوٹی سہتے ہیں آنچی سہتے نہیں
مر گئے ناامید ہم مہجور
خواہشیں جی کی اپنے جی میں رہیں
دیر دریا کنارہ کرتا رہا
عشق میں آنکھیں اپنی زور بہیں
مرتے تھے اس گلی میں لاکھوں جہاں
ہم بھی مارے گئے ندان وہیں
دیر سے میر اٹھ کے کعبے گئے
کہیے کیا نکلے جا کہیں کے کہیں

(۱۸۴۴)

رابطہ باہم ہے کوئی دن کا یاں
پھر زمانے میں کہاں تم ہم کہاں
گم ہوا ہوں یاں سے جاکر میں جہاں
کچھ نہیں پیدا کہاں میرا نشاں
پیری میں ہے طفل مکتب سا جھول
ہے فلک کرنے کے قابل آسماں
تو کہے واں ناگہاں بجلی گری
وہ نگاہ تند کرتا ہے جہاں
بھولے بھی میں یک نظر دیکھا نہیں
اس پہ ہے وہ بے دماغ و بدگماں
عشق نے تکلیف کی مالایطاق
بار امانت کا گراں میں ناتواں
کام کچھ آئی نہ دل کی بھی کشش
کھنچ رہا ہے ہم سے وہ ابرو کماں
کیا چھپی ہیں باتیں میرے عشق کی
داستاں در داستاں ہے داستاں

عشق میں کیونکر بسر کریے گا عمر
دل لگا ہے جس سے سو نامہرباں

جو زمیں پالغز تھی شاید کہ میر
ہو وہیں مسجود اس کا آستاں

(۱۸۴۵)

اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آجاتا ہوں
دل کی پھر دل میں لیے چپکا چلا جاتا ہوں

سعی دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
رنج سے عشق کے میں آپھی کھپا جاتا ہوں

گرچہ کھویا سا گیا ہوں پہ تہ حرف و سخن
اس فرخندۂ عشاق کی پا جاتا ہوں

خشم کیوں بے مزگی کاہے کو بے لطفی کیا
بدبر اتنا بھی نہ ہو مجھ سے بھلا جاتا ہوں

استقامت سے ہوں جوں کوہ قوی دل لیکن
ضعف سے عشق کے ڈھہتا ہوں گرا جاتا ہوں

مجلس یار میں تو بار نہیں پاتا میں
در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں

گاہ باشد کہ سمجھ جائے مجھے رفتۂ عشق
دور سے رنگ شکستہ کو دکھا جاتا ہوں

یک بیاباں ہے مری بیکسی و بیتابی
مثل آواز جرس سب سے جدا جاتا ہوں

تنگ آوے گا کہاں تک نہ مرا قلب سلیم
بگڑی صحبت کے تئیں روز بنا جاتا ہوں

گرمی عشق ہے ہلکی ابھی ہمدم دل میں
روز و شب شام و سحر میں تو جلا جاتا ہوں

(۱۸۴۶)

تری راہ میں گرچہ اے ماہ ہوں
پہ یہ غم ہے میں بھی سر راہ ہوں

مرے درپئے خون ناحق ہے تو
نہ خوندار ہوں میں نہ خونخواہ ہوں

تری دوستی سے جو دشمن ہیں سب
انھوں کے بھی خوں تک میں ہمراہ ہوں

نہ سمجھو مجھے بے خبر اس قدر
تہ دل سے لوگوں کے آگاہ ہوں

مری کجروی سادگی سے ہے میر
بہت اس روپے پہ گمراہ ہوں

(۱۸۴۷)

بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
جوانوں کو انھیں ایام میں زنجیر کرتے ہیں

برہمن زادگان ہند کیا پرکار سادے ہیں
مسلمانوں کی یارانے ہی میں تکفیر کرتے ہیں

موئے پر اور بھی کچھ بڑھ گئی رسوائی عاشق کی
کہ اس کی نعش کو اب شہر میں تشہیر کرتے ہیں

ہمارے حیرت عشقی سے چپ رہ جانے کی اس سے
مخالف مدعی کس کس طرح تقریر کرتے ہیں

تماشا دیکھنا منظور ہو تو مل فقیروں سے
کہ چٹکی خاک کو لے ہاتھ میں اکسیر کرتے ہیں

نہ لکھتے تھے کبھو یک حرف اسے جو ہاتھ سے اپنے سو کاغذ دستے کے دستے ہم اب تحریر کرتے ہیں
در و دیوار افتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں عمارت ساز مردم گھر جو اب تعمیر کرتے ہیں
خدا ناکردہ رک جاؤں جہاں رک جائے گا سارا غلط کرتے ہیں لڑکے جو مجھے دلگیر کرتے ہیں
اسے اصرار خوں ریزی پہ ہے ناچار ہیں اس میں
وگرنہ بجزتابی تو بہت سی میر کرتے ہیں

(۱۸۴۸)

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوئے ہیں بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوئے ہیں
غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر آگے خدا کے جب ہم محو دعا ہوئے ہیں
اہل چمن سے کیونکر اپنی ہو روشناسی برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں
بے عشق خوب رویاں اپنی نہیں گذرتی اے وائے کس بلا میں ہم مبتلا ہوئے ہیں
جانا کہ تن میں ہر جا نازک ہے اور دلکش ہم رفتۂ سراپا اس کے بجا ہوئے ہیں
تھے غنچے جتنے زیر دیوار باغ طائر شب باشی چمن سے شاید خفا ہوئے ہیں
صرفہ قیس کا ہے کیا وقر اس گلی میں ترک لباس کر واں شاہاں گدا ہوئے ہیں
خاموش اس کے در پر ہوکر فقیر بیٹھے یعنی کہ عاشقی میں ہم بے نوا ہوئے ہیں
عہد شباب گذرا شرب مدام ہی میں ہم کہنہ سال ہوکر اب پارسا ہوئے ہیں
اظہار کم فراغی ہردم کی بے دماغی
ان روزوں میر صاحب کچھ سیرزا ہوئے ہیں

(۱۸۴۹)

بیکار مجھ کو مت کہہ میں کارآمدہ ہوں بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں
میں منہ نہیں لگایا بنت العنب کو گاہے
تب تھا جوان صالح اب پیر میکدہ ہوں

(۱۸۵۰)

اسرار دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں
رنگینی زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ سو رنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میں
شاید بہار آئی ہے دیوانہ ہے جوان زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں
بے وقفہ اس ضعیف پہ جور و ستم نہ کر طاقت تعب کی کم ہے بہت میری جان میں
اس کے لبوں کے آگے کنھوں نے نہ بات کی آئی ہے کسر شہد مصفا کی شان میں

بروہ ہی یار کا رہے ہے چیت چڑھا سدا — خورشید و ماہ آتے ہیں کب میرے دھیان میں
ب میرے اس کے عہد میں شاید کہ اٹھ گئی — آگے جو رسم دوستی کی تھی جہان میں
تارے تو یہ نہیں مری آہوں سے رات کی — سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسمان میں

ابرو کی طرح اس کی چڑھی ہی رہے ہے میر
نکلی ہے شاخ تازہ کوئی کیا کمان میں

(۱۸۵۱)

آئے ہیں میر کافر ہوکر خدا کے گھر میں — پیشانی پر ہے قشقہ زنار ہے کمر میں
نازک بدن ہے کتنا وہ شوخ چشم دلبر — جان اس کے تن کے آگے آتی نہیں نظر میں
سینے میں تیر اس کے ٹوٹے ہیں بے نہایت — سوراخ پڑ گئے ہیں سارے مرے جگر میں
آئندہ شام کو ہم رویا کڑھا کریں گے — مطلق اثر نہ دیکھا نالیدن سحر میں
بے سدھ پڑا رہوں ہوں اس مست ناز بن میں — آتا ہے ہوش مجھ کو اب تو پہر پہر میں
سیرت سے گفتگو ہے کیا معتبر ہے صورت — ہے ایک سوکھی لکڑی جو بو نہ ہو اگر میں
ہمسایۂ مغاں میں مدت سے ہوں چنانچہ — اک شیرہ خانے کی ہے دیوار میرے گھر میں
اب صبح و شام شاید گریے پہ رنگ آوے — رہتا ہے کچھ جھمکتا خوناب چشم تر میں

عالم میں آب و گل کے کیونکر نباہ ہوگا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرا سفر میں

(۱۸۵۲)

آنکھ لگی ہے جب سے اس سے آنکھ لگی زنہار نہیں — نیند آتی ہے دل جمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں
وصل میں اس کے روز و شب کیا خوب گذرتی تھی اپنی — ہجراں کا کچھ اور سماں ہے اب وہ لیل و نہار نہیں
خالی پڑے ہیں دام کہیں یا صید وحشی صید ہوئے — یا جس صید افگن کے لیے تھے اس کو ذوق شکار نہیں
سبزہ خط کا گرد گل رو بڑھ کانوں کے پار ہوا — دل کی لاگ لب اپنی ہو کیونکر وہ اس منہ پہ بہار نہیں
لطف عمیم اس کا ہی ہمدم کیوں نہ غنیمت جانیں ہم — ربط خاص کسو سے اسے ہو یہ تو طور یار نہیں
عشق میں اس بے چشم و رو کے طرفہ رویت پیدا کی — کس دن اودھر سے اب ہم پر گالی جھڑکی مار نہیں

مشتاق اس کے راہ گذر پر برسوں کیوں نہ بیٹھیں میر
ان نے راہ اب اور نکالی ایدھر اس کا گذار نہیں

(۱۸۵۳)

طرفہ خوش رو دم خوں ریز ادا کرتے ہیں — وار جب کرتے ہیں منہ پھیر لیا کرتے ہیں

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو وفا کرتے ہیں

شوخ چشمی تری پردے میں ہے جب تک تب تک
ہم نظر باز بھی آنکھوں کی حیا کرتے ہیں

نفع بیماری عشق کو کرے سو معلوم
یار مقدور تلک اپنی دوا کرتے ہیں

آگ کا لائحہ ظاہر نہیں کچھ لیکن ہم
شمع تصویر سے دن رات جلا کرتے ہیں

اس کے قربانیوں کی سب سے جدا ہے رہ و رسم
اول وعدہ دل و جان فدا کرتے ہیں

رشک ایک آدھ کا جی مارتا ہے عاشق کا
ہر طرف اس کو تو دو چار دعا کرتے ہیں

بندبند ان کے جدا دیکھوں الٰہی میں بھی
میرے صاحب کو جو بندے سے جدا کرتے ہیں

دل کو جانا تھا گیا رہ گیا ہے افسانہ
روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں

واں سے یک حرف و حکایت بھی نہیں لایا کوئی
یاں سے طومار کے طومار چلا کرتے ہیں

بودو باش ایسے زمانے میں کوئی کیونکے کرے
اپنی بدخواہی جو کرتے ہیں بھلا کرتے ہیں

حوصلہ چاہیے جو عشق کے آزار کھنچیں
ہر ستم ظلم پہ ہم صبر کیا کرتے ہیں

میر کیا جانے کسے کہتے ہیں واشد دے تو
غنچہ خاطر ہی گلستاں میں رہا کرتے ہیں

(۱۸۵۴)

ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں
اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں

باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں

ماتم کدہ ہے تکیہ کیا تازہ کچھ ہمارا
یک جا فقیر کب سے ہم سب غم آشنا ہیں

تحریر راز دل کی مشکل ہے کیونکے کریے
کاغذ قلم ہمارے کب محرم آشنا ہیں

یاری جہانیوں کی کیا میر معتبر ہے
ناآشنا ہیں یک دم یہ اک دم آشنا ہیں

(۱۸۵۵)

دم ہے مہلت شیب میں جانے کا اپنے غم کہاں
تم ہوئے رعنا جواں بالفرض لیکن ہم کہاں

عالم عالم جمع تھے خوباں جہاں صافا ہوا
گرچہ عالم اور ہے اب واں پہ وہ عالم کہاں

تھی بلا شوخی شرارت یار کی ہنگامہ ساز
شور یوں تو اوروں کا بھی ہے پہ وہ اودھم کہاں

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالب ویرانہ ہو
جس کو فردوس بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

جس دم میں شیخ جو کرتا نہیں حرف و سخن
حق طرف ہے اس کے اس بیہودہ گو میں دم کہاں

ہو سو ہو میں میر اب تو دم بخود ہوں ہجر میں
کیا لکھوں تہ دل کی باتیں کاغذ و محرم کہاں

(۱۸۵۶)

گر روزگار ہے یہی ہجران یار میں — تو کیا رہیں گے جیتے ہم اس روزگار میں
کچھ ڈر نہیں جو داغ جنوں ہو گئے سیاہ — ڈر دل کے اضطراب کا ہے اس بہار میں
کیا بیقرار دل کی تسلی کرے کوئی — کچھ بھی ثبات ہے ترے عہد و قرار میں
بیتاب دل نہ دفن ہو اے کاش میرے ساتھ — رہنے نہ دے گا لاش کوئی دن مزار میں
وہ سنگ دل نہ آیا بہت دیکھی اس کی راہ — پتھرا چلی ہیں آنکھیں مری انتظار میں
تھمتا نہیں ہے رونا علی الاتصال کا — کیا اختیار گریۂ بے اختیار میں
مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے — سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
تھی بزم شعر رات کو شاعر بہت تھے جمع — دو باتیں ہم نے ایسے نہ کیں چار چار میں
دنبالہ گردی قیس نے بہتیری کی ولے — آیا نظر نہ محمل لیلیٰ غبار میں
اب ذوق صید اس کو نہیں ورنہ پیش ازیں — اودھم تھا وحش و طیر سے اس کے شکار میں
منھ چاہیے جو کوئی کسو سے حساب لے ق — ناکس سے گفتگو نہیں روز شمار میں

گنتی کے لوگوں کی وہاں صف ہووے گی کھڑی
تو میرؔ کس شمار میں ہے کس قطار میں

(۱۸۵۷)

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں — بہ خدا با خدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ تاب و تواں — میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا — ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں
اس کی بیگانہ وضعی ہے معلوم — برسوں تک آشنا رہا ہوں میں
دیکھو کب تیغ اس کی آبیٹھے — دیر سے سر اٹھا رہا ہوں میں
اس کی گرد سمند کا مشتاق — آنکھیں ہر سو لگا رہا ہوں میں
دور کے لوگ جن نے مارے قریب — اس کے ہمسائے آرہا ہوں میں
مجھ کو بدحال رہنے دیں اے کاش — بے دوا کچھ بھلا رہا ہوں میں
دل جلوں کو خدا جہاں میں رکھے — یا شقائق ہے یا رہا ہوں میں

کچھ رہا ہی نہیں ہے مجھ میں میرؔ
جب سے ان سے جدا رہا ہوں میں

ردیف و

(۱۸۵۸)

زمانے نے دشمن کیا یار کو   سلایا مرے خوں میں تلوار کو
کھلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں   کہاں خواب مشتاق دیدار کو
مجھے عشق اس پاس یوں لے گیا   کوئی لاوے جیسے گنہگار کو
محبت میں دشوار دینی ہے جاں   نہ جانتے سنا سہل آزار کو
کوئی دن کرے زندگی عشق میں   جو دم لینے دیں دل کے بیمار کو
بکا میں تو بازار خوبی میں جا   کہ واں بیچتے تھے خریدار کو
مرے منھ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک   ہزار آفریں چشم خونبار کو
تب اک جرعہ مے دیں مجھے مغبچے   گرو جب کروں رخت و دستار کو

کرو مت درنگ اٹھتے اس پینٹھ میر،
چلو مول لو میرؔ بازار کو

(۱۸۵۹)

کن نے کہا کہ مجھ سے بہت کم ملا کرو   منت بھی میں کروں تو نہ ہرگز منا کرو
بندے سے کی ہے جن نے یہ تخصی خدا کرے   اس سے بھی تم خصومت جانی رکھا کرو
عنقا سا شہرہ ہوں پہ حقیقت میں کچھ نہیں   تم دور ہی سے نام کو میرے سنا کرو
بیماری جگر کی شفا سے تو دل ہے جمع   اب دوستی سے مصلحتاً کچھ دوا کرو
ہم بے خودان مجلس تصویر اب گئے   تم بیٹھے انتظار ہمارا کیا کرو
جی مارتے ہیں ناز و کرشمہ بالاتفاق   جینا مرا جو چاہو تو ان کو جدا کرو
میں نے کہا کہ پھنک رہی ہے تن بدن میں آگ   بولا کہ عشق ہے نہ پڑے اب جلا کرو
دل جانے کا فسانہ زبانوں پہ رہ گیا   اب بیٹھے دور سے یہ کہانی کہا کرو

اب دیکھوں اس کو میں تو مرا جی نہ چل پڑے
تم ہو فقیر میرؔ کبھو یہ دعا کرو

(۱۸۶۰)

کیونکے نیچے ہاتھ کے رکھا دل بیتاب کو   وہ جو تڑپا لے گیا آسودگی و خواب کو
کم نہیں ہے سحر سے یہ بھی تصرف عشق کا   پانی کر آنکھوں میں لایا دل کے خون ناب کو
تھا یہی سرمایۂ بحر بلا پچھلے دنوں   چشم کم سے دیکھو مت اس دیدۂ پرآب کو
تو کہے تھی برق خاطف ناگہاں آکر گری   اک نگہ سے مار رکھا ان نے شیخ و شاب کو

کیا سفیدی دیکھی اس کی آستیں کے چاک سے
جس کے آگے رو نہ تھا کچھ پرتو مہتاب کو

چاہتا ہے جب مسبب آپھی ہوتا ہے سبب
دخل اس عالم میں کیا ہے عالم اسباب کو

دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میر
حال کہہ کر کیا کروں آزردہ اور احباب کو

(۱۸۶۱)

چھوڑا جنوں کے دور میں رسم و رہ اسلام کو
تہ کر صنم خانے چلا ہوں جامۂ احرام کو

مرتا مرو جیتا جیو آؤ کوئی جاؤ کوئی
ہے کام ہم لوگوں سے کیا اس دلبر خود کام کو

جس خودنما تک جاؤں ہوں اس سے سنوں ہوں دور دور
کیا منہ لگاوے اب کوئی اس رو سیہ بدنام کو

بے چین بستر پر رہا بے خواب خاکستر پہ ہوں
صبر و سکوں جب سے گئے پایا نہیں آرام کو

آسائش و راحت سے جو پوچھے کوئی تو کیا کہوں
میں عمر بھر کھینچا کیا رنج و غم و آلام کو

میر اب بھلا کیا ابتداے عشق کو روتا ہے تو
کر فکر جو پاوے بھی اس آغاز کے انجام کو

(۱۸۶۲)

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
کچھ تمھیں پیار نہیں کرتے جفا ماروں کو

شہر تو عشق میں ہے اس کے شفاخانہ تمام
وہ نہیں آتا کبھو دیکھنے بیماروں کو

مستی میں خوب گذرتی ہے کہ غفلت ہے ہمیں
مشکل اس مصطبے میں کام ہے ہشیاروں کو

فکر سے اپنے گذرتا ہے زمیں کاوی میں دن
رات جاتی ہے ہمیں گنتے ہوئے تاروں کو

خوب کرتے ہیں جو خوباں نہیں رو دیتے ہیں
منہ لگاتا ہے کوئی خوں کے سزاواروں کو

حسن بازار جہاں میں ہے متاع دلکش
صاحب اس کا مھگے جاتا ہے خریداروں کو

وامق و کوہکن و قیس نہیں ہے کوئی
بھکھ گیا عشق کا اژدر مرے غمخواروں کو

زندگی کرتے ہیں مرنے کے لیے اہل جہاں
واقعہ میر ہے درپیش عجب یاروں کو

(۱۸۶۳)

ہاتھ بے سبحہ تک رہا نہ کبھو
دل کا منکا ولے پھرا نہ کبھو

کیونکے عرفان ہوگیا سب کو
اپنے ڈھب پر تو وہ چڑھا نہ کبھو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے
ان نے یک حرف بھی لکھا نہ کبھو

گو شگفتہ چمن چمن تھے گل
غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

طور کی سی تھی صحبت اس کی مری جھمکی دکھلا کے پھر ملا نہ کبھو
غیرت اپنی تھی یہ کہ بعد نماز اس کا لے نام کی دعا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار عشق کی پائی انتہا نہ کبھو
وہ سخن گو فریبی چشم یار
ہم سے گویا تھی آشنا نہ کبھو

(۱۸۶۴)

تنک نقاب الٹو مت عتاب کرو کھولو منھ کو کہ پھر خطاب کرو
آنکھیں غصے میں ہوگئی ہیں لال سر کو چھاتی پہ رکھ کے خواب کرو
فرصت بود و باش یاں کم ہے کام جو کچھ کرو شتاب کرو
محو صورت نہ آرسی میں رہو اہل معنی سے تنک حجاب کرو
جھوٹ اس کا نشاں نہ دو یارو ہم خرابوں کو مت خراب کرو
منھ کھلے اس کے چاندنی چھٹکی دوستو میر ماہتاب کرو
میر جی راز عشق ہوگا فاش
چشم ہر لحظہ مت پرآب کرو

(۱۸۶۵)

بس اب بن چکے رو و موے سمن بو گری ہو کے بے ہوش مشاطہ یک سو
نہ سمجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے کیا اس کو بدخو بنا کر نکورو
نہ درگیر کیونکر ہو آپس میں صحبت کہ میں بوریا پوش وہ آتشیں خو
ہوا ابر و سبزے میں چشمک ہے گل کی کریں ساز ہم برگ عیش لب جو
بہار آئی گل پھول سر جوڑے نکلے رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو
رہے آبرو میر تو ہے غنیمت
کہ غارت میں دل کی ہے ایماے ابرو

(۱۸۶۶)

لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو برات عاشقاں بر شاخ آہو
گیا وہ ساتھ سوتے لے کے کروٹ لگا بستر سے پھر پنا نہ پہلو
اڑے ہے خاک سی سارے چمن میں پھرا ہے آہ کس کا واں سے گل رو
جدھر پھرتے تھے چنتے پھول ہنستے ادھر ٹپکے ہیں اب تک میرے آنسو
جدا ہوتے ہی گل خنداں ہوا میر
کیا تھا اس کا گل تکیہ جو بازو

(۱۸۶۷)

چاہت میں خوبرویوں کی کیا جانے کیا نہ ہو
بیتاب دل کا مرگ کہیں مدعا نہ ہو

بے لاگ عشق بازی میں مفلس کا ہے ضرر
کیا کھیلے وہ جوا جسے کچھ آسرا نہ ہو

کرتے دعا مجھے وہ دغاباز دیکھ کر
بولا کہ اس فقیر کے دل میں دغا نہ ہو

آزاد پرشکستہ کو صد رنگ قید ہے
یارب اسیر ایسا قفس سے رہا نہ ہو

دوری مہ سے کبک ہیں کہسار میں خراب
دلبر سے اپنے کوئی الٰہی جدا نہ ہو

کھولے ہے آنکھ اس کے گل رو پہ ہر سحر
غالب کہ میری آئینے کی اب صفا نہ ہو

آہوں کے میری دود سے گھر بھر گیا ہے سب
سدہ ہمنشیں لے دل کی کہیں وہ جلا نہ ہو

ہم گر جگر نکال رکھیں اس کے زیر پا
بے دید کی ادھر سے نظر آشنا نہ ہو

رہتے ہیں میر بے خود و وارفتہ ان دنوں
پوچھو کنایۂ کسو سے دل لگا نہ ہو

ردیف ہ

(۱۸۶۸)

ہر چند جذب عشق سے تشریف یاں بھی لائے وہ
پر خود گم ایسا میں نہیں جو سہل مجھ کو پائے وہ

خوبی و رعنائی ادھر بدحالی و خواری ادھر
اے وائے ہم اے وائے ہم اے ہائے وہ اے ہائے وہ

مارا ہوا چاہت کا جو آوارہ گھر سے اپنے ہو
حیراں پریشاں پھر کے پھر کیا جانے کیدھر جائے وہ

جی کتنا محو و رفتہ کا جو ہو طرف دیکھے تجھے
تو کج کرے ابرو اگر پل مارتے مرجائے وہ

الفت نہیں مجھ سے اسے کلفت کا میری غم نہیں
پاے غرض ہو درمیاں تو چل کے یاں بھی آئے وہ

عاشق کا کتنا حوصلہ یہ معجزہ ہے عشق کا
جو خستہ جاں پارہ جگر سو داغ دل پر کھائے وہ

مشکل عجائب میر ہے دیدار جوئی یار کی
دیکھے کوئی کیا اس کو جو آنکھیں لڑے شرمائے وہ

(۱۸۶۹)

اب دل خزاں میں رہتا ہے جی کی رکن کے ساتھ
جانا ہی تھا ہمیں بھی بہار چمن کے ساتھ

کب تک خراب شہر میں اس کے پھرا کریں
اب جاویں یاں سے کوئی غریب الوطن کے ساتھ

ہم باغ سے خزاں میں گئے پر ہزار حیف
جانا بنا نہ اپنا گل و یاسمن کے ساتھ

لکنت سے کیا نکلتی نہیں اس کے منہ سے بات
چپکا ہے حرف یار کے شیریں دہن کے ساتھ

جی خواب مرگ لے گئی حسرت ہی میں ندان   اک شب نہ سوئے ہم کسو گل پیرہن کے ساتھ
جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے   کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

کیا جانیں لوگ عشق کا راز و نیاز میر
اک بات اس سے ہوگئی دو دو بچن کے ساتھ

(۱۸۷۰)

مرتے ہیں ہم تو اس صنم خودنما کے ساتھ   جیتے ہیں وے ہی لوگ جو تھے کچھ خدا کے ساتھ
دیکھیں تو کار بستہ کی کب تک کھلے گرہ   دل بستگی ہے یار کے بند قبا کے ساتھ
اے کاش فصل گل میں گئی ہوتی اپنی جان   مل جاتی یہ ہوا کوئی دن اس ہوا کے ساتھ
مدت ہوئی موئے گئے ہم کو پر اب تلک   اڑتی پھرے ہے خاک ہماری صبا کے ساتھ
ہم رہتے اس کے محو تو وہ کرتا ہم کو سہو   ہرگز وفا نہ کرنی تھی اس بے وفا کے ساتھ
کیفیت آشنا نہیں اس مست ناز کی   معشوق ورنہ کون ہے اب اس ادا کے ساتھ
منھ اپنا ان نے عکس سے اپنے چھپا لیا   دیکھا نہ کوئی آئینہ رو اس حیا کے ساتھ
ٹھہرا ہے رونا آٹھ پہر کا مرا علاج   تسکین دل ہے یعنی کچھ اب اس دوا کے ساتھ

تھا جذب آگے عشق سے جو ہر نفس میں میر
اب وہ کشش نہیں ہے سحر کی دعا کے ساتھ

(۱۸۷۱)

نظر آیا تھا صبح دور سے وہ   پھر چھپا خور سا اپنے نور سے وہ
جز برادر عزیز یوسف کو   نہیں لکھتا کبھو غرور سے وہ
دیکھیں عاشق کا جی بھی ہے کہ نہیں   تنگ ہے جان ناصبور سے وہ
کیا تصور میں پھیرے ہے صورت   کہ سرکتا نہیں حضور سے وہ
خوبی اس خوبی سے بشر میں کہاں   خوب تر ہے پری و حور سے وہ
دل لیا جس شمیں کا تونے شوخ   وے گیا جی ہی اک سرور سے وہ

خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

(۱۸۷۲)

آزارکش کو اس کے آزار ہے ہمیشہ   آزردہ دل کسو کا بیمار ہے ہمیشہ
مختار عشق اس کا مجبور ہی ہے یعنی   یک رہ دو چار ہو کر ناچار ہے ہمیشہ

کب سہل عاشقی میں اوقات گذرے ہے یاں
کام اپنا اس پر اس بن دشوار ہے ہمیشہ

عالم کا عین اسی کو معلوم کر چکے ہیں
اس وجہ سے اب اس کا دیدار ہے ہمیشہ

اس سے حصول مطلب اپنا ہوا نہ ہوگا
با آنکہ کام دل کا اظہار ہے ہمیشہ

پروائے نفع و نقصاں مطلق نہیں ہے اس کو
اس کی تو لاابالی سرکار ہے ہمیشہ

ملنا نہ ملنا ٹھہرے تو دل بھی ٹھہرے اپنا
اقرار ہے ہمیشہ انکار ہے ہمیشہ

آمادۂ فنا کچھ کیا میرؔ اب ہوا ہے
جی مفت دینے کو وہ تیار ہے ہمیشہ

(۱۸۷۳)

دل ہے میری بغل میں صد پارہ
اور ہر پارہ اس کا آوارہ

عرق شرم رو سے دلبر کے
رفتہ ثابت گذشتہ سیارہ

خواری عشق اپنی عزت ہے
کی ہے ہموار ہم نے ہموارہ

کام اس سے پکڑ کر نہ لیا
ہیچ کارہ بھی ہے یہ ناکارہ

ٹوٹتیں پھوٹتیں نہ کاش آنکھیں
کرتے ان رخنوں ہی سے نظارہ

گو مسیحا مزاج آوے طبیب
عشق میں مرگ بن نہیں چارہ

کیا بنے اس سے میرؔ میں مسکین
وہ جفاپیشہ و ستم کارہ

(۱۸۷۴)

مکتوب دیر پہنچا پر دو طرف سے سادہ
کیا شوخ طبع ہے وہ پرکار سادہ سادہ

جب میکدے گئے ہیں پابوس ہی کیا ہے
ہے مغبچہ ہمارا گویا کہ پیرزادہ

سائے میں تاک کے ہم خوش بیٹھے ہیں اب اپنا
اس سلسلے میں بیعت کرنے کا ہے ارادہ

دل اس قدر نہ رکتا گھبراتا جی نہ اپنا
چھاتی لگا جو رہتا . وہ سینۂ کشادہ

شیشہ کنار جو ہے پنبہ دہان و رعنا
مینائے مے چمن میں اک سرو ہے پیادہ

پڑتی ہیں اس کی آنکھیں چاروں طرف نشے میں
جوں راہ میں بہکتے ہوں ترک مست بادہ

جو شہرہ نامور تھے یارب کہاں گئے وے
آباد کم رہا ہے یاں کوئی خانوادہ

مت دم کشی کر اتنی ہنگام صبح بلبل
فریاد خونچکاں ہے منہ سے ترے زیادہ

کیا خاک سے اٹھوں میں نقش قدم سا بیٹھا
اب مٹ ہی جانا میرا ہے پیش پا فتادہ

حالات عشق رنج و درد و بلا مصیبت
دل دادہ میرؔ جانے کیا جانے کوئی ندادہ

ردیف ی

(۱۸۷۵)

کہتے ہیں مرنے والے یاں سے گئے   سب یہیں رہ گئے کہاں سے گئے
دم میں دم جب تلک تھا سوچ رہا   سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے
آنکھ کھلتے ہی گھر گئے وے تو   ہم ستم دیدہ خانماں سے گئے
واں گئے کرتے وے خرام ناز   یاں جواں کیسے کیسے جاں سے گئے
اس گلی سے جو اٹھ گئے بے صبر
میرؔ گویا کہ وے جہاں سے گئے

(۱۸۷۶)

کچھ نہ کی ان نے جس کو چاہا ہے   جوں توں اپنا کیا نباہا ہے
سدھ خبر اپنے غمزدے کی لے   صبح تک رات کو کراہا ہے
یاعلیؑ ہے گا میرؔ پیر فقیر
اب سزاوار لطف شاہا ہے

(۱۸۷۷)

عشق میں ہم نے جاں کنی کی ہے   کیا محبت نے دشمنی کی ہے
کیسی سرخ و سفید نکلی تھی   مے گر دختر ارمنی کی ہے
بید سا کیوں نہ سوکھ جاؤں میں   دیر مجنوں سے ہم تنی کی ہے
اس پریشان کو نشانہ کر   یار نے جمع الگنی کی ہے
کر دیا خاک آسماں نے ہمیں   یہ بھی ہمت اسی دنی کی ہے
تکیہ ویراں فقیر کا بھی ہو   یاں خرابی بہت غنی کی ہے
قافلہ لٹ گیا جو آنسو کا
عشق نے میرؔ رہزنی کی ہے

(۱۸۷۸)

میں ہوں تو ہے درمیاں شمشیر ہے   سفک دم میں میرے اب کیا دیر ہے
خضر دشت عشق میں مت جا کہ واں   ہر قدم مخدوم خوف شیر ہے
راہ تک تک کر ہوئے ہیں جاں بہ لب   پر وہی اب تک بھی یاں اوسیر ہے

جو گرسنہ دل تھا اس دیدار کا — اپنے جینے ہی سے وہ اب سیر ہے
کچھ نہیں جاں ان کے پیش تار مو — گھر میں شمعی رنگوں کے اندھیر ہے
پاک ہی ہوتی رہی کشتی خلق — ہر زبردست اس جواں کا زیر ہے
طائروں نے گل فشاں کی میری گور — سامنے پھولوں کا گویا ڈھیر ہے
آشنا ڈوبے بہت اس دور میں — گرچہ جامہ یار کا کم گھیر ہے

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے

(۱۸۷۹)

جو جنون و عشق کی تدبیر ہے — سو نہ یاں شمشیر نے زنجیر ہے
وصف اس کا باغ میں کرتا نہ تھا — گل ہمارا اب گریباں گیر ہے
دیکھ رہتا ہے جو دیکھے ہے اسے — دلربا آئینہ رو تصویر ہے
پاے گیر اس کے نہ ہوں کیوں دردمند — حلقہ حلقہ زلف وہ زنجیر ہے
صید کے تن پر ہیں سب گلہاے زخم — کس قدر خوش کار اس کا تیر ہے
مدت ہجراں نے کی کچھ کمی — میرے طول عمر کی تقصیر ہے
خط نہ لکھتے تھے سو تاب دل گئی — دفتروں کی اکثر اب تحریر ہے
رکھ نظر میں بھی خراب آبادیاں — اے کہ تجھ کو کچھ غم تعمیر ہے
سخت کافر ہیں برہمن زادگاں — مسلموں کی ان کے ہاں تکفیر ہے
گفتگو میں رہتے تھے آگے خموش — ہر سخن کی اب مرے تقریر ہے
نظم محسن کی رہی سرمشق دیر — اس مرے بھی شعر میں تاثیر ہے
مر گئے پر بھی نہ رسوائی گئی — شہر میں اب نعش بھی تشہیر ہے
کیا ستم ہے یہ کہ ہوتے تیغ و طشت — ذبح کرنے میں مرے تاخیر ہے

میر کو ہے کیا جوانی میں صلاح
اب تو سارے میکدے کا پیر ہے

(۱۸۸۰)

دل غم سے خوں ہوا تو بس اب زندگی ہوئی — جان امیدوار سے شرمندگی ہوئی
خدمت میں اس صنم کے گئی عمر پر ہمیں — گویا کہ روز اس سے نئی بندگی ہوئی
گریے کا میرے جوش جو دیکھا تو شرم سے — سیلاب کو بھی دیر سرافگندگی ہوئی

تھا دو ولا وصال میں بھی میں کہ ہجر میں — پانچوں حواس کی تو پراگندگی ہوئی
اب صبر میرؔ ہو نہیں سکتا فراق میں
یک عمر جان و دل کی فرچندگی ہوئی

(۱۸۸۱)

یار نے ہم سے بے ادائی کی — وصل کی رات میں لڑائی کی
بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی
کلفتِ رنجِ عشق کم نہ ہوئی — میں دوا کی بہت شفائی کی
طرفہ رفتار کے ہیں رفتہ سب — دھوم ہے اس کی رہگرائی کی
خندۂ یار سے طرف ہوکر — برق نے اپنی جگ ہنسائی کی
کچھ مروت نہ تھی ان آنکھوں میں — دیکھ کر کیا یہ آشنائی کی
وصل کے دن کو کار جاں نہ کھنچا — شب نہ آخر ہوئی جدائی کی
منھ لگایا نہ دخترِ رز کو — میں جوانی میں پارسائی کی
جور اس سنگ دل کے سب نہ کھنچے — عمر نے سخت بے وفائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا — عشق نے زور آزمائی کی
چپکے اس کی گلی میں پھرتے رہے — دیر واں ہم نے بے نوائی کی
اک نگہ میں ہزار جی مارے — ساحری کی کہ دلربائی کی
نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی — برسوں تک ہم نے جبہہ سائی کی
میرؔ کی بندگی میں جانبازی
سیر سی ہوگئی خدائی کی

(۱۸۸۲)

زمیں اور ہے آسماں اور ہے — تب آناً فاناً سماں اور ہے
نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ — جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے
نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی — یہ خلق اور ان کی زباں اور ہے
تجھے گو کہ صد رنگ ہو مجھ سے کیں — مری اور اک مہرباں اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

(۱۸۸۳)

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے — کہ دیکھا جب تجھے تب جی کو مار مار رہے

ادا و ناز سے دل لے چلا تو ہنس کے کہا — کہ میرے پاس تمھارا بھی یادگار رہے
ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں مدت کے — الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے
ہوس اسیروں کے تنگ دل کی نکلے کچھ شاید — کوئی دن اور اگر موسم بہار رہے
اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا — ہزار مرغ گلستاں مجھے پکار رہے
لیا تو جاوے بھلا نام منھ سے یاری کا — جو ہم ستم زدوں سے یار کچھ بھی یار رہے
وصال ہجر مخبر جاوے کچھ نہ کچھ آخر — جو بیقرار مرے دل کو بھی قرار رہے
کریں گے چھاتی کو گلزار ہم جلاکر داغ — جو گل کے سینے میں ایسا ہی خار خار رہے
تکوں ہوں ایک سا میں گرد راہ کو اس کی — نہ کیونکے دونوں مری آنکھوں میں غبار رہے

نہ کریے گریۂ بے اختیار ہرگز میر
جو عشق کرنے میں دل پر کچھ اختیار رہے

(۱۸۸۴)

بے لطف یار ہم کو کچھ آسرا نہیں ہے — سو کوئی دن جو ہے تو پھر سالہا نہیں ہے
سن عشق جو اطبا کرتے ہیں چشم پوشی — جانکاہ اس مرض کی شاید دوا نہیں ہے
جس آنکھ سے دیا تھا ان نے فریب دل کو — اس آنکھ کو جو دیکھا اب آشنا نہیں ہے
جب دیکھو آئینے کو تب روبرو ہے اس کے — بے چشم و رو اسے کچھ شرم و حیا نہیں ہے
میں برگ بند اگرچہ زیر شجر رہا ہوں — فقر مکب سے لیکن برگ و نوا نہیں ہے
شیریں نمک لبوں بن اس کے نہیں حلاوت — اس تلخ زندگی میں اب کچھ مزہ نہیں ہے
اعضا گداز ہوکر سب بہ گئے ہیں میرے — ہجراں میں اس کے مجھ میں اب کچھ رہا نہیں ہے
سن سانحات عشقی ہنس کیوں نہ دو پیارے — کیا جانو تم کسو سے دل تک لگا نہیں ہے

دل خوں جگر کے ٹکڑے جب میر دیکھتا ہوں
اب تک زباں سے اپنی میں کچھ کہا نہیں ہے

(۱۸۸۵)

لاکھوں فلک کی آنکھیں سب مند گئیں ادھر سے — نکلے نہ ناامیدی کیونکر مری نظر سے
برسے ہے عشق یاں تو دیوار اور در سے — روتا گیا ہے ہر اک جوں ابر میرے گھر سے
جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے — دیکھا نہ ان کو اب کے آئے جو ہم سفر سے
قاصد کسو نے مارا خط راہ میں سے پایا — جب سے سنا ہے ہم نے وحشت ہے اس خبر سے
سو بار ہم تو تم بن گھر چھوڑ چھوڑ نکلے — تم ایک بار یاں تک آئے نہ اپنے گھر سے

چھاتی کے جلنے سے ہی شاید کہ آگ سلگی　　اٹھنے لگا دھواں اب میرے دل و جگر سے
نکلا سو سب جلا ہے نومید ہی چلا ہے　　اپنا نہال خواہش برگ و گل و ثمر سے
جھڑ باندھنے کا ہم بھی دیں گے دکھا تماشا　　ٹک ابر قبلہ آکر آگے ہمارے برسے
سو نامہ بر کبوتر کر ذبح ان نے کھائے　　خط چاک اڑے پھریں ہیں اس کی گلی میں پر سے
آخر گرسنہ چشم نظارہ ہوگئے ہم　　ٹک دیکھنے کو اس کے برسوں مہینوں ترسے
اپنا وصول مطلب اور ہی کسی سے ہوگا　　منزل پہنچ رہیں گے ہم ایسے رہگذر سے
سردے دے مارتے ہیں ہجراں میں میر صاحب
یارب چھڑا تو ان کو چاہت کے درد سر سے

(۱۸۸۶)

کافر بتوں سے مل کے مسلمان کیا رہے　　ہو مختلط جو ان سے تو ایمان کیا رہے
شمشیر اس کی حصہ برابر کرے ہے دو　　ایسی لگی ہے ایک تو ارمان کیا رہے
ہے سر کے ساتھ مال و منال آدمی کا سب　　جاتا رہے جو سر ہی تو سامان کیا رہے
ویرانی بدن سے مرا جی بھی ہے اداس　　منزل خراب ہووے تو مہمان کیا رہے
اہل چمن میں میں نے نہ جانا کسو کے تیں　　مدت میں ہو ملاپ تو پہچان کیا رہے
حال خراب جسم ہے جی جانے کی دلیل　　جب تن میں حال کچھ نہ رہے جان کیا رہے
جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

(۱۸۸۷)

وہ اب ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے　　افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے
ہجران یار ایک مصیبت ہے ہم نشیں　　مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے
صورت ہو ایسی کوئی تو کچھ میری قدر ہو　　مشتاق یار کو بھی کسو کا خدا کرے
مرنا قبول ہے نہیں زنہار یہ قبول　　منت سے آن کر جو معالج دوا کرے
مستی شراب کی سی ہی ہے آمد شباب　　ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشہ کرے
یارب نسیم لطف سے تیری کہیں کھلے　　دل اس چمن میں غنچہ سا کب تک رہا کرے
میں نے کہا کہ آتش غم میں جلے ہے دل　　وہ سردمہر گرم ہو بولا جلا کرے
رکنے سے میرے رات کے سارا جہاں رکا　　آئے نسیم صبح کہ اک دم ہوا کرے
برسوں کیا کرے مری تربت کو گل فشاں　　مرغ چمن اگر حق صحبت ادا کرے

عارف ہے میر اس سے ملا بیشتر کرو
شاید کہ وقت خاص میں تم کو دعا کرے

(۱۸۸۸)

مدت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی — ظاہر کا پاس تھا سو مدارات بھی گئی
کتنے دنوں میں آئی تھی اس کی شب وصال — باہم رہی لڑائی سو وہ رات بھی گئی
کچھ کہتے آکے ہم تو سنا کرتے وے خموش — اب ہر سخن پہ بحث ہے وہ بات بھی گئی
نکلی جو تھی تو بنت عنب عاصمہ ہی تھی — اب تو خراب ہو کے خرابات بھی گئی
عمامہ جانماز گئے لے کے مغبچے — واعظ کی اب لباسی کرامات بھی گئی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

(۱۸۸۹)

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے — گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
میں بے دماغ کرکے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے
صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے — کھو بیٹھیے جو آپ کو تو اس کو پائیے
رنجیدگی ہماری تو پر سہل ہے ولے — آزردہ دل کسو کو نہ اتنا ستائیے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں — اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق — طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائیے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے — آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے
مچلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند — سوتا پڑا ہو کوئی تو اس کو جگائیے

جان غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میر
بگڑا جنھوں سے چاہیے ان سے بنائیے

(۱۸۹۰)

لے عشق میں گئے دل پر اپنی جان سے — خالی ہوا جہاں جو گئے ہم جہان سے
دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار — نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
تنگ دل سے آؤ آنکھوں میں ہے دید کی جگہ — بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے
اول زمینوں میں ہو مائل مری طرف — جو حادثہ نزول کرے آسمان سے
یہ وہم ہے کہ آنکھیں مری لگ گئیں کہیں — تم مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے

کھل جائیں گی تب آنکھیں جو مرجاوے گا کوئی　　تم باز نئیں ہو آتے مرے امتحان سے
نامہربانی نے تو تمھاری کیا ہلاک　　اب لگ چلیں گے اور کسی مہربان سے
زنبورخانہ چھاتی غم دوری سے ہوئی　　وے ہم تلک نہ آئے کبھو کسر شان سے

تاثیر کیا کرے سخن میر یار میں
جب دیکھو لگ رہا ہے کوئی اس کے کان سے

(۱۸۹۱)

کہو سو کریے علاج اپنا طپیدن دل بلاے جاں ہے
نہ شب کومہلت نہ دن کو فرصت دمادم آنکھوں سے خوں رواں ہے

تلاش دل کی جو دلبری سے ہمارے پاس آ تھمیں رہے ہے
ستم رسیدہ شکستہ وہ دل گیا بھی خوں ہو کے یاں کہاں ہے

کڑھا کریں ہیں ہوا ہے مورد جہان اجسام جب سے اپنا
غم جدائی جہان جاں کا ہمارے دل میں جہاں جہاں ہے

نہیں جو دیکھا ہے ہم نے اس کو ہوا ہے نقصان جان اپنا
ادھر نہ دیکھے ہے وہ کبھو تو نگہ کا اس کی مگر زیاں ہے

بجا بھی ہے جو نہ ہووے مائل نگار میر چمن کا ہرگز
گلوں میں ہمدم ہو کوئی اس کا سو کس کا ایسا لب و دہاں ہے

کسے ہے رنج و غم و الم سے دماغ سر کے اٹھانے کا اب
مصیبت اس کے زمانے میں تو ہمارے اوپر زماں زماں ہے

نہیں ہے اب میر پیر اتنا جو ذکر حق سے تو منہ چھپاوے
پگاہ نعرہ زنی کیا کر ابھی تو نام خدا جواں ہے

(۱۸۹۲)

سر راہ چند انتظاری رہے　　بھلا کب تلک بیقراری رہے
رہا ہی کئے آنسو پلکوں پہ شب　　کہاں تک ستارہ شماری رہے
کہا بوسہ دے کر سفر جب چلا　　کہ میری بھی یہ یادگاری رہے
کہیں خشک ہو چشمۂ چشم بھی　　لہو منہ پہ تا چند جاری رہے
بس اب رہ چکی جان غمناک بھی　　جو ایسی ہی تن کی نزاری رہے
تسلی نہ ہو دل اگر یار سے　　ہمیں، سالہا ہم کناری رہے

کرے ہیں دعا تو سنا خوب ہی   فقیروں کی گر گوش داری رہے
شب وصل تھی یا شب تیغ تھی   کہ لڑتے ہی وے رات ساری رہے
کریں خواب ہمسائے کیونکر کہ یاں   بلا شور و فریاد و زاری رہے
پھرا کرتے ہیں خوار گلیوں میں ہم   کہاں تک یہ بے اعتباری رہے

کج ابرو ان اطفال میں ہے عجب
جو میر آبرو بھی تمھاری رہے

(۱۸۹۳)

کیا منھ لگے گلوں کے شگفتہ دماغ ہے   پھولا پھرے ہے مرغ چمن باغ باغ ہے
وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے   جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
قامت سے اس کی سرنگوں رہتے ہیں سرو و گل   خوبی سے اس کی لالۂ صد برگ داغ ہے
یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں   سوز دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے
مدت ہوئی کہ زانو سے اٹھتا نہیں ہے سر   کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے
گھر گھر پھرے ہے جھانکتی ہر صبح جو نسیم   پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سراغ ہے
صولت فقیری کی نہ گئی مر گئے پہ بھی   اب چشم شیر گور کا میری چراغ ہے
لگ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے   آنے میں باد صبح کے یاں اک دماغ ہے

نابخردی سے مرغ دل ناتواں پہ میر
اس شوخ لڑکے سے مجھے باہم جناغ ہے

(۱۸۹۴)

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی   کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی
نمائش داغ سودا کی ہے سر سے   بہار اب ہے جنوں کی ابتدا کی
نہ ہو گلشن ہمارا کیونکے بلبل   ہمیں گلزار میں مدت سنا کی
مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھ نہ آیا   نہیں تقصیر اس ناآشنا کی
گئے جل حر عشق سے جگر دل   رہی تھی جان سو برسوں جلا کی
انھیں نے پردے میں کی شوخ چشمی   بہت ہم نے تو آنکھوں کی حیا کی
ہوا طالع جہاں خورشید دن ہے   تردد کیا ہے ہستی میں خدا کی
پیام اس گل کو پہنچا پھر نہ آئی   ق   نہ خوش آئی میاں گیری صبا کی
سبب حیرت کا ہے اس کا توقف   سبک پا واں یہ اب تک کیا کیا کی

جفائیں سہیے گا کہتے تھے اکثر — ہماری عمر نے پھر کر وفا کی
جواں ہونے کی اس کے آرزو تھی — سو اب بارے ہمیں سے یہ جفا کی
گیا تھا رات دروازے پہ اس کے ق — فقیرانہ دعا کر جو صدا کی
لگا کہنے کہ یہ تو ہم نشیناں — صدا ہے دل خراش اس ہی گدا کی
رہا تھا دیکھ پہلے جو نگہ کر ق — ہمارے میر دل میں ان نے جا کی
ملا اب تو نہ وہ ملنا تھا اس کا
نہ ہم سے دیر آنکھ اس کی ملا کی

(۱۸۹۵)

ہم رو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے — جی میں ہے کہوں حال غریبانہ کہیں گے
سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ — اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
دیکھے سو کہے کوئی نہیں جرم کسو کا — کہتے ہیں بجا لوگ بھی بیجا نہ کہیں گے
ہوں دربدر و خاک بسر چاک گریباں — اس طور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہیں گے
ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر — اجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے
میں رویا کڑھا کرتا ہوں دن رات جو درویش — من بعد مرے تکیے کو غم خانہ کہیں گے
موقوف غم میر کہ شب ہوچکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

(۱۸۹۶)

مدت پائے چنار رہے ہیں مدت گلخن تابی کی
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

مشق نوشتن جن کی رسا ہے وے بھی چپ ہیں حیرت سے
نقل کروں میں خوبی خط کیا اس کے چہرے کتابی کی

وہ نہیں سنتا پچی بھی میری تین میں میں ہوں نہ تیرہ میں
گنتی میں کچھ ہوں تو میری قدر ہو حرف حسابی کی

دیر جوانی کچھ رہتی تو اس کی جفا کا اٹھتا مزہ
عمر نے میری گذر جانے میں ہائے دریغ شتابی کی

جام گلوں کے خزاں میں نگوں ہیں نکہت خوش بھی چمن سے گئی
ے شاید کہ تمام ہوئی ہے ہر غنچے کی گلابی کی

جیتے جاگتے اب تک تو ہیں لیکن جیسے مردہ ہیں
یعنی بے دم ست بہت ہیں حسرت سے بے خوابی کی

اچھی ہی ہے یہ جنس وفا یاں لیک نہ پائی ہم نے کہیں
داغ ہوئی ہے جان ہماری اس شے کی نایابی کی

جیب و دامن تر رہتے ہیں آٹھ پہر کے رونے سے
قدر نہیں ہے ہم کو ہرگز اپنے جامۂ آبی کی

تنگ خلق کیا ہے ہم کو آخر دست خالی نے
عالم میں اسباب کے ہے کیا شورش بے اسبابی کی

عشق میرؔ کسو سے اتنا اب تک ظاہر ہم پہ نہ تھا
حرف یار جو منھ سے نکلا ان نے بلا بیتابی کی

(۱۸۹۷)

خم ہوا قد کماں سا پیر ہوئے — سو ہم اس کے نشان تیر ہوئے
اب نہ حسرت رہے گی مرنے تک — موسم گل میں ہم اسیر ہوئے
میں ہی درویش خوار و زار نہیں — عشق میں بادشہ فقیر ہوئے
ہے شرارت کا وقت عہد شباب — تم لڑکپن ہی سے شریر ہوئے
گھر کو اس کے خراب ہی دیکھا — جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے
شور جن کے سروں میں عشق کا تھا — وے جواں سارے پاے گیر ہوئے
یاں کی خلقت کی ہے زباں الٹی — کہتے ہیں اندھوں کو بصیر ہوئے
نہ ہوئے ہم نظیریؔ سے یوں تو — شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

بات کا ہم سے ان کو کب ہے دماغ
میرؔ درویشی میں اسیر ہوئے

(۱۸۹۸)

آؤ کبھو تو پاس ہمارے بھی ناز سے — کرنا سلوک خوب ہے اہل نیاز سے
پھرتے ہو کیا درختوں کے سائے میں دور دور — کرلو موافقت کسو بے برگ و ساز سے[1]
ہجراں میں اس کے زندگی کرنا بھلا نہ تھا — کوتاہی جو نہ ہووے یہ عمر دراز سے
مانند سبحہ عقدے نہ دل کے کبھو کھلے — جی اپنا کیونکے اچٹے نہ روزے نماز سے
کرتا ہے چھید چھید ہمارا جگر تمام — وہ دیکھنا ترا مژۂ نیم باز سے

---

(۱) یہ شعر مطلع سے مربوط ہے۔ مصحح

دل پہ ہو اختیار تو ہرگز نہ کریے عشق ۔۔۔ پرہیز کریے اس مرض جاں گداز سے
آگے بچھا کے نطع کو لاتے تھے تیغ و طشت ۔۔۔ کرتے تھے یعنی خون تو اک امتیاز سے
مانع ہوں کیونکے گریۂ خونیں کے عشق میں ۔۔۔ ہے ربطِ خاص چشم کو افشاے راز سے
شاید شراب خانے میں شب کو رہے تھے میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرِ نماز سے

(۱۸۹۹)

رشک شمشیر ابرو کا خم ہے ۔۔۔ تیر و نشتر سے کیا پلک کم ہے
تم کرو شاد زندگی کہ مجھے ۔۔۔ دل کے خون ہونے کا بہت غم ہے
جب سے عالم میں جلوہ گر ہے تو ۔۔۔ میلکے میں تمام عالم ہے
حبس دم پر نہ جائیو ان کے ۔۔۔ شیخ صاحب کا یہ بھی اک دم ہے
زالِ دنیا کو جن نے چھوڑ دیا ۔۔۔ وہی نزدیک اپنے رستم ہے
سرو و طوبیٰ کا ناز ہے بیجا ۔۔۔ اس کے قد کا سا کب خم و چم ہے
کچھ تو نسبت ہے اس کے بالوں سے
یوں ہی کیا حال میر درہم ہے

(۱۹۰۰)

جو لوگ آسماں نے یاں خاک کر اڑائے ۔۔۔ بے عبرتوں نے لے کر خاک ان کی گھر بنائے
رہنے کی کوئی جا کہ شاید نہ تھی انھوں کی ۔۔۔ جو یاں سے اٹھ گئے ہیں وے پھر کبھو نہ آئے
لڑکے برہمنوں کے صندل بھری جبینیں ۔۔۔ ق ۔۔۔ ہندوستاں میں دیکھے سو ان سے دل لگائے
ہر اک صنم کدہ کیا کافر جگہ ہے ہم نے ۔۔۔ قشقے بھی یاں کھنچائے زنار بھی بندھائے
پامال لوگ کیا کیا آگے ہوئے ہیں تم سے ۔۔۔ اس پر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اٹھائے
کیا گھورتے ہو ہر دم ڈرتے نہیں ہیں کچھ ہم ۔۔۔ جن آنکھوں پر ہیں عاشق ان آنکھوں کے دکھائے
آہ شرر فشاں جو نکلے ہے منھ سے ہر دم
روشن ہے میر غم نے قلب و کبد جلائے

(۱۹۰۱)

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے ۔۔۔ آسماں تک سیاہ کرتے تھے
اے خوشا حال اس کا جس کا وے ۔۔۔ حال عمداً تباہ کرتے تھے
برسوں رہتے تھے راہ میں اس کی ۔۔۔ تب کچھ اک اس سے راہ کرتے تھے

نیچی آنکھیں ہم اس کو دیکھی کیے ‏ ‏ ‏ کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے
اب جوانی کے موسم گل میں ‏ ‏ ‏ جائے طاعت گناہ کرتے تھے
کیا زمانہ تھا وہ جو گذرا میر
ہم دگر لوگ چاہ کرتے تھے

(۱۹۰۲)

وائے یہ بے ہوشی و گرفتاری ‏ ‏ ‏ دزد غمزوں کی ویسی عیاری[1]
اب کے دل ان سے بچ گیا تو کیا ‏ ‏ ‏ چور جاتے رہے کہ اندھیاری
اچھا ہوتا نہیں مریض عشق ‏ ‏ ‏ ساتھ جی کے ہے دل کی بیماری
کیوں نہ ابر بہار پر ہو رنگ ‏ ‏ ‏ برسوں دیکھی ہے میری خوں باری
شور و فریاد و زاری شب سے ‏ ‏ ‏ شہریوں کو ہے مجھ سے بیزاری
چلے جاتے ہیں رات دن آنسو ‏ ‏ ‏ دیدۂ تر کی خیر ہے جاری
مر رہیں اس میں یا رہیں جیتے ‏ ‏ ‏ شیوہ اپنا تو ہے وفاداری
کیونکے راہ فنا میں جیئے گا ‏ ‏ ‏ جرم بے حد سے ہے گراں باری
واں سے خشم و خطاب و ناز و عتاب ‏ ‏ ‏ یاں سے اخلاص و دوستی یاری
میر چلنے سے کیوں ہو غافل تم
سب کے ہاں ہو رہی ہے تیاری

(۱۹۰۳)

جمع افلاکی سے ان نے ترکش کیے ہیں خالی ‏ ‏ ‏ کس مرتبے میں ہوگی سینوں کی خستہ حالی
درگیر کیونکے ہوگی اس سفلہ خو سے صحبت ‏ ‏ ‏ دیوانگی یہ اتنی وہ اتنا لاابالی
بے اختیار شاید آہ اس سے کھنچ گئی ہو ‏ ‏ ‏ جب صورت ایسی تیری نقاش نے نکالی
اتنی سڈول دیہی دیکھی نہ ہم سنی ہے ‏ ‏ ‏ ترکیب اس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی
وصل و فراق دونوں بے حالی ہی میں گذرے ‏ ‏ ‏ اب تک مزاج کی میں پاتا نہیں بحالی
میں خاکسار ان تک پہنچی دعا نہ میری ‏ ‏ ‏ وے ہفتم آسماں پر ان کا دماغ عالی
آنکھیں فلک کی لاکھوں تب جھپیاں ہی دیکھیں ‏ ‏ ‏ مانند برق خاطف تیغ ان نے جب نکالی
کل فتنہ زیر سر تھے جو لوگ کٹ گئے سب ‏ ‏ ‏ پھر بھی زمین سر پر یاروں نے آج اٹھا لی
طفلی میں ٹیڑھی سیدھی ٹوپی کا ہوش کب تھا ‏ ‏ ‏ پگڑی ہی پھیر رکھی ان نے جو سدھ سنبھالی
معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے
لڑکوں سے عشق بازی ہنگام کہنہ سالی

---

(۱) مطلع کے ساتھ دوسرا شعر مربوط ہے۔ مصحح

(۱۹۰۴)

دوستی نے تو ہماری جاں گدازی خوب کی
آہ اس دشمن نے یہ عاشق نوازی خوب کی

گور پر آیا سمند ناز کو جولاں کیے
اس سپاہی زادے نے کیا ترک تازی خوب کی

عاشقوں کی خستگی بدحالی کی پروا نہیں
اے سراپا ناز تونے بے نیازی خوب کی

تنگ چولی نے تو مارا تنگ درزی سے ہمیں
خاک بھی برباد کی دامن درازی خوب کی

سان مارا اور کشتوں میں مرے کشتے کو بھی
اس کشندے لڑکے نے بے امتیازی خوب کی

چھوڑ کر معمورۂ دنیا کو جنگل جا بسے
ہم جہان آب و گل میں خانہ سازی خوب کی

کھیل لڑکوں کا سمجھ کر چاہ کو آخر گئے
میر پیری میں تو تم نے عشق بازی خوب کی

(۱۹۰۵)

اے عشق بے محابا تونے تو جان مارے
تک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

(۱۹۰۶)

طائر فریب کتنا ہے وہ شکار پیشہ
مرغان باغ سارے گویا ہیں اس کے مارے

(۱۹۰۷)

اس سخن رس سے اگر شب کی ملاقات رہے
بات رہ جائے نہ یہ دن رہیں نے رات رہے

فخر سے ہم تو کلہ اپنی فلک پر پھینکیں
اس کے سگ سے جو ملاقات مساوات رہے

مغبچے لے گئے سجادہ و عمامہ اچک
شیخ کی میکدے میں کیونکے کرامات رہے

دھجیاں جامے کی کروں گا جنوں میں اب کے
گر گریباں دری کا کام مرے ہاتھ رہے

خاک کا پتلا ہے آدم جو کوئی اچھی کہے
عالم خاک میں برسوں تئیں وہ بات رہے

بات واعظ کی موثر ہو دلوں میں کیونکر
دن کو طامات رہے شب کو مناجات رہے

تنگ ہوں میر جی بے طاقتی دل سے بہت
کیونکے یہ ہاتھ تلے قبلۂ حاجات رہے

(۱۹۰۸)

کیا عشق بے محابا ستھراؤ کر رہا ہے
میداں بزن گہوں کے کشتوں سے بھر رہا ہے

غیرت سے دہری کی ذر چاندنی نہ دیکھی
مہتابی ہی رخ اس کا پیش نظر رہا ہے

خوں ریز ناتواں میں اتنا نہ کوئی بولا
کیا مارتا ہے اس کو یہ آپھی مر رہا ہے

پائیز کب کرے ہے افسردہ خستہ اتنا
تو بھی جدا کسو سے اے گل نگر رہا ہے

غیبت سے آج کل گیا ان نے کیا کنارہ
دریا ہمیشہ میرے گریے سے تر رہا ہے

میں اک نگاہ کا بھی خوش رو کوئی نہ دیکھا
الفت رہی ہے جس سے اس ہی کا ڈر رہا ہے

رہتا نہیں ہے رکھے تھمتا نہیں تھمائے
دل اب تڑپ تڑپ کر اک ظلم کر رہا ہے

یہ کارواں سرا تو رہنے کی گوں نہ نکلی
ہر صبح یاں سے ہم کو عزم سفر رہا ہے

بعد از نماز سجدہ اس شک کا کروں ہوں
روزوں کا چاند پیدا سب بے خبر رہا ہے

لیا پھر نظر چڑھا ہے اے میر کوئی خوش رو
یہ زرد زرد چہرہ تیرا اتر رہا ہے

(۱۹۰۹)

کیا طرح ہے یاں جو آئے ہو تو شرمائے ہوئے
بات تلخی کہتے ہو غصے سے جھنجھلائے ہوئے

اس مرے نوبادۂ گلزار خوبی کے حضور
اور خوباں جوں خزاں کے گل ہیں مرجھائے ہوئے

چھپ کے دیکھا ہمرہاں نے اس کو سو غش آگیا
حیف بیخود ہوگئے ہم پھر بخود آئے ہوئے

ہر زماں لے لے اٹھو ہو تیغ بیٹھا مجھ کو دیکھ
آئے ہو مستانہ کس دشمن کے بہکائے ہوئے

گھر میں جی لگتا نہیں اس بن تو ہم ہوکر اداس
دور جاتے ہیں نکل ہجراں سے گھبرائے ہوئے

ایک دن موے دراز اس کے کہیں دیکھے تھے میں
ہیں گلے کے ہار اب وے بال بل کھائے ہوئے

دشمنی سے سایۂ عاشق کو جو مارے ہے تیر
اس کماں ابرو کے جاکر میر ہمسائے ہوئے

(۱۹۱۰)

چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار دیکھیے کب تک رہے

سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا ہار دیکھیے کب تک رہے

ضعف سے آنکھیں مندیں کھل نہ گئیں پھر شتاب
غش یہ ہمیں اب کی بار دیکھیے کب تک رہے

لب پہ مرے آن کر بارہا پھر پھر گئی
جان کو یہ اضطرار دیکھیے کب تک رہے

اس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیاں
دل ہے مرا بے قرار دیکھیے کب تک رہے

اس سرے سے اس سرے داغ ہی ہیں صدر میں
ان بھی گلوں کی بہار دیکھیے کب تک رہے

آنکھیں تو پتھرا گئیں تکتے ہوئے اس کی راہ
شام و سحر انتظار دیکھیے کب تک رہے

آنکھ ملاتا نہیں ان دنوں وہ شوخ تک   بے مزہ ہے ہم سے یار دیکھیے کب تک رہے
روے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف   شعر ہی میرا شعار دیکھیے کب تک رہے
گیسو و رخسار یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میرؔ یہ لیل و نہار دیکھیے کب تک رہے

(۱۹۱۱)

فلک کرنے کے قابل آسماں ہے   کہ یہ پیرانہ سر جاہل جواں ہے
گئے ان قافلوں سے بھی اٹھی گرد   ہماری خاک کیا جانیں کہاں ہے
بہت نامہرباں رہتا ہے یعنی   ہمارے حال پر کچھ مہرباں ہے
ہمیں جس جاے کل غش آگیا تھا   وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہے
مژہ ہر اک ہے اس کی تیز ناوک   خمیدہ بھوں جو ہے زوریں کماں ہے
اسے جب تک ہے تیر اندازی کا شوق   زبونی پر مری خاطر نشاں ہے
چلی جاتی ہے دھڑکوں ہی میں جاں بھی   یہیں سے کہتے ہیں جاں کو رواں ہے
اسی کا دم بھرا کرتے رہیں گے   بدن میں اپنے جب تک نیم جاں ہے
پڑا ہے پھول گھر میں کاہے کو میرؔ
جھمک ہے گل کی برق آشیاں ہے

(۱۹۱۲)

ہم رہن بادہ جامۂ احرام کرچکے   مستی کی دیر میں قسم اقسام کر چکے
جامہ ہی وجہ سے میں ہمارا نہیں گیا   دستار و رخت سب گرو جام کرچکے
زنار پہنا سبحہ کے رشتے کے تار توڑ   ترک نماز و روزہ و اسلام کرچکے
جپ کرنے بیٹھے مالا لیے پیش روے بت   کفر اختیار کرنے میں ابرام کرچکے
صندل کے قشقے دیکھ برہمن بچوں کے صبح   عاشق ہوئے سو آپ کو بدنام کرچکے
واسوختہ ہو دیر سے کعبے کو پھر گئے   سو بار اضطراب سے پیغام کرچکے
شکر و گلہ صنم کدے کا حرف حرف میرؔ
کعبے کے رہنے والوں کو ارقام کرچکے

(۱۹۱۳)

عشق کیا کوئی اختیار کرے   وہی جی مارے جس کو پیار کرے
غنچہ ہے سر پہ داغ سودا کا   دیکھیں کب تک یہ گل بہار کرے

آنکھیں پتھرائیں چھاتی پتھر ہے — وہ ہی جانے جو انتظار کرے
سہل وہ آشنا نہیں ہوتا — دیر میں کوئی اس کو یار کرے
کنج میں دامنہ کے ہوں شاید — صید لاغر کو بھی شکار کرے
کبھو سچے بھی ہو کوئی کب تک — جھوٹے وعدوں کو اعتبار کرے
پھول کیا میر جی کو وہ محبوب
چڑھاوے گلے کا ہار کرے

(١٩١٤)

سب کام سونپ اس کو جو کچھ کام بھی چلے — جپ نام اس کا صبح کو تا نام بھی چلے
گل بکھرے لال میرے قفس پر خزاں کی باؤ — شاید کہ اب بہار کے ایام بھی چلے
خط لکھے پر بھی یار نہ لکھتا تھا کوئی حرف — سو اس کو اب تو لوگوں کے پیغام بھی چلے
سایہ سی اس کے پیچھے لگی پھرتی ہے پری — وہ کیا جو آگے یار کے دوگام بھی چلے
پھر صعوہ کے خرام کی بے لطفی دیکھیو — جب راہ دو قدم وہ گل اندام بھی چلے
اب وہ نہیں کہ تھامے تھمے اضطرار ہے — اک عمر ہم تو ہاتھ سے دل تھام بھی چلے
یہ راہ دور عشق نہیں ہوتی میر طے
ہم صبح بھی چلے گئے ہیں شام بھی چلے

(١٩١٥)

اب دشت عشق میں ہیں بتنگ آئے جان سے — آنکھیں ہماری لگ رہی ہیں آسمان سے
پڑتا ہے پھول برق سے گلزار کی طرف — دھڑکے ہے جی قفس میں غم آشیان سے
یک دست جوں صداے جرس بیکسی کے ساتھ — میں ہر طرف گیا ہوں جدا کاروان سے
تم کو تو التفات نہیں حال زار پر — اب ہم ملیں گے اور کسو مہربان سے
تم ہم سے صرفہ ایک نگہ کا کیا کیے — اغماض ہم کو اپنے ہے جی کے زیان سے
جاتے ہیں اس کی اور تو عشاق تیر سے — قامت خمیدہ ان کے اگر ہیں کمان سے
دلکش قد اس کا آنکھوں تلے ہی پھرا کیا — صورت گئی نہ اس کی ہمارے دھیان سے
آتا نہیں خیال میں خوش رو کوئی کبھو — تو مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے
آنکھوں میں آکے دل سے نہ ٹھہرا تو ایک دم — جاتا ہے کوئی دید کے ایسے مکان سے
دیں گالیاں انھیں نے وہی بے دماغ ہیں
میں میر کچھ کہا نہیں اپنی زبان سے

(۱۹۱۶)

گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی ۔۔۔ سب جیسے اڑ گئی ہے رنگینی گلستاں کی
مطلوب گم کیا ہے تب اور بھی پھرے ہے ۔۔۔ بے وجہ کچھ نہیں ہے گردش یہ آسماں کی
مائل ستم کے ہونا جور و جفا بھی کرنا ۔۔۔ انصاف سے یہ کہنا یہ رسم ہے کہاں کی
ہے سبزۂ لب جو اس لطف سے چمن میں ۔۔۔ جوں بھیگتی مسیں ہوں کوئی سرو نوجواں کی
میں گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے ۔۔۔ جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی
صوم و صلوٰۃ یکسو میخانے میں جو تھے ہم ۔۔۔ آواز بھی نہ آئی کانوں میں یاں اذاں کی
جب سامنے گئے ہم ہم نے اسے دعا دی ۔۔۔ شکل ان نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

دیکھیں تو میرؔ کیونکر ہجراں میں ہم جیے ہیں
ہے اضطراب دل کا بے طاقتی ہے جاں کی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ سودا (جلد دوم)

مرتب : محمد حسن

صفحات:240

قیمت : -/60روپے

مکتوبات اُردو کا ادبی و تاریخی اِرتقا

مصنف : خواجہ احمد فاروقی

صفحات:718

قیمت : -/193روپے

یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب)

ترتیب و انتخاب: زبیر رضوی

صفحات:494

قیمت : -/325روپے

کلیاتِ سرور جہاں آبادی

مرتب : کلدیپ گوہر

صفحات:410

قیمت : -/108روپے

تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات)

مصنف : احسن مارہروی

صفحات:496

قیمت : -/130روپے

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد دوم)

مترجم : فضلِ حسنین

صفحات:626

قیمت : -/170 روپے

₹ 440.00

ISBN: 978-81-7587-879-2

9 788175 878792

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025